جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

سرکش

7

محمود احمد مودی

میں نمیسو خان کے پیچھے پیچھے گھوڑا دوڑاتا جا رہا تھا۔ بل کھاتی پگڈنڈی بھی بالآخر ختم ہو گئی اور ہم ناہموار کچے علاقے میں سفر کرنے لگے۔ زرتاج کی زمینیں اب بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ ہم قدرے نشیبی سے علاقے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

پھر مجھے سامنے بہت بڑے طول و عرض میں درخت پھیلے ہوئے نظر آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دستِ قدرت نے خاص طور پر ایک محدود سے حصے میں بڑا باترتیب سا جنگل اُگا دیا تھا۔ حالانکہ جنگل میں ترتیب کا کیا کام؟ اردگرد نیم ریتیلا اور ناہموار میدان ہی تھا۔

اس باترتیب سے جنگل کو دیکھ کر کچھ شبہ سا گزرتا تھا کہ شاید اس کی تخم ریزی اور پرورش و پرداخت انسانی ہاتھوں ہی سے ہوئی تھی اور کسی خاص مقصد کے تحت برسوں کی منصوبہ بندی سے یہ جنگل اُگایا گیا تھا لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے اس موہوم سے خیال کو رد کر دیا۔ کسی کو اس ویرانے میں یہ زحمت اٹھانے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟

کبھی کبھی ہوا کا تیز جھونکا آتا اور زمین سے مٹی اُڑاتا ہوا لے جاتا۔ اسی وجہ سے یہاں کسی کا نقشِ پا رہ جانے کا امکان ذرا کم ہی تھا۔ مجھے دھندلے دُھندلے کچھ ایسے نشانات نظر آ رہے تھے جیسے کاریں یا ایسی ہی کچھ دوسری سواریاں ادھر سے گزرتی رہی ہوں۔ سواریاں یا تو اس مختصر جنگل کی طرف گئی تھیں یا ادھر سے آئی تھیں اور مختلف سمتوں میں گئی تھیں۔ سورج اب زوال پذیر تھا... اور اسی کی مدد سے میں نے اب تک کے سفر میں سمتوں کا کچھ تعین کرنے اور اسے ذہن میں رکھنے کی کوشش کی تھی تاکہ ضرورت پڑنے پر کبھی اپنے طور پر بھی ادھر آنے کی کوشش کر سکوں۔

اس مختصر سے جنگل کے قریب پہنچ کر ہم اس کے گرد چکر کاٹتے ہوئے دوسری طرف آ گئے۔ یہاں ایک مقام پر جنگل میں داخل ہونے کے لیے بل کھاتا ایک راستہ موجود تھا.... لیکن اگر دور سے دیکھا جاتا تو یہ راستہ الگ سے دکھائی نہ دیتا حالانکہ اچھا خاصا کشادہ راستہ تھا۔

اس راستے پر ذرا دور چلنے کے بعد ہی گویا ہم بھی جنگل میں مدغم ہو گئے۔ اب کوئی جنگل سے کچھ دور کھڑا... ہو کر دیکھتا تو شاید ہم اسے نظر نہ آتے۔ مجھے ایک بار پھر شبہ سا ہوا کہ اس جنگل کی نشوونما میں انسان کی انجینئرنگ اور منصوبہ بندی شامل تھی۔ میرا خیال بالکل بھی ہو سکتا تھا۔ دستِ قدرت نے بھی اس دنیا میں قدم قدم پر عجیب عجیب چیزیں تخلیق کر رکھی ہیں اور ہر دور میں انسان انہیں نہ جانے کن کن اچھے اور بُرے مقاصد کے لیے استعمال کرتا رہا ہے۔

درختوں کے درمیان بل کھاتے اس راستے پر ہم نے تھوڑا فاصلہ مزید طے کیا تو اچانک ہی اپنے آپ کو کھلی جگہ میں کھڑے پایا۔ اسی دوران درختوں کے عقب سے دو افراد اچانک ہی نکل کر ہمارے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں دوربار رائفلیں تھیں جن پر دوربینیں بھی فٹ تھیں۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ دونوں کسی نہ کسی جگہ سے بہت دور سے ہی ہم کو آتے دیکھ چکے تھے۔

وہ دونوں لحیم شحیم اور چہرے سے ہی بدفطرت سے نظر آنے والے افراد تھے۔ ایک کے چہرے پر نمیسو خان ہی کی طرح جھاڑ جھنکاڑ داڑھی تھی اور مونچھیں کچھ اس طرح اس میں گڈمڈ تھیں کہ دہن نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ تاہم اس مقام پر ہلکی سی ہلچل ہوئی تو اندازہ ہوا کہ وہ مسکرا رہا تھا۔

دوسرے کے کھُردرے چہرے پر صرف موٹی موٹی مونچھیں تھیں۔ وہ ہنسنے مسکرانے کا قطعاً عادی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں اور آنکھوں میں برہمی تھی۔ جیسے وہ ساری دنیا سے ناراض ہو۔ تاہم ان دونوں میں سے کسی کی بھی رائفل کا رخ ہماری طرف نہیں تھا۔

ان دونوں نے گہری نظروں سے صرف میرا جائزہ لیا لیکن کچھ بولے نہیں۔ نمیسو خان نے نہایت خفیف سے اشارے سے گویا جتایا کہ میں اس کے ساتھ تھا اور انہوں نے بھی نہایت خفیف سے اشارے سے ہی ہمیں آگے جانے کی اجازت دے دی۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ کوئی اجنبی اس جنگل میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

سامنے کسی پرانی اور نہایت طویل و عریض حویلی کا کھنڈر نظر آ رہا تھا۔ کھنڈر بھی کیا تھا، محض چند ٹوٹی پھوٹی دیواریں اور ستون

تھے یا پھر ان کے درمیان ملبے کے بہت سے ڈھیر جو بارشوں اور موسم کے دوسرے تغیر و تبدل کے باعث چھوٹے بڑے ٹیلوں کی شکل اختیار کر گئے تھے۔

جنگل گویا اس طویل و عریض کھنڈر کے گرد فصیل کا کام دے رہا تھا۔ جنگل نے نہایت خوبصورتی سے اس کھنڈر کو اپنے درمیان چھپایا ہوا تھا۔ اس کھنڈر کے گرد بہت سی جگہ درختوں سے خالی بھی تھی اور اس جگہ میں چھ سات قیمتی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں پجیرو، مرسیڈیز اور لاکارڈ جیسی گاڑیاں شامل تھیں۔ صرف ایک گاڑی ذرا کم قیمت تھی۔

ان پر دھول جمی ہوئی تھی لیکن یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ دیہی علاقوں میں زمینداروں وغیرہ کی گاڑیوں پر عموماً اسی طرح دھول جمی رہتی ہے۔ کسی گاڑی میں کوئی آدمی نہیں تھا۔ درختوں کی اس لمبی چوڑی فصیل میں گھرے ہوئے اس کھنڈر کے پاس کھڑی وہ گاڑیاں عجیب لگ رہی تھیں۔ میں نے بنیادی طور پر سادہ مزاج رکھنے والے دیہاتی کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ کر حیرت ظاہر کرنے کی اداکاری جاری رکھی۔ لیکن درحقیقت یہ خالص اداکاری بھی نہیں تھی۔ مجھے سچ مچ بھی کچھ حیرت تھی۔

غمیسو خان نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور گھوڑے کو بے پروائی سے وہیں کھڑا چھوڑ کر کھنڈر کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے بھی گھوڑے کو کہیں باندھے بغیر وہیں چھوڑا اور اس کے پیچھے لپکا۔ نہ جانے کیوں مجھے اپنے اعصاب میں ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

کھنڈر کے قریب پہنچ کر دیواروں کی ساخت سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی بہت ہی پرانی حویلی تھی اور کسی شاہی محل سے کم نہیں تھی۔ اس کا تعلق کسی ایسے دور سے تھا جب عموماً محلوں، قلعوں اور حویلیوں میں دیواروں پر رنگین تصویریں بنوانے کا بھی رواج تھا۔ امتدادِ زمانہ کے باوجود ان تصویروں کے رنگوں میں ابھی تک چمک باقی تھی لیکن دیواریں بری طرح شکست و ریخت کا شکار تھیں اور پلستر بھی جگہ جگہ سے جھڑ چکا تھا۔ اس لیے تصویروں کا بھی کوئی کوئی حصہ ہی باقی تھا جس سے سرسری نظر میں کوئی اندازہ لگانا تقریباً ناممکن ہی تھا۔ کم از کم میرے لیے تو ناممکن ہی تھا۔

ملبے کے کئی اونچے نیچے ڈھیروں سے گزرنے کے بعد ہم ایک ایسی شکستہ دیوار کے قریب پہنچے جس کے عقب میں پتھر کی سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ سیڑھیاں اتر کر ہم ایک راہداری میں پہنچے جس کے اختتام پر ایک لمبا چوڑا دروازہ نظر آ رہا تھا لیکن یہ دروازہ اس تباہ شدہ عمارت کا حصہ نہیں تھا۔

وہ جدید ساخت کا ایک مضبوط فلش ڈور تھا جس میں جدید ساخت کا ہی ایک فلش لاک اور ناب وغیرہ بھی موجود تھی۔ اوپر ملبے پر کھڑے ہونے والے کی نظر اس دروازے تک تو کیا، سیڑھیوں تک بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اوپر سے کچھ ایسا ہی لگتا تھا جیسے زمین میں کوئی گڑھا پڑ گیا ہو۔

غمیسو خان نے نہایت مطمئن انداز میں جیب سے ایک سنہری چابی نکالی جس پر ایک نمبر کندہ تھا۔ اس چابی سے اس نے دروازے کا تالا کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی مجھے سامنے ایک چوڑا چکلا، سفاک چہرہ نظر آیا جس کی رنگت تپے ہوئے تانبے جیسی تھی۔ وہ گٹھا ہوئے جسم کا ایک پستہ قد مگر گوریلے کی طرح مضبوط نظر آنے والا شخص تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں سانپ کی آنکھوں جیسی چمک تھی۔

اس نے ایک ہاتھ میں کلاشنکوف کھلونے کی طرح اٹھائی ہوئی تھی۔ غمیسو خان کو دیکھ کر اس نے گن بے پروائی سے جھکا لی۔ اس کا سر اس کی جسامت کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا، گریبان کھلا اور اس کے سینے پر گوریلے کی طرح بال نظر آ رہے تھے۔

اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف نہ ہوتی تب بھی ایک عام شخص اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو سکتا تھا۔ وہ کلین شیو تھا اور اس کا سُوجا ہُوا سا معلوم ہوتا تھا۔ بال بہت چھوٹے، چھدرے اور تاروں کی طرح کھڑے تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے ہوشو خان یاد آ گیا۔ ہوشو خان جیسا گرانڈیل نہیں تھا لیکن اس کی شخصیت میں ہوشو کی جھلک تھی۔ بلکہ اس کی آنکھیں ہوشو خان کی نسبت زیادہ خطرناک شخص کی آنکھیں تھیں۔

غمیسو خان کو دیکھ کر اس کے پتھرائے ہوئے سے چہرے پر مسکراہٹ کی صرف ایک رمق ابھری۔ غمیسو نے اس سے اُردو لفظ بھی نہیں کہا۔ بس مشفقانہ سے انداز میں اس کا کندھا تھپکا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ ایک چھوٹا سا چوکور کمرا تھا جہاں وہ گوریلا شخص تعینات تھا۔

اس کے عقب میں زمین سے چھت تک ایک دیوار تھی جس میں ایک چوکور شگاف موجود تھا۔ اس شگاف کی وجہ سے ہی اندازہ ہوا کہ وہ دیوار بہت موٹی تھی۔ شگاف اتنا بڑا تھا کہ اس وقت میں صرف ایک شخص آسانی سے گزر سکتا تھا۔

غمیسو خان کی رہنمائی میں اس شگاف سے گزرتے ہی یکدم گویا کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا۔ ہم ایک طویل و عریض میں کھڑے تھے جس کا فرش ماربل کی ٹائلوں کا تھا اور اس کے چاروں طرف اوپر نیچے دو منزلوں پر کمروں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ ان منزلوں کی اونچائی میزانائن فلور کی طرح کم تھی لیکن بہرحال وہ دو منزلیں تھیں اور یوں کمروں کی تعداد کافی زیادہ ہو گئی تھی۔ کمروں کے دروازے بند تھے۔ بالائی منزل کے سامنے تنگ سی بالکونی بھی چاروں طرف موجود تھی۔

چھت اور فرش کے درمیان کئی موٹے موٹے ستون بھی آ رہے تھے۔ معلوم نہیں یہ اس تباہ شدہ قدیم عمارت کا بقیہ خانہ تھا جو اصل عمارت کے کم از کم آدھے حصے جتنا لمبا چوڑا تھا۔ عمارت کی نچلی منزل تھی جو حادثاتی طور پر یا وقت کے ساتھ مٹی میں دب کر محفوظ ہو گئی تھی جبکہ اوپر کی منزل رفتہ رفتہ منہدم ہو گئی تھی، بعد میں اس زیریں منزل کی مرمت اور تزئین کے بعد اسے ایک نئی شکل دے دی گئی تھی۔ اب یہ محل وقوع اور ساخت کے لحاظ سے گویا ایک چھوٹا سا محفوظ قلعہ تھا جو اول تو اس ویرانے میں زیرِ زمین اور دوم جنگل میں چھپا ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نظروں سے محفوظ تھا۔

اس کے باوجود اس کی حفاظت کے انتظامات بھی موجود تھے جن کا اندازہ مجھے یہاں آتے وقت ہو گیا تھا۔ بالفرض محال کسی کی رسائی سیڑھیوں تک بھی ہو جاتی تب بھی اس ٹھکانے کو تباہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اگر کچھ لوگ یہاں قلعہ بند ہو کر بیٹھ جاتے تو انہیں نکالنا یا انہیں ہلاک کیے بغیر اس ٹھکانے پر کنٹرول حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

جس کسی نے بھی اس جگہ کو کارآمد بنانے کی منصوبہ بندی کی تھی اس کی ذہانت کو داد دینی چاہیے تھی۔ افسوس کی بات صرف یہ تھی کہ وہ ذہانت یقیناً اچھے مقاصد میں استعمال نہیں ہو رہی تھی۔

یہاں بجلی بھی موجود تھی۔ جابجا قمقمے روشن تھے۔ اس کا انتظام تو شاید جنریٹرز کے ذریعے کر لیا گیا ہو لیکن ہوا کی آمدورفت کا نہ جانے کیا انتظام تھا کہ یہاں گھٹن اور حبس محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ باہر سے یکدم یہاں آنے پر تو نہایت خوشگوار قسم کی خنکی محسوس ہو رہی تھی جیسے کوئی ایئرکنڈیشننگ سسٹم ہلکے درجے پر کام کر رہا ہو۔ زیرِ زمین جگہیں ویسے بھی نسبتاً ٹھنڈی ہی ہوتی ہیں۔

لیکن ان سب چیزوں میں سے کوئی بھی میرے لیے اس قدر حیران کن نہیں تھی جتنا یہاں کا ماحول باعثِ حیرت تھا۔ ان لامتناہی سے ویرانوں میں محض چند سیڑھیاں اتر کر اچانک ہی دوسری دنیا میں پہنچ جانے والا شخص پہلے تو یہی محسوس کرتا ہے کہ اس کی آنکھیں اسے دھوکا دے رہی ہیں، رنگین خواب دکھا رہی ہیں۔

انگریزی ویسٹرن فلموں میں پرانی طرز کے نائٹ کلبوں، سیلونوں وغیرہ کے ماحول کی جو جھلکیاں نظر آتی ہیں، ان میں تصور کی مدد سے کچھ رنگ آمیزی کر لی جاتی تو یہاں کے ماحول کا نقشہ کھینچا جا سکتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں کے ماحول میں ذرا دیسی ٹچ شامل تھا۔ پہلی نظر میں یہ گمان بھی گزر سکتا تھا کہ شاید وہ کسی بڑے بجٹ کی فلم کا سیٹ لگا ہوا تھا اور شوٹنگ جاری تھی۔

ہال میں قطار در قطار چھوٹی چھوٹی، خوبصورت میز کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے بیشتر خالی تھیں لیکن کچھ پر لوگ موجود تھے۔ میرے لیے حیرت در حیرت کا سامان یہ تھا کہ ان افراد میں چار لڑکیاں بھی شامل تھیں۔

مرد سبھی پکی عمروں کے تھے۔ ان کے چہروں اور لباسوں سے آسودہ حالی کی مخصوص چمک عیاں تھی۔ اپنے حلیوں اور رکھ رکھاؤ سے وہ زمیندار معلوم ہوتے تھے۔ لڑکیاں البتہ شہری علاقوں کی پیداوار معلوم ہوتی تھیں۔ کم از کم ان کے حلیے دیکھ کر تو یہی گمان گزرتا تھا لیکن ان کے چہروں پر دساتوں والی جوانی اور صحت مندی کی چمک موجود تھی۔ گو کہ یہ چمک رختِ سفر باندھ رہی تھی۔ اور زیادہ عرصے کی مہمان معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن بہرحال اس کی موجودگی خوشگوار تھی۔ ان کے لباس خاصے اچھے اور فیشن ایبل تھے۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ یہ عورتیں انہی مردوں کے ساتھ آئی ہوئی تھیں یا ان کا تعلق اسی جگہ سے تھا۔

وہ سب تین تین چار چار کی ٹولیوں میں مختلف میزوں پر تاش کھیل رہے تھے۔ ان کے سامنے پلاسٹک کے ٹوکنوں کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں تھیں۔ کھانے پینے کا شغل جاری تھا۔ ساتھ ساتھ پتے بھی گردش میں تھے اور پلاسٹک کے ٹوکن یا چپس ادھر سے اُدھر ہو رہے تھے۔

ہوا میں سگریٹوں کا دھواں اور وسکی وغیرہ کی بو چکرا رہی تھی۔ باتوں کی خفیف سی بھنبھناہٹ کے درمیان کبھی کوئی مخمور اور مترنم سا قہقہہ بھی سنائی دے جاتا۔ بیشتر میزیں ابھی خالی تھیں۔ گلشن کا کاروبار شباب پر نہیں تھا، شاید ابھی اس کا وقت نہیں تھا۔

میزوں پر موجود افراد نے محض اک نگاہِ غلط انداز سے ہماری طرف دیکھا اور دوبارہ اپنے اپنے شغل میں منہمک ہو گئے۔ میں غمیسو خان کی رہنمائی میں میزوں کے درمیان سے گزرتا آگے بڑھا۔ مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر حقیقت میں تھوڑی بہت حیرت کا احساس ضرور ہو رہا تھا اور اس وقت میرے لیے چہرے سے بھی تھوڑی بہت حیرت کا اظہار کرنا ہی بہتر تھا۔

میں اردگرد دیکھتے ہوئے تھوڑا سا ہونق نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا اور غمیسو خان کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے یقیناً دل ہی دل میں میری کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جن کمروں کے دروازے بند نظر آ رہے تھے ان کے مصرف کا اندازہ کرنا بھی مشکل نہیں تھا۔ یہاں یقیناً ہر قسم کی عیاشیوں کا بندوبست تھا۔

اسی اثنا میں ایک لمبا تڑنگا شخص کندھے پر رومال ڈالے، بوتل اور گلاسوں سے سجی ایک ٹرے اٹھائے سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ وہاں ویٹر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ غمیسو پر نظر پڑتے ہی وہ یکدم مؤدب سا ہو کر اس کے لیے راستہ چھوڑ کر ایک میز سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تاہم وہ کچھ بولا نہیں۔ حتیٰ کہ اس نے سلام دُعا وغیرہ بھی نہیں کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ غیر ضروری گفتگو کے قائل نہیں تھے۔ مجموعی طور پر وہاں بڑا سکون تھا اور ہال میں موجود لوگ اس ٹھکانے پر یقیناً اپنے آپ کو بے حد محفوظ محسوس کر رہے ہوں گے۔ وہ تاش اور مے نوشی کے شغل کے علاوہ اپنی ساتھی لڑکیوں سے گاہے گاہے اس حد تک دراز دستی بھی کیے جا رہے تھے جو عام جگہوں پر عام حالات میں قابلِ دست اندازی پولیس بھی ہو سکتی تھی۔

لیکن اس کے ردِ عمل کے طور پر مخمور سے قہقہوں کے سوا کچھ

سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کوئی ہلڑ بازی' شور شرابا نہیں تھا۔ نہایت مہذبانہ' ماحول تھا۔ بظاہر ویٹر نظر آنے والے شخص کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اس کی واسکٹ کی جیب سے کسی گن کا دستہ جھانک رہا تھا۔

میزوں کا سلسلہ ختم ہوا تو ایک ستون کے قریب سے غمیسو دائیں طرف مُڑ گیا۔ سامنے ہی ایک بہت بڑا کاؤنٹر تھا۔ اس کے عقب میں مجھے جو بار نظر آیا تھا' اتنا بڑا بار میں نے اس سے پہلے کبھی حقیقی زندگی میں یا فلموں میں نہیں دیکھا تھا۔ چھت تک پہنچنے والے لمبے چوڑے شیلف' رنگا رنگ اور ایک سے ایک مہنگی ولایتی شرابوں کی بوتلوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اتنی زیادہ بوتلوں کی موجودگی کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ یہاں طلبگاروں کو جام کے حساب سے نہیں' بوتل ہی کے حساب سے سپلائی جاری تھی۔

کاؤنٹر کے عقب میں ایک دراز قد اور وجیہہ نوجوان موجود تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ صاف ستھری شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا' اگر وہ چند کتابیں یا فائل لیے یہاں کے بجائے کسی سڑک پر کھڑا ہوتا تو کالج یا یونیورسٹی کا طالب علم معلوم ہوتا۔ وہ یہاں کا پہلا شخص تھا جس کی طرف دیکھ کر غمیسو خان باقاعدہ مسکرایا۔ اس نوجوان سے غمیسو نے مصافحہ بھی کیا۔

غمیسو کا اشارہ پاکر میں بھی اس کے ساتھ .... کاؤنٹر کے عقب میں چلا گیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے کافی کشادہ جگہ موجود تھی۔ وہاں چند کرسیاں بھی پڑی تھیں۔ غمیسو نے اپنی گن ایک کرسی کے سہارے کھڑی کی اور اسی کرسی پر اپنے مخصوص انداز میں پھیل کر بیٹھتے ہوئے مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں دوسری کرسی پر بیٹھ چکا تو غمیسو بیڑی سُلگانے لگا۔ میں نے غیر محسوس طور پر کاؤنٹر کے نیچے موجود بڑے بڑے شیلفوں کا جائزہ لیا۔ کئی شیلفوں میں تو چھوٹے بڑے کارٹن ٹھنسے ہوئے تھے جن کے بارے میں مجھے اندازہ نہیں ہوسکا کہ وہ کس چیز کے تھے۔ لیکن ایک چیز جسے عام طور پر چھپا کر رکھا جاتا ہے' وہ ایک شیلف میں بے پروائی سے بکھری ہوئی تھی۔ وہ چیز نقدی تھی!

وہ یقیناً کئی لاکھ روپے کی رقم تھی جو نئے اور پرانے نوٹوں کی گڈیوں کی صورت میں بے ترتیبی سے شیلف میں پڑی تھی۔ غمیسو نے بھی ایک نظر رقم کی طرف دیکھا اور طمانیت سے مسکرادیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک کچھ بڑھ گئی۔

ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر وہ شاہانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے نوجوان سے مخاطب ہوا "کیسا چلا رہا ہے دھندا؟"

"فرسٹ کلاس۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"اور حالات کیسے ہیں؟"

"حالات بھی بالکل ٹھیک ہیں۔"

"کوئی پریشانی تو نہیں؟" غمیسو نے مونچھ کو بل دیتے ہوئے پوچھا۔

اعتبار ساجد کی ہنستی مسکراتی
ہوئی شگفتہ تحریروں کا نیا انتخاب

قلم کاریاں

قیمت: -/75 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

"تم جیسے مالکوں اور سرپرستوں کے ہوتے ہوئے ہمیں کیا پریشانی ہوسکتی ہے؟" نوجوان مسکرایا۔

یہاں میں ایک بار پھر وضاحت کرتا چلوں کہ ان علاقوں میں ہم سب کے درمیان گفتگو مقامی زبان میں ہی ہوتی تھی۔ میرے بارے میں یہ تو ظاہر ہو ہی جاتا تھا کہ میں غیر مقامی تھا لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں بھی مقامی زبان ہی بولنے کی کوشش کرتا تھا اور ہر دن گزرنے کے ساتھ نہایت تیزی سے اس پر حاوی ہوتا جارہا تھا.... لیکن بہتر یہی ہوگا کہ تمام مکالمے آپ اُردو میں پڑھیں تاکہ بات کا اصل مفہوم سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ مقصد تو محض مفہوم ہی آپ تک پہنچانا ہے۔ زبان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زبان تو محض رابطے کا ایک ذریعہ ہے۔ بہرحال اتنا ضرور ہے کہ کم از کم پاکستان میں بولی جانے والی زبانوں میں سے جتنی بھی زیادہ سے زیادہ زبانیں آپ کو آتی ہوں' اتنا ہی اچھا ہے۔ ہر علاقے کے لوگوں سے گھلنے ملنے میں آسانی رہتی ہے۔ آپ جہاں بھی جاتے ہیں' جلد ہی اپنائیت بھرا ماحول تخلیق کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

وہاں ملازم ٹائپ دو تین افراد اور بھی نظر آرہے تھے۔ ایک طرف ایک کھلا دروازہ نظر آرہا تھا۔ اس کے عقب سے بُھنے ہوئے گوشت اور کھانے پینے کی دوسری چیزوں کی خوشبوئیں آرہی تھیں.... لیکن عجیب بات یہ تھی کہ کچن کا جو ایک مخصوص ساحس اور تپش ہوتی ہے اس کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اس بند جگہ میں ہوا کی آمدورفت کا یقیناً کوئی معقول ذریعہ موجود تھا۔

غمیسو خان نے گویا نوجوان کے جوابات سے مطمئن ہو کر بیڑی کا ایک کرارا کش لیا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد پوچھا۔ "وزیر خان نے مال بھجوادیا تھا؟"

"جی ہاں۔ اس نے وعدے کے مطابق ڈلیوری دے دی ہے۔ حالانکہ سنا ہے' سرحد کے قریب سے اس کے ٹرک روانہ ہوئے تو پشاور کے راستے میں ہی پکڑے گئے تھے لیکن اس نے جس سے جو وعدہ کیا تھا' وہ پورا کردیا۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"ان کاموں میں اس طرح تو ہوتا رہتا ہے۔" غمیسو بے پروائی سے مسکرایا۔ "ٹرک ورک تو پکڑے ہی جاتے ہیں مگر وزیر خان جیسے اچھے کاروباری لوگ اپنے وعدے پورے کرنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ نکال لیتے ہیں۔ ویسے بھی وزیر خان نے روسی اسلحے کے کاروبار میں بہت کمایا ہے۔ ایک دو ٹرک جانے سے اسے کیا فرق پڑتا ہے۔ ویسے آدمی وہ بہت سمجھدار اور بڑی پہنچ والا ہے۔ مجھے امید ہے جو ٹرک پکڑے گئے ہیں وہ بھی نکلوالے گا۔"

"اب تو ذرا مشکل ہی ہے۔ اخباروں میں خبریں وغیرہ آگئی ہیں۔" نوجوان نے محتاط سے لہجے میں کہا۔

غمیسو خان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اس کے بازو پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "طاہر شاہ! تم اب بھی کبھی کبھی پڑھے لکھوں والی.... میرا مطلب ہے بے وقوفوں والی باتیں کرجاتے ہو۔ اخباروں میں تو پتا نہیں کیا کیا خبریں آتی رہتی ہیں۔ اس سے کیا وہ کام رک جاتے ہیں جو دنیا میں ہو رہے ہیں؟ ارے بابا.... اخباروں کا کام شور مچانا ہے۔ وہ مچاتے رہتے ہیں۔ یعنی اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ دوسروں کو جو کرنا ہے وہ کرتے رہتے ہیں۔ سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ کسی کی وجہ سے کسی کے کام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر پڑتا ہے تو وہ خود ہی اس کو ٹھیک کرلیتا ہے۔ آج کل سب نے اپنے راستے کی رکاوٹ دور کرنا سیکھ لیا ہے۔ ہمارے ہاں ویسے بھی ہر رکاوٹ ہٹنے کے لیے ہی ہوتی ہے۔ ہر قانون ٹوٹنے کے لیے ہی بنتا ہے۔ توڑنے والے ہاتھ مضبوط ہونے چاہئیں۔ ہماری یا وزیر خان جیسے آدمیوں کی جڑیں جہاں جاکر ملتی ہیں وہاں اخباروں کی حیثیت ردّی کے پلندوں سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سائیں!" طاہر شاہ نامی اس نوجوان نے پُرخیال انداز میں سرہلایا۔

"خیر.... چھوڑو ان باتوں کو.... یہ بتاؤ دس پیٹیاں آئی ہیں نا؟" غمیسو نے بے پروائی سے سر جھٹکتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں' مال تو پورا ہے۔ میں نے چیک کرلیا تھا۔ اس مرتبہ کلاشنکوف کا جو ماڈل آیا ہے وہ پہلے والی سے بہتر ہے۔" طاہر شاہ بولا۔

"ہر نئی چیز' پرانی سے بہتر ہوتی ہے۔ سوائے شراب کے۔" غمیسو نے ایک بار پھر مونچھ کو بل دیا۔

"لیکن اپنے ہاں تو اگر کوئی چیز پاپولر ہوجائے تو اس کا معیار گر جاتا ہے۔ صرف نام کے سہارے لوگوں کو لوٹنے کی کوشش شروع ہوجاتی ہے۔ یا پھر اس چیز کی چار چھ نقلیں سامنے آجاتی ہیں۔" طاہر شاہ بولا۔

"ہاں لیکن یہ بدبخت غیر مُسلم ایسا نہیں کرتے۔ ان کی کوئی چیز دُنیا میں مقبول ہوجائے تو یہ اسے کچھ اور بہتر بنا کر مارکیٹ میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں نقل بنانے کا اول تو سلسلہ ہی نہیں ہے اور اگر کوئی نقل بنا کر پکڑا جائے تو رشوت دے کر چھوٹ نہیں سکتا اور نہ ہی لوگوں کے ماہانہ وظیفے باندھ کر اپنا کاروبار جاری رکھ سکتا ہے۔ یہ بڑی خرابی ہے ان بے ایمانوں میں۔" غمیسو خان مسکرایا۔

طاہر شاہ بھی مسکرادیا۔ اس دوران وہ ہمارے لیے ٹھنڈی بیئر کے دو گلاس بھر چکا تھا۔ اسے مزید ٹھنڈی کرنے کے لیے اس نے اس میں برف بھی ڈالی تھی۔ اس ویرانے میں ضرورت کی ہر چیز ہی موجود تھی۔

غمیسو نے تو اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر ہونٹوں سے لگالیا لیکن طاہر شاہ نے دوسرا گلاس میری طرف بڑھایا تو میں نے ہونق نظر آنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہوئے نفی میں سرہلا کر کہا۔ "میں تو سادہ پانی پیوں گا۔"

غمیسو اپنا بیئر نما ہاتھ میرے گھٹنے پر مارتے ہوئے بولا "ابے اُلو! یہ سادہ پانی ہی ہے۔ ایسے ہی ذرا شو بنانے کے لیے فیکٹری والوں نے اس میں تھوڑا سا رنگ ڈال دیا ہے۔"

"نہیں۔ مجھے پتا ہے یہ بیئر ہے۔" میں نے اپنے آپ کو عقلمند ظاہر کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی اصرار کیا۔ "میں تو سادہ پانی ہی پیوں گا۔"

طاہر شاہ نے سوالیہ نظروں سے غمیسو کی طرف دیکھا۔ غمیسو کندھے اُچکاتے ہوئے بولا "دے دو یار! اس بدنصیب کو سادہ پانی ہی دے دو۔ یہ ہمارا نیا رنگروٹ ہے۔ ویسے اس نے انٹرویو پاس کرلیا ہے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر طاہر شاہ سے دوسرا گلاس بھی لے لیا۔

طاہر شاہ نے ایک بڑے سے کولر سے پانی کا گلاس بھر کر مجھے دیا۔ پانی خوب ٹھنڈا تھا۔ وہ جگہ گویا جنگل میں منگل کی تصویر تھی۔ دولت میں واقعی بڑی طاقت ہے۔ دولت اپنی آسائشیں اپنے ساتھ کہیں بھی لے جاسکتی ہے۔

ایک گلاس خالی کرکے غمیسو خان نے طاہر شاہ کی طرف بڑھایا اور سوچ میں ڈوبے لہجے میں بولا "یہ ڈلیوری بڑے صحیح وقت پر آئی ہے۔ اسلحے کی ضرورت بڑھتی جارہی ہے۔ اگلی مرتبہ وزیر خان کو پیغام بھجوانا ہے کہ کچھ راکٹ لانچروں کا بندوبست کرے۔"

"کیا تم لوگ کسی سے جنگ لڑنے کی تیاری کررہے ہو؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

غمیسو خان نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگایا جس میں

بھیڑیے کی سی غراہٹ نمایاں تھی پھر وہ آنکھیں سکیڑتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا "ہم تو ہر وقت ہی حالتِ جنگ میں ہوتے ہیں میرے چاند! پولیس کے سر پھرے افسروں سے..... رینجرز سے..... شریف شہریوں اور دہاتیوں سے..... موٹی اسامیوں سے..... بھیس بدل کر آنے والے دشمنوں سے..... اور نہ جانے کس کس سے ہر وقت ہی ہماری جنگ جاری رہتی ہے۔"

"ہاں..... یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے سر ہلا کر گویا اس کی دانشورانہ بات کی داد دی۔

چند لمحوں میں اس نے بیئر کا دوسرا گلاس بھی خالی کر دیا اور یکدم اٹھتے ہوئے طاہر شاہ سے مخاطب ہوا "آؤ..... ذرا مال تو دکھاؤ۔"

طاہر شاہ نے ایک اور شخص کو بلا کر کاؤنٹر پر کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ تیموخان میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم بھی آؤ۔"

ہم گھوم کر کاؤنٹر کے بائیں طرف والی دیوار کے عقب میں پہنچے۔ اس طرف ایک تنگ گلی سی تھی جس کے اختتام پر ایک اونچا چوبی دروازہ تھا جو دیکھنے میں ہی بڑا مضبوط معلوم ہو رہا تھا۔

طاہر شاہ نے ایک بڑی سی چابی نکال کر اس کا تالا کھولا اور ہم اندر پہنچے۔ یہاں چاروں طرف بڑے بڑے کارٹن اور چوبی پیٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کمرے کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ عیاشی اور قمار بازی کے کسی زیرِ زمین اڈے کا حصہ تھا۔ یہ بڑا سا کمرا کسی تاجر کا گودام معلوم ہوتا تھا۔

پیٹیاں چھت تک پہنچی ہوئی تھیں۔ ان میں سے بیشتر شاید شراب کی بوتلوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ان پر صرف شیشے کے سامان کا علامتی نشان یعنی جام نظر آ رہا تھا اور 'احتیاط سے ہینڈل کیجئے' کے الفاظ چھپے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں لکھا تھا۔ لکڑی کی کئی پیٹیاں تو غیر معمولی طور پر بڑی تھیں اور ٹین کی پٹیوں کی مدد سے بڑی مضبوطی سے بند تھیں۔ اسی کمرے میں ایک طرف مجھے اوپر نیچے چار جنریٹر رکھے نظر آئے..... لیکن وہ چل نہیں رہے تھے۔ شاید وہ فاضل تھے۔

ان کے قریب ہی کھُردری لکڑی کی دس پیٹیاں رکھی تھیں۔ وہ بظاہر پھلوں کی پیٹیوں سے مشابہ تھیں لیکن ان سے کچھ بڑی اور بستر کوالٹی کی نظر آ رہی تھیں۔ وہ بالکل نئی معلوم ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایک کا اوپر کا تختہ کھولا جا چکا تھا اور وہ اس کے اوپر ہی رکھا تھا۔ اس طرف سے کاغذ کی کترن بھی جھانک رہی تھی۔ ان پیٹیوں پر نہ تو کوئی نشان تھا اور نہ ہی کچھ لکھا ہوا تھا تاہم وہ بالکل عام اور بے ضرر سی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایسی پیٹیاں بہت سی چیزوں کی نقل و حمل میں استعمال ہوتی تھیں۔

طاہر شاہ کھلی پیٹی کے پاس جا رکا۔ اکھڑا ہوا تختہ نیچے رکھ کر اس نے کترن میں ہاتھ مارا اور پولیتھین کے موٹے تھیلے میں لپٹی ہوئی ایک سیاہ نکلا شکوف نکالی۔ اسے تھیلے سے نکالتے ہوئے وہ بولا "باقی کنوں کی معمولی سی اسمگلنگ ہوتی ہے۔ میں نے صرف یہ ایک ہی گن جوڑی تھی۔"

"آزما کر بھی دیکھی ہوگی؟" تیموخان نے ملائمت سے پوچھا۔

"ہاں" طاہر شاہ قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا "تبھی تو اندازہ ہوا ہے کہ یہ ماڈل اس سے بہتر ہے جو ہمارے زیادہ استعمال میں رہا ہے۔"

سیاہ اسٹیل کی گنیں..... خصوصاً جب وہ نئی ہوتی ہیں تو خاصی خوبصورت دکھائی دیتی ہیں لیکن اگر انہیں ذرا غور سے دیکھا جائے تو ان میں ایک عجیب خوفناک سی بدصورتی نمایاں ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ شاید یہ موت کی بدصورتی ہوتی ہے۔

میں اپنے ملک میں مختلف جگہوں پر اور مختلف موقعوں پر مختلف اتفاقات کے تحت جس طرح اسلحے کی ریل پیل دیکھ رہا تھا اور جیسی جیسی باتیں سننے میں آ رہی تھیں یا پہلے سے میرے علم میں تھیں، ان سے کچھ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہماری آدھی قوم حالتِ جنگ میں تھی..... لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر یہ جنگ کس کے خلاف تھی؟ کیا باقی آدھی قوم کے خلاف تھی؟

ایسا لگتا تھا جیسے ہر جگہ کسی نہ کسی روپ میں، کسی نہ کسی بہانے سے، کسی نہ کسی جواز کے ساتھ چھوٹی چھوٹی متوازی فوج تیار ہو رہی تھی۔ کہیں یہ فوج ڈاکوؤں کی صورت میں تھی، کہیں بڑے بڑے لوگوں کی ذاتی اور نجی فورس کی صورت میں..... کہیں ان کے محافظوں کی صورت میں..... کہیں قبیلوں کی صورت میں..... کہیں سیاسی پارٹیوں کے کسی ونگ کی صورت میں..... کہیں ڈرگ مافیا کی صورت میں..... کہیں بدمعاشوں کے گروہوں کی صورت میں۔

یہ سب چھوٹی چھوٹی فوجیں نہایت منظم تھیں اور حیرت انگیز حد تک اپنے آپ کو مسلح کر چکی تھیں۔ کبھی کبھی میں گہرائی میں جا کر سوچتا تھا تو تشویش سے میری راتوں کی نیند حرام ہونے لگتی تھی کہ آخر یہ بڑے بڑے مسلح جتھے ملک کو کہاں لے جانا چاہتے تھے؟ ان کی موجودگی کا جواز کیا تھا؟ انہیں اس قدر منظم اور مسلح ہونے کی ضرورت کیا تھی؟

ایک آزاد ملک میں، اپنے ہی بھائیوں اور ہم وطنوں میں رہتے ہوئے یہ جتھے کیوں زیادہ سے زیادہ اسلحہ جمع کرنے کی دوڑ میں لگے ہوئے تھے؟ یہ صرف اپنے اعمال کا خوف تھا یا کچھ اور مقاصد کی تیاریاں تھیں؟ اربابِ اختیار نے کیوں اس طرف سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں؟ آخر ہمارے ہاں قانون اس وقت ہی کیوں حرکت میں آتا تھا جب پانی سر سے گزر جاتا تھا؟ بلکہ صحیح معنوں میں تو اس وقت بھی حرکت میں نہیں آتا تھا..... اکھڑے لولے انداز میں دو چار قدم اٹھا کر رہ جاتا تھا۔

ادھر ان جتھوں کا جذبہ اور جوش و خروش دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان پر کسی نادیدہ دشمن ملک نے خدانخواستہ تسلط جما رکھا ہو، انہیں اپنا غلام بنا رکھا ہو اور وہ بڑے زبردست جذبۂ جہاد کے ساتھ غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لیے نہایت اعلیٰ درجے کے حُریت پسندوں کی طرح گوریلا جنگ میں مصروف ہوں یا پھر اس کی تیاریاں کر رہے ہوں۔ آخر یہ سب کیا مذاق تھا؟ ملک کے چپے چپے میں پھیلتے ہوئے یہ جتھے کیا کسی کی نظر میں کوئی مسئلہ نہیں تھے؟ آخر یہ سیلاب کہاں جا کر رکے گا؟ اسلحہ تیار کرنے والوں کو تو صرف منڈیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا ہم صرف منڈی بننے اور جنازے اٹھانے کے لیے رہ گئے تھے؟

طاہر شاہ اسلحے کے کسی سیلزمین کے سے انداز میں تیموخان کو بتا رہا تھا "یہ ماڈل صرف ہلکی مشین گن کے طور پر استعمال نہیں ہوتا، یہ رائفل کا کام بھی دے سکتا ہے۔ بڑی اچھی چیز بنائی ہے کمبختوں نے۔ اس میں چار قسم کی گولیاں استعمال ہو سکتی ہیں۔ ایک تو کم رینج کی گولیاں ہوتی ہیں جو قریب کے دشمن کے پرخچے اڑانے کے علاوہ راستے کی رکاوٹیں دور کرنے کے بھی کام آتی ہیں۔" پھر اس نے وضاحت کی "ان گولیوں کا اگر آپ ایک ہی لیول پر برسٹ ماریں تو وہ درخت کو کاٹ کر گرا سکتی ہیں۔ لوہے کے گیٹ وغیرہ توڑ سکتی ہیں۔ دوسری قسم کی گولیاں لمبی رینج کے لیے ہوتی ہیں۔ دور کے دشمن سے مقابلے کے لیے۔ تیسری قسم کی گولیاں تباہی پھیلانے کے ساتھ ساتھ زبردست قسم کی آواز بھی پیدا کرتی ہیں جسے سن کر اچھے بھلے سورماؤں کے دل بھی دہل جاتے ہیں....."

وہ استہزائیہ سے انداز میں مسکرایا "سنا ہے پولیس والوں کو بھگانے کے لیے تو وہ آواز ہی کافی ثابت ہو رہی ہے۔ چوتھی قسم کی گولیاں میں نے آزما کر تو نہیں دیکھیں لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ بھی بڑی ٹھیک ٹھاک اور کارآمد ہیں۔ وہ بورنگ والی ٹیکنیک سے نکلتی ہیں یعنی برمے کی طرح گھومتی ہوئی جاتی ہیں اور بڑی موٹی موٹی ٹھوس رکاوٹوں سے بھی گزر جاتی ہیں۔"

طاہر شاہ نے یہ سب کچھ بتا کر داد طلب سی نظروں سے تیموخان کی طرف دیکھا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ گن اسی نے ایجاد کی ہو اور درحقیقت وہ ایک مہلک ہتھیار نہیں بلکہ بنی نوعِ انسان کے لیے بہت ہی فائدہ مند قسم کی سائنسی ایجاد ہو۔

"چیز تو واقعی کام کی ہے۔" تیموخان گن کو الٹتے پلٹتے ہوئے بولا "اپنے جانو کو نئی نئی چیزوں کی فوراً خبر ہو جاتی ہے اور وہ انہیں منگوانے میں بھی ذرا دیر نہیں کرتا۔ جس طرح دولت کماتا ہے اسی طرح خرچ بھی کرتا ہے۔ اس کی عقل کا کوئی جواب نہیں۔"

"اسی لیے تو وہ سردار ہے۔" طاہر شاہ متانت سے بولا۔ وہ اپنے لہجے اور انداز سے گفتگو سے پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا لیکن جہاں وہ موجود تھا اور جو کچھ کر رہا تھا اسے دیکھ کر فی الحال میں صرف حیران

ہی ہو سکتا تھا۔

نمیسو خان گن کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد گویا مطمئن ہو کر طاہر شاہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے۔ فی الحال تو اسے رکھو اور اس پیٹی کو بھی پیک کردو۔ میں جانو کو بتادوں گا کہ مال آگیا ہے۔ وہ خود ہی منگوانے کا بندوبست کرلے گا۔ ان کے ساتھ ایمونیشن تو ٹھیک ٹھاک آیا ہے نا؟"

"تین پیٹیاں ہیں۔" طاہر شاہ مطمئن لہجے میں بولا "اب تو ویسے بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آدمی جو ایسا مل گیا ہے۔ ادھر پیسے دو اور دوسرے دن ڈیلیوری لے لو۔"

"بہت اچھے۔ بہت اچھے۔ جانو زندہ باد۔" نمیسو نے چھت کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ طاہر شاہ نے مسکراتے ہوئے گن پیٹی میں واپس رکھ دی اور ہم دوبارہ کاؤنٹر کے پیچھے آگئے۔

طاہر شاہ جس شخص کو اپنی جگہ پر کھڑا کر کے گیا تھا وہ نہایت انہماک سے گلاس صاف کر کے ایک ٹرے میں سجا رہا تھا۔ وہ ہماری طرف نظر اٹھا کر دیکھے بغیر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے یقیناً اپنے ہاتھ کی رسائی میں موجود رقم کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ کچن میں چلا گیا۔ ہم اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

طاہر شاہ نے نوٹوں کی گڈیاں کاؤنٹر کے نیچے سے نکال کر ترتیب سے ایک اخبار پر رکھنی شروع کیں۔ سلیقے سے سب گڈیاں کم سے کم جگہ میں رکھنے کے بعد اس نے پیکٹ بنایا اور اس پر اچھی طرح ڈوری لپیٹی۔ یہ پیکٹ اس نے ایک شاپنگ بیگ میں ڈال کر اسے گرہ لگائی اور نمیسو خان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "پانچ لاکھ ہیں۔"

نمیسو خان نے مطمئن انداز میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور پیکٹ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ مسکتی بیزی بے پروائی سے اپنی آہنی انگلیوں سے مسل کر پھینکتے ہوئے بولا "ابھی اسے یہیں رکھو۔ میں ذرا جانِ تمنا سے تو مل آؤں۔"

'جانِ تمنا' اس نے نہایت معنی خیز انداز میں کہا تھا۔ تاہم دونوں کے چہروں پر سنجیدگی ہی طاری رہی تھی۔ طاہر شاہ نے رقم کا بنڈل اٹھا کر کاؤنٹر کے نیچے رکھ دیا پھر وہ جیب سے ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر نمیسو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "اس پر حساب ہے۔ آپ چیک کرلیں۔"

نمیسو خان کاغذ کھول کر دیکھے بغیر اس کا ہاتھ پیچھے دھکیلتے ہوئے بولا "اسے اپنے پاس ہی رکھو۔ تم اب ان لوگوں میں سے ہو جن سے حساب لیا جاتا ہے' اپنی ایمانداری کی وجہ سے تم نے بہت جلدی ہم لوگوں کی نظر میں بڑا مقام بنالیا ہے۔ ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔"

"آپ لوگوں کی مہربانی ہے۔" طاہر شاہ عجیب سے انداز میں بولا "ایماندار کی قدر وان ملے بھی تو کہاں ملے۔ میں باہر ہوں میں انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا تھا۔"

نمیسو خان نے گونجیلا سا قہقہہ لگایا اور فضا میں ارتعاش سا پیدا ہوگیا۔ تاہم وہ طاہر شاہ کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اٹھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا "آؤ تم کچھ دیر ہال میں لوگوں کے درمیان بیٹھو، کچھ پیو پلاؤ' کسی محبوب مشغلے کے ساتھ اچھا وقت گزارو، گپ شپ کرو۔ تمہارا کچھ خرچ نہیں ہوگا۔"

میں اٹھ کر اس کے ساتھ ہال میں آگیا۔ یہاں اب بہت سے مردوں اور عورتوں کا اضافہ ہوگیا تھا۔ باتوں کی بھنبھناہٹ اور مترنم و مخمور قہقہوں کی کھنکھناہٹ کچھ بڑھ گئی تھی۔

ایک میز پر ایک لڑکی تنہا بیٹھی تھی۔ بنیادی طور پر وہ دیہاتی معلوم ہوتی تھی لیکن شہری سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ اس کے گھنے سیاہ گھنگریالے بالوں کی لٹیں بے ترتیبی سے اس کے کندھوں اور کمر پر پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کی رنگت چنبیلی جیسی تھی اور اس میں موم کی سی دھندلی چمک تھی جیسے وہ دھوپ اور روشنی میں بہت کم جاتی ہو۔ اپنی رنگت کی اس خفیف سی زردی کے باعث وہ کچھ بیمار بیمار سی لگ رہی تھی۔

اس کی موٹی موٹی آنکھیں بھی خوبصورت تھیں لیکن ان آنکھوں میں ہلکی سی نمی اور گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی جس کے دھوئیں کی بو بتا رہی تھی کہ سگریٹ سادہ نہیں تھی۔ وہ ڈھیلے ڈھالے سوتی لباس میں تھی مگر اس کے جسم کا خزانہ جو نہ جانے کب سے لٹ رہا تھا' اس بے چارے چند گز کپڑے سے سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔

وہ لڑکی بیٹھی تو اس ہال میں تھی لیکن اس کا ذہن نہ جانے کہاں تھا۔ لمبی لمبی پلکیں اٹھا کر اس نے بے پروائی سے ہماری طرف دیکھا۔

"تم اس کے پاس بیٹھو۔" نمیسو نے گویا مجھے بہت اہم مشورہ دیا۔ "اس کا نام نوری ہے لیکن یہ وہ نوری نہیں ہے جس سے جام تماچی نے عشق کیا تھا۔ وہ بڑی شریف نوری تھی۔ یہ ذرا دوسری طرح کی نوری ہے۔ یہ شہر جا کر نورین بن گئی ہے۔ بڑے غضب کی عورت ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اس دیہاتی لڑکی کے سامنے سفید چمڑی والی میمیں بھی کچھ نہیں۔ میں کسی اور سے ملنے جارہا ہوں ورنہ میں خود اس کی قربت کی چھاؤں میں بیٹھنا پسند کرتا۔"

اس کی بات سن کر بھی لڑکی کا چہرہ سپاٹ ہی رہا.... پھر وہ بے پروائی سے دوسری طرف دیکھ کر سگریٹ کا کش لینے لگی۔ نمیسو خان نے میرا کندھا دباتے ہوئے مجھے اس کے مقابل بٹھادیا۔ اس نے اپنی بھوکی نظریں گویا بہ مشکل لڑکی کے وجود سے ہٹائیں اور ایک آنکھ دبا کر مسکراتے ہوئے بولا "میرا آئے گا' جو کچھ کھا' پیتا ہو' بے دھڑک منگالینا۔ زندگی موت کا کچھ پتا نہیں۔ جو موقع میسر آتا ہے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤ۔"

میں نے ہچکچاہٹ آمیز سے انداز میں بیٹھ کر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا "میں تو صرف کولڈ ڈرنک پیوں گا۔"

"زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔" نمیسو نے جانے کیوں ایک بار پھر جتایا۔ شاید یہی ان کا فلسفۂ حیات تھا۔ "جو بھی کچھ میسر ہو' سمیٹ لینا چاہیے۔ کہیں بعد میں صرف پچھتاوا نہ رہ جائے۔" ایسا لگتا تھا کہ صرف ڈاکوؤں کا ہی نہیں بلکہ ملک کی اسی فیصد آبادی کا نظریۂ حیات آج کل یہی ہوگیا تھا جو نمیسو خان کہہ رہا تھا۔

"میں نے اب کسی بھی بات پر پچھتانا چھوڑ دیا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تب لڑکی نے نہایت آہستگی سے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی کچھ گہری ہوچکی تھی۔ اس میں شاید کچھ شکستہ خوابوں کے خون کی سرخی بھی شامل تھی۔ اس کی سگریٹ تقریباً ختم ہوچکی تھی مگر وہ اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔ کسی نہ کسی طرح اس سے زیادہ سے زیادہ تسکین کشید کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

نمیسو خان نے ہاتھ ہلایا اور دائیں طرف والی کمروں کی قطار کی طرف چل دیا۔ ایک ستون کے قریب بیرا ٹائپ ایک شخص کھڑا عقابی نظروں سے ہال کا جائزہ لے رہا تھا۔ نمیسو اس کے سامنے جا رکا۔ اس نے ذرا چونک کر نمیسو کو دیکھا اور ہڑبڑا کر یک دم مؤدب سا ہوگیا۔ نمیسو نے اس سے کچھ پوچھا۔ اس شخص نے ایک کمرے کے بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

نمیسو خان نے جا کر اس کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور میں نے ایک گوری چٹی قد آور' خوبصورت عورت کی جھلک دیکھی۔ وہ شاید نیند سے اٹھی تھی۔ اس کے بھورے بال منتشر تھے اور وہ گلابی رنگ کی ایک خوبصورت نائٹی میں تھی۔ یہ سب نظارے میرے لیے خاصے حیران کن تھے۔ میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس ویرانے میں' زیرِ زمین مجھے یہ سب کچھ دیکھنے کو ملے گا۔

عورت' نمیسو کو دیکھ کر تھکے تھکے سے انداز میں مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں تھکن کے علاوہ شاید مجبوری بھی شامل تھی۔ نمیسو خان نپے تلے انداز میں قدم اٹھاتا' مونچھ کو بل دیتا کمرے میں داخل ہوگیا اور کمرے کا دروازہ دوبارہ بند ہوگیا۔ میں نے زندگی میں بہت سے بھاری بھرکم افراد دیکھے تھے لیکن ان کے چلنے سے زمین میں دھمک محسوس نہیں ہوتی تھی..... جبکہ نمیسو خان کچھ ایسا گرانڈیل بھی نہیں تھا لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ جب وہ اپنے مخصوص نپے تلے انداز میں قدم اٹھاتا تھا تو زمین میں ہلکی سی دھمک ہوتی تھی۔ لگتا کچھ ایسا تھا جیسے اس کا ابلیسی سا وجود ٹھوس لوہے سے بنا ہوا تھا۔

چند لمحے تک اس کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد میں نے گردن سیدھی کی اور یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ لڑکی نے بالآخر سگریٹ کے اس ٹوٹے کا پیچھا چھوڑ دیا تھا جس کی لمبائی بہ مشکل ایک چوتھائی رہ گئی تھی۔ اگر وہ اب بھی اس سے سرور کشید کرنے کی کوششوں میں لگی رہتی تو شاید کچھ چنگاریاں ہی اس کی انگلیوں اور ہونٹوں کو جلاتی ہوئی اس کے حلق میں جاتیں۔

وہ انگلیاں ایک دوسری میں پھنسائے کہنیاں میز پر ٹکائے ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ گول مٹول اور کلائیاں سڈول تھیں۔ ایک کلائی میں چاندی کا ایک ڈھیلا سا کنگن اٹکا ہوا تھا۔

"تو تمہارا نام نوری ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ درحقیقت میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کیا بات کروں۔

اس نے نہایت آہستگی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور جیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی "نوری نہیں' نورین.... نوری تو مدت ہوئی مرچکی ہے۔"

اسی اثنا میں وہ بیرا نما شخصیت ہماری طرف آتی دکھائی دی جس سے چند لمحے پہلے نمیسو خان نے بات کی تھی۔ نورین گویا کسی اور ہی دنیا سے واپس آتے ہوئے سر جھٹک کر مشینی سے انداز میں بولی۔ "ہاں... بولو... کیا کھیلوگے.... کیا کھاؤ گے' کیا پیو گے....؟ یا پھر ادھر چلنا ہے؟" اس نے کمروں کی طرف اشارہ کیا۔

"میں غریب سا آدمی ہوں۔" میں نے اپنے لہجے سے مسکینی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔ "کھیلنے کھانے' پینے پلانے اور اس قسم کے کمروں کی طرف جانے کے شغل میری بساط سے باہر ہیں۔"

"تمہیں نمیسو خان یہاں بٹھا کر گیا ہے۔ تم اس وقت اپنے آپ کو بادشاہ سمجھو۔" وہ استہزائیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "تمہیں اپنی جیب اور اپنی حیثیت کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف حکم کرو' ہر چیز اس میز پر پہنچ جائے گی۔ اور میں تو یہاں پہلے سے ہی موجود ہوں۔" اس نے اپنے سراپا کی طرف اشارہ کیا۔ پھر ذرا توقف سے بولی "ویسے اتنی انکساری کی ضرورت نہیں۔ غریب آدمی کا بھلا یہاں کیا کام؟ یہ بہت مہنگی جگہ ہے۔"

اسی اثنا میں بیرا مؤدبانہ انداز میں ہماری میز کے قریب آکھڑا ہوا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کے تمام تر مؤدبانہ انداز کے باوجود اسے صرف بیرا سمجھنا ذرا مشکل تھا۔ یقیناً وہ اور اس جیسے دوسرے تین چار افراد صرف بیرے نہیں تھے۔ ضرورت پڑنے پر محافظ یا لڑاکے بھی بن جاتے ہوں گے۔

"میرے لیے صرف کولڈ ڈرنک لے آؤ۔ ان خاتون کی مرضی انہی سے پوچھ لو۔" میں نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

لڑکی نے بیزاری سے ہاتھ ہلا کر بیرے کو جانے کا اشارہ کردیا۔ میز پر اس کا پرس رکھا تھا۔ اس نے پرس کھول کر سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا اور نئی سگریٹ سلگا کر ندیدے انداز میں طویل کش لے کر دھواں میرے چہرے پر اگل دیا۔

میں نے ناگواری محسوس کرتے ہوئے سانس روک لی۔ اس

پکٹ میں شاید ساری سگریٹس پہلے ہی سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ عام سگریٹیں نہیں تھیں۔ کثیف اور بدبودار دھواں ہوا میں تحلیل ہوگیا تو میں نے دھیرے سے سانس لی۔

لڑکی نے ایک بار پھر گویا تصدیق چاہی "تمہیں کچھ پینا پلانا بھی نہیں ہے.... کھیلنا بھی نہیں ہے.... وہاں بھی نہیں جانا ہے۔" اس نے انگوٹھے سے کمروں کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں۔ یہ میرے شغل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ مشینی سے انداز و اطوار اختیار کرنا میری عادت نہیں ہے۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"تم تو بہت ہی بیکار آدمی ہو۔ یہاں کس لیے آئے ہو.... جھک مارنے؟" اس نے جھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

زندگی کی حقیقتیں بڑی تلخ ہوتی ہیں۔ اگر ہم دونوں کسی افسانے کے کردار ہوتے تو وہ میری سادگی اور تعیشات سے میری بے نیازی دیکھ کر یقیناً بہت متاثر ہوتی۔ میں اس بھیڑ میں اسے ایک منفرد اور الگ تھلگ شخص نظر آتا اور وہ بڑے اشتیاق سے پوچھتی "آپ کون ہیں.... کہاں سے آئے ہیں.... آپ اب تک کہاں تھے....؟" وغیرہ وغیرہ۔

پھر اس پہلی ہی ملاقات میں' میں اس کے من مندر کا دیوتا بن جاتا.... لیکن حقیقی زندگی کے رنگ ڈھنگ کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ افسانہ آپ کے خوابوں کا دوسرا نام ہے۔ جبکہ حقیقی زندگی میں آپ کے خواب قدم قدم پر ٹوٹتے ہیں۔

نورین شاید انفرادیت' شرافت اور سادگی میں دلچسپی لینے کی حد سے بھی گزر چکی تھی۔ اس کی عمر کچھ ایسی زیادہ نہیں تھی لیکن شاید اس نے زندگی کو ہر پہلو سے برت لیا تھا اور ہر چیز سے اس کا اعتبار اٹھ چکا تھا "دو اور دو چار" کے علاوہ سب باتیں اس کے لیے بے معنی ہو چکی تھیں۔

یہاں کے ماحول نے میرے ذہن میں بے شمار اندیشوں' پُرپیچ سوالوں اور نہ جانے کیسے اُلجھے اُلجھے خیالات کی چبھن پیدا کر دی تھی۔ اس چبھن سے نجات کے لیے میں نے گفتگو کے دامن میں پناہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔

"تم کون ہو.... اور اس جگہ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" میں نے ملامت سے پوچھا۔

"سوالات کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔" اس نے قطعی رُکھائی سے کہا "اس چار دیواری میں سوالات کرنا سخت منع ہے۔ خصوصاً غیر ضروری سوالات۔ سوالات کرنے والے عموماً بے وقوف ہوتے ہیں۔ عقلمند لوگ سوال کیے بغیر سب کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

ایک لمحے کے لیے میں دم بخود سا رہ گیا۔ پھر میں نے قدرے حیرت اور تاسف سے کہا "میں نے جو کچھ پوچھا کیا وہ غیر ضروری تھا؟"

"بالکل۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی "مجھے بھی تو دیکھو۔ میں نے تمہارا نام تک نہیں پوچھا۔ میں تمہارے متعلق کچھ بھی نہیں جاننا چاہتی۔ پوچھنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ ہم ایک دوسرے کے لیے ایسے ہی ہیں جیسے ٹرین میں بیٹھا ہوا مسافر اور راستے میں پڑی درخت کے قریب کھڑا ایک درخت۔ شاید تم زندگی کی تیز رفتار ٹرین میں بیٹھے مسافر ہو اور میں باہر کھڑا درخت۔ یا پھر میں مسافر ہوں اور تم درخت.... بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قابلِ غور بات صرف یہ ہے کہ ہم صرف ایک پل کے لیے ایک دوسرے کے سامنے آئیں گے اور پھر ایک دوسرے کی نظر سے اوجھل ہو جائیں گے۔ تو پھر سوالوں میں اُلجھنے کی ضرورت کیا ہے؟ ٹرین میں بیٹھے مسافر درختوں سے یا درخت' مسافروں سے ان کے نام نہیں پوچھتے' ان کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔"

زندگی بعض لوگوں کے لیے بڑا سفاک استاد ثابت ہوتی ہے' بہت کم وقت میں انہیں جانے کیا کچھ سکھا جاتی ہے۔ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹ کچھ پیلے سے نظر آنے لگے۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی۔ "اگر تمہارا خیال ہے کہ میں نشے میں ہوں' اس لیے کچھ سوالوں کے جواب دے جاؤں گی.... تو تم غلطی پر ہو۔ میں نشے میں اور خواہ کچھ بھی کر گزروں لیکن سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔"

پھر وہ بیزاری آمیز سے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا اٹھنا بہرحال قیامت تھا۔ ایک لمحے کے لیے دل بے ایمان ہوا کہ میں بھی اس کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہو جاؤں لیکن اسی ایک بے عنوان سی احتیاط نے دامن تھام لیا کہ یہ گھڑیاں کچھ ایسی سنہری بھی نہیں تھیں۔

وہ اپنا پرس اٹھاتے ہوئے صحیح طور پر میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ "لگتا یہی ہے کہ تم اِدھر اُدھر کی باتوں کے علاوہ کچھ نہیں کرو گے۔ بالکل بیکار آدمی ہو تم۔"

وہ ایک ہاتھ میز پر رکھ کر ذرا جھکی اور نیچی آواز میں بولی۔ "میں بے شک سُست نظر آتی ہوں لیکن میں اتنی سُست نہیں ہوں۔ میں زندگی کے راستے پر بہت تیز چل رہی ہوں۔ بہت جلدی میں ہوں۔ جوانی بہت تیزی سے میری مٹھی سے نکلتی جا رہی ہے اور میرے لیے اس کا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہے۔ تم آرام سے بیٹھ کر کھیاں مارو۔ خدا حافظ۔"

وہ چلی تو اس کا انگ انگ گویا ہوا میں ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ غالباً خاصی دور کسی میز پر جا بیٹھی لیکن وہ میز مجھے وہاں سے صحیح طور پر نظر نہیں آ رہی تھی جہاں میں بیٹھا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جہاں میں اپنا سامنہ لیے بیٹھا رہ گیا تھا۔

خاصی دیر تک میں یونہی ہونقوں کی طرح بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ بیرا میرے سامنے کولڈ ڈرنک کی بوتل رکھ کر چلا گیا۔ اردگرد اب بیشتر

میزیں بھر چکی تھیں۔ سب اپنے اپنے شغل میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں نوجوان' ادھیڑ عمر اور بوڑھے سبھی تھے۔ ان میں سے کوئی کبھی کبھار گردن گھما کر میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ ان کی نظریں بتاتی تھیں کہ انہیں یہاں میرے اجنبی ہونے کا احساس تھا۔ کمروں میں بھی مزید چند لوگوں کی آمد و رفت نظر آئی تھی۔ کچھ مزید مہ رخوں کی موجودگی کا بھی علم ہوا۔ وہاں ہر طرح کی عیاشیوں کا سامان خاصے وسیع پیمانے پر موجود تھا۔ کیا ستم ظریفی تھی۔ شہروں میں قحبہ خانوں' قمار خانوں اور نائٹ کلبوں پر پابندی تھی لیکن جنگل میں ان سب کا کمپیوز موجود تھا۔

میز پر دو دن پرانا ایک غیر معروف سا علاقائی اخبار پڑا تھا۔ کم از کم میرے لیے وہ غیر معروف ہی تھا۔ میں نے اپنے آپ کو قدرے مضطرب محسوس کرتے ہوئے اس کی اوٹ میں پناہ لے لی۔ پہلے اور آخری صفحے پر اسی قسم کی خبریں تھیں جو برسوں سے چھپ رہی تھیں۔ بڑے لوگوں کے بیانات' فلاں کو فلاں غلط کام کی اجازت نہیں دی جائے گی اور فلاں کی منفی سرگرمیاں برداشت نہیں کی جائیں گی۔ ڈاکوؤں اور دہشت گردوں سے آہنی ہاتھ سے نمٹا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب کچھ میں ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کے خوبصورت' پُرسکون اور محفوظ ٹھکانے پر بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ آہنی ہاتھ نہ جانے کہاں تھا اور کون سے ریشمی غلافوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں اس ستم ظریفانہ صورتِ حال پر ہنسنا چاہتا تھا لیکن سینے میں صرف ایک ٹیس سی محسوس کر کے رہ گیا۔

کولڈ ڈرنک ختم کرنے کے بعد میں اطمینان سے اندرونی صفحات پر نظر دوڑانے لگا کیونکہ نعیم خان کی واپسی کے فی الحال آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ دفعتاً صفحے کے وسط میں چوطرفہ حاشیے میں چھپی ہوئی ایک تصویر پر میری نظر جم کر رہ گئی۔ بظاہر وہ ایک عام سا گروپ فوٹو تھا۔ نچلے ٹکڑے کے کسی کنبے کا گروپ فوٹو لیکن اس میں کوئی غیر معمولی بات ضرور تھی۔

اس اخبار کی چھپائی وغیرہ کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن عجیب اتفاق تھا کہ وہ تصویر نہایت صاف' واضح اور نمایاں چھپی ہوئی تھی۔

تصویر میں دائیں ہاتھ پر ایک باریش بوڑھا تھا۔ اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ اس نے زندگی فقر و فاقے اور تنگدستی میں گزاری تھی لیکن قناعت اور شکر گزاری اس کی فطرت میں شامل رہی تھی مگر شاید اب وہ شکر گزاری اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی' رخصت ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ان گنت بددُعائیں تھیں۔ وہ گویا کیمرے کی آنکھ کی طرف نہیں' پوری دنیا کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں پوری دنیا کے لیے نفرت تھی۔

اس کے قریب ہی ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی جس کا چہرہ دوپٹے کے حلقے سے گھرا ہوا تھا۔ وہ ایک خوبصورت اور معصوم لڑکی تھی۔ وہ شاید تصویر کھنچوانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ اس کا ایک ہاتھ مضطربانہ انداز میں اس کے کندھے تک پہنچا ہوا تھا جہاں اس نے اپنے دوپٹے کا ایک حصہ مٹھی میں جکڑا ہوا تھا۔ اسی ہچکچاہٹ اور اضطراب کے عالم میں کیمرے کی آنکھ نے اس کا عکس قید کر لیا تھا۔

مجھے کچھ دیر بعد اندازہ ہوا کہ اس کی ہچکچاہٹ کی وجہ غالباً یہ نہیں تھی کہ وہ بہت شرمیلی تھی بلکہ شاید اس کی عزتِ نفس اسے ڈسنے لگی تھی کہ اخبار میں اس کی تصویر آئے گی تو اس کی بے بسی' ناداری اور کسمپرسی یا اس کا نجی مسئلہ دنیا کے لیے ایک تماشا بنے گا۔ لوگ اس پر ترس کھائیں گے اور کچھ شاید اس کی محرومیوں سے بھی لذت اندوز ہوں گے۔ اس کی بڑی بڑی' وحشی آنکھوں میں اتھاہ غم بھی تھا' خجالت بھی اور شرمندگی بھی۔

لڑکی کے برابر دو چھوٹے چھوٹے بچے بیٹھے تھے۔ ان کی عمروں میں شاید ایک ڈیڑھ سال کا ہی فرق تھا۔ دونوں بچوں کے ہاتھ گود میں تھے اور وہ گردنیں ذرا ترچھی کیے معصوم اور حیران آنکھوں سے کیمرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی تمام تر کم عمری' معصومیت اور حیرانی کے باوجود ایک تاثر ان کے چہروں پر بھی نمایاں تھا.... اور وہ تھا کوئی چیز چھن جانے کا تاثر۔ وہ محروم اور مظلوم بچوں کے چہرے تھے۔

ان کے پیچھے ایک فربہی مائل عورت سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ بھی دوپٹے کے حلقے میں گھرا ہوا تھا۔ سر جھکا ہونے کی وجہ سے چہرہ صحیح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن جتنا بھی نظر آ رہا تھا' اس پُر حزن و ملال اور رنج و شکستگی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس کے وجود پر شاید افسردہ سوچوں کا بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ اس سے سر اٹھائے نہیں اٹھ رہا تھا۔

گروپ فوٹوز میں عموماً چہرے اتنے واضح نظر نہیں آتے کہ ان کے پیچھے چھپے جذبوں کی کہانیاں پڑھی جا سکیں لیکن ایک تو اس گروپ فوٹو میں زیادہ افراد نہیں تھے' دوسرے اسے نمایاں کر کے چھاپا گیا تھا۔ شاید اس روز اخبار کے پاس فلیش کرنے کے لیے اس سے زیادہ اہم کوئی' اسٹوری' نہیں تھی۔ ان چہروں کے بارے میں جو تاثر میں نے لیا تھا وہ بھی درحقیقت اسی وقت گہرا ہوا تھا جب میں نے اس تصویر سے متعلق تفصیلی خبر پڑھی تھی۔

جامی نگرنامی چھوٹے سے قصبے سے نامہ نگار نے بڑے دل نشین انداز میں کہانی بنا کر بھیجی تھی۔ اس میں' خبریت' کم تھی اور جذبات نگاری زیادہ.... لیکن یہ حقیقی جذبات نگاری تھی.... اس میں کوئی انوکھی یا انہونی بات نہیں تھی۔ جن پر ایسے واقعات گزرتے ہیں' ان کا عالم عموماً یہی ہوتا ہے۔

وہ اخبار بے شک چھوٹا تھا اور اس واقعے کا تعلق بھی ایک قصبے سے تھا لیکن اس نامعلوم نامہ نگار کو یقیناً قلم سے اُنسیت تھی' ان کرداروں سے کچھ وابستگی تھی۔ لکھنے کا کچھ نہ کچھ سلیقہ تھا یا پھر شاید بات صرف اتنی تھی کہ اس کا احساس زندہ تھا اور اس نے

اس کنبے کا احوال لکھتے وقت صرف اخلاص سے کام لیا تھا۔ اس لیے اس تحریر اور تصویر میں اتنی تاثیر پیدا ہوگئی تھی کہ میں بار بار سب کچھ پڑھے جا رہا تھا' بار بار تصویر کو دیکھے جا رہا تھا۔ ورنہ اس سفاک دنیا کے نقطۂ نظر سے بات کچھ اتنی بڑی بھی نہیں تھی۔ آپ آئے دن اخبارات میں نہایت اختصار سے ایسے واقعات پڑھتے رہتے ہیں۔

یہ ڈکیتی کی اسی واردات کا شاخسانہ تھا جس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا مگر جس نے فی الحال مجھے زندگی کی ایک عجیب ہی ڈگر پر ڈال دیا تھا۔ ہائی وے پر بسیں لوٹے جانے کی یہ وہی واردات تھی جس میں جانو کے گروہ کے ساتھ روحیل خان بھی شامل تھا۔ اخبار میں جس کنبے کی تصویر تھی وہ ایک بس کے کنڈیکٹر کا تھا جو عینی شاہدوں کے مطابق ایک سیاہ پوش ڈاکو کی گولیوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ وہ سیاہ پوش ڈاکو سیاہ رنگ ہی کے گھوڑے پر سوار تھا۔ سب سے زیادہ فائرنگ اسی نے کی تھی اور اسی کے ہاتھوں سب سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ ڈاکو روحیل خان ہی تھا لیکن یہ بات صرف چند افراد ہی کو معلوم تھی۔

نامہ نگار نے اس خبر میں یہی بتایا تھا کہ کنڈیکٹر کے قتل کے بعد اس کے لواحقین اور پسماندگان پر کیا گزر رہی تھی۔ تصویر میں جو بوڑھا نظر آرہا تھا وہ مقتول کنڈیکٹر کا باپ تھا۔ کنڈیکٹر اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور گھر کا واحد کفیل تھا۔ کئی سال بیروزگار رہنے کے بعد اسے چند ماہ پہلے ہی نوکری ملی تھی اور بدحال کنبے کی ساری توقعات اسی سے وابستہ ہوگئیں تھیں کہ اب وہ جوان بہن کے ہاتھ پیلے کرے گا' اپنے بچوں کو اسکول میں داخل کرائے گا اور اپنی بیوی کے وہ چند زیورات بھی بنوائے گا جو اس کی بیکاری کے دوران بک گئے تھے۔

بڑے میاں کے برابر بیٹھی ہوئی وحشی آنکھوں والی لڑکی کنڈیکٹر کی بہن تھی جس کے چہرے پر امیدوں کی پرچھائیاں دم توڑ چکی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ اس کا بھائی زندہ رہتا تب بھی اس کی ڈولی رخصت نہ کرپاتا۔ آخر وہ ایک بس کنڈیکٹر ہی تو تھا۔ کس کس کی مُرادیں' کس کس کے ارمان پورے کرسکتا تھا..... لیکن گھر میں کم از کم ایک فرد بھی روزگار سے لگا رہے تو سارے سادہ لوح اور افلاس زدہ کنبے کی آس امیدیں اسی کی ذات سے بندھی رہتی ہیں کہ آج نہیں تو کل اس کے دم سے یہ کام ہوجائے گا' وہ کام ہوجائے گا۔ سب کو زندہ رہنے کا ایک سہارا ملا رہتا ہے۔ امید کا یہ موہوم سہارا بجھ جانا اُن سیدھے سادے لوگوں پر کیسی قیامت ڈھاتا ہوگا' یہ صرف وہی جان سکتے تھے۔

تصویر کھنچوانے میں اس لڑکی کا اضطراب' اس کی ہچکچاہٹ قابلِ فہم تھی۔ وہ غالباً ان پڑھ ہی تھی۔ دنیا اس نے یقیناً نہیں دیکھی ہوگی لیکن عزتِ نفس اور شعور اس کے پاس ضرور تھا۔ وہ اخبار چھپنے کی نظر میں قابل نہیں چاہتی تھی کہ اس کی تصویر اخبار میں چھپے۔ وہ کسی کو بتانا نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بوڑھے اور بیمار باپ کے کندھوں پر اس کا وجود ایک بوجھ ہے مگر لکھنے والوں کو لکھنے کے لیے..... اور پڑھنے والوں کو پڑھنے کے لیے کہانیاں چاہئیں' افسانے چاہئیں' خبریں چاہئیں۔

لڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے دو معصوم بچوں کو صحیح طور پر تو اندازہ نہیں ہوگا کہ ان پر کیا قیامت گزر چکی تھی لیکن ان کی سوچوں کی چھوٹی سی دنیا میں بھی ہلچل تو یقیناً مچی تھی۔ اسی لیے تو ان کورے چہروں پر بھی محرومی کی ایک نادیدہ تحریر ابھر آئی تھی۔ ان کو بھی یقیناً احساس ہوچکا تھا کہ ان سے کوئی بیش قیمت چیز چھن چکی تھی۔ ان میں سے ایک بچہ تقریباً پانچ سال کا تھا اور دوسرا تقریباً چار سال کا۔ اس عمر میں ذہن کے ورق پر نقش بننے بگڑنے کا عمل تو شروع ہو ہی جاتا ہے۔

ان کے پیچھے جو بیوہ سر جھکائے کھڑی تھی' اس میں تو شاید طاقت ہی نہیں رہی تھی کہ کسی کو صحیح طور پر اپنا دکھ بتا سکے۔ اسی لیے اس کا سر تو شاید عمر بھر کے لیے شکست خوردہ سے انداز میں جھک گیا تھا۔ عورت کتنی بھی غریب ہو مگر شوہر زندہ ہو تو شاید اس خیال کے سہارے سر اونچا رکھتی ہے کہ اس کے سر پر تاج ہے مگر اس عورت کے سر کا تاج محض کسی کی دولت کی ہوس کا نشانہ بن کر موت کی تاریک وادی میں جا گرا تھا۔

ایک فرد کی ناگہانی موت سے پورا ایک خاندان برباد ہوجاتا ہے۔ مرنے والا اپنے پیچھے نہ جانے کتنی المناک کہانیاں' کتنے زندہ کرداروں کے ساتھ چھوڑ جاتا ہے مگر ہم روزانہ ایسے بیسیوں افراد کی ناگہانی موت کی خبریں اخباروں کے کونے کھدروں میں پڑھتے ہیں اور بے دلی سے اخبار ایک طرف پھینک کر ناشتا کرنے لگتے ہیں کہ کہیں چائے ٹھنڈی نہ ہوجائے' انڈا بدمزہ نہ ہوجائے۔ وہ کہانیاں نہ جانے کتنے برسوں تک اپنے انجام کی تلاش میں بھٹکتی رہتی ہیں لیکن ہم ان کے بارے میں نہیں سوچتے کیونکہ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

کبھی کبھی یہ دنیا..... اپنا آپ..... گردوپیش کے لوگ..... سب کچھ مجھے بہت عجیب لگنے لگتا تھا۔ عجیب نظام تھا..... یا پھر شاید ہم لوگ ہی عجیب ہوگئے تھے۔

کبھی کبھی کوئی لمحہ' کوئی موڈ انسان کے لیے بہت خاص ہوتا ہے۔ میری نظریں مسلسل اس تصویر اور اسٹوری میں الجھی ہوئی تھیں۔ نامہ نگار نے لکھا تھا کہ قصبے میں شاید وہ واحد گھرانہ تھا جس کا مکان ذاتی نہیں تھا۔ مالک مکان پہلے ہی ان سے خوش نہیں تھا' اب کچھ اور خفا ہوگیا تھا۔

کچھ اور بھی قرض خواہ تھے جنہیں بہت تشویش تھی کہ اب کمانے والا نہیں رہا تو ان کی پھنسی ہوئی رقموں کا کیا بنے گا؟ رقمیں معمولی تھیں مگر جس کے پاس روپیا نہ ہو اس کے لیے کوئی رقم معمولی نہیں ہوتی۔

کنڈیکٹر کا باپ گُردے کی تکلیف میں مبتلا تھا۔ اس کی دوا روکا خرچ خاصا تھا مگر اب تو روٹی کے لالے پڑ گئے تھے' دوا کہاں سے آتی۔ چنانچہ رات کو بڑے میاں تکلیف کے باعث اونچی آواز میں کراہتے تھے تو پڑوسیوں کی نیند خراب ہوتی تھی۔

ایک آدھ کنڈیکٹر سے مجھے حال ہی میں پالا پڑا تھا۔ اس سے پہلے برسوں سے کسی کنڈیکٹر سے واسطہ نہیں پڑا تھا لیکن جب پڑتا تھا تب بھی وہ مجھے اچھے نہیں لگتے تھے۔ پیشہ بھی انسان کی ذات پر کچھ نہ کچھ اثرات ضرور مرتب کرتا ہے۔ کنڈیکٹروں پر ان کے پیشے کا نہ جانے کیوں یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ عجیب کھردرے سے انسان بن جاتے ہیں۔ یا پھر شاید وہ پہلے ہی سے ایسے ہوتے ہیں اور اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر اس پیشے کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ دن بھر نہ جانے کس کس مزاج کے لوگوں سے بک بک جھک جھک کرنے کی وجہ سے ان کے رویّے میں مستقل کھردرا پن آجاتا ہو۔

بات خواہ کچھ بھی تھی لیکن اس وقت میری زندگی بھر کی ناگواری نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ وہ نامعلوم اور ان دیکھا کنڈیکٹر مجھے اپنا کوئی قریبی دوست محسوس ہونے لگا۔ وہ ہمارے معاشرے کا ایک عام سا انسان تھا' اس کے پیچھے ایک عام سی کہانی تھی۔ آہوں' آنسوؤں اور مصائب کی کہانی لیکن اس وقت میری نظر میں وہ خاص انسان بن گیا تھا۔ اسے قتل کردیا گیا تھا' یہ اس پر تو ایک ظلم تھا ہی لیکن اس کے خاندان پر بھی بہت بڑا ظلم تھا۔ اس وقت میرے اندر شاید گداز کا موسم تھا۔ وہ ایک ساکت تصویر اور اخباری فیچر گویا مجھے ڈس گیا۔

میرے اندر کا موسم اتنا عجیب تھا کہ مجھے یہ بھی پتا نہ چلا کہ خمیسو خان کب آکر میرے عقب میں کھڑا ہوگیا۔ اس نے بھی محسوس کرلیا کہ میں اس نمایاں ترین تصویر اور رپورٹ میں اُلجھا ہوا تھا۔

میں اس وقت چونکا جب اس نے اخبار میرے ہاتھ سے اُچک لیا اور اسی رپورٹ پر نظر دوڑاتے ہوئے میرے سامنے آن بیٹھا۔ زیرِلب بڑی روانی سے وہ پوری رپورٹ پڑھتا چلا گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی کچھ نہ کچھ پڑھا لکھا ضرور تھا۔

پوری رپورٹ پڑھ کر اس نے بغور میری طرف دیکھا۔ میرے دل کی دھڑکن اور تیز ہوگئی۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ میں اس رپورٹ کو اتنی محویت سے کیوں پڑھ رہا تھا۔ پھر وہ اخبار میز پر پھیلا کر اس پر نظر جما کر بیٹھ گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ اس گروپ فوٹو میں سے صرف اس لڑکی کے چہرے کو گھور رہا تھا۔

آخر اس کی سوچ اس کے ہونٹوں پر آگئی جو میرے اندازے سے بہت مختلف تھی۔ لڑکی کی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے وہ بولا "دانہ اچھا ہے..... اور اس کے حالات بھی ہمارے حق میں بہت اچھے ہیں۔ ان حالات میں تو ہماری ایجنٹ جیماں اس لڑکی کو بڑی آسانی سے اس اڈے تک لاسکتی ہے اور ٹریننگ دے سکتی ہے۔" اس نے گردوپیش کی طرف اشارہ کیا۔

اس کا انداز خود کلامی کا تھا لیکن یہ چند الفاظ جب اپنے صحیح معانی اور مفہوم کے ساتھ میرے ذہن تک پہنچے تو میری روح کانپ اٹھی۔ گویا یہ لوگ بعض خاندانوں کو ایک انداز میں برباد کرنے کے بعد بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ انہیں مزید برباد کرنے کا بھی نہ جانے کن کن طریقوں کا ان کے ہاں بندوبست تھا۔

ان کے تمام سلسلے بہت منظم تھے۔ ان کی کوئی جیماں نامی ایجنٹ بھی تھی جو نامساعد حالات میں گھری ہوئی مجبور لڑکیوں..... یا پھر ان کے مطلوبہ رجحانات رکھنے والی لڑکیوں کو گھیر گھار کر اس قحبہ خانے تک لاتی تھی..... پھر نہ جانے کس طرح انہیں خاص سانچے میں ڈھالا جاتا تھا۔

اس سارے عمل کے دوران اور اس کے بعد وہ نہ جانے کہاں رہتی تھیں۔ اپنے گھروں میں یا کہیں اور؟ وہ کس حد تک ان کے پنجوں میں جکڑی ہوتی تھیں؟ اس طرح کے بہت سے سوالات میرے ذہن میں چکرانے لگے تھے لیکن اتنی جلدی ہر سوال کا جواب نہیں مل سکتا تھا۔

میں ان سوالوں کو زبان پر آنے سے روکنے کی کوشش میں مصروف تھا جب خمیسو خان اخبار ایک طرف کھسکا کر اٹھتے ہوئے بولا "میں ذرا کاؤنٹر سے اپنی چیزیں لے آؤں پھر چلتے ہیں۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ میں نے اخبار ایک بار پھر اپنی طرف کھسکا لیا۔ ایک بار پھر تصویر سے ہوتی ہوئی میری نظر اس رپورٹ کی آخری سطروں پر جا اٹکی۔ افسانہ نگاری کے سے رجحانات رکھنے والے اس نامہ نگار نے آخری سطروں میں لکھا تھا:

'.....یہ شقی القلب ڈاکو' یہ انسان نما درندے محض رقم کی خاطر..... اور بعض اوقات تو صرف دہشت پھیلانے کی غرض سے کسی کی زندگی کا چراغ گل کرتے وقت ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچتے کہ ان کی اس درندگی سے کتنے گھروں میں تاریکی پھیل جائے گی' کتنی زندگیاں برباد ہوجائیں گی۔

قدرت اور قانون' دونوں ہی انہیں ڈھیل دیتے ہیں۔ بہرحال کبھی نہ کبھی تو قدرت یا قانون کا ہاتھ انہیں گرفت میں لے ہی لیتا ہے۔ کنڈیکٹر عبدالرشید اور کئی بے گناہ مسافروں کو موت کے گھاٹ اتارنے والا ڈاکو نہ جانے کب اپنے انجام کو پہنچے..... لیکن سردست تو لمحہ بہ لمحہ اندھیرے کی دلدل میں اترتے ہوئے یہ بے گناہ افراد یعنی کنڈیکٹر عبدالرشید کے یہ اہلِ خانہ جامی نگر کے میراثی پاڑے کے ایک پرانے سے مکان میں کسی معجزے کے منتظر ہیں جو ان کی زندگیوں سے اندھیرے سمیٹ سکے۔ وہ روشنی کی کسی کرن کے انتظار میں ہیں جو انہیں منزل کا کچھ پتا دے سکے.....'

یہ تمام الفاظ اور تفصیلات گویا میرے ذہن پر نقش ہوکر رہ گئی

تھیں۔

نمیسو خان کے قدموں کی دھمک سُن کر میں نے اخبار ایک طرف کھسکا دیا۔ نمیسو نے میز کے قریب پہنچ کر ایک بار پھر تصویر کی طرف دیکھا۔ گھنے بالوں میں گھرے ہوئے اس کے ہونٹ ہوس زدہ سے انداز میں پھیل گئے، آنکھوں میں نشہ سا اُتر آیا۔ وہ جب سے کمرے سے واپس آیا تھا بڑا آسودہ سا نظر آرہا تھا لیکن اب جیسے ایک بار پھر پیاسا پیاسا دکھائی دینے لگا۔ مجھے معلوم تھا تصویر میں اس کی نظر صرف لڑکی کے چہرے پر تھی۔

ایک بار پھر وہ خودکلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ "دانہ اچھا ہے....."

میرا دل چاہا کہ اسی وقت اس کی گردن دبوچ لوں اور اس وقت تک دباتا چلا جاؤں جب تک اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل کر اس کے چہرے پر نہ لٹک آئیں۔ لیکن ایک بار پھر میں نے اپنے آپ پر ضبط کرلیا۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا اس کے لیے مجھے مناسب موقع کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ اس وقت تک میری معلومات میں مزید نہ جانے کتنا اضافہ ہو سکتا تھا۔

نمیسو کے کندھے پر اب ایک چھوٹا سا سفری بیگ نظر آرہا تھا۔ اس میں یقیناً رقم کا پیکٹ اور شاید کچھ دوسری چیزیں تھیں۔ وہ چلنے کے لیے تیار تھا۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا، یہ پوچھے بغیر کہ کہاں جانا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ رقم پہنچانے اور اپنے دورے کی رپورٹ دینے جانو کے ڈیرے پر جائے گا جو ایک طرح سے ان کا ہیڈکوارٹر تھا۔

نمیسو ابھی ہال پر ایک الوداعی سی نظر ڈال رہا تھا کہ بالائی قطار کے ایک کمرے سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ سنائی دی۔ دروازہ بند ہونے کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی گھٹ کر رہ گئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ بالائی کمروں کی جنگلے دار بالکونی سے میں اوپر کا منظر بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔

ایک عورت لڑکھڑاتی ہوئی کمرے سے نکلی۔ وہی چیخیں مار رہی تھی۔ وہ کچھ اچھی حالت میں نہیں تھی۔ اس کے جسم پر لباس نامکمل تھا لیکن اس وقت اسے لباس کی نہیں، شاید اپنی جان کی فکر تھی کیونکہ وہ بالکونی کے راستے سیڑھیوں کی طرف دوڑی آرہی تھی۔ بالائی کمرے صرف چند سیڑھیوں کی بلندی پر تھے۔

دوسرے ہی لمحے..... لمبا تڑنگا اور قدرے بھاری جسم کا ایک پختہ العمر مرد بھی لڑکھڑاتا ہوا کمرے سے برآمد ہوا۔ عورت کا دوپٹا اس کے ہاتھ میں تھا جس کا اس نے پھندا بنا رکھا تھا۔ وہ عورت غالباً اسی پھندے سے اپنی گردن آزاد کروا کر نکل کے بھاگی تھی کیونکہ اس کا ایک ہاتھ ابھی تک گردن پر تھا۔

مرد یقیناً نشے میں دُھت تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ عورت سیڑھیوں کی طرف بھاگ چکی تھی۔ وہ اب بھی دوپٹے کا پھندا اس کے گلے میں ڈالنے کے لیے دونوں ہاتھ اونچے کیے اسے بالکونی میں تلاش کررہا تھا۔

پھر وہ نشے میں تُتلاتی ہوئی سی زبان کے ساتھ موٹی موٹی گالیاں دیتے ہوئے گرجا۔ "کہاں گئی سالی..... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا..... تجھے تو آج میں کتوں کے آگے پھنکواؤں گا۔"

اس وقت تک عورت دھڑ دھڑ سیڑھیاں اتر کر نیچے آپہنچی تھی۔ ہم سیڑھیوں سے زیادہ دور نہیں تھے۔ عورت نمیسو خان ہی کی طرف لپکی آرہی تھی۔ دو ویٹر جو اس وقت ہال میں خدمات انجام دے رہے تھے، اپنی اپنی ٹرے میزوں پر رکھ کر اپنی جیبوں سے ٹی ٹی پسٹل نکال چکے تھے اور بالکل الرٹ تھے لیکن شاید وہ نمیسو خان کے حکم کے منتظر تھے۔ اپنی اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے۔ خود نمیسو خان بھی بالکل ساکت کھڑا عورت کو اپنی طرف آتے دیکھ رہا تھا۔ ہال میں سکوت چھا گیا تھا..... لیکن عورت نمیسو خان کے قریب پہنچ کر ایک بار پھر بدحواسی میں چیخی۔ "بچاؤ..... بچاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی وہ نہ جانے کس چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ وہ شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ مرد اس کے پیچھے آرہا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گرتے ہی وہ زیادہ بدحواسی سے چیخی۔ "بچاؤ..... بچاؤ۔"

نمیسو نے ہاتھ بڑھا کر اسے بازو سے پکڑا اور یوں اٹھا لیا جیسے وہ بڑے سائز کی گڑیا ہو۔ حالانکہ وہ ذرا بھاری تن و توش کی عورت تھی لیکن یہ بھاری پن مناسب جگہوں پر تھا اور اسے ایک الگ انداز کی خوبصورتی بخش رہا تھا۔ نمیسو نے نہایت آہستگی سے اسے ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے ڈانٹا۔ "چیخو مت۔ تم تو اچھی بھلی حوالے کی گئی لگتی ہو۔ یہ ایک دم تمہیں کیا ہوگیا ہے؟" اس کا چہرہ قطعی پُرسکون تھا۔ سفری بیگ اس نے میز پر رکھ دیا تھا۔ اس کی نظر بالکونی کی طرف تھی۔

عورت ہانپتے ہوئے بولی۔ "عادل شاہ پاگل ہوگیا ہے شاید..... اس نے تو مجھے تقریباً مار ہی دیا تھا..... تم لوگوں کو شاید پتا بھی نہ چلتا..... دوپٹے کا پھندا اس نے اچانک ہی میرے گلے میں ڈال دیا تھا....."

وہ ایک بار پھر اپنی گردن مسلنے لگی۔ میں نے دیکھا اس کی مرمریں گردن پر سرخ حلقہ نمودار ہوچکا تھا۔

"بات کیا تھی؟" نمیسو نے اس کی طرف دیکھے بغیر پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

عورت وحشت زدہ نظروں سے جنگلے کی طرف دیکھتے ہوئے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی۔ "بات معمولی سی تھی..... لیکن بتانے والی نہیں ہے..... وہ پہلے ہی سے پتا نہیں کس بات پر خار کھائے ہوئے تھا..... میرا ذرا سا انکار سُن کر آپے سے باہر ہوگیا..... اس نے دھوکے سے میرے گلے میں دوپٹا ڈال دیا تھا....."

اس دوران وہ شخص سیڑھیوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ جنگلے سے جھانک کر اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیچے دیکھا۔ اس

میں چونکہ صرف عورت کو تلاش کررہی تھیں، شاید اس لیے اسے صرف عورت ہی نظر آئی۔ اس کے دیکھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ اس نے نمیسو خان کو نہیں دیکھا تھا..... اور یہ شاید اس کی بدقسمتی تھی!

وہ جنگلے پر لٹکتے ہوئے ایک بار پھر گندی گالیاں دیتے ہوئے چلایا۔ "..... وہاں چھپی بیٹھی ہے..... ابھی تجھے صحیح کرتا ہوں..... تیری یہ جرأت....." وہ مغلظات بکتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

میں ایک ستون کے قریب ساکت کھڑا تھا۔ نمیسو میری طرف مُڑتے ہوئے پُرسکون لہجے میں بولا۔ "دیکھ رہے ہو؟ نجی زندگی میں تمہارے معززین اور شرفا کی یہ حالت ہوتی ہے۔ کافی بڑا اور معزز زمیندار ہے یہ۔ علاقے میں بڑی عزت ہے اس کی۔ عادل شاہ..... اونہہ.....!" اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے اس نے حقارت سے فرش پر تھوک دیا ہو لیکن درحقیقت اس نے تھوکا نہیں تھا۔

میرا خیال تھا کہ عادل شاہ یہ خیروعافیت نیچے نہیں پہنچ سکے گا اور سیڑھیوں سے لڑھک جائے گا لیکن وہ جنگلا پکڑ کر سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔ اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے اس کا سیڑھیوں سے اتر آنا کسی کارنامے سے کم نہیں تھا۔ نمیسو نے اپنی جگہ سے قطعاً حرکت نہیں کی تھی۔ وہ نہایت اطمینان سے وہیں کھڑا انتظار کررہا تھا۔ اسے گویا یقین تھا کہ عادل شاہ سیدھا اسی کی طرف آئے گا۔

عادل شاہ لڑکھڑاتا ہوا واقعی اس کے قریب آپہنچا۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی بے خبری میں کھسکتی ہوئی مکڑی کے جال کے قریب جا پہنچتی ہے۔ اس بدبخت کی نظر ابھی تک نمیسو پر نہیں پڑی تھی حالانکہ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے دیکھ رہا تھا لیکن اسے شاید عورت کے سوا کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

وہ کچھ اور قریب پہنچا تو نمیسو خان کا بازو اچانک کچھ اس طرح حرکت میں آیا جیسے کسی مشین کا اسپرنگ ٹوٹ گیا ہو۔ اتنے زور کا تھپڑ عادل شاہ کے منہ پر پڑا کہ ہال میں فائر کی سی آواز گونج کر رہ گئی۔ وہ "اوغ" کی زوردار آواز کے ساتھ دور جا کر گرا اور وہیں ساکت ہوگیا۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں ایک ہی تھپڑ میں اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز تو نہیں کرگئی لیکن پھر میں نے اسے حرکت کرتے دیکھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں اور ہونٹ خون میں لتھڑ گئے تھے۔

نمیسو خان لمبا سا ڈگ بھر کر آگے بڑھا۔ اس کے چہرے پر خاموش غیظ و غضب کے آثار تھے۔ اس نے جھک کر اس اچھے بھلے ڈیل ڈول کے آدمی کو گردن سے پکڑ کر یوں ایک جھٹکے سے اٹھا لیا جیسے وہ سوہے سلف کا کوئی چھوٹا موٹا تھیلا ہو۔

عادل شاہ کی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں۔ اس کا چہرہ اب نمیسو خان کے چہرے سے بہ مشکل دو انچ دور تھا۔ اس کے حواس پہلے ہی ٹھکانے نہیں تھے، نمیسو کے منہ توڑ قسم کے تھپڑ نے یقیناً اس کے حواس کچھ اور مختل کردیے تھے لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس نے نمیسو کو پہچان لیا تھا کیونکہ میں نے اس کے حلق سے فرخراہٹ کے سے انداز میں نمیسو کا نام برآمد ہوتے ہوئے سنا تھا۔ گردن نمیسو کی گرفت میں ہونے کی وجہ سے وہ صحیح طور پر بول نہیں پا رہا تھا۔

شاید وہ سانس بھی مشکل سے ہی لے پا رہا تھا کیونکہ اس کی آنکھیں لمحہ بہ لمحہ حلقوں سے نکلی آرہی تھیں۔ اس نے نمیسو کی گرفت سے گردن چھڑانے کی کوشش کی لیکن یہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی چوزا ہاتھی کے جبڑوں سے گردن چھڑانے کی کوشش کررہا ہو۔

نمیسو نے اس کے دوسرے رخسار پر اُلٹے ہاتھ کا ایک اور تھپڑ رسید کیا..... پھر اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ ایک بار پھر گر پڑا۔ نمیسو نے اس بار ہاتھ ہلکا ہی رکھا تھا ورنہ شاید وہ بے ہوش ہوگیا ہوتا۔

بہچانی

از اصدق

قیمت ۱۵۰/۰۰ روپے

اُردو کے خُوبصورت شاعر اکبر الٰہ آبادی سے لے کر آج کے دور کے جانے پہچانے شاعروں کا منتخب اور دلچسپ ظریفانہ کلام----

اُردو کی ظریفانہ شاعری

☆---- ہما علی

قیمت: -/75 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

اس کا چہرہ خون میں کچھ اور لتھڑ گیا۔ اس نے سر کو جھٹک کر گویا اپنے حواس کچھ ٹھکانے لانے کی کوشش کی اور پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔ "غیسو..... ! تیری یہ جرأت.....!" اس کے ہونٹوں سے خون کے چھینٹے اڑے۔

غیسو کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر عادل شاہ کی پسلیوں پر ٹھوکر رسید کی۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ اُچھلا۔ غیسو اس پر جھکتے ہوئے یکدم ہی چلایا۔ "ابے حرامزادو..... اتنی پیتے ہی کیوں ہو جتنی تم سے ہضم نہیں ہوتی؟"

اس نے ایک اور ٹھوکر عادل شاہ کے کولھے پر رسید کی۔ وہ درد سے بلبلاتے ہوئے چلایا۔ "غیسو..... تو دو ٹکے کی عورت کے لیے عادل شاہ پر ہاتھ اٹھا رہا ہے۔" اسے گویا اس انہونی پر یقین نہیں آرہا تھا۔

غیسو عجیب سے انداز میں مسکرایا اور جوتے سمیت اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر ذرا جھکتے ہوئے بولا۔ "بڑی غلط بات کر رہے ہو عادل شاہ! اس اڈے پر کوئی عورت دو ٹکے کی نہیں ہوتی۔ وہ جو بھی ہیں..... جیسی بھی ہیں..... اپنا کام کر رہی ہیں۔ تمہیں بھی صرف اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے تھا۔ تم بھول گئے تھے کہ اس اڈے کا ڈسپلن کتنا سخت ہے۔ جیسا تماشا تم نے لگایا ہے اس پر تمہاری سزا تو زیادہ سخت ہونی چاہیے تھی۔ میں تم پر رحم کر رہا ہوں۔"

عادل شاہ کمزور آدمی نہیں تھا۔ نشے میں نہ ہوتا تو شاید وہ غیسو خان سے تھوڑا بہت مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ کانپتی ٹانگوں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے گویا ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ غیسو نے اس کے منہ پر تھپڑ لگائے تھے۔ وہ شاید ان لوگوں میں سے تھا جنہیں کسی کے ہاتھ سے بھی تھپڑ کھانا ایک ڈراؤنا خواب تو محسوس ہو سکتا تھا لیکن وہ یقین نہیں کر سکتے تھے کہ کسی نے حقیقت میں انہیں مارا تھا۔

"غیسو..... غیسو..... تو نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا.....؟" وہ اپنے چہرے سے خون پونچھ کر لتھڑے ہوئے ہاتھ کو بے یقینی سے دیکھتے ہوئے پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔

"ہاں۔ میں نے بڑی غلطی کی۔" غیسو نہایت پُرسکون لہجے میں بولا۔ "یہ کام میرے شایانِ شان نہیں تھا۔ مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

اس نے اشارے سے ان دونوں قوی الجثہ نوجوانوں کو بلایا جو ہال میں ویٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ پسٹل لیے الرٹ کھڑے تھے۔ اس کا اشارہ پا کر مستعدی سے قریب آگئے۔ غیسو نے انہیں حکم دیا "اس کے منہ پر تھوکو۔"

دونوں نے نہایت سعادت مندی سے بیک وقت عادل شاہ کے منہ پر تھوک دیا۔ اب تو عادل شاہ کی حالت بہت ہی خراب ہوگئی۔ اس نے اپنی بچی کھچی توانائی مجتمع کرتے ہوئے جھپٹ کر ایک ویٹر نوجوان سے پسٹل چھیننے کی کوشش کی لیکن وہ ان معاملات میں اتنا اناڑی نہیں تھا۔ اس نے جھکائی دے کر ہاتھ بچا کر لیا۔ عادل شاہ پسٹل کو چھو بھی نہ سکا۔

دوسرے نوجوان نے اس کی ٹھوڑی پر نپا تُلا گھونسا رسید کیا۔ وہ ایک بار پھر دھم سے گر پڑا۔ اب گویا اس میں دم خم ختم ہو گیا۔ وہ بے ہوش تو اب بھی نہیں ہوا تھا لیکن اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔

غیسو نے دونوں نوجوانوں کو حکم دیا۔ "اسے ڈنڈا ڈولی کر کے باہر لے جاؤ۔ اس کی گاڑی میں ڈالو اور تم میں سے کوئی ایک گاڑی ڈرائیو کر کے اسے سڑک تک چھوڑ آئے۔ گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کر کے تم وہیں شاہدو گوٹھ سے اپنی کوئی گاڑی بھیج یا گھوڑا لے کر واپس آجانا۔ اس میں ہمت ہوگی تو ڈرائیو کر کے گھر چلا جائے گا ورنہ کوئی اسے پہنچا دے گا۔ جو بھی اس کی قسمت میں ہوا وہ ہو جائے گا۔"

دونوں نوجوانوں نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور پسٹل جیبوں میں رکھتے ہوئے جھک کر یک دم ہی عادل شاہ کو نہایت مشاقی و مہارت سے ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے اٹھا لیا۔ اس نے مزاحمت نہیں کی لیکن غیسو کی طرف دیکھ کر خرخراتی سی آواز میں بولا۔ "میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں غیسو! میں یہ اڈا بند کرا دوں گا..... اور تمہیں بھی دیکھ لوں گا....."

غیسو نے یک دم جھک کر اس کے گریبان کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے جھٹکا دیا اور بولا۔ "ضرور دیکھنا..... لیکن مجھے دیکھنے سے پہلے اپنے تین چھوٹے چھوٹے بچوں کو ضرور دیکھ لینا۔ دو لڑکے ہیں..... اور ایک لڑکی ہے جس کی آنکھیں انگریزوں کی طرح نیلی ہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟ تم انہیں زندہ دیکھنا چاہتے ہو نا؟ اس کے علاوہ تمہاری ایک چھوٹی بہن بھی ہے..... کراچی میں میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے۔ ڈیفنس میں رشتے داروں کے ساتھ رہتی ہے۔ بنگلے کا نمبر بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ تمہاری کار کے بارے میں بھی یقیناً یہی خواہش ہوگی کہ وہ زندہ رہے..... اور عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہے..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

عادل شاہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ غیسو اس کے گریبان کو ایک اور جھٹکا دے کر سانپ کے سے انداز میں پھنکارا۔ "ایک اور اہم بات تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گیا۔ ہمارے پاس تمہاری کچھ تصویریں ہیں۔ بہت قیمتی تصویریں ہیں۔ تم سیاست میں بھی تو منہ مارتے ہو نا؟ ابھی سیاست میں تمہارا کوئی مقام نہیں ہے..... لیکن اگر وہ تصویریں ہم نے کچھ خاص خاص جگہوں پر پہنچا دیں تو سیاست میں تمہارا مقام راتوں رات اتنا اونچا ہو جائے گا کہ تم خود بھی اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکو گے۔ کچھ سمجھ میں آیا؟"

عادل شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ شاید اس میں اب آنکھیں کھلی رکھنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ غیسو خان نے چٹکی بجائی۔ دونوں نوجوان عادل شاہ کو اٹھائے اس موٹی سی دیوار کی طرف بڑھے جس میں مستطیل شگاف رہ گیا تھا۔ گوریلا نما محافظ اس شگاف سے جھانک کر دلچسپی آمیز انداز میں یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔

دفعتاً غیسو کو جیسے کچھ یاد آیا۔ اس نے ایک بار پھر نوجوانوں کو رکنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ کر عادل شاہ کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اس کی واسکٹ کی جیب سے اس نے ویسی ہی ایک سنہری چابی نکالی جس چابی سے وہ خود دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔ وہ چابی اس نے اپنی جیب میں رکھ لی اور عادل شاہ پر جھکتے ہوئے بولا۔ "ہمیں معلوم تھا میں تم اتنے کم ظرف انسان ہو عادل شاہ! ہم تمہارے بارے میں پیر حشمت علی سے بات کریں گے جس نے تمہیں ممبر شپ دلائی تھی۔ کبھی کبھار ہی ہمیں تم جیسا کوئی گندہ ممبر ملتا ہے۔"

عادل شاہ کسمسایا لیکن خوشحال نوجوانوں نے اسے دبوچا ہوا تھا۔ غیسو پھنکارنے ہی کے سے انداز میں مزید بولا۔ "تم ہمارا سب سے اہم اصول بھی بھول گئے..... کہ جب تک ہمارے ساتھ رہو، سچے دوستوں کی طرح رہو اور جب ساتھ چھوڑنا ہو تو خاموشی سے چابی واپس کر کے عزت داروں کی طرح رخصت ہو جاؤ۔ تماشا لگانے والوں کو تو ہم دنیا میں تماشا بنا دیتے ہیں۔"

اس نے ہاتھ نیچے لے جا کر عادل شاہ کی کمر میں گھونسا رسید کیا۔ عادل شاہ تڑپ کر ایک لمحے کے لیے اوپر کو کمان کی طرح اٹھ کر رہ گیا۔ پھر ڈھیلا پڑ گیا۔ نوجوانوں نے اسے اپنی گرفت سے نکلنے نہیں دیا تھا۔ الوداعی گھونسا رسید کر کے غیسو کو اطمینان ہو گیا اور اس نے نوجوانوں کو جانے کی اجازت دے دی۔

ہال میں بدستور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی نے اپنی جگہ سے ہلنے اور اس کارروائی میں مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ غیسو میز پر واپس آگیا اور عورت سے مخاطب ہوا۔ "کمرے میں واپس جاؤ اور اپنی حالت ٹھیک کرو۔"

وہ عورت اٹھی اور واپس اوپر چل دی۔ اب اس کی حالت سنبھل چکی تھی۔ اندر سے ایک اور نوجوان نے ہال میں آکر ویٹر کے فرائض سنبھال لیے تھے۔ غیسو نے اس سے اپنے لیے ٹھنڈی بیئر کا ایک گلاس منگوایا اور بیئر سُڑکتا کر بیٹھ گیا۔

اس نے مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ "سالے نے دماغ گرم کر دیا ہے۔ اب ذرا دماغ کو ٹھنڈا کر لیں تو پھر چلیں گے۔"

باقی سب لوگ بھی دھیرے دھیرے دوبارہ اپنے مشاغل کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ کچھ کمروں کے دروازے بھی تھوڑے تھوڑے کھل چکے تھے اور ان سے مختلف چہرے جھانک رہے تھے۔ اب وہ دروازے بھی دوبارہ بند ہو رہے تھے۔ پُرسکون جھیل میں ذرا دیر کے لیے جو ہلچل پیدا ہوئی تھی وہ اب معدوم ہو رہی تھی۔

چند لمحے بعد بیئر کا سنسناتا ہوا سا گلاس آپہنچا۔ غیسو خان نے نہایت اطمینان سے اسے ختم کیا۔ میں نے اس دوران ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیا۔ اس وقت تک ہال میں سب کچھ معمول پر آچکا تھا۔ بیئر کا گلاس ختم کر کے غیسو کے شب تاریک سے چہرے پر کچھ رونق آگئی۔ اس نے بیئر کی ایش ٹرے میں سلگا اور چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ سفری بیگ اٹھا کر اس نے کندھے پر لٹکا لیا۔

جس راستے سے ہم اندر آئے تھے اسی سے واپس باہر آئے۔ ہمارے گھوڑے وہیں موجود تھے جہاں ہم نے انہیں چھوڑا تھا۔ دو راتفل برداروں کو میں نے اب بھی درختوں کے درمیان ٹہلتے دیکھا لیکن یہ وہ نہیں تھے جنہیں میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ معلوم نہیں یہاں کتنے افراد باری باری ڈیوٹی دیتے تھے۔ کھلی جگہ میں بہت سی گاڑیوں کا بھی اضافہ ہو چکا تھا۔

ہم واپس اسی طرف چل دیے جدھر سے آئے تھے۔ رات اپنا دامن پھیلا چکی تھی لیکن آسمان پر غریب کے لباس کی طرح ادھورا سا چاند موجود تھا۔ دھندلی دھندلی چاندنی میں خاصی دور تک کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ غیسو خان عجلت میں نہیں تھا۔ گھوڑے کو ڈھیلی چلا رہا تھا۔ میرے ذہن میں ان گنت سوالات ڈنک مار رہے تھے مگر میں پوری پوری کوشش کر رہا تھا کہ زیادہ متجسس نظر نہ آؤں۔ زیادہ متجسس نظر آنا مجھے مشکوک بنا سکتا تھا۔

لیکن چند لمحے بعد غیسو گویا ایک انجانی سی مسرت محسوس کرتے ہوئے ایک نظر پیچھے دیکھ کر خود ہی فخر سے بولا۔ "کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہاں کوئی ایسا اڈا موجود ہے جس سے ہمیں لاکھوں روپے مہینے کی آمدنی ہے۔ وہ بھی لوٹ مار اور قتل و غارت کیے بغیر۔"

اس نے داد طلب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی تائید میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ "کسی علاقے کی پولیس کی حدود میں اس قسم کا اڈا بناؤ تو انہیں بھاری بھتا دینا پڑتا ہے۔ وہ ایک طرح کے پارٹنر ہو جاتے ہیں..... اور پارٹنر بھی خطرناک قسم کے۔ جیسے گھر کے بھیدی ہوتے ہیں جو کبھی کبھی لنکا ڈھا دیتے ہیں۔ ان پر زیادہ سختی آتی ہے تو کبھی کبھی وہ اپنی سرپرستی میں

تاریخی ناول

ابلیس مصر	الماس ایم۔اے	-/100
حسن بن صباح	الماس ایم۔اے	-/125
راجکماری	الماس ایم۔اے	-/150
نور الدین زنگی	الماس ایم۔اے	-/250
سلطان عادل	الماس ایم۔اے	-/150

مکتبہ القریش اُردو بازار۔لاہور 2

کام کرنے والوں کو بھی قربانی کا مرغا بنا لیتے ہیں۔"

اس نے کھلی فضا میں غالباً آزادی کے احساس سے ایک گہری سانس لی اور مسرور لہجے میں بولا۔ "مگر یہاں بھتے وغیرہ کا کوئی چکر نہیں۔ ہر وقت پولیس کی تلوار بھی سر پر نہیں لٹکتی۔ زمین سرکار کی ہے لیکن یہاں مالک صرف ہم ہیں۔ یہاں کوئی آکر ہم سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی ادھر سے برسوں کسی عام اور ناواقف شخص کا گزر نہیں ہوتا۔ اگر ہو بھی تو لوگ دور ہی سے دیکھ کر اسے کوئی چھوٹا موٹا جنگل سمجھ کر کترا کر گزرتے ہیں۔"

"جگہ ویسے تم لوگوں کو خوب ملی ہے۔" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ میں حد سے زیادہ خاموش رہ کر بھی خود کو مشکوک بنانا نہیں چاہتا تھا۔

"جگہیں تو دنیا کے کونے کونے میں نہ جانے کیسی کیسی موجود ہیں لیکن اصل کام تو کسی جگہ کو کارآمد بنانا اور اس کا انتظام بہترین طریقے سے چلانا ہوتا ہے۔ اس کے لیے بڑے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ دماغ کی۔" اس نے اپنی کنپٹی پر انگلی ماری۔

پھر اس کے لہجے میں عقیدت جھلک آئی۔ "اور دماغ اپنے جانو کے پاس بہت بڑا ہے۔ بڑے کمال کا دماغ دیا ہے اللہ نے اسے۔ اس کا نام سن کر لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی ان پڑھ، جٹ جاہل دیہاتی ہوگا لیکن وہ بہت پڑھا لکھا ہے۔"

پھر وہ بڑے سرور سے انداز میں مسکرایا۔ اس کا ذہن گویا گزرے دنوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا۔ ایک لمحے خاموش رہ کر وہ بولا۔ "ان دنوں ہمارا گروہ زیادہ بڑا نہیں تھا اور ہمارے پاس دولت بھی زیادہ نہیں تھی جب ایک واردات سے واپس آتے وقت رات کی طوفانی بارش کے دوران اتفاق سے ہم نے اس کھنڈر کا یہ خانہ دریافت کر لیا تھا۔ اس وقت یہ اتنی اچھی حالت میں نہیں تھا لیکن بہت بڑا تھا اور اس کی بناوٹ بڑے کام کی تھی۔"

"واہ۔" میں نے خواہ مخواہ سر ہلایا۔

"جانو کے ذہن میں اسی وقت اسے استعمال کرنے کا آئیڈیا آگیا تھا۔" غیبو فخریہ لہجے میں بولا۔ "اس وقت کھنڈر کے گرد زیادہ درخت بھی نہیں تھے۔ اس جنگل کو ہم نے بڑا کیا ہے۔ سیکڑوں مزید درخت اگائے ہیں۔ جس وقت جانو نے آئیڈیا دیا تھا اس وقت کسی کو بھی امید نہیں تھی کہ اس پر عمل ہو سکے گا۔"

"کافی محنت کرنی پڑی ہوگی اس جگہ کو سیٹ کرنے میں۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"سارے کام ہم لوگوں نے خود اپنے ہاتھوں سے کیے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کو کوئی نہ کوئی کام آتا ہے۔ اپنے خاص خاص ٹھیکوں پر اکثر کام ہم خود ہی کرتے ہیں۔ رازداری بھی رہتی ہے اور جن دنوں فرصت ہو ان دنوں وقت بھی اچھا کٹ جاتا ہے۔ اگر زیادہ ہی کسی کی ضرورت آن پڑے تو اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لاتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

پھر ایک لمحے کے لیے ادھر اُدھر دیکھ کر بولا۔ "جانو نے ہی یہ سارا سسٹم سیٹ کیا ہے..... لیکن یہاں آنے والوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کے پیچھے جانو ہے۔ بہرحال ممبروں پر دہشت قائم ہے تاکہ وہ کبھی اس کا راز افشا کرنے یا اسے نقصان پہنچانے کے بارے میں نہ سوچیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک خود اپنی جگہ اچھا بھلا پہنچے خان ہوتا ہے۔"

پھر اس نے اپنا گھوڑا میرے گھوڑے کے کچھ اور قریب لاتے ہوئے گویا میری معلومات میں اضافہ کیا۔ "اس کا نام "گولڈ کی کلب" ہے۔ یورپ، امریکا وغیرہ کے شہروں میں کی کلب ہوتے ہیں لیکن اتنی رنگینیاں وہاں بھی نہیں ہوتیں جتنی جانو نے یہاں جمع کر دی ہیں۔"

"اچھا.....؟" میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

وہ سر ہلا کر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "بہت خاص خاص اور بھروسے کے آدمی چھٹنے کے بعد انہیں ممبر شپ دی جاتی ہے۔ اس کے بعد انہیں کلب کے دروازے کی چابی دے دی جاتی ہے۔ باہر کے ملکوں میں تو لوٹے لپاڑے اس قسم کے جو چھوٹے موٹے کلب بناتے ہیں، ان میں تو کوئی بھی چابی لے کر دروازہ کھول کر اندر آسکتا ہے لیکن ہمارے ہاں شرطیں ذرا اور سخت ہیں۔ پہرا اور چیکنگ بھی ہوتی ہے۔ ممبر اپنی چابی کسی اور کو نہیں دے سکتا۔ البتہ کسی کو ممبر بنانے کی سفارش کر سکتا ہے۔ اس کی سفارش پر اچھی طرح چھان پھٹک کرنے کے بعد ممبر شپ دی جا سکتی ہے۔"

ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر وہ فخریہ سے انداز میں مسکرا کر پھر بولا۔ "گولڈ کی کلب کی ممبر شپ بہت مہنگی ہے۔ صرف ممبر شپ ہی نہیں..... اس کے بعد یہاں آنا جانا، اٹھنا بیٹھنا بھی بہت مہنگا ہے۔"

اس کے باوجود اچھے خاصے لوگ نظر آرہے تھے۔ اتنے زیادہ ممبر کیسے بن گئے؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

اس کے بلند آہنگ قہقہے سے فضا مرتعش ہو کر رہ گئی۔ "یہاں میں بڑی لذت اور کشش ہے نا۔ نیکی اور عبادت کی دعوت دینے والے اپنے ٹھکانوں پر ہر آرام مہیا کرتے ہیں۔ پنکھے لگاتے ہیں، قالین بچھاتے ہیں۔ وہاں جانے میں کوئی ڈر، کوئی خوف بھی نہیں ہوتا بلکہ دیکھنے والوں کی نظر میں عزت بڑھتی ہے۔ اس کے باوجود وہاں کم لوگ جاتے ہیں لیکن چرس، ہیروئن اور بدکاری کے اڈوں پر لوگ کتوں کی طرح بُو سونگھتے ہوئے، لوگوں کی نظروں سے چھپتے چھپاتے جوق در جوق پہنچ جاتے ہیں، خواہ اس کی کوئی پبلسٹی نہیں۔ راستہ کتنا ہی مشکل ہو اور خواہ وہ ٹھکانا کہیں دور دراز مقام پر، گندے نالے یا کچرا گھر کی بغل میں واقع ہو۔ یہ تو پھر بھی با معقل، آرام دہ اور پُرسکون جگہ ہے۔" اس نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کے باوجود ممبروں کی اتنی تعداد حیرت انگیز ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ کوئی پورے ممبر تو نہیں تھے۔" غیبو گویا میری حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے ہنس کر بولا۔ "ایک وقت میں تو آدھے سے بھی کم ممبر موجود ہوتے ہیں۔ سارے تو ایک وقت میں جمع ہو ہی نہیں سکتے۔ کوئی کہیں ہوتا ہے، کوئی کہیں۔ ہر ایک کی اپنی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں۔"

"پھر بھی اس ویرانے میں اتنے لوگ کہاں سے آجاتے ہیں؟ یہ کون لوگ ہیں؟" میں نے حیرت کا اظہار جاری رکھا جو کافی حد تک حقیقی ہی تھا۔

"تم شاید علاقے سے زیادہ اچھی طرح واقف نہیں ہو۔" وہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "یہاں جتنے ویرانے نظر آتے ہیں اتنی ہی زرخیزی بھی ہے۔ اردگرد کے ساٹھ ستر میل کے علاقے میں چھوٹے بڑے زمیندار بکھرے ہوئے ہیں۔ اکثر زمینداروں کا کسی نہ کسی شہر میں بھی مکان، ٹھکانا اور دوسری جائیدادیا کاروبار اپنی اپنی حیثیت کے مطابق موجود ہوتا ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ان شہروں میں جو بھی شغل میلے میسر ہوں ان سے تو وہ لطف اٹھاتے ہی رہتے ہیں لیکن کچھ نہ کچھ عرصہ انہیں اپنی زمینوں پر، دیہاتوں میں بھی رہنا ہی پڑتا ہے۔ چھوٹے زمینداروں کو زیادہ رہنا پڑتا ہے اور ان جنگلوں پر عیاشی یا تفریح کے کچھ زیادہ ذرائع میسر نہیں ہوتے۔ سوائے اس کے..... کہ گھر میں بیٹھ کر پلی پلائی..... کسی ایسی ویسی..... یا کم حیثیت سی لڑکی پر ہاتھ ڈال لیا لیکن ظاہر ہے، ان چکروں میں ان کے لیے کوئی خاص لطف نہیں ہوتا، ایڈونچر نہیں ہوتا۔ ذرا اچھی قسم کی چیزوں تک ان کا ہاتھ نہیں پہنچتا..... پھر وہاں بیوی بچے بھی ہوتے ہیں، گاؤں دیہات کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ بعض کا پارسائی کا بھرم بھی ہوتا ہے۔ سو باتیں، سو مسائل ہوتے ہیں۔ گولڈ کی کلب ان کی رسائی سے زیادہ دور بھی نہیں ہے اور یہاں وہ دنیا کی ہر فکر سے بے نیاز ہو کر آتے ہیں۔"

میں نے ذرا حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بارے میں میرے اندازے کافی تیزی سے تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ اس کا باس تو جو کچھ تھا سو تھا، خود وہ بھی مجھے اتنا کوڑھ مغز، جاہل اور نرا جانور معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اسے تو انسانی نفسیات کی باریکیوں کا بھی علم تھا۔ یا پھر شاید ان لوگوں نے جانو کے زیرِ سایہ رہ کر ڈاکا زنی اور قتل و غارت کے علاوہ بھی بہت کچھ سیکھا تھا۔

اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "چھوٹے سے چھوٹے زمیندار کے پاس بھی کافی روپیا ہوتا ہے اور چونکہ ان لوگوں کو کمانے کے لیے خود اپنی جان نہیں کھپانی پڑتی، اس لیے ان کے پاس وقت بھی کافی ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ طبقہ سیاست میں زیادہ حصہ لیتا ہے اور کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے، یہ لوگ جو کچھ ہمارے اڈے پر لگاتے ہیں، اس کی کسر کہیں نہ کہیں سے نکال لیتے ہوں گے۔"

پھر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "خیر..... زمینداروں ہی کا کیا ذکر..... تاجر، صنعت کار، سرکاری اہل کار۔ کوئی بھی کم نہیں ہے۔ یہ سب لوگ ہم سے بڑے ڈاکو ہیں۔ ہمارا تو نام زیادہ بدنام ہے۔ زیادہ بڑے ڈاکو تو معزز لوگوں والے لباس پہن کر اچھے اچھے دفتروں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بہرحال..... ہمارا واسطہ زیادہ تر زمینداروں سے ہے، اس لیے ہم انہی کی بات کرتے ہیں۔ ہم نے ان کے لیے ہر تفریح کا بندوبست کر رکھا ہے۔ ہر پندرہ دن بعد یہاں ایک زبردست فکور شو ہوتا ہے جو کسی زمانے میں بیروت کے نائٹ کلبوں میں اور آج کل یورپ وغیرہ میں ہونے والے فکور شو سے کم نہیں ہوتا۔"

اگر میں وہ ٹھکانا دیکھ کر نہ آرہا ہوتا تو شاید یہی سمجھتا کہ میں کسی تخیل پرست شخص کی باتیں سن رہا ہوں۔ چند لمحے گم صم رہنے کے بعد میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ "ممبر بنانے کے لیے لوگوں تک رسائی کیسے ہوتی ہے؟"

"شروع میں ذرا مسئلہ تھا، اب تو خود ہی ایک بھیڑ کے پیچھے دوسری بھیڑ چلی آرہی ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "ویسے بھی جانو کو کسی بھی چیز کا نظام چلانے میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ امریکا کے بدمعاشوں کے گروہوں سے وہ یہی سب سے بڑا کام سیکھ کر آیا ہے۔ تمہیں شاید معلوم ہو کہ وہ امریکا میں کئی سال رہ کر آیا ہے۔"

طنز و مزاح

پیچ در پیچ	مظفر بخاری	125/-
قصہ مختصر	مظفر بخاری	75/-
ایک سو ایک (کالم)	مظفر بخاری	90/-
گستاخی معاف	مظفر بخاری	100/-
ایک سو نو (کالم)	مظفر بخاری	100/-
چمن کو چلیے	مظفر بخاری	200/-

مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور نمبر2

"نہیں۔ مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"وہ اس بات پر بہت خوش ہوتا ہے کہ یہاں معاوضے پر ہر کام کے لیے لوگ مل جاتے ہیں اور رشوت سے دنیا کا ہر جائز ناجائز کام ہو جاتا ہے۔ کسی بھی طبقے میں یا کسی بھی محکمے میں ہمارے ایجنٹ یا مخبر کے طور پر کام آنے والے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ ان سے بڑی آسانی رہتی ہے۔ ہمارا بہت بڑا اور بہت زبردست نظام کام کر رہا ہے۔ ہم یونہی اتنے پھیلتے پھولتے نہیں جا رہے ہیں۔"

"بہت خوب!" میں نے بھرپور ستائشی لہجے میں کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس وقت غیسو خان زیادہ سے زیادہ داد کا طالب تھا۔

وہ مسرور لہجے میں بولا۔ "بہت کم عرصے میں جانو نے بے مثال ترقی کی ہے۔ ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے کہ اس نے ہم چند لوگوں کو ادھر اُدھر سے جمع کیا تھا۔ کوئی حوالات میں پڑا سڑ رہا تھا، کوئی فقیروں سے بدتر زندگی گزار رہا تھا، کسی کے پیچھے پولیس لگی ہوئی تھی اور کسی کے پیچھے دشمن۔ کوئی زندگی سے بیزار تھا اور کوئی معاشرے سے۔ آج ہمارا گروہ اتنا بڑا ہے کہ آدمیوں کی صحیح تعداد کا علم صرف جانو کو ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم ایک گروہ نہیں، ہم کئی گروہ ہیں جن کا آپس میں اتحاد ہے۔ اب ہم بہت طاقتور ہو چکے ہیں۔ ہمیں مٹانا آسان نہیں رہا..... جو ہمیں مٹانے کی کوشش کرے گا خود بھی بڑا نقصان اٹھائے گا۔"

اب ہم جس راستے پر جا رہے تھے وہ زرتاج نگر کی طرف نہیں جاتا تھا۔ میں بہت ذہن میں محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ شارٹ کٹ شروع ہو چکا تھا جس کے ذریعے جانو اور اس کے آدمی بہت کم وقت میں اپنے ڈیرے سے زرتاج نگر آ پہنچتے تھے۔ میرے لیے اس شارٹ کٹ کو یاد رکھنا بہت ضروری تھا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ سخت مٹی پر صرف ہمارے گھوڑوں کی مدھم ٹاپیں سنائی دیتی رہیں۔ پھر میں نے کسی سادہ لوح شخص کی طرح پُراشتیاق لہجے میں پوچھا "جانو تو بہت دولت مند آدمی ہو گا؟"

"بے شک۔ اس نے تو اب اپنی دولت مڈل ایسٹ کی طرف بھی منتقل کرنی شروع کر دی ہے۔" غیسو نے بلا تامل جواب دیا۔ "ابھی تو وہ اپنے گروہ کے لوگوں اور دوسرے کارندوں کو دل کھول کر حصہ دیتا ہے ورنہ اس کے پاس شاید اس سے زیادہ دولت ہوتی۔ بہرحال ہم لوگوں کے طور طریقوں یا رہن سہن سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ہم مالدار لوگ ہیں۔ ہمیں ظاہر کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہمیں زندگی کی ہر ضرورت، ہر آسائش انہی جنگلوں، ویرانوں اور گاؤں دیہات میں میسر ہے۔ عیش سے زندگی گزر رہی ہے، ہمیں اور کیا چاہیے؟"

"لیکن تم لوگ آمدورفت کے لیے زیادہ تر گھوڑے ہی کیوں استعمال کرتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہمیں زیادہ تر ایسے راستوں سے گزرنا پڑتا ہے جہاں گاڑیاں کام نہیں دیتیں۔ خاص طور پر جب اچانک بارش شروع ہو جائے۔" وہ بیڑی کا بنڈل نکالتے ہوئے بولا۔ "پٹرول بھی بیمار ہر جگہ دستیاب نہیں ہے۔ گھوڑوں کے استعمال کے بڑے فائدے ہیں۔ ویسے ہمارے پاس جیپیں، پجیرو، کاریں، موٹر سائیکلیں، ہر چیز موجود ہے۔ کمی کسی چیز کی نہیں ہے۔ جہاں جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے..... یا جو ہم مناسب سمجھتے ہیں وہی چیز استعمال کرتے ہیں۔ گاڑیاں بعض اوقات تیز رفتاری سے فرار کروانے کے بجائے مروا بھی دیتی ہیں۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ پھر ایک لمحے خاموش رہ کر پوچھا۔ "کیا خیال ہے..... جانو مجھے گروہ میں شامل کر لے گا؟"

"جانو کے بارے میں یقین سے تو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔" اس نے گویا صاف گوئی سے کام لیا۔ "وہ موڈی آدمی ہے۔ کبھی کسی کو بڑے سے بڑے نقصان پر بھی معاف کر دیتا ہے اور کبھی چھوٹی سی غلطی پر کسی کو الٹا ٹانگ دیتا ہے لیکن اپنے لوگوں کے لیے بہرحال وہ دل کا بہت اچھا ہے۔ اگر کسی کے ساتھ زیادتی ہو بھی جاتی ہے تو بعد میں موڈ ٹھیک ہونے پر اس کی تلافی کر دیتا ہے، خوب نواز دیتا ہے۔ اسی لیے ہم سب اس کو پسند کرتے ہیں۔ کسی نئے آدمی کو لینے کے سلسلے میں بھی اس کا یہی حال ہے۔ کسی کو تو ایک نظر دیکھتے ہی ساتھی بنا لیتا ہے۔ کسی کو بہت عرصے لگاتا ہے، بہت آزماتا ہے۔"

میں نے منہ لٹکا لیا۔ گویا اس کے جواب سے مجھے کافی مایوسی ہوئی تھی۔ غیسو خان چلتے گھوڑے پر بیڑی کا کش لے کر ایک نظر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "لیکن تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اسے سنبھال لوں گا۔ میں نے تمہیں پاس کر دیا ہے۔ ہمیں آدمیوں کی بہرحال ضرورت ہے۔ ہمارا کام بہت پھیل رہا ہے۔ اغوا برائے تاوان کا دھندا بہت تیز جا رہا ہے۔ شہروں سے بڑے بڑے سیٹھ اٹھا کر لائے جا رہے ہیں۔ اس کام میں کافی آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے..... اور بڑے دل گردے والے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ کبھی کبھی کسی سیٹھ کے اغوا پر بڑی سخت کارروائی شروع ہو جاتی ہے۔"

"دل گردے کی تو تم فکر ہی نہ کرو۔ جس کام پر بھی لگاؤ گے، جان لڑا دوں گا۔" میں نے خلوص سے کہا پھر دوستانہ سے انداز میں پوچھا۔ "سیٹھوں کو کہاں رکھا جاتا ہے؟"

"کوئی ایک جگہ تو نہیں ہے۔ مختلف حالات میں مختلف جگہیں ہوتی ہیں۔ اب جگہوں کے بارے میں پوچھنے مت بیٹھ جانا۔ ایک ہی وقت میں ساری باتیں تو نہیں بتائی جا سکتیں۔ جتنا کچھ میں نے تمہیں بتا دیا ہے اور دکھا دیا ہے وہی بہت ہے۔"

"ہاں۔ اس میں تو شک نہیں۔ یہ تو بڑی مہربانی ہے تمہاری۔"

ان نے عاجزی سے کہا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ "جس رفتار سے ہم نے یہ کام شروع کیے ہیں ان حالات میں جانو جیسے آدمی کو اگر پانچ سال اور مل گئے تو اس پورے صوبے میں اس کا راج ہو گا۔ اس کے حکم کے بغیر یہاں پتا بھی نہیں ہلے گا۔"

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میری رگ و پے میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ محض لاف زنی نہیں کر رہا تھا۔ یہاں معاشرے اور نظام کے متوازی بظاہر خاموش سے انداز میں ایک اور ہی معاشرہ، ایک اور ہی نظام تشکیل پا رہا تھا اور کسی کو اس کا کوئی خاص احساس نہیں تھا کہ بگولے طوفان کس طرح بنتے ہیں اور جھونکے آندھیوں کی صورت کس طرح اختیار کرتے ہیں۔ کسی کو شاید مسئلے کی سنگینی کا احساس ہی نہیں تھا۔ شہروں یا دیہات کے ہر جگہ ہمیشہ ایسے لوگ کبھی نہ کبھی ایک سنگین مسئلہ بن جاتے ہیں جن کے ذہن میں یہ مجنونانہ خواہش سمائی ہوتی ہے کہ ان کے حکم کے بغیر کہیں پتا نہ ہلے۔ ایک وقت آتا ہے کہ ایسے لوگ سوسائٹی کے حلق میں پھنسے ہوئے رہ جاتے ہیں۔ سوسائٹی انہیں نہ تو نگل سکتی ہے اور نہ ہی اُگل سکتی ہے۔

غیسو فخریہ لہجے میں بولا۔ "ابھی اصل مزے کی بات تو میں نے تمہیں بتائی ہی نہیں۔" اس نے سلگتی بیڑی ہوا میں اچھال کر قہقہہ لگایا۔ "یہ جو ہمارا گولڈ کی کلب ہے..... یہ کسی قلعے سے کم نہیں ہے۔ اس پر قبضہ کرنا تو گیا..... اس تک پہنچنا ہی بڑا مشکل ہے لیکن اگر کبھی کسی طرح کوئی طاقت اس ٹھکانے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو بھی جائے تو اسے وہاں کچھ ایسے کاغذات اور دیگر ثبوت ملیں گے جن سے ظاہر ہو گا کہ اس اڈے کی مالکن تمہاری رئیسانی زرتاج ہے....."

ویرانے میں اس کا جناتی سا قہقہہ گونج کر رہ گیا۔ وہ مجھ پر یہ انکشاف کر کے گویا بہت محظوظ ہوا تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے گھوڑے کی پشت پر لدی ہوئی برف کی ایک سِل بن کر رہ گیا تھا۔ میرا گھوڑا سیر حا جا رہا تھا لیکن میں گردن موڑے ایک ٹک غیسو خان کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کسی وجہ سے میرا گھوڑا ہنہنایا تو میں چونکا اور مجھے احساس ہوا کہ میرا اس قسم کا ردِعمل ظاہر کرنا کچھ زیادہ مناسب نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجالی۔

غیسو بولا۔ "خدانخواستہ اگر کبھی پولیس یا کوئی اور ایجنسی اس اڈے تک پہنچنے میں کامیاب ہو بھی گئی تو اس کے پاس اخبارات کو دینے کے لیے بڑی رنگین..... بڑی سنگین اور بہت لمبی کہانی ہو گی جسے اخبارات ایک عرصے تک چھاپتے رہیں گے۔ سرخیاں لگیں گی۔ "بے مثل حسن کی مالک ایک بہت بڑی جاگیردارنی ایک انوکھا عشرت کدہ چلا رہی تھی" وہاں کیا کچھ ہوتا تھا، اخبار والے اس کی تفصیلات چٹخارے لے لے کر لکھیں گے اور پڑھنے والے اس سے

دو جلدیں
قیمت: 200/-
تاریک وادی
ایوب
تاریخی ناول

خالد بن ولید	الماس ایم۔اے۔/200
سلطان ٹیپو شہید	الماس ایم۔اے۔/200
نواب حیدر علی خاں	الماس ایم۔اے۔/200
سلطان صلاح الدین ایوبی	الماس ایم۔اے۔/450

مکتبہ القریش اُردو بازار۔لاہور2

زیادہ چٹخارے لے لے کر پڑھیں گے۔ زرتاج کی اپنی شخصیت کچھ ایسی ہے کہ اس قسم کی کہانی اس سے وابستہ ہو گی تو اس کی سنسنی کئی گنا بڑھ جائے گی۔ کیا خیال ہے؟" اس نے داد طلب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلایا۔ "جانو واقعی بہت ذہین آدمی ہے۔ اس کے زیرِ سایہ رہ کر انسان کچھ نہ کچھ بن سکتا ہے۔"

غیسو تائید میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس کہانی پر لوگوں کو اس لیے بھی آسانی سے یقین آ جائے گا کہ وہ زمین جس میں وہ اڈا بنایا گیا ہے، کسی زمانے میں زرتاج کے باپ ہی کی ملکیت تھی۔ ان کے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے حکومت نے زرعی اصلاحات کا کافی شور شرابا مچایا تھا۔ دولت والے چالاک تو بہت ہوتے ہیں، اپنی زمین بھلا کس نے چھوڑنی تھی؟ سب نے زمینیں بچانے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ لیا تھا۔ اگر کسی نے تھوڑی بہت قربانی دی بھی تھی تو بنجر اور بے کار زمین کی دی تھی۔ زرتاج کے باپ نے بھی وہ بنجر اور بے کار زمین چھوڑ دی تھی اور زرعی اصلاحات کے ڈرامے میں تھوڑی سی نیک نامی کمالی تھی۔"

اب ہمارے گھوڑے ایک خاصے اونچے ٹیلے پر چڑھ رہے تھے۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد وہ ایک لمحے کے توقف سے بولا۔

"بہت لمبے چوڑے علاقے میں صرف تمہاری رئیسانی ایسی ہے جس نے ہم سے کچھ زیادہ بنا کر نہیں رکھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے ہمیں کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ نقصان پہنچانے کی تو خیر اس کی کبھی ہمت ہی نہیں پڑی ہوگی لیکن اس نے کبھی ہمیں کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچایا۔ یہ چیز ہماری نظر میں بہت کھٹکتی ہے کہ کوئی ہمیں فائدہ پہنچانے کی طاقت رکھتا ہو مگر نہ پہنچائے۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"ہاں..... ہاں۔ کیوں نہیں۔" میں نے سمجھ داری سے سر ہلایا۔

"چنانچہ جب بھی جانو کے سر سے جاگیردارنی کے عشق کا بھوت اُتر گیا، ہم کسی نہ کسی چکر میں اسے بھی سیدھی کردیں گے۔ ایک چھوٹا موٹا..... ہلکا پھلکا دھچکا تو ہم اسے کل بھی پہنچانے والے ہیں۔ تمہیں شاید اس کے بارے میں یہ سُن کر صدمہ ہو۔" اس کے چہرے پر خباثت بھری مسکراہٹ بدستور رقصاں تھی۔

"مجھے کیوں صدمہ ہوگا؟" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "مجھے اس سے ہمدردی ہوتی تو میں تمہارے گروہ میں بھرتی ہونے تمہارے پاس کیوں آتا؟ اسے ہم جیسے غریب غربا کی ہمدردی کی ضرورت بھی کیا ہے؟ ہماری اہمیت اس کے لیے گدھے گھوڑوں سے.... زیادہ تو نہیں۔"

پھر میں نے اپنے لہجے کے تجسس کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "کل اسے تم لوگ کیا جھٹکا دینے والے ہو؟"

"زرتاج نگر میں ایک ہی بینک ہے۔ تم نے تو دیکھا ہی ہوگا۔" وہ بڑی ترنگ میں بولا۔

"ہاں۔ دیکھا تو ہے لیکن کبھی وہاں پیسے رکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اتنے فالتو پیسے ہی نہیں ہوئے کبھی ہمارے پاس۔" میں نے مسکینی سے کہا۔

اس نے ایک بار پھر بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ میں اسے زیادہ نہیں جانتا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان صرف نفرت کا زہریلا رشتہ تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ اتنا خوش وہ کبھی کبھار ہی نظر آتا ہوگا جتنا آج نظر آرہا تھا۔

"ہاں۔ بینک تم جیسوں کے لیے نہیں کھولے جاتے۔" اس نے گویا میری مسکینی سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ "تم تو کبھی اندر بھی نہیں گئے ہوگے؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے تو کبھی کسی نے اپنا چیک کیش کرانے یا رقم جمع کرانے بھی نہیں بھیجا۔"

میں نے آج ہی گاؤں کے بازار سے گزرتے وقت بینک کا بورڈ دیکھا تھا۔ اس وقت بینک بند تھا اور اس کے دروازے پر لوہے کی گرل مقفل تھی۔ وہ ایک ہی بڑے سے کمرے پر مشتمل معلوم ہوتا تھا۔

وہ ہنس کر بولا۔ "گنگالوں پر کون اعتبار کرتا ہے۔ خیر..... میں تمہیں یہ بتانے لگا تھا کہ اس بینک میں گاؤں والوں کی رقم کا تو نہ لین دین نہیں ہوتا۔ اصل میں بینک کی یہ شاخ صرف تمہارے رئیسانی کی خدمت کے لیے کھولی گئی ہے۔ زیادہ رقم اسی کی ہوتی ہے۔ اسی کا لین دین چلتا ہے۔ آج کل کٹائی کا زمانہ ہے۔ اس کی فصل کے ٹرک بھر بھر کر شہر جارہے ہیں اور منڈی سے رقمیں آرہی ہیں۔ بینک کی اس برانچ سے کیش روزانہ نیشنل بینک کو بھیجنے کی سہولت موجود نہیں ہے۔ پورے پندرہ دن بعد نیشنل بینک کی گاڑی کیش لینے آتی ہے۔ کل چودھواں دن ہے۔ یعنی کل بینک میں زیادہ سے زیادہ کیش موجود ہوگا۔"

"تو پھر.....؟" میں نے بظاہر پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"کل دوپہر کے لیے ہم نے اپنے چار آدمیوں کی ڈیوٹی لگائی ہے کہ ایک بجے جب عام لوگوں کے لیے لین دین بند ہوجائے اور بینک میں صرف عملے کے تین آدمی حساب کتاب میں مصروف ہوں تو انہیں کیش کے بوجھ سے نجات دلا دی جائے۔ خواہ مخواہ بے چاروں کو رقم سمیت سمیٹ کر رکھنی پڑتی ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"یعنی ڈاکے کا پروگرام ہے؟" میں نے بظاہر خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ فی الحال تم یہی لفظ استعمال کرسکتے ہو کیونکہ ابھی تم باقاعدہ طور پر گروہ میں شامل نہیں ہوئے ہو۔ ورنہ ہم تو ایسے موقعوں پر یہی کہتے ہیں کہ ذرا کیش کا بندوبست کرنے جارہے ہیں۔" وہ خوش دلی سے بولا۔

پھر جیسے اسے کوئی خیال آیا۔ ایک ہاتھ سے وہ اپنی ٹوپی درست کرتے ہوئے بولا۔ "میں ابھی جاکر جانو سے بات کروں گا۔ اگر اس نے اجازت دی تو کل والی اس واردات میں تمہیں بھی شامل کرلیں گے۔ اپنے گھر سے ہی کام شروع کردو۔ بالکل سیدھا سادہ اور آسان سا کام ہے۔"

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھ کر چٹکی بجائی۔ "یوں جاؤ گے اور یوں رقم سمیٹ کر لے آؤ گے تم لوگ۔ اس قسم کے کاموں میں ہمیں زیادہ گھاگ لوگوں کو بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اناڑیوں سے بھی کام چل جاتا ہے۔ کیا خیال ہے..... چلے جاؤ گے نا؟"

میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے حوصلے یا میری وفاداری کا ہلکا سا امتحان لے رہا تھا کہ میں یک دم ڈاکا زنی میں کود پڑنے اور اپنے ہی علاقے سے آغاز کرنے کے لیے تیار ہوں یا نہیں؟

"میرا اپنا ہی گاؤں ہے..... کوئی مجھے پہچان تو نہیں لے گا؟" میں نے گویا اس کی تجویز کے سلسلے میں ذہنی طور پر نیم رضامند ہوتے ہوئے پوچھا۔

"تم کافی سیدھے آدمی معلوم ہوتے ہو اور تمہاری یہی بات مجھے پسند بھی آئی ہے۔ سیدھے اور سچے سے آدمی اگر ڈاکو بننے پر

تُل جائیں تو بڑے غضب کے ڈاکو ثابت ہوتے ہیں۔" وہ خوش دلی سے بولا۔ "بھئی تم سب لوگ ڈھاٹے وغیرہ باندھ کر جاؤ گے۔ ساری احتیاطیں جو اس قسم کے کاموں میں ضروری ہوتی ہیں وہ کرو گے۔ ہمیں منہ اٹھا کر دندناتے ہوئے جانے اور شیخی جھاڑنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ ہمیں تو اپنے کام سے مطلب ہے۔ کام صحیح ہونا چاہیے اور مال ہمارے ہاتھ آنا چاہیے۔"

پھر وہ گویا مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "تمام احتیاطوں کے باوجود اگر کبھی کسی واردات میں کوئی تمہارا یہ پیارا سا کھڑاک دیکھ بھی لے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب تم ہمارے زیرِ سایہ آجاؤ گے تو تمہیں اس قسم کی چھوٹی موٹی باتوں پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

پھر اس نے گویا میری ڈیوٹی کی نوعیت کا بھی فیصلہ کر دیا۔ "تم بینک کا دروازہ سنبھالنے کے لیے موزوں رہو گے۔ باہر سے کوئی بھی شخص کسی بھی صورت میں اندر نہ آنے پائے۔"

"بے فکر رہو۔" اگر میں دروازے پر جم کر کھڑا ہو گیا تو پھر کمان سے نکلا ہوا تیر یا گن سے نکلی ہوئی گولی بھی اندر نہیں آسکے گی۔" میں نے اسے اطمینان دلایا پھر گویا معاملے میں مزید دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔ "بینک میں کُل کتنے آدمی ہوں گے؟"

"چار۔" نمیسو نے جواب دیا۔ "موٹی توند والا تھل تھل کرتا سُست اور ڈرپوک منیجر۔ ایک سوکھا سا کیشیئر۔ وہی کچھ تیز و طرار سا ہے۔ اس سے ذرا ہوشیار رہنے کی ضرورت ہو گی لیکن تمہیں نہیں۔ یہ ہمارے ان آدمیوں کی ذمے داری ہو گی جو اندر جائیں گے۔ ایک بے ضرر سا کلرک یا شاید اکاؤنٹنٹ ہے۔ ایک قریب المرگ قسم کا گن مین ہے جو توڑے دار بندوق سنبھالے ایک طرف بیٹھا اونگھتا رہتا ہے۔ چھوٹی موٹی برائچوں پر عام طور پر اسی قسم کے گن مین دیکھنے میں آتے ہیں جن کی بندوقیں شاید پہلی جنگِ عظیم کے زمانے کی ہوتی ہیں اور انہیں زنگ لگا ہوتا ہے۔ محسوس یہی ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے فائر کرنے کی کوشش کی تو بندوق پھٹ پڑے گی اور کسی دوسرے کو مارنے کے بجائے وہ خود ہی مارے جائیں گے۔ شاید اسی لیے بے چارے ڈاکے وغیرہ کی صورت میں فائر نہیں کرتے اور بڑی آسانی سے ڈاکوؤں کے قابو میں آجاتے ہیں۔ یہ صرف دکھانے کے دانت ہیں۔ وہ بھی کیڑا لگے ہوئے۔"

میں ہنس دیا۔ نمیسو بولا۔ "بینک والے بالکل مطمئن اور بے فکر رہتے ہیں کیونکہ زرتاج نگر میں چھوٹے موٹے جھگڑوں کے سوا برسوں سے کوئی قابلِ ذکر واردات نہیں ہوئی۔ وہاں ہم ہی کوئی واردات کر سکتے تھے لیکن ہم نے اب تک اس گاؤں پر نظرِ کرم رکھی تھی لیکن اب وقت آگیا ہے کہ وہاں کی دولت میں سے بھی آٹھ دس لاکھ کا خراج وصول کر لیا جائے۔"

اس نے ایک اور بیڑی نکالی۔ گھوڑا روک کر اس نے بیڑی کو سُلگایا۔ کیونکہ ہوا اب کچھ تیز ہو گئی تھی۔ دور کہیں سے گیدڑوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ایک کش لے کر وہ گھوڑے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "شاید تمہیں معلوم ہو، بینک کے دو دروازے ہیں۔ ایک پچھلی گلی میں کھلتا ہے۔ احتیاطاً ہمارا ایک آدمی اُدھر بھی کھڑا ہو گا۔ وہ گلی بہت چھوٹی اور گندی ہے ورنہ ہم چھپ بھی اُدھر ہی کھڑی کرتے۔ فرار کے لیے تم لوگ جیپ استعمال کرو گے۔ ایک آدمی ڈرائیونگ سیٹ پر ہی موجود رہے گا اور جیپ کو اسٹارٹ رکھے گا۔ دو آدمی اندر جائیں گے۔ پانچویں تم ہو گے جو دروازے پر رہو گے۔"

پھر اچانک ہی اس نے پوچھا۔ "تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بولا۔ "لیکن اس واردات میں بہرحال وہی ڈرائیو کرے گا جس کی پہلے سے ڈیوٹی لگ چکی ہے۔ اسے ہی یہ بھی معلوم ہے کہ رقم کہاں لے کر جانی ہے۔ وہ رقم اڈے پر نہیں جائے گی۔"

پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "لیکن کسی ایمرجنسی کی صورت میں ڈرائیونگ کے لیے تمہاری ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔"

"میں تو ہر کام کے لیے حاضر ہوں۔" میں نے خلوص سے کہا۔ "بس مجھے موقع ملنا چاہیے۔"

"بس سمجھ لو تمہیں موقع مل گیا۔" وہ شاہانہ انداز میں بولا۔ اس نے اپنی حد تک تو گویا یقینی طور پر اس مہم کے سلسلے میں میرا "تقرر" کر دیا تھا۔ اسی لیے وہ مجھے سب کچھ سمجھا رہا تھا اور ہدایات دے رہا تھا۔

میں نے قدرے ہچکچاہٹ سے کہا۔ "علاقہ تو میرا اپنا ہے..... لیکن چونکہ مجھے یہاں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا..... اور جتنا عرصہ بھی گزرا ہے وہ شریفانہ انداز میں ہی گزرا ہے، اس لیے مجھے پولیس وغیرہ کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں چنانچہ تم سے ہی پوچھ رہا ہوں کہ زرتاج نگر میں پولیس کی کیا پوزیشن ہے؟"

"کیوں..... کیا ڈر رہے ہو؟" نمیسو نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ شاید اس کے ذہن میں یک دم اس اندیشے نے سر ابھارا تھا کہ میں بزدل تو ثابت نہیں ہوں گا۔

"ارے نہیں یار!" میں نے قہقہہ لگایا۔ "اب اس لائن میں رہنا ہے تو میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"زرتاج نگر میں ایک تھانہ تو موجود ہے۔ وہ تو تم نے دیکھا ہی ہو گا؟" اس نے جاننا چاہا۔

"ہاں۔ باہر سے تو دیکھا ہے۔ شکر ہے اندر سے نہیں دیکھا۔" میں نے جواب دیا۔

"وہاں اکثر صرف ایک انسپکٹر، ایک اے ایس آئی، ایک محرر اور دو کانسٹیبل بیٹھے تاش کھیلتے رہتے ہیں یا نذرانے میں آئی ہوئی مرغیاں بھون کر کھاتے رہتے ہیں۔ وہ بے چارے تو اس جگہ سے بڑے بیزار ہیں جہاں کوئی خاص واردات نہیں ہوتی۔ وہ تو بدمعاشی

کا رُجحان رکھنے والے کئی لوگوں کو تھپکی دے چکے ہیں کہ وہ کچھ ہمت پکڑیں اور غلط سلط دھندے شروع کریں مگر بڑا کام دکھانے یا غلط سلط دھندے شروع کرنے کی کسی کی ہمت ہی نہیں پڑتی۔ علاقے پر زرتاج کا کنٹرول کافی سخت ہے۔"

"ایسا کیوں ہے؟" میں نے بیزاری سے کہا۔ "میں اس کا کارندہ ہوتے ہوئے بھی اس بات کو نہیں سمجھ سکا کہ وہ عورت ہو کر بھی اتنا سخت کنٹرول قائم رکھنے میں کیسے کامیاب ہے؟ جبکہ وہ اپنی دہشت پھیلانے کے لیے کچھ خاص حرکتیں بھی نہیں کرتی۔ باہر بھی کم نکلتی ہے۔"

"بہت سادہ سی بات ہے۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آئی؟" نمیسو نے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ "وہ خود دیانتدار ہے اور دولت کی لالچی نہیں ہے۔ بس ان دو خصوصیات کی وجہ سے وہ علاقے پر اپنا سخت کنٹرول قائم رکھنے میں کامیاب ہے..... لیکن ایک بات طے ہے کہ ایک بار کوئی بڑی واردات ہو گئی اور اس کے ذمے دار لوگ پکڑے نہ گئے تو پھر سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ جرم ایک ایسی کھیتی ہے کہ ایک بار کہیں اس کا بیج پڑ جائے تو بڑی تیزی سے پھلتی پھولتی ہے۔"

میں اس کی باتیں سن رہا تھا اور میرے تصور میں زرتاج کا چہرہ گھوم رہا تھا جس پر صرف طمانیت کی چاندنی تھی، اندیشوں کی کوئی پرچھائیں نہیں تھی۔ اس بے چاری کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے اردگرد کیسے نقشے جڑ پکڑ رہے تھے۔ کیسی کیسی بلائیں اپنے جال بُن رہی تھیں۔ وہ اپنے آئیڈیل ازم میں مگن اور اپنے معمولات میں منہمک تھی۔

نمیسو کہہ رہا تھا۔ "تھانے والے خانہ پُری کریں گے۔ رئیسانی کا کوئی خاص اثر و رسوخ بھی نہیں ہے جو وہ زیادہ آگے جانے کی کوشش کرے۔"

"اس کا اثر و رسوخ نہیں ہے؟" میں نے حیرت اور بے یقینی سے پوچھا۔

"ایسا اثر و رسوخ نہیں ہے جو اس کے کام آسکے۔ بس دکھاوے ہی دکھاوے کا ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "اس نے کبھی اثر و رسوخ صحیح معنوں میں بڑھانے کی کوشش ہی نہیں کی ورنہ اس جیسی عورت تو نہ جانے کیا قیامت ڈھاتی۔ اس نے شاید اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ وہ سوچتی ہو گی کہ جب وہ کوئی غلط کام نہیں کرتی، کسی ہیرا پھیری میں ملوث نہیں، کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتی تو اسے آڑے وقت میں کام آنے والے لوگوں سے تعلقات بڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"ہاں..... اس طرح کی باتیں کرتے اسے میں نے بھی سنا ہے۔" میں نے سر ہلایا۔

"لیکن اسے نہیں معلوم کہ آج کل کے زمانے میں یہ فارمولے غلط ہو جاتے جا رہے ہیں۔" وہ الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "آج کل تو مجرموں کو اپنی حفاظت اور بچاؤ کے لیے اونچے لوگوں سے رابطے رکھنے پڑتے ہیں اور شریفوں کو اپنی شنوائی کے لیے۔ اگر شریف لوگوں کے صحیح جگہوں پر رابطے نہیں ہوں گے تو کوئی ان کی فریاد بھی نہیں سُنے گا۔ کیا سمجھے؟ میں غلط کہہ رہا ہوں کیا؟"

"سولہ آنے صحیح بات ہے۔" میں نے تائید میں سر ہلایا۔

"اگر زرتاج اس واردات کے..... یا آئندہ کی کسی بھی واردات کے سلسلے میں کچھ کرنے میں کامیاب بھی ہو گئی تو ہم اسے سنبھال لیں گے۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ دو چار وارداتوں کے بعد خود ہی تمہارا حوصلہ اتنا بڑھ جائے گا کہ تمہیں کسی مشورے اور تسلی کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

اب میرا یہ یقین پختہ ہو چکا تھا کہ وہ اتنا جاہل اور کوڑھ مغز نہیں تھا جتنا اپنے سراپا سے نظر آرہا تھا۔ جانو جیسے شاطر شخص نے یونہی تو اسے اپنا نائب نہیں بنا رکھا تھا۔ اس اعتبار سے گویا وہ اور بھی بڑی چیز تھا۔ عیار اور مکار لوگ جب خباثت کے راستے پر نکلتے ہیں تو بہت دور تک جاتے ہیں اور دنیا کو زیادہ آزار پہنچاتے ہیں۔ وہ زیادہ تر نئے ہتھکنڈوں سے دنیا کو ستاتے ہیں۔ ان کے ذہن سے کسی مثبت سوچ کا گزر نہیں ہوتا۔

دفعتاً وہ سامنے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہ سرکنڈوں کا جنگل سا نظر آرہا ہے نا..... اس کے پیچھے بہت بڑی دلدل ہے..... اور وہ بائیں ہاتھ پر اونچی اونچی پہاڑیاں ہیں۔ گھوڑوں کے لیے ان پر چڑھنا..... اور خاص طور پر تھکن کی حالت میں چڑھنا پھر دوسری طرف اترنا کافی مشکل ہے۔ اگر ہم ان کے گرد چکر کاٹ کر جائیں تو دسیوں میل کا فرق پڑ جائے گا اور اس طرف کا راستہ بھی بڑا ہی خراب ہے....."

سمتوں کے ساتھ میں نے یہ سب کچھ ذہن نشین کرتے ہوئے پوچھا۔ "تو پھر ہم اب کیا کریں گے؟"

"قدرت کا کمال دیکھو۔ سرکنڈوں کے جنگل اور پہاڑیوں کے درمیان یہاں سے تو کافی فاصلہ نظر آرہا ہے نا؟ لیکن آگے چل کر صرف ایک پٹی سی رہ جاتی ہے جو ٹھوس ہے۔ باقی سب دلدل ہے۔ تقریباً ایک میل تک وہ صرف اتنی چوڑی ہے کہ اس پر سے ایک گھوڑا گزر سکتا ہے۔ وہ بھی احتیاط کے ساتھ۔ اگر اس کا رخ ذرا سا بدلا تو سیدھا دلدل میں۔"

"اوہ.....!" میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"دلدل سے بہ خیر و عافیت گزرنے کا وہی ایک راستہ ہے۔ اس قسم کی بہت سی جگہیں ہیں جہاں سے گزرتے وقت تمہیں زیادہ صحیح طور پر سمجھ آجائے گی کہ ہم سواری کے لیے اکثر گھوڑے کیوں استعمال کرتے ہیں۔" وہ بولا۔

"میں پہلے ہی بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"جہاں سے میں تمہیں بتاؤں گا وہاں سے تم میرے برابر چلنے کے بجائے بالکل میری سیدھ میں پیچھے پیچھے آؤ گے۔ اس پٹی پر چلنے کے دوران ہم آپس میں بات بھی نہیں کریں گے۔"

"بہت بہتر۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ان کے اڈے اور زر تاج نگر کے درمیان شارٹ کٹ یہی تھا..... اور یہ ایک ایسا شارٹ کٹ تھا جس سے ان کے اپنے علاوہ کوئی استفادہ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ شاید فطرت کے اس نظارے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ "میری زندگی کا زیادہ تر حصہ ویرانوں، جنگلوں اور پہاڑیوں میں گزرا ہے۔ انسان کو زندگی کا سلیقہ یہیں آتا ہے۔ شہر کی سڑکوں پر نہیں..... لیکن اتنی زمین دیکھنے اور بڑی عجیب عجیب چیزوں کا نظارہ کرنے کے باوجود اس طرح تین چیزیں مجھے کہیں اکٹھی نظر نہیں آئیں۔ یعنی سرکنڈوں کا جنگل..... پہاڑ اور دلدل۔ جہاں پہاڑ ہوتے ہیں وہاں عموماً دور دور تک دلدل نہیں ہوتی۔"

پھر وہ جیسے کسی خیال سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ "ان کے درمیان ٹھوس زمین کی جو پٹی ہے وہ تو بہت ہی کام کی چیز ہے۔ اگر تمہیں اس پٹی پر گھوڑا دوڑانے میں مہارت ہو تو تم اپنے تعاقب میں آنے والی پوری فوج کی فوج کو بھی دلدل میں دھنسا سکتے ہو۔ بہت دیر میں کسی کی سمجھ میں یہ بات آئے گی کہ تم کیسے صحیح سلامت گھوڑا دوڑائے جا رہے ہو اور تمہارے تعاقب میں آنے والے کیوں زمین میں غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ کیونکہ دلدل اور ٹھوس پٹی کے رنگ میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے کوئی ان کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتا۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ فخریہ سے لہجے میں بولا۔ "یہ گزرگاہ صرف ہماری دریافت ہے اور فی الحال صرف ہمارے ہی استعمال میں ہے۔"

بالآخر سرکنڈوں کے جنگل کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم محفوظ پٹی پر جا پہنچے۔ وہاں سے میں دھندلی سی روشنی میں نمیسو کے عین پیچھے احتیاط سے گھوڑے کو چلانے لگا۔ واقعی یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ پٹی کتنی چوڑی تھی۔ وہاں تاحدِ نظر زمین کا رنگ مٹیالا سا ہی تھا۔ کسی کو گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ وہاں کوئی دلدل موجود تھی۔

میں راستے کے بارے میں پوری طرح چوکس تھا اور اپنی توجہ مکمل طور پر ادھر ہی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن پھر بھی مختلف خیالات ذہن پر یلغار کیے ہوئے تھے۔ درحقیقت میں بے حد متفکر تھا۔

سچی بات یہ تھی کہ میں ذہن میں کوئی واضح منصوبہ لیے بغیر نمیسو سے آن ملا تھا۔ میرے ذہن میں بس ایک دھندلا سا خاکہ تھا کہ اگر نمیسو خان بے وقوف بن گیا تو میں اس کے ساتھ ان لوگوں کے اڈے تک جا پہنچوں گا اور ایک آدھ دن میں کوئی مناسب موقع پا کر ان کی غفلت کے کسی لمحے میں ان سب کو یا ان میں سے زیادہ سے زیادہ ڈاکوؤں کو موت کے گھاٹ اتار کر واپس بھاگ آؤں گا۔

لیکن اب مجھے اپنا یہ ارادہ بچکانہ سا لگ رہا تھا۔ میرے ذہن میں ان کے بارے میں یہی تصور تھا کہ وہ ڈاکوؤں کا کوئی چھوٹا موٹا گروہ تھا۔ میں نے جنگل میں جانوروں کی کمیں گاہ پر جن آٹھ دس افراد کو دیکھا تھا اور جن کی صورتیں بھی ذہن میں محفوظ کر لی تھیں، میرے خیال میں گروہ کل انہی پر مشتمل تھا اور ان کا صفایا کرنے سے گروہ کا قلع قمع ہو سکتا تھا۔ میرے لیے چوہے بلی کا کھیل ختم ہو سکتا تھا اور کم از کم ایک طرف سے تو میں مطمئن اور بے فکر ہو سکتا تھا۔

لیکن نمیسو خان کی باتوں نے میری آنکھیں کھول دی تھیں اور میری خوش فہمی دور کر دی تھی۔ وہ لوگ بظاہر تعداد میں تھوڑے اور معمولی ڈاکو ہی نظر آتے تھے لیکن درحقیقت وہ معمولی ڈاکو نہیں، اچھے بھلے دہشت گرد تھے اور مافیا کی طرح بڑے منظم اور مربوط انداز میں نہ جانے کہاں کہاں پھیلے ہوئے تھے۔ چار چھ کو مارنے سے گروہ مکمل طور پر ختم نہیں ہو سکتا تھا..... اور منہ اٹھا کر ان لوگوں میں جا گھسنا خود میرے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ حد سے زیادہ خود اعتمادی میرے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ یہ اتنا آسان اور سیدھا سادہ معاملہ نہیں تھا۔ اس میں کچا قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔

نمیسو تو نہایت سنجیدگی سے مجھے گروہ میں شامل کرنے کے لیے لے چلا تھا اور پرسوں سے شاید وہ لوگ مجھے "کام" پر بھی بھیج دیتے۔ کام بھی سب سے پہلے اپنی محسنہ ہی کے گھر میں نقب لگانے کا تھا لیکن میں اب محسوس کر رہا تھا کہ میرے لیے نمیسو سے جان چھڑا کر واپس چلے جانا ہی بہتر تھا..... لیکن اس کے لیے کون سا طریقہ مناسب ہو سکتا تھا؟ میں اسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے خود اپنے لیے کوئی راہِ فرار نہیں چھوڑی تھی۔

بہرحال میں نے یہ ضرور محسوس کر لیا تھا کہ ان کے اڈے پر جانے سے میرے لیے کسی بھی طرح فی الحال واپس چلے جانا ہی بہتر تھا۔ خواہ اس کے لیے مجھے نمیسو خان کو ٹھکانے ہی لگانا پڑتا۔ ویسے بھی میرا ارادہ اسے جہنم رسید کرنے کا ہی تھا لیکن اس کام کے لیے اب ان کے اڈے پر جانے اور کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے کے بجائے اس ویرانے میں ہی کچھ کر گزرنا بہتر تھا۔ اس کام کے لیے مناسب ترین وقت تو یہی معلوم ہو رہا تھا جب وہ میری طرف پشت کیے سیدھا آگے چلا جا رہا تھا۔

اتنے قریبی ہدف کے لیے تو ریوالور ہی کافی تھا اور میں قمیص کے نیچے ریوالور چھپائے ہوئے تھا لیکن پھر میں نے مناسب یہی سمجھا کہ میں [illegible] اک پٹی نمیسو کی رہنمائی میں ہی عبور کر جاؤں۔

یہاں فائر کرنے کا کوئی خطرناک ردِعمل بھی ظاہر ہو سکتا تھا۔ ابھی سفر باقی تھا اور اس سفر کے دوران اسے گولی مارنے کے بہت سے اچھے مواقع میسر آنے کی امید تھی۔

اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں مطمئن ہو گیا۔ اس شخص کو گولی مارنے کا تصور میرے لیے بڑا طمانیت بخش تھا۔

ایک میل کا وہ ٹکڑا مجھے بڑا طویل محسوس ہوا۔ بالآخر ایک جگہ رُک کر نمیسو نے مُڑ کر میری طرف دیکھا اور مطمئن لہجے میں بولا۔ "اب تم میرے برابر آ سکتے ہو۔"

میں اپنا گھوڑا ذرا ڈرتے ڈرتے اس کے برابر لے گیا۔ اس پٹی اور دلدل کے درمیان اب بھی کوئی فرق ظاہر نہیں ہوا تھا، تاہم میں نے اس کی سیدھ ذہن نشین کر لی تھی۔

چند لمحے ہم خاموشی سے محوِ سفر رہے۔ بالآخر نمیسو نے ہی سکوت توڑا۔ "کس خیال میں پھنسے ہوئے ہو؟"

"میرا ذہن پھر اس اڈے کی طرف چلا گیا تھا۔ 'لولڈ کی کلب' کی طرف۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "جو لوگ وہاں ضرورت کی چیزیں وغیرہ پہنچاتے ہوں گے وہ بھی تو اس ٹھکانے سے واقف ہوں گے؟"

"وہاں کوئی بھی شخص کوئی چیز پہنچانے نہیں آتا۔ ہر چیز ہمارے آدمی اپنی گاڑیوں میں لے کر آتے ہیں۔ اگر کبھی ان کلاشنکوفوں کی طرح کوئی خاص کیپ آئی ہو تو ان کے لیے الگ ٹھکانے ہیں۔ پہلے چیز وہاں آتی ہے، وہاں سے ہم کلب میں منتقل کرتے ہیں۔ کلب سے وہ چیزیں تقسیم ہو کر وہاں پہنچ جاتی ہیں جہاں ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہیں ہمارے انتظامات میں سر کھپانے کی ضرورت نہیں۔ سب کام بڑے شاندار طریقے سے چل رہا ہے۔"

"بہت خوب!" میں نے ایک بار پھر مرعوبیت کا اظہار کیا۔

دفعتاً نمیسو ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "کچھ کھا پی لینا چاہیے اور تھوڑی دیر سستا لینا چاہیے۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔"

"کھائیں گے کیا؟" میں نے ذرا حیرت سے کہا۔ "ہمارے پاس کھانے کے لیے تو کچھ نہیں ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" وہ مسکرایا۔ "مجھے معلوم تھا، راستے میں بھوک لگے گی۔ میں بندوبست کر کے چلا تھا۔" وہ گھوڑے سے اتر آیا۔

ایک صاف سی جگہ دیکھ کر نمیسو نے چادر بچھائی اور اس پر بیٹھ کر اس بیگ میں سے ایک بڑا سا پیکٹ نکالا جس میں میرے خیال میں رقم کا پیکٹ بھی موجود تھا۔ اخباروں کی تہیں وغیرہ کھولنے کے بعد اس پیکٹ سے دو چرغے برآمد ہوئے۔ نمیسو نے ایک چرغا کاغذ پر میرے سامنے رکھ دیا اور دوسرا خود وحشیانہ انداز میں اُدھیڑتے ہوئے بولا۔ "ڈاڑھ تو گرم ہو ہی جائے گی۔"

میں آہستگی سے مُرغی کی ٹانگ چباتا رہا، نمیسو کی طرف دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ مجھے فیصلہ کُن قدم کب اٹھانا چاہیے۔ اب زیادہ تاخیر مناسب نہیں تھی۔

چرغا چٹ کر کے وہ کلاشنکوف ایک طرف رکھ کر لیٹتے ہوئے بولا۔ "ذرا کمر ہی سیدھی کر لیں۔" پھر اسے ہچکی آئی اور وہ مونچھوں کو بل دیتے ہوئے بولا۔ "یار..... اوہ میرے گھوڑے کی زین سے پانی کی بوتل بندھی ہوئی ہے، وہ تو کھول لاؤ۔"

اس کا گھوڑا جھاڑیوں پر منہ مارتا ذرا دور چلا گیا تھا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے قریب پہنچا اور پانی کی بوتل زین سے کھول کر جونہی مُڑا، میری رگوں میں لہو منجمد سا ہو گیا۔

نمیسو خان جسے میں نے ایک لمحے پہلے تھکے تھکے سے انداز میں بے پروائی سے لیٹے دیکھا تھا، وہ اب ایک گھٹنے کے بل کسی درندے کی طرح چوکنا کھڑا تھا۔ اس کی کلاشنکوف تو بدستور ایک طرف چادر پر ہی پڑی تھی لیکن اس کے ہاتھ میں ایک بدصورت سا ریوالور نظر آ رہا تھا جس کا مُنہ میری ہی طرف تھا۔

میری کلاشنکوف بھی چادر پر ہی پڑی تھی۔ اضطراری طور پر میں نے قمیص کے نیچے چھپے ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا لیکن نمیسو فوراً بولا۔ "نا..... نا برخوردار.....! نمیسو خان کے سامنے اس قسم کی حماقت نہ کرنا۔ میرے نشانے کے بارے میں تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔ دیکھو..... میں ایک فائر کروں گا۔ اگر تم اپنی جگہ سے بال برابر بھی نہ ہلے تو گولی تمہارے بائیں کان کے پاس سے گزرے گی۔ بالکل پاس سے....."

میں اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ اس ویرانے کے سناٹے میں فائر کا دھماکا خاصا خوفناک محسوس ہوا۔ گولی میرے بائیں کان کی لو کو تقریباً چھوتی ہوئی گزری۔

میرے تاثرات شاید کچھ اس قسم کے تھے کہ نمیسو کو یقیناً بے تحاشا ہنسی آ رہی تھی لیکن وہ ایک مختصر قہقہے پر اکتفا کرتے ہوئے بولا۔ "کیا تم واقعی مجھے اتنا ہی احمق سمجھے تھے افضل خان؟"

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں نے ابتدا ہی سے اسے ایک جاہل، احمق اور کوڑھ مغز سمجھا تھا مگر اب محسوس ہو رہا تھا کہ احمق وہ نہیں، میں تھا۔ اس کے بارے میں میری رائے تو کافی دیر پہلے سے بدل چکی تھی لیکن ابھی میں اس بدلی ہوئی رائے کی روشنی میں کوئی قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے پانسا پلٹ دیا۔

بہرحال..... جو غلطی سرزد ہونی تھی وہ تو اب ہو ہی چکی تھی۔ اس پر پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ انسان زندگی کے میدان میں خواہ کتنا ہی کامیاب ہو، یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کا اٹھایا ہوا ہر قدم ہی درست ثابت ہو گا۔

بعض اوقات برقی رو کا جھٹکا لگنے سے انسان کے اعصاب جھنجھنا اٹھتے ہیں لیکن وہ جھٹکا اس کے لیے مفید بھی ثابت ہوتا ہے۔ اس کی بہت سی خفیہ اور خفتہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں، اگر

جھٹکا مناسب ووولٹیج کا ہو تو بعض اوقات اس سے فالج کے مریضوں کو بھی فائدہ ہو جاتا ہے اور دماغی مریضوں کی حالت بھی بہتر ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح خمیسو خان نے مجھے جو جھٹکا لگایا تھا وہ کچھ فائدہ مند بھی محسوس ہو رہا تھا۔

میرے اندر جو ایک درندہ سویا ہوا تھا' میں نے ایک جھٹکے سے اسے بیدار ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ میں سرتاپا آنکھ بن گیا۔ بظاہر میں ساکت ہی رہا لیکن میرے اندر نہ جانے کتنی قوتیں متحرک ہو گئیں۔ صرف ایک ثانیے کے لیے میں نے اپنے آپ کو خوفزدہ محسوس کیا تھا' لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خوف ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔

صرف یہ احساس رہ گیا تھا کہ میں اچانک ذرا مشکل صورتِ حال میں گرفتار ہو گیا تھا۔ جس طرح اچھے بھلے سمجھدار اور باصلاحیت شخص کا پاؤں بھی راہ چلتے وقت اچانک کسی گڑھے میں پھنس سکتا ہے' بالکل اسی طرح مجھ پر بھی ذرا مشکل آن پڑی تھی اور مجھے اپنی صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے اس سے نکلنا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ موت اور زندگی کے درمیان صرف بال جیسی باریک لکیر ہوتی ہے لیکن اس حد فاصل کے ایک طرف رہنا کوئی ایسا مشکل بھی نہیں۔ کم از کم مجھے اب بھی زندگی والی سائڈ پر ہی رہنا ناممکن محسوس نہیں ہو رہا تھا' لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ میں کوئی غلطی نہ کروں۔

میدان میں دُھندلی دُھندلی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ روشنی کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن میں اس کی بھوؤں کی خفیف سی جنبش بھی صاف دیکھ رہا تھا اور غالباً یہی عالم اس کا تھا۔ ایک درندہ یقیناً اس کے اندر بھی رہتا تھا بلکہ وہ درندہ اس کے اندر تو کم ہی رہتا تھا' زیادہ تر باہر ہی جھانکتا رہتا تھا۔ اس وقت وہ درندہ بھی پوری طرح چوکس تھا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ بھی مزید کچھ نہیں بولا تھا۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ کی نشانیاں غائب ہو چکی تھیں۔ چند لمحے ہم آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ساکت کھڑے رہے۔ درندوں کی بہت سی حسیات انسانوں سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہیں۔ خمیسو نے یقیناً محسوس کر لیا تھا کہ میرے اندر بھی کوئی درندہ بیدار ہوا ہے۔ ایک درندہ دوسرے درندے کی موجودگی کو فوراً محسوس کر لیتا ہے..... لیکن وہ شاید اس دوسرے درندے کو کوئی اہمیت دینے پر تیار نہیں تھا۔ اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ اس کی سفاک آنکھوں میں تکبّر عود کر آیا۔

آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا وہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے معلوم ہے تمہارے اندر کوئی قوت بیدار ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود تم کیا کر سکتے ہو؟ میرے لیے تمہاری حیثیت ایک چیونٹی سے زیادہ نہیں۔ میں جب چاہوں گا تمہیں مسل دوں گا۔"

اس تصور سے وہ گویا محظوظ ہو رہا تھا۔ ریوالور کی نال میں خفیف سی جنبش ہوئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی گھنی مونچھیں بھی ذرا پھیل گئیں۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ میری نظر ریوالور کی نال پر جمی ہوئی تھی اور میں نے ابھی تک پلک نہیں جھپکی تھی۔ اس نے یقیناً میری دونوں آنکھوں کے عین درمیان کا نشانہ لیا تھا۔ میں نے سانس روک لی اور ٹریگر پر اس کی انگلی کے بڑھتے ہوئے دباؤ کا اندازہ کرنے لگا۔

جھکائی دے کر گولی سے بچنے کے آرٹ میں ساری اہمیت وقت کے تعین کی ہوتی ہے۔ اگر ریوالور کی نال سے گولی برآمد ہونے کے بارے میں آپ کا اندازہ ذرا بھی غلط ہو گیا اور آپ ایک پل پہلے جھکائی دے گئے تو ایک ماہر نشانے باز کی گن کی نال بھی اسی لمحے جھک سکتی ہے اور آپ کی کوشش رائیگاں جا سکتی ہے۔ اگر آپ کو جھکائی دینے میں ایک پل کی تاخیر ہو گئی تب بھی آپ بچ نہیں سکتے۔

خمیسو خان کو شاید مجھ سے اندازے کی درستی کی توقع نہیں تھی۔ گولی چلی اور میں جھکائی دینے میں کامیاب رہا۔ میرے عضلات نے اس خفیف سی حرکت میں تقریباً گولی ہی کی رفتار سے میرا ساتھ دیا تھا۔ میدان میں فائر کی بازگشت گونجی لیکن اس میں میری چیخ یا کراہ شامل نہیں تھی۔

خمیسو بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم نے خواہ مخواہ تکلیف کی۔ یہ گولی تو صرف تمہارے بالوں کو چھوتی ہوئی گزرتی۔ میں تمہیں اتنی جلدی ہلاک کرنا نہیں چاہتا۔ تمہاری کھوپڑی یا دل میں اتارنے کے لیے تو میں صرف آخری گولی کام میں لاؤں گا۔ اس سے پہلے تو میں ایک ایک کر کے تمہارے دونوں بازوؤں میں..... پھر دونوں ٹانگوں میں..... اور پھر تمہارے پیٹ میں گولی ماروں گا۔ تمہیں شاید معلوم ہو کہ پیٹ میں گولی لگنے کے بعد موت بڑی اذیت ناک ہوتی ہے۔ میں تمہیں اذیت ہی کی موت مرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ آسان موت نہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ موت جب تمہارے وجود کو سر سے پاؤں تک آری کی طرح چیرتی ہوئی گزرے گی تو تمہارے تاثرات کیا ہوں گے۔"

میری نظر اب بھی اس کی انگلی پر ہی جمی ہوئی تھی جو ٹریگر پر ٹکی ہوئی تھی۔ اگر اس نے دوسری گولی ضائع کرنے کے بعد اندھا دُھند بھی تیسرا چوتھا فائر کیا ہوتا تو میں اس کے لیے بھی تیار تھا۔ گو کہ وہ محض ایک جُوا ہی ہوتا۔ ایسا جُوا جس میں بازی جیتنے کا امکان صرف ایک فیصد ہی تھا' لیکن بعض اوقات ایک فیصد بھی بہت کام آجاتا ہے' ننانوے فیصد دھرے رہ جاتے ہیں۔

میرے ہونٹ غیر ارادی طور پر سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ میں نے قدرے کوشش سے انہیں حرکت میں لاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری مکروہ آنکھوں نے تو نہ جانے کتنی مرتبہ دیکھا ہو گا یہ تماشا۔ نہ جانے کتنے لوگوں کو تم نے ایسی ہی موت مارا ہو گا۔"

"بے شک۔" وہ ہنسا۔ اس کی ہنسی درندے کی غرّاہٹ سے مشابہ تھی۔ "لیکن دوسروں کی بات اور تھی' تمہاری بات کچھ اور

ہے۔ تمہیں تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھنا شاید میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہوگی۔ اسی لیے تو میں نے کلاشنکوف کے بجائے ریوالور اٹھایا ہے کہ کلاشنکوف کا اگر ہلکا پھلکا برسٹ بھی چل گیا تو کہیں تم فوراً نہ مرجاؤ۔"

شاید یہ قدرت کے نظام کا ایک حصہ ہے کہ بعض اوقات بے گناہوں کو متکبر اور خبیث قسم کے لوگوں کے ظلم و تشدد سے بچانے کے لیے وہ ان درندوں کے دماغ میں عجیب عجیب خناس پیدا کردیتی ہے۔ اگر ان کے دماغوں میں وہ خناس پیدا نہ ہوں تو شاید وہ چند سیکنڈ میں، بغیر کسی رکاوٹ اور مزاحمت کے اپنا کام کر گزریں۔

غمیسو خان کا مقصد بھی اگر صرف مجھے ہلاک کرنا ہوتا تو اس کا آسان ترین اور سیدھا سادہ راستہ یہی تھا کہ جب میری پشت اس کی طرف تھی، وہ کلاشنکوف اٹھا کر ایک برسٹ مارتا اور میرا قصہ تمام ہو جاتا لیکن قدرت نے اس کے دماغ میں ایک خناس ڈال دیا تھا۔ قدرت کے یہی اسرار و رموز ہوتے ہیں جن تک اکثر ہماری نظر نہیں جاتی۔

"مجھ پر اتنا غصہ کیوں ہے تمہیں؟" میں نے اس کی ٹریگر والی انگلی سے نظر ہٹائے بغیر پوچھا۔

"تم نے مجھے گھونسا مارا تھا... مجھے... یعنی غمیسو کو۔ جس پر آج تک کسی کو ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی" اس کے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ نفرت کے زہر میں بجھا ہوا تھا "مجھے ایک گھونسے سے بے ہوش کرکے تم اپنے آپ کو بہت بڑا طرّم خان سمجھ رہے تھے؟ وہ ایک اتفاق تھا کہ میں بے ہوش ہوگیا تھا۔ کھوپڑی کے کسی نازک حصے پر ہاتھ پڑ گیا ہوگا..... دوسرے میں اس کے لیے تیار نہیں تھا... مجھے تمہاری طرف سے جوابی حملے کا خطرہ ہی نہیں تھا... تم شکل سے بالکل مسکین لگ رہے تھے۔"

"میں مسکین لگ رہا تھا... اس کے باوجود تم سب مل کر میری ہڈیاں توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "تم لوگ اسی لیے تو مجھے زیادہ قابلِ نفرت لگے ہو کہ تمہارے ہاں مسکینوں سے وہ سلوک ہوتا ہے جو ظالموں سے ہونا چاہیے۔ ورنہ ڈاکو ہونے کی وجہ سے تم مجھے اتنے بُرے نہیں لگے تھے۔"

"مگر تم مسکین کہاں ہو؟ تم تو بڑی منحوس چیز ہو۔ میں نے تمہیں عام سا آدمی سمجھ کر سخت غلطی کی تھی۔" اس کے ہاتھ میں ریوالور ساکت تھا۔

"میں تو آج تک اپنے آپ کو عام سا آدمی ہی سمجھتا آیا ہوں" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "لیکن قدرت شاید فرعونوں کو ان کے انجام تک پہنچانے کے لیے عام آدمیوں کو خاص بنا دیتی ہے۔"

"میں نے تمہیں عام سا آدمی سمجھنے کی جو غلطی کی تھی اس پر میں حد سے زیادہ پچھتا رہا تھا۔ میں نے اپنی پیاری مرحوم ماں کی قسم کھائی ہوئی تھی کہ تمہیں ہر قیمت پر تلاش کرکے موت کے گھاٹ اتاروں گا۔" وہ بھی ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

"ایک گھونسے پر اتنا غصہ؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس احساس سے مجھے حیرت ہوئی کہ میں اس صورت حال پر کچھ زیادہ فکرمند نہیں تھا۔

"ہاں۔ میں نے بتایا نا کہ اس سے پہلے کسی کو جرأت نہیں ہوئی تھی غمیسو خان پر ہاتھ اٹھانے کی۔" وہ الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "میں پولیس کے ہتھے بھی چڑھا ہوں... جیل بھی گیا ہوں... جیل توڑ کر بھاگا تھا۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ ہم جیسے لوگ اگر پولیس کے قابو میں آجاتے ہیں تو ان کا کیا حشر ہوتا ہے لیکن یہ غمیسو خان کی دہشت تھی کہ تھانے میں... جیل میں... حوالات میں... کسی بڑے سے بڑے پھنّے خان نے بھی اسے انگلی تک نہیں لگائی تھی۔ مار پیٹ تو دور کی بات ہے، کسی نے آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات بھی نہیں کی تھی۔"

اس نے ایک طویل سانس لی لیکن اس کے ریوالور والے ہاتھ میں جنبش نہیں ہوئی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں بھلا میں کیسے معاف کرسکتا تھا؟ جب تم خود بخود ہی مجھ سے آن ٹکرائے تو میں نے دل ہی دل میں بڑا شکر ادا کیا تھا کہ مجھے تم کو تلاش کرنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔"

"یعنی تم نے مجھے شروع میں ہی پہچان لیا تھا؟" میں نے دوستانہ سے لہجے میں پوچھا۔

"بے شک۔" غمیسو نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے بعد کی سب باتیں تم مجھے بہلانے اور مجھ پر رُعب جمانے کے لیے کر رہے تھے؟" میں نے جاننا چاہا۔

"نہیں۔ باتیں سب ٹھیک تھیں۔ میں نے تم سے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں بولا، کوئی گپ نہیں ماری۔ سچ بول کر کسی کو بیوقوف بنانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ میں تمہیں ساتھ ساتھ لیے پھر رہا تھا، ہر بات بالکل ٹھیک ٹھیک بتا رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں مزہ لے رہا تھا۔ تم سمجھ رہے تھے، میں تمہارے ہاتھوں بے وقوف بن رہا ہوں۔ میں مزے لے رہا تھا کہ کس طرح تمہیں ساتھ ساتھ لیے پھر رہا ہوں اور تمہیں شبہ تک نہیں کہ میرے روپ میں دراصل تمہاری موت تمہیں اپنے ساتھ لیے... پھر رہی ہے۔ میں نے سوچا، تمہیں میرے ہاتھوں سے مرنا تو ہے ہی، کیوں نہ تمہیں اس دنیا سے رخصت کرنے سے پہلے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ بتا دوں۔ بڑا لطف آرہا تھا وہ باتیں کرنے میں۔ ہمیں اپنے بارے میں باتیں کرنے کا موقع کہاں ملتا ہے۔"

ایک بار پھر وہ خرخرانے کے سے انداز میں ہنسا۔ "لیکن مجھے تمہاری بے وقوفی پر یقین نہیں آرہا۔ کیا تم واقعی یہ سمجھ رہے تھے کہ راہ چلتے جانو کے نائب کو پکڑ کر درخواست کروگے کہ وہ تمہیں گروہ میں شامل کرلے اور وہ تمہاری بات مان لے گا؟ تمہیں اس وقت بھی شک نہیں ہوا جب میں نے اس پہلی ہی ملاقات میں اتنے بڑے بڑے معاملات تمہارے سامنے کھول کر رکھ دیے؟ چلو ا

باتوں کو بھی چھوڑو۔ تم نے اس پر بھی غور نہیں کیا کہ میں نے ابھی تک تمہارا نام بھی نہیں پوچھا تھا؟"

میں خاموش رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مجھ سے حماقت سرزد ہوئی تھی لیکن کم از کم غمیسو کے سامنے اس کا اعتراف کرنا ضروری نہیں تھا۔

وہ ترحم آمیز سے انداز میں بولا۔ "ویسے تم کیا سوچ کر مجھ سے ملے تھے؟ تمہارے ذہن میں کوئی بات تو ہوگی؟"

"ہاں۔ میرا ارادہ تھا کہ تم سب کو ہلاک کردوں گا..... ایسے ہی ویرانوں میں تمہاری قبریں بناؤں گا، ان کے سرہانے باقاعدہ کتبے نصب کروں گا اور سب سے اونچا کتبہ تمہاری قبر پر لگاؤں گا۔" میں نے سنجیدگی اور دیانتداری سے کہا۔

اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ فضا مرتعش ہو کر رہ گئی۔ وہ میری بات سے کچھ زیادہ ہی محظوظ ہوا۔ میں نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ "ابھی میں نے اپنا ارادہ ترک نہیں کیا ہے۔"

ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں پانی آنے لگا۔ میں دھندلی چاندنی میں اس کی آنکھوں میں نمی کی جھلاہٹ دیکھ رہا تھا۔

"تم ڈاکو کیوں بنے تھے غمیسو خان؟" میں نے اچانک ہی دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"تاریخ میں نام پیدا کرنے کے لیے، بڑا آدمی کہلانے کے لیے، الیکشن لڑنے کے لیے۔" وہ استہزائیہ سے لہجے میں بولا پھر یکدم جیسے اسے غصہ آگیا۔ زمین پر پاؤں مارتے ہوئے بالکل بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ابے گدھے! ظاہر ہے مجبوریوں کی وجہ سے بنا تھا۔ اس معاشرے نے بنایا تھا مجھے ڈاکو۔"

"بکواس ہے یہ۔ جھوٹ بولتے ہو تم۔" میں نے غیر متزلزل لہجے میں کہا۔ "اپنے گناہوں کا پشتارہ معاشرے کے کندھوں پر لادنے کا یہ بہت اچھا فارمولا ایجاد کر رکھا ہے تم لوگوں نے۔ تم جیسے لوگوں میں ڈاکو بننے کے جراثیم پہلے سے موجود ہوتے ہیں، تم صرف بہانے کی تلاش میں ہوتے ہو۔"

وہ خاموش رہا۔ میں نے تیزی سے کہا۔ "ہمارے ہاں زیادہ تر لوگوں نے وتیرہ بنا لیا ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ کر اپنے بے قصور ہم وطنوں، اپنے بھائیوں پر ظلم شروع کردیتے ہیں۔ کبھی شور برپا کیا کہ فلاں طبقے نے ہمارے حقوق دبا رکھے ہیں.... اور اس کے ساتھ ہی مار کاٹ اور آتشزنی شروع کردی۔ کبھی نعرہ بلند ہوا فلاں لوگ ہماری حق تلفی کر رہے ہیں.... اور اس کے ساتھ ہی بے گناہوں کا قتل عام شروع ہوگیا۔ یہ مظلومیت کا ردِ عمل نہیں، یہ صرف خباثت ہے۔ اگر کسی کو نظام سے شکایت بھی ہے تو نظام گلی محلوں میں رہنے والوں نے تو نہیں بنایا۔ پالیسیاں اور نظام تو اونچے اونچے دفتروں میں بنتا ہے۔ ان کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں پاتا۔ عام لوگوں کو مارنا شروع کردیتے ہیں۔"

وہ ایک ٹک مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "کیا یہ سیاسی تقریر کا موقع ہے؟"

"یہ سیاسی تقریر نہیں ہے، یہ تمہاری ہی کہانی ہے۔ تمہاری... اور تم جیسے بہت سے لٹیروں کی جو اندر سے ایک ہیں لیکن جنہوں نے اس سوسائٹی کو جہنم بنانے کے لیے مختلف لبادے اوڑھ رکھے ہیں، مختلف نعرے اپنا رکھے ہیں۔ اس دنیا میں خدا نے بھی انسانوں کو چھوٹا بڑا پیدا کیا ہے لیکن بعض کو جو کچھ ملتا ہے وہ اس پر قناعت نہیں کرتے، شکر نہیں کرتے۔ ان کی نظریں دوسروں کی طرف لگی رہتی ہیں۔ وہ ان سے سب کچھ چھین لینے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ تم بھی انہی بے شمار لوگوں میں سے ہو۔ واردات کے طریقے الگ الگ ہیں۔ گالیاں دینے کے لیے بے چارہ معاشرہ رہ گیا ہے۔ کسی بھی قسم کی سیاست کی آڑ میں لوگوں کے گھر اجاڑنے والے تم جیسے ڈاکو..... یا دوسرے دہشت گرد..... درحقیقت تم سب ایک ہو۔"

وہ دھیرے دھیرے میرے قریب آرہا تھا۔ معلوم نہیں اس کا ارادہ کیا تھا لیکن میں نے بات جاری رکھی۔ "جو حقیقتاً مظلوم ہوتے ہیں وہ کچھ اور طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے دلوں میں درد اور سوز و گداز ہوتا ہے۔ وہ تم لوگوں کی طرح شقی القلب نہیں ہوتے۔ اگر اس نظام میں تمہارے ساتھ واقعی کوئی زیادتی ہوئی ہو تو تمہیں جا کر ان کا گریبان پکڑنا چاہیے جو اس نظام کی تخلیق کے ذمے دار ہیں لیکن ان سے تم کوئی انتقام نہیں لے پاتے، ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ ان کے گرد فصیلیں مضبوط ہیں۔ ان کی حفاظت کے لیے دنیا جہاں کے انتظامات موجود ہیں۔ تم بظاہر بہت غضب ناک اور بہت طاقتور نظر آتے ہو لیکن درحقیقت تم لوگ بہت کمزور اور بزدل ہو۔"

"وہ کیسے؟" غمیسو پھنکارا۔

"وہ اس طرح کہ تم لوگوں کے غیظ و غضب اور انتقام کا نشانہ بھی مجھ جیسے تنہا اور کمزور لوگ بنتے ہیں یا پھر تم رئیسانی زرتاج جیسے سیدھے سادے اور اصول پرست لوگوں کے خلاف سازشیں کرتے ہو، بے گناہ لوگوں کو لوٹنے کے درپے رہتے ہو۔ کبھی کسی بھی ایسے شخص کو... یا اس کے بچے کو اغوا کرلیتے ہو جس کے پاس تمہیں دینے کے لیے رقم ہو۔ خواہ وہ اس نے جائز طریقوں سے اور محنت ہی سے کمائی ہو۔ کبھی ان بسوں یا گاڑیوں کو لوٹ لیتے ہو جن میں بے قصور لوگ اپنی عمر بھر کی پونجی یا محنت کی کمائی سے بنائی ہوئی چیزیں لے کر نہ جانے کس کس ارادے سے کن کن منزلوں کی طرف جا رہے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض تمہارے ہاتھوں مارے بھی جاتے ہیں۔ تم گاؤں بھی اجاڑتے ہو تو بے گناہ لوگوں کے۔ یہ سب لوگ تمہارے مجرم تو نہیں ہیں۔ انہوں نے تو تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔ ان میں سے تو بہت سے خود مظلوم ہوتے ہیں۔ یہ اچھا انتقام ہے تم لوگوں کا۔ انتقام ہمیشہ ظالم سے لیا جاتا ہے۔ اگر تم لوگوں نے آج تک ایک بھی طاقتور،

ظالم، عیار، مکار اور صاحب اختیار سے انتقام لیا ہوتا تو میں تمہارے سامنے گردن جھکاتا، تمہیں خراج تحسین پیش کرتا، تم سے محبت کرتا۔"

"چ۔۔۔ چ۔۔۔ چ۔۔۔" اس نے رُک کر متاسفانہ انداز میں سر ہلایا۔ اب وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ "یہ تو بہت برا ہوا شہنشاہِ معظم! ہم آپ کی محبت سے محروم ہوگئے۔ اب ہمارے لیے زندگی گزارنا ناممکن ہوجائے گا۔ موت ہمارا مقدر ہوگی۔ ہم پر رحم فرمایئے میرے آقا!" اس نے فلمی انداز میں گڑگڑاتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس پر ہنسی کا دورہ سا پڑ گیا۔ اسے میرے خیالات، نظریات اور ان کی سچائی یا اخلاص سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

پھر یکدم اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا اور وہ بالکل بدلے ہوئے لہجے میں غرا کر بولا۔ "سن بے چوہے! میں چاہتا ہوں کہ مرتے وقت تم یہ خوش فہمی دل میں لے کر نہ جاؤ کہ تم زندہ رہ جاتے تو نہ جانے کون سا تیر مار لیتے۔ اگر میں تمہیں مزید دس سال بھی زندہ رہنے کا موقع دے دوں تب بھی تم اکیلے تو کیا، تم جیسے سو دو سو مل کر بھی ہم سب کی قبریں نہیں بنا سکتے۔ صرف ایسے خواب دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے تمہیں اپنے گروہ وغیرہ کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، ہماری جڑیں اس سے زیادہ گہری ہیں۔"

"مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"اب پروا کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ اب موت جو تمہارا مقدر ہوچکی ہے..... لیکن زندگی کے آخری لمحوں میں تمہیں یہ پچھتاوا ضرور ہوگا کہ آخر قسمت نے تمہیں کیوں ہم سے لا ٹکرایا تھا۔"

"پچھتاتا تو میں نے ایک عرصے سے چھوڑ دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں تمہیں پچھتانے پر مجبور کردوں گا۔" وہ الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "میں تمہارے پیٹ میں گولی مارنے کے بعد تمہارے قریب ہی بیٹھوں گا۔ جتنی دیر تم ہوش میں رہو گے، بہت تڑپو گے۔ میں تمہاری ہر سسکی، ہر کراہ، ہر فریاد سننا چاہتا ہوں۔"

متوقع لذت کے تصور سے اس کے ہونٹ بھنچ کر رہ گئے۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ وہ سخت اذیت پرست انسان تھا۔ درندے ایسے انسانوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ وہ اذیت پرست نہیں ہوتے۔ وہ صرف زندگی، موت یا اپنی بقا کی جنگ لڑتے ہیں۔ اپنے حریف کو اذیتیں دے کر نہیں مارتے۔ کم از کم دانستہ طور پر وہ ایسا نہیں کرتے۔

اس بار اچانک ہی اس کے ریوالور کی نال جھکی اور میں اچانک ہی بجلی کی سی تیزی سے اچھلا۔ اس نے میری ٹانگ میں گولی مارنے کی کوشش کی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں باتوں میں الجھا ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکوں گا۔

گولی کی بازگشت ختم ہونے کے بعد ایک لمحے کے لیے میدان میں گہرا سکوت چھا گیا۔ ہم دونوں بھی اپنی جگہ ساکت تھے۔ بالآخر اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ "تم بے شبہ فنکار ہو۔ تمہارا زندہ رہنا ہمارے حق میں بالکل اچھا نہیں۔ نمیسو خان کی چلائی ہوئی گولی سے بچ جانے والا ہم سب کے لیے بہت بڑے خطرے کی گھنٹی ہے....."

بات کرتے کرتے ہی اس نے اچانک ایک اور فائر کیا۔ اب اس نے غالباً مجھے تڑپا تڑپا کر مارنے کا پروگرام ملتوی کردیا تھا کیونکہ اس بار اس نے جس لائن پر فائر کیا تھا اگر میں اس پر موجود رہتا تو گولی میری گردن سے گزر جاتی۔ لمحے کے صحیح تعین کے ساتھ ذرا سی جھکائی دیتے ہوئے میں بچ گیا لیکن وائلن کے تاروں کی طرح تنے ہوئے میرے اعصاب گویا ٹوٹنے کو تھے۔ مجھے احساس تھا کہ میرے جسم پر پسینے کی دھاریں رینگ رہی تھیں۔ یہ دھاریں میرے اعصاب میں اور بھی گدگدی سی کررہی تھیں..... لیکن میں ان کی سرسراہٹ سے بے نیاز رہنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے بہت دیر سے پلک بھی نہیں جھپکی تھی۔ اس وقت میں اپنی زندگی کی اہم ترین گنتی بھی کررہا تھا۔ چار گولیاں ضائع ہوچکی تھیں۔

اس کے ریوالور میں صرف دو گولیاں باقی تھیں اور اب کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ میرے جسم کے کس حصے پر..... اور کس طرح سے گولی مارنے کی کوشش کرے گا لیکن اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اندر ہی اندر وہ نروس ہوچکا تھا۔ اس کی خود اعتمادی میں دراڑ پڑ چکی تھی لیکن اس کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی بلکہ شاید اس کی کوشش تھی کہ اگر میں ریوالور سے خوفزدہ نہیں ہوسکا تھا تو کم از کم اس کے چہرے کی خونخواری سے ہی ڈر جاؤں۔

اب مسئلہ گویا یہ نہیں رہا تھا کہ اسے ریوالور کے استعمال میں کتنی مہارت حاصل تھی اور میں گولی سے بچنے کے آرٹ میں کتنا ماہر تھا بلکہ اب یہ گویا اعصاب کی جنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ اگر اس وقت میرے اعصاب مجھے دھوکا دے جاتے تو موت میرا مقدر تھی۔

اس عالم میں، میں مسکرا دیا۔ میری مسکراہٹ نے اس کی رگ دپے میں مقید غیظ و غضب کے بارود کو چنگاری دکھا دی۔ اس نے اپنے اعصاب پر کنٹرول کھو دیا۔ پانچواں فائر اس نے شدید جھنجلاہٹ میں کیا۔ جھنجلاہٹ میں چلائی گئی گولی سے بچنا میرے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔

اگر و۔ چھٹی گولی بھی اسی جھنجلاہٹ میں ضائع کردیتا تو میرے حق میں اچھا ہوتا لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ اس کے ہونٹ اس طرح بھنچ گئے کہ جھاڑ جھنکاڑ داڑھی مونچھوں کے درمیان غائب ہو کر رہ گئے۔

میرے جسم سے پسینہ بری طرح پھوٹ رہا تھا اور چند منٹ کی اس آزمائش نے میرے اعصاب چٹخا دیے تھے لیکن میں نمیسو کے

ریوالور پر نظر جمائے بدستور مسکرا رہا تھا اور پلک نہیں جھپک رہا تھا۔ نمیسو خان آخری گولی کو ہر حال میں صحیح استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کی تمام تر توجہ اب اسی مسئلے پر مرتکز تھی۔

اس سے ایک غلطی ہوئی تھی کہ وہ جذبات کی شدت میں ذرا آگے آگیا تھا۔ وہ اپنی اور میری دونوں ہی کلاشنکوفیں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اب وہ میرے اور کلاشنکوفوں کے تقریباً درمیان تھا۔ اس کا خالی ہاتھ غیر ارادی طور پر ہوا میں بلند ہوگیا تھا اور اس نے نیم دائرے میں کھسکنا شروع کردیا تھا۔

اپنی دانست میں وہ کسی بہتر زاویے کی تلاش میں تھا لیکن اس کی ہر کوشش فضول تھی کیونکہ میں نے بھی وہیں کھڑے کھڑے آہستگی سے گھومنا شروع کردیا تھا۔ یوں عملاً ہماری پوزیشن میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کی طرف اسی طرح دیکھ رہے تھے۔

اب میری زندگی اور موت کا دارومدار خدا کی مرضی کے بعد صرف اس بات پر تھا کہ وہ مجھے نچا دیتے ہوئے کتنی پھرتی سے فائر کرسکتا تھا اور میں کتنی تیزی سے گولی کے رُخ کو سمجھتے ہوئے اپنا بچاؤ کرسکتا تھا۔ میں نے اب سانس بھی روک لی تھی۔

چوہے بلی کا یہ کھیل چند لمحے سے زیادہ جاری نہیں رہا۔ اس نے اچانک ہی آخری داؤ کھیل لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس نے یہ داؤ بجلی کی سی تیزی سے کھیلا تھا۔ اس بار تو صاف طور پر ہی مجھے کسی غیبی قوت نے بچایا تھا۔ مجھے خود صحیح طور پر احساس نہیں تھا کہ میں کس طرح بروقت لائن آف فائر سے ہٹنے میں کامیاب ہوا تھا۔

آخری گولی اس نے میرے پیٹ میں اتارنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ میرے بازو کو چھوتی ہوئی گزری۔ مجھے اپنے بازو پر ہلکی سی تپش کا احساس ہوا۔

ریوالور اس نے وہیں ہاتھ سے چھوڑ دیا اور تیزی سے کلاشنکوف اٹھانے کے لیے پلٹا لیکن میں اسے اتنی آسانی سے کلاشنکوف اٹھانے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ اسی ایک لمحے کے انتظار میں تو میں اتنی طویل آزمائش سے گزرا تھا۔ میں نے اپنا ریوالور بھی نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ میری قمیص کے نیچے سوتی واسکٹ کی جیب میں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اسے نکالنے میں زیادہ وقت صرف ہوگا۔ اس وقت ایک سیکنڈ کے دسویں حصے کی بھی بہت اہمیت تھی۔

میں نے ریوالور نکالنے کے بجائے اس پر زقند لگائی۔ اس وقت اس کا ہاتھ کلاشنکوف کو تقریباً چھو چکا تھا جب میں نے اس کندھے پر کراٹے کا ہاتھ رسید کیا..... اور ساتھ ہی کلاشنکوف کو ٹھوکر ماری۔ کلاشنکوف اس کی دسترس سے نکل گئی اور کراٹے کے وار سے وہ لڑکھڑا گیا مگر بلا کا سخت جان تھا۔ اس نے اُف تک نہ کی اور فوراً ہی میری کلاشنکوف کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی

دو حصے

انوار صدیقی

قیمت فی حصہ 90 روپے

اسلام کے نامور مجاہدین	قمر تسکین	50/-
اسلام کی نامور خواتین	قمر تسکین	40/-
سو مسلمان مشاہیر	قمر تسکین	75/-
ملک ملک کی عورتیں	قمر تسکین	35/-

مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور 2

لیکن اس وقت تک میں اس کی پسلیوں پر ٹھوکر رسید کرچکا تھا۔

وہ ایک بار پھر لڑکھڑایا اور درندے کی طرح غرایا۔ کلاشنکوف کا خیال اس نے چھوڑ دیا اور کسی عفریت کی طرح پلٹ کر مجھ پر جھپٹا۔ اب اس کے پاس کوئی حکمت عملی نہیں رہی تھی۔ شاید اس کے خیال میں اب سوچ سمجھ کر لڑنے کا وقت ہی نہیں رہا تھا۔ جبکہ میرے خیال میں ہوش و حواس کا قائم رہنا اور اعصاب کا قابو میں رہنا ہر حال میں ضروری تھا اور کسی بھی معرکے میں فیصلہ کن اہمیت اسی کی تھی۔

مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب اس نے نہایت ہی احمقانہ انداز میں دونوں ہاتھوں سے میری گردن دبوچنے کی کوشش کی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میری گردن اس کے ہاتھوں میں آگئی تو وہ پتلی سی کسی خشک ٹہنی کی طرح اسے توڑ دے گا۔

میں نے اپنی گردن اس کی گرفت میں جانے سے بچانے کے لیے اس کے چہرے پر گھونسا رسید کیا۔ اس کی گردن ایک لمحے کے لیے ٹیڑھی ہوئی مگر فوراً ہی سنبھلتے ہوئے اس نے اپنا بن مانس کا سا بازو گھمایا۔ میں نے بازو پر ہی اس کا یہ وار روکا۔ اس کا بازو کسی شہتیر کی طرح میرے بازو سے ٹکرایا۔ اسی لمحے میں نے اس کے پیٹ میں لات رسید کی۔ یہ لات کھا کر بھی وہ صرف ذرا سا لڑکھڑایا

اور فوراً سنبھل گیا۔ وہ واقعی کسی جنگلی سانڈ سے کم نہیں تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے مجھ پر جست لگائی۔

میں اس کی طاقت سے مرعوب نہیں تھا لیکن فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کی گرفت میں آنے سے بچا رہوں تو میرے حق میں اچھا ہوگا۔ میں نے جھکائی دے کر اپنے آپ کو بچایا۔ وہ اوندھے منہ زمین پر گرا اور میں نے اس کی پسلیوں میں ایک ٹھوکر رسید کی۔

اس کی پھرتی حیرت انگیز تھی۔ وہ مشینی انداز میں اچھل کر اٹھا۔ اس کی گڑی کھل کر گر چکی تھی..... اور لمبے لمبے گھنگریالے بالوں کی لٹیں کندھوں پر پھیل چکی تھیں۔ چہرہ اور داڑھی کے بال مٹی میں لتھڑ چکے تھے۔ باچھوں سے بہتا ہوا کف بھی ان بالوں پر چمک رہا تھا۔ وہ سرتاپا وحشت تھا۔ بالکل زمانۂ غار کا انسان دکھائی دے رہا تھا۔

نہایت ہی غضبناک انداز میں بازو پھیلا کر وہ ایک بار پھر مجھ پر جھپٹا اور میں نے ایک بار پھر کامیابی سے جھکائی دیتے ہوئے اس کی کنپٹی پر گھونسا رسید کیا۔ وہ دوبارہ منہ کے بل زمین پر چلا گیا۔ اس بار وہ پہلے جیسی پھرتی سے نہیں اٹھ سکا..... لیکن میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے دبوچنے کی کوشش نہیں کی۔

اس بار وہ اٹھ کر پلٹا تو غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ یہی میں چاہتا تھا۔ زیادہ طاقتور لوگ جب غصے سے پاگل ہوتے تھے تو انہیں قابو میں کرنا آسان ہوتا تھا۔ وہ عجیب بے معنی سی آوازیں نکالتا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن اس بار اس نے پھر مجھ سے پٹ پر لات کھائی۔ وہ دُہرا ہو گیا اور ایک بار پھر گرتے گرتے بچا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، میری نظر ایک کلاشنکوف پر پڑی۔ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔

میں نے جھپٹ کر کلاشنکوف اٹھائی لیکن وہ نال کی طرف سے میرے ہاتھ میں آئی۔ مجھے اس کو سیدھا کرنے کی مہلت نہیں ملی کیونکہ نمیسو نے مجھے آن دبوچا تھا۔ اس نے مجھ سے کلاشنکوف چھیننے کی کوشش نہیں کی بلکہ عقب سے میری کمر کے گرد بازوؤں کا شکنجہ ڈال دیا۔ وہ واقعی آہنی شکنجہ تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا جسم درمیان سے کچلا جائے گا۔ میں نے یہ مشکل ذرا تر چھا ہوتے ہوئے پوری قوت سے اس کی کھوپڑی پر رائفل کا بٹ مارا۔

اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور میں نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو چھڑا کر کلاشنکوف کو ہتھوڑے کی طرح استعمال کرتے ہوئے اس کے سر پر دوسری اور پھر تیسری ضرب لگائی۔ وہ دائیں بائیں لہرایا لیکن اس کے زمین پر ڈھیر ہونے سے پہلے میں اس کی کھوپڑی پر نہ جانے کتنی ضربیں لگا چکا تھا۔ زندگی اور موت کی اس جنگ میں آخری لمحوں میں مجھے بھی اپنے ہاتھ پیروں پر کچھ اختیار سا نہیں رہا تھا۔

میں اس وقت اپنی مجنونانہ سی کیفیت سے باہر آیا جب میں نے اسے بے حس و حرکت اپنے سامنے پڑے دیکھا۔ اس کی کھوپڑی اگر لمبے، گھنے اور جھاڑ جھنکاڑ بالوں سے نہ ڈھکی ہوتی تو شاید اس وقت ٹوٹے ہوئے تربوز سے مشابہ نظر آتی۔ اس کا چہرہ اور گردن خون میں لتھڑ چکے تھے۔ شاید اس کے منہ اور ناک سے بھی خون اُبل رہا تھا۔

اس کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئی تھیں اور ان میں بھی خون بھرا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ میں موجود کلاشنکوف کا آہنی دستہ بھی خون میں لتھڑ چکا تھا۔ میں نے اسے نمیسو کی لاش کے قریب پھینک دیا اور مٹی کے ایک تودے پر بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ بالآخر میں نے موت سے یہ معرکہ جیت لیا تھا۔ دھیرے دھیرے میری رگ و پے سے ہیجان رخصت ہو گیا اور چند منٹ بعد میں نے اپنے آپ کو دوبارہ پُرسکون محسوس کیا۔

دھندلی چاندنی میں اس ویرانے میں تودے پر بیٹھے ہوئے مجھے اپنا وجود کچھ عجیب عجیب سا لگ رہا تھا۔ چند لمحے پہلے وہاں دو انسان..... یا شاید دو درندے زندگی کی جنگ میں مصروف تھے۔ اب ان میں سے ایک باقی رہ گیا تھا۔ یہ لاکھوں سال پرانی کہانی تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اس تودے پر میری جگہ نمیسو خان بیٹھا ہوتا۔ تقدیر بھی کچھ کچھ ترازو ہی کی طرح ہوتی ہے۔ کبھی پلڑا ادھر کو جھک گیا، کبھی اُدھر کو۔

بالآخر میں گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ تھوڑی بہت احتیاطی تدابیر ہی اختیار کرنا بہتر تھا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایک طرف مجھے گڑھے کی موجودگی کے آثار محسوس ہوئے۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں پہنچ گیا۔ گڑھا واقعی موجود تھا اور میرے مقصد کے لیے کافی حد تک موزوں بھی تھا۔ اس کی تہ میں شاید کافی عرصہ پہلے کی بارش کا تھوڑا بہت پانی بھی موجود تھا۔

میں نمیسو کی لاش کو گھسیٹتا ہوا وہاں تک لے گیا۔ میں لاش کو آسانی سے اٹھا کر بھی لے جا سکتا تھا لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کا خون میرے کپڑوں پر لگے۔ خون دھیرے دھیرے جمنے لگا تھا۔ نخوت، تکبر اور اذیت پرستی کا وہ پیکر اب مٹی میں لتھڑا، زمین پر پڑا بے حد حقیر اور قابلِ رحم لگ رہا تھا۔ مجھے اب اس پر ترس آ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ باعزت طور پر اس کی تکفین اور تدفین کروں لیکن مجبوری تھی۔ سردست میں اسے اعزاز کے ساتھ دفنانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

میں نے اس کی لاش کو گڑھے میں دھکیل دیا۔ گڑھا اتنا لمبا نہیں تھا کہ لاش اس میں سیدھی لٹائی جا سکتی۔ وہ درمیان سے خم کھا گئی۔

"معاف کرنا نمیسو خان!" میں نے معذرت کی۔ "میں اس وقت تمہیں اس سے زیادہ آرام دہ قبر مہیا نہیں کر سکتا۔"

پھر میں نے ادھر اُدھر سے مٹی کے چھوٹے بڑے ڈھیلے اور تودے اس گڑھے میں ڈالے۔ خون آلود کلاشنکوف بھی میں نے

اسی گڑھے میں پھینک دی۔ بڑی تدبیروں سے اِدھر اُدھر سے کچھ مٹی بھی گڑھے میں ڈالی۔ گڑھا بھر گیا اور لاش اچھی طرح چھپ گئی۔ مجھے امید تھی کہ ایک آدھ بارش یا چند راتوں کی اوس اس گڑھے کو ہموار کردے گی اور زمین میں یہ پیوند کاری نظر نہیں آئے گی..... پھر میں نے زمین پر وہ نشان بھی کافی حد تک خراب کردیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں سے کوئی چیز گھسیٹ کر لے جائی گئی تھی۔

اس کام میں کافی دیر لگ گئی لیکن نتائج خاصے تسلی بخش تھے۔ میں ہاتھ پاؤں جھاڑ کر اس چادر پر آبیٹھا جس پر بیٹھ کر کچھ دیر پہلے میں نے اور نمیسو نے اٹھے کھانا کھایا تھا۔ ابھی سے یہ بات کچھ پرانی پرانی سی لگنے لگی تھی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ نمیسو خان کا گھوڑا بڑی خاموشی سے ایک طرف کھڑا اداس اداس سی آنکھوں سے میری ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ گھوڑا بہت ذہین جانور ہوتا ہے۔ خصوصاً وہ گھوڑا جو جنگلوں بیابانوں میں سرگرم رہنے والے لوگوں کے ساتھ پُرخطر زندگی گزارتا ہے۔

نمیسو کا گھوڑا کہیں بندھا ہوا نہیں تھا مگر اس نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ گھوڑا تنہا اپنے ٹھکانے پر واپس جاسکتا تھا اور اگر کوئی اس کے اشاروں کو سمجھتا تو وہ اسے یہاں تک لاسکتا تھا جہاں نمیسو خان دفن تھا۔ یہ کوئی خوش آئند بات نہیں تھی۔ میرے حق میں بہتر تو یہی تھا کہ میں اس گھوڑے کو بھی گولی مار دیتا۔

گھوڑا میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے وہ میرے خیالات پڑھ رہا تھا۔ اس حیوان کی موٹی موٹی آنکھوں میں مجھے انسان سے زیادہ فہم محسوس ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھ میں اس خوبصورت مگر بے زبان جانور کو مارنے کی ہمت نہیں تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی زین کھول دی اور لگام اس کے جبڑوں سے نکال کر پھینک دی۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ میں نے اس کی ایال پر ہاتھ پھیرا، گردن پر تھپکی دی تب بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

"جاؤ دوست! تمہاری مرضی ہے..... خواہ اپنے ٹھکانے کی طرف لوٹ جاؤ یا جنگلوں کا رخ کرلو۔ چاہو تو کسی کی رہنمائی کرتے ہوئے اسے نمیسو خان کی قبر تک لے آنا..... اور چاہو تو اس سارے تماشے کو بھول جانا۔ میری طرف سے تم آزاد ہو۔" میں نے اس کی کمر تھپکتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

وہ ایک بار ہنہنایا۔ جیسے اس نے میری بات کا جواب دیا ہو..... پھر وہ دوڑتا ہوا ایک طرف کو چلا گیا۔ کم از کم اس وقت تو اس کا رخ ادھر نہیں تھا جس طرف کچھ دیر پہلے میں اور نمیسو خان محوِ سفر تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ فی الحال وہ اپنے ٹھکانے کی طرف نہیں جارہا تھا۔

وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگیا تو میں چادر پر جالیٹا۔ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے، چت لیٹا میں دیر تک چاند کی طرف دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ زندگی مجھے کیا کیا تماشے دکھا رہی تھی۔ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ زیادہ سوچ بچار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میری حالت پہاڑ سے اترتے ہوئے شخص کی سی تھی جس کی رفتار اس کے اپنے قابو میں نہیں رہتی۔ اس عالم میں اگر وہ رکنے کی کوشش کرتا ہے تو اوندھے منہ گرتا ہے۔

کچھ دیر سستانے کے بعد میں نے اٹھ کر وہ بیگ کھول کر دیکھا جو نمیسو اپنے ساتھ لے جارہا تھا۔ اس میں ایک شاپنگ بیگ موجود تھا جس میں نوٹوں کی کئی گڈیاں موجود تھیں۔ یہ وہی رقم تھی جو نمیسو گولڈ کی کلب' سے لے کر چلا تھا۔ میں نے وہ بیگ اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ لٹکایا' اپنی کلاشنکوف کندھے پر لٹکائی اور گھوڑے پر بیٹھ کر زرتاج نگر کی طرف واپس روانہ ہوگیا۔

میں گاؤں پہنچا تو صبح کاذب کا وقت تھا۔ ہر طرف سکوت اور سناٹے کا راج تھا۔ منہ اندھیرے کھیتوں کو جانے والے یا تہجد کے لیے مسجد کو جانے والے دیہاتی بھی ابھی بیدار نہیں ہوئے تھے۔ ادھر اُدھر پھرتے ہوئے چند آوارہ کتے زندگی کا احساس دلا رہے تھے۔ اس بات پر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ انہوں نے مجھے دیکھ کر صرف غرانے پر اکتفا کیا۔ ان میں سے کوئی بھونکا نہیں۔ شاید میں ان کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ چند دن میں ہی گاؤں کی باس میرے وجود میں رچ گئی تھی۔ یا پھر شاید وہ کتے آوارہ ہونے کے باوجود سمجھ دار تھے۔ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ مجھ پر بھونکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

مجھے گاؤں سے گزر کر ہی فارم کی طرف جانا پڑا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس وقت حویلی کے محافظوں کی نظریں میں آڈں...! اس لیے میں عقبی دروازے کی طرف سے فارم پر پہنچا تھا۔

میں عقبی دروازے کا تالا کھول رہا تھا جب بائیں طرف کچھ دور درختوں کے جھنڈ میں مجھے سرسراہٹ سی سنائی دی۔ میں لپک کر درختوں تک پہنچا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا لیکن نہ تو کوئی دکھائی دیا اور نہ ہی کہیں حرکت کا احساس ہوا۔ شاید کوئی جانور تھا جو بھاگ چکا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھنے کا تردد نہیں کیا۔ مجھ پر ایک عجیب کاہلی آمیز بے نیازی غالب آرہی تھی۔ اندر کوارٹر میں پہنچ کر میں بستر پر گرا اور چند لمحے بعد اپنے آپ کو دنیا کا سب سے آسودہ حال اور بے وسوسہ انسان محسوس کرتے ہوئے گہری نیند سوگیا۔

میری آنکھ کھلی تو دروازے پر دستک ہورہی تھی۔ کمرے کی سلاخ دار کھڑکی سے کندنی دھوپ اندر آرہی تھی۔ میں نے سر کو کئی جھٹکے دے کر نیند کا خمار دور کرنے کی کوشش کی۔ گزشتہ رات کے واقعات مجھے خواب ہی محسوس ہورہے تھے۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے عبدل نامی وہ شخص کھڑا

لاضرورت اور بے وجہ دانت نکال رہا تھا جو میرے لیے کھانا وغیرہ پکانے اور باہر کے کام کاج پر مامور تھا۔ اصطبل کی صفائی اور گھوڑوں کو راتب وغیرہ دینے پر دوسرا شخص مامور تھا۔ عبدل کے پاس فارم اور میرے کوارٹر کی چابیاں ہوتی تھیں لیکن اس کمرے کی چابی نہیں تھی جس میں میرا زیادہ وقت گزرتا تھا اور جو خواب گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

"آپ کا رات کا کھانا بھی اسی طرح رکھا ہوا ہے..... اور اب دن چڑھے تک آپ سو کر نہیں اٹھے تو میں نے سوچا، معلوم کرلوں کہ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ آپ نے برا تو نہیں منایا سائیں؟" اس کا لہجہ پہلے کی نسبت زیادہ مؤدبانہ ہوچکا تھا۔ اس سے پہلے اس کا طرزِ عمل کچھ زیادہ مؤدبانہ نہیں رہا تھا۔ بلکہ جب میں پہلے دن یہاں آیا تھا تو اس نے مجھے کسی حد تک ناپسندیدگی ہی کی نظر سے دیکھا تھا۔ معلوم نہیں گزشتہ رات کے دوران کس وجہ سے اس کی نظر میں میری توقیر بڑھ گئی تھی۔

"نہیں..... میں نے بالکل برا نہیں منایا..... اور میری طبیعت بھی بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میں آپ کے لیے ناشتا تیار کروں؟" اس نے اپنے چوڑے چوڑے دانتوں پر ہونٹوں کا پردہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ ضرور۔" میں نے کہا۔ "میں اتنی دیر میں تیار ہوتا ہوں۔"

وہ باورچی خانے کی طرف چلا گیا اور میں غسل خانے کی طرف۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے چھوٹے سے ٹیبل کلاک میں وقت دیکھا تھا۔ دس بجنے کو تھے۔ مجھے یقین تھا کہ آج زرتاج نگر کے بینک میں ڈاکا ضرور پڑے گا۔ جانو کے جن آدمیوں کی ڈیوٹی اس کام پر لگ چکی تھی، انہیں تو طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے نمٹانے آنا ہی تھا۔ ایک بجے ڈاکا پڑنے کا امکان تھا۔

مجھے اب کئی معاملات میں اندازوں سے کام چلانا تھا۔ میرا ایک اندازہ یہ بھی تھا کہ نمیسو خان کی گمشدگی کو شاید تین چار روز تک تو تشویش کی نظر سے نہ دیکھا جائے اور یہ امکان تو شاید کافی دنوں تک کسی کو قابلِ قبول محسوس نہ ہو کہ وہ مرچکا ہوگا۔

مجھے زیادہ بہتر یہی محسوس ہورہا تھا کہ اس بینک ڈکیتی کو میں خود ہی روکنے کی کوشش کروں۔ پولیس کے پاس جاکر خود مصیبت میں پھنسنے کا امکان تھا۔ نمیسو بتا چکا تھا کہ تھانے کی کُل نفری چار پانچ افراد پر مشتمل تھی۔ وہ خود بھی زنگ خوردہ تھے اور ان کے ہتھیار بھی۔ ان کا جانو کے آدمیوں کے سامنے رکنا ذرا مشکل ہی تھا جو بڑے خرانٹ دہشت گرد اور قاتل تھے اور جدید ترین اسلحے سے بھی لیس تھے۔ پولیس پر مجھے ویسے بھی زیادہ بھروسا نہیں تھا۔ معلوم نہیں اس مختصر سے عملے میں کون جانو کا زرخرید تھا۔

زرتاج خود گھر پر نہیں تھی۔ ویسے تو اس کی عدم موجودگی میں اس کا کمدار رب نواز تمام معاملات کو دیکھتا تھا۔ وہ حویلی میں ہی

الاقربیٰ

قمر اجنالوی قیمت:=/200

ایک سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا اور شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بڑے زمینداروں کے کمدار خود بہت بڑی چیز ہوتے ہیں۔ بہت مال بناتے ہیں اور بہت دور تک پھنکارتے پھرتے ہیں۔ ان کا بڑا دبدبہ اور رعب ہوتا ہے۔ مالک کے علاوہ شاذ و نادر ہی کسی کو ان کے سامنے دم مارنے کی جرأت ہوتی ہے۔

لیکن رب نواز اس قسم کا آدمی نہیں تھا۔ سر جھکا کر چلتا تھا اور اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ میں اسے بھی اس خطرے سے آگاہ کرسکتا تھا لیکن اس کی زبان پر یقیناً سب سے پہلا سوال یہی آتا کہ مجھے یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟ میں فی الحال چھوٹے سے چھوٹے سوال سے بھی بچنا چاہتا تھا اور اپنی ذات کو ہر معاملے میں مکمل طور پر پس منظر میں رکھنا چاہتا تھا۔ میرے لیے پس منظر میں رہتے ہوئے ہی کچھ کرنا بہتر تھا۔

عبدل نے بھاری بھرکم اور جناتی قسم کا ناشتا مجھے کمرے میں ہی لادیا۔ ناشتا کرکے میں نے نمیسو خان کا چھوڑا ہوا رقم کا بیگ الماری میں رکھ کر تالا لگایا اور کمرے سے نکلنے سے پہلے اپنے حلیے کو مبہم اور غیر واضح سا بنانے والی چند چیزیں ساتھ لے لیں۔ ابھی میں کمرے سے نکلا نہیں تھا کہ عبدل برتن اٹھانے آگیا۔

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "سائیں! شیر محمد کا پیغام آیا تھا کہ آج وہ کام پر نہیں آسکیں گے۔ ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "میں خود بھی شاید گھوڑوں کو سدھانے کے لیے وقت نہ نکال سکوں۔ میں رئیسانی جی کے ہی ایک اور ضروری کام سے جارہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے سائیں! ویسے یہ جو اپنے شیر محمد صاحب ہیں نا..... ان کی طبیعت ان دنوں میں اکثر ہی خراب ہوتی ہے جب رئیسانی جی یہاں نہیں ہوتیں۔" عبدل معنی خیز انداز میں مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "سائیں رب نواز بھی انہیں کچھ نہیں کہتے۔"

وہ مجھے "ملازمتی سیاست" میں الجھانے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ "ان مسائل پر کبھی فرصت میں غور کریں گے۔"

میں نے فارم سے اپنا گھوڑا نکالا اور گاؤں کی طرف روانہ ہوگیا۔ کچھ دور پہنچ کر میں نے تاریک شیشوں والا چشمہ لگالیا۔ سر پر اجرک پگڑی کے انداز میں لپٹی ہوئی تھی۔ گلے میں ریشمی مفلر بھی تھا۔

بازار میں سب سے بہتر عمارت بینک ہی کی تھی۔ دروازے سے لوہے کی گرل اس وقت ہٹی ہوئی تھی۔ دروازہ لکڑی کا تھا مگر اس میں شیشے کا پینل بھی لگا ہوا تھا۔ دروازہ تین سیڑھیوں کی بلندی پر تھا۔ سامنے کے رخ پر سلاخوں والی ایک کھڑکی بھی تھی جو اس وقت بند تھی۔

بینک کے دروازے پر باہر ہی ایک کرسی پر بوڑھا اور کمزور سا گن مین بیٹھا تھا۔ وہ ملیشیا کی شلوار قمیص میں تھا۔ اس کی بے پروائی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنی انگریزوں کے زمانے کی توڑے دار بندوق بھی دیوار کے سہارے کھڑی کی ہوئی تھی۔ کارتوس کی پیٹی کرسی کے پشتے پر لٹکی ہوئی تھی۔ شاید اسے خود بھی احساس تھا کہ بندوق اس کے ہاتھوں میں ہو یا دیوار کے سہارے کھڑی ہو' اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے خواہ مخواہ وزن اٹھا کر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔

وہ گرد و پیش سے بے نیاز بیٹھا' مہندی سے رنگی ہوئی سرخ مونچھوں کو بل دے رہا تھا اور نہ جانے کن تفکرات میں الجھا ہوا تھا۔ شاید اس کی ریٹائرمنٹ قریب تھی یا ویسے ہی رعایتی مدت پوری کر رہا تھا۔

میں جب بینک کے سامنے سے گزرا تو میں نے رب نواز کو بینک سے نکلتے دیکھا۔ وہ ایک چرمی بیگ بغل میں دبائے ہوئے تھا۔ شاید رقم جمع کروا کے واپس جا رہا تھا۔ رب نواز ایک ادھیڑ عمر' بھاری بھرکم شخص تھا۔ بظاہر خاصا بارعب نظر آتا تھا لیکن میں نے اسے کسی پر رعب ڈالتے نہیں دیکھا تھا۔

گن مین نے ہڑبڑا کر اسے سلام کیا۔ رب نواز نے نیم توجہی سے جواب دیا اور اپنی شیشوں والی ٹوپی درست کرتا رخصت ہو گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

بازار کا چکر لگا کر واپس آتے وقت میں بینک سے کچھ دور ہی رک گیا۔ وہاں ایک گلی کے کونے پر کسی کی ٹوٹی پھوٹی سی بیل گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے اس بیل گاڑی کے پہیے سے اپنا گھوڑا باندھ دیا۔ یہاں دیوار کے ساتھ ایک چائے فروش ایسا سا وار لیے بیٹھا تھا جس کے نیچے کوئلوں والی انگیٹھی فٹ تھی۔ وہ سبز چائے بیچ رہا تھا۔

میں نے اس سے ایک پیالی لی اور ایک طرف کھڑے ہو کر دھیرے دھیرے چسکیاں لینے لگا۔ میرے پاس ابھی خاصا وقت تھا۔ چائے والے کو بھی وہاں سے جانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اِکّا دُکّا گاہک آئے جا رہے تھے۔

میری نظر غیر محسوس طور پر بینک ہی کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں وہ جگہ بھی منتخب کر چکا تھا جہاں مجھے پوزیشن لینا تھی۔ بینک کے تقریباً سامنے دو عمارتوں کے درمیان ایک نہایت تنگ سی گلی تھی۔ بازار کے اس حصے میں زیادہ تر مکانات ہی تھے لیکن ان کے نیچے دُکانیں تھیں۔

جو گلی میں نے دیکھی تھی وہ درحقیقت دو اونچے مکانوں کے درمیان یونہی فالتو سی جگہ چھوٹی ہوئی تھی جہاں لوگوں نے کوڑا کرکٹ پھینکنا معمول بنا لیا تھا۔ مجبوری کی حالت میں اس راستے سے دوسری گلی میں پہنچا جا سکتا تھا۔ اس گلی میں روشنی کی رسائی بھی کم تھی۔ اگر میں اس سے زیادہ آگے نہ جاتا تو وہاں سے بینک پر بھی نظر رکھ سکتا تھا۔ اس کے لیے مجھے صرف کچرے کی بُو برداشت کرنا پڑتی۔ وہ اتنی تنگ گلی تھی کہ مجھ جیسی صحت کا آدمی ترچھا ہو کر ہی اس سے گزر سکتا تھا۔ سیدھا چلنے کی صورت میں شاید میرے کندھے دونوں طرف کی کھردری اور کہنہ سال دیواروں سے رگڑ کھاتے۔ بازار میں تھوڑی بہت چہل پہل ہونے کے باوجود اس قدر سکون تھا کہ کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا تھا یہاں کوئی گڑبڑ ہونے والی تھی۔ ایک لمحے کے لئے تو میں نے بھی اپنے آپ کو خوش گمانی سے بہلانے کی کوشش کی کہ یہاں کچھ نہیں ہونا تھا..... لیکن میری نامعلوم حس کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔

میں نے جتنی دیر میں سبز چائے کی وہ پیالی ختم کی' اتنی دیر میں دو تین گاہک یکے بعد دیگرے آ کر' چائے پی کر جا بھی چکے تھے۔ میں چائے کبھی کبھار ہی پیتا تھا لیکن اس روز وقت گزاری کی خاطر اس چائے والے سے دوسری پیالی بھی لے لی اور اپنی طلب کو برحق ثابت کرنے کے لیے مجھے اس کی چائے کی تعریف میں چند الفاظ بھی بولنا پڑے جنہیں سن کر وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ ایک بالٹی میں گدلے سے پانی میں پیالی دھوتے ہوئے وہ مجھے سبز چائے تیار کرنے کے نہایت نایاب اور خاندانی نسخوں سے آگاہ کرنے لگا مگر اب میری توجہ اس کی طرف نہیں تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ دوسری پیالی ختم کر کے بازار کا ایک چکر اور لگاؤں گا۔ اگر اس کے بعد بھی وقت گزاری کا مسئلہ درپیش رہا تو حجام کی دکان میں گھس جاؤں گا جو قریب ہی واقع تھی۔ کل میں نے تمیسو کو بھی اسی دُکان میں بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ حجام کے پاس جانے کا قائل تو معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس دُکان میں اس کی موجودگی بھی آج کی ڈکیتی کے سلسلے ہی کی کوئی کڑی رہی ہو۔

پچھلے چند دنوں میں میری داڑھی جتنی بھی بڑھی تھی وہ میرا قیمتی اثاثہ بن چکی تھی کیونکہ اس سے مجھے اپنا حلیہ پہلے کی نسبت مختلف بنانے میں بہت مدد مل رہی تھی۔ چنانچہ اس سے محرومی کا فیصلہ تو میں ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ حجام سے خط بنوانے میں کچھ وقت ضائع کر سکتا تھا۔

میں ابھی اس مسئلے پر غور و خوض کر ہی رہا تھا کہ اچانک پیالی میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ دراصل بینک سے ایک شخص برآمد ہوا تھا اور اسے دیکھ کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

وہ انسپکٹر رحیم گل تھا!

ایک نوجوان کی سنسنی خیز لہو رنگ خودنوشت

دہشت گرد

سلیم فاروقی

○ وہ محب وطن ہونے کے باوجود دہشت گرد کہلاتا تھا۔
○ وقت کی راسیں تھامتے اس کے ہاتھ لہولہان ہو گئے تھے۔
○ "سچی کہانیاں" کا ایک مقبول ترین ایڈونچر سلسلہ چار حصوں میں شائع ہو رہا ہے۔

پبلشرز: کتاب منزل، سرکلر روڈ اردو بازار لاہور 2 ۔ 7224653

انسپکٹر رحیم گل سادہ لباس میں تھا لیکن میں اسے ہزاروں کے مجمعے میں پہچان سکتا تھا اور شاید یہی معاملہ دوسری طرف بھی تھا' اس لیے میں نے فوراً دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ رحیم گل نے اس طرف دیکھا ہی نہیں تھا جدھر میں کھڑا تھا۔ میری جب اس پر نظر پڑی اس وقت اس کی پیشانی پر شکنیں تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔

دوبارہ مڑ کر اس کی طرف دیکھنا میں نے بہتر نہ سمجھا۔ اتنا ہی غنیمت تھا کہ اس کی مجھ پر نظر نہیں پڑی تھی۔ اب یہ کوئی اچھی بات نہ ہوتی کہ میں خود اسے اپنی طرف دیکھنے کی دعوت دیتا۔ یہ ایک عجیب ہی موقع تھا۔ میں اس سے الجھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ فضا میں پہلے ہی ایک خطرے کی آہٹیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم گل کے معاملے میں میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں اسے ہرگز ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک چھوٹا مگر دیانت دار آفیسر تھا۔ دیانت دار اور دلیر آفیسر ہمارے معاشرے میں پہلے ہی تقریباً ناپاب تھے۔ اس سے اچانک سامنا ہونے پر حیرت کے باعث ایک لمحے کے لیے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

آخر وہ یہاں نظر ہی کیوں آیا تھا؟ کیا اسے یہاں میری موجودگی کا شبہ ہوا تھا یا اسے یہاں میری آمد کا کوئی امکان نظر آیا تھا؟ کیا وہ میرا سراغ لگاتا ہوا یہاں تک آن پہنچا تھا یا پھر اسے ڈاکے کی مخبری ہو چکی تھی؟ مگر یہ تو اس کا علاقہ ہی نہیں تھا۔ وہ کیوں اتنی دردسری مول لیتا؟ پولیس والے تو اپنے علاقے کی وارداتوں کے سلسلے میں ہی کوئی زحمت کر لیں تو غنیمت ہوتا ہے۔ دوسرے اس وقت رحیم گل' ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی بھی اعتبار سے تیار نظر نہیں آتا تھا۔

اچانک مجھے ایک اور عجیب سا خیال آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ میں نے اس کی بے پناہ دیانت داری' دلیری اور کبھی نہ جھکنے' کبھی نہ بکنے کی جو باتیں سُنی تھیں وہ محض قصے کہانیاں تھیں' پروپیگنڈہ تھا؟ درحقیقت کہیں ڈکیتی کے اس منصوبے سے ہی تو اس کا کوئی تعلق نہیں تھا؟

سوالات' شبہات اور امکانات کن کھجوروں کی طرح میرے ذہن سے چمٹے جا رہے تھے اور کسی بھی بات کا کوئی تسلی بخش جواب میرے پاس نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔ نہایت اطمینان سے چائے والے کو ادائیگی کی اور بے حد آہستگی سے گردن گھما کر بینک کی طرف دیکھا۔ رحیم گل جا چکا تھا۔ وہ بازار میں بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی اور اپنے گھٹیا سے

سیاہ چشمے کو ناک پر کچھ اور اچھی طرح جمالیا۔ ایک بار پھر محتاط انداز میں اِدھر اُدھر کا جائزہ لے کر میں آگے چل دیا۔ اس بار میں نے یوں بازار کے سرے تک فاصلہ طے کیا جیسے مجھے کچھ خریدنا تھا لیکن اپنے مطلب کی چیز مجھے کہیں نظر نہیں آرہی تھی یا میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پارہا تھا۔ درحقیقت مجھے اس قسم کی اداکاری کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہاں کسی کی بھی توجہ میری طرف نہیں تھی لیکن میں محض احتیاطاً ایسا کر رہا تھا۔

اس چکر میں واپسی پر میں نے سوچا کہ ایک بار اس دراڑ نما گلی میں گھس کر بھی دیکھ لینا چاہیے جہاں مجھے پوزیشن لینا تھی۔ مجھے چند لمحے بعد اندازہ ہوا کہ میرا اس گلی میں گھسنا کیسا بروقت تھا۔ شاید کسی غیبی ہاتھ نے مجھے اس گلی کی طرف دھکیلا تھا۔

گلی میں گھستے ہی بدبو کے بھبکے نے میرا استقبال کیا۔ شاید آس پاس کے گھروں والے اس گلی میں کچرا پھینکتے تھے لیکن مجھے ناک بھوں چڑھانے کی مہلت نہیں ملی کیونکہ اپنے عقب میں بازار کی طرف سے مجھے کسی انجن کی گھرگھراہٹ سنائی دی تھی جو تیزی سے قریب آتی جارہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کچھ گڑبڑ کا سا احساس ہوا۔

میں نے پلٹ کر محتاط انداز میں دراڑ نما گلی سے سر نکال کر دیکھا۔ سیاہ رنگ کی ایک جیپ کسی غضبناک درندے کی طرح غراتی ہوئی بازار میں چلی آرہی تھی۔ ڈرائیور سمیت اس کھلی جیپ میں پانچ آدمی نظر آرہے تھے اور پانچوں کے چہروں پر ڈھاٹے تھے۔ کلاشنکوفیں انہوں نے ہاتھوں میں بلند کر رکھی تھیں۔ وہ بڑے دھڑلے سے بازار میں چلے آرہے تھے۔

پھر فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے مرتعش ہوگئی۔ انہوں نے غالباً لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کی تھی۔ ان کا مقصد پورا ہوگیا۔ لوگ خوف زدہ ہوکر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ چند افراد دیواروں سے چپک کر کھڑے ہوگئے۔ بازار میں عورتیں اکا دُکا ہی تھیں۔ نیچے والی ایک عورت کو میں نے دہشت زدہ ہوکر ایک دُکان میں گھستے دیکھا۔ ایک عورت میں شاید کہیں بھاگنے یا پناہ حاصل کرنے کی بھی سکت نہیں رہی۔ وہ ایک دُکان کی دیوار سے چپک کر اکڑوں بیٹھ گئی اور غالباً اپنی چیخیں روکنے کے لیے اس نے سختی سے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

چند لمحے پہلے میں نے بازار میں تین چار ایسے افراد کو بھی دیکھا تھا جن کے کندھوں پر کوئی نہ کوئی گن تھی لیکن اب وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیے۔

میں نے سر پیچھے کیا اور مشینی سے انداز میں اپنے چہرے پر بھی اپنی اجرک کا ڈھاٹا باندھ لیا۔ کلاشنکوف کندھے سے اتار کر ہاتھوں میں تھام لی۔ میں ایک گھٹنے کے بل کھڑا ہوچکا تھا اور میری کلاشنکوف کی نال اس دراڑ نما گلی سے باہر جھانک رہی تھی مگر کسی کا دھیان میری طرف نہ تھا۔

ڈاکوؤں کی جیپ عین بینک کے سامنے آن رکی تب بوڑھا گن مین ہڑبڑا کر اٹھا ورنہ شاید اس کا خیال تھا کہ جیپ میں آنے والوں کا ہدف کوئی اور ہے یا پھر شاید وہ ویسے ہی دہشت پھیلانے آئے ہیں' فائرنگ کرتے ہوئے گزر جائیں گے۔ اس نے جلدی سے اپنی پرانی سی شاٹ گن سنبھالی لیکن دوسرے ہی لمحے گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری اور وہ بے چارہ سیڑھیوں سے نیچے لڑھک گیا۔

چار ڈاکو جیپ سے کود کر نیچے آگئے' پانچواں اسٹیئرنگ سنبھالے بیٹھا رہا۔ جیپ اسٹارٹ ہی رہی۔ ایک ڈاکو نے حقارت سے بوڑھے گن مین کی لاش کو ٹھوکر سے ایک طرف کیا۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ اپنی راہ میں حائل ہونے والے کسی بھی شخص کو گولیوں سے چھلنی کرنے میں انہیں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوگی۔

میں نے ایک لمحے انتظار کیا کہ وہ چاروں سیڑھیاں چڑھ چکیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان میں سے کوئی جیپ کے عقب میں پناہ لینے میں کامیاب ہوجائے۔ میں مورچہ بندی اور زیادہ دیر کی لڑائی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ مجھے اپنی ذات کو پوشیدہ ہی رکھنا تھا۔ مجھے تو چند لمحوں کے اندر اندر اپنا کام دکھا کر غائب ہوجانا تھا۔

ایک ڈاکو نے زوردار ٹھوکر مار کر بینک کا دروازہ کھولا اور دوسرا بازار کی طرف رخ کرتے ہوئے کلاشنکوف تان کر کھڑا ہی ہونے لگا تھا کہ میں نے پہلا برسٹ مارا۔ دروازے کو ٹھوکر مارنے والے ڈاکو کو اندر جانے کا موقع نہیں ملا۔ رائفل تان کر یار عب انداز میں کھڑے ہوئے ڈاکو کی حسرتیں بھی دل ہی میں رہ گئیں۔ ایک تو ہوا میں اچھلا اور سر کے بل سڑک پر آیا' دوسرا اپنا سینہ تھامے اس انداز میں سیڑھیوں سے لڑھکا جس انداز میں بوڑھا گن مین لڑھکا تھا۔

مجھے بوڑھے گن مین کی بے وجہ موت کا افسوس تھا۔ اگر میں نے ایک لمحے بھی انتظار نہ کیا ہوتا اور ڈاکوؤں کی جیپ رکتے ہی فائرنگ شروع کردی ہوتی تو شاید وہ مرنے سے بچ جاتا لیکن اس صورت میں بھی اس کے فائرنگ کی زد میں آنے کا امکان بہرحال موجود تھا۔

تیسرا ڈاکو کچھ چُرتیلا تھا۔ اس نے تیزی سے گھومتے ہوئے کچھ جھک کر اندھا دھند جوابی فائرنگ شروع کی لیکن اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ گولیاں کس طرف سے آئی تھیں۔ اس نے ایک اونچے مکان کی کھلی کھڑکی پر برسٹ مارا تھا۔ اسے یقیناً ادھر سے فائرنگ کا شبہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ صحیح طور پر کچھ سمجھ سکتا' میری کلاشنکوف کی گولیوں نے اس کا لہو بھی چاٹ لیا۔

اسی دوران ڈرائیور نے اسٹیئرنگ وہیل چھوڑ کر اپنے قریب سے ہی ایک کلاشنکوف اٹھائی۔ اسے غالباً اندازہ ہوچکا تھا کہ گولیاں کہاں سے آئی تھیں لیکن اس کے اپنے سامنے وینڈ اسکرین تھی۔ اسے بچاتے ہوئے فائر کرنے کی غرض سے اسے کھڑا ہونا پڑا اور کھڑا ہونا اسے بہت مہنگا پڑا۔ اس کی کھوپڑی اور چہرے میں یقیناً

کئی سوراخ ہوئے ہوں گے۔ اگر اس کے سر اور چہرے پر ڈھاٹا نہ ہوتا تو شاید اس کی کھوپڑی کا بیشتر حصہ غائب ہی ہوجاتا۔ وہ پہلے پلٹ پر اور پھر اس سے نیچے لڑھک گیا۔

یہ سب کچھ بالکل اسی طرح ہوا تھا جیسے کوئی انتہائی مختصر دورانیے کی ایکشن فلم بڑے زور وشور اور گھن گرج سے شروع ہوئی ہو لیکن اس کا انجام ختم ہوکر رہ گیا ہو۔ سب کچھ جیسے پلک جھپکتے میں ختم ہوکر رہ گیا تھا اور بازار میں ایک لمحے کے لیے موت کا سا سکوت پھیل گیا تھا۔

پانچویں ڈھاٹا پوش نے لپک کر بینک میں گھسنے کی کوشش کی۔ کسی غیر متوقع صورت حال میں کوئی اچھی حکمتِ عملی اختیار کرنے کے معاملے میں وہ لوگ زیادہ ہوشیار معلوم نہیں ہوتے تھے۔ میرا اپنا اندازہ اور تجربہ یہی تھا کہ اس قسم کے ڈاکوؤں کی دہشت زیادہ ہوتی ہے اور اسی کا وہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ عام لوگوں کا دہشت زدہ ہونا بھی بجا ہی ہوتا ہے کیونکہ یہ لوگ سامنے آنے والے کسی بھی شخص کو بلا ضرورت بھی چھلنی کردیتے ہیں۔

میں نے اسے بھی بینک میں داخل ہونے کا موقع نہیں دیا۔ وہ دروازے کے سامنے ہی ڈھیر ہوگیا لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے بینک کا دروازہ کھلتے دیکھا۔ ایک اور ڈھاٹا پوش اپنی دانست میں "محتاط" انداز میں باہر جھانک رہا تھا۔ اس کی کلاشنکوف کی نال متلاشی انداز میں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔

میں نے کسی ڈاکو کو اندر جانے کا موقع نہیں دیا تھا۔ میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ آخر وہ بدبخت چھٹا ڈاکو اندر سے کیسے جھانک رہا تھا؟ مجھے امکان یہی نظر آیا کہ جب جیپ بازار میں داخل ہوئی ہوگی تو اس کے ساتھیوں نے اسے بازار کے سرے پر ہی اتار دیا ہوگا۔ اس کی ڈیوٹی بینک کا عقبی دروازہ سنبھالنے کی ہوگی لیکن وہ خلاف توقع فائرنگ کی آواز سن کر ادھر آگیا تھا۔ بینک میں یقیناً کسی نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ اب وہ احمق دروازہ کھولے جھانک رہا تھا۔

لیکن احمق ہونے کے باوجود وہ یقیناً بے حد خوش قسمت تھا کیونکہ جب میں نے اسے ملکِ عدم کے راستے پر روانہ کرنے کے لیے ٹریگر دبایا تو معلوم ہوا کہ میری کلاشنکوف کا میگزین خالی ہوچکا تھا۔

اس ڈاکو نے کوئی فائر کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس نے یک لخت سکوت کو غنیمت جانا۔ اسی طرح جھکے جھکے وہ تیزی سے پھرتیاں کرتا جیپ میں گھسا اور اسٹیئرنگ وہیل سنبھال کر تیزی اور چستی سے جیپ وہاں سے نکال لے گیا۔ اپنے ساتھیوں کی فکر میں وہ بینک کے سامنے ہی پڑی چھوڑ گیا تھا۔ میرے کلاشنکوف ہی کو کرنے تک وہ جان بچا کر نکل چکا تھا۔ بلاشبہ وہ خوش قسمت تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے مجھے اس دراڑ نما گلی میں دیکھا تھا یا نہیں؟

بینک سے اور کوئی بھی باہر نہیں آیا۔ میرا اندازہ تھا کہ عملے کے لوگ اندر بیٹھے تھر تھر کانپ رہے ہوں گے۔ میں نے کلاشنکوف کندھے پر لٹکائی' چہرے سے ڈھاٹا ہٹا کر اجرک کندھوں پر ڈالی اور بازار میں نکل کر دیوار سے لگ کر یوں کھسکتا ہوا آگے بڑھا جیسے میں بھی اس ساری کارروائی سے خوف زدہ ہوجانے والا ایک عام سا آدمی تھا۔ کچھ آگے جانا میری مجبوری تھی کیونکہ میرا گھوڑا ادھر بندھا ہوا تھا۔

بچے کھچے لوگوں میں سے زیادہ تر ادھر اُدھر کھسک رہے تھے۔ چند ایک ہمت کرکے اب جائے واردات کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ کسی کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔ زیادہ تر لوگ لاشوں کی طرف یا پھر اس طرف دیکھ رہے تھے جدھر جیپ دھول اُڑاتی ہوئی غائب ہوئی تھی۔

کھمبے کے قریب پہنچ کر میں نے اپنا گھوڑا کھولا اور اس پر سوار ہوکر گھوم کر دوسری گلی کے راستے گاؤں سے واپس روانہ ہوگیا۔ اس گلی میں چند عورتیں دروازے ذرا سے کھول کر صورت حال جاننے کی کوشش کررہی تھیں۔ مجھے یقین تھا' انہوں نے مجھے بھی ایک خوف زدہ شخص ہی سمجھا ہوگا جو جلد از جلد اس ہنگامے سے دور نکل جانے کی کوشش کررہا تھا۔ میں کم از کم اداکاری تو ایسی ہی کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

آندھی اور طوفان کی طرح گھوڑا دوڑاتے ہوئے میں ایک بار پھر فارم پر پہنچا اور عقبی دروازے سے فارم میں داخل ہوا۔ اپنے گھوڑے کو اصطبل میں باندھ کر میں نے کلاشنکوف وغیرہ کمرے میں رکھی' کپڑے تبدیل کیے پھر ایک اور گھوڑا ہارس فارم سے نکال کر میدان کی طرف چل پڑا۔ اس گھوڑے کو میں ان دنوں سدھا رہا تھا۔

میدان میں پہنچ کر میں نے حقیقتاً گرد وپیش سے اپنا دھیان بالکل ہٹالیا اور یوں گھوڑے کو سدھانے میں مصروف ہوگیا جیسے دنیا کا سب سے ضروری کام یہی تھا اور میں گھنٹوں سے اسی کام میں مصروف تھا۔

سہ پہر تک میں اطمینان سے اپنے کام میں مصروف رہا۔ سہ پہر کے قریب عبدل نہ جانے کہاں سے دوڑا دوڑا میرے پاس آیا۔ اس کا چہرہ جوش وخروش سے تمتما رہا تھا۔ شاید اسے برسوں میں پہلی بار کسی کو سنانے کے لیے کوئی سنسنی خیز خبر میسر آئی تھی۔ اس کی باچھیں کھلی جارہی تھیں۔

قریب آکر وہ بولا "معاف کرنا خان صاحب! آج تو میں نے آپ کے لیے دوپہر کا کھانا ہی نہیں پکایا۔ دراصل میں بازار گیا ہوا تھا اور وہاں جاکر ایسا پھنسا کہ اب واپس آیا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ مجھے کھانے کی کوئی خاص ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی۔ صبح کی بچی کچھی کچھ چیزیں کھالی تھیں" میں نے اسے تسلی دی۔ "لیکن تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ تمہاری تو

گڑی گڑی جارہی ہے۔"

"وہ... سائیں' میں گھبرایا ہوا نہیں ہوں" اس نے کھسیانا ہوکر جلدی سے پگڑی درست کی پھر قدرے سنبھل کر بولا "آپ نے کچھ سنا سائیں؟"

"نہیں۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"بہت خاص ہے سائیں!" وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا۔

"تو پھر مجھے کہاں سے معلوم ہوگی" میں نے مایوسی سے کہا "مجھے ابھی یہاں کی خاص باتیں کون بتاتا ہے؟ میں ابھی یہاں نیا ہوں نا... اور پھر میں کوئی اہم آدمی بھی نہیں ہوں۔"

"نہیں جی... اہم تو آپ ضرور ہیں" عبدل نے گویا تسلی دی کہ مجھے دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے۔ ہمت بندھانے والے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے وہ بولا "رئیسانی جی نے سب کو خاص طور پر حکم دیا تھا کہ آپ کا بہت اچھی طرح خیال رکھیں اس لیے ہماری نظر میں تو آپ خاص آدمی ہوئے۔"

"خیر... تم وہ بات بتاؤ جو بتانے لگے تھے؟" میں نے کہا۔

اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا "سائیں! وہ بات یہ تھی کہ آج ہمارے گاؤں کے بینک پر ڈاکا پڑنے لگا تھا۔ بڑے خطرناک قسم کے پانچ ڈاکو آئے تھے اور آج رئیسانی جی کی فصلوں کا بہت روپیہ بینک میں تھا۔ وہ تو آج یقیناً ساری رقم لوٹ کرلے جاتے لیکن پتا نہیں کون شخص رحمت کا فرشتہ بن کر آگیا۔ اس نے پانچ ڈاکوؤں کو گولی ماردی۔ چھٹا جیپ لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔"

"اچھا...!" میں نے دل ہی دل میں اس کی باتوں سے محظوظ ہوتے ہوئے بظاہر حیرت سے کہا "کون تھا وہ نیک دل اور بہادر آدمی؟"

"یہی تو کمال ہے کہ اس کا کچھ پتا نہیں چلا" عبدل پُرجوش لہجے میں بولا "صرف ایک بُڑھیا نے اس کی جھلک دیکھی تھی جو اپنے چوبارے کی کھڑکی میں کھڑی تھی مگر اس کی نظر زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ وہ بھی ڈاکوؤں کی طرح ہی ڈھاٹا باندھے ہوئے تھا اور ایک تنگ سی گندی گلی سے گولیاں چلاتا نظر آیا تھا۔ بُڑھیا فائرنگ سے ڈر کر اندر جاکر چھپ گئی تھی۔ سکون ہونے پر وہ دوبارہ کھڑکی میں آئی تو وہ شخص غائب ہوچکا تھا۔"

پھر عبدل نے خیال ظاہر کیا "ممکن ہے وہ بھی ڈاکوؤں ہی کا ساتھی رہا ہو لیکن کسی بات پر آخری وقت میں ڈاکوؤں سے اس کی بگڑ گئی ہو... جھگڑا ہوگیا ہو اور اس نے اپنے ساتھیوں پر ہی فائر کھول دیا ہو..." وہ خاصا خطرناک خیال ظاہر کررہا تھا۔ معلوم نہیں کس نے اس کے دماغ میں یہ بات ڈالی تھی۔

"تم سے کس نے کہا کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھی بھی ہوسکتا تھا؟" میں نے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

قیمت 150/- روپے

انوار صدیقی

اردو کے شاہکار سفرنامے — ضیاء ساجد — 00/-

منتخب مشہور سفرنامے — ضیاء ساجد — 50/-

منتخب مشہور افسانے — ضیاء ساجد — 50/-

منتخب اعلیٰ افسانے — ضیاء ساجد — 25/-

مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2

"یہ تو میں خود سوچ رہا ہوں سائیں!" وہ ذرا فخریہ سے لہجے میں بولا "کوئی اور ایسی دلیری دکھاتا تو اسے پوشیدہ رہنے کی ضرورت تھی؟ وہ تو رئیسانی جی سے انعام حاصل کرتا۔"

"دیکھو عبدل!" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا "تم زیادہ سوچ بچار نہ کیا کرو۔ ننھا سا دماغ تمہارا خواہ مخواہ اتنا سوچنے میں خرچ ہوجائے گا۔"

"دیکھیں خان صاحب! میں اِدھر اُدھر کسی سے فالتو بات نہیں ہوں لیکن انسان کو سوچ بچار تو کرنی چاہیے نا" وہ مدلل سے لہجے میں بولا۔

"اچھا خیر..." میں نے اس کا کندھا تھپکا "یہ بتاؤ پھر کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں صاحب! بس پانچ دس سیکنڈ میں ہی سب ہوگیا۔" وہ ابھی تک ہیجان زدہ لہجے میں ہی بات کررہا تھا "سائیں! اللہ نے بڑا کرم کیا کہ بینک لٹنے سے بچ گیا۔ بڑی پھیل گئی تھی۔ سارا گاؤں ادھر جمع ہوگیا تھا۔ رب نواز اور اس کے دوسرے کئی آدمی ادھر ہی تھے' وہ بھی موقعے پر پہنچ گئے۔ پولیس کے جو چھ آدمی تھانے میں ہوتے ہیں' ان کی تو سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا کریں۔ پھر حاصل آباد سے بھی کچھ پولیس آئی تھی۔ ڈاکوؤں کی لاشیں بھی وہی لے گئے ہیں۔ ابھی کچھ پتا نہیں چل رہا کہ وہ کس گروہ کے ڈاکو ہیں اور کس علاقے سے آئے تھے۔

ان کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں کسی نے انہیں جہنم رسید کیا ہے۔"

"چلو خیر... اچھی بات یہ ہے کہ بینک لٹنے سے بچ گیا" میں نے کہا۔

"ہاں سائیں!" اس نے تائید میں سر ہلایا "رئیسانی جی سُنیں گے تو بہت خوش ہوں گے۔ بینک میں زیادہ روپیہ پیسہ ہمیشہ انہی کا ہوتا ہے لیکن شاید وہ فکرمند بھی ہوں کیونکہ اس سے پہلے کبھی ڈاکوؤں نے ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ یہاں آج تک اس قسم کی کوئی واردات نہیں ہوئی تھی۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا "ڈاکو تو کب سے اس ہیرا سی عورت کے گرد سازشوں کے جال بُن رہے ہیں مگر اسے کچھ پتا ہی نہیں۔ کسی روز اچانک ہی اس کا یہ گوشۂ عافیت شعلوں میں گھر گیا تو شاید اسے سنبھلنے کا بھی موقع نہ ملے۔"

تاہم عبدل سے میں نے کچھ نہیں کہا اور گھوڑے کی لگام پکڑ کر اسے واپس ہارس فارم میں لے آیا۔ میں جو کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا وہ مجھے معلوم ہوچکا تھا۔ اب مجھے خواہ مخواہ وہاں اپنے آپ کو صرف ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں صرف یہی جاننا چاہتا تھا کہ میرے آنے کے بعد وہاں کیا ہوا تھا۔

دوسرے روز صبح ناشتے سے فارغ ہوکر میں نے عبدل سے کہا "میں ذرا ایک کام سے جارہا ہوں۔ شاید شام تک واپسی ہو۔ شیر محمد آئے تو اس سے کہنا' اکیلا ہی کام کرتا رہے۔ جس گھوڑے کو میں سدھا رہا تھا' اسے ہی سدھانے کی کوشش کرے۔"

"شیر محمد تو شاید آج نہ آئے" عبدل ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔

"کیوں... خیریت؟"

"یہی بات یہ ہے سائیں کہ اسے گھوڑے سدھانے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔ وہ تو بس ایسے ہی ٹائم پاس کررہا ہے۔ اس کے خیال میں یہ بالکل بے کار اور جاہل آدمیوں کا کام ہے..."

"یعنی ہم اس کی نظر میں بے کار اور جاہل آدمی ہوگئے؟" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ مجھے واقعی اس بات پر غصہ نہیں آیا تھا بلکہ میں لطف اندوز ہوا تھا۔

عبدل بدستور ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا "سائیں! وہ تو خود بہت بڑا جاہل ہے لیکن اب میں کیا کروں... میں تو چھوٹا آدمی ہوں نا... کہیں تو اس سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جو کچھ وہ کہتا ہے' چپ کرکے سن لیتا ہوں۔ بہرحال اس کا اب اس کام سے بالکل دل اُچاٹ ہوچکا ہے۔ اسی لیے وہ بہانے بہانے سے غوطے مارنے لگا ہے۔ آج کل وہ کردار رب نواز صاحب کے پیچھے لگا ہوا ہے کہ اس کے ذمے کوئی اور کام لگا دیا جائے۔"

"چلو... یہ تو بہت اچھی بات ہے" میں نے خوش دلی سے کہا "میرا سامنا کردار صاحب سے ہوا تو میں بھی شیر محمد کی سفارش کردوں گا کہ اس پڑھے لکھے انگریز کے ذمے واقعی کوئی اور ہی کام لگادیں۔ یہ کام تو میں اکیلا ہی کرلوں گا۔ جتنے گھوڑے اس وقت فارم میں موجود ہیں' ان کے لیے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں لیکن اس وقت میرے پہلے کے کچھ کام رُکے ہوئے ہیں' وہ نمٹ جائیں تو میں گھوڑوں کی طرف پوری توجہ دوں گا۔ جب میں اس کام میں پوری طرح لگوں گا تو گھوڑے مجھ سے پناہ مانگیں گے۔"

"ہاں سائیں! میرا خیال ہے' گھوڑوں کو اس بات کا اندازہ تو ہوچکا ہے" عبدل مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔ یہ مذاق کی بات نہیں ہے" میں نے سنجیدگی سے اس کی تائید کی۔ "گھوڑا اچھا خاصا ذہین جانور ہے۔ بہت سی باتوں کا اندازہ کرلیتا ہے۔ اسی لیے تو گھوڑوں کو سدھانا میری نظر میں کوئی مشکل کام نہیں۔ البتہ گدھوں کو سدھانا بہت مشکل کام ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ" عبدل مسکراتے ہوئے سر ہلا کر بولا اور صفائی کرنے فارم کی طرف چلا گیا۔

میں نے ایک سفری بیگ اٹھا کر بائیں کندھے پر اور کلاشنکوف دائیں کندھے پر لٹکائی' کمرے کو تالا لگایا اور عقبی راستے سے نکل کھڑا ہوا۔ بیگ میں سب سے اہم چیز اس رقم کا پیکٹ تھا جو گزشتہ روز نمیسو خان اپنے اڈے پر پہنچانے کے لیے روانہ ہوا تھا۔ اس میں سے کچھ رقم تو میں نے اپنے متوقع اور غیر متوقع اخراجات کے لیے رکھ لی تھی لیکن بیشتر رقم اب بھی پیکٹ میں موجود تھی جو کسی حساب نصیب کے حالات بدلنے کے لیے کافی تھی۔

میں خاصا لمبا چکر کاٹ کر برساتی نالے پر پہنچا اور اس کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ میں حاصل آباد سے آنے والی بس پکڑنا چاہتا تھا لیکن گاؤں کے اڈے سے اس بس میں سوار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ بس یونہی معمولی سی احتیاط کے پیش نظر میں نہیں چاہتا تھا کہ مقامی لوگوں میں سے کوئی مجھے بس میں بیٹھ کر کہیں جاتے دیکھے۔ میں بس کو راستے ہی میں روک کر سوار ہونا چاہتا تھا۔

میں سمتوں کی مدد سے اندازاً اپنے مطلوبہ مقام کی طرف جارہا تھا۔ میں نے ذرائع آمدورفت کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرلی تھیں۔ حاصل آباد سے آنے والی ایک بس مختلف قصبوں اور دیہاتوں کے قریب سے گزرتی ہوئی جامی نگر تک جاتی تھی۔ جامی نگر اس کا آخری اسٹاپ تھا۔ خاصا طویل سفر تھا اس لیے میں گھوڑے پر نہیں جارہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ آج ہی اپنے ٹھکانے پر واپس بھی آجاؤں۔

برساتی نالے میں خاصا پانی موجود تھا۔ پہاڑی علاقوں کی طرح یہاں بھی کسی زمانے میں لوگوں نے کچھ ایسا انتظام کیا تھا کہ فاضل اور بے کار زمین میں بڑے بڑے گڑھے کھود کر بارش کے پانی کو محفوظ کرلیتے تھے۔ پھر اسے نالوں کے ذریعے اِدھر اُدھر پہنچاتے تھے مگر اب یہ علاقہ نہری نظام سے منسلک ہوچکا تھا اور بجلی بھی آچکی تھی اس لیے کہیں کہیں ٹیوب ویل بھی لگ گئے تھے۔ چنانچہ یہ

پرانا' ضمنی نظام متروک ہوچکا تھا لیکن ان گڑھوں اور نالوں میں اب بھی اکثر برساتی پانی جمع رہتا تھا اور ادھراُدھر آتے جاتے مویشیوں کے پینے میں کام آتا تھا۔

میں زرتاج کے بارے میں سوچتا ہوا نالے کے کنارے کنارے چلا جارہا تھا۔ میں اپنی دانست میں دل پھینک نہیں تھا۔ زندگی میں وہ کچھ دیکھ لیا تھا کہ دل تو مشکل سے ہی کسی پر آتا تھا اور میرا خیال تھا کہ مستقل طور پر تو میرا دل راحیلہ میں ہی اٹکا ہوا تھا کیونکہ وہ میرا لڑکپن کا خواب تھی لیکن نہ جانے کیوں زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر کوئی نہایت ہی غیر معمولی لڑکی نظر آہی جاتی تھی جو دل میں ایک بے عنوان سی خلش جگادیتی تھی۔

زرتاج یقیناً ایک غیر معمولی لڑکی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اسی دن ہوگیا تھا جس دن میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ آج کے دور میں اس قسم کی لڑکیاں خوابوں ہی کی دنیا میں ملتی ہیں لیکن میں اس کے بارے میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا' اپنے ذہن کو الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ کسی نشے کی طرح میرے حواس پر نہ چھا جائے۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے خواب کیا تھے' آئیڈیلز کیا تھے' اس کا مرکزِ نظر' اس کی سوچوں کا محور کیا ہوسکتا تھا؟ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ میں اندازہ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میری سوچوں اور میرے حالات میں انتشار پہلے ہی کچھ کم نہیں تھا۔ میں اپنے ذہن کو مزید اُلجھانا نہیں چاہتا تھا۔ آخر انسان کتنے خوابوں کے خارزاروں میں اُلجھ سکتا تھا اور کتنے خوابوں کی تعبیر پاسکتا تھا؟

میں ایک معمولی' بے وقعت اور بے حیثیت شخص کے طور پر اس سے ملا تھا اور چاہتا تھا کہ اسی طرح رخصت ہوجاؤں۔ میں بھی چند روز بعد اسے بھول جاؤں' وہ بھی میرے بارے میں کچھ نہ سوچے لیکن نہ جانے کیا بات تھی' کسی نہ کسی بہانے اس کا خیال ذہن میں گھسا چلا آتا تھا۔ ان لمحات میں دل میں ایک عجیب سا گداز پیدا ہوجاتا تھا جو مجھے ڈرا دیتا تھا۔ اس طرح کا گداز کوئی اچھی علامت نہیں ہوتا۔

ایسے لمحات میں' میں اپنے آپ کو راحیلہ کے تصور میں الجھانے کی کوشش کرتا تھا جسے میں زندگی اور موت کی ایک عجیب جنگ لڑتے چھوڑ آیا تھا جس میں اسے صرف اپنے بارے میں ہی نہیں' اپنے تمام ساتھیوں کے بارے میں بھی فیصلے خود ہی کرنے تھے۔ وہ اس قسم کے معاملات میں صرف میری وجہ سے اُلجھی تھی ورنہ وہ تو کراچی میں اپنی چھوٹی سی ملازمت میں محدود مگر پُرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ میں راحیلہ کے بارے میں سوچتا تو زرتاج کا تصور ذہن میں ذرا مدھم پڑجاتا لیکن محو نہیں ہوتا تھا۔ میں اسے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش جاری رکھتا مگر کپڑے کو گرد لگ جائے تو وہ بھی آسانی سے نہیں چھوٹتی۔ یہ تو پھر بھی ایک نایاب سی لڑکی کا خیال تھا!

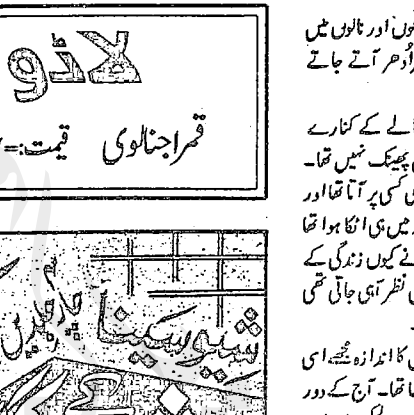

میں انہی خیالات میں اُلجھا نالے کے کنارے کنارے برساتی جوہڑ کے قریب پہنچ گیا لیکن وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔ جو قریب ڈھلوان اور ریتلی سی زمین پر ایک پرانی جیپ ترچھی تھی۔ اس کے چاروں پہیے چپکے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں ہوچکے تھے یا ان میں سے ہوا نکلی ہوئی تھی۔ دراصل اس جیپ کو دیکھ کر ہی میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رہ گیا تھا کیونکہ اس کی پلیٹ پر واضح حروف میں "پولیس" لکھا ہوا تھا مگر پولیس کی اس متروک سے انداز میں' ویرانے میں کیوں کھڑی ہوئی تھی؟

جیپ خالی تھی اور ارد گرد بھی کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ جوہڑ نشیب میں تھا اور اس کے کنارے ڈھلوان تھے۔ پہلے میں نے کہ تھوڑا سا چکر کاٹ کر جیپ اور جوہڑ سے کترا کر اس جگہ گزر جاؤں مگر پھر شاید تجسس نے حوصلہ بھی دلایا اور مجبور بھی میں جیپ کے قریب چلا گیا۔ اسی دوران میری نظر نشیب میں طرف گئی تو مجھے دوسری حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔

جوہڑ میں کافی پانی موجود تھا لیکن گدلا تھا اس لیے اس کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوسکتا تھا۔ جوہڑ کے کنارے نیم رتیلی ڈھلوان زمین پر ایک شخص اوندھے منہ پڑا تھا۔ وہ شلوار قمیص واسکٹ میں تھا۔ سر سے پاؤں تک گندے پانی اور کیچڑ میں لتھڑا تھا۔ وہ یقیناً جوہڑ میں گرنے کے بعد باہر آیا تھا لیکن عجیب بات تھی کہ اس کے ہاتھ اس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور ٹخنوں میں بھی رسّی کی بندشیں تھیں۔

وہ قطعی ساکت تھا۔ معلوم نہیں زندہ بھی تھا یا مرچکا تھا۔ پھر میں نے بغور دیکھا تو اس کے اوپری دھڑ میں موہوم سی جنبش نظر آئی جو نشاندہی کررہی تھی کہ وہ سانس لے رہا تھا۔ میں

اس کے قریب پہنچا اور ایک ہاتھ سے اپنی گن اور چادر سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے میں نے اسے سیدھا کردیا۔ دوسرے ہی لمحے میں غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹ گیا۔

اس کا چہرہ اور بال گوکہ کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے پھر بھی اس شخص کو میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ انسپکٹر رحیم گل تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سانسوں کی آمدورفت سُست تھی۔ کل میں نے اسے بڑے طمطراق سے' صاف ستھرے حُلیے میں بینک سے نکلتے دیکھا تھا۔ آج وہ اس حال میں پڑا تھا۔ معلوم نہیں کیا ماجرا تھا؟ جب وہ میرے تعاقب میں تھا تو وردی میں تھا اور گھوڑے پر تھا لیکن اب شلوار قمیص میں تھا اور قریب ہی اس کی سرکاری جیپ بھی کھڑی تھی۔ شاید اس نے کسی قریبی پولیس اسٹیشن پہنچ کر مدد حاصل کی تھی لیکن کیا اس نے میری.... یعنی اپنی دانست میں ایک خطرناک ڈاکو کی تلاش جاری رکھنے کے لیے مزید پولیس فورس کی مدد حاصل نہیں کی تھی؟ لگتا یہی تھا کہ وہ جو کچھ بھی کررہا تھا' اکیلا ہی کررہا تھا اور اکیلا ہی ہونے کی وجہ سے اس حال کو پہنچا تھا۔

ایک بار تو میں نے سوچا کہ اسے یونہی پڑا چھوڑ کر اپنی راہ لوں۔ اول تو مجھے اس صورت حال پر خوش ہونا چاہیے تھا کیونکہ کسی اور نے میرے حصے کا کام کردیا تھا۔ اسے یقیناً بہت زیادہ مارپیٹ کے بعد ہاتھ پاؤں باندھ کر جوہڑ میں پھینک دیا گیا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح وہ گھسٹتا ہوا جوہڑ سے نکل آیا تھا۔ اس کی ٹانگیں اب بھی گھٹنوں تک پانی میں ہی تھیں۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ جسم اور چہرے پر کیچڑ کے باوجود ضربات کے نشان نظر آرہے تھے۔ پیشانی کی کھال پھٹی ہوئی تھی اور وہاں سے یقیناً کافی خون بہہ چکا تھا۔ چہرے پر نیل پڑے ہوئے تھے۔

بہت سے ملزمان کا تھانوں اور عقوبت خانوں میں دورانِ تفتیش یہی حال ہوتا تھا جو اس وقت انسپکٹر رحیم کا نظر آرہا تھا۔ وہ یک سخت جان' مضبوط اور قد آور شخص تھا۔ یقیناً بے پناہ قوتِ برداشت کا مالک تھا۔ نہ جانے اس نے کتنی مارپیٹ برداشت کی تھی۔ اس وقت وہ نیم جاں نظر آرہا تھا۔

یہ بات یقینی تھی کہ اگر میں اسے یونہی چھوڑ کر آگے روانہ ہوجاتا تو وہ موت کے منہ میں چلا جاتا۔ لگتا یہی تھا کہ ادھر سے شاذ و نادر ہی کسی کا گزر ہوتا تھا۔ انسپکٹر رحیم گل تو خیر ایک اچھا آدمی تھا لیکن اس طرح بے بسی کے عالم میں کسی کو بھی مرتا چھوڑ کر آگے بڑھ جانا میری نظر میں مردانگی نہیں تھی۔ اگر مجھے یقینی طور پر معلوم ہوتا کہ وہ ایک کرپٹ اور کمزوروں پر ظلم کرنے والا پولیس آفیسر تھا تو میں دل میں ذرا سی بھی خلش محسوس کیے بغیر اسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا۔

لیکن اب تک اس کے بارے میں جو شہادتیں ملی تھیں ان سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انہی پولیس آفیسرز میں سے ایک تھا جو نایاب ہوتے جارہے تھے۔ وہ اپنی عمل داری' اپنے علاقے سے کوسوں دور یہاں شاید میری تلاش میں.... یا پھر کسی اور جرم کی تفتیش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔

مانا کہ یہ اس کے فرائض میں شامل تھا مگر اس دور میں اپنے فرائض کے یاد رہ گئے تھے؟ ہر کوئی صرف حقوق کا طلب گار تھا۔ فرائض کے لیے جن کو سرکاری کرسیوں پر بٹھایا گیا تھا ان میں سے کچھ لوگوں کا تقریروں' تحریروں' رپورٹوں' فائلوں اور دستخطوں سے کام چل رہا تھا۔ کچھ صرف ڈنڈے سے کام چلا رہے تھے۔ رحیم گل بھی چاہتا تو آرام سے اپنے علاقے میں' اپنے تھانے میں بیٹھ کر حاکمی کرتا' موج اُڑاتا اور صرف رجسٹر کالے کرواتا مگر وہ جان ہتھیلی پر لیے پھرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی یہ ادا مجھے پسند آئی تھی۔ ایسے شخص کو اس عالم میں نہیں مرنا چاہیے تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوں اور وہ گندے جوہڑ کے کنارے پڑا ہو۔

میں نے اس کی بندشیں کھولیں۔ قمیص کے نیچے اس کی کمر سے ہولسٹر بھی بندھا ہوا تھا مگر اس میں ریوالور نہیں تھا۔ میں اسے اٹھا کر جوہڑ سے کچھ دور ہموار زمین پر لے آیا۔ اس کے چہرے اور جسم پر لگی ہوئی کیچڑ خشک ہوچکی تھی۔ اسے جوہڑ سے باہر آئے یقیناً کافی دیر گزر چکی تھی۔ میں نے اسے کسی مجسمے کی طرح جھاڑا پونچھا' اس کا ناک منہ صاف کیا اور ہاتھ پیروں کی تھوڑی سی مالش کی کیونکہ اس کے ہاتھ پاؤں بالکل سرد تھے۔

وہ بالکل بے دم لگ رہا تھا مگر ہاتھ پاؤں کی مالش کے دوران قطعی غیر متوقع طور پر وہ کسمسایا پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے پہل شاید وہ خالی الذہن سا رہا اور میری صورت اسے دھندلی نظر آئی کیونکہ اس نے کئی بار پلکیں جھپکائیں پھر دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک نمودار ہوئی۔ اس نے بہ مشکل اپنے ہاتھ پیروں کو ذرا سی حرکت دی اور اٹھنے کی کوشش کی۔

میں اطمینان سے اس کی کوششوں کا جائزہ لیتا رہا۔ جب وہ اٹھنے میں ناکام رہا تو میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "آرام سے لیٹے رہو۔ تمہارے اٹھ کھڑے ہونے سے حالات میں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔"

"تم کون ہو؟" اس نے نقاہت زدہ سی آواز میں پوچھا۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ پگڑی' سیاہ چشمے اور بڑھی ہوئی شیو جیسی سادہ سی چیزوں نے میک اپ کی کمی پوری کردی تھی لیکن رحیم گل اپنی تمام تر شکستہ حالی کے باوجود جتنی توجہ سے میری طرف دیکھ رہا تھا اس سے اندیشہ محسوس ہورہا تھا کہ وہ مجھے پہچان ہی نہ جائے۔ میں نے گلے میں پڑی ہوئی اجرک کچھ اس طرح لپیٹی کہ اس کا کچھ حصہ چہرے کے سامنے بھی آگیا۔

"میں تو ایک راہ گیر ہوں" میں نے مجسم جواب دیا پھر انجان بنتے ہوئے پوچھا "تم بتاؤ کون ہو؟ ادھر جو جیپ کھڑی ہے' کیا وہ تمہاری ہے؟ اس کی نمبر پلیٹ پر پولیس لکھا ہوا ہے۔"

"ہاں... میں پولیس انسپکٹر ہوں..." اس کی آواز سرگوشی سے کچھ ہی بلند تھی "لیکن... یہ میرا علاقہ نہیں ہے... میں ایک ضروری کام سے آیا ہوا تھا... آج صبح ادھر سے گزر رہا تھا کہ ڈاکوؤں سے سامنا ہوگیا... انہوں نے اچانک ہی مجھے گھیر لیا... وہ تعداد میں سات تھے... انہوں نے مجھے رائفلوں کے کندوں سے مارا... پھر ہاتھ پاؤں باندھ کر جوہڑ میں پھینک دیا... وہ گولی بھی مار سکتے تھے... لیکن وہ چاہتے تھے کہ میں زیادہ سے زیادہ تکلیف سے مروں... جب انہوں نے مجھے پانی میں پھینکا اس وقت میں بے ہوش تھا لیکن پانی میں گرتے ہی مجھے نہ جانے کیسے ہوش آگیا اور میں نے سانس روک لی... وہ سمجھے کہ میں ڈوب چکا ہوں... اس لیے وہ چلے گئے... ان کے جانے کے بعد میں کسی نہ کسی طرح گھسٹتا ہوا باہر آگیا..."

وہ ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ میں نے تاسف زدہ لہجے میں کہا "اب ڈاکوؤں کی اتنی ہمت بڑھ گئی ہے کہ انہوں نے راہ چلتے ایک پولیس آفیسر پر بلاوجہ تشدد کرکے اور اپنی دانست میں اسے ہلاک کرنے کے لیے جوہڑ میں پھینک دیا۔ حالانکہ آپ نے ان کو گرفتار کرنے کی تو کوشش نہیں کی ہوگی؟"

"میں اگر خبردار ہوتا تو شاید کوئی کارروائی کرتا... کیونکہ میں اپنی عادت سے مجبور ہوں... مگر اس وقت تو میں کسی اور ہی خیال میں... اپنے دھیان میں جا رہا تھا... انہوں نے اچانک ہی مجھے آن گھیرا تھا..." ایک لمحے کے لیے خاموش ہوکر اس نے قدرے گہری نظر سے میری طرف دیکھا اور خود استہزائی کے سے انداز میں مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کے زخمی ہونٹ کھنچ کر رہ گئے۔

پھر وہ پہلے سے قدرے بہتر آواز میں بولا "جہاں تک ہمت کی بات ہے... ڈاکوؤں کی ہمت تو اس سے بھی کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے... میں تو اکیلا تھا... انہیں موقع ملے تو وہ پولیس کی کسی بڑی پارٹی پر بھی حملہ کرسکتے ہیں... حوصلے تو شرفا کے پست ہوتے ہیں... اور مجھے اعتراف ہے کہ اس میں کسی حد تک ہم پولیس والوں کا قصور ہے... دوسرے بہت سے لوگ بھی ہیں... جن کا ہم پولیس والوں سے بھی زیادہ قصور ہے... بہرحال میں تو تلافی کی اپنی سی کوشش کر رہا ہوں... میری زندگی تو تلافی ہی کے لیے وقف ہے... لیکن میں تنہا ہوں... بہت تنہا..."

اس نے ایک بار پھر مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے پر اس کی مسکراہٹ میں شکست خوردگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ مجھے مزید اچھا لگا۔ اس حال میں اس طرح کی باتیں کرنا اور مسکرانے کی کوشش کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر اس شخص سے کبھی میرا مقابلہ آن پڑا اور وہ مجھے ہلاک کرنے پر بھی تل گیا تب بھی شاید میں جواباً اسے باز رکھنے کے سوا اس کے خلاف کچھ نہ کرسکوں۔

میں نے گپڈی درست کرتے ہوئے کہا "سادہ لباس میں... اپنے راستے پر جاتے ہوئے پولیس آفیسر پر اس طرح حملہ... اس طرح اسے جان سے مارنے کی کوشش... یہ معاملہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

وہ ٹانگوں کو حرکت دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "مجھے مارتے وقت وہ جو باتیں کر رہے تھے ان سے مجھے کسی حد تک وجہ کا اندازہ ہوا ہے... اگر تم زرتاج نگر کے رہنے والے ہو تو شاید تمہیں معلوم ہو کہ کل وہاں کے بینک میں چند ڈاکو آئے تھے... اچانک کہیں سے فائرنگ ہوئی... وہ بینک لوٹنے میں کامیاب نہیں ہوسکے... پانچ ڈاکو مرگئے... ایک بھاگ گیا... بدقسمتی سے... اس واقعے سے کچھ دیر پہلے میں ایک اور کام سے اس بینک میں تھوڑی دیر کے لیے گیا تھا... ڈاکوؤں کو اس بات کی اطلاع ہوگئی... وہ سمجھے کہ مجھے کسی ذریعے سے مخبری ہوگئی تھی... اور میری ہی وجہ سے ڈکیتی ناکام ہوئی... انہوں نے مجھے کوئی وضاحت کرنے یا کسی سوال کا جواب دینے کی مہلت نہیں دی... لیکن اگر مجھے واقعی اس ڈکیتی کے بارے میں پہلے سے خبر مل جاتی تو چاہے مجھے اکیلے اسے روکنے کی کوشش کرنا پڑتی، میں ضرور کرتا... معلوم نہیں وہ کون نیک آدمی تھا جو پولیس کے حصے کا کام ادا کرگیا۔"

میں اجرک کی اوٹ میں مسکرادیا۔ وہ میرے لیے "نیک آدمی" کے الفاظ استعمال کر رہا تھا اور اسی "نیک آدمی" کو گرفتار کرنے کے لیے مارا مارا پھر رہا تھا۔ شاید اسے گمان بھی نہیں تھا کہ اس وقت وہ اسی نیک آدمی سے ہم کلام تھا۔

میں نے گفتگو کے اس پہلو سے کترا تے ہوئے پوچھا "ڈاکوؤں نے اگر آپ کو بے خبری میں گھیرا تھا... تو اس کا مطلب ہے وہ آپ کو پہچانتے تھے؟"

"ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے بہت اچھی طرح پہچانتے تھے... لیکن میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا... بہرحال کبھی نہ کبھی جان جاؤں گا... بشرطیکہ زندہ رہا... میں ضدی انسان ہوں..." اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی مگر اندر سے پہلے ہی کی طرح مضبوط تھا۔ وہ زیادہ زخمی نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید اندرونی چوٹوں اور دیر تک بندھا پڑا رہنے کی وجہ سے اس کی حالت خراب تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں مگر بار بار کوشش کرکے نہ صرف انہیں کھلی رکھ رہا تھا بلکہ بغور میری طرف دیکھنے کی کوشش بھی کیے جا رہا تھا۔ دو ایک مرتبہ تو مجھے یہ اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ مجھ سے سیاہ چشمہ اتارنے اور اس کے سامنے سے اجرک ہٹانے کی بھی فرمائش نہ کردے۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "میں ایک بہت ضروری کام سے جا رہا تھا... بہت جلدی میں ہوں ورنہ تمہیں گھر لے چلتا... بہرحال میں تمہیں کسی ایسی جگہ پہنچانے کا بندوبست کرکے جاؤں گا جہاں تمہیں مدد میسر آسکے۔"

"تم مجھے صرف زرتاج نگر کے تھانے تک پہنچانے کا بندوبست کردو۔ بس تمہاری یہی مہربانی کافی ہوگی" وہ تھکے تھکے سے انداز میں آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔

میں نے اسے کندھے پر اٹھایا اور ریتلی ڈھلوان زمین پر احتیاط سے پاؤں جما کر مزید اوپر آگیا۔ وہ ایک جسیم آدمی تھا اور اس وقت بے جان سے انداز میں میرے کندھے پر لدا ہوا تھا اس لیے اس کا وزن کچھ اور زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ بے ہوش یا مُردہ شخص کو اٹھا کر چلنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ بہرحال میں اسے اٹھائے زرتاج نگر کی طرف واپس چل دیا۔

خوش قسمتی سے مجھے زیادہ دور تک نہیں چلنا پڑا۔ ابھی میں نے فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ بل کھاتی پگڈنڈی کے ایک طرف سے آتی ہوئی چوں چوں کی ہلکی سی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ڈگمگاتی سی ایک بیل گاڑی پگڈنڈی کی طرف چلی آرہی تھی۔

میں رک کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ بیل گاڑی میں ایک بوڑھا جوڑا سوار تھا۔ مرد بیلوں کو ہانک رہا تھا اور عورت ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں قریب بیٹھی تھی مگر مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ دونوں کچھ سنبھل کر بیٹھ گئے۔

فاصلہ کچھ اور کم ہوا تو گاڑی کے پچھلے حصے میں دو بھری ہوئی بوریاں بھی لدی نظر آئیں۔ بڑے میاں نے اب شک زدہ سی نظروں سے میرا جائزہ لینا شروع کردیا کیونکہ میرے کندھے پر ایک شخص بے جان سے انداز میں لٹکا ہوا تھا۔

مجھے کچھ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ بڑے میاں نے قریب پہنچ کر خود ہی متذبذب سے انداز میں گاڑی روک لی اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں چاچا جی؟" میں نے نہایت نرمی سے پوچھا۔ میرے لہجے سے غالباً بڑے میاں کو کچھ حوصلہ ہوا پھر بھی انہوں نے مشورہ طلب سے انداز میں اپنی ہم سفر کی طرف دیکھا جس نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے غیر ارادی سے انداز میں آدھا چہرہ چادر میں چھپالیا تھا۔ بڑے میاں گویا نظروں ہی نظروں میں اس سے اجازت طلب کر رہے تھے کہ سوال کا جواب دیں یا نہ دیں۔

بیوی کی طرف سے کوئی واضح اشارہ نہ پاکر بڑے میاں دوبارہ میری طرف متوجہ ہوئے اور ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولے "زرتاج نگر جا رہا ہوں۔"

میں نے اپنے کندھے پر لدے رحیم گل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ شخص پولیس انسپکٹر ہے۔ ڈاکوؤں نے اسے بے ہوش کرکے جوہڑ میں پھینک دیا تھا۔ آپ صرف اتنی تکلیف اٹھالیں کہ اسے اپنی بیل گاڑی میں ڈال کر لے جائیں اور زرتاج نگر کے تھانے پہنچادیں۔ بس آپ کو اور کچھ نہیں کرنا ہے۔ وہاں پولیس والے خود ہی اسے سنبھال لیں گے۔"

"تم بھی ساتھ چلوگے؟" بڑے میاں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"میں اس وقت ایک بہت ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے ورنہ شاید میں اسے کندھے پر ہی لے جاتا" میں نے جواب دیا اور گردن ذرا ٹیڑھی کرکے رحیم گل کے چہرے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

بڑے میاں اپنی مختصر سی پگڑی درست کرتے ہوئے بولے "دیکھو برخوردار! تم زور آور آدمی لگتے ہو۔ کلاشنکوف بھی تمہارے پاس ہے۔ تم چاہو تو اس مرے ہوئے یا ادھ مرے آدمی کو زبردستی بھی میری گاڑی میں ڈال سکتے ہو لیکن تمہیں اس قسم کی بہانے بازی کی کیا ضرورت ہے؟ ہمیں کیوں کسی چکر میں پھنسانے کی کوشش کر رہے ہو؟ اس سے جان چھڑانی ہے تو پگڈنڈی سے دور کہیں جھاڑیوں میں پھینک دو۔"

بڑے میاں اتنے سیدھے سادے نہیں تھے جتنے نظر آرہے تھے۔ میں ذرا شرمندہ سا ہوگیا کیونکہ انہوں نے مجھے جھوٹا سمجھا تھا۔ رحیم گل بدستور ڈھیلے ڈھالے انداز میں میرے کندھے پر لٹکا ہوا تھا۔ شاید وہ بے ہوش ہوچکا تھا اس لیے میری بات کی تصدیق نہیں کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں تذبذب میں پڑگیا کہ کیا کروں؟

اسی دوران بڑے میاں ذرا توقف کے بعد بولے "اگر میں تمہاری بات پر یقین بھی کرلوں کہ یہ پولیس انسپکٹر ہے... تب بھی اسے اس حالت میں تھانے پہنچانے کا تو مجھ میں حوصلہ نہیں ہے بیٹا! تھانے والے تو مجھے ہی دھرلیں گے۔ اگر یہ مُردہ نہیں ہے لیکن راستے میں اللہ کو پیارا ہوگیا تو میں بالکل ہی مارا جاؤں گا۔ ہم غریب لوگ ہیں... ہمیں معاف ہی رکھو۔"

اسی لمحے رحیم گل کسمسایا پھر نقاہت بھرے انداز میں میرے بازو پر کچھ سیدھا ہوتے ہوئے آہستگی سے آنکھیں کھول کر نہایت دھیمی آواز میں بڑے میاں سے مخاطب ہوا "گھبراؤ نہیں بابا! یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے، ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم مجھے لے چلو... تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی... بلکہ شاید کچھ انعام ہی مل جائے... اور اس کے علاوہ میں زندگی بھر تمہارا شکر گزار بھی رہوں گا... چاچا! ہمارا معاملہ 'بداچھا بدنام برا' والا ہے۔ ہم پولیس والے اتنے برے نہیں ہیں جتنے بدنام ہیں۔"

اب بڑے میاں کے کھسیانا ہونے کی باری تھی۔ انہوں نے اشارے سے رحیم گل کو گاڑی میں لٹانے کی اجازت دے دی۔ میں نے اسے بوریوں کے قریب لٹادیا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے مضمحل سے انداز میں مسکرایا۔ اس مسکراہٹ میں تشکر کی آمیزش تھی۔

وہ نہایت دھیمی آواز میں بولا "میں تمہارا بھی شکر گزار رہوں گا۔"

میں نے اسے خدا حافظ کہا اور بیل گاڑی سے اتر آیا۔ بڑے میاں کا شکریہ ادا کر کے میں تیزی سے واپس اسی طرف روانہ ہو گیا جدھر سے آیا تھا۔ میں عقل کی روشنی میں تو فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ میں نے رحیم گل کی جان بچا کر اپنے حق میں اچھا کیا تھا یا برا؟ لیکن میرا ضمیر مطمئن تھا۔ فی الحال میرے لیے یہی اطمینان کافی تھا۔ میں اب زیادہ دور کی سوچوں میں نہیں اُلجھتا تھا۔

سمتوں کی مدد سے سفر کرنے کے معاملے میں میرے اندازے ہمیشہ درست ہی رہتے تھے۔ میں سڑک پر اسی مقام پر پہنچ گیا جہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ مجھے وہاں خاصی دیر انتظار کرنا پڑا۔ آخر کار جامی نگر کی طرف جانے والی بس آتی دکھائی دی۔ بس کیا تھی' انسانوں کا ایک چھتہ تھا جو لڑھکتا چلا آ رہا تھا۔

بس قریب آئی تو پتا چلا کہ اس کے اندر بھی انسان بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھنسے ہوئے تھے اور صرف محاورتاً ایسا نہیں تھا بلکہ حقیقتاً بس میں انسانوں کے ساتھ کئی بھیڑ بکریاں بھی موجود تھیں۔ مساوات کے زریں اصولوں پر کچھ زیادہ ہی عمل کرتے ہوئے دو پایوں اور چوپایوں کو یکساں انداز میں ٹھونسا گیا تھا۔ بعض جگہ تو فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ انسان کون سا ہے اور بکرا کون سا۔ چھت پر بھی لوگ اپنی پوٹلیوں' صندوقوں اور دیگر ساز و سامان کے ساتھ موجود تھے۔ جہاں جہاں لٹکنے کی گنجائش تھی وہاں لٹکے ہوئے بھی تھے۔ بڑے شہروں میں رہنے والے سمجھتے ہیں کہ ان کے مسائل سے بڑھ کر کسی کے مسائل نہیں لیکن دیہی اور دور افتادہ علاقوں میں جا کر پتا چلتا ہے کہ انسان کس حال میں زندگی گزار رہے ہیں اور انہیں قدم قدم پر کن مسائل اور کن مصائب سے واسطہ پڑتا ہے۔

اس عبرتناک صورت حال کے باوجود ڈرائیور نے انتہائی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے ہاتھ ہلانے پر بس روک لی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر میں نے یہ بس چھوڑ دی تو دوسری بس کے لیے شاید مجھے ڈیڑھ دو گھنٹے انتظار کرنا پڑے چنانچہ کسی نہ کسی طرح پائیدان کے ایک کونے پر پاؤں پھنسا کر میں بھی لٹک ہی گیا۔ زیادہ فکر مجھے اس بات کی تھی کہ اس دھکم پیل میں کہیں رقم اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔ اس صورت میں تو ساری تگ و دو ہی بے کار چلی جاتی۔

چند ایک دیہات اور قصبے گزر چکے تو بس پر بوجھ کافی کم ہو گیا۔ میری حالت میں اتنی "ترقی" ہوئی کہ میں اندر پہنچ گیا اور ایک سیٹ کے پشتے کا سہارا لے کر قدرے باعزت انداز میں کھڑا ہو گیا۔ مزید ایک گھنٹے کے سفر کے بعد تو مجھے سیٹ بھی میسر آ گئی لیکن اس وقت تک میں جامی نگر کے قریب پہنچ چکا تھا۔

جامی نگر کے اسٹاپ پر میرے سوا کوئی نہیں اُترا۔ بس اپنے کسی ٹھکانے یا اڈے کی طرف روانہ ہو چکی تو میں نے سر جھٹک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ریسلنگ کے کسی چھوٹے موٹے مقابلے میں حصہ لے کر رِنگ سے باہر آیا تھا۔ جسم میں ابھی جھنجھناہٹ باقی تھی۔

غنیمت تھا کہ ایک طرف چھوٹا سا ایک ٹیڑھا میڑھا سائن بورڈ زمین میں گڑا ہوا تھا جس پر "جامی نگر ٹاؤن" لکھا ہوا تھا اور تیر کا نشان بھی بنا ہوا تھا۔ میں کچے میں اُتر کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس طرف چل دیا۔ تین چار فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جامی نگر کے مکانات نظر آنے لگے۔

جامی نگر اچھا خاصا قصبہ معلوم ہوتا تھا اور اس کا مین بازار بھی بارونق تھا۔ میرانی پاڑے تک پہنچنے کے لیے مجھے ایک شخص سے ملاقات کرنا ہی پڑی۔ نہ جانے کیوں اس نے راستہ بتانے سے پہلے میرا سرتاپا جائزہ لیا۔ بہرحال اس نے راستہ مجھے سمجھا دیا۔ وہ تو میرے ساتھ چلنے پر بھی کمربستہ نظر آنے لگا تھا۔ میں نے بہ مشکل اسے باز رکھا۔

اس کے بعد مجھے میرانی پاڑے تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ خاصے عسرت زدہ سے مکانوں پر مشتمل ایک مختصر سی گلی تھی جس میں چار پانچ بچے کھیل رہے تھے۔

میں نے ان میں سے ایک کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے پوچھا "بیٹا! تمہیں معلوم ہے کنڈکٹر عبدالرشید کا گھر کون سا ہے؟"

لڑکا اپنے ساتھیوں کی نسبت ذرا بڑا تھا۔ دس بارہ سال کا ہو گا۔ وہ اخروٹوں سے کھیل رہے تھے۔ میرا سوال سن کر بڑا لڑکا کھیل کو بھول بھال کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے مستعدی سے بولا "جسے ڈاکوؤں نے قتل کر دیا تھا؟"

"ہاں" میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

وہ چاروں بیک وقت مجھے گھر بتانے پر تل گئے اور مجھے گویا گھیر گھار کر آگے چل دیے۔ ان سے پوچھ کر میں تو پھنس ہی گیا تھا۔

عبدالرشید کا مکان گلی میں دائیں ہاتھ پر آخر میں تھا۔ اس سے آگے گلی بند تھی۔ وہ نیچی سی دیواروں والا ایک نیم پختہ مکان تھا۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا جس کا نچلا حصہ تار تار تھا۔

مجھے دستک یا آواز دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ تمام بچے دھڑ دھڑ کرتے دَرآنہ وار اندر گھس گئے اور چند سیکنڈ بعد اسی رفتار سے واپس آ گئے۔ وہ میرے گرد دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئے اور بڑے مُدبرانہ انداز میں میرا جائزہ لینے لگے۔

چند لمحے بعد ٹاٹ کا پردہ ذرا ایک طرف کو سرکا اور اس کے عقب سے وہی موٹی موٹی آنکھیں طلوع ہوئیں جو کبھی بہت روشن رہی ہوں گی لیکن اب غم کے غبار سے دھندلائی ہوئی سی تھیں۔ وہ صبیح چہرہ جسے میں نے ایک چھوٹی سی اخباری تصویر کی صورت میں دیکھا تھا' اس وقت سیاہ چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ ایک اداس چاند تھا جس کے گرد ماتمی بادلوں کا حلقہ تھا۔ ان افسردہ آنکھوں نے میرا سرتاپا جائزہ لیا اور ٹاٹ کے پردے پر مرمریں انگلیوں کی گرفت غیر

ارادی طور پر سخت ہو گئی۔

"کیا بات ہے بھائی....؟ کون ہو تم؟" اس کے لب لرزے۔ "بھائی۔" اس لفظ کی حلاوت اور شیرینی میری رگ رگ میں اتر گئی۔

میں نے ہچکچاہٹ سے ایک نظر بچوں کی طرف دیکھا جو یوں سر اٹھائے مجھے دیکھ رہے تھے جیسے کسی مینار پر کندہ کسی اجنبی زبان کے الفاظ پڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"میں ایک منٹ کے لیے اندر آ سکتا ہوں؟" میں نے اجازت طلب کی۔

ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار دکھائی دیے پھر وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی "گھر میں اس وقت کوئی مرد نہیں ہے۔ تمہیں جو کہنا ہے یہیں کہہ دو۔"

"بچو! تم جا کر کھیلو۔ مجھے بہن سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں" میں نے بچوں کے لیڈر کو پیار سے تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ان کے چہروں پر ناپسندیدگی اور ناگواری کے تاثرات ابھر آئے لیکن وہ بادلِ ناخواستہ گلی کے اس سرے پر واپس چلے گئے جہاں وہ کچھ دیر پہلے اخروٹوں سے کھیل رہے تھے۔ ان کا لیڈر وہاں پہنچ کر بھی کن انکھیوں سے اِدھر ہی دیکھ رہا تھا۔

میں نے اپنے بیگ سے اس رقم کا پیکٹ نکالا جو خمیسو خان "گولڈ کی کلب" سے لے کر چلا تھا اور جو اسے ہلاک کرنے کے بعد میں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اس میں اب بھی تقریباً پانچ لاکھ کی رقم موجود تھی۔

میں نے پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "عبدالرشید نے یہ پیکٹ کسی کے پاس امانت رکھوایا ہوا تھا۔ اس شخص نے اخبار میں عبدالرشید کے قتل اور اس کے کنبے کے حالات کے بارے میں پڑھا تو میرے ہاتھ یہ چیز آپ لوگوں کے لئے بھجوائی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اب جبکہ عبدالرشید اس دنیا میں موجود نہیں ہے تو آپ لوگ ہی اس کی امانت کے وارث ہیں۔ ویسے بھی عبدالرشید نے یہ آپ لوگوں کے لیے ہی رکھوائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ کسی مناسب وقت پر لے جائے گا لیکن اس کی زندگی نے وفا نہیں کی۔"

لڑکی کا ہاتھ پیکٹ تھامنے کے لیے آگے نہیں بڑھا۔

"کیا ہے اس میں؟" اس کے لہجے میں ایک بے عنوان سا خوف تھا۔ "کیا نام ہے ان کا.... جنہوں نے یہ بھیجا ہے؟"

"انہوں نے اپنا نام بتانے سے منع کیا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس پیکٹ میں کیا ہے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا تھا کہ اس میں ایک ایسی چیز ہے جو آپ کے بہت کام آئے گی۔ یہ چیز صرف عبدالرشید کو واپس نہیں لا سکتی لیکن آپ کے باقی تمام مسائل حل کر دے گی۔ آپ سے رکھ لیں۔"

عبدالرشید کا محض نام سن کر ہی لڑکی کی آنکھیں بھر آئی تھیں حالانکہ اس کے قتل کے بعد سے اب تک اس کا وقت یقیناً آنسو بہاتے ہی گزرا ہو گا لیکن آنسوؤں کے سوتے شاید خشک ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

وہ گلوگیر آواز میں بولی "جو چیز عبدالرشید کو.... میرے بھائی جان کو واپس نہیں لا سکتی وہ ہمارے کس کام کی۔"

"بہرحال یہ تم لوگوں کی امانت ہے' اسے رکھ تو لو" میں نے زور دیا۔

اس نے پیکٹ بے دلی سے تھام لیا اور ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی "اندر آ جاؤ بھائی!" اب گویا اس نے مجھ پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"نہیں.... بس اب میرے اندر آنے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ" میں نے کہا اور تیزی سے مُڑ کر واپس چل دیا۔ گلی کے موڑ پر پہنچ کر میں نے مُڑ کر دیکھا۔ وہ اداس آنکھیں ابھی تک میری جانب نگراں تھیں۔ اب ان آنکھوں میں اداسی کے ساتھ حیرت بھی جھلک رہی تھی۔

میں جس راستے سے آیا تھا' تیزی سے اسی راستے سے واپس چل دیا۔ ایک عجیب سی سرشاری' ایک عجیب سی خوشی کی خوشبو ہر مسامِ جاں سے روح کی گہرائی میں اتر آئی تھی۔ میں اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا اور اس وقت گویا چل نہیں رہا تھا' اُڑ رہا تھا۔ کسی کی مدد کرنے میں ایک عجیب ہی لذت پنہاں ہوتی ہے۔ کوئی اور خوشی اس کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ خمیسو خان والی رقم میں نے قبضے میں تو لے لی تھی لیکن اسے اپنے پاس رکھنے کو میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ وہ مجھے ایک بوجھ محسوس ہو رہی تھی۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ رقم کیسی بھی ہو' پھینکی نہیں جاتی۔ میں شروع سے ہی سوچ میں تھا کہ اس رقم کا اچھا مصرف کیا ہونا چاہیے۔ یک دم مجھے کنڈکٹر عبدالرشید کا خیال آ گیا تھا۔ ڈکیتی کی جس واردات میں عبدالرشید مارا گیا تھا اس میں اور بھی کئی لوگ مارے گئے تھے۔ ان میں سے بھی کچھ یقیناً مدد کے مستحق ہوں گے لیکن میرے پاس ان میں سے کسی کا کوئی سراغ نہیں تھا۔ میرے سامنے صرف کنڈکٹر عبدالرشید کا تھوڑا بہت سراغ موجود تھا اور مجھے امید تھی کہ میں کوشش کروں تو اس کے گھر تک پہنچ جاؤں گا۔ وہ رقم یقیناً نہایت ہی ناجائز اور گھٹیا قسم کی کمائی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ رقم عبدالرشید کے پسماندگان یا اہلِ خانہ کو پہنچا کر مجھے ثواب ملے گا یا نہیں۔ میں گناہ و ثواب کے چکر میں تھا بھی نہیں۔ میں صرف یہی چاہتا تھا کہ فی الحال اس مصیبت زدہ کنبے کے مسائل حل ہو جائیں۔

میں تقریباً پہلے ہی کے سے انداز میں سفر کر کے رات گئے زرتاج نگر واپس پہنچ گیا۔ حالانکہ سفر طویل نہیں تھا لیکن اس میں وقت بہت ضائع ہوتا تھا۔

زرتاج نگر واپس پہنچ کر دوسرے روز سے میں اپنے کام میں

مصروف ہوگیا۔ تقریباً ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا لیکن ہفتے کے اختتام پر ایک شام گاؤں کے ایک چائے خانے میں بیٹھے بیٹھے مجھے ایک ایسا جھٹکا لگا جس نے کافی دیر کے لیے میرے اعصاب شل کردیے۔

بات کچھ بھی نہیں تھی۔ بس ایک اخباری خبر نظر سے گزری تھی۔ کاش میں نے وہ اخبار نہ دیکھا ہوتا۔ یہ وہی غیر معروف سا علاقائی اخبار تھا جو میں نے نسمو خان کے ساتھ ان کے خفیہ اڈے "گولڈ کی کلب" میں دیکھا تھا اور اس میں مقتول کنڈکٹر عبدالرشید کے اہلِ خانہ کے بارے میں فیچر پڑھا تھا۔

اس روز زرتاج نگر کے ایک چائے خانے میں بیٹھے بیٹھے مجھے اسی اخبار کا تازہ شمارہ میز پر پڑا ہوا نظر آیا تو میں نے غیر ارادی طور پر اٹھالیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پچھلے صفحے پر چھوٹے سے ایک باکس میں اس روز بھی کنڈکٹر عبدالرشید کے اہلِ خانہ کے بارے میں ایک خبر موجود تھی جس نے مجھے ایک عجیب طرح کے ملال میں مبتلا کردیا۔

نامہ نگار نے جامی نگر سے رپورٹ دی تھی کہ گزشتہ دنوں وہاں اپنی نوعیت کا عجیب ہی واقعہ پیش آیا۔ کوئی پُراسرار اجنبی مقتول کنڈکٹر عبدالرشید کے گھر پہنچا اور یہ کہہ کر پونے پانچ لاکھ کی رقم کا پیکٹ دے گیا کہ عبدالرشید نے وہ کسی کے پاس امانت رکھوایا ہوا تھا۔

خبر یہاں تک بھی ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی لیکن اصل جھٹکا مجھے اس سے آگے پڑھنے کے بعد لگا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ عبدالرشید کے اہلِ خانہ کو یہ معاملہ مشکوک معلوم ہوا تھا۔ بھلا ایک غریب کنڈکٹر کسی کے پاس پونے پانچ لاکھ روپے امانت کیسے رکھوا سکتا تھا؟ اگر وہ امانت بھی تھی تو یقیناً کسی اور کی ہوگی.... عبدالرشید کی نہیں۔

چنانچہ عبدالرشید کے بیمار باپ نے وہ رقم ٹاؤن کمیٹی کے چیئرمین صاحب کی خدمت میں لے جاکر پیش کردی تھی جو کوئی حاجی صاحب تھے۔ وہ نہایت دیانت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے علاقے کے تحصیل دار صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لے گئے تھے۔ انہوں نے بھی نہایت دیانت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے سرکاری تحویل میں لے لیا تھا اور علاقے کے صحافیوں کو فخر سے یہ بات بتادی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر کچھ دنوں تک اس رقم کا کوئی دعوے دار سامنے نہ آیا تو وہ اس میں سے عبدالرشید کے اہلِ خانہ کو پچیس ہزار روپے بطور انعام دینے کے بارے میں "غور" کریں گے۔

پوری خبر پڑھ کر میں نے اخبار میز پر واپس پھینک دیا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ غلطی میری ہی تھی۔ شاید میں نے ان لوگوں کی مدد کرنے کے لیے صحیح راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ مجھے اپنی کاروباری زندگی میں بھی تجربہ ہوچکا تھا، مجھے اس کو یاد رکھنا چاہیے تھا کہ بعض اوقات حد سے زیادہ غریب اور مصیبت زدہ لوگوں کی زیادہ بڑی امداد "ہضم" بھی نہیں ہوتی۔ مجھے کنڈکٹر کے گھر والوں کی مدد میں پچیس ہزار روپے سے ہی کرنی چاہیے تھی اور اگر یہ رقم انہیں پہنچانی تھی تو صحیح طور پر بات کرکے، انہیں ذہنی طور پر مطمئن کرکے پہنچانی چاہیے تھی۔ میرا یہ اندازہ غلط نکلا تھا کہ وہ اسے "امدادِ غیبی" سمجھ کر چپکے سے رکھ لیں گے۔

حرام کی رقم گویا حرام راستے ہی چلی گئی تھی۔ کافی دیر تک میں اسی طرح تاسف کے عالم میں بیٹھا رہا لیکن جو ہونا تھا وہ ہوچکا تھا۔ اب اس کی تلافی کا کوئی طریقہ کم از کم میرے لیے قابلِ عمل نہیں تھا اس لیے میں نے اس بات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو سمجھایا کہ اگر ان لوگوں کے مقدر میں مدد تھی ہی نہیں تو میں کیا کرسکتا تھا۔ پھر میں نے دودھ پتی کی ایک چینک منگوا کر اپنا "غم غلط" کرنے کی کوشش کی اور شام ڈھلے اٹھ کر اپنے ٹھکانے واپس آگیا۔

اس ہفتے میں اس کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ حویلی اور زرتاج کی زمینوں پر کام کرنے والے بیشتر لوگ اب مجھے تھوڑا بہت جاننے لگے تھے۔ گو میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ ان کی نظر میں غیر نمایاں اور بے شناخت ہی رہوں۔

شیر محمد نے اس دوران اپنی ڈیوٹی کہیں اور لگوالی تھی۔ یعنی اسے میرے ساتھ کام کرنا گوارا ہی نہیں رہا تھا لیکن میرا دل کہتا تھا کہ اس کے اس اقدام میں کوئی اور بھی مصلحت پنہاں تھی۔ اوغر زرتاج ابھی تک شکار سے واپس نہیں آئی تھی۔ رب نواز اسے بینک پر ناکام ڈکیتی کے بارے میں بتانے کے لیے بے چین تھا۔

اسے کافی حد تک اندازہ تھا کہ شکار پر جانے والوں نے جنگلوں میں کہاں کہاں کیمپ لگائے ہوں گے اور کس سمت میں ان کا سفر جاری ہوگا۔ وہ چاہتا تو آدمی بھیج کر ان کا پتا کرا سکتا تھا اور زرتاج کو وہیں یہ خبر پہنچوا سکتا تھا مگر شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ زرتاج کی تفریح میں خلل پڑے۔

اسی دوران مجھے باتوں باتوں میں رب نواز سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جانو اپنے چار ساتھیوں کے ہمراہ زرتاج سے ملنے آیا تھا۔ اس نے اپنی آمد کا مقصد نہیں بتایا تھا لیکن وہ سخت غصے میں معلوم ہوتا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ زرتاج ابھی شکار سے واپس نہیں آئی تھی تو وہ مزید ایک منٹ بھی رکے بغیر واپس روانہ ہوگیا تاہم یہ کہہ گیا تھا کہ چند دن بعد وہ دوبارہ آئے گا اور اس وقت تک زرتاج شکار سے واپس آچکی ہوتو اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ رب نواز نے بھی محسوس کرلیا تھا کہ اس کے لہجے میں دھمکی سی پوشیدہ تھی لیکن وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

مجھے پتا نہیں چل سکا تھا کہ جانو کس وقت آیا تھا اور کب واپس گیا تھا حالانکہ میں جس میدان گھوڑے سدھاتا تھا وہاں تقریباً چاروں طرف سے ہی آنے جانے والے لوگ دکھائی دیتے

تھے۔ شاید وہ کسی ایسے وقت آیا تھا جب میں کھانا کھانے اپنے کمرے میں گیا تھا۔ شاید یہ ہم دونوں ہی کے حق میں اچھا ہوا تھا کہ ہمارا ایک دوسرے سے سامنا نہیں ہوا تھا۔

بہرحال میں نے اس سلسلے میں رب نواز سے زیادہ کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی مبادا وہ میری طرف سے شک میں پڑجائے کہ آخر اس کارندے کو جانو کی آمد وغیرہ سے اتنی دلچسپی کیوں تھی۔ میرے حساب سے روز و شب سکون سے ہی گزر رہے تھے لیکن وہی میری نامعلوم سی حس کبھی کبھی میرے اعصاب پر ہولے ہولے دستک دینے لگتی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح!

خطرے کا احساس تو محض ایک احساس ہی ہوتا ہے، اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا مگر مجھے یوں لگتا جیسے خطرہ کوئی جسم اوڑھ کر آس پاس کہیں رات کے اندھیرے میں ٹہل رہا ہے، میری گھات میں ہے۔ میں نے اپنے کمرے میں رات کو زیرو کا بلب روشن رکھنے کا انتظام کیا تھا لیکن ایسے لمحوں میں، میں وہ بلب بھی بجھا دیتا تھا اور اندھیرے میں کسی درندے کی طرح چوکنا ہوکر بیٹھ جاتا۔ اندھیرے میں، میں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس کرتا لیکن یونہی بہت دیر گزر جاتی، کچھ بھی نہ ہوتا۔ میرے کشیدہ اعصاب بالآخر ڈھیلے پڑ جاتے اور میں دوبارہ سوجاتا۔

میں زرتاج کی واپسی کا منتظر تھا۔ میں اب یہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا۔ میرے پاس اب کچھ رقم بھی موجود تھی۔ میں سستا بھی چکا تھا۔ ایک آدھ کار آمد قسم کا ہتھیار بھی یہاں سے ساتھ لے جاسکتا تھا۔ میرے یہاں سے جانے کا ارادہ کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ زرتاج کو دیکھ کر میرے سینے میں کوئی خلش سی سر ابھارنے لگتی تھی۔ معلوم نہیں یہ کس محرومی کی خلش تھی۔ میں اس سلسلے میں اپنے تحت الشعور یا لاشعور کو کریدنا نہیں چاہتا تھا۔ ذہن کی بھول بھلیاں عجیب ہوتی ہیں۔ آپ یونہی اِدھر اُدھر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے بیٹھیں تو نہ جانے کیا کیا نکلتا چلا جائے۔

میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ یہ بے عنوان سی خلش کچھ اور زور پکڑے، کچھ اور گہری ہو۔ یا محض خلش نہ رہے، کچھ اور بن جائے۔ ان سب تفرّدات سے بہت پہلے میں یہاں سے رخصت ہوجانا چاہتا تھا۔ مجھے راحیلہ اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی بھی یاد ستا رہی تھی۔ وہ لوگ نہ جانے کس حال میں تھے۔ معلوم نہیں میرے غائب ہونے کے بعد ریڈ ڈاٹ نے ان کا پیچھا چھوڑ دیا تھا یا نہیں؟

سب باتیں صحیح طور پر تولا ہو جاکر ہی معلوم ہوسکتی تھیں لیکن میں فی الحال سیدھا لاہور جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ پہلے کراچی جاکر فون اور دیگر ذرائع سے لاہور کی صورت حال جاننے کی کوشش کروں گا۔ کراچی میں صرف شفیع شاہ اور دو تین دوسرے ساتھی میرے تمام غیر کاروباری معاملات سے واقف تھے اور وہ سب اس وقت تک لاہور ہی میں تھے جب میں لاہور سے فرار ہوا تھا۔ میں نے ہی سب ساتھیوں کو وہاں جمع کیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کراچی میں ان افراد کی عدم موجودگی میں اور کسی کو بھی علم نہیں ہوگا کہ میں یا میرے قریبی ساتھی کن حالات سے دوچار تھے۔

فی الحال مسئلہ یہ تھا کہ میں زرتاج کو مطلع کیے بغیر یہاں سے رخصت ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے محض ایک نظر مجھ پر ڈال کر جس خلوص سے مجھ پر بھروسا کیا تھا، جس طرح آنکھیں بند کرکے مجھے یہاں پناہ دی تھی، جس طرح میرا ہر مسئلہ چٹکی بجاتے میں حل کیا تھا، جس طرح پورا ہارس فارم میرے سپرد کرکے یہاں سے چلی گئی تھی، اس کے بعد اسے اطلاع تک دیے بغیر منہ چھپا کر یہاں سے رخصت ہوجانے پر میرا دل آمادہ نہیں تھا۔ اس طرح بہت سی ناکردہ خطائیں بھی میرے کھاتے میں پڑسکتی تھیں۔

زرتاج پورے دس دن بعد واپس آئی۔ اس کی واپسی کی بھی میں نے صرف خبر ہی سنی، اسے واپس آتے نہیں دیکھا۔ وہ رات میں کسی وقت آئی تھی۔ دوسرے دن سے حویلی میں لوگوں کی آمدورفت بے پناہ بڑھ گئی۔ لوگ بڑے پُرجوش انداز میں اندر جاتے اور مستعدی سے واپس آتے دکھائی دیتے۔

اتنے دنوں میں زرتاج کی عدم موجودگی میں جو کچھ ہوا تھا، شاید اس کی رپورٹیں دی جارہی تھیں اور جو کچھ نہیں ہوسکا تھا، اس کے لیے احکامات لیے جارہے تھے۔ غرضیکہ بڑی سرگرمی نظر آرہی تھی لیکن مجھ سے کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ زرتاج کا کوئی پیغام مجھے نہیں ملا تھا اور نہ ہی اس نے مجھے طلب کیا تھا۔

البتہ اس دوران رب نواز کچھ رقم مجھے دے گیا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا "تمہیں ضرورت ہوگی.... رکھ لو" یہ کہہ کر وہ عجلت میں رخصت ہوگیا تھا۔ اس نے یہ بھی وضاحت نہیں کی تھی کہ یہ میری تنخواہ تھی یا کچھ اور۔ اگر تنخواہ تھی تو کس حساب سے کیونکہ ابھی تو مجھے وہاں ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا جبکہ رقم خاصی تھی۔ کم از کم گھوڑے سدھانے والے کو چند دن کی اتنی تنخواہ تو نہیں دی جاسکتی تھی۔

زرتاج کو واپس آئے جب پورے چار دن گزر گئے اور میں نے اس کی جھلک تک نہیں دیکھی، نہ ہی اس دوران اس کا کوئی پیغام ملا تو میں نے اپنے آپ کو خود اپنی ہی نظر میں خاصا بے وقعت محسوس کیا۔ میرے خیال میں ابھی اس کی نظر میں میری اتنی وقعت نہیں تھی جتنی میں سمجھنے لگا تھا۔ تاہم میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ میرے حق میں یہ اچھا ہی تھا۔

پانچویں دن جب سورج ڈھل رہا تھا اور میں میدان میں بیک وقت دو گھوڑوں کو سدھا رہا تھا تو ایک شخص حویلی کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ گویا ابھی اندھیرا گہرا نہیں ہوا تھا لیکن میرے اندر شام اُتر آئی تھی۔ ایک اداس شام.... نہ جانے کیوں اچانک ہی میں

اپنے آپ کو بے حد تنہا' بے حد افسردہ محسوس کرنے لگا تھا۔

وہ شخص قریب آکر بولا "خان صاحب! آپ کو رئیسانی جی نے یاد کیا ہے۔"

ایک لمحے کے لیے میرے اندر پھیلے ہوئے سناٹے میں نقرئی سی گھنٹیاں بجیں۔ پھر میں نے اپنا جائزہ لیا تو یہ گھنٹیاں خاموش ہوگئیں۔ میرے پاؤں مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے' جسم پسینے میں تر تھا اس لیے کپڑے کہیں کہیں جسم سے چپکے ہوئے تھے اور اگر میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ سکتا تو یقیناً اس پر گرد کی تہ کے ساتھ مشقت کی درماندگی ہی نظر آتی۔ بال بھی یقیناً بکھرے ہوئے ہی تھے۔

عجیب اتفاق تھا کہ مجھے ابھی تک زرتاج کے سامنے جانے کا جتنی مرتبہ بھی موقع ملا تھا' ایسے ہی حال میں ملا تھا۔ یہ کچھ بے ہودہ سا ہی اتفاق تھا۔ پھر میں نے اس تاسف کو خود ہی ذہن سے جھٹک دیا۔ بھلا مجھے کسی بہتر حال میں اس کے سامنے جانے کی ضرورت بھی کیا تھی؟

میں اس شخص کی رہنمائی میں حویلی میں پہنچا۔ اس بار زرتاج مجھے نچلی منزل پر ہی ملی۔ اصل نشست گاہ نچلی منزل پر ہی تھی۔ یہ پرانی طرز پر آراستہ وپیراستہ ایک طویل وعریض کمرا تھا۔ رومن تاریخ کے پس منظر میں بننے والی انگریزی فلموں میں اس قسم کی آرائش نظر آتی تھی۔

نوکر مجھے دروازے تک چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔ میں اپنے لتھڑے ہوئے پیروں کا خیال ذہن سے جھٹک نہ سکا اور چوکھٹ کے قریب پڑے ہوئے چھوٹے سے غالیچے پر ہی رک گیا۔ کمرے میں اتنا خوب صورت اور صاف ستھرا قالین بچھا ہوا تھا کہ اس پر گندے پاؤں رکھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

زرتاج شاید میری ہچکچاہٹ کی وجہ سمجھ گئی تھی۔ کمرے کے دوسرے سرے سے اس کی آواز سنائی دی۔ وہی آواز جسے سن کر سماعت میں پھول سے کھل جاتے تھے۔

"بلا جھجک چلے آؤ" وہ کہہ رہی تھی "میرے قالین میری زمین کی مٹی سے زیادہ قیمتی نہیں ہیں۔ یہاں میرے قریب آجاؤ۔ مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

تب میں آگے چلا گیا اور اس صوفے کے قریب پہنچ گیا جو اس کے دائیں ہاتھ پر رکھا تھا۔ اب میں نے سر اٹھا کر صحیح طور پر اس کی طرف دیکھا۔ میں اندیشہ محسوس کرنے لگا تھا کہ ہر وہ لمحہ میرے ذہن میں مقیّد ہوجائے گا جب بھی میں اس کی طرف دیکھوں گا۔ میں اپنے ذہن کے کشکول میں ایسی یادوں کے موتی جمع کرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ کھدر کے مردانہ شلوار قمیص میں تھی۔ لمبے ریشمی بالوں کو قابو میں رکھنے کے لیے ان کا جوڑا بنایا ہوا تھا۔ پیروں میں کینوس کے جوتے تھے۔ پندرہ دن جنگل میں رہنے سے اس کی رنگت کی چاندنی میں جو ہلکا سا سانولا پن آیا تھا اس کے اثرات ابھی باقی تھے اور اس خفیف سی تبدیلی نے اسے مزید دلکش بنا دیا تھا۔

وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو ہر روپ میں دلکش لگتی ہیں ا جن پر ہر چیز جچتی ہے۔ وہ نوجوان یا نوخیز نہیں تھی لیکن جب خاموش بیٹھی ہوتی تھی تو اس کی آنکھوں میں بچپن کی معصومیت ہلکورے لیتی نظر آتی تھی لیکن جونہی وہ بولنے کے لیے ہونٹ ہلاتی تھی' وہ معصومیت کہیں پس منظر میں چلی جاتی تھی اور وہ نمایاں سمجھدار' نہایت سنجیدہ نظر آنے لگتی تھی۔

"بیٹھ جاؤ افضل خان!" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

میں بیٹھ چکا تو اس نے خلیق میزبانوں کی طرح پوچھا "کیا کو پیو گے؟"

"میں تو صحرا کا اونٹ ہوں' جو ملے کھا پی لیتا ہوں اور نہ ملے کئی کئی دن کھائے پیے بغیر نکال لیتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

اس کے رسیلے ہونٹوں پر مدّھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ درحقیقت ہنسی تھی جس کا اس نے نہ جانے کیوں گلا گھونٹ دیا مگر اس کی چمک ایک لمحے کے لیے آنکھوں میں باقی رہ گئی تھی۔

وہ خوش دلی سے بولی "اب یہاں ایسی بھی کوئی آفت نہیں آ ہوئی ہے کہ کئی کئی دن کھائے پیے بغیر گزارنے پڑیں اور نہ ہی صحرا میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بلا تکلف بتاؤ۔"

میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا "پینے کے لیے کوئی ٹھنڈی سی چیز منگوا دیجیے۔ گلا خشک ہو رہا ہے۔"

میں اسے بتا نہیں سکا کہ یہ صرف مشقت اور دھوپ کی تمازت کا اثر نہیں تھا کہ گلا خشک ہو رہا تھا بلکہ یہ اس کی قربت کی حرارت کا بھی نتیجہ تھا۔

"تمہیں اور تو کچھ پینے پلانے کا شوق نہیں ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"اور کچھ....؟ کیا مطلب؟" میں بالکل انجان بن گیا۔

"یہی کوئی بیئر.... وسکی.... وائن وغیرہ...." اس نے پلک جھپکائے بغیر پوچھا۔

"یہ تو شاید آپ شرابوں کے نام لے رہی ہیں..." میں نے آنکھیں ذرا پھیلاتے ہوئے کہا "توبہ کریں جی.... میں تو سیدھا سادا' ان پڑھا سا.... غریب سا.... پینڈو آدمی ہوں۔ اس قسم کے مہنگے اور بے کار شوق پالنے کے بارے میں' میں نے کبھی نہیں سوچا۔"

"اچھا.... واقعی؟" وہ بدستور میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ برقرار تھی۔

"جی ہاں" میں نے مسکینی سے سر ہلایا۔ اس نے ایک طویل سانس لی' آواز دے کر ملازمہ کو بلایا اور کولڈ ڈرنکس وغیرہ منگوائیں۔

ٹھنڈے کا دور چل چکا تو وہ گویا کسی غیر اہم سے واقعے کا تذکرہ چھیڑتے ہوئے سرسری سے لہجے میں بولی "تمہیں معلوم ہی ہوگا.... بینک پر ڈاکا ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی؟"

"جی ہاں۔ پتا چلا تھا۔ لیکن ڈاکو بہت نقصان میں رہے" میں نے کہا۔

"میں بہت خوش قسمت ہوں" وہ مسرور انداز میں دھیرے سے ہنسی۔ "میرے علاقے میں بھی کبھار ہی کسی بڑی واردات کی کوشش ہوتی ہے اور اس کا انجام کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی اتفاق ایسا ہو جاتا ہے کہ واردات خود مجرموں پر اُلٹ جاتی ہے یا مجھے کسی ایسے ذریعے سے کوئی مدد میسّر آجاتی ہے جس کے بارے میں' میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ بہرحال میں نقصان سے بچ جاتی ہوں۔"

"شاید یہ آپ کی نیک نیتی کا ثمر ہے" میں نے کہا۔

"شاید...." اس نے مبہم سے لہجے میں کہا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے' ہاتھ گود میں رکھ کر وہ پُرخیال سے انداز میں ایک لمحے انہیں دیکھتی رہی پھر سر اٹھائے بغیر بولی "میں نے اُڑتی اُڑتی سی خبر سُنی ہے کہ ڈاکوؤں کی طرح وہ بھی کوئی ڈھاٹا پوش ہی تھا جس نے ڈاکوؤں کو گولیاں ماریں اور چھلاوے کی طرح غائب ہوگیا۔ صرف ایک بُڑھیا نے اس کی جھلک دیکھی تھی...." اس نے سر اٹھا کر ایک بار پھر میری آنکھوں میں جھانکا لیکن مزید کچھ نہیں بولی۔

"چلیں.... وہ جو کوئی بھی تھا' ہمارے حق میں تو اچھا ہی کر گیا" میں نے گویا اس پہلو کو غیر اہم سمجھتے ہوئے کہا۔

"کسی تعلق' کسی خاص جذبے یا کسی ذاتی غرض کے بغیر کون ایسا قدم اٹھا سکتا ہے؟ اس کے علاوہ اس کام کے لیے بڑے حوصلے کی بھی ضرورت تھی۔ یہ کسی عام آدمی کا کام نہیں ہو سکتا" وہ بدستور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ میں نے پلک نہیں جھپکائی۔

ایک لمحے بعد اس نے خود ہی نظر چُرالی اور ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولی "بینک کی یہ برانچ زیادہ تر میرے کیش پر ہی چل رہی ہے لیکن اس کے لٹنے سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ نقصان کا ذمے دار تو بینک ہی ہوتا لیکن ظاہر ہے' اس قسم کے واقعات کے اثرات اچھے نہیں ہوتے۔ ایک بار کوئی بھی واردات ہو جائے تو مجرموں کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں۔ ایک کے بعد ایک چیز کی باری آتی چلی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک بھی پہنچ سکتی ہے کہ گلی گلی گھر گھر ڈاکے پڑنے لگیں۔ میں اسی بات کی قائل ہوں کہ واردات کو کامیاب ہونے سے روکا جائے۔ بعد میں بیٹھ کر لکیر پیٹنے کا کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔ اس قسم کی وارداتوں سے لوگوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے.... اور یہ میں کسی قیمت پر نہیں چاہتی۔ اس لیے میں اس نامعلوم شخص کی بہت ممنون ہوں۔"

میں نے اپنے دل میں خوشی کی ایک دھیمی سی لہر ابھرتے محسوس کی۔ اچانک وہ ذرا بلند آواز میں بولی "میں دونوں ہی فریقوں کے بارے میں اُلجھن میں ہوں۔ اس شخص کے بارے میں تو خوشگوار حیرت اپنی جگہ ہے جس نے ڈاکوؤں کو مارا لیکن میں ڈاکوؤں کے بارے میں بھی پریشان ہوں کہ وہ کس گروہ کے تھے؟ کس علاقے کے تھے؟ اس قسم کی کوشش میرے لیے اور میرے اس گوشۂ عافیت کے لیے کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ڈاکوؤں کا تعلق کس گروہ سے ہو سکتا ہے؟"

"میں.... میں کیا کہہ سکتا ہوں...." میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "میں تو ابھی علاقے کے شرفا کو اچھی طرح نہیں جانتا' ڈاکوؤں کے گروہوں کے بارے میں مجھے کیا معلومات ہو سکتی ہیں؟"

درحقیقت میں یہ کہتے کہتے رہ گیا تھا کہ جانو کے علاوہ بھلا وہ کس کے آدمی ہو سکتے تھے لیکن فوراً ہی میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ابھی ان معاملات میں میرا اظہارِ خیال مناسب نہیں تھا۔ پہلے مجھے وہ سب کچھ سُن لینا چاہیے تھا جو زرتاج کہنا چاہتی تھی۔

وہ ایک بار پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے روشن انداز میں مسکرائی اور شگفتہ لہجے میں بولی "کچھ زیادہ ہی محتاط بن رہے ہو۔ بالکل ڈپلومیٹ معلوم ہو رہے ہو۔"

میں نے ایک بار پھر مسکراہٹ کی آڑ میں پناہ لی "میں تو ایک معمولی سا آدمی.... ایک غیر اہم سا کارندہ ہوں رئیسانی جی! میں اس قسم کے معاملات میں کیا رائے ظاہر کر سکتا ہوں؟"

اس بار وہ کھل کر ہنسی۔ میں نے پہلی بار اسے قہقہہ لگاتے سُنا۔ کمرا گویا عجیب برقی سی لہروں سے بھر گیا۔ یہ کسی بے عنوان مسرت کی لہریں تھیں۔ مسرت کی شعاعوں کی طرح میرے وجود میں بھی جذب ہونے لگیں۔

"ہاں...." وہ سر ہلاتے ہوئے بولی "مجھے کچھ کچھ اندازہ ہوتا جا رہا ہے کہ تم کتنے معمولی اور کتنے غیر اہم آدمی ہو.... اور ہاں.... اگر تم دوسروں کی طرح مجھے رئیسانی جی نہ کہا کرو تو مجھے خوشی ہوگی۔ تم مجھے صرف زرتاج کہہ سکتے ہو۔"

"لیکن یہ اچھا معلوم نہیں ہوگا" میں نے کہا۔

"اگر یہ مجھے اچھا معلوم ہوگا تو پھر یہاں اور کون ایسا موجود ہے جسے بُرا محسوس ہوگا؟" اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ وہ آزاد اور خود مختار تھی' کون اس کے معاملات میں دخل دے سکتا تھا؟

اچانک وہ اصل موضوع کی طرف پلٹتے ہوئے بولی "کیا یہ بات کچھ عجیب نہیں کہ ڈکیتی کی اس ناکام کوشش کے دوسرے ہی دن جانو اپنے چار آدمیوں کے ساتھ بہت غصے میں یہاں آیا تھا لیکن میں یہاں موجود نہیں تھی۔ وہ رب نواز سے کوئی خاص بات کیے بغیر محض دو چار پھنکاریں مار کر چلا گیا۔ کل رات وہ اپنے چھ

ساتھیوں کے ہمراہ ایک بار پھر آیا....."

میں چونکا۔ مجھے اس کی آمد کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ میں نے اضطراری انداز میں اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا "آپ سے ملاقات ہوئی؟"

"ظاہر ہے" وہ بولی "اور یہ ملاقات مجھے کسی طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہوتی ہے۔ میں نے جانو کو کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا۔ اس بار تو وہ جیسے کچھ کرنے کا ارادہ لے کر آئے تھے لیکن شاید کسی مصلحت کے تحت واپس چلے گئے۔ وہ جیپوں میں آئے تھے۔ بہت سی کلاشنکوفیں ان کے پاس تھیں۔ جیپوں میں شاید گرنیڈ وغیرہ بھی موجود تھے..... اور یہ صرف نمونہ تھا۔ وہ مجھے صرف ٹریلر دکھانے اور بتانے آئے تھے کہ اصل فلم کسی وقت بھی چل سکتی ہے۔"

"تو کیا اس نے تسلیم کرلیا کہ بینک پر ڈاکا ڈالنے والے اسی کے آدمی تھے؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"نہیں۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اب اس بات کے اعتراف کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے غیظ و غضب کی ایک اور وجہ بھی تھی....." اس نے پُرخیال انداز میں ہاتھ مسلے۔ اس کے ہاتھوں کو دیکھ کر بیک وقت گداز کا بھی احساس ہوتا تھا اور مضبوطی کا بھی۔

"کیسی وجہ؟" میں نے اپنے اضطراب کو دباتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا ایک نہایت قریبی ساتھی تھا نا..... غیسو خان..... اسے تم جانو کا دایاں ہاتھ کہہ لو..... نائب کہہ لو..... نمبر ٹو کہہ لو..... تم نے اسے دیکھا ہی تھا۔ پچھلی مرتبہ تمہاری موجودگی میں جب جانو مجھ سے ملنے آیا تھا تو تم چھپ کر انہیں دیکھ ہی رہے تھے۔ وہ جو شکل سے ہی انتہائی خبیث اور خطرناک لگ رہا تھا..... وہ غیسو خان تھا....."

"ہاں۔ مجھے یاد ہے" میں نے سرہلایا۔ مجھے اُلجھن ہو رہی تھی کہ وہ بہت رُک رُک کر، ٹھہر ٹھہر کر بات کر رہی تھی لیکن میں اپنی بے چینی اور اضطراب کو چھپائے ہوئے تھا۔

"جانو بتا رہا تھا کہ غیسو خان خاصی بڑی رقم سمیت پُراسرار انداز میں غائب ہوگیا ہے" زرتاج گہری سانس لے کر بولی "آخری بار اسے غیر واضح سے حُلیے والے ایک شخص کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ ایسا حُلیہ جو نہ جانے کتنے لوگوں پر فٹ آسکتا ہے۔ کچھ دنوں کی بڑھی ہوئی داڑھی مونچھیں..... سر پر اجرک کی پگڑی..... آنکھوں پر سیاہ چشمہ..... یہ حُلیہ تو کسی بھی شخص کا ہو سکتا ہے۔ دو ایک نشانیاں ہیں جنہیں کسی حد تک امتیازی سمجھا جاسکتا ہے لیکن ان سے بھی کوئی خاص مدد نہیں مل سکتی۔ ایک تو یہ کہ اس شخص کی رنگت سرخ و سپید تھی، دوسرے اس کا قد کاٹھ غیر معمولی تھا....."

اس نے ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر گہری نظر سے میرا جائزہ لیا۔ میں کسی مجرم کی طرح ساکت بیٹھا رہا۔ اگر میں اس وقت زرتاج کی توجہ اپنی طرف سے ہٹانے کی کوشش کرتا تو شاید اپنے آپ کو اور بھی زیادہ مشکوک بنا لیتا۔

وہ گویا کسی خیال کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے مسکرائی اور بے پروائی سے بولی "ان دو نشانیوں کی بنیاد پر بھی کسی پر انگلی نہیں رکھی جاسکتی..... اور میرے خیال میں یہ بھی ایک اچھی ہی بات ہے۔ بہرحال جانو نے جو "تفتیش" کی ہے اس کی بنیاد پر اس کا دعوا ہے کہ اس حُلیے کا کوئی آدمی زمینوں پر..... فارم پر یا کسی اور جگہ..... یہیں کہیں، آس پاس ہی موجود ہے اور مجھے اس کے بارے میں معلوم ہے لیکن میں چھپا رہی ہوں۔ بلکہ میں نے بتا دیا ہے کہ میں نے اس شخص کو پناہ دے رکھی ہے۔"

"پھر آپ نے کیا جواب دیا؟"

"ظاہر ہے میں نے اس سے انکار کیا۔ حقیقت یہی ہے کہ میں ایسے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں جس نے غیسو کو غائب کردیا ہے لیکن وہ بدستور آگ بگولا رہا۔ اس دوران میں نے بڑے تحمل سے بات کرتے ہوئے اسے کُریدنے کی کوشش کی کہ بینک پر ڈاکا ڈالنے کے لیے آنے والے اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے والے ڈاکو کون ہوسکتے ہیں؟ اس سلسلے میں وہ کوئی جواب دینے کے بجائے مزید برہم ہوگیا جیسے میں نے اس کا کوئی زخم چھیڑ دیا ہو۔ اس نے بڑی لمبی چوڑی باتیں کیں۔ میں انہیں دُہرا نہیں سکتی۔"

"شاید آپ مجھے بتانا مناسب نہیں سمجھتیں؟" میں نے آہستگی سے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے۔ اگر میں تم سے بات کرنا ٹھیک نہ سمجھتی تو ان میں سے کوئی بھی بات نہ کرتی جو میں نے اب تک کی ہیں۔ اس طرح تمہیں اپنے پاس بلا کر ہی نہ بٹھاتی۔ اسی لیے تو میں نے تمہیں سب سے آخر میں اطمینان سے بلایا ہے کہ مجھے تم سے ساری ہی ضروری باتیں کرنا تھیں" وہ تیزی سے بولی "جانو کی باتوں کی تفصیل میں اس لیے نہیں دُہرا رہی کہ وہ محض ایک جاہل آدمی کی خرافات کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ مختصراً تمہیں بتا دیتی ہوں۔ میرے بارے میں عزائم تو ایک عرصے سے اس کے دل میں پل رہے ہیں، یہ تو تمہیں معلوم ہو ہی چکا ہے۔ اب اس آتش فشاں کو پھٹ پڑنے کے بہانے میسّر آرہے ہیں۔ جلد یا بدیر ایک نہ ایک دن بہرحال یہی کچھ ہونا تھا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے مشورہ دیا کہ مجھے اپنی اوقات میں رہنا چاہیے، اس سے بنا کر رکھنی چاہیے، اپنی جوانی کو یوں فضولیات میں نہیں گنوانا چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ....."

اس نے اپنی قمیص کا دامن اپنے گھٹنوں پر پھیلایا اور نظر جھکاتے ہوئے استہزائیہ سے انداز میں بولی "ایک تو اس بے چارے کو میری جوانی کی بہت فکر لاحق رہتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ دنیا میں وہی ایک خوبرو، جواں مرد اور طاقتور انسان ہے جس کی نوازشات کی بدولت میری جوانی گل و گلزار ہوسکتی ہے..... گدھا کہیں کا!"

مجھے زرتاج کا جواب سن کر خوشی بھی ہوئی لیکن جانو کی باتوں

کا تصور کرکے میری کنپٹیاں تپنے لگیں تاہم میں نے اپنا لہجہ حتی الامکان ہموار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا "کیا دھمکیاں دے رہا تھا وہ؟"

"یہی کہ وہ جب چاہے زرتاج نگر کو خاکستر کرسکتا ہے، حویلی کو زمیں بوس کرسکتا ہے اور مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے لے جاسکتا ہے۔ یہ اس کی مہربانی ہے کہ میرا یہ مختصر سا علاقہ گوشۂ عافیت بنا ہوا ہے ورنہ یہاں بھی بہت سے دوسرے علاقوں کی طرح یہی عالم ہوتا کہ لوگ اپنے گھر بار اور مویشی تک چھوڑ کر ہجرت کرجاتے۔ اسی قسم کی نہ جانے کتنی باتیں جو وہ اس سے پہلے ذرا نرم لہجے میں، ذرا ملائم الفاظ میں کرتا آرہا تھا، اس بار اس نے سخت اور صاف لہجے میں کیں۔ اس نے اب کرخت اور دوٹوک الفاظ میں اپنے عزائم کا اظہار کردیا ہے۔"

"کیا آپ کے خیال میں وہ اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانے کی طاقت رکھتا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

اس نے ایک لمحے سوچا پھر اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولی "ہاں۔ کافی حد تک۔"

"آپ اس کی حقیقت جانتے ہوئے بھی اس کے خلاف پولیس کی مدد حاصل نہیں کرسکتیں؟" اس سوال کی گہرائی میں میری حیرت بھی پنہاں تھی۔

"ان علاقوں کی پولیس تو ان کے سامنے جانے کے تصور سے بھی تھر تھر کانپتی ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"علاقے کے دوسرے زمینداروں کے ساتھ مل کر جانو کا کچھ بندوبست نہیں کیا جاسکتا؟" میں نے اپنی کنپٹیوں میں تپش محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"بہت سے بڑے زمیندار خود بڑے بڑے ڈاکوؤں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ اپنی دانست میں وہ اپنی طاقت اور دولت بڑھا رہے ہیں لیکن انہیں معلوم نہیں کہ وہ اپنی آنے والی نسلوں کے لیے ایک جہنم تیار کررہے ہیں جس میں خود ان کے اپنے بچے بھی ایک نہ ایک دن جلیں گے۔ بڑے زمیندار اور بڑے ڈاکو، دونوں طبقے ایک دوسرے کی ملی بھگت سے بڑے بڑے دھندے کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے باڈی گارڈ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔"

اس کے چاند چہرے کو کرب نے گہنا دیا۔ افسردہ سے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے وہ بولی "ڈاکو آئے دن جن شریف اور دولت مند شہریوں یا دیہاتیوں کو اغوا کرکے جو بڑی بڑی رقمیں تاوان کے طور پر وصول کرتے ہیں، ان زمینداروں سمیت ان میں نہ جانے کتنے طبقوں کا حصہ ہوتا ہے۔ اسلحے اور منشیات کی تجارت ہے..... اور نہ جانے کیا کچھ ہے۔ شہروں میں رہنے والے اپنے لانے روتے رہتے ہیں۔ انہیں کچھ اندازہ نہیں کہ ان علاقوں میں لاقانونیت کا کیسا بازار گرم ہے۔ حالات کے تیور دیکھ کر مجھے لگتا ہے، اگر ان چیزوں کی طرف سنجیدگی اور خلوص سے توجہ نہ دی گئی اور سب اپنی اپنی ہی لوٹ مار میں لگے رہے تو ایک عجیب سا غدر برپا ہوجائے گا۔ جنگلوں میں آگ پھیلے گی تو شہر کی بلند و بالا عمارتوں تک بھی جائے گی مگر مجھے لگتا ہے کہ کسی کو ہم جیسوں کی بات سننے کی فرصت نہیں ہے۔"

"شہر ہوں یا دیہات..... بات تو ایک ہی ملک کی ہے۔ ہم سب ایک ان دیکھی سی ڈور میں بندھے ہیں۔ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ کوئی بھی کڑی کمزور ہوگی، نقصان باقی کڑیوں کو بھی پہنچے گا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا، یہ باتیں ہم کس کو جاکر سمجھائیں۔ نہ عوام سننے کو تیار ہیں اور نہ ہی خواص۔ سب اپنے اپنے گلے شکوؤں، لڑائی جھگڑوں، چھینا جھپٹی اور کھینچا تانی میں لگے ہوئے ہیں۔ معقولیت کی بات پر تو کوئی کان ہی نہیں دھرتا" وہ مایوسی سے بولی "تمہیں شاید یقین نہ آئے، ڈاکوؤں اور مختلف قسم کے گروہ بازوں کے حوصلے یہاں تک بڑھ چکے ہیں اور وہ اتنے منظم ہوچکے ہیں کہ اغوا کے سلسلے میں تاوان بینک ڈرافٹ تک کی صورت میں وصول کیے جانے لگے ہیں۔ دھاندلی اور لاقانونیت نہ جانے کہاں تک جائے گی۔ ڈاکو، زمینداروں کے ساتھ مل کر اپنی دولت کو "وہائٹ" کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ دولت مختلف جائز کاروباروں میں انویسٹ کی جارہی ہے۔ شہروں اور قصبوں میں جائیدادیں بن رہی ہیں، عمارتیں تعمیر ہورہی ہیں، پیٹرول پمپ کھل رہے ہیں، پلازا بن رہے ہیں۔"

"چلیں..... ترقی تو ہو رہی ہے" میں نے مسکراتے ہوئے اس کے تفکرات کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کی۔

"یہ وہ ترقی ہے جو رفتہ رفتہ ہمارے معاشرے اور اس کی تمام اچھی قدروں کو کھا جائے گی۔" وہ بدستور افسردگی سے بولی "موت مار، افراتفری، پیسے کے لیے ایک دوسرے کی گردن کاٹنا ہمارا کلچر بن جائے گا۔"

"یعنی آپ کے خیال میں صورت حال بہت مایوس کن ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔ کسی کے تصور سے بھی زیادہ۔ لیکن عوام اور خواص سب نے اس طرف سے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں۔ کوئی اپنی روش ترک کرنے پر آمادہ نہیں" وہ بولی "لیکن کیا تم بھی مایوس ہو؟"

"میں مایوس نہیں ہوں۔ میرے سینے میں کوئی آگ بھڑک رہی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ اضطراب کی یہ آگ مجھے جلا کر راکھ کردے گی" میں نے کہا۔

"مایوسی کی موت مرنے سے تو بہتر ہی ہے کہ انسان اپنے ہی اضطراب کی آگ میں پروانے کی طرح جل مرے۔ یہ موت خواہ آج بے مقصد نظر آئے لیکن آنے والے کسی دور میں ضرور اس کے اثرات مرتب ہوں گے" وہ یقین سے بولی۔

"کیا حالات اتنے ہی خراب ہیں جو آپ اتنی مایوسی کی باتیں کر رہی ہیں؟" میں نے جاننا چاہا۔

"میں فضا میں طوفان کی بُو سونگھ رہی ہوں۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے" اس نے گویا مجھے جھوٹی امید دلانا بہتر نہ سمجھا "جانو سے اپنی گفتگو کا کلا مکس تو میں نے تمہیں سنایا ہی نہیں۔ اس نے فوری طور پر مجھ سے پچاس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تھا۔"

"وہ کس لیے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ لوگ اب اس منزل پر پہنچ چکے ہیں کہ ان کے لیے کسی بھی مطالبے کی کوئی وجہ بتانا ضروری نہیں رہا" اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا اور بولی "جانو نے مجھے جو مہلت دی تھی اسے بھی ختم ہوئے بارہ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ مجھے پچاس لاکھ روپیہ اس کے ایک ٹھکانے پر پہنچانا تھا لیکن میں نے نہیں پہنچایا۔"

وہ گہری سانس لے کر اٹھی اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ پردہ ذرا سا سرکا کر وہ باہر دیکھنے لگی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ دھیمے لہجے میں بولی "یہ بھی گویا ایک طرح کا تاوان تھا۔ کچھ ایسے نقصانات کا معاوضہ جن کا ذمے دار وہ مجھے سمجھ رہا تھا لیکن زبان سے ان کا ذکر بھی نہیں کر رہا تھا۔ بات رقم کی نہیں ہے' میں چاہوں تو پچاس لاکھ اسے دے بھی سکتی ہوں.... اور ایک بار میں نے ایسا سوچا بھی تھا لیکن پھر میں نے فوراً ہی اپنے اس خیال کو رد کر دیا۔ اسے ایک بار رقم دے دینا مسئلے کا حل نہیں تھا۔ یہ تو ایک طرح سے صرف پہلی قسط ہوتی۔ اس کے بعد تو مطالبے پر مطالبہ چلا آتا۔ حرام خوروں میں ایک یہ بھی بڑی منحوس عادت ہوتی ہے کہ کوئی ایک بار ان کا مطالبہ پورا کر دے تو وہ اسے سونے کا انڈا دینے والی مرغی سمجھ لیتے ہیں اور کبھی کبھار تو مرغی کو ہی ذبح کرنے پر تل جاتے ہیں.... اور پھر یہ تو صرف رقم کا مطالبہ تھا' یہ پورا ہو جاتا تو شاید کل کو مجھے اس کے کسی اور مطالبے کے سامنے بھی جھکنا پڑتا۔ ویسے بھی میں عورت سہی.... لیکن میری غیرت یہ قبول نہیں کرتی کہ میں کسی کی خراج گزار بنوں۔"

اس کے لہجے میں بے پناہ مضبوطی تھی۔ اس نے مُڑ کر میری طرف دیکھا اور اس لمحے وہ مجھے بہت بلند قامت نظر آئی۔ کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایستادہ کسی پُرشکوہ اور عظیم الشان مجسمے کی طرح۔

"کیا میں نے غلط کیا؟" اس کی آواز مجھے سرگوشی سے مشابہ محسوس ہوئی۔

"ہرگز نہیں" میں نے بھی اسی جیسے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

یک دم اسے گویا بے پناہ طمانیت حاصل ہو گئی۔ گہری سانس لے کر وہ آسودہ سے لہجے میں بولی "اس وقت مجھے ایک ایسی ہی ٹھوس "نہیں" کی ضرورت تھی۔"

اس کے ہونٹوں پر وہ دلکش مسکراہٹ لوٹ آئی جو دیکھنے والوں کو یقیناً اپنا دیوانہ بنا لیتی ہوگی.... میں نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا "آپ نے جانو کا مطالبہ پورا نہیں کیا.... بارہ گھنٹے گزر چکے ہیں.... کیا اس کا کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا؟"

"ممکن ہے ردِعمل ذرا ٹھہر کر سامنے آئے لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ اس بار جو کچھ بھی ہوگا' بہت شدید ہوگا۔ میں اپنے آپ کو بہت تنہا تنہا سا محسوس کر رہی تھی اسی لیے میں نے خاص طور پر تمہیں بُلوایا ہے۔ یہ ایک ایسا احساس تنہائی تھا جو شاید دس بیس کلاشنکوف برداروں کو بُلا کر اپنے اردگرد کھڑا لینے سے بھی دور نہ ہوتا۔ کبھی کبھی میں محسوس کرتی ہوں کہ محض کلاشنکوفیں کسی کی حفاظت نہیں کر سکتیں۔"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے" میں نے کسی وضاحت کے بغیر کہا "اور آپ نے ایک بے عنوان احساس تنہائی کے لمحوں میں مجھے بُلایا.... یہ میرے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں۔ آپ ہرگز پریشان نہ ہوں۔ جانو اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے کہ آپ جیسے وسائل اور آپ جیسا بے داغ کردار رکھنے والی لڑکی اس کی طرف سے پریشان ہو۔ اس کا جو بھی ردِعمل ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں ایک حقیر سا آدمی ہوں لیکن جس قابل بھی ہوں' اپنی جان کے نذرانے کے ساتھ حاضر ہوں۔"

وہ ایک لمحے کے لیے گویا کھو سی گئی۔ ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہی پھر یک دم گویا کسی اور ہی دنیا سے واپس آتے ہوئے خوش گوار لہجے میں بولی "اب میں تمہیں ایک اور مزے کی بات بتاتی ہوں۔ دو دن پہلے یہاں حاصل آباد کا ایک پولیس انسپکٹر بھی آیا تھا۔ اس کا نام رحیم گل تھا۔"

اس نے خاموش ہو کر گویا میرے ردِعمل کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا لیکن میں نے بہ مشکل اپنے آپ کو کوئی ردِعمل ظاہر کرنے سے باز رکھا تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "مجھے یہ بات کچھ عجیب سی لگی کہ رحیم گل کو بھی غیر واضح سے حُلیے والے اس شخص کی تلاش تھی جس کا میں ذکر کر چکی ہوں۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ شخص ایک زبردست ڈاکے.... ایک کنڈکٹر اور کئی مسافروں کے قتل کے علاوہ ایک ہیڈ کانسٹیبل پر قاتلانہ حملے کا مجرم ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل خوش قسمتی سے جان بر ہو گیا ورنہ اس کے ہلاک ہونے میں بھی کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی...."

میں نے یہ سُن کر ذرا غیر محسوس طور پر اطمینان کی سانس لی کہ جس ہیڈ کانسٹیبل پر میں نے اضطراری انداز میں گولی چلائی تھی وہ بچ گیا تھا۔ درحقیقت وہی میرا واحد جرم تھا اور وہ بھی میرے نقطۂ نظر سے جرم نہیں' اپنے دفاع کی ایک کوشش تھی۔ اگر میں نے اضطراری انداز میں گولی نہ چلائی ہوتی تو وہ ہیڈ کانسٹیبل یقیناً مجھے گولی مار دیتا۔ جبکہ میں مجرم نہیں تھا۔ لیکن اخبار میں یہی خبر آتی "خطرناک ڈاکو پولیس مقابلے میں ہلاک...."

زرتاج کہہ رہی تھی "رحیم گل جائے واردات سے ہی اس نوجوان کے تعاقب میں تھا۔ جائے واردات سے میلوں دور رحیم گل کا اس نوجوان سے سامنا ہوا۔ اس وقت وہ ڈاکو بس والے حُلیے میں ہی تھا۔ اس نے ہیڈ کانسٹیبل کو گولی ماری اور ایک بار پھر بھاگ نکلا۔ رحیم گل نے جوں توں زخمی ہیڈ کانسٹیبل کو ایک اسپتال پہنچایا اور ڈاکو کا سراغ کھو دیا لیکن اس نے دوبارہ اندازاً اس کا تعاقب کرنے کی کوشش کی...."

میں بڑی توجہ سے رحیم گل کی سرگزشت زرتاج کی زبانی سن رہا تھا۔ اس نے بدستور میری طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی "رحیم گل کو امکان نظر آیا کہ شاید اس ڈاکو نے یہاں.... زرتاج نگر میں پناہ حاصل کر لی ہو۔ رحیم گل ادھر اُدھر پھرتا رہا اور پھر اس کا اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ اسے زرتاج نگر کے نواح میں ویسے ہی غیر واضح سے حُلیے میں وہ ڈاکو دکھائی دیا جیسے حُلیے میں وہ شخص تھا جس کے ساتھ نمیسو خان کو آخری مرتبہ دیکھا گیا تھا لیکن اس مرتبہ رحیم گل کا اس سے سامنا نہایت عجیب حالات میں ہوا۔ رحیم گل کچھ ڈاکوؤں کے غیظ و غضب کا نشانہ بن کر زخمی حالت میں جوہڑ کے کنارے ویرانے میں پڑا تھا اور موت کا منتظر تھا جب وہی ڈاکو وہاں آن پہنچا اور اس بار اس نے رحیم گل کی جان بچائی...."

میں دم بخود بیٹھا تھا۔ زرتاج نے ایک بار پھر گویا نظروں ہی نظروں میں مجھے ٹٹولنے کی کوشش کی۔ میں نے پوری پوری کوشش کی کہ میرے چہرے سے فطری سی دلچسپی کے علاوہ کسی تاثر کا اظہار نہ ہونے پائے۔

زرتاج سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی "کافی دیر تک رحیم گل نے اسے نہیں پہچانا لیکن جب وہ رخصت ہونے لگا تب اس نے پہچان لیا لیکن ظاہر ہے اس وقت رحیم گل اس حالت میں نہیں تھا کہ اسے گرفتار کر سکتا۔ گرفتار کرنا تو دور کی بات ہے' وہ اس سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکا۔ وہاں سے اس کے لیے حیرت کا بھی ایک نیا باب کھل گیا۔ اس سے پہلے معاملہ حل نہیں ہو رہا تھا کہ ایک بار سامنا ہوا تو اس ڈاکو نے اپنے ساتھی ہیڈ کانسٹیبل پر گولی چلا دی اور دوسری بار سامنا ہوا تو اس نے نہایت بے بسی کے عالم میں پڑے ہوئے انسپکٹر کو موت کے منہ سے نکالا...."

اب میں اسے کیا بتاتا کہ اس میں مُعمے والی کوئی بات نہیں تھی۔ پہلی بار اس "ڈاکو" کو اس لیے گولی چلانا پڑی تھی کہ اسے اپنی جان بچانی تھی اور دوسری بار اس نے اس لیے رحیم گل کی جان بچائی تھی کہ رحیم گل اس کی جان لینے یا اسے گرفتار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور اس نے اس لیے بھی رحیم گل کی مدد کی تھی کہ وہ درحقیقت ڈاکو نہیں تھا' اس کی رحیم گل سے کوئی دشمنی نہیں تھی بلکہ وہ تو رحیم گل کے مثالی کردار کے بارے میں سُن سُن کر غائبانہ طور پر اس کا قدردان بن چکا تھا مگر فی الحال میں یہ باتیں نہ تو زرتاج کو بتا سکتا تھا اور نہ ہی رحیم گل کو۔ میں دم بخود بیٹھا تھا۔ میرے لیے یہ انکشاف بڑی حیرت کا باعث تھا کہ رحیم گل نے بالآخر اس وقت مجھے پہچان لیا تھا جب میں نے اسے بیل گاڑی میں لٹایا تھا۔

زرتاج بولی "لیکن اس خوشگوار حیرت کے باوجود انسپکٹر رحیم گل کے عزائم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اس مُعمے کو بھی حل کرنا چاہتا ہے لیکن ہر حال میں اس ڈاکو کو بھی گرفتار کرنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال بھی یہی تھا کہ وہ یہیں کہیں آس پاس پناہ گزیں ہے۔ وہ اسے تلاش کرنا چاہتا تھا۔ زمینوں' حویلی اور فارم وغیرہ پر کام کرنے والے تمام لوگوں کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ گویا ایک غیر رسمی شناختی پریڈ کرانا چاہتا تھا۔"

"پھر آپ نے کیا جواب دیا؟" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"میں نے اسے اس کی اجازت نہیں دی" زرتاج نے اطمینان سے جواب دیا "پہلے میں نے اسے نرمی سے یہی سمجھایا کہ یہ علاقہ اس کی عملداری میں نہیں ہے اور اس کے پاس تلاشی کا وارنٹ بھی نہیں ہے۔ جواباً اس نے مجھے قانونی دفعات کے ساتھ سمجھایا کہ بعض مخصوص حالات کے تحت کوئی بھی علاقہ کسی بھی علاقے کی پولیس کی عملداری میں آجاتا ہے اور وہاں اگر وہ خود نہیں تو اس علاقے کی پولیس کے تعاون سے کسی بھی جرم کی تفتیش کے سلسلے میں کارروائی کر سکتا ہے۔ وارنٹ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے' وہ ایک آدھ دن میں کوئی بھی وارنٹ لے کر آسکتا ہے لیکن اسے اندیشہ ہے کہ اس دوران اس کا مطلوبہ آدمی غائب کر دیا جائے گا۔ مختصراً یہ کہ آخر میں مجھے اس کے ساتھ سخت رویّہ اختیار کرنا پڑا۔ وہ ذرا مختلف قسم کا پولیس والا ہے۔"

"اس کے باوجود آپ کہتی ہیں کہ پولیس' ڈاکوؤں کے سامنے جاتے ہوئے تھر تھر کانپتی ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"رحیم گل نے اس علاقے میں زیادہ عرصہ نہیں گزارا ہے۔ اس کے تجربات محدود ہیں۔ اس کی سروس بھی زیادہ پرانی نہیں۔ نو آموز آفیسر ہے۔ ابھی اسے ڈاکوؤں کے مضبوط گروہوں سے واسطہ نہیں پڑا اور شاید اسے خود بھی حالات کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہے۔ اس کے آفیسر اور ماتحت دونوں ہی شاید اس سے تنگ ہوں اس لیے اسے موقع دے رکھا ہو کہ وہ منہ اٹھائے اِدھر اُدھر پھرتا رہے اور یونہی کسی روز کام آجائے۔ اگر اس کی زندگی کچھ لمبی ہوئی تو کچھ عرصے میں یقیناً بہت کچھ سمجھ جائے گا۔ اس کے بعد شاید وہ بھی اپنے محکمے کے دوسرے بہت سے لوگوں جیسا ہو جائے۔"

"بہرحال.... آپ نے اسے واپس بھیج دیا؟" میں نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ چلا گیا لیکن ظاہر ہے کافی ناخوش تھا" زرتاج نے جواب دیا۔

"اس ایک نامعلوم شخص... اس غیر واضح حُلیے والے نوجوان کی وجہ سے آپ کے لیے کچھ زیادہ ہی مشکلیں کھڑی نہیں ہو رہیں؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"وہ مشکلیں جن کا سبب جانو ہے' وہ تو مجھ پر ہر حال میں پڑنی ہی تھیں۔ یہ تلوار تو بہت عرصے سے میرے سر پر لٹک رہی تھی۔ سمجھوتا مجھے نہ پہلے کرنا تھا اور نہ ہی اب کرنا ہے۔ چنانچہ میں اس معاملے کو ذرا مختلف زاویے سے دیکھ رہی ہوں۔ شاید قدرت نے اس نامعلوم شخص کو میرا بوجھ کم کرنے اور میرے شانہ بہ شانہ کھڑا ہونے کے لیے بھیجا ہو۔ شاید اس کے بارے میں جو باتیں مجھ تک پہنچ رہی ہیں' اس کی اصلیت ان سے بہت مختلف ہو' اصل بات کچھ اور ہی ہو۔"

وہ بیٹھ چکی تھی اور بظاہر پُرسکون تھی لیکن اس کے اندر یقیناً اضطراب موجزن تھا اس لیے وہ ایک بار پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور کمر پر ہاتھ باندھ کر ٹہلنے لگی۔

ایک لمحے کی بوجھل خاموشی کے بعد وہ بولی "لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ نامعلوم شخص... وہ غیر واضح حُلیے والا نوجوان آکر مجھ سے مل ہی نہیں رہا' مجھے ساری حقیقت بتا ہی نہیں رہا۔ میں صرف موہوم سے اندازوں کی بنیاد پر مہلک خطرات مول لیے جا رہی ہوں لیکن میں کب تک ایسا کر سکتی ہوں؟ مبہم چیزوں کے لیے انسان کب تک جوجھ سکتا ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں نئے سرے سے غور کرنے اور اپنے لیے کوئی محفوظ راستہ تلاش کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔"

چند لمحے کمرے میں بوجھل سکوت طاری رہا۔ وہ بدستور ٹہل رہی تھی لیکن میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ میرے ذہن میں تلاطم سا برپا تھا۔ بالآخر میں نے گہری سانس لی۔ میرے خیال میں اب وقت آگیا تھا کہ میں اسے اپنے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا دیتا۔ یہ ہم دونوں ہی کے حق میں بہتر تھا۔

"آپ بیٹھ جائیے..." میں نے نیچی آواز میں کہا "بات شاید ذرا لمبی ہو جائے... لیکن میں آپ کو اپنے بارے میں تقریباً سب کچھ بتا ہی دیتا ہوں۔"

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا' مسکرائی اور اپنی شاہانہ سی کرسی پر شاہانہ سے انداز میں آن بیٹھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے دوبارہ سر اٹھایا۔ وہ ایک ٹک میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے کہا "میرے خیال میں یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں رہی کہ وہ نامعلوم شخص جس کی بیک وقت پولیس اور ڈاکوؤں کے سردار' دونوں کو تلاش ہے' وہ میں ہی ہوں۔"

"میں سمجھ تو چکی تھی لیکن میں تمہارے منہ سے سننا چاہتی تھی" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی "میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر تم کب تک اس حقیقت کو پوشیدہ رکھو گے۔"

"میں شاید اب بھی اپنے منہ سے اس کا اعتراف نہ کرتا کیونکہ اب میں یہاں سے جا ہی رہا تھا۔ میں آج کل میں یہاں سے جانے کے لیے آپ سے اجازت طلب کرنے ہی والا تھا۔"

اس کے ماہ تاب چہرے پر ایک رنگ بدلی کی طرح آکر گزر گیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "لیکن اب میں نے آپ کی باتیں سنیں... کچھ میری معلومات میں اضافہ ہوا اور میں نے سوچا کہ آپ کو الجھن میں چھوڑ کر جانا مناسب نہیں۔ آپ کو یہ تو یقین ہے نا کہ میں مجرم نہیں ہوں؟"

"اگر مجھے یقین نہ ہوتا تو میں تمہیں کبھی اس حد تک تحفظ نہ دیتی۔ یہ یقین تو مجھے پہلی بار تمہاری صورت دیکھتے ہی ہو گیا تھا۔ پہلی نظر میں ہی تم پر بھروسا کرنے کو جی چاہنے لگا تھا" وہ بلا تامل بولی۔

"بہت شکریہ۔ یہ میرے لیے ایک اعزاز ہے" میں نے حقیقی ممنونیت سے کہا۔

"میرے دل نے کہا تھا کہ اگر میں تمہارے ساتھ کوئی بھلائی کروں گی تو تم اس کا صلہ مجھے برائی کی صورت میں ہرگز نہیں دو گے" وہ وثوق سے بولی۔

"آپ کی مردم شناسی پر مجھے حیرت ہے۔ میں جتنے دن بھی یہاں رہا ہوں' آپ کے مفادات کی حفاظت کی تگ و دو میں ہی لگا رہا ہوں" میں نے کہا۔

"اس کا اندازہ تو مجھے اسی بات سے ہو گیا ہے کہ کس طرح تم نے بینک کو لُٹنے سے بچایا اور اس کے باوجود اس بات کو... اپنی ذات کو راز میں رکھتے رہے۔ ایک عام آدمی میں اتنا ظرف کہاں ہوتا ہے" وہ شیریں لہجے میں بولی۔

"آپ کو یہ بھی یقین ہے نا کہ میں ایک شریف آدمی ہوں؟" میں نے اس سے مزید تصدیق چاہی۔

"ہاں" وہ پُرخیال لہجے میں بولی "لیکن تم کوئی عام قسم کے شریف آدمی نہیں ہو۔ کچھ الگ ہی طرح کے شریف آدمی ہو... اور تم یقیناً اس طبقے کے فرد بھی نہیں ہو جس طبقے کے بننے کی کوشش کر رہے ہو لیکن تم میں یقیناً ہر طبقے میں گھل مل جانے' ہر مشقت اور صعوبت سہہ جانے کی صلاحیت ہے۔"

"شکریہ" میں نے ہولے سے ہنس کر کہا "لگتا ہے آپ تو میری شخصیت کی تہ تک پہنچتی جا رہی ہیں اور یہ بات مجھے بڑی خطرناک لگتی ہے کہ کوئی میری شخصیت کی تہ کو پہنچنے لگا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھے مکمل طور پر بوجھ لیا جائے۔ مجھے خود اپنے آپ کو مکمل طور پر جاننے سے خوف آتا ہے۔"

"میرا خیال ہے' یہ شخص تم بن رہے ہو... مجھے ادھر اُدھر کی باتوں میں اُلجھانے کی کوشش کر رہے ہو..." وہ آنکھوں کے راستے گویا میری شخصیت کی گہرائیوں میں اُترنے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے بولی "تمہاری شخصیت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ تمہیں مکمل طور پر بوجھ لیے جانے اور اپنے آپ کو مکمل طور پر جاننے سے

خوف آئے۔ بہرحال تم ٹکڑوں میں بات کرنے کے بجائے مسلسل اور پوری بات کیوں نہیں کرتے؟"

چنانچہ میں نے پوری بات کر ڈالی لیکن درحقیقت وہ بھی پوری نہیں تھی۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میں درحقیقت کون تھا۔ بس اپنا اصل نام پورا بتا دیا' یہ بتا دیا کہ میں ایک چھوٹا موٹا بزنس مین تھا۔ کچھ انتہائی خطرناک لوگوں کی دشمنی کی وجہ سے مجھے بھاگنا پڑا تھا اور حالات نے مجھے روحیل خان سے لا ٹکرایا تھا۔ وہاں سے میں نے باقی تمام باتیں اسے سچ سچ بتا دی تھیں۔ روحیل خان سے ملاقات کے بعد سے اب تک مجھے جو بھی واقعات پیش آئے تھے وہ سب میں نے بلا کم و کاست اسے سنا دیے۔

اس کے چہرے پر کئی بار تغیر آیا لیکن وہ درمیان میں کچھ نہ بولی' نہایت صبر و سکون سے اس نے سب کچھ سنا۔ میں نے اسے ڈاکوؤں کے "گولڈ کی کلب" کے بارے میں بھی بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اگر کبھی پولیس یا کوئی اور ایجنسی اس کلب کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو بھی گئی تو وہاں سے کچھ ایسے کاغذات یا کچھ ایسے جعلی ثبوت برآمد ہوں گے جن سے وہ کلب اس کی ملکیت ظاہر ہو گا۔ یہ سن کر تو اس کی رنگت ایک لمحے کے لیے پھیکی پڑ گئی لیکن بظاہر وہ پُرسکون ہی رہی۔

"... اور اب میں آپ کے سامنے ہوں اور آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ میری وجہ سے آپ کو جتنی بھی زحمت ہوئی ہو اس کے لیے میں تہ دل سے معذرت خواہ ہوں" میں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر گردن کو خم دیتے ہوئے کہا۔

"آپ اتنا بھی رسمی ہونے کی ضرورت نہیں" وہ جرأت مندی سے مسکرائی "اب جبکہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ میں کس قسم کے حالات میں گھری ہوئی ہوں... تو تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟"

"مجھے اندازہ ہے کہ آپ ایک مضبوط لڑکی ہیں۔ آپ کے پاس بہت وسائل ہیں۔ آپ ان حالات سے آسانی سے نمٹ لیں گی" میں نے کہا۔

"نمٹ تو شاید لوں گی لیکن آسانی سے نہیں" اس نے پُرخیال انداز میں ٹھوڑی مسلتے ہوئے آہستگی سے کہا "بے شک میرے پاس وسائل موجود ہیں لیکن سب سے بڑا مسئلہ تو یہی ہے کہ میں لڑکی ہوں۔ لوگ مجھے لڑکی ہونے کی سزا دینا چاہتے ہیں..."

پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔ وہ انگلی اٹھاتے ہوئے بولی "اور ہاں... تم ہرگز یہ مت سمجھنا کہ تمہاری وجہ سے مجھے کوئی زحمت ہوئی ہو گی یا میرے لیے کوئی مصیبت کھڑی ہوئی ہو گی۔ عین ممکن ہے' تمہاری وجہ سے تو میری کوئی مصیبت ٹل گئی ہو۔ میرا اصل مسئلہ کیا جانو ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس سے کیسے نجات حاصل کروں۔ یہ مردود کسی بھوت کی طرح میرے پیچھے لگ گیا ہے۔"

"اور یہ لاتوں کا بھوت ہے' باتوں سے نہیں مانے گا" میں نے کہا۔

"میں خون خرابہ نہیں چاہتی۔ ایک انسانی جان کا نقصان بھی میری نظر میں ناقابلِ تلافی ہے۔ میں اپنے گاؤں کو ایک مثالی گاؤں بنانا چاہتی تھی۔ میرے خواب بہت اونچے تھے لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے جانو جیسی بلاؤں سے واسطہ پڑے گا۔ میرے خوابوں میں اس کی گنجائش نہیں تھی۔ میں اپنے آپ کو ابھی تک ذہنی طور پر ان لوگوں سے اُلجھنے کے لیے تیار نہیں کر سکی۔"

"اس دنیا میں قدم قدم پر جانو جیسی بلائیں موجود ہیں۔ کہیں کسی روپ میں' کہیں کسی روپ میں۔ یہ دنیا آئیڈیلسٹ لوگوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہ تو آپ کی خوش قسمتی ہے کہ جس قسم کی آپ لڑکی ہیں... اور جس پوزیشن میں ہیں... اس میں آپ کو صرف ایک بلا سے ہی واسطہ پڑا ہے۔ بات صرف وہی ہے کہ آپ نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس بلا سے نمٹنے کے لیے تیار نہیں کیا۔ جس دن آپ ذہنی طور پر تیار ہو گئیں' اس دن نمٹ لیں گی۔"

"عجیب بات یہ ہے کہ میں اس سے خوف زدہ بھی نہیں ہوں" وہ اُلجھن آمیز سے لہجے میں بولی۔

"مجھے معلوم ہے" میں نے اثبات میں سر ہلایا "یہ بس ایک گریز... ایک جھجک ہے جو طاقتور شرفا میں پائی جاتی ہے۔ کمزور شرفا میں تو باقاعدہ خوف پایا جاتا ہے۔"

"تم نے جانے کا فیصلہ کیوں کر لیا ہے؟" اس نے اچانک ہی پوچھا۔

"میں اپنے کچھ ہمدرد اور جاں نثار قسم کے دوستوں کو ان خطرناک لوگوں سے برسرِپیکار چھوڑ آیا تھا جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں پیش منظر سے ہٹ جاؤں گا تو کم از کم کچھ عرصے کے لیے ضرور سکون ہو جائے گا۔ میں نے ان لوگوں کو یہ تاثر بھی دینے کی کوشش کی تھی کہ میں آخری جھٹپٹ میں ہلاک ہو چکا ہوں۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ میری یہ کوشش کس حد تک کامیاب رہی کیونکہ اس کے بعد میں صحیح معنوں میں روپوش ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کسی بھی ذریعے سے رابطہ کرنے کی ذرا سی بھی کوشش نہیں کی لیکن اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ میری یہ حکمتِ عملی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔"

"میرے خیال میں تو اچھی تھی" وہ بلا تامل بولی "میں تمہارے حالات سے پوری طرح اب بھی واقف نہیں ہو سکی اور میں تمہیں زیادہ کُریدنا بھی نہیں چاہتی۔ جتنا تم نے بتا دیا' اتنا ہی کافی ہے۔ ظاہر ہے تمہاری کچھ مجبوریاں یا مصلحتیں ہوں گی... لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم نے جو کچھ کیا' اچھا کیا۔ شاید اس طرح تمہارے سر سے کوئی مصیبت ٹل گئی ہو لیکن اب تم اپنے ساتھیوں کے پاس واپس جانا چاہتے ہو... کیا تمہارے خیال میں حالات تبدیل ہو گئے ہوں گے؟"

"میں فوری طور پر ان کے پاس واپس نہیں جاؤں گا۔ پہلے میں

ذرا دور ہی رہ کر ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ پہلے میں کراچی جاؤں گا۔ وہاں سے اپنے کچھ رابطے بحال کرنے کی کوشش کروں گا" میں نے بتایا۔

"اب تم سے تعارف ہوا.... تم نے اپنے بارے میں تھوڑا بہت بتایا تو ساتھ ہی تم چل دیے" وہ مبہم سے انداز میں مسکرائی۔

"زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی" میں نے کہا۔

"شاید..." اس نے بے یقینی سے کہا۔ اس نے یہ شکوہ نہیں کیا کہ میں نے تو اسے اپنے کاروبار' اپنے ٹھکانے' اپنی رہائش وغیرہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ کوئی فون نمبر نہیں دیا تھا۔ رابطے کا کوئی طریقہ تجویز نہیں کیا تھا تو پھر ملاقات یا رابطے کا کیا امکان ہوسکتا تھا؟ محض اتفاقاً ہی ملاقات ہوسکتی تھی.... اور اتفاقات کا کیا ہے.... ہونے لگیں تو آئے دن ہوسکتے ہیں.... نہ ہوں تو زندگی بھر نہ ہوں۔ میں خود ہی چاہتا تو اس سے رابطہ کرسکتا تھا لیکن اس نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ بہت سمجھدار تھی۔ اس سے زیادہ کچھ پوچھنا نہیں چاہتی تھی جتنا میں بتانا چاہتا تھا۔

اِدھر میرا عجب ہی معاملہ تھا۔ میں محسوس کررہا تھا کہ وہ میرے حواس پر حملہ آور ہورہی تھی۔ بلاشبہ وہ دل ودماغ پر چھا جانے والی لڑکی تھی۔ بہت تیز نشے کی طرح حواس کو تسخیر کرلینے والی۔ اسی لیے میں اس سے خوف زدہ ہوگیا تھا۔ جلد از جلد اس سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ اس کے طلسم سے بچنے کا شاید یہی ایک طریقہ تھا۔

معلوم نہیں اسے خود احساس بھی تھا یا نہیں کہ اس کی شخصیت' اس کا وجود مجھ جیسے لوگوں پر کیا قیامت ڈھا سکتا تھا؟ میرا خیال تھا کہ احساس تو یقیناً ہوگا۔ حسن والے اپنے حسن کی تباہ خیزیوں سے بہت اچھی طرح واقف ہوتے ہیں لیکن اس کی انفرادیت یہ تھی کہ وہ محض حسین نہیں تھی اور میں صرف حسن سے متاثر ہونے والوں میں سے تھا بھی نہیں۔ وہ تو کئی پہلوؤں سے ایک غیر معمولی اور نایاب لڑکی تھی۔ راحیلہ کی طرح۔

بہت سے معاملات میں وہ راحیلہ سے بہت مختلف تھی۔ ظاہر ہے وہ اپنی جگہ ایک منفرد شخصیت تھی۔ یہ انفرادیت اسے میری نظر میں اور بھی زیادہ دلکش بناتی تھی لیکن مسئلہ یہی تھا کہ صرف راحیلہ کا خیال مجھے زرتاج کے بارے میں سوچنے سے باز رکھتا تھا۔ میں اگر بے اختیاری میں کبھی زرتاج کے بارے میں سوچتا بھی تھا تو اپنے آپ کو راحیلہ کا مجرم محسوس کرتا تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ راحیلہ کا مجھ سے کوئی عہد وپیماں نہیں تھا' اقرار نہیں تھا۔ وہ تو صحیح طور پر کبھی کوئی بات مان کر ہی نہیں دیتی تھی۔ کئی بار وہ نہایت سنجیدگی سے مجھے مشورہ دے چکی تھی کہ میں کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر شادی کرلوں.... اور میرا یہ حال تھا کہ اگر میں نے ایک اچھی لڑکی دیکھ بھی لی تھی تو راحیلہ ہی کے تصور کی وجہ سے اس لڑکی کے سامنے اپنے آپ کو مجرم مجرم سا محسوس کرتا تھا۔ عجیب ہی صورت حال میں گرفتار تھا میں بھی! اس لیے میں نے جان بوجھ کر زرتاج کو اپنا کوئی پتا' فون نمبر یا رابطے کا ذریعہ نہیں بتایا تھا۔ شعوری طور پر تو میری کوشش یہی تھی کہ ایک بار اس کے ہاں سے رخصت ہونے کے بعد آئندہ میری اس سے ملاقات نہ ہو لیکن لاشعوری طور پر میں کیا چاہتا تھا....؟ یہ ابھی مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

میں زرتاج کی آواز سن کر اپنے خیالات سے چونکا۔ وہ پوچھ رہی تھی "مجھے بتاؤ.... میں تمہارے لیے کیا کرسکتی ہوں؟"

"آپ نے جو کچھ کردیا' میں زندگی بھر اس کا احسان نہیں چکا سکتا۔"

"اب شرمندہ مت کرو" وہ سچ مچ خجالت زدہ سی ہوکر بولی "میں نے تم سے تمہارے شایانِ شان کوئی سلوک نہیں کیا۔ میں یہ تو سمجھ گئی تھی کہ تم جو کچھ اپنے آپ کو ظاہر کررہے ہو وہ نہیں ہو لیکن میں تمہارے بارے میں کوئی واضح فیصلہ بھی نہیں کرپا رہی تھی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں نے آنکھیں بند کرکے تم پر اعتماد کرلیا تھا۔"

"یہی تو وہ احسان ہے جس کا میں بدلہ نہیں چکا سکتا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اب آپ مجھ پر صرف اتنا احسان اور کیجیے کہ مجھے کسی ایسے قریبی قصبے یا شہر پہنچانے کا بندوبست کردیجیے جہاں سے میں ڈائرکٹ یا مرحلے وار' بس یا ٹرین کے ذریعے کراچی پہنچ سکوں۔"

"تمہیں کراچی بھی پہنچوادیں گے' ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "دن کا انتظار تو کرلو۔ ابھی تو رات ہے۔ تم چاہو تو تمہیں پجیرو میں ارائیں روڈ بھجوادیا جائے گا۔ پانچ چھ گھنٹے کا سفر ہے۔ وہاں سے جہاز کے ذریعے کراچی چلے جانا۔"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں بالکل عام اور گمنام سا آدمی بن کر رات کے اندھیروں میں ہی' عوامی طریقوں سے سفر کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ پہلو بدلتے ہوئے دھیرے سے ہنس کر بولی "ویسے تم نے عام آدمی بننے میں بھی حد ہی کردی.... اور کچھ نہیں تو گھوڑے سدھانے والے ہی بن گئے۔ اب اس وقت کوئی تمہیں اس طرح مُوھول پہنے میں لتھڑا ہوا دیکھے.... تمہارے ہاتھ میں یہ لگام' یہ چابک دیکھے تو واقعی تمہیں جدّی پشتی کوچبان یا گھوڑے سدھانے والا سمجھے گا۔"

"بس.... فوری طور پر جس کا موقع نظر آیا' وہ بن گیا۔ جب میں یہاں پہنچا تو گھوڑا آپ کے آدمی کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ میں نے سوچا' چلو یہی کرکے دکھادیتے ہیں۔ پھر فیصلہ کیا کہ چلو بہروپ اپنے اوپر لاد لیا جائے...." پھر ایک لمحے کے توقف سے نے کہا "ویسے.... آپ کو شاید یقین نہ آئے کہ میں نے زندگی کبھی کوئی گھوڑا نہیں سدھایا۔"

"اوہ.... نو...." حیرت سے اس کی خوبصورت آنکھیں پھیل

گئیں۔

"لیکن بچپن میں' میں نے اپنے گاؤں میں کچھ لوگوں کو بہت سے گھوڑے سدھاتے دیکھا تھا۔ میں بہت غور سے وہ منظر دیکھا کرتا تھا۔ وہ ساری باتیں میرے ذہن میں نقش تھیں۔"

"پھر بھی.... بڑی حیرت کی بات ہے...." اس نے گردن ہلائی۔ وہ شاید مزید کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بغیر بلائے ایک ملازمہ نہایت گھبرائے ہوئے انداز میں کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

دو قدم آگے آکر وہ گرتے گرتے بچی اور ہاتھ باندھ کر بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی "رئیسانی جی! جانو دھاڑیل اپنے چار پانچ آدمیوں کے ساتھ سیدھا اندر گھسا چلا آرہا ہے.... اسے گیٹ پر بھی کسی نے نہیں روکا.... پتا نہیں کیا بات ہے.... ایسا لگتا ہے جیسے گیٹ پر کوئی موجود ہی نہیں ہے...."

زرتاج اچھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ اس کا چہرہ خوف سے زرد نہیں بلکہ برہمی سے سرخ ہوگیا تھا۔ اس نے فوری طور پر ملازمہ کو حکم دیا "تم بھاگ جاؤ اور کہیں چھپ جاؤ...."

"اور میرے بارے میں کسی کو کچھ مت بتانا۔" میں نے ٹکڑا لگایا۔ اس وقت تک میں اچھل کر صوفے کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ صوفوں کے پیچھے چاروں طرف اوپر سے نیچے تک دیواروں کو بھاری دبیز' ریشمی پردوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے ان پردوں کے پیچھے پناہ لی۔ میں اپنے ساتھ گھوڑے کی لگام اور چابک پردے کے پیچھے لانا نہیں بھولا تھا۔ اگر ان میں سے ایک بھی چیز صوفے پر رہ جاتی تو وہاں میری موجودگی کا راز کھل جاتا۔

ملازمہ گرتی پڑتی کمرے سے بھاگ گئی اور میں پردے کے پیچھے چھپ گیا۔ اس میں بہ مشکل چند سیکنڈ ہی لگے تھے۔ اس دوران باہر برآمدے کی ماربل کی ٹائیوں پر کئی افراد کے بھاری قدموں کی ٹھک ٹھک اور دھم دھم سنائی دینے لگی۔ زرتاج دونوں ہاتھ کمر پر رکھے تنی کھڑی تھی۔ اس نے اپنی جگہ سے ہلنے کی شاید ضرورت نہیں سمجھی تھی یا اس کے خیال میں کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کرنا مناسب نہیں تھا۔

وہ کوئی ہتھیار وغیرہ لینے کے لیے نہیں لپکی تھی۔ شاید ڈرائنگ روم میں کوئی ہتھیار موجود نہیں تھا۔ حویلی کے اردگرد چونکہ مسلح محافظ تعینات رہتے تھے شاید اس لیے زرتاج اطمینان سے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے زندگی میں یہی تجربہ حاصل ہوا تھا کہ انسان کو خواہ کتنے ہی مسلح محافظ میسّر ہوں لیکن اپنے خود بھی ہر وقت' کسی بھی قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

جانو چار مسلح آدمیوں کے ساتھ جس طرح کمرے میں داخل ہوا اس طرح شاید پرانے زمانے میں جنگجو اور سفاک بادشاہ بھی اپنے مفتوحہ علاقوں میں داخل نہیں ہوتے ہوں گے۔ اس کی گردن متکبرانہ انداز میں اکڑی ہوئی تھی اور چہرے پر خونخواری تھی۔ میں دو پردوں کے درمیان بال جیسی باریک جھری سے صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا اور اپنے اعصاب کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس وقت اپنے آپ کو پُرسکون رکھنا نہایت ضروری تھا۔

جانو اور اس کے ساتھی ڈاکو اس وقت خاصے معززانہ لباس میں تھے۔ چاروں ڈاکوؤں نے جانو کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور وہ شکار پر نکلے ہوئے درندوں کی طرح چوکنے نظر آرہے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت بھی ان چاروں کا رخ مختلف سمتوں میں تھا۔ وہ اس طرح جانو کو اپنے حلقے میں لیے آرہے تھے جیسے اسے کسی دشمن کے نرغے سے نکال کر لے جارہے ہوں۔ ان کی نظریں بتا رہی تھیں کہ انہیں کسی کی تلاش تھی۔ وہ اس کمرے میں زرتاج کے علاوہ بھی کسی کی موجودگی کی توقع لیے آرہے تھے یا پھر شاید وہ حد سے زیادہ محتاط تھے۔ آخر وہ زرتاج کی حویلی میں گھسے چلے آرہے تھے۔ کہیں غیر متوقع طور پر کسی سے بھی ان کا سامنا ہوسکتا تھا۔ ان کا انداز بتاتا تھا کہ وہ ہر طرح کی صورت حال کے لیے تیار تھے۔

جانو عین زرتاج کے سامنے پہنچ کر ایک جھٹکے سے رک گیا۔ اس نے خباثت بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے زرتاج کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی لیکن زرتاج نے اس کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا اور حیرت انگیز خونخواری کے ساتھ بولی "اپنا ہاتھ پیچھے رکھو کسی نامعلوم بھٹکی کی اولاد!"

جانو کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اس کی کلاشنکوف اس کے کندھے پر تھی۔ اس کا ہاتھ اس کی طرف بڑھا لیکن نہ جانے کیا سوچ کر وہ کلاشنکوف کندھے سے اتارتے اتارتے رہ گیا۔ اس کے چاروں ساتھیوں نے اپنی کلاشنکوفوں کا رخ زرتاج کی طرف کرلیا تھا لیکن زرتاج کے چہرے پر خوف کے بجائے غیظ و غضب ہی نمایاں رہا۔ چاروں ڈاکو ٹریگر دبانے کے لیے گویا جانو کے اشارے کے منتظر تھے لیکن جانو نے انہیں ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا بلکہ ایک ٹک زرتاج کی طرف دیکھتے ہوئے خطرناک حد تک پُرسکون لہجے میں بولا "میں حد سے زیادہ بدتمیزی برداشت نہیں کرتا۔"

"تم تو حد سے زیادہ کی بات کررہے ہو.... میں تو معمولی بدتمیزی بھی برداشت نہیں کرتی۔" زرتاج ترکی بہ ترکی بولی۔

"لیکن اب تمہارے لیے نہ جانے کیا کچھ برداشت کرنے کا وقت آگیا ہے۔ ہم تمہیں جتنی ڈھیل دے سکتے تھے' دے چکے۔ اس وقت میں تم سے صرف پچاس لاکھ روپے لینے آیا ہوں' باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔"

"کون سے پچاس لاکھ روپے؟ یہ رقم تمہارے نامعلوم باپ نے میرے پاس امانتاً رکھوائی تھی یا مجھے قرض دی تھی؟" زرتاج نے اسی بے خوفی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پلک جھپکائے بغیر

پوچھا۔ میں دل ہی دل میں اس کی بے خوفی اور جرأت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ گو کہ ابھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا' اس کی یہ جرأت اسے اور مجھے کیا کچھ دکھانے والی تھی۔

"زرتاج....!" جانو یک دم دہاڑا۔ اس کی مٹھیاں تشنج کے انداز میں بھنچ گئیں اور چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا لیکن اس سے آگے وہ ایک لفظ نہ بولا۔ چند لمحے کے لیے اپنی جگہ ساکت ہی ہو گیا۔ کمرے میں بوجھل خاموشی چھا گئی لیکن یہ سکوت جانو کی چیخ و پکار سے زیادہ خطرناک محسوس ہو رہا تھا۔ وقت گویا اپنی جگہ ٹھہر گیا تھا۔

جانو دوبارہ بولا تو اس کا لہجہ حیرت انگیز طور پر پُرسکون تھا۔ "....تو تم نے پچاس لاکھ کا بندوبست کر کے نہیں رکھا۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔ مجھے معلوم ہے تم بہت ضدی لڑکی ہو۔ تم اپنی ضد کی آگ میں اپنا سب کچھ جلا کر خاک کر لوگی۔ مجھے معلوم تھا' تمہارا جواب کچھ اسی قسم کا ہو گا اس لیے میں پہلے ہی سب بندوبست کر کے چلا تھا۔"

"تمہیں اندر کس نے آنے دیا؟" زرتاج کے غیظ و غضب اور جاہ و جلال میں کمی نہیں آئی تھی۔

"شاید تم ان مسلح گارڈز کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو رہی ہو جن میں سے کچھ گیٹ پر پڑے اینڈتے رہتے ہیں اور کچھ حویلی کے گرد گشت کرتے رہتے ہیں...." جانو استہزائیہ لہجے میں بولا "وہ سب اس وقت آرام کی نیند سو رہے ہیں۔"

مجھے خفیف سا جھٹکا لگا۔ کیا ان سب کو مار دیا گیا تھا؟ لیکن میں نے ایک بھی گولی چلنے کی آواز نہیں سنی تھی۔ میرے ذہن میں جو سوال ابھرا تھا وہ زرتاج کی زبان پر آ گیا۔

"کیا تم نے ان سب کو مار دیا؟" اس نے غضبناک لہجے میں پوچھا۔

"میں نے کہا نا کہ وہ سب آرام سے سو رہے ہیں۔ تم چاہو تو انہیں مُردہ بھی سمجھ سکتی ہو کیونکہ میرے خیال میں سوئے ہوئے اور مُردہ انسان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔" جانو نے غیر واضح سا جواب دیا پھر وہ سر جھٹک کر بولا۔ "تم یہ سوال جواب چھوڑو' میں یہاں سوالوں کے جواب دینے نہیں آیا۔ مجھے ہر حال میں دو چیزیں چاہئیں۔ پچاس لاکھ روپیہ اور افضل خان۔"

میرے اعصاب کچھ اور تن گئے۔ اس کا مطلب تھا' اسے میرے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔ زرتاج نے ایک لمحے کے لیے اپنے غیظ و غضب کو بھول کر ذرا حیرت کی اداکاری کی۔ "کون افضل خان؟"

"تم اتنی جلدی بھولنے والی لڑکی نہیں ہو۔ میں نے پچھلی ہی ملاقات میں تو ذکر کیا تھا کہ اس نام کا ایک شخص کس طرح غلطی سے ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا ہے۔" جانو بولا "اب تمہیں اتنا بننے کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے' تم نے اسے گھوڑے سدھانے پر ملازم رکھا ہے۔ ہم تو اس سرونٹ کوارٹر کو بھی کنگال آئے ہیں جو تم نے اسے رہنے کے لیے دیا ہوا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے تم نے کچھ دیر پہلے اسے 'شرف ملاقات بخشنے' کے لیے بلایا تھا۔ اور اسے حویلی میں ہی کہیں ہونا چاہیے۔ جلدی بتاؤ' تم نے اسے کہاں چھپایا ہے۔ ہمارے پاس اتنی بڑی حویلی کو کھنگالنے کا وقت نہیں ہے۔"

زرتاج نے حقارت بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور بولی "ابھی میری نظر میں تم کوئی ایسی توپ چیز نہیں ہوئے کہ تمہارے ڈر سے میں کسی کو اِدھر اُدھر چھپانے لگوں۔ میں تو اب تک تم سے خواہ مخواہ کے ٹکراؤ سے بچنے کے لیے تمہارے ساتھ اخلاق سے پیش آتی رہی ہوں لیکن اب تم بالکل ہی سر پر چڑھ آئے ہو تو ٹھیک ہے.... اخلاق وخلاق رہا ایک طرف.... اب تم سے بندوق کی زبان میں ہی بات ہو گی۔ تم نے اب میرے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا۔ تم خون بہتے دیکھنا چاہتے ہو تو چلو یونہی سہی...."

جانو گویا اس کی بات سے محظوظ ہوتے ہوئے دھیرے سے ہنسا اور از سرِ نو اس کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولا "لباس میں اگر اِدھر اُدھر کوئی چھوٹا موٹا پستول وغیرہ چھپا رکھا ہے تو اسے نکالنے کی کوشش نہ کرنا' جسم چھلنی ہو جائے گا.... اور فی الحال میں اس حسین جسم کو چھلنی ہوتے دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"تم صرف حویلی کے محافظوں کو مار کر یا بے ہوش کر کے آ رہے ہو کہ زرتاج نگر مسلح مردوں سے خالی ہو گیا؟" زرتاج بولی "اگر زندہ واپس جانا چاہتے ہو تو اب بھی چلے جاؤ اور آئندہ کبھی نہ آنا۔ میں تمہاری اس گستاخی کو معاف کر دوں گی۔"

جانو نے ٹھنڈی سانس لی۔ "رسّی جل جاتی ہے مگر اس کا بل نہیں جاتا۔ تم تو ابھی جلی بھی نہیں ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیسے تمہارا بل نکالوں.... کیسے تمہیں سمجھاؤں کہ اس وقت تم زندگی کے ایک انتہائی خطرناک دوراہے پر کھڑی ہو...."

پھر وہ گویا انتہائی تحمل سے کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "تم کہہ رہی ہو میں نے تمہارے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا۔ بالکل غلط ہے۔ حالانکہ میں تم سے انتہائی تنگ آیا ہوا ہوں۔ تمہاری وجہ سے مجھے جتنا نقصان پہنچا ہے اور تم بار بار میری بے عزتی کر رہی ہو.... جتنی ضد دکھا رہی ہو.... اگر تمہاری جگہ اور ہوتا تو میں اس کا نام و نشان مٹا چکا ہوتا...."

"اتنے تکبر کا کلمہ مت بولو۔" زرتاج اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی "نام و نشان مٹانے کی طاقت اللہ نے صرف اپنے پاس رکھی ہے۔ قبرستان ایسے لوگوں کی قبروں سے بھرے پڑے ہیں جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں نہ جانے کس کس کا نام و نشان مٹانے کی کوشش کی۔ آج کوئی ان کا نام تک نہیں جانتا۔"

"وعظ بند کرو اور زیادہ ملّانی بننے کی کوشش مت کرو۔" نرمی سے بولا "جو بات میں کہہ رہا ہوں اس پر توجہ دو۔ میں

بھی تمہارے لیے راستہ چھوڑا ہوا ہے۔ کسی بھی شکل میں پچاس لاکھ روپیہ مجھے دے دو۔ جتنی نقد رقم ہے وہ دے دو۔ زیور.... پرائز بانڈ.... اور کوئی قیمتی چیز.... بھی قابلِ قبول ہو گی۔ بس پچاس لاکھ کا حساب پورا کر دو اور افضل خان کو میرے حوالے کر دو۔ میرا تمہارا جھگڑا یہیں ختم ہو جائے گا۔ میں پُرامن طور پر واپس چلا جاؤں گا۔"

"تاوان نہ میرے باپ نے کبھی دیا تھا اور نہ کبھی میں دوں گی۔ میں پچاس لاکھ روپیہ غریبوں کی مدد اور فلاح کے لیے خرچ کر سکتی ہوں' ایک ڈاکو اور دہشت گرد کو نہیں دے سکتی جس کے پاس پہلے ہی حرام کی دولت کے انبار موجود ہیں۔" زرتاج فیصلہ کن لہجے میں بولی "میں تمہیں تاوان دے کر تمہاری بگڑی ہوئی عادتوں کو مزید بگاڑنا نہیں چاہتی۔ بھیڑیے کو ایک بار جہاں سے شکار مل جائے وہ بار بار پلٹ کر وہاں آتا ہے۔"

"میں تمہارے حسن کے دیدار کے لیے.... تم سے ملاقات کے لیے تو آتا رہوں گا.... لیکن کوئی مطالبہ لے کر نہیں آؤں گا.... یہ میرا وعدہ ہے۔" جانو کے لہجے میں خاصی ملائمت آ گئی۔

"میں آئندہ زرتاج نگر اور اس حویلی کے آس پاس تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔" زرتاج نفرت سے بولی۔

"تم پچاس لاکھ روپیہ اور افضل خان مجھے دے دو تو اس سلسلے میں بھی غور کیا جا سکتا ہے لیکن میں کوئی وعدہ نہیں کروں گا۔ میں تمہارا سچا عاشق ہوں۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھر چلا آؤں گا۔" جانو کا لہجہ اب خاصا بدل چکا تھا۔

"تمہاری یہ باتیں سُن سُن کر تو مجھے اُبکائی آنے لگی ہے۔ مجھے نہ تمہارے کسی وعدے کا اعتبار ہے اور نہ ہی کسی اور بات کا۔ آج اس بات کا فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ آئندہ تم زرتاج نگر کی حدود میں قدم نہیں رکھو گے۔" زرتاج کے لہجے میں اب بھی کوئی لچک نہیں تھی۔

"تم مجھے اپنی شرائط بتا رہی ہو؟ تم مجھے حکم دینا چاہتی ہو؟" جانو کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اسے گویا اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں کیونکہ اس وقت تم میری جاگیر کی حدود میں.... میری حویلی میں کھڑے ہو۔" وہ بدستور رُعب اور دبدبے سے بولی۔

"لیکن.... میری جان.... میں نے ایک اہم بات تمہیں ابھی تک نہیں بتائی...." جانو نہایت ملائمت سے بولا لیکن اس ملائمت کی تہ میں سفاکی چھپی ہوئی تھی۔ "میرا خیال ہے اب میں تمہیں وہ بات بتا ہی دوں تو بہتر ہو گا۔ تمہیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ میرا گروہ کافی بڑا ہے اور آج میں پورے گروہ کے ساتھ اس خاص مہم پر نکلا ہوں۔ میرا پورا گروہ ایک ساتھ کسی خاص مہم پر ہی نکلتا ہے۔ اس وقت تمہاری حویلی اور تمہارا گاؤں خاص خاص زاویوں سے میرے آدمیوں کے گھیرے میں ہے۔ تم ضدی بھی ہو اور شاید تم میری بات کو اتنی اہمیت بھی نہیں دو گی جتنی دینی چاہیے۔ بہرحال میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ تمہارے پاس صرف پانچ منٹ کی مہلت ہے...."

اس نے گھڑی دیکھی اور ایک لمحے کے توقف سے بولا "ٹھیک پانچ منٹ بعد میں سگنل دے دوں گا۔ تمہاری حویلی اور تمہارا گاؤں ایسی تباہی کی لپیٹ میں آ جائے گا جس کا تم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔ اب تم مجھے آخری جواب دے دو...."

اس نے جیب سے موبائل فون نما کوئی چیز نکالی لیکن وہ موبائل فون نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ موبائل فون اس علاقے میں کام نہیں کرتا تھا۔ وہ غالباً واکی ٹاکی سیٹ تھا۔ وہ اسے ہاتھ میں ذرا اونچا کرتے ہوئے بولا "میں اس پر صرف دو لفظ بولوں گا اور آپریشن شروع ہو جائے گا۔ بولو کیا کہتی ہو؟"

زرتاج نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے کھڑی تھی۔ میرے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ میں اس وقت بالکل نہتا تھا اور جانو کے ساتھی کلاشنکوفیں سیدھی کیے کمرے کے چاروں کونوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ میں اگر اچانک پردے کے عقب سے نکل کر ان پر چھلانگ لگاتا تب بھی شاید ان میں سے ایک یا دو کو دبوچتے ہوئے ڈھیر ہوتا۔ اس دوران اگر ان کی اپنی گنیں چل جاتیں تب بھی میرے لیے موت کا خطرہ تھا اور اسی دوران باقی دونوں تینوں افراد بھی آسانی سے مجھے چھلنی کر سکتے تھے۔ وہ بالکل ہی ناکارہ اور سُست تو یقیناً نہیں تھے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ میرے اور ان کے درمیان آٹھ دس فٹ کا فاصلہ تھا اور اس وقت ایک ایک انچ فاصلے کی بڑی اہمیت تھی۔ اگر میں ان کے بالکل قریب ہوتا تو میری پھرتی میرے کام آ جاتی اور میں پلک جھپکتے میں ان میں سے کسی کی گن چھینتے ہوئے باقی لوگوں سے پہلے کم از کم ایک برسٹ تو مار ہی سکتا تھا لیکن اس صورت میں بھی میرے لیے زرتاج کو بچانا بڑا نازک مسئلہ ہوتا۔ بے بسی کے احساس سے میرے اعصاب چٹخنے لگے۔

دفعتاً ایک شخص نہایت خاموشی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بھی کلاشنکوف تھی۔ اسے دیکھ کر میرے دل میں امید کی ایک کرن لہرائی۔ وہ عبدل تھا جو سرونٹ کوارٹر میں میرا کھانا وغیرہ پکانے پر مامور تھا۔ وہ اس وقت بالکل بدلا ہوا انسان نظر آ رہا تھا۔ یہ وہ مسکین اور بُدھو سا عبدل نہیں تھا جسے میں اب تک دیکھتا آیا تھا۔ وہ تو اس وقت لومڑی سے زیادہ عیار و مکار نظر آ رہا تھا۔

جس خاموشی سے وہ کمرے میں داخل ہوا تھا' میرا خیال تھا' وہ تو نقشہ ہی بدل دے گا' بازی پلٹ دے گا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ ان چاروں ڈاکوؤں کی نظر میں آئے بغیر تو وہ کمرے میں داخل ہو ہی نہیں سکتا تھا اور وہ کمرے میں داخل ہونے کے بعد چند قدم آگے بھی آ چکا تھا لیکن ڈاکوؤں میں سے کسی

نے اس پر گولی نہیں چلائی تھی اور نہ ہی عبدل کی کلاشنکوف کا رخ ڈاکوؤں کی طرف تھا۔ ظاہر ہے' اس کا مطلب تو کچھ اور تھا۔

دوسرے ہی لمحے یہ مطلب واضح بھی ہوگیا جب عبدل نے نہایت مؤدبانہ لہجے میں جانو کو مخاطب کیا "سائیں! میں نے تمام نوکروں اور نوکرانیوں کو ایک کمرے میں بند کردیا ہے لیکن افضل خان حویلی میں کہیں نہیں ہے... اور وہ واپس بھی نہیں گیا ہے...."

وہ پانچوں یک لخت پہلے سے زیادہ چوکنے ہوگئے اور جانو سرہلاتے ہوئے بولا "اس کا مطلب ہے وہ اسی کمرے میں ہے..."

وہ اپنی جگہ ساکت ہوگئے۔ صرف ان کی آنکھیں متحرک تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کی نظریں شکاری باز کی طرح کمرے میں موجود ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کمرے میں وکٹورین اسٹائل کا بہت سا بھاری بھرکم فرنیچر موجود تھا۔ تقریباً ہر چیز کے پیچھے ہی کوئی آسانی سے چھپ سکتا تھا لیکن میں فرنیچر سے بھی ذرا پیچھے پردے کے عقب میں تھا۔ دو پردوں کے کناروں کو میں نے صرف چٹکی سے تھاما ہوا تھا اور بال برابر جھری کو ذرا بھی کشادہ نہیں ہونے دیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے شبہ ہوا کہ ایک کلاشنکوف بردار کی نظر عین اسی مقام پر آکر ٹھہر گئی تھی۔

لیکن عین اسی لمحے زرتاج کی تاسف زدہ آواز ابھری۔ "عبدل.... کیا واقعی تم....!" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ شاید بے یقینی کی شدت کی وجہ سے الفاظ اس کے ہونٹوں پر دم توڑ گئے تھے۔ اس کے لہجے میں سسکی سی پنہاں تھی۔ شاید اسے زندگی میں پہلی بار کسی کی غداری کے صدمے سے واسطہ پڑا تھا۔

عبدل نے کوئی جواب نہ دیا لیکن جانو فاتحانہ لہجے میں بولا "ہاں... عبدل ہمارا آدمی ہے۔ اسی کی وجہ سے تو حویلی کے محافظوں کو قابو میں کرنا ہمارے لیے ممکن ہوا ورنہ یہ کام کافی مشکل تھا۔"

عبدل نہایت ڈھٹائی سے زرتاج کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ مجھ سمیت ایک لمحے کے لیے شاید سبھی عبدل کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ میں بھی صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا کہ زرتاج نے کب اور کہاں سے چھوٹا سا وہ چپٹا پستول نکالا تھا۔ میں تو فائر کی ہلکی سی آواز سن کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

اسی لمحے عبدل پٹ سے فرش پر گرا۔ گولی عین اس کے سینے پر دل کے مقام پر لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا فائر کرتی یا پستول کا رخ کسی اور کی طرف کرتی' جانو نے بجلی کی سی تیزی سے اس کی کلائی پر ٹھوکر ماری۔ اس کے پیروں میں بھاری بوٹ تھے۔ پستول زرتاج کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کا بازو بے جان سے انداز میں جھول گیا۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید کراہ کر بازو تھام کر بیٹھ جاتی لیکن اس نے اُف تک نہ کی۔ البتہ شاید اسے اس بات کا افسوس تھا کہ وہ پستول نکالنے میں تو کامیاب ہوگئی تھی لیکن اس سے مزید کام نہیں لے سکی۔ عبدل کے ہاتھ سے کلاشنکوف چھوٹ گئی تھی اور وہ چاروں خانے چت پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ شاید اسے آخری سانس لینے تک یقین نہیں آیا تھا کہ اسے گولی لگ چکی تھی۔

"آخر تم ایک خطرناک قدم اٹھانے سے باز نہیں رہ سکیں۔" جانو بوجھل آواز میں بولا "اس حرکت میں تمہاری جان بھی جاسکتی تھی۔ میرے آدمیوں نے احتیاط برتی ہے۔"

"بڑا احسان ہے ان کا۔" زرتاج زہرخند کے ساتھ بولی "مجھے تو خوشی یہ ہے کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ آستین کے سانپ کو پہلے مارنا ضروری تھا۔ سامنے کھڑے ہوئے دشمن کا معاملہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔"

"تم بہت خطرناک لڑکی ہو۔" جانو کے چہرے پر اب شیطانی سی مسکراہٹ نمودار ہورہی تھی۔ "اب تمہیں مزید تنہا نہیں رہنا چاہیے۔ میں اب تمہارے سامنے دو کے بجائے تین راستے رکھ رہا ہوں۔ تم مجھے پچاس لاکھ کی ادائیگی کردو یا پھر تم مجھے شوہر کے طور پر قبول کرلو.... میرا جب دل چاہے گا میں یہاں آجایا کروں گا اور جتنے دن چاہوں یہاں قیام کیا کروں گا.... ورنہ آج پھر اپنی اس بادشاہی کی تباہی کے لیے تیار ہوجاؤ...."

"تم اس رشتے کو شادی جیسا مقدس نام کیوں دے رہے ہو۔ سیدھی طرح کہو نا کہ تم مجھے داشتہ رکھنا چاہتے ہو...." زرتاج کے چہرے پر سرخی بڑھ رہی تھی۔

"تم جو چاہے سمجھ لو... بہرحال میں تو اس بندھن کو شریفانہ اور معززانہ شکل دینے کے لیے تیار ہوں...." جانو اس کے کچھ اور قریب آگیا۔

"بہت اونچے خواب دیکھتے ہو تم...." زرتاج گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی "تم میرے شوہر بننا چاہتے ہو' میں تو تمہیں زرتاج نگر میں گندوں کی صفائی کے لیے بھی ملازم نہ رکھوں۔ اس کے لیے بھی میں کوئی تھوڑا بہت باکردار آدمی مقرر کرنا پسند کروں گی۔"

"اونچے خواب میں نہیں' تم دیکھتی ہو اسی لیے اب تک تنہا زندگی گزار رہی ہو۔ آخر میں تمہارا شوہر کیوں نہیں بن سکتا؟" جانو گویا تحمل سے کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "کیا خرابی ہے مجھ میں؟ پڑھا لکھا ہوں.... دولت مند ہوں.... بہت دور تک میری دہشت پھیلی ہوئی ہے.... تمہیں ہر طرح سے خوش رکھ سکتا ہوں۔ تمہیں اور کیا چاہیے؟"

"پڑھ لکھ کر بھی اگر آدمی کو یہی کچھ بننا ہو جو تم بنے ہو تو پھر ان پڑھ تم سے لاکھ درجے بہتر ہیں۔" زرتاج نے جواب دیا۔

"اچھا.... اب باتیں بہت ہوچکیں۔ تم ہمارا مزید وقت ضائع نہ کرو۔ بات کو کسی کنارے لگاؤ...." پھر جیسے وہ کچھ سوچ کر بولا "میرے خیال میں تو سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ تم ہی میرے ساتھ چلو۔ اس طرح کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ سب سکھ میں رہیں گے۔"

"کہاں لے چلوگے مجھے؟" زرتاج نے نہایت رسان سے

پوچھا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے چہرے کی سرخی بڑھتی ہی جارہی تھی۔

"تمہیں اس سلسلے میں کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بہت ٹھکانے ہیں میرے۔" جانو شاہانہ انداز میں بولا "تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"کتنا خیال ہے تمہیں میرے آرام کا۔" زرتاج زہریلے لہجے میں بولی۔ اس کی آواز سانپ کی پھنکار سے مشابہ ہوتی جارہی تھی۔ لیکن جانو کو شاید اس کا احساس نہیں تھا۔ وہ زرتاج کی کلائی پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "آؤ میری جان! باتیں چھوڑو اور میرے ساتھ چلو...."

زرتاج اسے کلائی تھامنے کا موقع دیے بغیر ایڑی کے بل گھومی۔ دوسرے ہی لمحے جانو کے جبڑے پر ایسی لات پڑی کہ میرے اندازے کے مطابق اس کا جبڑا ہلتے گیا ہوگا یا اپنی جگہ سے ہل گیا ہوگا۔ وہ بری طرح لڑکھڑایا۔

اس لڑکی کو واقعی اپنی جان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ جانو کے ساتھیوں کا غیظ و غضب سے بُرا حال ہوگیا۔ یکدم انہوں نے زرتاج کے گرد گھیرا تنگ کرلیا اور ان چاروں کی کلاشنکوفوں کا رخ زرتاج کی طرف ہوگیا لیکن شاید وہ سردار کے اشارے کے بغیر ٹریگر نہیں دبا سکتے تھے۔ کم از کم زرتاج کو گولیوں سے چھلنی نہیں کرسکتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کا سردار اس مجسم شعلے کو زندہ ہی قابو میں کرنے کے لیے کس طرح تڑپ رہا تھا۔ اس لیے وہ اب بھی ٹریگر دباتے دباتے رہ گئے لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ وہ خود پر مشکل سے قابو رکھے ہوئے تھے۔

تاہم زرتاج نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے وہ موقع فراہم کردیا تھا جس کا میں منتظر تھا۔ میں یہی چاہتا تھا کہ خواہ ایک لمحے کے لیے ہی سہی لیکن کلاشنکوفوں کا رخ کسی ایک طرف ہی ہوجائے۔ میرے لیے سب سے زیادہ وہ کلاشنکوف خطرناک تھی جس کا رخ ہی اس پردے کی طرف تھا جس کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا۔ گو کہ اس کلاشنکوف والے ڈاکو کو یہ معلوم نہیں تھا لیکن جونہی میں پردہ ہٹاتا' ٹریگر دب سکتا تھا۔ اب کم از کم ایک آدھ لمحے کے لیے یہ خطرہ ٹل گیا تھا۔

زرتاج نے جانو کو کرارے کا جو داؤ دکھایا تھا اس سے سنبھلنے کے لیے اسے کئی سیکنڈ درکار تھے۔ وہ تو آدمی مضبوط تھا ورنہ شاید ڈھیر ہوچکا ہوتا۔ میں اسی لمحے پردے دونوں طرف ہٹا کر صوفے کے اوپر سے چھلانگ لگا چکا تھا جب کلاشنکوفوں کا رخ زرتاج کی طرف ہوا تھا۔

میں نے اس کلاشنکوف پر چھلانگ لگائی تھی جو عبدل کے ہاتھ سے نکلی تھی۔ اسے کسی نے اٹھانے کی زحمت نہیں کی تھی اور وہ مجھ سے قریب تھی۔ ڈاکوؤں کو فوراً ہی معلوم ہوگیا تھا کہ پردوں کے عقب سے کوئی 'چیز' تقریباً اڑتی ہوئی نکلی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ میری طرف مڑتے اور مجھے صحیح طور پر دیکھ پاتے' میں کلاشنکوف اٹھاتے ہوئے کچھ اور آگے لڑھک چکا تھا۔

اب چاروں ہی ڈاکو بیک وقت میری طرف گھومے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان میں سے دو میری گن کی زد میں آچکے تھے۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے برسٹ مارا۔ اگر مجھے ایک ثانیے کی تاخیر ہوجاتی تو وہ دونوں برسٹ مار چکے ہوتے۔ وہ دونوں آڑے ترچھے ڈھیر ہوگئے۔

باقی دونوں صرف اس لیے گولی چلانے میں ایک لمحے کے لیے جھجک گئے کہ ان کے اپنے ساتھی ان کی زد میں تھے۔ ان کی تو وہ رکاوٹ دور ہوگئی کیونکہ ان کے وہ دونوں ساتھی ڈھیر ہوگئے تھے لیکن میں اندھا دھند دوسرا برسٹ نہ مار سکا کیونکہ اس طرف زرتاج کے بھی گولیوں کی زد میں آنے کا اندیشہ تھا۔

میں نے باقی دنوں ڈاکوؤں کی متوقع فائرنگ سے بچنے کے لیے دوسری طرف لوٹ لگائی۔ اسی دوران زرتاج نے ایک اہم کام کر دکھایا۔ اس نے ایک ڈاکو کی کمر پر اتنے زور کی لات رسید کی کہ وہ قربانی کے بکرے کی طرح عین میرے سامنے آگیا۔ اس دوران اس کی کلاشنکوف نے گولیاں اُگلیں لیکن گن کا رخ فرش کی طرف ہوچکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ہلکا سا برسٹ مارا اور وہ بھی ڈھیر ہوگیا۔

اس کے ساتھ ہی میں لوٹ لگا کر ایک بار پھر اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں اتنی پھرتی دکھانے میں کامیاب ہوگیا تھا کیونکہ جونہی میں اس جگہ سے ہٹا' وہاں برسٹ پڑا۔ میں بال بال بچا تھا۔ دوسری بار میں گن سیدھی نہیں کرسکا تھا کہ چوتھے ڈاکو نے گن کا رخ بدل لیا۔ اس بار یقیناً میں گولیوں کا نشانہ بن گیا ہوتا کیونکہ میں بروقت اپنی گن کو فائرنگ پوزیشن میں نہیں لاسکا تھا۔

اسی لمحے زرتاج کی ٹانگ ایک بار پھر حرکت میں آئی۔ اس نے نہایت حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا تھا کہ ڈاکو کی کلائی پر اس طرح لات رسید کی تھی کہ کلاشنکوف اوپر کی طرف اچھلی۔ وہ گولیاں جو شاید میرے جسم میں پیوست ہوتیں' چھت میں لگیں۔ ایک فانوس کا تھوڑا سا حصہ ان کی زد میں آیا۔ کچھ پلستر اور شیشے کی کچھ کرچیاں نیچے گریں۔ تقریباً ان کے ساتھ ہی ڈاکو بھی فرش پر گرا کیونکہ اس دوران میں برسٹ مارنے میں کامیاب ہوچکا تھا۔

جانو کی طرف سے میں اس دوران اس لیے تین چار سیکنڈ بے فکر رہا تھا کہ جب زرتاج نے اس کے جبڑے پر لات رسید کی تھی تو اس کے لڑکھڑانے کے دوران اس کے کندھے سے گن گر چکی تھی۔ میں نے یہ خیال تو رکھا کہ اس دوران وہ گن اٹھانے کے لیے نہیں جھکا تھا۔ بازی یوں یکدم الٹتی دیکھ کر وہ شاید بدحواس ہوگیا تھا۔

لیکن جب تک میں چوتھے ڈاکو سے نمٹنے میں کامیاب ہوا'

اس دوران وہ سنبھل کر ایک کام دکھانے میں ضرور کامیاب ہوگیا۔ زرتاج جس نے اپنی حاضر دماغی سے مجھے تو چوتھے ڈاکو کی فائرنگ سے بچالیا تھا' وہ خود اپنا خیال نہ رکھ سکی۔ وہ عین جانو کے سامنے آگئی۔

جانو نے لپک کر اس کی گردن بازو کے شکنجے میں کستے ہوئے اور اس کا بازو مروڑ کر پشت پر لاتے ہوئے اسے قابو میں کرلیا۔ اس نے زرتاج کو اپنی ڈھال بنالیا تھا۔ میں اس پر گولی نہیں چلا سکتا تھا۔ اگر اس کے جبڑے پر پڑنے والی لات نے اس کا دماغ نہ ہلایا ہوتا تو شاید اس دوران وہ کوئی اور خطرناک کام دکھا چکا ہوتا۔ آدمی وہ بہرحال خاصا خطرناک اور طاقتور تھا۔

"گن پھینک دو.... ورنہ میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا...." وہ پھٹی پھٹی سی آواز میں چلّایا۔ مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ زرتاج آسانی سے اس کے قابو میں آنے والی چیز نہیں تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ بہت بری طرح پھنس گئی تھی اور اس کے شکنجے میں آگئی تھی۔ سردست تو وہ بے بس ہی معلوم ہو رہی تھی۔ جانو نے اپنی دھمکی سچ کر دکھانے کے لیے زرتاج کے گلے پر بازو کا دباؤ کچھ بڑھادیا۔ زرتاج کی آنکھیں حلقوں سے باہر آنے لگیں۔

میں نے گن فوراً پھینک دی اور آہستگی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ جانو کی آنکھوں میں وحشت تھی جو اس کی بدحواسی کی نشاندہی کرتی تھی۔ میں نے اپنی مُرتعش سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "جس پر قربان ہوئے جارہے تھے' اسی کو ڈھال بنالیا... لعنت ہے تمہاری زندگی پر....."

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جذباتی باتوں میں اُلجھنے کا قائل معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ بدستور زرتاج کو ڈھال بنائے ذرا سا گھومتے ہوئے دھیرے دھیرے دروازے کی طرف کھسکنے لگا۔ عجیب بات تھی کہ کمرے میں کئی کلاشنکوفیں بکھری ہوئی تھیں اور کسی طرف ایک پستول بھی پڑا تھا لیکن ہم میں سے کوئی ان میں سے ایک گن بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

"تمہارا خیال ہے' تم اسی طرح زرتاج کو ڈھال بنائے اتنی بڑی حویلی میں سے زندہ سلامت گزر جاؤ گے؟" میں نے اپنی دانست میں اسے باتوں میں لگا کر اس کے ساتھ ساتھ دھیرے دھیرے خود بھی دروازے کی طرف کھسکنے کی کوشش کی لیکن اسے اس کا احساس ہوگیا۔

وہ اسی وحشت زدہ انداز میں پھٹی پھٹی سی آواز میں چلّایا۔ "تم آگے مت بڑھو..... وہیں کھڑے رہو..... ورنہ....." اس نے زرتاج کی گردن کو خفیف سا جھٹکا دیا۔ زرتاج اس عالم میں بھی یقیناً پوری کوشش کررہی تھی کہ اس کے چہرے سے اذیت کا اظہار نہ ہونے پائے لیکن میرے لیے اس کی کیفیت کا اندازہ کرنا مشکل نہ تھا۔ جانو نے اسے تقریباً میری ہی ٹیکنیک سے دبوچ رکھا تھا اسی لیے وہ بے بس نظر آرہی تھی۔

میں اپنی جگہ ساکت ہوگیا۔ جانو کا وائی ٹاکی بھی گر گیا تھا لیکن اس نے اسے بھی اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میری نظر اس پر جمی ہوئی تھی اور میں کوشش کررہا تھا کہ پلک بھی نہ جھپکوں۔ اس قسم کی صورت حال میں اگر کوئی موقع میسّر آتا بھی ہے تو وہ بس کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے کہ پلک جھپکتے میں ہی کچھ کرکے دکھانا ہوتا ہے۔

جانو لاشوں سے بچتا ہوا دروازے کی طرف کھسکتا جارہا تھا۔ اگر کمرا اتنا طویل و عریض نہ ہوتا تو شاید کسی لاش میں ہی اس کا پاؤں اُلجھنے کی امید رکھی جاسکتی۔

وہ اس وقت دروازے کے کافی قریب پہنچ چکا تھا جب قسمت نے مجھے وہ موقع فراہم کیا جس کی امید لیے میں اس پر نظر جمائے کھڑا تھا۔ مجھے بھی نہیں معلوم تھا اور جانو نے بھی یقیناً نہیں دیکھا تھا کہ عبدل جب گولی کھا کر گرا تھا تو اس کی پگڑی سر سے اتر گئی تھی اور کھل کر ذرا دور تک پھیل گئی تھی۔

جانو کا پاؤں نہایت معمولی حد تک اس میں اُلجھا لیکن وہ چونکہ وحشت زدہ تھا' ایک لمحے کے لیے ٹھٹک سا گیا اور شاید اسی لمحے زرتاج کی گردن پر اس کے بازو کا شکنجہ ذرا ڈھیلا پڑ گیا۔ زرتاج نے اس موقعے سے فائدہ اٹھانے میں کمزوری نہیں دکھائی۔ اس نے ذرا سا جھکتے ہوئے یکدم جانو جیسے لحیم شحیم شخص کو پشت پر اٹھاتے ہوئے سامنے کی طرف اچھال دیا۔

جانو لاشوں کے درمیان دبیز قالین پر آکر گرا۔ میں نے فوراً اس پر چھلانگ لگائی۔ اس کوشش میں مجھے چوٹ بھی لگی کیونکہ اس نے اسی لمحے گھٹنے موڑ لیے تھے اور میں گھٹنوں پر ہی گرا تھا لیکن میں نے چوٹ کی پروا نہیں کی اور اس کی گردن دبوچنے کی کوشش کی۔

میں اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس نے مجھے گھٹنوں پر اچھال دیا لیکن میں دور جاکر نہیں گرا' اس کے قریب ہی لڑھک گیا۔ ہم دونوں بیک وقت ہی اٹھے۔ شاید یہ جانو کی غلطی تھی کہ وہ ایک کلاشنکوف اٹھانے کے لیے لپکا۔ میں نے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی۔ جس نفرت سے میں نے اسے وہ ٹھوکر رسید کی اس سے میرے خیال میں اس کی ایک آدھ پسلی تو ٹوٹ کر پھیپھڑے میں گھس جانی چاہیے تھی۔

جسیم ہونے کے باوجود وہ اس ٹھوکر سے خاصا اچھلا اور کچھ دور جاگرا لیکن زخمی چیتے کی طرح فوراً ہی تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بدبخت عیاش اور شرابی ہونے کے باوجود خاصا طاقتور اور پھرتیلا تھا۔ اس بار وہ کوئی گن اٹھانے کے لیے نہیں جھپٹا بلکہ کسی غضبناک سانڈ کی طرح اس نے مجھے ٹکر رسید کرنے کی کوشش کی۔ میں نے جھکائی دے کر بچتے ہوئے اس کی پیٹھ پر لات رسید کی۔

وہ اپنی جھونک میں ایک صوفے سے جا ٹکرایا۔ صوفہ نہایت وزنی ہونے کے باوجود اُلٹ گیا اور اس نے میرا کام کافی آسان کر دیا کیونکہ جانو کے جسم کا کچھ حصہ اس کے نیچے دب گیا۔ گو کہ وہ جسم کو جھٹک کر کافی تیزی سے اس کے نیچے سے نکل آیا تھا لیکن اس وقت تک میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ وہ بجلی سی پھرتی کا مظاہرہ نہ کرسکا۔ میں نے اس کے منہ پر پوری قوت سے گھونسا رسید کیا۔

اگر زرتاج کی لات سے کوئی کسر رہ گئی تھی تو میرے گھونسے سے پوری ہوجانی چاہیے تھی اور اس کا جبڑا کم از کم اب تو ٹوٹ جانا چاہیے تھا۔ وہ اسی اُلٹے ہوئے صوفے پر سے اُلٹ کر دوسری طرف واپس جاگرا۔ میرا خیال تھا' وہ اب نہیں اٹھے گا لیکن وہ بدبخت پھر اٹھ کھڑا ہوا البتہ اب اس کے حواس یقیناً مختل ہوچکے تھے کیونکہ اب اس کے اٹھنے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اسے کچھ نظر نہ آرہا ہو۔

میں صوفے کو پھلانگ کر دوبارہ اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے اناڑیوں کی طرح دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر گویا مجھے روکنے کی کوشش کی۔ میں نے جھک کر یک دم ہی اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا۔ اب تک میں نے اپنی حرکات و سکنات پر پوری طرح قابو رکھا تھا اور اپنے اوسان مجتمع رکھتے ہوئے نہایت نپے تلے انداز میں ہر کام کیا تھا لیکن اس لمحے یک لخت ہی گویا مجھے اپنے آپ پر اختیار نہ رہا۔ میرے اندر گویا غیظ و غضب کا ایک آتش فشاں پھٹ پڑا۔

میں نے پہلی بار جب اسے دیکھا تھا اور اس نے میرے ساتھ جو سلوک کرایا تھا' اس وقت سے اب تک میرے دل میں قطرہ قطرہ جو نفرت جمع ہو رہی تھی وہ گویا پٹرول کا ذخیرہ بن گئی اور اسی لمحے اسے گویا کسی نادیدہ ہاتھ نے تیلی دکھادی۔ ایک لمحے کے لیے میں اپنے ہوش و حواس میں نہ رہا۔ میں نے اسے یونہی اٹھائے اٹھائے گھمایا اور کسی چھوٹے موٹے شہتیر کی طرح دیوار پر دے مارا۔

وہ دھم سے نیچے گرا۔ ذبح ہونے والی مرغی کی طرح ایک لمحے کے لیے پھڑکا اور ساکت ہوگیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے اسے دیوار پر نہیں' ایک کھڑکی میں دے مارا تھا۔ وہی کھڑکی جس میں کچھ دیر پہلے زرتاج کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کھڑکی میں موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور جانو سر کے بل ان سلاخوں سے جاکر ٹکرایا تھا۔ اس کی کھوپڑی کسی تربوز کی طرح چٹخ گئی تھی اور دو تین جگہ سے پچک گئی تھی۔ گاڑھا گاڑھا مواد آمیز سا خون اس کے بالوں کے درمیان سے پھسلتا باہر آنے لگا تھا۔

میں نے گھوم کر زرتاج کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک ایک ہاتھ سے اپنی گردن مسل رہی تھی اور دوسرے بازو کو جھٹکے دے رہی تھی۔ اس کی گردن سرخ اور چہرہ کچھ متورم سا نظر آرہا تھا۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچا۔

"تم ٹھیک تو ہو نا؟" میں نے اس کا بازو تھامتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

"ہاں.... ٹھیک ہی ہوں...." اس نے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں جواب دیا اور مسکرانے کی کوشش کی۔ "البتہ میرا یہ بازو چند سیکنڈ اور اس کی گرفت میں رہتا تو شاید میرا کندھا اتر جاتا۔" وہ بازو کو بدستور جھٹکے دیتے ہوئے بولی۔ "اور شاید گردن کا منکا بھی ٹوٹ جاتا۔"

پھر وہ گہری سانس لے کر آگے بڑھتی ہوئی بولی "کیا یہ خبیث مرگیا؟"

"اگر اب بھی نہ مرا ہو تو میں اسے کوئی مافوق الفطرت مخلوق ہی سمجھوں گا۔" میں نے کہا۔

ہم دونوں جانو کے قریب آکھڑے ہوئے جو قالین پر چت پڑا تھا۔ اس کی شکل بری طرح مسخ ہوگئی تھی۔ وہ کافی ڈراؤنا لگ رہا تھا حالانکہ خوش شکل آدمی تھا۔ اس کے نتھنوں سے بھی خون بہہ رہا تھا اور کھوپڑی تو پوری ہی سرخ سے ملغوبے میں لتھڑ چکی تھی۔ اس کا سینہ ساکت دکھائی دے رہا تھا۔ سانسوں کے زیروبم کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

"میرا اسے چھونے کو دل نہیں چاہ رہا.... ورنہ میں اس کی نبض دیکھنے یا دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کرتی...." ایک لمحے کی خاموشی کے بعد زرتاج بولی۔ اس کے لہجے میں اب بھی نفرت تھی۔

"لیکن.... میرا خیال ہے یہ مرچکا ہے...." جانو کی موت کے بعد بھی زرتاج کے لہجے میں نفرت کم نہیں ہوئی تھی۔

"ہاں۔" میں نے بھی جانو کو چھوئے بغیر وثوق سے جواب دیا "یہ واقعی مرچکا ہے۔"

تب گویا زرتاج پر یکدم ہی تھکن نے غلبہ پالیا۔ وہ قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئی اور تھکے تھکے سے انداز میں پشتے سے ٹیک لگالیا۔ کمرا عجیب ہی منظر پیش کررہا تھا۔ پانچ لاشیں ادھر اُدھر آڑی ترچھی پڑی تھیں' جگہ جگہ خون پھیلا نظر آرہا تھا۔ گو کہ قالین رنگین اور دبیز تھا' خون اس میں تیزی سے جذب ہوچکا تھا' اس کے باوجود گرے گرے گیلے داغ نظر آرہے تھے۔

میں بھی زرتاج کے قریب جا بیٹھا۔ چند لمحے کے لیے میرے اعصاب کو بھی سکون کی ضرورت تھی۔ زرتاج گہری سانس لے کر بولی "حد سے زیادہ فرعونیت پر اُتر آنے والوں کی کہانی کبھی کبھی یوں صرف چند لمحوں میں ختم ہوجاتی ہے۔"

"ہاں.... لیکن باقی فرعون اس سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

دفعتاً اس نے گردن موڑ کر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اب وہ گویا ایک نئے ہی زاویۂ نظر سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ پھر وہ دھیمی سی آواز میں بولی۔ "تم یقیناً ایک غیر معمولی شخص ہو۔ تمہارے اندر بھی کوئی شیطانی روح متعین ہے۔"

"شیطانی....؟" میں نے مجروح سے لہجے میں کہا۔ "یہ شبہ آپ کو کیونکر ہوا؟"

"جس سفاکی سے تم نے جانو کو اٹھا کر ایک کھلونے کی طرح

ایک کھڑکی سے دے مارا' مجھے اس پر یقین نہیں آرہا۔ اس وقت میں نے ایک لمحے کے لیے تمہارا چہرہ دیکھا تھا۔ میں نے زندگی میں ایسی سفاکی شاید کسی انسان کے چہرے پر نہیں دیکھی....." اس نے خفیف سی جھرجھری لی۔

فرعونوں سے نمٹنے کے لیے ایسی ہی سفاکی کی ضرورت ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "جس کے دل میں فرعونوں کے لیے بھی نرم گوشہ ہوگا' وہ طاقت ور ہونے کے باوجود اس سے نہیں نمٹ سکتا....."

وہ خاموشی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میرے اندر جو روح مقیّد ہے' اسے آپ شیطانی ہرگز نہیں کہہ سکتیں۔ وہ تو ایک شریف روح ہے۔ اس سے آج تک کسی شریف آدمی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔"

"لیکن فرعون صفت لوگ ضرور انجام کو پہنچے ہیں؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔" میں نے انکار نہیں کیا۔

وہ ایک لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ "ٹھیک ہے..... میں اپنے وہ 'شیطانی روح' والے الفاظ واپس لیتی ہوں۔"

"شکریہ۔" میں نے گردن کو ذرا خم دیتے ہوئے نہایت شائستگی سے کہا۔

اچانک وہ چونکی اور جھرجھری سی لے کر یکدم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "اف..... خدایا.....! ہم تو یوں آرام سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے ہیں گویا پکنک پر آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں حویلی کے محافظوں کی خبر لینی چاہیے۔ معلوم نہیں وہ زندہ بھی ہیں یا مر گئے..... اور ہاں..... جانو نے کہا تھا کہ اس کے آدمیوں نے حویلی کو بھی گھیرے میں لے رکھا ہے۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس کی بات کا کچھ زیادہ یقین نہیں لیکن ہمیں بہرحال محتاط رہنا چاہیے۔ اگر باہر واقعی آدمی موجود ہیں تو فائرنگ کی آوازیں یقیناً ان تک پہنچ چکی ہوں گی اور وہ صورت حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔"

زرتاج نے جھک کر ایک کلاشنکوف اٹھالی۔ میں نے دوسرے ڈاکو کی گن اٹھالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"اس وقت اگر ہمارے پاس دو مارٹر رائفلیں موجود ہوتیں تو اچھا تھا۔" میں نے کہا۔

"میرے پاس تہ خانے میں چند رائفلیں موجود ہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔" وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

"اس طرح یکدم منہ اٹھا کر باہر نہ نکلیں....." میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔ "اور پہلے اس کمرے کی بتیاں بجھا دیں۔"

وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی پھر اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ اندھیرے میں ہم دونوں شانہ بشانہ کمرے کے دروازے تک پہنچے۔

"رکوع کی سی حالت میں چوکھٹ سے لگ کر باہر نکلیں اور نکلتے ہی پہلے چند لمحے کے لیے دیوار سے لگ کر صورت حال کا جائزہ لیں۔" میں نے سرگوشی میں اسے ہدایت کی۔

یہ احتیاط ہمارے کام آگئی اور یہ بھی ہماری خوش قسمتی ہی تھی کہ ہم بڑے صحیح وقت پر کمرے سے نکل آئے تھے۔ اگر ہم صرف چند لمحے وہیں بیٹھے رہتے تو نہ جانے ہمارا کیا انجام ہوتا۔

باہر نکلتے ہی ہم کمرے کی دیوار سے چپک گئے تھے۔ دوسرے ہی لمحے زرتاج میری ہدایت کے بغیر ہی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ میں نے اس کی تقلید کی۔ میں نے بھی ملگجے اندھیرے میں چند سائے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ لیے تھے۔ میں اور زرتاج اس وقت برآمدے میں تھے جو ذرا اونچا تھا۔ دو سیڑھیاں چڑھ کر اس میں قدم رکھا جاتا تھا۔

اس وقت حویلی کی شاید سبھی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ ہر طرف پُراسرار' ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا جو اپنے دامن میں نہ جانے کیا کچھ چھپائے ہوئے تھا۔ نشیب میں وہ سات آٹھ سائے تھے جو آہستگی سے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن کمرے کی بتیاں بجھنے کے بعد شاید انہیں کسی گڑبڑ کا احساس ہوگیا تھا۔ انہوں نے بکھرنا شروع کردیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ سیدھے دروازے کی طرف آنے کے بجائے چاروں طرف سے کمرے کو گھیرے میں لینا چاہتے تھے۔

"کیا یہ آپ کے آدمی ہیں؟" میں نے سرگوشی میں زرتاج سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں ہیولے دیکھ کر ہی بتا سکتی ہوں کہ یہ میرے آدمی نہیں ہیں۔ ویسے بھی انہیں اس طرح کمرے کی طرف بڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟" زرتاج نے سرگوشی میں ہی جواب دیا۔

"تو پھر بے دریغ انہیں اُڑا دینا چاہیے۔" میں نے بلا تامل کہا۔ "اگر یہ حویلی میں اِدھر اُدھر بکھر گئے اور اِدھر اُدھر عمارت کی آڑ لے کر مورچہ بند ہوگئے تو ہمارے لیے ان سے نمٹنا مشکل ہوجائے گا۔"

سائے رکوع کی سی حالت میں اِدھر اُدھر بڑھ رہے تھے۔ میری اور زرتاج کی کلاشنکوفیں بیک وقت گرجیں اور یہ سائے تقریباً ایک ساتھ ہی اِدھر اُدھر لڑھک گئے۔ کوئی ہوا میں اچھلا' کوئی لہرایا اور کوئی جہاں کا تہاں ڈھیر ہوگیا۔ فضا میں گھٹی گھٹی دو تین چیخیں بھی ابھریں۔ اس کے بعد گہرا سکوت چھا گیا۔ موت جیسے بار بار اس خوب صورت حویلی میں بھیانک قہقہے بلند کرتی تھی' کچھ لوگوں کا لہو چاٹتی تھی اور اس کے بعد سکوت چھا جاتا تھا۔

"کیا یہ سب مر گئے ہوں گے؟" زرتاج نے عجیب سادگی اور معصومیت سے پوچھا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا کہ جیسے ہم نے کلاشنکوفوں سے گولیاں نہیں برسائی تھیں' کھلونے چلائے تھے۔

"انشاءاللہ۔" میں نے خلوص سے جواب دیا۔

کافی دیر تک ہم دبکے رہے لیکن ہمیں کہیں اور کسی قسم کی نقل و حرکت کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ ہم نے برآمدے کے کونے سے جھانک کر اِدھر اُدھر دیکھا' ہر طرف سکوت تھا۔

"میرا خیال ہے' اب ادھر کی بتیاں روشن کردی جائیں۔" زرتاج مشورہ طلب انداز میں بولی۔

"نہیں۔" میں نے اسے روکا۔ "اندھیرے میں ہی باہر چل کر دیکھتے ہیں کہ کیا صورت حال ہے۔"

وہاں اندھیرا کچھ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ میں آسانی سے کافی دور تک کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ مجھے روشنی کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ میں اس سے گہرے اندھیرے میں بھی خاصی دور تک کی چیزیں دیکھ لیتا تھا اور اندھیرے میں ہی اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس کرتا تھا۔ کسی خطرناک صورت حال میں روشنی میں پہنچتے ہی مجھے کچھ ایسا احساس ہوتا تھا جیسے میں کسی کے لیے آسان ہدف بن گیا ہوں۔

برآمدے سے نیچے اترنے سے پہلے ہم نے احتیاطاً کمروں کے گرد ایک چکر لگایا تاکہ چاروں طرف کا کچھ اور بہتر طور پر جائزہ لے سکیں۔ اسی دوران ایک کمرے سے گھگھیاہٹ آمیز سی کچھ گھٹی گھٹی آوازیں سنائی دیں۔ باہر سے اس کمرے کے بولٹ چڑھے ہوئے تھے۔

زرتاج اس کے سامنے رکتے ہوئے بولی۔ "اس میں یقیناً گھریلو ملازم اور ملازمائیں بند ہیں۔"

اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا تو کمرے میں بیک وقت کئی خوفزدہ سی آوازیں بلند ہوئیں۔ کمرے کے اندر بھی اندھیرا ہی تھا۔

"ڈرو مت۔ یہ میں ہوں۔" زرتاج نے کمرے میں جھانکتے ہوئے نہایت نیچی آواز میں کہا۔ وہ کمرا چھوٹا سا تھا لیکن اس میں بہت سے افراد بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھنسے ہوئے تھے۔

"رئیسانی جی! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے آپ خیریت سے ہیں....." کسی عمر رسیدہ مرد نے گہری سانس لے کر کہا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں..... بس ذرا حویلی میں کچھ ڈاکو گھس آئے تھے..... وہ سب مارے جاچکے ہیں۔" زرتاج نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "تم لوگ اپنے اپنے ٹھکانے پر جاؤ۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ جس جس کو جو ہتھیار مل سکے وہ اپنے ساتھ رکھے..... اور ہاں..... خیال رہے..... ڈرائنگ روم میں اور باغیچے کے قریب احاطے میں کچھ لاشیں بکھری پڑی ہیں..... فی الحال کوئی انہیں ہاتھ نہ لگائے۔"

"رئیسانی جی! ہمیں تو عبدل نے دھوکے سے یہاں لاکر بند کردیا تھا۔" ایک اور شخص نے گویا صفائی پیش کی۔

"کوئی بات نہیں..... کوئی بات نہیں۔" زرتاج نے گویا انہیں

تسلی دی۔ "ممبل بھی مرچکا ہے۔" پھر آگے بڑھنے سے پہلے وہ بولی۔ "کوئی بتی نہ جلائے۔ ٹارچیں وغیرہ تلاش کرو۔ اگر زیادہ ہی ضرورت پڑے تو ان سے کام چلانے کی کوشش کرنا۔ میں اور افضل خان حالات کا جائزہ لینے باہر جارہے ہیں۔"

ہم دروازہ کھلا چھوڑ کر سیڑھیوں کی طرف چل دیے۔ راستے میں زرتاج بولی۔ "یہ سب بے چارے گھریلو قسم کے کام کاج کرنے والے سیدھے سادے لوگ ہیں۔ انہوں نے شاید کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ڈاکو اس حویلی میں بھی گھس سکتے ہیں۔"

ہم ابھی سیڑھیوں سے اترے ہی تھے کہ دور کہیں یکدم خوفناک فائرنگ شروع ہوگئی۔ ہم دونوں ہی ٹھٹک کر رہ گئے۔

"یہ آوازیں تو گاؤں کی طرف سے آرہی ہیں۔" زرتاج بولی لیکن اس کے لہجے میں کچھ زیادہ تشویش نہیں تھی۔

"میرا خیال ہے جانو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا....." میں نے کہا۔ "اس نے حویلی کے باہر بھی آدمی کھڑے کیے ہوئے تھے اور شاید گاؤں کو بھی کچھ لوگوں نے گھیر رکھا تھا۔ انہیں چونکہ بہت دیر سے سگنل نہیں ملا اور انہوں نے حویلی کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں بھی سنی ہوں گی۔ انہوں نے اندازہ لگایا ہوگا کہ حویلی میں کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے لہٰذا انہوں نے اب جانو کے بغیر ہی گاؤں پر حملہ کردیا ہے....."

"تمہارا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے۔" زرتاج بولی۔

"ہمیں جلدی ان کی مدد کو پہنچنا چاہیے..... ڈاکو کہیں بے گناہ اور سیدھے سادے، نہتے دیہاتیوں کا قتل عام نہ شروع کردیں۔ ہم جس حد تک بھی انہیں روک سکتے ہوں، چل کر روکنے کی کوشش کریں۔" میں نے تیزی سے کہا۔

زرتاج غالباً میرے لہجے کی تشویش کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔ "تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکو نہ تو آسانی سے گاؤں میں گھس سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی بڑی کارروائی کرسکتے ہیں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے جانو کے تیور دیکھتے ہوئے کافی عرصے سے خطرہ تھا کہ گاؤں میں کبھی اس قسم کی کوئی صورت حال پیش آسکتی ہے اور ڈاکو عام طور پر وار کرنے..... کسی بستی والوں کو ستانے یا انتقام لینے کے لیے یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ شب خون مارنے کے انداز میں حملہ کرتے ہیں..... گھروں اور حویلیوں کو آگ لگاتے ہیں، لوگوں کو قتل کرتے ہیں۔ کئی دیہات اور قصبوں وغیرہ میں ایسا ہوچکا ہے۔ چنانچہ میں نے احتیاطاً نہایت خاموشی سے گاؤں کی حفاظت کا ایک نظام ترتیب دیا تھا۔ گاؤں میں چاروں طرف چند خاص خاص مکانات منتخب کیے گئے تھے جن کی چھتوں پر مورچے بھی لگے ہوئے ہیں اور وہاں کے مردوں کو اسلحہ بھی فراہم کیا گیا تھا۔ وہ لوگ باری باری، ایک ایک رات چھت پر پہرا دیتے ہیں اور اردگرد نقل و

تنہا لڑکی

اسلم راہی ایم اے قیمت:-/150

طنز و مزاح

منتخب مزاح پارے	ضیاء ساجد	00/-
ممتاز ادیبوں کے منتخب خاکے	ضیاء ساجد	20/-
منتخب شگفتہ شہ پارے	ضیاء ساجد	00/-
سرجیکل وارڈ	ضیاء ساجد	00/-
مزاح مزے کا	ضیاء ساجد	50/-
منتخب شاہکار شخصی خاکے	ضیاء ساجد	00/-
منتخب مزاحیہ مضامین	ضیاء ساجد	20/-

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور نمبر2

حرکت پر نظر رکھتے ہیں۔ لہٰذا آج ڈاکوؤں کو منہ توڑ جواب ملے اور وہ گاؤں میں داخل نہیں ہوسکیں گے۔ جو لوگ پہرے پر ہوں گے وہ تو مقابلہ کررہے ہوں گے لیکن جن لوگوں کی آج پہرے کی باری نہیں ہوگی وہ بھی مکانوں کے اندر ہی اندر ان کی مدد کو پہنچ جائیں گے....."

پھر وہ ایک لمحے کے لیے کان لگا کر سننے کے بعد بولی۔ "ذرا غور سے سنو..... تمہیں اندازہ ہوجائے گا کہ فائرنگ دو طرفہ ہو رہی ہے۔"

"ہاں..... مجھے اندازہ ہوچکا ہے۔" میں نے کہا۔ "کتنے افسوس کی بات ہے، ہم اپنے ہی ملک میں بعض مقامات پر تو گویا حالتِ جنگ میں زندگی گزار رہے ہیں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" ایک لمحے کے لیے اس کے لہجے میں بھی افسردگی جھلک آئی لیکن پھر وہ سر جھٹکتے ہوئے بولی۔ "بہرحال..... ہم ان کی مدد کے لیے ضرور چلیں گے۔ مجھے امید ہے کہ ہم دونوں کے جانے سے کافی فرق پڑ جائے گا۔"

"یقیناً۔" میں نے وثوق سے کہا۔ "لیکن کم از کم دو عدد دوربار رائفلیں اور کافی مقدار میں ایمونیشن ضرور ساتھ لے لیں۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ میرے ساتھ آؤ....." وہ تیزی سے واپس پلٹی۔ ہم برآمدے میں آئے اور ایک راہداری میں دوڑتے ہوئے تہ خانے کی پچھلی طرف پہنچے۔ یہاں ایک جگہ سے سیڑھیاں نیچے جارہی تھیں۔

ہم تیزی سے نیچے پہنچے۔ تہ خانے میں پہنچ کر زرتاج نے بتی جلا دی۔ وہ ایک طویل و عریض تہ خانہ تھا اور پورا کا پورا مختلف قسم کے سازوسامان سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے ایک حصے میں گویا اسلحے کا "شو" قائم تھا۔ اس طرف شیلفوں میں کئی طرح کی عمدہ گنیں بھری ہوئی تھیں۔ ایمونیشن کے کارٹن موجود تھے۔ ایک شیلف میں نیاموں سمیت کچھ خنجر بھی تھے۔ حتیٰ کہ ایک الماری میں کچھ تلواریں بھی لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ شاید پرانے وقتوں کی یادگاریں تھیں۔

ہم نے دو نمبر رینج کی رائفلیں منتخب کیں۔ ایک بیگ کو جھاڑ کر جلدی جلدی اس میں کچھ تیار میگزین اور گولیاں بھریں اور دوڑتے ہوئے واپس آئے۔ زرتاج لمبے چوڑے ڈرائیو وے میں کھڑی ایک سیاہ جیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "اس میں چلتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے....." میں نے سرہلایا۔ "آپ ڈرائیو کریں اور ہیڈلائٹس آف ہی رہنے دیں۔ جو پگڈنڈی عام طور پر آمدورفت کے لیے استعمال ہوتی ہے اس راستے سے مت چلیے گا، جدھر سے میں کہوں اُدھر سے چلیے گا۔"

"یس سر!" اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر باقاعدہ مجھے سیلوٹ کیا۔ "اس وقت کمانڈنگ آفیسر آپ ہیں۔ میں آپ کی ہدایات پر عمل کروں گی۔ علاقہ میرا ہے لیکن بہتر جرنیل آپ ہیں۔"

میں نے مسکرانا چاہا لیکن مسکرا نہ سکا۔ فائرنگ کی آوازوں سے بدستور سکوتِ شب درہم برہم تھا۔ ہمارے پاس جو دو کلاشنکوفیں پہلے سے موجود تھیں ہم نے وہ بھی گاڑی میں رکھ لیں۔ زرتاج نے بڑا سا ایک خنجر بھی ساتھ لے لیا تھا۔ زرتاج نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ہم ہیڈلائٹس آن کیے بغیر حویلی سے باہر آگئے۔ بلند و بالا چوبی گیٹ کھلا پڑا تھا۔

باہر گیٹ کے قریب لمبی چوڑی، بھاری بھرکم چارپائی پر چاروں گارڈ اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ زرتاج نے گاڑی چارپائی کے قریب روک لی اور اتر گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ اتر گیا اور محافظوں کا جائزہ لینے لگا۔ وہ بے ہوش تھے لیکن زندہ تھے۔ ان کی گنیں غائب تھیں۔ چارپائی کے قریب ہی ایک تپائی پر چائے کے برتن بکھرے ہوئے تھے۔ بے ہوشی کے بعد محافظوں کے ہاتھ پاؤں بھی باندھ دیے گئے تھے۔ جانو کے لیے یہ خدمت عبدل نے انجام دی تھی۔

زرتاج نے خنجر سے ان کی بندشیں کاٹ دیں۔ وہ چار محافظ تو اسی چارپائی پر گیٹ کے پاس ہی موجود رہتے تھے۔ دو نئے محافظ اور بھی تھے جو حویلی کے گرد گشت کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے کبھی کوئی آرام کے لیے چلا جاتا اور کبھی کوئی۔ بہرحال چار پانچ افراد تقریباً ہر وقت ڈیوٹی پر موجود رہتے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ باقی دو تین بھی حویلی کی دیواروں کے آس پاس ہی کہیں لڑھکے پڑے ہوں گے۔

"شکر ہے ان منحوسوں نے اس عالم میں انہیں ہلاک نہیں کیا۔" زرتاج ان سب کو وہیں چھوڑ کر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

"اس کا ارادہ پہلے آپ سے جواب لینے کا تھا۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "یہ یقین ہونے کے بعد..... کہ آپ اس کا کوئی مطالبہ نہیں مانیں گی..... وہ کشت و خون کا بازار گرم کردیتا۔ اس کے اندر کا درندہ آج پوری طرح بیدار تھا۔"

پروفیسر ایم اشرف ایم - اے

شاہ فاروق حاکم مصر	50/-
شاہ فیصل شہید	50/-
ہٹلر کی حیات معاشقہ	90/-
ہٹلر کے آخری دس دن	75/-
ہٹلر اور نازی جرمنی	75/-
سکندر اعظم	90/-
نپولین بوناپارٹ	75/-
رومانی شاعر لارڈ بائرن کی حیات معاشقہ	60/-
مہاراجہ رنجیت سنگھ اور ان کی عیاشیاں	75/-
ہر دور ہٹلر کی کہانی	100/-

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

"حد سے زیادہ تند خو درندے اکثر اسی طرح موت کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "وہ مجھے شاید کوئی گائے بھینس سمجھتا تھا کہ جب جی چاہے گا' رسّی گلے میں ڈال کر کھینچتا ہوا لے جائے گا۔ میں ہی اس علاقے میں اس کے راستے میں سب سے بڑی دیوار بھی تھی ورنہ باقی سب زمینداروں میں سے کچھ کو تو اس نے نکیل ڈال رکھی تھی اور کچھ سے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔ اب وہ مجھے سرنگوں کرنا چاہتا تھا۔"

"بے چارے کی بازی بالکل ہی اُلٹ گئی۔" میں نے کہا۔ "ادھر اس کے ساتھیوں نے بھی گاؤں کو بالکل مفتوحہ علاقہ سمجھ کر گھسنے کی کوشش کی ہوگی تو گولیوں نے ان کا استقبال کیا ہوگا۔"

"شکر ہے میں نے رات کی چوکیداری کے اس منصوبے کی خبر عام نہیں ہونے دی تھی۔ عبدل کو تو بالکل پتا نہیں تھا ورنہ یہ اطلاع بھی جانو کو پہنچ چکی ہوتی۔" زرتاج بولی۔ وہ ایک پرچھائیں کی طرح میرے برابر بیٹھی تھی اور ہم گھنے درختوں کے درمیان ایک اور ہی ناہموار راستے سے گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ میری کوشش تھی کہ کسی بھی کمین گاہ میں موجود کوئی بھی ڈاکو ہماری گاڑی کو آتے نہ دیکھ سکے۔ ویسے اس کا خطرہ کم ہی تھا کیونکہ گاڑی کا رنگ سیاہ تھا اور وہ اندھیرے میں تو کچھ فاصلے سے مشکل سے ہی نظر آسکتی تھی۔ اس کے انجن کی آواز بھی برائے نام تھی۔ فائرنگ کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔

درختوں کا سلسلہ ختم ہونے لگا تو میں نے کہا۔ "بس.... گاڑی یہیں روک دیجئے۔ باقی فاصلہ ہم پیدل طے کریں گے۔ اس دوران شاید کچھ اندازہ ہو جائے کہ ڈاکو کہاں کہاں چھپے ہوئے ہیں۔"

زرتاج نے گاڑی روکی ہی تھی کہ ایک زوردار چھناکا ہوا اور زرتاج یکدم مجھ پر آن گری۔

میں نے بوکھلا کر اندھیرے میں زرتاج کو ٹٹولا لیکن وہ میرا ہاتھ ہٹاتے ہوئے جلدی سے بولی۔ "بس.... بس۔ میں ٹھیک ہوں۔"

میں نے اطمینان کی طویل سانس لی۔ گولی اسے نہیں لگی تھی۔ اس نے چند سیکنڈ مزید انتظار کیا اور جب دوسری گولی نہیں آئی تو وہ پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ میں اس وقت ٹارچ روشن کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا کیونکہ پہلی گولی تو شاید "آوارہ" تھی۔ یونہی بھٹک کر ادھر آنکلی تھی لیکن روشنی دیکھ کر دوسری گولی کوئی نشانہ باندھ کر بھی چلا سکتا تھا۔

میں نے اندھیرے میں اتنا ضرور دیکھ لیا کہ ونڈ اسکرین کے ایک کونے میں سوراخ ہو چکا تھا اور کافی بڑے حصے میں مکڑی کا جالا سا پھیل گیا تھا تاہم پوری ونڈ اسکرین نہیں ٹوٹی تھی۔ گولی شاید زرتاج کے کندھے پر سے ہوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ وہ اپنی گود میں ہاتھ مار کر کچھ جھاڑنے لگی۔ شاید کچھ کرچیاں اس کی گود میں آن گری تھیں۔

چند لمحے ہم دونوں ساکت رہے لیکن ہماری سمت میں مزید کوئی فائر نہیں ہوا۔ گاؤں کی طرف سے البتہ دو طرفہ فائرنگ کی آوازیں اسی طرح سنائی دے رہی تھیں۔ میں اور زرتاج دو مار رائفلیں ہاتھ میں لیے اور ایک ایک بیگ کندھے سے لٹکائے پجیرو سے اتر آئے۔ خاصا فاصلہ ہم نے کمانڈوز کی طرح رکوع کی سی حالت میں طے کیا اور ایک کچی دیوار تک جا پہنچے۔

وہ درحقیقت ایک بہت بڑے باغ کی چار دیواری تھی۔ ہمیں اندازہ ہو چکا تھا کہ ڈاکو اس باغ میں مورچہ بند تھے۔ وہ یقیناً بڑے اچھے اور طے شدہ منصوبے کے تحت آئے تھے اور "جنگی" حکمتِ عملی کے اعتبار سے انہوں نے بہت اچھی جگہ منتخب کی تھی۔ باغ میں وہ یقیناً چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ شاید درختوں پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔ یوں گاؤں کا بیشتر حصہ ان کی فائرنگ کی زد پر تھا جبکہ وہ خود گویا بنے بنائے مورچوں میں تھے۔

میں نے چند لمحے فائرنگ کی آوازیں سن کر کچھ اندازے قائم کیے اور نیچی آواز میں زرتاج سے کہا۔ "میں زمین پر بیٹھتا ہوں' تم میرے کندھوں پر چڑھ کر اس دیوار سے اندر کود جاؤ۔"

"اس دیوار پر چڑھنے کے لیے مجھے تمہارے کندھوں پر چڑھنے کی ضرورت نہیں۔" وہ اطمینان سے بولی۔ اس نے اپنی گن اور بیگ مجھے تھمایا اور بازو اونچے کر کے ہاتھ دیوار پر جمائے۔ دوسرے ہی لمحے اس کے جسم نے ناگن کی طرح بل کھایا اور ایک بندریا کی سی پھرتی سے وہ دیوار پر چڑھ گئی۔ گو کہ اس کے لیے میرے ذہن میں آنے والی یہ دونوں تشبیہات مجھے قطعاً اچھی نہیں لگی تھیں۔ وہ نہ تو ناگن کی طرح زہریلی تھی اور نہ ہی بندریا کی طرح مضحکہ خیز لیکن صرف لچک اور پھرتی اس میں ان دونوں جیسی نظر آئی تھی۔

دیوار پر بیٹھ کر اس نے جھک کر مجھ سے گنیں اور بیگ لیے۔ دوسرے ہی لمحے میں بھی دیوار پر چڑھ گیا۔ ہم بہ خیر و عافیت باغ میں کودنے میں کامیاب ہو گئے۔ کسی گولی نے ہمارا استقبال نہیں کیا۔ گو کہ گاؤں کی سمت میں فائرنگ بدستور جاری تھی۔

ہم عقب سے باغ میں داخل ہوئے تھے اور دیوار سے لگ کر بیٹھ گئے تھے۔ زرتاج نیچی آواز میں بولی۔ "میں اس طرف جاتی ہوں.... تم اس طرف جاؤ.... قسمت میں ہوا تو دروازے کی طرف ہم پھر آن ملیں گے...."

اس کا مقصد تھا کہ ہم دونوں دائیں بائیں طرف سے باغ کے گرد ہوتے ہوئے جتنے بھی ڈاکوؤں کو تلاش کر کے ہلاک کر سکیں' کر دیں اور بتدریج آگے بڑھتے رہیں حتیٰ کہ باغ کے گیٹ کی طرف ہم ایک دوسرے کے سامنے آجائیں لیکن فی الحال اسے محض ایک خواب یا تمنا بھی کہا جا سکتا تھا کیونکہ راستے میں خود ہمارے مارے جانے کا بہت زیادہ امکان تھا۔ ہم کسی درخت کو مورچہ نہیں بنا سکتے تھے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کس درخت پر ڈاکو موجود ہیں یا کہاں درختوں کے درمیان کوئی مورچہ بند ہو۔

اس تجویز کا ایک اچھا پہلو یہ تھا کہ اگر ہم دونوں کمانڈوز کے مخصوص انداز میں تیزی سے فائرنگ کرتے اور گرینڈ پھینکتے ہوئے ساتھ ہی نہایت پھرتی سے پوزیشن بدلتے ہوئے اپنے آپ کو بچا کر آگے بڑھ سکتے تو ڈاکوؤں کو یہ تاثر مل سکتا تھا کہ انہیں گھیرے میں لینے کے لیے کچھ لوگ یا پولیس فورس وغیرہ باغ میں گھس گئی ہے۔ ادھر انہیں جانو کی طرف سے کوئی سگنل نہیں ملا تھا۔ وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو سکتے تھے۔

اس روشن پہلو کے باوجود میں نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا اور کہا۔ "ہم اکٹھے ہی رہیں گے.... خواہ زندہ رہیں یا مر جائیں۔"

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ باغ میں تاریکی ذرا گہری محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے بھی دور تک کی چیزیں دیکھنے میں دقت پیش آنے لگی تھی لیکن میں کم از کم اس کا چہرہ.... اس کی آنکھیں تو اچھی طرح دیکھ ہی سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے روشنی سی آئی اور معدوم ہو گئی۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "آپ کا میرے ساتھ رہنا اس لیے ضروری ہے کہ اس باغ کے راستوں سے آپ زیادہ

لازوال
کہانیوں کے خالق
انوار صدیقی
کے
شاہکار ناول

خبیث (۵ حصے) -/۲۰۰
برہمچاری -/۵۰
درخشاں (۲ حصے) -/۱۰
رقصِ ابلیس -/۵۰
آسیب زدہ -/۱۰
دستک -/۰۰

مکتبہ القریش
اُردو بازار لاہور۲
فون ۷۲۲۴۶۶۵

رومانی ناول

دل کا آنگن	سلمیٰ رعنا	75/-
کالے کنول	سلمیٰ رعنا	75/-
اور دیا جلتا رہا	سلمیٰ رعنا	100/-
موج گرداب	سلمیٰ رعنا	100/-

مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور2

اچھی طرح واقف ہیں اور میرا خیال ہے لڑائی کی ٹیکنک میں آپ سے بہتر جانتا ہوں۔"

"ممکن ہے یہ محض تمہارا خیال ہی ہو۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔" وہ مسکرائی۔ ان حالات میں بھی وہ وحشت زدہ نہیں تھی۔ انسان کو آدھی فتح تو اسی طرح حاصل ہوجاتی ہے کہ اس کے اعصاب شکست نہ کھائیں۔

"بعض اوقات خیال، حقیقت سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔" میں نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس نے دوسری طرف جانے کا ارادہ ترک کردیا اور ہم دونوں دیوار سے لگ کر کھسکنے لگے۔

فائروں کی آوازوں سے مجھے اب کافی حد تک اندازہ ہونے لگا تھا کہ ڈاکو کہاں کہاں موجود تھے لیکن درختوں کے جھنڈ میں سے انہیں نکالنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کوشش میں خود ہماری موجودگی ظاہر ہوسکتی تھی اور ہم فی الحال کسی محفوظ پوزیشن پر نہیں تھے۔

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا اور میں نے باغ کے ایک حصے میں ایک ثانیے کے لیے روشنی کا جھماکا دیکھا۔ ہم کچھ اور نیچے ہوکر دیوار کی جڑ میں دبک گئے۔ پے در پے دو تین اور ایسے ہی دھماکے ہوئے۔ فائرنگ کی آواز ان میں دب کر رہ گئی۔

"یہ تو گرینیڈ استعمال ہورہے ہیں!" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔ میرے گاؤں کے لوگ استعمال کررہے ہیں۔" زرتاج اطمینان سے بولی۔ "ڈاکوؤں کی دہشت گردیوں نے انہیں بھی پورا پورا کمانڈو بنا دیا ہے۔ حالانکہ ہمارا گاؤں آج تک محفوظ ہی چلا آرہا تھا لیکن دہشت گردیوں کے قصے بہرحال سنتے آرہے تھے۔ اچھا ہی ہوا کہ میں نے ان لوگوں کو اس قسم کی صورت حال کے لیے تیار رکھا تھا۔ تم دیکھ رہے ہو۔۔۔؟ حملہ بالکل اسی طرح ہوا ہے جیسے دشمن ملک کی فوج چڑھائی کرنے کے لیے آئی ہو۔"

اسی دوران گاؤں کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں مجھے قریب آتی محسوس ہونے لگیں تھیں۔ زرتاج بولی۔ "گاؤں والے پیش قدمی کررہے ہیں۔" تب مجھے معلوم ہوا کہ اندازے لگانے میں زرتاج بھی کچھ ایسی اناڑی نہیں تھی۔ ہم خاصا آگے پہنچ چکے تھے لیکن ابھی تک ہم نے ایک بھی فائر نہیں کیا تھا۔

ہم ایک لمحے کے لیے رکے تو زرتاج سرگوشی میں بولی۔ "ذرا آگے مالی کا کمرا ہے۔ اس کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ وہ بہت اچھا مورچہ ثابت ہوسکتا ہے۔ دعا کرو کہ ہم خیریت سے اس تک پہنچ جائیں۔" اس بار میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے درمیان اس کی سرگوشی بہ مشکل سن پایا۔ جب سے باغ میں گرینیڈ آکر گرے تھے، مجھے باغ میں کچھ ہلچل کا سا احساس ہورہا تھا۔ میں درختوں کے درمیان کچھ دیکھ تو نہیں پا رہا تھا لیکن محسوس کررہا تھا کہ وہاں کچھ بھاگ دوڑ سی شروع ہوچکی تھی۔

اچانک زرتاج کا گرم و گداز ہاتھ مضطربانہ انداز میں میرے ہاتھ پر آٹکا اور وہ مجھے ایک طرف متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ "وہ دیکھ رہے ہو؟"

میں نے اس کے اشارے کی سمت میں دیکھا۔ واقعی ایک کمرے کا ہیولا نظر آرہا تھا جس کے آس پاس شاید کچھ باڑھ وغیرہ بھی تھی۔ وہ بولی۔ "یہی مالی کا وہ کمرا ہے جسے میں مورچہ بنانے کی بات کررہی تھی۔۔۔"

لیکن اب یقیناً اس کا اشارہ کمرے کی طرف نہیں، اس کی چھت کی طرف تھا جس پر چند ہیولے متحرک نظر آرہے تھے۔ ان ہیولوں کے درمیان ایک غیر متحرک چیز بھی دکھائی دے رہی تھی۔ انسانی ہیولے تین ٹانگوں والی اس چیز کو سیٹ کررہے تھے۔

"تمہیں اندازہ ہوا وہ کیا ہے؟" زرتاج نے پوچھا۔

"ہاں۔ راکٹ لانچر ہے۔ آخر وہ گاؤں والوں کو گرینیڈز کا جواب تو دیں گے۔" میں نے کہا۔ میں اندھیرے میں ان ہیولوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور مجھے کچھ عرصہ قبل ایک دور دراز مقام پر دیکھا ہوا تقریباً ایسا ہی ایک منظر یاد آرہا تھا جب بلوچستان کے قریب سندھ کے ایک دور افتادہ مقام پر ڈاکوؤں نے اسی طرح ایک مکان کے گرد محاصرہ ڈالا ہوا تھا۔ تب بھی میں نے اسی طرح ایک پہاڑی پر راکٹ لانچر کا نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ بعض ڈاکو تو لانچر کے لیے ٹرائی بھی فسٹ کرنے کی زحمت نہیں کرتے تھے۔ وہ لانچر کندھے پر رکھ کر ہی راکٹ فائر کردیتے تھے۔

"یہ تو بہت دور دور تک تباہی پھیلائیں گے۔" زرتاج مضطربانہ انداز میں بولی۔

"قدرت نے ہمیں بروقت ہی یہاں بھیجا ہے۔" میں نے کہنیوں کے بل لیٹتے ہوئے کہا۔ "اور ہم یہاں ان کارروائیوں کا صرف معائنہ کرنے نہیں آئے۔"

اس نے بھی میری تقلید کی۔ کمرے کی چھت زیادہ دور نہیں تھی۔ سینے کے بل لیٹنے کے باوجود ہیولے ہماری نظر میں رہے۔ اس سے پہلے کہ وہ راکٹ فائر کرتے، ہماری رائفلوں نے گولیاں اگلیں اور وہ چاروں کے چاروں کمرے کی چھت سے لڑھک پڑے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے بھی تیزی سے لڑھک کر اپنی پوزیشن بدل لی [illegible] کے کچھ فٹ ہوگئے۔ جہاں ہم ایک لمحہ پہلے [illegible] وہاں بھی کوئی

میں آئی۔ کمرے کی چھت پر موجود ڈاکوؤں کو تو یقیناً پتا نہیں چلا ہوگا کہ موت نے کس سمت سے انہیں آن دبوچا تھا لیکن باغ میں موجود ڈاکوؤں کو بھی شاید کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا۔ انہیں غالباً یہی اطمینان تھا کہ اس وقت باغ پر ان کا قبضہ تھا۔ کوئی اور باغ میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا تاہم انہیں یہ ضرور معلوم ہوگیا تھا کہ کمرے کی چھت پر کوئی گڑبڑ ہوئی تھی کیونکہ میں نے کچھ ہی دور درختوں کے درمیان سے کسی کے کودنے کی آواز سنی پھر اچانک ہی دو سیاہ پوش، درختوں کے درمیان سے بھاگتے ہوئے باہر آئے۔

ان کی یہ حرکت قطعی اضطراری اور بے وقوفانہ تھی۔ ان کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔ وہ اس طرح اندھا دھند بھاگتے ہوئے نکلے تھے کہ ہم بھی فوری ردِعمل پر مجبور ہوگئے ورنہ شاید وہ انجانے میں ہمارے سروں پر ہی آن پہنچتے۔ میں نے اور زرتاج نے بیک وقت فائر کیا، وہ دونوں بھی ڈھیر ہوگئے۔

ہم نے تیزی سے پھر پوزیشن بدلی اور کمرے کے مزید قریب ہوگئے۔ وہیں باغبانی میں کام آنے والی بہت سی چیزیں زمین پر پڑی تھیں۔ ہم نے ان کی آڑ لینے کی کوشش کی۔ میں اپنے تھیلے ساتھ رکھنے میں بڑی دقت پیش آرہی تھی لیکن ہم انہیں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان میں فاضل میگزین اور گرینیڈ تھے جن کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ مقابلہ دل کھینچ سکتا تھا۔ ڈاکو تو اس بے دردی سے ایمونیشن ضائع کررہے تھے گویا ان کے پاس ٹرکوں کے حساب سے موجود تھا۔

میں یکدم کمرے کے قریب جانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید کوئی ڈاکو کمرے کے اندر بھی موجود ہو۔ اس دوران ہم چند بوریوں کے قریب پہنچ چکے تھے جن سے بو آرہی تھی۔ شاید وہ کھاد کی بوریاں تھیں۔ میں نے انہیں مورچہ بنانے کے ارادے سے ان کی آڑ میں ہونا چاہا تو اچانک مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میری ٹانگ پکڑنے کی کوشش کی ہو۔

میں اچھل کر ایک طرف ہٹا اور زمین کی طرف فائر کرتے کرتے رہ گیا۔ بوریوں کی آڑ میں ایک شخص آڑا ترچھا پڑا نظر آیا لیکن فوراً ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ زندہ نہیں تھا۔ اس کا بازو ایک طرف کو پھیلا ہوا تھا اور میرا پاؤں اس میں الجھ گیا تھا۔

پھر مجھے اپنے پیروں تلے خون کی چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ اس دوران زرتاج بھی لاش کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس نے اندھیرے میں جھک کر اس کا جائزہ لیا اور بے اختیار اس کے ہونٹوں سے دبی دبی سی سسکی نکلی۔

"یہ ہمارا مالی تھا۔۔۔" اس نے سرگوشی میں بتایا۔ اس کی نیچی آواز میں بھی مجھے غیظ و غضب کی لہر مچلتی محسوس ہوئی۔ "ان کتوں نے اس بے چارے بے ضرر سے آدمی کو بھی مار ڈالا۔۔۔ اتنا شریف۔۔۔ نمازی اور پرہیزگار شخص تھا۔۔۔ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ یہاں رہتا تھا۔۔۔ معلوم نہیں ان بے چاروں کا کیا بنا ہوگا۔۔۔"

اس سوال کا جواب بھی ہمیں چند سیکنڈ بعد ہی مل گیا۔ دیوار کے ساتھ تین لاشیں اور پڑی تھیں۔ ایک عورت تھی اور دو نوعمر لڑکے۔ میرے دل میں بھی تاسف کی ایک لہر ابھری۔ کسی شریف اور بے ضرر انسان کا بے جواز اور ظالمانہ قتل ہمیشہ میرے دل میں ایک چبھن اور اضطراب سا پیدا کردیتا تھا۔

زرتاج بھی اب گویا بپھر چکی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گن لیے درختوں کے درمیان جا گھستی اور چاروں طرف گولیوں کی بوچھاڑ کردیتی لیکن ظاہر تھا کہ اس موقعے پر یہ محض ایک حماقت ہوتی۔

اس دوران درختوں میں چھپے ہوئے ڈاکوؤں کو معلوم ہوچکا تھا کہ مالی کی کوٹھڑی کی سمت میں گڑبڑ ہوچکی تھی۔ اس طرف گولیوں کے برسٹ پڑنے لگے تھے۔ میں اور زرتاج جلدی سے کوٹھڑی کی آڑ میں ہوگئے۔ کوٹھڑی کیا تھی، اچھا خاصا پکا کمرا تھا اور اس وقت ایک بہت عمدہ مورچہ ثابت ہوسکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مورچے کی آڑ میں ہمارے دبکے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اور ڈاکو ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔

اچانک مجھے درختوں کے درمیان کچھ سائے متحرک نظر آئے۔ میری نظر جو اندھیرے میں بھی کافی بہتر طور پر کام کرتی تھی، اس موقعے پر میرے بہت کام آرہی تھی۔ میں نے رائفل استعمال کرنے میں تاخیر نہیں کی۔ درختوں کے درمیان کہیں غراہٹ آمیز سی ایک چیخ ابھری۔ میری چلائی ہوئی گولیاں کسی نہ کسی حد تک کارآمد رہی تھیں۔

اس دوران دو تین گرینیڈ اور باغ میں پھٹے۔ باہر سے فائرنگ کی آواز بھی قریب آتی جارہی تھی۔ تڑتڑاہٹ کے درمیان جو بھی ذرا ذرا سا وقفہ آتا تھا اس میں مجھے زرتاج کی دھیمی سی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ وہ خوش ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "گاؤں والے پیش قدمی کررہے ہیں۔ آج کی رات ڈاکوؤں پر بھاری ہوگی۔ زرتاج نگر کا رخ کرکے انہوں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی حماقت کی ہے۔۔۔"

ایک گرینیڈ ہم سے کچھ دور ہی درختوں کے درمیان گر کر پھٹا اور روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ اب میں نے پہلی بار ڈاکوؤں میں سے کسی کی آواز سنی۔ وہ چیخ کر کسی سے کچھ کہہ رہا

اب تک ان کا سکوت قائم تھا۔ ان کا بول اٹھنا ان کی بوکھلاہٹ کی نشانی تھی۔ الفاظ پوری طرح تو میری سمجھ میں نہ آئے لیکن اندازہ ہوگیا کہ وہ راکٹ لانچر والوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ انہوں نے ابھی تک راکٹ کیوں فائر نہیں کیا تھا۔ جواب میں کسی نے چیخ کر غالباً اسے یہ بتایا کہ ادھر گڑبڑ ہوچکی تھی۔ یہ آواز زیادہ دور سے نہیں آئی تھی۔ میں نے اندازاً آواز پر فائر کیے۔ ایک لمحے کے لیے ڈاکوؤں کی طرف سے فائرنگ گویا بالکل ہی تھم گئی۔ ان کا جانی نقصان بڑھتا جارہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مالی کے کمرے کی سمت میں برسٹ آیا۔ ہم سے کچھ دور ایک ٹوٹے ہوئے درخت کا تنا پڑا تھا۔ میں نے اس میں بھی گولیاں پیوست ہونے کی آواز سنی۔

اس کے فوراً بعد مجھے دائیں طرف کافی دور سے بے در پے کئی دھماکے سنائی دیے پھر دیوار کا ایک حصہ نیچے آن گرا۔ ایک لمحے کی تاخیر سے میری سمجھ میں آیا کہ باغ کا دروازہ گرینڈ مار کر توڑا گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ ڈاکوؤں کی فائرنگ کے باوجود محض اپنے دفاع کے لیے گھروں کی چھتوں تک محدود نہیں رہے تھے۔ نہ جانے کس طرح وہ باغ کے قریب آتے جارہے تھے۔ تاہم اگر وہ گیٹ کے راستے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے تو یہ ان کی حماقت ہوتی کیونکہ ملگجے اندھیرے میں وہ شگاف کسی حد تک نظر آرہا تھا جو لکڑی کا گیٹ گرنے سے پیدا ہوا تھا۔ غنیمت تھا کہ گیٹ نے آگ نہیں پکڑی تھی۔ اگر وہ لوگ اس شگاف سے داخل ہونے کی کوشش کرتے تو ان کے ہیولے ڈاکوؤں کی نظر میں آسکتے تھے۔

کسی نے گیٹ سے داخل ہونے کی کوشش نہیں کی لیکن فائرنگ کی آوازیں اس طرف سے بہرحال آتی رہیں۔ ایک گرینڈ اور مالی کے کمرے سے ذرا ہی فاصلے پر آکر پھٹا۔ اس کے دھماکے سے تو کمرے کی دیوار سے کچھ مٹی جھڑ کر ہمارے اوپر گری۔

زرتاج خوش ہوتے ہوئے بولی۔ "سلیم کی ٹریننگ کام آرہی ہے۔ مجھے امید ہے ہمارے آدمی ڈاکوؤں کو باغ میں گھیر لیں گے اور انہیں ماریں گے۔"

"یہ سلیم کون ہے؟"

"ایک ریٹائرڈ میجر۔" زرتاج نے جواب دیا۔ "میں نے گاؤں کو ڈاکوؤں سے بچانے کے لیے رات کی چوکیداری کی جو اسکیم شروع کرا رکھی تھی وہ اس کا انچارج ہے۔ آدمیوں کو ٹریننگ بھی اسی نے دی ہے۔ وہی ٹریننگ تو اس وقت کام

کہا۔ "گرینڈ اب ہمارے بھی قریب آکر گر رہے ہیں۔ ایک آدھ گرینڈ ذرا اور ادھر کو آن گرا تو اپنا کام تمام ہوجائے گا۔"

"ہاں۔۔۔" اس نے بے آواز سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ میں بھی باغ میں آن گھسا ہوں۔"

"واقعی۔ میرے ہونے نہ ہونے سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن آپ کے احترام میں شاید وہ کچھ محتاط ہوجاتے۔" میں نے کہا۔

"لیکن میں نہیں چاہتی کہ وہ محتاط ہوں۔ یہ موقع محتاط ہونے کا نہیں ہے۔ اگر انہیں یہاں میری موجودگی کا علم ہوجائے اور وہ محتاط ہوجائیں تو ان کا اور ہمارا کام تمام سمجھو۔" وہ بولی۔

"میں تو اب بھی کم از کم اپنا کام تمام ہی سمجھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کے گاؤں والوں کے حوصلے اتنے بلند ہیں اور وہ دفاع کے بجائے ڈاکوؤں کو کرمارنے کے لیے نکل کھڑے ہوں گے تو ہم بھی یہاں آنے کے بجائے ان سے ملنے کی کوشش کرتے تاکہ انہیں سہارا ملتا۔ اب انہیں بھی ہم سے کوئی خاص مدد نہیں مل رہی۔ ہم دونوں برسرپیکار فریقوں کے درمیان پھنس گئے ہیں۔"

"خیر اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "ہمارا یہاں آنے کا فائدہ تو بہت ہوا ہے۔ ہم بہت بروقت پہنچے تھے۔ آتے ہی ہم نے راکٹ لانچر استعمال کرنے والوں کو ٹھکانے لگا دیا، یہی بہت اہم کام تھا۔ گاؤں والوں کے باغ سے دور رہتے ہوئے یہ کام کرنا بہت مشکل تھا اور ڈاکو چند راکٹ فائر کرنے میں کامیاب ہوجاتے تو گاؤں والوں کی پیش قدمی کی ہمت ہی نہ پڑتی۔ ان کے لیے اپنے گھروں کو بچانا ہی مشکل ہوجاتا۔ نہ جانے کتنے لوگ مرتے اور مکان تباہ ہوتے۔ اس کے علاوہ ہم نے دو تین دفعہ ڈاکوؤں کو بھی ہلاک کیا ہے۔ تھوڑی سی دیر میں گاؤں کا اتنا ہاتھ تو بٹا دیا ہے۔ یہ کیا کم ہے؟"

"رپورٹ تو ہمت افزا ہے آپ کی۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں ذرا اس ایکشن چاہتا تھا۔"

"جتنا کچھ ڈاکوؤں کے ساتھ ہوچکا ہے میرے لیے بہت امید افزا ہے۔ آدمی تو انہی کے مارے جارہے ہیں۔ اہم بات تو یہ ہے کہ وہ منحوس جانو مارا جائے۔ سب سے بڑا کام تو اس علاقے میں سب سے بڑا تھا۔ آج اس کا گروہ اس علاقے سے ایک ایک ان کی طاقت ٹوٹ جائے تو اس علاقے سے ایک

"آپ طاقت ٹوٹنے کی بات کر رہی ہیں۔۔۔ میرا خیال ہے، آج کی رات یہ گروہ ختم ہوجائے گا۔" میں نے اعتماد سے کہا۔ اس اعتماد کی بنیاد کیا تھی، یہ فی الحال مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔" وہ بولی۔

میں نے ایک گرینڈ کی پن نکال کر اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "جس وقت میں گرینڈ پھینکوں، عین اسی وقت آپ کو یہ گرینڈ پوری قوت سے اس سمت میں پھینکنا ہے۔" میں نے اشارے سے اسے سمجھایا۔

"گویا ہمیں ڈاکوؤں کو اپنی موجودگی کا پوری طرح یقین دلا دینا چاہیے؟" اس نے نیم سوالیہ انداز میں کہا۔

"انہیں ہماری موجودگی کا علم تو ہوچکا ہے۔ وہ دوسری طرف الجھے ہوئے ہیں اس لیے ہماری طرف بھرپور حملہ نہیں کر رہے ہیں۔ اب ہمیں ان کو یہ تاثر دینا ہے کہ یہاں کئی افراد موجود ہیں۔ تابڑ توڑ ان پر گرینڈ پھینکنے ہیں، خواہ چند سیکنڈ میں ہی ہمارے پاس گرینڈ ختم ہوجائیں۔ اس کے ساتھ ہی فائرنگ بھی کرنی ہے۔ اس مورچے سے پورا پورا فائدہ اٹھانا ہے۔ اس طرح گاؤں سے جو لوگ باغ کو گھیرے میں لے رہے ہیں انہیں بھی اندازہ ہوجائے گا کہ اندر ان کا ساتھ دینے والے کچھ لوگ موجود ہیں۔ دوسرے ڈاکوؤں پر دو طرف سے دباؤ پڑے گا۔ ہمیں کسی طرح ان کو ان درختوں کے درمیان سے نکالنا ہے۔ درخت ان کے لیے بہت اچھی پناہ گاہ بن گئے ہیں۔"

وہ میرا مقصد یقیناً سمجھ گئی۔ میری طرح اس نے بھی بیک وقت دونوں ہاتھوں میں، پن نکلے ہوئے دو گرینڈ سنبھال لیے۔ رائفلیں ہم نے زمین پر رکھ دی تھیں۔ میرے اشارہ کرنے سے پہلے وہ بولی۔ "اگر جواباً انہوں نے بھی گرینڈ استعمال کیے تو کیا ہوگا؟ ہم تو محدود سی جگہ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہ کمرا بھی ٹوٹ کر ہم پر گر سکتا ہے۔"

"میں اتنی دیر سے یہی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے ان کے پاس گرینڈ نہیں ہیں ورنہ وہ اب تک ضرور استعمال کرتے۔ بلکہ انہیں اندازہ ہوچکا ہے، گاؤں والے دیوار کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ ڈاکو شاید راکٹ لانچر پر ہی تکیہ کیے ہوئے تھے اور وہ ان کے لیے بیکار ہوگیا ہے۔"

زرتاج نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے فائرنگ کی آوازوں سے اندازے قائم کیے تھے کہ درختوں کے درمیان ڈاکو کہاں کہاں موجود تھے۔ گرینڈ پھینکنے کے لیے میں نے ایسی ہی چند جگہیں منتخب کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے زرتاج کو بھی اشاروں کے ساتھ انہی جگہوں کے بارے میں بتایا تھا۔

وہ میرا مقصد یقیناً اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔

ہم نے نہایت تیزی سے یکے بعد دیگرے چار گرینڈ پھینکے اور ان کے دھماکوں کا ارتعاش ختم ہونے سے پہلے مختلف سمتوں میں چند راؤنڈ فائر کیے۔ درختوں کے درمیان مجھے کچھ ہلچل کا احساس ہوا پھر ہماری طرف بھی فائرنگ ہونے لگی لیکن وہ نہایت معمولی تھی۔ پکے کمرے کی آڑ میسر ہونے کی وجہ سے ہمیں اس کی کوئی خاص پروا نہ تھی۔

اچانک مجھے باغ کی دوسری دیوار کی طرف سے بھی فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ گاؤں والوں نے کیا ہوشیاری دکھائی تھی۔ انہوں نے ڈاکوؤں کی توجہ گیٹ کی طرف مبذول رکھی تھی لیکن درحقیقت کچھ لوگ بغلی دیوار سے باغ میں آکودے تھے۔ اب ڈاکوؤں پر ایک طرف سے ہم حملہ کر رہے تھے اور دوسری طرف سے گاؤں والے۔

ڈاکوؤں کے خوابوں کی تعبیر بالکل الٹی نکلی تھی۔ انہوں نے یقیناً یہ سوچا ہوگا کہ وہ باغ میں مورچہ بند ہوکر پہلے گاؤں پر فائرنگ کرکے اور راکٹ برسا کر لوگوں کو خوفزدہ کرکے گھروں میں دبکنے پر مجبور کریں گے۔ اس طرح وہ خود بھی جوابی حملے سے محفوظ رہیں گے۔ اس کے بعد وہ گلی کوچوں میں گھس کر تباہی پھیلا دیں گے، مکانوں کو آگ لگا دیں گے۔ جو سامنے آئے گا اسے ہلاک کردیں گے اور جو ہاتھ لگے گا وہ لوٹ لیں گے۔ ان علاقوں میں ڈاکو عموماً اسی طرح تباہی پھیلاتے تھے۔ خصوصاً جس گاؤں میں وہ جذبۂ انتقام کے ساتھ داخل ہوتے تھے وہاں وہ چنگیزی اور تاتاری دور کی یاد تازہ کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن ان لوگوں کے گاؤں میں گھسنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ خود مصیبت میں گھر گئے تھے۔ یہ وقت وقت کی بات تھی۔

ادھر ہم نے اپنی حکمتِ عملی کے مطابق اپنا اسلحہ استعمال کیا اور ادھر باغ کی پرلی دیوار کی طرف سے بھی دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ مزید چند گرینڈ استعمال ہوئے۔ حتیٰ کہ مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ باغ میں آگ نہ لگ جائے۔ زیادہ ہریالی اور نمی کے باعث ابھی تک باغ میں آگ لگی تو نہیں تھی لیکن کئی بار ایسے آثار دکھائی ضرور دیے تھے۔

جلد ہی ڈاکوؤں نے اس احساس کو بھی شاید خیرباد کہہ دیا کہ درختوں کے درمیان وہ زیادہ محفوظ تھے۔ میں نے چند ہیولوں کو درختوں سے نکل کر رکوع کی سی حالت میں باغ کی عقبی دیوار کی طرف دوڑتے دیکھا۔ میری نظر اتفاقاً ہی اس طرف چلی گئی تھی ورنہ میں اس وقت دوسری طرف متوجہ تھا۔ زرتاج اس وقت کمرے کے دوسرے کونے پر تھی۔

میں لڑھک کر اس کے قریب پہنچا اور اسے اس

کی طرف متوجہ کیا جدھر بندوق بردار ہیولے تیزی سے دیوار پر چڑھنے لگے تھے۔ ہم ان سب کو گولیوں کا نشانہ بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے علاوہ بھی ہمیں دیوار کے آس پاس اندھیرے میں جہاں کہیں خفیف سی حرکت کا بھی شبہ ہوا وہاں ہم نے گولیاں برسائیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جتنے ڈاکوؤں نے بھی بھاگنے کی کوشش کی تھی وہ سب کے سب مارے گئے تھے۔

ہم جس دیوار کی طرف تھے وہاں سے ہمیں گیٹ اور عقبی دیوار کا بیشتر حصہ غیر مرئی آسمان کے پس منظر میں کسی نہ کسی حد تک دکھائی دے رہا تھا۔ اگر باغ کی دوسری بغلی دیوار یا کسی اور راستے سے گاؤں کے کچھ لوگ باغ میں داخل ہونے میں کامیاب ہوچکے تھے تو باقی حصوں پر ان کی نظر رہ سکتی تھی۔ اس طرح ڈاکوؤں میں سے اگر کچھ باقی بچ گئے تھے تو باغ ان کے لیے محفوظ مورچے کے بجائے چوہے دان بن چکا تھا۔ گاؤں والوں کی اور ہماری جرأت ہمارے کام آگئی تھی۔ اگر سب لوگ سہم کر گھروں میں دبک جاتے تو اس وقت ان کی وہی حالت ہوتی جو ڈاکوؤں کی تھی۔

یک دم باغ کے دوسری طرف سے بھی فائرنگ بند ہوگئی۔ باغ میں ایک عجیب سی خاموشی چھاگئی۔ اس خاموشی میں موت کی سرگوشیاں رچی ہوئی تھیں۔ گاؤں کے لوگوں نے غالباً ڈاکوؤں کے ردِعمل کا جائزہ لینے کے لیے اچانک فائرنگ بند کردی تھی۔ شاید وہ بھی جاننے کی کوشش کررہے تھے کہ باغ میں کچھ ڈاکو باقی ہیں یا سب کا ہی صفایا ہوچکا ہے۔ انہیں یہ اندازہ تو یقیناً ہوگیا تھا کہ باغ میں دوسری طرف ان کا ساتھ دینے والے کچھ لوگ موجود تھے جن کی وجہ سے ان کا کام آسان ہوگیا تھا۔

سکوت کئی لمحوں پر پھیل گیا۔ درختوں کے درمیان سے کوئی فائر نہ ہوا۔ ابھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ڈاکو بھی کوئی چال چل رہے تھے یا واقعی کوئی ڈاکو زندہ نہیں بچا تھا۔ ادھر گاؤں والوں کے سکوت سے کچھ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے وہ صبح تک انتظار کرنے پر کمربستہ تھے۔ صبح کا اجالا پھیلنے پر یہ مقابلہ واضح صورت اختیار کرسکتا تھا۔ دونوں فریقوں کو ایک دوسرے کے مورچوں کا صحیح اندازہ ہوسکتا تھا لیکن دن کی روشنی میں گاؤں والوں کا جانی نقصان بڑھ بھی سکتا تھا۔

آخرکار گاؤں والوں نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کرہی لیا۔ میں نے بہت دور باغ کے ایک گوشے میں دو تین ٹارچیں روشن ہوتے دیکھیں۔ وہ یقیناً طاقتور ٹارچیں تھیں۔ میں نے ان کی روشنی درختوں کے درمیان بھی دور تک پہنچتے دیکھی لیکن ٹارچیں صرف ایک لمحے کے لیے روشن ہوئی تھیں۔ روشن کرنے والوں نے یقیناً انہیں بجھا کر فوراً ہی پوزیشن تبدیل کرلی تھی۔ تاہم ڈاکوؤں کی طرف سے تب بھی کوئی گولی نہ چلی۔

اس وقت تک زرتاج بھی بیگ سے ٹارچ نکال چکی تھی۔ وہ میری طرف مڑتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ "میرا خیال ہے میں بھی اپنے لوگوں کو یہاں اپنی موجودگی کا سگنل دے ہی دوں۔ انہیں اگلا قدم اٹھانے میں آسانی رہے گی۔"

"ابھی چند لمحے اور ٹھہر جاؤ۔" میں نے مشورہ دیا۔

وہ چند لمحے ایک عجیب قسم کے تناؤ میں گزرے۔ دونوں دیوار کے ساتھ چپکے نہایت آہستگی سے گردن گھماتے ہوئے جہاں تک نظر جاسکتی تھی کسی متحرک ہیولے کو تلاش کرنے کی کوشش کررہے تھے لیکن کہیں کوئی چیز حرکت کرتی دکھائی نہ دی۔ اتنے زبردست ہنگامے اور گھن گرج کے بعد یک دم ہی ہر طرف موت کا سکوت پھیل گیا تھا۔ فضا میں خون اور بارود کی بو محسوس ہورہی تھی۔

بالآخر زرتاج نے ایک لمحے کے لیے ٹارچ روشن کی اور فوراً ہی بجھا کر کمرے کی آڑ میں ہوگئی۔ درختوں کے درمیان تب بھی سکوت ہی رہا۔ کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا۔

"میرا خیال ہے معرکہ ختم ہوچکا ہے۔ ڈاکوؤں کا صفایا ہوگیا ہے۔" زرتاج سرگوشی میں بولی۔

"لگتا یہی ہے۔" میں نے تائید کی۔ زرتاج نے ایک بار پھر روشنی کا سگنل دیا۔ اس بار باغ کے ایک حصے سے روشنی کے سگنل کی صورت میں جواب ملا۔ مزید چند لمحوں کے انتظار کے بعد ان لوگوں کو بھی حوصلہ ہوا اور کسی نے چیخ کر پوچھا۔ "ادھر کون ہے۔"

"میں ہوں۔۔۔ زرتاج۔۔۔!" زرتاج نے چیخ کر جواب دیا۔

دوسری طرف وہی پہلا سا سکوت چھا گیا۔ ان لوگوں نے شاید اپنے کانوں پر یقین نہیں کیا تھا کہ اس معرکے کے دوران زرتاج باغ میں گھسی ہوئی تھی۔ انہوں نے مزید چند لمحے انتظار کیا۔ بالآخر وہ جن گوشوں میں زمین یا دیوار سے چپکے ہوئے تھے، وہاں سے نکلنے لگے۔ میں نے ایک طرف سے چند ہیولوں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

ان میں سے ایک نے احتیاطاً اندھیرے میں آواز لگائی۔ "گولی مت چلائیے گا۔۔۔"

پھر دھیرے۔۔۔ دھیرے ادھر ادھر اندھیرے کی آڑ سے بہت سے لوگ نکل آئے۔ ان کے پاس مختلف ٹارچیں تھیں۔ انہوں نے ٹارچیں روشن کیں اور کمرے کے اندر میں ہم دونوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ میری تو انہیں خیر خاص پروا نہیں تھی لیکن زرتاج کو بہ خیروعافیت دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔

بڑی عمر کا ایک قد آور اور صحت مند شخص آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "آپ کو اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی رئیسانی جی؟ ہم لوگ جو موجود تھے۔ خادموں کے ہوتے ہوئے مالکوں کو بندوق اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"صرف خادم ہی مالکوں کے محافظ نہیں ہوتے، مالک بھی خادموں کے محافظ ہوتے ہیں۔ جب تک دونوں میں شانہ بہ شانہ لڑنے کی اہلیت نہ ہو، دونوں ہی خطرے میں رہتے ہیں۔" زرتاج نے جواب دیا۔ "ویسے بھی اگر میں یہاں نہ آتی تب بھی خطرہ تو میرے گھر ہی پہنچ چکا تھا۔ تم لوگوں کو تو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ جانو ہمارے ایک غدار ملازم کی مدد سے تمام محافظوں کو بے ہوش کرکے حویلی میں آن گھسا تھا۔ اس نے تو مجھے یرغمال بنالیا تھا۔۔۔"

پھر اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ "اگر یہ صاحب ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو شاید آج کے معرکے کا نتیجہ بہت مختلف ہوتا۔"

ان میں سے بیشتر نے حیرت سے میری طرف اور پھر رئیسانی کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے گھوڑے سدھانے والے کی حیثیت سے جانتے تھے۔ انہیں شاید اس بات پر حیرت تھی کہ زرتاج میرے لیے "صاحب" کا لفظ استعمال کررہی تھی۔ زرتاج بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "جتنی بھی ٹارچیں تم لوگوں کے پاس ہیں وہ سب روشن کرکے ٹولیوں میں پورے باغ میں پھیل جاؤ اور جائزہ لو کہ کیا صورت حال ہے۔ محسوس تو یہی ہورہا ہے کہ سب ڈاکو کتے کی موت مارے جاچکے ہیں۔ پولیس وغیرہ کے حصے کا کام ہم لوگوں نے انجام دے دیا ہے۔"

"ان علاقوں میں اگر دو چار جگہ بھی ڈاکوؤں کو اس قسم کے ردِعمل کا سامنا کرنا پڑجائے تو مجھے امید ہے کہ ان کا زور ٹوٹ جائے۔" ان میں سے ایک شخص بولا۔

بڑی عمر کا قد آور اور صحت مند شخص جس کے بارے میں مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ریٹائرڈ میجر سلیم تھا، ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "ایسا ہونا بہت مشکل ہے کیونکہ ہر گاؤں زرتاج نگر نہیں ہوتا۔"

ہم سب لوگ ٹارچیں لے کر ٹولیوں کی صورت میں باغ میں بکھر گئے۔ باغ میں واقعی میدانِ کارزار کا سا سماں تھا۔ ہینڈ گرینیڈز نے کافی تباہی پھیلائی تھی۔ میں ڈاکوؤں کی تعداد دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنے بہت سے ڈاکو ہم لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ بعض لاشوں کے چہرے مسخ ہوگئے تھے اور بعض کے اعضا الگ ہوگئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس پیمانے پر ڈاکوؤں کی ہلاکت

میں ہماری حکمتِ عملی کے علاوہ کسی غیبی امداد کو بھی دخل تھا۔

اپنے اس "سروے" کے دوران بھی ہم ذرا محتاط ہی رہے۔ اندیشہ تھا کہ کوئی ڈاکو زندہ نہ ہو اور کہیں چھپا ہوا نہ ہو۔ ہم پر اچانک ہی گولیوں کی بوچھاڑ بھی ہو سکتی تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مجھے اس پر بھی حیرت ہوئی۔ ڈاکوؤں کا قطعی غیر متوقع طور پر صفایا ہو گیا تھا۔

لاشیں جہاں جہاں تھیں اور جس حالت میں تھیں، ہم نے انہیں اسی طرح وہیں رہنے دیا۔ بالآخر ایک جگہ رکتے ہوئے میں نے زرتاج سے کہا۔ "آج کی رات ہمارے لیے بہت مبارک رہی ہے۔ ہمارے دو تین آدمی کام ضرور آئے ہیں لیکن اس قربانی کے بعد ایک بہت بڑے فتنے کا بڑی حد تک خاتمہ ہو گیا لیکن میرے خیال میں ابھی کچھ کام باقی ہے۔ اس وقت ہمارا لہو گرم ہے اور ہمارے سر پر خون سوار ہے۔ لگے ہاتھوں وہ کام بھی نمٹا لیا جائے تو آپ کے حق میں بہت اچھا ہو گا۔"

"کیا مطلب؟" زرتاج چونکتے ہوئے بولی۔

"میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ان لوگوں نے ایک ویرانے میں زیرِ زمین "گولڈ کی کلب" بنایا ہوا ہے جہاں خاصی شرمناک اور خاصی خطرناک سرگرمیاں جاری ہیں۔ اگر کبھی وہ کلب کسی کی گرفت میں آیا تو اس کی مالک آپ ظاہر ہوں گی۔ ویسے بھی وہ جہاں واقع ہے وہ زمین کبھی آپ کے والد کی ہی ملکیت ہوا کرتی تھی۔"

"ہاں۔۔۔" وہ پُرخیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "یہ بات تو فی الحال اس ہنگامۂ اجل میں میرے ذہن سے نکلی ہوئی تھی۔"

"یہاں اگر خوش قسمتی سے دن چڑھے تک پولیس پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تو اس سے نمٹنے اور تمام حالات بتانے کا کام آپ کمدار وغیرہ کے سپرد کر دیں۔ ہم یہاں سے آٹھ دس منتخب آدمیوں کو لے کر چلتے ہیں اور "گولڈ کی کلب" والا قضیہ بھی نمٹا آتے ہیں ورنہ کل کلاں کو وہ بھی آپ کے لیے پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔" وہ نیم رضامندی سے بولی۔

"آج ہماری خوش قسمتی سے جانو اور اس کے گروہ کے بیشتر آدمیوں کا خاتمہ ہو گیا ہے تو اس کی باقیات کا بھی خاتمہ ہو جانا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم رات کی تاریکی میں ہی وہاں پہنچ جائیں تو شاید ان سے نمٹنے میں آسانی رہے کیونکہ وہ محفوظ جگہ میں ہوں گے اور ہمیں کھلے میدان سے بڑھنا ہو گا۔ ہمارے لیے خطرات زیادہ ہوں گے۔"

"محفوظ مقامات پر تو یہ لوگ بھی تھے۔۔۔" زرتاج اردگرد بکھری ہوئی لاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "انہیں دہشت گردی کا تجربہ بھی زیادہ تھا اس کے باوجود قدرت نے ہماری مدد کی۔"

"اسی امید کے سہارے تو میں آپ کو مزید قدم بڑھانے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ اوپر والا زیادتی سہنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں بھی قدرت ہماری مدد کرے گی۔ ان لوگوں کو جتنی ڈھیل ملنا تھی، مل چکی۔ کچھ لوگوں کے لیے یوم حساب ذرا دیر سے آتا ہے مگر آتا ضرور ہے۔۔۔ بلکہ ان لوگوں کے لیے تو شبِ حساب آئی ہے۔"

اس دوران گویا پورا گاؤں باغ کی طرف اُمڈ آیا تھا۔ کمدار وغیرہ بھی آ چکے تھے۔ لوگ مختلف ہتھیار، لالٹینیں، ٹارچیں، کلہاڑیاں، ڈنڈے اور نہ جانے کیا کچھ اٹھائے ہوئے تھے مگر اب ان کا سامنا کرنے کے لیے لاشوں کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔

زرتاج نے کمدار اور دوسرے دو تین لوگوں کو تمام صورت حال سمجھا کر مختلف کام ان کے ذمے لگائے۔ میجر سلیم کو بھی اس نے وہیں چھوڑ دیا۔ اس کے خیال میں وہاں اس کی زیادہ ضرورت تھی۔ البتہ جن لوگوں نے باغ میں چھپے ہوئے ڈاکوؤں کے خلاف کمانڈو ایکشن کی طرز پر کارروائی کی تھی، ان میں سے دس افراد کو زرتاج نے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے منتخب کر لیا۔ ہم نے تیزی سے کچھ تیاریاں کیں اور دو گاڑیوں میں روانہ ہو گئے۔

میں، زرتاج اور تین دوسرے افراد پجیرو میں تھے۔ باقی لوگ ایک چھوٹے ٹرک جیسی پک اپ میں تھے۔ گاڑی زرتاج ڈرائیو کر رہی تھی اور میں اپنی یادداشت کے سہارے اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ آسمان پر ٹکا ٹکا تاروں کی موجودگی کی وجہ سے اندھیرا اتنا گہرا نہیں تھا جتنا عموماً ویرانوں میں ہوتا ہے۔

میں صرف ایک بار گولڈ کی کلب تک گیا تھا لیکن یادداشت نے میرا ساتھ دیا اور آثار بتانے لگے کہ میں صحیح سمت میں جا رہا تھا۔ جنگل بیابان میں کوئی ایسی خاص چیزیں تو موجود نہیں تھیں جن کی نشانیاں مقرر کی جا سکتیں پھر بھی میں درختوں اور ٹیلوں وغیرہ کو دیکھ کر ایک غیر واضح سی مانوسیت کے سہارے زرتاج کی رہنمائی کرتا جا رہا تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ زرتاج کو خود یاد نہیں تھا کہ اس کے مرحوم باپ کی وہ زمین کس طرف ہوا کرتی تھی۔

جب مجھے احساس ہوا کہ ہم مطلوبہ مقام کے بہت

قریب پہنچ چکے ہیں تو میں نے دونوں گاڑیوں کی ہیڈلائٹس آف کروا دیں۔ کلب کے گرد میں نے ایک چھوٹا سا جنگل دیکھا تھا۔ ملگجے اندھیرے میں مجھے اس کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ انجن کی خفیف سی آواز ان مسلح محافظوں تک نہ پہنچ جائے جو درختوں کے درمیان گشت کرتے رہتے تھے۔

میری ہدایت پر گاڑیاں وہیں چھوڑ دی گئیں اور ہم خاصے بڑے دائرے میں بکھر کر پیدل آگے بڑھے۔ اس وقت تک صبح کاذب کے آثار بھی نمودار ہونے لگے تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ درختوں کے عقب میں موجود لوگ ہمارے ہیولے دیکھ سکتے ہیں لیکن خطرہ مول لیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ ہم سینے کے بل رینگ کر اتنا فاصلہ طے نہیں کر سکتے تھے۔

فضا کا سکوت کسی بھی لمحے گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے مرتعش ہو سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ وقت اور جگہ ایسی تھی کہ وہاں گہرا سکوت ہی ہونا چاہیے تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ سکوتِ شب کی چادر کچھ زیادہ ہی دبیز تھی۔ یہ سکوت غیر معمولی تھا۔

درختوں کے بالکل قریب پہنچ کر میں نے سوچا کہیں وہ لوگ گھات لگائے انتظار نہ کر رہے ہوں کہ ہم بالکل ہی قریب پہنچ جائیں تب وہ ہمیں گولیوں سے بھون ڈالیں۔ میں نے سب کو اشارہ کیا اور ہم سینے کے بل لیٹ کر اپنی اپنی کنیں سنبھالے رینگنے لگے۔

ہم نے بلاوجہ یہ مشقت اٹھائی۔ ہم درختوں کے دائرے میں داخل ہونے والے راستے سے بہ خیر و عافیت اندر پہنچ گئے، ایک بھی گولی نہ چلی لیکن اس سے ہم بے فکر اور پُرسکون ہونے کے بجائے مزید مضطرب ہو گئے۔ بالآخر میرا اشارہ پا کر ایک ایک کر کے سب اٹھ کھڑے ہوئے اور رکوع کی سی حالت میں ہم لوگ اس مختصر سے جنگل کے وسط میں واقع کھنڈر کی طرف بڑھے۔

چند لمحے بعد میں نے محسوس کیا کہ ہم خواہ مخواہ ہی اس احتیاط پسندی میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہاں تو کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اگر درختوں میں بھی کچھ لوگ چھپے ہوتے تو اب تک وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتے تھے۔ ہمارے کھنڈر تک پہنچنے کے دوران درختوں میں چھپا ہوا کوئی ایک شخص بھی کاشکوف وغیرہ سے نہایت آسانی سے ہمارا خاتمہ کر سکتا تھا لیکن ابھی تک کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ بلکہ سکوت گویا کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔

تاہم میرے اشارے پر سب لوگوں نے اپنا محتاط انداز برقرار رکھا۔ ہم چاروں طرف نظر رکھے ہوئے تھے اور کھنڈر کی دیواروں کے درمیان سے ہوتے ہوئے ملبے پر چڑھ کر اس مستطیل شگاف تک پہنچے جس کی گہرائی میں فولادی دروازہ موجود تھا۔ اس وقت وہاں کوئی محافظ نہیں تھا۔ تاہم میں نے پانچ افراد کو اس شگاف کے گرد کھڑا کیا۔ زرتاج، میں اور باقی افراد یکے بعد دیگرے شگاف میں اترے۔

میں جب پچھلی مرتبہ خمیسو خان کے ساتھ یہاں آیا تھا تو میں نے ایک خاص انداز میں لیور کے ذریعے محافظ کو یہ دروازہ کھولتے دیکھا تھا۔ اسی طریقے سے میں نے بھی وہ فولادی دروازہ کھول لیا۔ اس میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔

اس سے آگے ایک اور بھاری بھرکم، مضبوط چوبی دروازہ ہمارا منتظر تھا۔ یہ دروازہ اس طلائی چابی سے کھلتا تھا جو ممبروں کے پاس ہوتی تھی۔ میں نے ایسے ہی کسی موقعے کے لیے وہ چابی خاص طور پر اپنے پاس محفوظ رکھی تھی جو خمیسو خان کو ہلاک کرنے کے بعد اس کی جیب سے نکالی تھی۔ اس چابی سے دروازہ کھول کر دبے قدموں مزید چند سیڑھیاں اتر کر ہم نیچے پہنچے۔

تہہ خانے میں گہری تاریکی تھی۔ ہم سب چند لمحے اپنی اپنی کلاشنکوفوں اور رائفلوں کے رخ مختلف سمتوں میں کیے، دم سادھے کھڑے رہے لیکن کلب میں بدستور گہرا سکوت چھایا رہا۔ بالآخر ہم نے ٹارچیں روشن کر لیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

زرتاج حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے واقعی یہ ایک دنیائے حیرت تھی۔ اسے شاید ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ اس ویرانے میں زیرِ زمین ایک باقاعدہ کلب موجود تھا۔ ٹارچوں کی روشنی میں ہم سب کلب کا جائزہ لے رہے تھے۔

اچانک کہیں کھٹکا سا ہوا۔ ہم نے فوراً ٹارچیں بجھا دیں اور سینے کے بل فرش پر لیٹ گئے۔ دوسرے ہی لمحے رات کے سکوت میں در و دیوار میں خفیف سا ارتعاش محسوس ہوا۔ کہیں دور شاید کوئی مشین اسٹارٹ ہوئی تھی۔ اس کے فوراً بعد ہی ہال میں تیز روشنی پھیل گئی۔ ہمارا سینے کے بل فرش پر لیٹے ہونا یک دم ہی کچھ مضحکہ خیز سا محسوس ہونے لگا۔ ہماری گنوں کی نالیں ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں لیکن ہمارے سامنے کوئی نہیں تھا جسے ہم نشانہ بناتے۔

پھر بلندی پر کہیں ایک آسیبی سا قہقہہ سنائی دیا۔ آواز نسوانی تھی۔ اس ہال کے تین اطراف میں بلندی پر سینما کی گیلری کی طرز پر کمرے ہی کمرے بنے ہوئے تھے۔ آواز انہی میں سے ایک کمرے سے ابھری تھی۔ ہم سب کی گنوں کا رخ اسی طرف ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے ٹھٹکتے ہوئے پیچھے راہداری میں گھسنے کی کوشش کی لیکن ہم سب ایک ساتھ

اس میں نہیں گھس سکتے تھے۔

اس کا مطلب تھا کہ اگر اس وقت بلندی پر کوئی خود کسی محفوظ چیز کی آڑ میں رہتے ہوئے ہمیں نشانہ بنانا چاہتا تو آسانی سے بنا سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو میری دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں۔ باقی لوگوں کا نہ جانے کیا حال تھا۔

کلب کی ویرانی کا ایک جواز میری سمجھ میں آیا تھا جس کے بعد میں مطمئن ہو چکا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس کلب کو چلانے والے تمام لوگ بھی حقیقت میں چونکہ ڈاکو ہی تھے اس لیے آج زرتاج نگر پر حملے میں شامل ہونے کے لیے گئے ہوئے تھے کیونکہ یہ ان کا ایک بہت ہی خاص مشن تھا۔ امکان یہی تھا کہ اس میں حصہ لینے کے لیے گروہ کا ہر رکن پہنچا ہوگا۔ زرتاج نگر میں جتنے ڈاکو مارے گئے تھے، شاید اس میں "گولڈ کی کلب" کو چلانے والے تمام ڈاکو بھی شامل تھے۔

اب میرا یہ خیال غلط ثابت ہوتا نظر آ رہا تھا۔ شاید یہاں کچھ لوگ موجود تھے اور ہم غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ایک قسم کے ٹریپ میں آن پھنسے تھے۔ بلندی پر ایک کمرے کا دروازہ جھٹکے سے کھلا اور ایک عورت بالکونی کے جنگلے پر آن کھڑی ہوئی۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نظر نہیں آ رہا تھا لیکن سردست یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں نے کوئی مشین سی اسٹارٹ ہونے کی جو دھیمی آواز سنی تھی وہ جنریٹر کی تھی۔ جنریٹر غالباً اسی عورت نے اسٹارٹ کیا تھا۔

وہ بڑی بے خوفی سے جنگلے پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ ہمیں اوندھا لیٹے اور گنیں اونچی کیے دیکھ کر اس نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایک بار پھر بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ اس کا انداز اب بھی کچھ ہذیانی اور کچھ آسیبی سا تھا۔ شاید اسے ہماری حالت بہت مضحکہ خیز لگی تھی۔ وہ ہنس ہنس کر دُہری ہوئی جا رہی تھی۔

جب وہ ذرا سیدھی ہوئی اور اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹایا تو مجھے اس کی صورت شناسا سی لگی۔ دوسرے ہی لمحے مجھے یاد آ گیا کہ جب میں خمیسو خان کے ساتھ یہاں آیا تھا تو اس نے مجھے اس عورت کی میز پر بٹھایا تھا اور بہ صد اصرار عیاشی کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ اس عورت کا نام کبھی نوری ہوا کرتا تھا لیکن اس نے کافی عرصہ شہر میں گزارا تھا جہاں وہ نوری سے نورین ہو گئی تھی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس وقت وہ نشے میں تھی۔

وہ جس کمرے سے برآمد ہوئی تھی اس میں اور کسی کی موجودگی تو ظاہر نہیں ہو رہی تھی لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ باقی کمروں کے بند دروازوں کے پیچھے کیا تھا یا کون چھپا ہوا تھا۔

میرے ساتھ آئے ہوئے افراد میں سے دو آدمی اچانک اٹھے اور میرے یا زرتاج کے حکم کا انتظار کیے بغیر ہی دوڑتے ہوئے سیڑھیوں تک پہنچے اور تین تین سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتے ہوئے نہایت تیزی سے اوپر جا پہنچے۔ چند سیکنڈ بعد انہوں نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر قابو میں کیے کافی بے دردی سے کھینچتے ہوئے نیچے لے آئے۔ اس دوران کسی اور کمرے کا دروازہ نہیں کھلا۔ ان پر کسی نے فائر نہیں کیا۔ میری جان میں جان آئی۔ مجھے خود سے زیادہ ان کی فکر لاحق ہو گئی تھی کیونکہ وہ بے وقوفوں کی طرح منہ اٹھا کر دوڑ پڑے تھے۔

نوری عرف نورین گو کہ مزاحمت نہیں کر رہی تھی لیکن وہ لوگ اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے ہی لائے تھے۔ اس کے پیروں سے جوتیاں اتر گئی تھیں۔ زرتاج کے آدمیوں نے اس کے بازو بھی موڑے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ اس وقت تک ہم لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ کلب میں اس وقت اس عورت کے سوا کوئی نہیں تھا۔

"اسے چھوڑ دو۔" میں نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔ زرتاج کے آدمیوں نے میرے حکم کی تعمیل کی۔

نوری عرف نورین بہ مشکل سیدھی کھڑی ہو کر اپنے بازوؤں کو جھٹکے دیتے ہوئے استہزائیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "معلوم نہیں ہم جیسے لوگوں کو نیکی کا صلہ بھی کیوں ایسا ملتا ہے....."

معلوم نہیں کیوں مجھے اس کے اس طرح بے رحمانہ انداز میں کھینچ کر لائے جانے پر افسوس ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر معذرت خواہانہ انداز میں اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ دراصل ہمارے آدمیوں سے صرف گھبراہٹ میں یہ حرکت سرزد ہوئی ہے۔ ہم تمہیں کوئی تکلیف پہنچانا نہیں چاہتے تھے....."

اس نے گویا قدرے چونک کر میری طرف دیکھا اور آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولی۔ "تم تو وہی ہو جسے اس شام خمیسو خان نے میری میز پر لا کر بٹھایا تھا....."

اس سے آگے وہ نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہاں..... ہاں، میں وہی ہوں۔"

"مجھے اس وقت ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ تم ایک شریف آدمی ہو..... اور اب تم نے مجھ سے معذرت چاہی ہے..... یہ بھی تمہاری شرافت کی دلیل ہے۔" اس نے زرتاج سمیت باقی لوگوں کی طرف بازو لہراتے ہوئے اشارہ کیا۔ "ان لوگوں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی..... لیکن مجھے خوشی ہے

کہ تم میرے ہاتھوں مرنے سے بچ گئے۔ تم سب کی زندگی میرے ہاتھ میں تھی..... میرے ایک اشارے پر تم سب کے پرخچے اڑ سکتے تھے..... لیکن میں نے اپنے آپ کو ہاتھ ہلانے سے باز رکھا۔ اس کا صلہ مجھے یہ ملا....." اس نے ایک بار پھر اپنے بازوؤں کو جھٹکا دیا جنہیں کافی بری طرح موڑا گیا تھا۔

میں نے اس کا مطلب پوری طرح سمجھے بغیر کہا۔ "میں ایک بار پھر ان لوگوں کی طرف سے تم سے معافی چاہتا ہوں۔ تم خود ہی کہہ چکی ہو کہ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ امید ہے کہ تم ایک شریف آدمی کی معذرت قبول کرو گی۔"

اس نے ایک بار پھر بغور میری طرف دیکھا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ اچانک وہ میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ "سگریٹ ہوگی تمہارے پاس؟"

"نہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "میں اتنا شریف آدمی ہوں کہ سگریٹ بھی نہیں پیتا۔ ویسے بھی تمہارا سادہ سگریٹ سے کیا بھلا ہونا تھا۔ تم تو کچھ اور طرح کی سگریٹ پینے کی عادی ہو۔"

"اس وقت تو کسی بھی قسم کی سگریٹ کی طلب ہو رہی ہے..... میرا پیکٹ اوپر رہ گیا ہے۔" وہ مڑ کر کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں ابھی منگوا دیتا ہوں....." میں نے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ وہ چہرے پر قدرے ناگواری کے تاثرات لیے اوپر چلا گیا۔ شاید وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ ہم ایک قیامت خیز ہنگامے سے گزر کر آ رہے ہیں، یہاں بھی ہمیں نہ جانے کیا حالات پیش آنے والے تھے اور مجھے دشمن کے اڈے پر موجود ایک مشکوک قسم کی عورت کی سگریٹ کی فرمائش پوری کرنے کی فکر پڑی ہوئی ہے۔ مجھے احساس تھا کہ زرتاج بھی عجیب سی نظروں سے کبھی میری طرف اور کبھی نورین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے ملائمت سے نورین سے پوچھا۔ "تم یہاں اکیلی ہو؟"

"ہاں۔ کاش تم بھی اکیلے آئے ہوتے!" وہ آنکھ مارتے ہوئے مسکرائی۔ مجھے کسی نیک پروین قسم کی لڑکی کی طرح اپنے کانوں کی لویں تپتی محسوس ہوئیں۔ میں نے کھسیانے سے انداز میں زرتاج کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ٹک نورین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اسی لمحے نورین بھی زرتاج کی طرف متوجہ ہوئی اور سرتاپا اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "یہ بیگم صاحبہ کون ہیں؟"

حالانکہ اس وقت ہم خاصے بُرے حال میں تھے۔ سر

اسلم راہی ایم اے کے ولولہ انگیز تاریخی ناول

سائبیریا کا طوفان	۱۵۰/-	سرابوں کے صحرا	۳۰۰/-
آتش و آہن	۱۵۰/-	رقصِ درویش	۳۰۰/-
ظلمات	۱۵۰/-	دشت کے بھیڑیئے	۲۵۰/-
سراج منیر (اول دوم)	۵۰۰/-	غرناطہ کا چوپان	۳۰۰/-
طارق بن زیاد	۲۵۰/-	شیر شاہ سوری	۲۵۰/-
مقدس دیوداسی	۱۷۵/-	سندھ کا سورما	۲۵۰/-
ابلیکا (سات جلدیں مکمل سیٹ)	۱۹۵۰/-		

مکتبہ القریش ۱۰ اردو بازار لاہور ۲ فون: ۷۲۲۴۶۶۵

سے پاؤں تک پسینے اور مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی زرتاج کی شخصیت سے ایک شان جھلک رہی تھی۔ شاید اسی لیے نورین نے اس کے لیے "بیگم صاحبہ" کے الفاظ استعمال کیے تھے۔

"تم اسے چھوڑو۔۔۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تمہارے ایک اشارے پر ہمارے پرخچے کیسے اڑ سکتے تھے؟"

"یہ جاننے کے لیے تمہیں میرے ساتھ اس کلب سے باہر کچھ دور چلنا پڑے گا۔" وہ بے نیازی سے بولی۔ اس دوران ہمارا آدمی اوپر کے کمرے سے اس کی مخصوص سگریٹوں کا پیکٹ اور لائٹر لے آیا تھا۔ اس نے مُرتعش انگلیوں سے ایک سگریٹ سلگا کر گہرا کش لیا۔ اس کے چہرے پر کچھ طمانیت سی پھیل گئی۔ اس نے دُھوئیں کا ایک کثیف مرغولا ہوا میں چھوڑا تو زرتاج ایک قدم پیچھے ہٹ گئی تاہم اس نے اپنے چہرے سے ناگواری ظاہر نہیں ہونے دی۔ میں نے ہیروئن کے نشے کے عادی تو کئی افراد دیکھے تھے جن کا نشہ ٹوٹنے لگتا تھا تو ان کی حالت غیر ہو جاتی تھی لیکن نورین اس لحاظ سے کچھ عجیب نشے باز تھی کہ اسے چرس کا نشہ بھی کچھ اسی شدت سے ستاتا تھا اور معلوم یہی ہوتا تھا کہ وہ تقریباً ہر وقت ہی نشے میں رہنا چاہتی ہے۔

"ٹھیک ہے۔۔۔" میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ "ہم تمہارے ساتھ چلیں گے۔ اس سے پہلے ہم ذرا یہاں کا جائزہ لے لیں۔"

"یہاں اب جائزہ لینے کو کیا رکھا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"کیا مطلب۔۔۔؟ کیا اب یہاں کوئی خاص، قابلِ ذکر چیز نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہر شخص کا نقطۂ نظر مختلف ہوتا ہے۔ معلوم نہیں، اب تمہاری نظر میں کون سی چیز خاص اور قابلِ ذکر ہو۔" وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "ورنہ یہاں خاص اور قابلِ ذکر چیز تو میں بھی ہوں۔" وہ ایک بار پھر مخمور سے انداز میں مسکرائی۔ معلوم نہیں اس وقت اتنے لوگوں۔۔۔ اور خصوصاً زرتاج کی موجودگی میں وہ بار بار کیوں اس طرح قربان جانے والے انداز میں مسکرائے جا رہی تھی ورنہ جب تھیسو خان نے مجھے اس کی میز پر بٹھایا تھا، اس وقت تو وہ ہر بات بڑے سپاٹ اور کاروباری انداز میں کر رہی تھی۔

"تم چیز نہیں۔۔۔ تم ایک بہت اچھی عورت ہو۔" میں نے اسے بچوں کی طرح چمکارتے ہوئے کہا۔ "تم ادھر ایک میز پر بیٹھ جاؤ۔ ہم چند منٹ میں واپس آتے ہیں۔"

وہ ایک میز پر جا بیٹھی۔ میرے کہے بغیر ہی ہمارے ساتھیوں میں سے ایک کلاشنکوف بردار اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ میں زرتاج اور دوسرے لوگوں کو لے کر آگے بڑھا۔ پورے زیرِ زمین کلب میں بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔ میں انہیں کلب کا ہر گوشہ دکھانے لگا۔ اس وقت گو کہ وہاں وہ رونق میلہ نہیں تھا جسے دیکھ کر شاید انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا۔ اس کے باوجود ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔ انہوں نے شاید کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس ویرانے میں زیرِ زمین ایسی بھی کوئی عمارت موجود تھی جس میں عیاشی کے تمام لوازمات سجے ہوئے تھے۔ شراب کا ذخیرہ دیکھ کر ہی زرتاج کی رنگت متغیر ہو گئی۔

پھر اس کا ذہن شاید دوبارہ نورین کی طرف چلا گیا۔ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ "یہ عورت کون ہے؟"

"انہی ان گنت بدنصیب عورتوں میں سے ایک۔۔۔ جو ستاروں پر کمند ڈالنے نکلتی ہیں اور دلدلوں میں جا گرتی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ کو اندازہ ہو ہی گیا ہو گا۔"

"ہاں۔۔۔ اندازہ تو ہو گیا ہے۔" اس نے سر ہلایا۔

"کچھ عورتیں تو خود بھٹکتی بھٹکاتی ان منزلوں پر پہنچی ہوں گی لیکن اس گروہ نے ایسے چکر بھی چلائے ہوئے تھے کہ مجبور، بے سہارا یا ضرورت مند عورتوں کو بھی گھیر گھار کر ان راستوں پر لایا جاتا تھا اور جو کسی نہ کسی طرح ان کے ہتھے چڑھ جاتی تھیں، ان کا حشر تو آپ سوچ ہی سکتی ہیں کیا ہوتا ہو گا۔" میں نے کہا۔ زرتاج نے متاسفانہ سے انداز میں سر ہلایا۔

بلندی پر جو کمرے واقع تھے وہ کسی معقول ہوٹل کے کمروں کی طرز پر آراستہ تھے۔ میں زرتاج کو ان کمروں میں بھی لے گیا جہاں میں نے اسلحے کی پیٹیاں دیکھی تھیں۔ پیٹیاں اب بھی وہاں موجود تھیں لیکن خالی تھیں۔ ہم نے بہت تیزی سے سب جگہوں کی تلاشی لی لیکن ہمیں وہاں کوئی فائل یا کاغذات وغیرہ نہیں ملے۔ معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت اس جگہ کو بالکل خالی کر دیا گیا تھا۔

ہم واپس آئے تو نورین اسی میز پر بیٹھی مخمور انداز میں مسکرا رہی تھی۔ وہ میرے پوچھنے سے پہلے ہی بولی۔ "یہاں سے بہت سی چیزیں جانو نے منگوا لی تھیں۔ اگر تمہیں کسی خاص چیز کی تلاش تھی تو تمہیں مایوسی ہو گی۔"

"نہیں۔۔۔ ہم تو ویسے ہی ذرا اس جگہ کا جائزہ لے رہے تھے۔ جانو کی کاوشوں کی داد دے رہے تھے۔ زندگی میں اتنی محنت کرنے والے اور ایسے ایسے "شاندار" پروجیکٹس تخلیق کرنے والے لوگ روز روز تھوڑا ہی پیدا ہوتے ہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا۔ "تم ہمیں کیا بتانے اور دکھانے والی تھیں؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

ہم اس کے ساتھ ہو لیے اور جس راستے سے آئے تھے اسی راستے سے باہر آ گئے۔ کھنڈر کے گرد درختوں کا دائرہ خاصے بڑے حصے میں پھیلا ہوا تھا۔ نورین کی رہنمائی میں ہم اس مختصر جنگل سے نکل کر ایک طرف بڑھے۔ تب میں نے دیکھا، اس سمت میں ایک جھونپڑی سی نظر آ رہی تھی۔ اس وقت تک صبح صادق کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ اندھیرے میں روشنی کی آمیزش بڑھ گئی تھی۔

ہم کچھ اور آگے بڑھے تو اندازہ ہوا کہ وہ جھونپڑی نہیں، ایک چوبی کیبن تھا جس کے ارد گرد خودرو جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ نورین سب سے آگے چل رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہمارے آدمی تھے۔ انہوں نے غیر محسوس سے انداز میں اسے اپنی گنوں کی زد پر لیا ہوا تھا۔ میں اور زرتاج سب سے پیچھے تھے۔

زرتاج سرگوشی میں بولی۔ "یہ ہمیں کسی جال میں پھنسانے کے لیے تو نہیں لے جا رہی؟"

"جال میں پھنسانے کے لیے تو وہ تہہ خانہ ہی سب سے اچھی جگہ تھی جہاں سے ہم آ رہے ہیں۔ یہ کیبن تو ویران ہی معلوم ہو رہا ہے۔ بہرحال۔۔۔۔ اگر کوئی جال بھی ہوا تو دیکھا جائے گا۔ ہم سب الرٹ تو ہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔

کیبن کے قریب پہنچ کر نورین نے فلمی بدمعاشوں والے اسٹائل میں لات مار کر اس کا دروازہ کھولا۔ میں گو کہ دور کھڑا تھا اور کیبن کے اندر تاریکی تھی لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ کیبن میں کوئی موجود نہیں تھا۔ اس وقت شاید میرے ساتھ ساتھ زرتاج کو بھی حیرت ہوئی جب نورین نے کیبن میں داخل ہو کر کوئی سوئچ آن کیا اور وہاں بتی روشن ہو گئی۔ اندر لوہے کی ایک چارپائی اور ایک تپائی نظر آ رہی تھی۔

میں اور زرتاج بھی آگے بڑھ کر کیبن میں داخل ہو گئے۔ وہ کچھ اسی قسم کا کیبن تھا جیسے بعض مقامات پر چوکیداروں یا گیٹ کیپروں کے کیبن ہوتے ہیں۔ اس میں بے سروسامانی کچھ زیادہ تھی۔ تپائی پر ریڈیو نما کوئی چیز رکھی ہوئی تھی۔ وہ وائرلیس بھی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وائرلس میں موجود تھی۔ پتلی سی ایک تار اس سے منسلک تھی جو کیبن کے ایک کونے میں جا کر غائب ہو گئی تھی۔

"واہ۔۔۔! اس ویرانے میں تم لوگوں نے بجلی کا خوب بندوبست کر رکھا ہے۔" میں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کیبن سے بھی زیرِ زمین تار اس تہہ خانے تک جا رہی ہے۔ وہیں کے جنریٹرز سے سلسلہ جُڑا ہوا ہے۔" نورین نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "لیکن میں تمہیں ایک دوسرا سلسلہ دکھانے کے لیے لائی ہوں۔ یہ جو تم میز پر ریڈیو سا رکھا دیکھ رہے ہو۔۔۔ مجھے اس کا صرف ایک بٹن دبانا تھا اور پورا تہہ خانہ بھک سے اُڑ جاتا۔ مجھے بٹن اس وقت دبانا تھا جب تم سب لوگ اندر جا چکے تھے۔ تہہ خانے کے ساتھ ہی تم لوگوں کے بھی پرخچے اُڑ جاتے۔"

"لیکن تم خود بھی تو وہیں موجود تھیں۔ ساتھ تمہارے بھی تو پرخچے اُڑ جاتے۔" میں نے کہا۔

"احمق! اگر مجھے اس پروگرام پر عمل کرنا ہوتا تو پھر میں وہاں کیوں موجود ہوتی۔ میں تو یہیں اس آلے کے پاس ہی موجود رہتی۔ تم لوگوں کے آنے سے پہلے میں یہیں موجود تھی۔ میں نے بہت دور سے تم لوگوں کی آمد کے آثار محسوس کر لیے تھے۔ مجھے تم لوگوں کی گاڑیوں کے ہیولے حرکت کرتے دکھائی دیے تھے۔ اسی وقت میں جلدی سے جا کر تہہ خانے میں چھپ گئی تھی۔ کاش میرے پاس میک اپ وغیرہ کا سامان ہوتا تو میں چُڑیل بن کر تم لوگوں کو ڈراتی۔ آج میرا کسی سے مذاق کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ برسوں گزر گئے ہیں کہ میں نے کسی سے کوئی مذاق نہیں کیا۔"

"اس مذاق میں تمہاری جان بھی جا سکتی تھی۔" میں نے کہا۔

"جان۔۔۔!" اس نے استہزائیہ سے انداز میں قہقہہ لگایا۔ "یہاں جان تو بغیر مذاق کے بھی جا سکتی ہے۔"

"تمہاری بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ پوری بات بتاؤ۔۔۔" میں نے کہا۔

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بیزاری سے بولی۔ "بات کچھ بھی نہیں ہے۔ بس جانو کی طرف سے کچھ احکامات آئے تھے۔ سب لوگ ہنگامی طور پر یہاں سے رخصت ہوئے تھے۔ بہت سا سامان بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ مجھے اس کیبن میں موجود رہنے کا حکم ملا تھا۔ اس کے علاوہ حکم یہ تھا کہ میں چاروں طرف نظر رکھوں۔ اس کیبن سے دور دور تک کا منظر نظر آتا ہے۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ اگر میں کچھ لوگوں کو کلب کی طرف آتے دیکھوں اور مجھے اندازہ ہو جائے کہ وہ کلب میں داخل ہو چکے ہوں گے تو میں اس بٹن کو دبا دوں۔" اس نے ریڈیو نما چیز کے ایک بٹن کی طرف اشارہ کیا۔ وہ یقیناً تہہ خانے میں نصب کسی ڈائنامائٹ کو ڈیٹونیٹ کرنے کا آلہ تھا۔

میرے لیے جانو یا اس کے گروہ کا یہ اندیشہ باعثِ حیرت تھا کہ کچھ لوگ یہاں پہنچ بھی سکتے تھے۔ انہوں نے یقیناً اس بات کا امکان محسوس کر لیا تھا۔ جانو کو یہ اطلاع تو مل ہی گئی ہو گی کہ تھیسو خان یہاں سے ایک اجنبی کے ساتھ روانہ ہوا تھا جس کے بعد وہ راستے ہی میں رقم سمیت غائب ہو گیا تھا۔ اس سے ہی اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا ہو گا۔

انہوں نے ایسے انتظامات کر رکھے تھے کہ اگر کبھی پولیس وغیرہ کی اس اڈے تک رسائی ہو تو زرتاج اس کی مالک ظاہر ہو لیکن آج انہوں نے اس عشرت کدے کو خالی کروا دیا تھا۔ اسلحہ وغیرہ بھی یہاں سے ہٹا دیا تھا اور یہ انتظام بھی کر گئے تھے کہ اگر کچھ لوگ اس ٹھکانے تک پہنچتے دکھائی دیں تو ان لوگوں سمیت اس اڈے کو

دھماکے سے اُڑا دیا جائے۔ اس میں یقیناً جانو کی کچھ اور مصلحت رہی ہوگی لیکن اب جانو اس دنیا میں نہیں تھا اور شاید اس کے بیشتر ساتھی بھی ٹھکانے لگ چکے تھے اس لیے اس مصلحت کے بارے میں کوئی کچھ نہیں بتا سکتا تھا' صرف اندازے قائم کیے جاسکتے تھے۔

میں نے نورین کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تم نے احکامات پر عمل کیوں نہیں کیا؟ یہ بٹن دبانے کے لیے یہاں موجود کیوں نہیں رہیں؟"

"یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔" وہ بے نیازی سے کندھے اُچکاتے ہوئے بولی۔ "بس..... میرا دل نہیں چاہا۔ حالانکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم لوگ کون ہو۔ میرے لیے تم اندھیرے میں حرکت کرتے ہوئے محض چند سائے تھے۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ میں نے تمہیں زندہ چھوڑ دیا تو تم لوگ میرے ساتھ دشمنوں کا سا سلوک بھی کرسکتے ہو۔ اس کے باوجود میں نے بٹن دبانے کا ارادہ نہیں کیا اور خود کلب میں جاکر چھپ کر بیٹھ گئی۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اس حکم عدولی پر جانو میرا نہ جانے کیا حشر کرے۔ اس کے باوجود میں اپنے آپ کو بٹن دبانے پر آمادہ نہ کرسکی۔"

"جانو کا تو اپنا حشر بہت خراب ہوچکا ہے۔" میں نے اسے بتا دینے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

"کیا ہوا اسے؟" نورین نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ بس وہ مرچکا ہے۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔

"کُتّے کی موت مرچکا ہے۔" زرتاج نے گویا تصحیح کی۔

"اوہ....." نورین نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے سیٹی بجائی۔ "ان علاقوں میں دور دور تک رہنے والوں کے لیے یہ اس سال کی سب سے بڑی خبر ہے۔"

"میرا خیال ہے اس کا پورا گروہ بھی جہنم رسید ہوچکا ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا۔" نورین کی مخمور آنکھیں پھیل گئیں لیکن دوسرے ہی لمحے وہ طمانیت کی گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ "چلو..... اب کم از کم میں اس کے عتاب سے تو بچی رہوں گی۔ میں نے تم لوگوں کو مرنے سے بچا تو لیا تھا لیکن اب دل ہی دل میں ڈر بھی رہی تھی کہ یہ نیکی مجھے مہنگی پڑے گی۔ زندگی میں پہلی بار اتنی بڑی نیکی کی تھی۔ میری زندگی میں تو چھوٹی موٹی نیکیوں کا گزر بھی کم ہی رہا ہے۔"

"تمہاری یہ نیکی رائیگاں نہیں جائے گی۔" میں نے کہا اور آگے بڑھ کر ریڈیو نما آلے کا وہ سرخ بٹن دبا دیا جس کی طرف چند لمحے پہلے نورین نے اشارہ کیا تھا۔ اس طرح اچانک کسی کو بھی بجھ سے اس حرکت کی توقع نہیں تھی۔ یک دم زوردار دھماکا ہوا اور زمین لرز کر رہ گئی۔ دھماکا چونکہ زیرِ زمین ہوا تھا اس لیے اس کی آواز تو ایسی نہیں تھی کہ کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوتے لیکن اس کی دھمک اور گونج اتنی تھی کہ باہر کھڑے ہوئے دو افراد میں سے دو اوندھے منہ گر پڑے۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" زرتاج سنبھلتے ہوئے بولی۔

"کیا اس جگہ کا کوئی اور مصرف تھا آپ کے ذہن میں؟" میں نے معصوم بنتے ہوئے پوچھا۔ وہ گویا لاجواب سی ہوگئی۔

میں نے کیبن سے نکل کر دیکھا' درختوں کے درمیان سے اس طرح دُھواں بلند ہوتا دکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی چھوٹا موٹا آتش فشاں پھٹا ہو۔

میں نے رائفل کندھے پر لٹکا کر گویا کسی چھوٹے موٹے کام سے فارغ ہوکر ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "چلیے اب واپس چلتے ہیں۔" میں نے نورین کو بھی چلنے کا اشارہ کیا۔

"مجھے ساتھ لے جاکر کیا کرو گے؟" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"تمہارا بھی کوئی نہ کوئی مصرف نکال ہی لیں گے۔ تم چلو تو سہی۔" میں نے جواب دیا۔ وہ گویا بادل نخواستہ ہمارے ساتھ ہولی۔

راستے میں وہ بولی۔ "تم لوگ مجھے کہاں لے جارہے ہو؟"

"زرتاج نگر۔" میں نے جواب دیا۔

اچانک وہ چونکی اور زرتاج کی طرف گویا ایک نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کہیں آپ رئیسانی زرتاج تو نہیں ہیں؟"

زرتاج تو کچھ نہ بولی۔ اس کی طرف سے میں نے جواب دیا۔ "ہاں۔ یہ رئیسانی زرتاج ہی ہیں۔ تمہیں یقین نہیں آرہا کیا؟"

"ہاں۔ مجھے واقعی یقین نہیں آرہا کہ اتنی بڑی زمیندارنی خود بھی بندوق اٹھا کر اس طرح مٹی اور پسینے میں لتھڑی اپنے دشمنوں اور ڈاکوؤں سے نمٹنے کے لیے نکل سکتی ہے۔" بے یقینی اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ "میں نے تو یہی دیکھا ہے کہ اس طرح کے لوگ صاف ستھرے' اُجلے اُجلے کپڑے پہن کر اپنے عالیشان ڈرائنگ روز میں بیٹھ کر احکامات صادر کرنا جانتے ہیں اور ان کے احکامات پر لوگ ایک دوسرے کو جانوروں کی طرح بھنبھوڑتے اور ایک دوسرے کی بوٹیاں نوچتے مرجاتے ہیں۔"

زرتاج اب بھی خاموش تھی۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "دنیا میں ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔" پھر میں نے زرتاج کو مخاطب کرتے ہوئے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ "بعض کام کتنے مشکل نظر آتے ہیں لیکن کتنی آسانی سے ہوجاتے ہیں۔ آج کی رات گو کہ بہت بھاری گزری ہے لیکن کم از کم میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ سر سے اتنے بڑے بڑے بوجھ ہٹ جائیں گے۔ جانو کے گروہ کا خاتمہ بھی ہوجائے گا اور اس کا یہ خطرناک ٹھکانا بھی تباہ ہوجائے گا۔"

"امدادِ غیبی اسی کو کہتے ہیں۔" زرتاج مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

اس وقت تک ہم لوگ گھنے درختوں کی اس پٹی تک پہنچ چکے جو دائرے کی سی صورت میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے درمیان بدستور دُھواں اٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ ہم اس طرف پہنچے تو اس دائرے میں داخل ہونے کا راستہ بنا ہوا تھا۔ اس راستے سے پہنچ کر ہم نے دیکھا' درختوں کے درمیان کھنڈر کا بیشتر حصہ اب ملبے ہی تباہ ہوچکا تھا۔ وہاں ایک بڑا سا گڑھا پڑ گیا تھا جس سے دھواں اور پھڑپھڑاتے ہوئے شعلے بلند ہورہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین شق ہوگئی تھی اور زیرِ زمین کوئی آتش فشاں پھٹ گیا ہو۔ گو کہ اوپر سے زمین زیادہ نہیں پھٹی تھی اور شعلے بھی زیادہ بلند ہوتے نظر نہیں آرہے تھے لیکن تپش ہم لوگوں تک پہنچ رہی تھی۔ زمین میں پیدا ہونے والے شگاف سے بار بار کثیف دُھوئیں کے بڑے بڑے بگولے باہر آنے لگتے تھے اور کبھی کبھی ہلکی سی گڑگڑاہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔

چند لمحے تک خاموشی سے یہ نظارہ دیکھنے کے بعد ہم لوگ اس طرف واپس چل دیے جدھر ہم اپنی گاڑیاں چھوڑ کر آئے تھے۔ اس وقت تک صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ اب ویرانہ بھی خوبصورت اور پُرسکون لگ رہا تھا۔ کہیں کہیں جھاڑ جھنکاڑ اور درخت نظر آرہے تھے مگر اس وقت وہ بھی نکھرے نکھرے دکھائی دے رہے تھے۔ شاید ہمارے اندر کا موسم بدل چکا تھا۔ کم از کم میں اس وقت خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا۔ رات بھر کی اعصابی کشیدگی کے بعد اب صبح کی تازہ ہوا میں سکون کی سانس لینے کا موقع ملا تھا۔

ہم سب نے رائفلیں وغیرہ کندھوں پر لٹکالی تھیں۔

دوسرے ہی لمحے مجھے معلوم ہوا کہ سکون میری قسمت میں زیادہ دیر کے لیے نہیں تھا۔ پرندہ جہاں ایک لمحے کے لیے غافل ہوتا ہے' عموماً صیاد وہیں چھپا ہوتا ہے۔ ہم گاڑیوں کے قریب پہنچے ہی تھے کہ ایک کھردری سی آواز سنائی دی۔ "ہینڈز اپ!"

میں نے رائفل کندھے سے اتارنے کے لیے تیزی سے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ فائر کی آواز گونجی اور گولی میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزری۔ دونوں گاڑیوں کے عقب سے گنوں کی نالیں جھانک رہی تھیں۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آہستگی سے ہاتھ اٹھا دیے۔ گاڑیوں کے عقب سے دو مرد اور ایک عورت نکل آئی۔ پہلی نظر میں تو عورت بھی مرد ہی دکھائی دی تھی۔

میں نے فوراً ہی اسے پہچان لیا۔ وہ جانو کی بیوی تھی..... بلکہ بیوہ سونیا تھی لیکن اس وقت وہ ویسٹرن فلموں کا کوئی کردار معلوم ہورہی تھی۔ مجھے یاد پڑتا تھا کہ اس نے راکیل ویلچ کو کسی فلم میں اس حلیے میں دیکھا تھا۔ وہ ماڈیوائز جیسی جینز اور جیکٹ میں تھی۔ پیروں میں فل بوٹ تھے۔ سر پر صرف فیلٹ ہیٹ کی کمی تھی۔ اس کی جگہ وہ کھلاڑیوں جیسی پی کیپ پہنے ہوئے تھی۔ اس کی کمر کے گرد گولیوں کی پیٹی لپٹی ہوئی تھی اور ہاتھ میں لمبی نال اور لمبی ہی رینج کا ایک نہایت خطرناک بیریٹا پسٹل تھا۔

پی کیپ کے نیچے اس کے ریشمی تراشیدہ بال ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہلکورے سے لے رہے تھے۔ اس وقت شاید وہ کافی خوبصورت اور پُرکشش نظر آتی لیکن غیظ و غضب سے اس کا چہرہ کچھ بگڑا ہوا سا تھا۔ دو مرد جو اس کے ساتھ تھے' ان پر نظر ڈالتے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ڈاکو تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ جانو کے گروہ کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ ابھی اس کی نہ جانے کتنی نشانیاں باقی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ سونیا کو دیکھتے ہی نورین کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔

سونیا بھی غضبناک نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ دانت پیس کر بولی۔ "غدار کہیں کی! تجھے جو آرڈر ملا تھا تو نے اس پر عمل نہیں کیا اور ان کے ساتھ چل دی۔ تیرا کیا خیال ہے' ان کے ساتھ جاکر تو ملکۂ عالیہ بن جائے گی؟"

"میڈم! میں نے تو حکم پر عمل کیا تھا..... لیکن یہ لوگ بچ گئے....." نورین نے ہکلاتے ہوئے جھوٹ بولنے کی کوشش کی۔

"بکواس مت کرو۔" سونیا گرجی۔ "میں اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ تم لوگوں کے چہرے دیکھ کر جھوٹ سچ کا فرق بھی نہ سمجھ سکوں....." دوسرے ہی لمحے دھماکا ہوا اور نورین ڈھیر ہوگئی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہی محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل پر گولی ماردی ہو۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ سونیا گولی چلانے میں اتنی تیزی دکھائے گی۔ اس نے تو ویسٹرن فلموں کی ہیروئنوں کو بھی مات کردیا تھا۔

نورین اوندھے منہ گری تھی اور گرتے ہی ساکت ہوگئی تھی۔ اس کی پشت پر کندھے کے نیچے سوراخ نظر آرہا تھا جس سے خون اُبل رہا تھا۔ گولی یقیناً اس کے دل سے گزر گئی تھی۔ میں نے اس پر جھکنے کی کوشش کی لیکن سونیا خطرناک انداز میں پستول کو حرکت دیتے ہوئے بولی۔ "تم بالکل سیدھے اور ساکت کھڑے رہو ورنہ تمہارا بھی یہی انجام ہوگا حالانکہ تمہارے لیے میرے دل میں نرم گوشہ موجود ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ میرا شوہر اور گروہ کے زیادہ تر لوگ تمہاری وجہ سے مارے جاچکے ہیں لیکن شاید میں تمہیں معاف کردوں۔ شرط صرف یہی ہے کہ میرے سامنے ہیرو بننے کی کوشش نہ کرنا۔"

میں ساکت ہوچکا تھا لیکن اسے یقیناً اندازہ نہیں تھا کہ میرے دل میں کیسا شعلہ سا بھڑک اٹھا تھا۔ نورین بلاشبہ ہماری محسنہ تھی۔ اس نے موقع حاصل ہوتے ہوئے بھی ہماری ہلاکت کا سامان نہیں کیا تھا۔ ہم جس وقت تہہ خانے میں تھے' ہمیں گمان تک نہیں تھا کہ محض ایک بٹن دبانے سے ہمارے پرخچے بھی اُڑ سکتے تھے۔ نہ جانے اس کی کس سوچ نے ہمیں دوسری زندگی دی تھی اور اسے ہمارے سامنے کسی حقیر جانور کی طرح مار دیا گیا تھا۔ یہ حقیقت میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی لیکن میں اپنے سینے میں امنڈتے ہوئے غیظ و غضب کو دبائے بظاہر بالکل پُرسکون کھڑا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے زرتاج کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور

وہ ایک ٹک سونیا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سونیا کے دونوں ساتھی ڈاکوؤں نے ہمیں کور کیا ہوا تھا اور وہ پلک نہیں جھپک رہے تھے۔

سونیا حقارت آمیز نظروں سے زرتاج کا سراپا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "تم یقیناً زرتاج ہو..... میں نے تمہیں دیکھا نہیں تھا لیکن جانو کی زبانی تمہاری باتیں سُن سُن کر اندازہ ہو چکا تھا کہ تم کیسی عورت ہو گی۔ تمہارے عشق میں پاگل تھا وہ..... تمہارے ہی ہاتھوں انجام کو پہنچ گیا....."

"میں ابھی تک سمجھ نہیں سکی کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" زرتاج نہایت پُرسکون لہجے میں بولی۔

"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ جانو کو مار کر تم یہ مت سمجھ لینا کہ تمہیں اس علاقے میں دشمنوں سے نجات مل گئی....." سونیا تند لہجے میں بولی۔ "اب میں تمہیں پاکستانی پھولن دیوی بن کر دکھاؤں گی..... لیکن نہیں..... تم بھلا یہ سب کیسے دیکھ سکو گی۔ سب سے پہلے تو میں تم ہی کو ہلاک کروں گی۔ ابھی اور اسی وقت۔"

زرتاج بے ساختہ ہنس دی لیکن فوراً ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "میں نے تو سنا تھا کہ تم خاصی پڑھی لکھی عورت ہو....."

"اس میں کیا شک ہے۔" سونیا اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولی۔

"اس کے باوجود تم نے اتنے گھٹیا آئیڈیل بنا رکھے ہیں۔" زرتاج حقارت سے بولی۔ "پھولن دیوی بننا چاہتی ہو تم۔ لعنت ہے تم پر۔"

میری توقع کے برعکس سونیا نے لعنت کا زیادہ برا نہیں منایا تاہم کشیدہ سے لہجے میں بولی۔ "تم جیسے لوگوں نے اور تمہاری اس سوسائٹی نے اس کے علاوہ میرے لیے راستہ ہی کون سا چھوڑا ہے۔"

زرتاج نے میری طرف دیکھا اور ایک طویل سانس لی۔ "وہی معاشرے کا رونا.....! دنیا کے زیادہ تر بُرے لوگوں نے اپنی خباثتوں کا جواز گھڑنے کے لیے یہ اچھا افسانہ تراش رکھا ہے۔ بہت کم لوگوں کو بُرا بنانے میں معاشرے یا حالات کا ہاتھ ہوتا ہے لیکن الا اپنے کے لیے سب کو یہی راگ مل جاتا ہے۔"

نظریہ تو میرا اپنا بھی یہی تھا تاہم میں خاموش رہا۔ سونیا پر زرتاج کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ کھُردرے لہجے میں بولی۔ "بکواس بند کرو..... اور تم سب اپنے اپنے ہتھیار سامنے پھینک دو۔"

زرتاج اس کا حکم ان سُنا کرتے ہوئے بولی۔ "میں چاہتی ہوں' تمہیں مجھ جیسے لوگوں اور اس معاشرے سے شکایت نہ رہے۔ میں تمہیں موقع دیتی ہوں کہ تم اب بھی پھولن دیوی بننے کا خیال دل سے نکال دو۔ تم میرے ساتھ چلو۔ تمہیں باعزت زندگی گزارنے کے لیے جو بھی مدد درکار ہو گی وہ میں فراہم کروں گی۔ تم ذرا دبنگ قسم کی عورت معلوم ہوتی ہو۔ میں تمہیں اپنی زمینوں کی منیجر بنا دوں گی۔ میں چاہتی ہوں' عورتیں اس قسم کے کاموں میں بھی آگے آئیں۔ یہ پہلی مثال ہو گی کہ ایک بڑی زمیندارنی کی زمینوں کی منیجر بھی عورت ہو گی۔"

"مجھے چارہ مت ڈالو۔ مجھے معلوم ہے' تم اس قسم کے خواب دکھا کر مجھے لے جا کر پولیس کے حوالے کر دو گی۔ جانو کی بیوی اور اس کی شریکِ کار کی حیثیت سے میں بھی پولیس کو مطلوب ہوں۔" سونیا منہ بنا کر بولی۔

"میں اتنی چھوٹی عورت نہیں ہوں کہ جان بچانے کے خوف سے جھوٹ بولنے لگوں' جھوٹے وعدے کرنے لگوں۔ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جو وعدہ نبھانے کے لیے جان بھی دے دیتے ہیں۔ تمہیں پولیس سے بچانے کی ذمے داری بھی میں لیتی ہوں۔ اب تمہیں کیا اعتراض ہے؟ میں نے تو سنا تھا کہ تم اپنے شوہر کے ڈاکو ہونے سے بیزار ہو..... تم اس دلدل میں آ کر پھنس گئی تھیں..... یہ تمہارے آئیڈیلز نہیں تھے..... وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اب تم خود ڈاکو بننے نکل کھڑی ہوئی ہو۔"

"جانو ڈاکو تھا یا دہشت گرد' وہ بہرحال میرا شوہر تھا۔ میں اسے ہلاک کرنے والوں کو معاف نہیں کر سکتی۔ میرے ہاتھ اس سے پہلے بھی خون میں رنگے ہوئے ہیں۔ اب یہ غدار بھی میرے ہاتھوں مارا جا چکا ہے....." اس نے نورین کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ "اب تم لوگوں کو بھی زندہ چھوڑنے کا میرا ارادہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد میرے سامنے واپسی کا راستہ نہیں رہے گا۔"

"فی الحال تو راستہ موجود ہے لیکن اپنے لیے راستے تم خود بند کر رہی ہو۔" زرتاج بولی۔

"ان دو آدمیوں کے علاوہ بھی ابھی کچھ آدمی میرے ساتھ ہیں جو اپنی جان پر کھیل کر مجھے اپنی سردارنی سمجھ کر جانو کی چھوڑی ہوئی بادشاہت کی حفاظت کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں انہیں مرنے کے لیے چھوڑ کر تمہارے ساتھ میں پناہ نہیں لے سکتی۔ یہ میرے لیے جانیں دینے والے لوگ ہیں۔ میں بھی ان کی خاطر جان دے سکتی ہوں۔"

"دیکھا..... میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ اصل میں تم جیسے لوگوں کا خمیر ہی خراب ہوتا ہے۔ معاشرے اور حالات کے تو صرف بہانے ہوتے ہیں۔ صرف بُرے لوگ ہی بُرے لوگوں کے لیے جان دینے کو تیار رہتے ہیں۔" زرتاج بولی۔

سونیا کے ساتھی ڈاکوؤں میں سے ایک بے تابی سے کلاشنکوف کو حرکت دیتے ہوئے ہم پر سے نظر ہٹائے بغیر سونیا سے مخاطب ہوا۔ "میڈم! اس قصے کو جلدی ختم کریں۔ ابھی ہمیں اڈے پر واپس جا کر بہت سے کام نمٹانے ہیں۔"

سونیا اس کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ کے اشارے سے اسے گویا تسلی دیتے ہوئے بولی۔ "غم نہ کرو۔ میں بات ان سے کر رہی ہوں لیکن میرا دماغ دوسری طرف بھی کام کر رہا ہے۔ ہمارا بڑا نقصان ہے۔ سارا نقصان تو پورا نہیں ہو سکتا لیکن اگر ہم زرتاج کو ساتھ لے چلیں تو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پورا ہو جائے گا۔"

شاید ایسے ہی موقعوں کے لیے کہا گیا ہے کہ لالچ بُری بلا ہے۔ اس لمحے میں سونیا کے جو عزائم نظر آ رہے تھے' اگر وہ ان پر قائم رہتی تو ہماری جانوں کو شدید خطرہ لاحق تھا۔ گنیں اب بھی ہمارے کندھوں پر تھیں لیکن جس طرح سونیا اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں کور کیا ہوا تھا اور جس طرح ہم پر نظر رکھی ہوئی تھی' ہمارے لیے گنیں کندھوں سے اتارنا' سیدھی کرنا اور فائر کرنا تقریباً ناممکن نظر آ رہا تھا۔ یہ معمولی سا کام ایک طویل اور پیچیدہ عمل نظر آ رہا تھا لیکن اگر سونیا صرف زرتاج کو بھی زندہ لے جانے کے چکر میں پڑ گئی تھی تو ہمارے لیے امید کی کوئی کرن نظر آنے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔

سونیا کی نظر زرتاج پر ہی مرکوز رہی لیکن وہ پسٹل کی خفیف سی جنبش سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "اگر تم یہ آدمی مجھے دے دو تو میں واقعی تمہیں پاکستانی پھولن دیوی بن کر دکھا دوں گی۔"

زرتاج ناگواری سے بولی۔ "یہ آدمی کوئی تحفے پر رکھا ہوا امرود نہیں ہے کہ میں اٹھا کر تمہیں دے دوں۔ تم اس آدمی سے خود ہی کیوں نہیں پوچھ لیتیں کہ یہ تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہے یا نہیں..... اور تمہیں پھولن دیوی بنانے کے "عظیم کارِ خیر" میں تمہارا ہاتھ بٹانا چاہتا ہے یا نہیں۔"

"مجھے لگتا ہے کہ یہ تمہارے جادو میں پھنسا ہوا ہے اس لیے تم سے ہی پوچھ رہی ہوں۔" سونیا بولی۔ "اسے جب میں نے پہلی بار اپنے اڈے پر جانو کے روبرو دیکھا تھا اور ہمارے آدمیوں نے اسے مارنے پیٹنے کی کوشش میں اس کے ہاتھوں مار کھائی تھی' اس وقت ہی نہ جانے کیوں میرے دل نے کہہ دیا تھا کہ یہ شخص جانو اور اس کے گروہ کی تباہی کا سبب بنے گا۔"

"اس کے باوجود تم اسے ساتھ لے جانا چاہتی ہو؟" زرتاج پُچھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ہاں۔ میرے خیال میں یہ من موجی ہے۔ اس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ اسے اپنا فائدہ نظر آئے یا کسی طرف اس کا دل پلٹ جائے تو یہ کسی کا بھی ساتھی بن سکتا ہے....."

اس الو کی پٹھی نے میرے بارے میں بہت ہی غلط اندازہ قائم کیا تھا۔ تاہم میں خاموش ہی رہا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں اس کی باتوں سے لطف اندوز ہوتا۔ اچانک اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکا اور دو ٹوک لہجے میں بولی۔ "میں تمہیں بچے کھچے گروہ کا سردار اور اپنا مالک و مختار تسلیم کر سکتی ہوں..... تم نے جو کچھ بھی کیا وہ سب معاف کر سکتی ہوں۔ ہماری طرف آ جاؤ..... زرتاج بے شک ایک دولت مند زمیندارنی ہے لیکن ہمارے پاس بھی کافی دولت موجود ہے۔ تم میرے ساتھ مل جاؤ تو ہم اس گروہ کو شاید پہلے سے بھی بڑا کر لیں..... زیادہ مضبوط' زیادہ طاقتور بنا لیں۔ زرتاج کے ساتھ رہ کر تمہیں کیا ملے گا؟ اگر اس نے تم سے شادی کر بھی لی ہوتی تو تمہاری عمر اس کی جوتیاں سیدھی کرتے ہی گزرتی..... اور اب تو اس کا بھی کوئی امکان نہیں..... کیونکہ تمہاری زندگیاں اب میرے ہاتھ میں ہیں....."

جب کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں کی زندگی اس کے ہاتھ میں ہے' تو مجھے بڑا عجیب لگتا ہے۔ نہ جانے کیوں اسی لمحے مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ اس کی اپنی زندگی انجام کے قریب پہنچ چکی ہے۔

میں نے زرتاج کی طرف دیکھے بغیر محسوس کیا کہ شاید اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ گھٹے گھٹے لیکن برہم سے لہجے میں بولی۔ "تم اب حد سے زیادہ ہی بکواس کر رہی ہو۔ افضل خان سے میرا کوئی معاشقہ نہیں چل رہا..... ہم شادی کی تیاریاں ہرگز نہیں کر رہے..... اور اگر ایسی کوئی بات ہوتی تب بھی میں اس طرح سرِراہ کھڑے ہو کر اسے ڈسکس کرنا ہرگز پسند نہیں کرتی۔ تمہیں افضل خان سے جو بھی پوچھنا ہے ویسے ہی پوچھ لو۔ اتنی بکواس اور دلیل بازی کی کیا ضرورت ہے؟"

سونیا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ بھی نشے کی عادی تھی۔ اس وقت بھی مجھے پنک میں لگتی تھی لیکن اسے اپنے اوپر خوب قابو تھا۔ تاہم نشے نے اس کے ذہن کو متاثر ضرور کیا تھا۔ اس کی باتوں میں کچھ نہ کچھ سنکی پن کی جھلک ضرور تھی۔

میں نے اپنی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک پیدا کرنے کی کوشش کی گویا میں دل ہی دل میں اس کی تجویز پر غور کرنے لگا تھا۔ سونیا کی نظر اب مجھ پر تھی۔ وہ پسٹل کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "کیا کہتے ہو؟"

"کیا اس قسم کی باتوں کا جواب بندوق کی نوک پر لیا جاتا ہے؟" میں نے اتنی دیر میں پہلی بار زبان کھولی۔

"مجبوری ہے..... فی الحال تو تم پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔" سونیا نے کندھے اچکائے لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر وحشت و درندگی کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔

"اگر اب بھروسا کرنا مشکل ہے تو پھر آگے چل کر بھی مشکل ہی ہو گا۔" میں نے گویا بات ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اب وہ بات ختم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے یقیناً میری آنکھوں میں دلچسپی کی چمک دیکھ لی تھی۔

"خیر..... ہم دیکھیں گے اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے..... فی الحال تم سب اپنی اپنی گنیں اپنے سامنے ذرا دور پھینک دو۔" سونیا نے شاہانہ انداز میں حکم دیا۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ کم از کم مجھے اور زرتاج کو زندہ ساتھ لے جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکی تھی۔ میں چاہتا تو اس کی پیشکش قبول کرنے کا ڈراما رچا سکتا تھا اور ان کے خفیہ اڈے تک پہنچ کر ان کے بچے کھچے گروہ کا بھی خاتمہ کرنے کی کوئی تدبیر کر سکتا تھا لیکن میں اب کسی لمبے چکر میں پڑنے کے لیے تیار

نہیں تھا۔ میں اس علاقے میں کچھ زیادہ ہی اُلجھتا جا رہا تھا۔ میں تو شاید کئی دن پہلے یہاں سے نکل جاتا لیکن حالات عجیب سے عجیب تر رخ اختیار کیے جا رہے تھے۔ اب میں ان حالات میں مزید اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا' فوری طور پر کرنا تھا۔

زرتاج سے گویا میرا کچھ ذہنی رابطہ سا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ میں جو کچھ سوچ رہا ہوں' جو کچھ کرنے لگا ہوں' زرتاج کو اس کا اندازہ ہے اور وہ اس میں میرا ساتھ دے گی۔

ہم نے اپنی اپنی گنیں اتارنے کے لیے ہاتھ کندھوں کی طرف بڑھائے۔ ہمارے آدمی ہم سے ذرا پیچھے تھے اور ایک دوسرے کے زیادہ قریب نہیں تھے۔ گو کہ میں مُڑ کر ان کی طرف دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن مجھے کسی حد تک ان کی پوزیشن کا اندازہ تھا۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ خاطر خواہ پھرتی کا مظاہرہ کرسکیں۔ تعداد بہرحال ہماری زیادہ تھی۔ ہم سونیا اور اس کے ساتھیوں کو کنفیوژ کرسکتے تھے۔

جونہی ہمارے ہاتھ کندھوں کی طرف بڑھے' سونیا اور اس کے ساتھی کچھ اور مستعد ہوگئے۔ ٹریگرز پر ان کی انگلیوں کا دباؤ بڑھ گیا۔ سونیا نے تو پسٹل دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا اور اس کا نشانہ میں تھا۔ زیادہ نشہ کرنے والوں کی آنکھیں عموماً دُھندلائی دُھندلائی سی رہتی ہیں لیکن اس کی آنکھوں میں اس وقت سانپ کی سی چمک تھی۔

"نہایت آہستگی سے گنیں کندھے سے اتارنا..... ذرا بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا..... یہ تمہاری زندگی اور موت کا سوال ہے....." سونیا نے خبردار کیا۔

کندھوں سے گنیں اتارنے تک ہم نے اس کی ہدایت پر عمل کیا یعنی ہاتھوں کو نہایت آہستگی سے حرکت دی۔ پھر بظاہر ہم گنیں اپنے سامنے پھینکنے لگے اور اسی لمحے ہمارے ہاتھوں نے تقریباً یکساں انداز میں حرکت کی۔ میں نے اپنی گن سونیا کے منہ پر دے ماری تھی اور زرتاج نے اس کے ساتھی کے منہ پر پھینکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے زمین پر گرتے ہوئے لوٹ لگائی تھی۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ فضا میں گونجی۔ ہمارا صرف ایک آدمی خاطر خواہ پھرتی کا مظاہرہ کرسکا۔ وہ کندھے سے گن اتارنے اور گر کر لوٹ لگاتے ہوئے برسٹ مارنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس برسٹ نے سونیا کے دونوں ہی آدمیوں کا بیک وقت کام تمام کردیا لیکن اس دوران ہمارا ایک آدمی بھی کام آگیا۔ باقی اتفاقاً ہی بچ گئے۔ قسمت ان پر مہربان تھی۔

سونیا نے مزید فائر کرنے کے بجائے پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کی تاکہ ہماری رسائی سے نکل جائے۔ چند قدم ہٹ کر وہ ہمیں دوبارہ نشانہ بنانے کی کوشش کرسکتی تھی لیکن میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ اس وقت تک اس کی ٹانگ میری رسائی میں آچکی تھی۔ میں نے ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔

وہ گر پڑی لیکن گرتے گرتے بھی اس نے پسٹل کر فائر کیا۔ گولی میرے سر سے ذرا بلندی سے ہی گزر گئی۔ اس کے بعد میں نے اسے گولی چلانے کا موقع نہیں دیا۔ میں اچھل کر اس پر جا گرا اور اس کا پسٹل والا بازو میرے ہاتھ میں آگیا۔ میں نے اسے کسی درخت کی ٹہنی کی طرح موڑ کر رکھ دیا۔ اس کے حلق سے ذبح کیے ہوئے بکرے کی سی آواز نکلی۔ شاید اس کا بازو جوڑ پر سے ہی اکھڑ گیا تھا۔

پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے جھپٹ کر اسے اٹھا لیا۔ اس آخری لمحے میں' میں نے اس کے چہرے پر پھیلی دہشت اور بے یقینی دیکھی لیکن میں نے وہ لمحہ سوچ بچار میں ضائع نہیں کیا۔ میں نے اسی کے پستول کی گولی اس کے سینے میں اتار دی۔ گولی بالکل اسی طرح عین اس کے دل سے گزر گئی جس طرح نورین کے دل سے گزری تھی۔ یہ میرا اندازہ تھا اور ان معاملات میں میرے اندازے شاذ و نادر ہی غلط ہوتے تھے۔ وہ گولی بھی اس کے پسٹل کی آخری گولی تھی۔ میں نے دوبارہ ٹریگر دبایا تو صرف کلک کی آواز سنائی دی۔

میں آہستگی سے گھوما۔ وہ جگہ اب کچھ اچھا منظر پیش نہیں کر رہی تھی۔ ایک لمحے پہلے تک جہاں زمین بے داغ تھی اب وہاں خون پھیلا ہوا تھا اور دھیرے دھیرے جذب بھی ہو رہا تھا۔ اس زمین پر شاید بہت ہی منحوس قدموں کی آمد و رفت رہی تھی جو خون کی پیاسی ہوگئی تھی ورنہ زمین ایسی ہوتی نہیں..... وہ تو اپنی کوکھ سے انسان کے لیے رزق اور دولت اُگلتی ہے.....

زرتاج میرے برابر آن کھڑی ہوئی تھی۔ وہ متاسفانہ سی نظروں سے سونیا کی لاش کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ عورت تھی..... اور ذرا مختلف قسم کی عورت تھی..... لیکن تم نے اسے ہلاک کرنے میں ایک لمحہ بھی تامل نہیں کیا۔"

میں نے نورین کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بھی عورت تھی..... اور ہماری محسنہ تھی۔ سونیا نے بھی اسے ہلاک کرنے میں ایک لمحہ بھی تامل نہیں کیا تھا۔"

"اوہ....." زرتاج نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "اس کے علاوہ..... اگر میں ایک لمحہ تامل کرتا تو شاید سونیا کی جگہ میری لاش پڑی ہوتی۔"

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" زرتاج ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔ "ہماری گاڑیوں میں ان سب لاشوں کو لے جانے کی گنجائش نہیں۔"

"گاڑی تو شاید ان لوگوں کی بھی کہیں آس پاس ہی موجود ہوگی۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہمیں لاشوں کو نہیں چھیڑنا چاہیے۔ کچھ کام پولیس کے لیے بھی چھوڑنا چاہیے۔"

ہم نے کچھ دور تک ادھر اُدھر گھوم پھر کر دیکھا۔ ہمیں ایک جگہ درختوں کے ایک جھنڈ کے عقب میں ایک جیپ کھڑی نظر آئی۔ جس وقت ہم لوگ گولڈ کی کلب کی تباہی کے نظارے میں محو تھے' شاید اس وقت سونیا اور اس کے ساتھی اس جیپ میں یہاں پہنچے تھے۔ میں نے اس جیپ کی تلاشی لی لیکن اس میں کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ ہم نے اسے وہیں چھوڑ دیا اور اپنی دو گاڑیوں میں بیٹھ کر واپس روانہ ہوگئے۔

ہم زرتاج نگر واپس پہنچے تو ایک پولیس پارٹی وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ ایک ڈی ایس پی ان کی قیادت کر رہا تھا۔ پولیس گاؤں کے ان لوگوں میں سے چند کے بیانات قلمبند کر رہی تھی جنہوں نے ڈاکوؤں سے مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ کمداران سے نمٹ رہا تھا۔ پولیس کا سامنا ہونے سے پہلے ہی زرتاج کو ان کے بارے میں تمام اطلاعات مل گئیں۔ وہ ابھی باغ میں ہی تھے۔

جو شخص ان کے بارے میں اطلاع لے کر آیا تھا' زرتاج نے اس سے کہا۔ "ٹھیک ہے..... انہیں اپنا کام کرنے دو۔ میں اس وقت سخت تھکی ہوئی ہوں۔ حویلی میں جا رہی ہوں۔ پہلے میں ذرا سستا لوں اور اپنا حُلیہ تھوڑا بہت ٹھیک کرلوں' اس کے بعد ڈی ایس پی صاحب کو میرے پاس لے کر آنا۔"

"ٹھیک ہے رئیسانی جی!" وہ شخص ہاتھ باندھ کر بولا اور زرتاج نے چہرے کا رخ حویلی کی طرف موڑ دیا۔

حویلی میں نچلی منزل پر کئی لاشیں اسی طرح پڑی تھیں۔ زرتاج نے اپنے آدمیوں کو مختلف کام سنبھالنے کے سلسلے میں ہدایات دیں اور میرے ساتھ اوپر کی منزل پر آگئی۔ مجھے اوپر کی منزل کے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ چند ہی منٹ میں لباس تبدیل کرکے اور اپنا حُلیہ کافی حد تک درست کرکے واپس آگئی۔ اس کام میں اتنی پھرتی دکھا کر اس نے گویا عورتوں کی روایت کو توڑ دیا تھا۔

میں اس وقت اسی بالکونی میں چق کے پیچھے کھڑا تھا جہاں سے میں نے کچھ دن پہلے جانو اور خمیسو خان وغیرہ کی آمد کا نظارہ کیا تھا۔ مجھے یقین کرنا مشکل محسوس ہو رہا تھا کہ اب ان لوگوں کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب یہاں میرا کام بھی ختم ہوچکا تھا۔ قدرت مجھ سے جو کام لینا چاہتی تھی' لے چکی تھی۔ اب مجھے یہاں سے رخصت ہوجانا چاہیے تھا۔ مجھے پولیس کی نظر میں آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے میرے لیے اُلجھنیں کھڑی ہوسکتی تھیں اور میرے یہاں سے نکلنے کے پروگرام میں تاخیر ہوسکتی تھی۔

زرتاج تھکے تھکے سے انداز میں ایک صوفے پر ڈھیر ہوگئی۔ میں نے رائفل اس کے صوفے کے سہارے کھڑی کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے' میرے رخصت ہونے کے لیے یہی وقت مناسب ہے۔ میں پولیس کے چکروں میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میں خاموشی سے رخصت ہوجاتا ہوں۔ آپ جس طرح مناسب سمجھیں پولیس کو کہانی سنا دیجیے گا۔"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "اب ایسی بھی کیا آفت آرہی ہے؟ یہ کون سا وقت ڈھونڈا ہے تم نے رخصت ہونے کا؟ ہم اتنی خطرناک صورت حال سے گزرے ہیں۔ تم کم از کم ایک آدھ دن تو سستا لو۔ پولیس کی تم فکر مت کرو۔ ان سے میں نمٹ لوں گی۔ اب میں اتنی بھی گئی گزری نہیں ہوں۔ شرافت اور امن سے رہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرا یہاں کوئی دبدبہ نہیں ہے۔"

"نہیں..... یہ مسئلہ نہیں ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے ہی..... نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ میں یہاں مزید ایک آدھ گھنٹا بھی رُکوں گا تو مزید اُلجھتا چلا جاؤں گا۔ اب میرا چلے جانا ہی بہتر ہے....."

تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد بالآخر اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی اور بولی۔ "کم از کم اپنا حُلیہ تو کچھ ٹھیک کرتے جاؤ..... میں تمہارے لیے کسی ڈھنگ کے لباس کا تو فوری طور پر بندوبست نہیں کرسکتی لیکن کم از کم صاف شلوار قمیص مہیا کرسکتی ہوں....."

اس نے ملازمہ کو ذرا بڑے سائز کی ایک شلوار اور قمیص کا انتظام کرنے کے لیے کہا۔ میری حالت اس وقت واقعی خانہ بدوشوں سے بدتر تھی۔ میں جب لباس تبدیل کرکے اور زرتاج ہی کی طرح اپنے آپ کو تھوڑا بہت "جھاڑ پونچھ" کر دوبارہ اس کے سامنے آیا تو وہ کسی سوچ میں ڈوبی بیٹھی تھی۔

میری آہٹ سن کر سر اٹھاتے ہوئے بولی۔ "سفر کے لیے تمہیں کچھ رقم کی بھی تو ضرورت ہوگی؟"

"میں نے کچھ انتظام کر رکھا ہے۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ نے مجھے جو سرونٹ کوارٹر دے رکھا ہے' وہاں ایک الماری میں' میں نے کچھ رقم چھپائی ہوئی ہے۔"

"اسے تو بھول جاؤ۔" زرتاج وثوق سے بولی۔ "تمہیں یاد نہیں' عبدل جو وہاں تمہارا کھانا وغیرہ پکاتا تھا' غدار تھا..... جانو کا ایجنٹ تھا..... جب وہ اور جانو وغیرہ حویلی میں گھسے تھے تو وہ خود اپنے منہ سے کہہ رہا تھا کہ وہ تمہارے کمرے کی اچھی طرح تلاشی لے چکے تھے۔ جب ڈاکو بہت اچھی طرح تلاشی لے چکے ہوں تو تمہیں وہاں رقم محفوظ رہ جانے کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔"

اس کی بات معقول تھی۔ میں تذبذب کے سے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ وہ اٹھی اور ملحقہ کمرے میں چلی گئی۔ چند لمحے بعد وہ واپس آئی اور نوٹوں کی ایک گڈی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یہ رکھ لو..... گھر میں اس وقت زیادہ کیش نہیں ہے۔ تم آج کا دن رُکتے تو جتنی رقم کا چاہتے' بندوبست ہوسکتا تھا۔"

وہ بڑے نوٹوں کی سرپہ مرگڈی تھی۔ ایک لاکھ روپیا تھا۔ میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ "آپ اسے کم سمجھ رہی ہیں؟ میرے لیے تو یہ بہت زیادہ ہے۔ میں اتنی رقم کا کیا کروں گا؟ مجھے

کون سا جہاز سے سفر کرنا ہے اور فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ٹھہرنا ہے۔ میں تو آج کل صحیح معنوں میں عوامی زندگی گزار رہا ہوں اور لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ مجھے تو پانچ دس ہزار روپیا دے دیجئے۔ میرے لیے بہت ہوگا۔ کافی دن عیش و عشرت سے گزر جائیں گے۔"

"مذاق مت کرو۔ مجھے معلوم ہے' یہ رقم تمہارے لیے نہایت معمولی ہے لیکن تم اسے بوجھ سمجھ کر قبول نہیں کر رہے۔ خدا کے لیے اسے بوجھ مت سمجھو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ تم خود مجھ پر کتنے بڑے احسانات کا بوجھ چھوڑ کر جا رہے ہو۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"میں نے اگر کوئی اچھا کام کیا ہے تو اسے خود پر احسان مت سمجھیں۔ یہ سب کچھ بس خود بخود ہوتا چلا گیا۔ جہاں تک رقم کا تعلق ہے تو ان دنوں میرے لیے بڑی سے بڑی رقم بھی حقیر ہو کر رہ گئی ہے۔ میں جن حالات سے گزر رہا ہوں ان میں کئی بار مجھے احساس ہوا کہ بعض اوقات نوٹوں کی گڈیاں انسان کے لیے ردی کاغذ کے پرزوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں....." میں نے کہا تاہم اس کے اصرار پر مجھے وہ گڈی اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھنا پڑی۔

"میں نے ملازمہ کی زبانی پیغام بھجوا دیا ہے...." زرتاج بولی۔

"حویلی کے باہر ڈرائیور آچکا ہوگا۔ وہ پیجرو میں تمہیں بس اڈے تک لے جائے گا۔ بس سے تم ڈھرکی چلے جانا اور وہاں سے کراچی جانے کے لیے کوئی بھی ٹرین پکڑ لینا۔"

"میں آپ کی عنایات کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔" میں نے کہا۔

"پھر کب ملاقات ہونے کی امید رکھی جائے؟" اس نے منہ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ میں نے اس کے لہجے میں افسردگی کی جھلک محسوس کی۔

"زندگی رہے تو ملاقات کی امید رہتی ہی ہے۔" میں نے کہا۔ اس نے شکوہ نہیں کیا کہ میں نے اسے اپنا کوئی ایڈریس نہیں دیا تھا۔ اس نے مانگا بھی نہیں تھا۔ ادھر انا تھی اور اُدھر ایک بے وجہ سی احتیاط۔

میں نیچے آگیا' ابھی تک گیٹ پر گارڈز اپنی ڈیوٹی پر واپس نہیں آسکے تھے اور گیٹ کھلا ہی تھا۔ میں حویلی کی بالکونی کے نیچے سے نکل کر برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گیٹ کی طرف بڑھا۔ ابھی میں دو تین قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ ایک باوردی پولیس والا ہچکچاہٹ آمیز سے انداز میں اندر داخل ہوا۔ کسی طرف سے ایک ملازمہ اسے روکنے کے لیے آگے بڑھی لیکن اسی لمحے اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔

ایک لمحے کے لیے ہم دونوں ساکت رہ گئے۔ اس نے مجھے اور میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ انسپکٹر رحیم گل تھا اور حویلی کی طرف غالباً تنہا ہی آیا تھا۔ نہایت پھرتی سے اس نے ریوالور نکال کر مجھ پر تان لیا۔ میں اس وقت بالکل نہتا تھا۔ میں نے پلٹ کر بھاگنے یا ادھر ادھر ہونے کی کوشش نہیں کی۔

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بلا تمہید بولا۔ اس وقت تک وہ طویل و عریض احاطے کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔

"میں اس وقت خود اپنے علاوہ کسی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ درحقیقت میں اس کی کسی صورت حال کے اندیشے کی وجہ سے یہاں مزید نہیں رک رہا تھا لیکن اس قسم کی صورت حال پھر بھی میرے سامنے آنی ہی تھی۔

"میں ہر حال میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔" وہ ضد انسانوں کے سے انداز میں بولا۔ معلوم نہیں وہ اکیلا کس چکر میں حویلی کی طرف نکل آیا تھا۔ باقی پولیس والے شاید ابھی باغ اور گاؤں میں ہی اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ رحیم گل ان کے ساتھ نہیں بلکہ الگ ہی اپنے طور پر آیا ہو۔ احاطے میں اس وقت بھی کئی لاشیں پڑی تھیں اور رحیم گل کے تیور کچھ ایسے تھے جیسے وہ ان میں ایک اور لاش کا اضافہ کرنا چاہتا ہو۔

"آخر تم کیوں مجھے ساتھ لے جانے پر تُلے ہوئے ہو؟" میں نے ملازمت سے پوچھا۔

"کیونکہ تم ایک خطرناک مجرم ہو۔ قتل اور ڈکیتی کی کئی وارداتوں میں مجھے مطلوب ہو۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔

"تمہیں یا قانون کو؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"ایک ہی بات ہے۔" وہ بولا۔ حالانکہ اس بدبخت کو معلوم ہو چکا تھا کہ میں نے اس کی جان بچائی تھی۔ اس کے باوجود وہ نہ جانے کیوں اپنے خیال پر اڑا ہوا تھا۔

"میں مجرم نہیں ہوں..... نہ ہی میں نے کسی بے گناہ کو قتل کیا ہے اور نہ ہی میں نے کوئی ڈاکا ڈالا ہے۔" میں نے ملازمت سے کہا۔ "مجھے جانے دو۔"

"اگر یہ باتیں اتنی ہی آسانی اور سادگی سے طے ہو جایا کرتیں تو پھر پولیس اور عدالتوں وغیرہ کی کیا ضرورت تھی۔" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔

"تمہیں یقین ہے کہ میں ایک خطرناک مجرم ہوں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ وہ کچھ گڑبڑا گیا۔

"میرے یقین کو چھوڑو۔ فیصلہ عدالت میں ہوگا۔ میرا کام تمہیں گرفتار کر کے عدالت میں پیش کرنا ہے۔ واقعاتی اور ظاہری شہادتیں تمہارے خلاف ہیں۔" وہ تیزی سے بولا۔

"بعض اوقات انسان کی آنکھیں اسے دھوکا دیتی ہیں اور تم بھی بہرحال ایک انسان ہو۔" میں نے کہا۔ "کچھ وقت ضرور لگے گا لیکن حقائق بہرحال تمہارے علم میں آجائیں گے۔ فی الحال مجھے جانے دو۔ میں یہاں اُلجھنا نہیں چاہتا....." میں نے چلنے کے لیے قدم بڑھایا۔ میری نظر اس کی اس انگلی پر جمی ہوئی تھی جو ٹریگر پر تھا۔ ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ خطرناک حد تک بڑھ گیا۔

اچانک ایک فائر ہوا۔ مجھے جھٹکا سا لگا لیکن پھر احساس ہوا کہ گولی مجھے نہیں لگی تھی۔ فائر رحیم گل نے نہیں کیا تھا بلکہ اس کے ہاتھ سے تو ریوالور نکل کر دور جا گرا تھا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ بالکونی کی چق اٹھی ہوئی تھی۔ زرتاج رائفل لیے بالکونی میں کھڑی تھی۔ میں دل ہی دل میں اس کے نشانے کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ رحیم گل کبھی اپنے خالی ہاتھ کی طرف اور کبھی زرتاج کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس کا ہاتھ زخمی نہیں ہوا تھا۔

"اسے جانے دو رحیم گل!" زرتاج بلند لیکن پُرسکون آواز میں بولی۔ "یہ تمہارا مطلوبہ آدمی نہیں ہے۔ اس نے تو انکا تمہاری جان بچائی تھی۔ یہ ایثار کا قیدی ہے۔ اس نے بڑے افسانوی انداز میں کسی کے لیے ایثار کرنے کی کوشش کی تھی اور تمہاری نظر میں مجرم بن گیا۔ میں تمہیں اس کی پوری کہانی سنا دوں گی لیکن فی الحال اسے جانے دو۔"

"کہانیاں بعد میں سُنی جاتی رہیں گی اور ان کی حقیقت کا بھی پتا چل جائے گا لیکن فی الحال میں اس کو گرفتار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔" رحیم گل بلند آواز میں بولا۔ وہ اپنی ضد پر قائم تھا۔ اس سے جو کچھ کہا جا رہا تھا' اگر وہ کسی حد تک اس کی صداقت کا قائل تھا تب بھی کارروائی وہ اپنی مرضی کے مطابق ہی کرنا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں وہ کسے مطمئن کرنا چاہتا تھا۔ قانون کو' اپنی انا کو یا اپنی شکی طبیعت کو؟

"اسے خواہ مخواہ اپنی انا کا مسئلہ مت بناؤ رحیم گل! میرا مہمان جانا چاہتا ہے تو اسے جانے دو۔ یہ تو تم پولیس والوں پر بھی بہت سے احسانات کرکے جا رہا ہے۔ تمہارے حصے کا بہت سا کام نمٹا کر جا رہا ہے جو شاید تم جیسے بہت سے آفیسرل کر زندگی بھر میں بھی نہ نمٹا پاتے۔" زرتاج جذبات میں آکر ایسی بات کر گئی جو میرے خیال میں غیر ضروری ہی تھی۔

رحیم گل چونکا۔ اسے یقیناً یہ تو معلوم ہو ہی چکا ہوگا کہ گزشتہ رات زرتاج نگر میں کیسی خونریزی ہوئی تھی۔ یہ زرتاج نگر والوں کی خوش قسمتی تھی کہ خون ڈاکوؤں کا بہا تھا۔ اگر ڈاکو اپنی حکمتِ عملی میں کامیاب ہو جاتے تو صورت حال اس کے بالکل اُلٹ ہوتی۔ گاؤں والوں کا تو صرف جانی ہی نہیں' مالی نقصان بھی بے اندازہ ہوتا۔ نہ جانے کتنے گھروں کو آگ لگتی اور کیا کچھ اُجڑتا۔

رحیم گل سر کو خفیف سی حرکت دیتے ہوئے بولا۔ "اس صورت حال میں تو اس شخص کا یہاں رکنا اور بھی ضروری ہے۔ ہمیں اس سے بہت کچھ پوچھنا ہوگا۔"

"تمہیں جو کچھ پوچھنا ہوگا وہ مجھ سے پوچھ لینا۔ میں جواب دوں گی۔ اس کے بعد مجھے بھی پولیس کے چکھے سے بہت سے سوالات کرنے ہیں۔ ہو سکے تو تم بھی ان کے جواب دینے کی کوشش کرنا۔" زرتاج بولی۔

میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ رحیم گل نے بازو پھیلا کر راستہ روک لیا۔ زرتاج نے دوسرا فائر کیا۔ اس کی ٹوپی جا گری۔ زرتاج سرد لہجے میں بولی۔ "میں اس ٹوپی کی توہین نہیں چاہتی تھی لیکن تم مجھے مجبور کر رہے ہو۔ دوسری گولی اس ایک انچ نیچے بھی آسکتی ہے۔"

رحیم گل اپنی جگہ ساکت ہو گیا لیکن اسی بے خوف لہجے بولا۔ "آپ سرکاری کام میں مداخلت اور ایک پولیس آفیسر قاتلانہ حملے کی مُرتکب ہو رہی ہیں رئیسانی! آپ کو اس کے نتائج کا سامنا کرنا ہوگا۔"

"میں اپنی نرم مزاجی کو بالائے طاق رکھنے پر مجبور ہو گئی انسپکٹر! اب میں بھی تیار ہوں اور تم بھی یہ دیکھنے کے لیے تیار کہ کس کو کن نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔" زرتاج کے لہجے پہلی بار میں نے فولاد کی سی سختی محسوس کی۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "تم جاؤ افضل خان! میں اور رحیم گل ایک دوسرے سے نمٹتے رہیں گے۔"

رحیم گل قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ "رئیسانی! آپ چاہے مجھے گولی مار دیں۔ میں خالی ہاتھ ہی اس شخص کو روکنے کی کوشش کروں گا۔"

"تم افضل خان کو روکو گے؟" زرتاج نے استہزائیہ سا قہقہہ لگایا۔ "یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے رحیم گل! یہ بالکل ایسا ہے جیسے کوئی بچہ کسی بپھرے ہوئے ہاتھی کا راستہ روکنے کی کوشش کرے۔ اگر تمہیں راستہ روکنے کا اتنا ہی شوق ہے تو ان ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کا راستہ روکا ہوتا جنہوں نے پچھلی رات زرتاج نگر پر دھاوا بولا تھا۔"

"اگر مجھے بروقت اطلاع مل جاتی تو میں ان کا راستہ روکنے کی کوشش بھی ضرور کرتا۔" رحیم گل نے پُروقار لہجے میں کہا پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں اس کو بھی ڈاکو ہی سمجھ کر اس کا راستہ روک رہا ہوں۔"

"اس وقت مجھے تم میں اور عام سے پولیس والوں میں کوئی فرق نظر نہیں آرہا۔" زرتاج نے متاسفانہ سے لہجے میں کہا۔

رحیم گل کو نہیں معلوم تھا کہ دو گرانڈیل افراد اس کے عقب میں پہنچ چکے تھے۔ وہ دبے قدموں آگے بڑھے اور غالباً زرتاج کے اشارہ پا کر انہوں نے اچانک رحیم گل کو دبوچ لیا۔ انہوں نے رحیم گل کے دونوں بازو اور گردن قابو میں کر لی۔ وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں چیختا رہا اور اپنے مؤقف کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے پلٹ کر اشارے سے زرتاج کا شکریہ ادا کیا اور رحیم گل کو بڑے پیار سے خدا حافظ کہہ کر نکل آیا۔ مجھے امید تھی کہ زرتاج اس سے اچھی طرح نمٹ لے گی۔ وہ اپنی طاقت استعمال کر اُتر آئی تھی۔ اب اس کے لیے اس قسم کے مسائل کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔

حویلی کے باہر دیوار کی اوٹ میں ڈرائیور ہیرو لیے کھڑا تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور کچھ دیر کے سفر کے بعد ہم اس سڑک پر آن پہنچے جو آگے جا کر ہائی وے سے ملتی تھی۔ جب تک بس نہیں آئی اور ڈرائیور نے اسے روک کر مجھے اس میں سیٹ نہیں دلا دی تب تک وہ وہیں کھڑا رہا۔

بس سے میں ڈہرکی پہنچا۔ ڈہرکی کے ریلوے اسٹیشن پر مجھے دو ڈھائی گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ بالآخر ایک ٹرین آئی جو کراچی جا رہی تھی لیکن اس کی وہی حالت تھی جو عموماً ہمارے ہاں ٹرینوں کی ہوتی ہے۔ کہیں مسافر ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے اور کہیں سامان سے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ چڑھنے والے کون تھے اور اترنے والے کون۔ جو لوگ ٹرین کے اندر تھے' ان میں سے بیشتر کی کوشش تھی کہ کوئی سوار نہ ہونے پائے۔ انہوں نے دروازے بند کر رکھے تھے کیونکہ اندر تِل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔

بالآخر میں نے ریلوے کے ایک "اعلا افسر" یعنی قُلی کی خدمات حاصل کیں جس نے معقول "حق الخدمت" کے عوض مجھے ان مسائل سے نجات دلائی اور سلیپر میں ایک سیٹ مہیا کی۔ ٹرین چلنے تک میں چوکنا ہی رہا لیکن مجھے اسٹیشن پر کوئی بھی عام شخص یا پولیس والا ایسا دکھائی نہیں دیا جس کے بارے میں مجھے شبہ ہوتا کہ وہ میرے تعاقب میں وہاں آیا ہوگا۔ ٹرین چل پڑی تو میں ذرا بے فکر ہو کر اپنی سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔ گزشتہ شام سے میں مسلسل معرکہ آرائی میں اُلجھا ہوا تھا۔ اب حالتِ سفر میں آرام میسر آیا تھا۔

کسی وجہ سے اس روز تمام ٹرینیں بہت تاخیر سے کراچی پہنچ رہی تھیں۔ میں جس ٹرین میں تھا' وہ بھی اپنے اصل وقت سے کہیں بعد میں' رات گئے کراچی پہنچی۔ اس وقت تک میرا حلیہ دوبارہ بہت خراب ہو چکا تھا۔ شیو تو پہلے ہی بڑھی ہوئی تھی جو تقریباً داڑھی کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ بال منتشر تھے اور مٹی میں اَٹے ہوئے تھے۔ سفر کے دوران شلوار قمیص میں بری طرح شکنیں پڑ چکی تھیں اور راستے میں اس قدر مٹی اوپر گری تھی کہ وہ کپڑے ایک ماہ پہلے کے پہنے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے پلیٹ فارم پر اترنے کے بعد سوچنا شروع کر دیا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ اس سے پہلے میں نے اس موضوع پر غور کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ میں نے چند ہی لمحوں میں فیصلہ کر لیا کہ مجھے ایک عام آدمی کی حیثیت سے اپنے ہی فائیو اسٹار ہوٹل میں چلے جانا چاہیے۔

باہر آکر ٹیکسی میں بیٹھ کر جب میں نے ڈرائیور کو مطلوبہ ہوٹل چلنے کے لیے کہا تو اس نے مُڑ کر ذرا غور سے میری طرف دیکھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مُٹھیے سے ایک پریشان حال اور بے سروسامان دیہاتی نظر آنے والا شخص فائیو اسٹار ہوٹل کا رخ کس لیے کر رہا ہے؟ پھر اس نے گویا دل ہی دل میں اپنے آپ کو کسی جواز سے مطمئن کرتے ہوئے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہوٹل کے دروازے پر اتر کر میں نے اسے بھاری ٹپ دی تو اس کی باچھیں کھل گئیں اور اسے شاید اطمینان بھی ہو گیا کہ مسافر خواہ "پینڈو" اور بدحال تھا مگر اس کے پاس روپیا بہرحال موجود تھا۔

ہوٹل کا دربان جو ہر آتے جاتے کو دیکھ کر باچھیں پھیلا کر دروازہ کھولتا تھا' مجھے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر گویا شش و پنج میں پڑ گیا کہ دروازہ کھولے یا نہ کھولے۔ میں نے اس کی الجھن دور کر دی اور خود ہی دروازہ کھول کر اندر جا پہنچا۔

فائیو اسٹار ہوٹلوں میں عموماً رات کو دن سے زیادہ رونق ہوتی ہے لیکن اس رات وہاں خاص رونق نظر نہیں آرہی تھی۔ لابی اور لاؤنج خالی پڑا تھا۔ دائیں ہاتھ پر کافی بار میں بھی صرف دو تین نوجوان جوڑے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ ریسپشن پر صرف ایک ہی کلرک موجود تھا اور وہ بھی اونگھ رہا تھا۔

میری آہٹ سن کر اس نے سر اٹھایا اور ذرا چونک کر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ شاید اس کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایک مفلوک الحال' میلا کچیلا' دیہاتی سا شخص منہ اٹھائے فائیو اسٹار ہوٹل میں کیوں گھسا چلا آرہا تھا۔ اس وقت اگر کوئی میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے یہ بتانے کی کوشش کرتا کہ یہ میلا کچیلا' دیہاتی سا شخص اس ہوٹل کا مالک ہے تو شاید وہ اسے ایک بچگانہ مذاق سمجھتا۔ ویسے بھی وہ مجھے کوئی نیا ہی ری سپشنسٹ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سامنے تو اگر میں "صحیح" حلیے میں بھی جاتا تو اس کے لیے اجنبی ہوتا۔ بلکہ ایک اسی پر کیا موقوف' ہوٹل کا بیشتر عملہ مجھے صورت سے نہیں پہچانتا تھا۔

کاؤنٹر پر پہنچ کر جب میں نے ہوٹل میں قیام کا ارادہ ظاہر کیا اور اپنے لیے ایک لگژری سوئٹ طلب کیا تو استقبالیہ کلرک کچھ پریشان ہو گیا۔ شاید وہ مجھے سوئٹ تو کیا' سنگل کمرا بھی دینے سے انکار کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح ایسا کرے۔ محض ظاہری حلیے کی بنیاد پر کسی کو کمرا دینے سے انکار کرنا ہوٹلوں کی روایات کے خلاف تھا۔

اس نے بادل نخواستہ کارڈ میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے جان بوجھ کر نہایت کم پڑھے لکھے افراد کی طرح اس سے پوچھ پوچھ کر اسے اُردو میں پُر کرنا شروع کیا۔ خانہ پُری مکمل کرکے میں نے اس طرح گہری سانس لی گویا کوئی بہت کٹھن مرحلہ سر کر لیا ہو۔ پھر میں نے چاروں طرف سر گھما کر چمکتے دمکتے در و دیوار' جھلملاتے فرش اور جگمگاتے فانوسوں کا جائزہ لیا اور کچھ مرعوبیت' کچھ طمانیت سے سر ہلایا' گویا میں اپنے خوابوں کی سرزمین پر پہنچ گیا تھا۔

استقبالیہ کلرک نے غالباً مجھے مزید مرعوب کرنے کے لیے انگریزی میں پوچھا۔ "آپ کے پاس کوئی سامان وغیرہ نہیں ہے؟"

اس کے لہجے میں بظاہر ملائمت تھی لیکن درحقیقت اس کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔

"ہیں جی.....؟ کیا فرمایا؟" میں نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔ حالانکہ میرا اس قسم کی اداکاری کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس صورت حال سے میں خواہ مخواہ ہی کچھ لطف اندوز ہونے لگا تھا اور میں نے ان کی توقعات کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔

"میں نے پوچھا تھا کہ آپ کے پاس کچھ سامان وغیرہ نہیں ہے؟" کلرک نے اپنے سوال کا ترجمہ کیا۔

"سامان.....؟" میں نے اپنے اردگرد دیکھا گویا اس سے پہلے میں نے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ میرے پاس کچھ سامان بھی ہونا چاہیے تھا۔ "سامان فی الحال تو نہیں ہے جی..... لیکن یہ کون سا مسئلہ ہے..... سامان بھی آجائے گا۔"

میں نے لفٹ کی طرف سے ایک دراز قد سفید فام غیر ملکی کو کاؤنٹر کی طرف آتے دیکھا اور فیصلہ کیا کہ مجھے اپنے ڈرامے کو طول نہیں دینا چاہیے۔ کہیں خواہ مخواہ لوگوں کی توجہ میری طرف مبذول ہونے لگے۔ پہلے ہی ایک ویٹر ایک طرف دیوار کے سہارے کھڑا عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"آپ کب تک ٹھہریں گے؟" کلرک نے کارڈ کے اندراجات میں اس سوال کا جواب لکھا ہونے کے باوجود مجھ سے پوچھا۔ شاید دل ہی دل میں وہ دعا گو تھا کہ میرا قیام مختصر سے مختصر ہو۔ غیر ملکی اپنے کمرے کی چابی کلرک کو دے کر دروازے کی طرف بڑھ چکا تو میں نے کہا۔ "ہفتہ دس دن..... اس سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے اور کم بھی....." میں نے محسوس کیا کہ غیر ملکی نے بھی جاتے جاتے مڑ کر ایک نظر میری طرف دیکھا تھا۔

کلرک کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "آپ کو کم از کم پچیس ہزار روپے ایڈوانس جمع کرانے ہوں گے۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ فائیو اسٹار ہوٹلوں کی روایات سے انحراف کر رہا تھا اور ریلوے اسٹیشن یا لاری اڈے پر واقع ہوٹلوں کی طرح ایڈوانس مانگ رہا تھا حالانکہ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں اپنے معزز گاہکوں پر اعتبار کرنے کا "رسک" لیا جاتا ہے۔ انہیں زیادہ تر مہمانوں کے ساتھ میزبانی کی اعلیٰ ترین روایات کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے لیکن کلرک یقیناً مجھے ذرا الگ ہی "کیس" سمجھ کر ڈیل کر رہا تھا۔

میں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور جیب سے کچھ نوٹ نکال کر پچیس ہزار گن کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ تب اس نے کچھ اطمینان کی سانس لی اور غالباً یقین کر لیا کہ میرا حلیہ خواہ کیسا ہی سہی لیکن میں کنگال نہیں ہوتا۔

اس نے اشارے سے ویٹر کو بلایا اور چابی اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "صاحب کو اوپر پہنچاؤ۔"

ویٹر مجھے اداسی سے کرتے دیکھ چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ نیم دلی سے میرے ساتھ روانہ ہوا۔ لفٹ میں بھی میں دیہاتیوں کی طرح حیران سا ہو کر ادھر اُدھر دیکھتا رہا گویا پہلی بار لفٹ میں سوار ہوا ہوں حالانکہ میں مزید اداکاری کا ارادہ ترک کر چکا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے ویٹر کو عجیب سی نظروں سے اپنی طرف دیکھتے پا کر کچھ ایسا ہی کرنا پڑ رہا تھا۔

پانچویں منزل پر مجھے لگژری سوئٹ میں پہنچا کر اس نے میری آنے والی نسلوں پر احسان کرتے ہوئے مجھے سمجھایا کہ کوشش کی کہ کسی چیز کو کس طرح استعمال کرنا ہوگا، فون سروس والوں سے کس طرح رابطہ کرنا ہوگا..... وغیرہ وغیرہ۔ میں آنکھیں پھیلائے، سر ہلاتے ہوئے گویا اس کی باتیں نشین کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ رخصت ہونے لگا تو میں نے نہایت مؤدبانہ انداز میں سو روپے ٹپ پیش کی تب اس کا رویہ خاصا بدل گیا۔ اس کی پیشانی سے شکنیں دور ہو گئیں اور اس کے لہجے میں جو ہلکی سی کاٹ تھی وہ معدوم ہو گئی۔ وہ کافی مؤدب نظر آنے لگا۔ پیسے میں واقعی بڑا جادو ہے۔

وہ رخصت ہو چکا تو میں نے چند سیکنڈ بعد دروازے کی طرف آئی سے آنکھ لگا کر باہر دیکھا۔ میرا سوئٹ لفٹ کے قریب ہی تھا اور ویٹر ابھی لفٹ کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اسی اثنا میں دوسری لفٹ سے ایک اور ویٹر ٹرے ہاتھ پر اٹھائے آگیا۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔ میرے کمرے سے نکلنے والا ویٹر نوجوان تھا، دوسرا ذرا بڑی عمر کا تھا۔ نوجوان ویٹر بار بار میرے ہی کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میرے ہی بارے میں بات کر رہا تھا لیکن سائنڈ پروف ہونے کی وجہ سے آواز اندر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے بے آواز طریقے سے دروازہ نہایت ذرا سا کھول کر اس کان لگایا تو آوازیں سنائی دینے لگیں۔

نوجوان ویٹر کہہ رہا تھا۔ "..... اللہ کی شان ہے! کیسے کیسے لوگ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں آنے لگے ہیں۔ بس اب میں تمہیں بتاؤں کہ کیسا حلیہ تھا..... بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی گھسیٹوں میں کام کرتے کرتے یکدم منہ اٹھا کر ادھر بھاگ آیا ہو....."

پھر ذرا رازدارانہ انداز میں بولا۔ "لیکن یار! پیسے اس کے پاس ضرور ہیں۔ کھلے دل سے خرچ کر رہا ہے۔"

"کوئی نو دولتیا ہوگا۔" بڑی عمر کے ویٹر نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"لیکن نو دولتیے تو اپنا حلیہ وغیرہ اچھے سے اچھا بنا کر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔" نوجوان ویٹر بولا۔ "یہ آدمی تو مٹی میں لتھڑا ہوا تھا..... کپڑے چُرمُر تھے..... سر پہ خاک پڑی ہوئی تھی۔ شاید بے چارے کو منہ دھوئے بھی ہفتہ دس دن گزر چکے ہیں۔"

"تو پھر کہیں کوئی ڈاکو نہ ہو۔" بڑی عمر کا ویٹر دور کی کوڑی لایا۔

"لگتا تو نہیں ہے۔" نوجوان ویٹر بولا۔ "لیکن بھئی آج کل کسی کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ خیر..... ڈاکو بھی ہو تو ہمیں کیا۔ ان معاملات کو ہوٹل والے جانیں۔ ہمیں تو ہماری پگار ملتی رہنی چاہیے۔ ہمارے لیے تو وہی اچھا آدمی ہے جو ہمیں پیسے دے..... اور دل کھول کر دے۔"

اسی دوران لفٹ آگئی اور وہ دونوں اس میں گھس گئے۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر واپس آیا اور بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔ میں ایک خاصا طویل عرصہ جنگلوں بیابانوں میں جس قسم کی صعوبتیں اٹھاتے گزار کر آیا تھا اس کے بعد فائیو اسٹار ہوٹل کے لگژری سوئٹ کی آرام دہ اور پُرتعیش چیزیں عجیب لگ رہی تھیں لیکن مجھے اس ماحول سے مانوس ہوتے بھی دیر نہ لگی اور چند لمحے بعد ہی میں سب کچھ بھول بھال کر گھوڑے بیچ کر سو گیا۔

دوسری صبح میں نے ڈٹ کر ناشتا کرنے کے بعد اپنی حالت ٹھیک کرنے کی مہم شروع کی۔ سب سے پہلے کلفٹن جا کر ایک فیشن ایبل شاپنگ سینٹر سے اپنے لیے کچھ ڈھنگ کے کپڑے خریدے پھر ہوٹل کی باربر شاپ میں شیو بنوائی، بال ترشوائے اور ایک نہایت طویل، پُراہتمام غسل کے بعد نئے لباس میں آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو یوں محسوس ہوا جیسے میں نے ایک نیا جنم لیا ہو۔ مجھے کچھ یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں واقعی شہر واپس پہنچ گیا ہوں۔ میں اپنے لیے ایک سیاہ چشمہ اور خوبصورت سا فیلٹ ہیٹ بھی لے آیا تھا۔

میں نے اپنی شخصیت میں ان دونوں چیزوں کا اضافہ کر کے نئے سرے سے اپنا جائزہ لیا۔ بعض انگریزی فلموں میں ذرا بارعب قسم کے گروہ باز یا نائٹ کلبوں کے جوان مضبوط قسم کے مالک دکھائے جاتے ہیں، میں کچھ اسی قسم کی چیز دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے اس قسم کی ڈرامے بازی سے بدمزگی ہی محسوس ہوتی تھی لیکن فی الحال اس طرح کے چھوٹے موٹے سہارے لیے رکھنا بہتر تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہوٹل میں کوئی مجھے پہچانے۔ ہوٹل میں قیام کرنے والوں کو جس اسٹاف سے زیادہ تر واسطہ پڑتا ہے یا سامنا ہوتا رہتا ہے، وہ لوگ تو ویسے بھی مجھے نہیں پہچانتے تھے۔ میرے لیے بھی بیشتر شکلیں اجنبی ہی تھیں۔ خاص خاص عہدوں پر کام کرنے والے لوگ مجھے پہچانتے تھے۔ ان سے سامنا ہونے کا امکان کم ہی تھا۔ ہوٹل کے کارڈ میں، میں نے اپنا نام ایم۔ ایف خان درج کرایا تھا۔

دوبارہ باہر نکلنے سے پہلے میں نے ٹیلی فون پر رابطوں کی کوششیں شروع کیں۔ میں نے اپنے مقامی آفس فون کیا اور شفیع شاہ وغیرہ کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ پتا چلا کہ وہ لاہور ہی میں تھے۔ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے لیکن لاہور میں بھی ان کا کچھ پتا نہیں تھا۔ کسی کا ان سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔

کراچی آفس میں صرف چند ہی ساتھی "دی سرکل" میں شامل تھے۔ باقی دفتر میں کام کرنے والے عام سے لوگ تھے۔ انہیں "دی سرکل" یا ہماری چند گھریلو ہماری مصروفیات کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ اس لئے میں نے انہیں مزید کریدنے کی کوشش نہیں

کی اور نہ ہی اپنا نام بتایا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ شہر میں کوئی بھی میری موجودگی سے آگاہ ہو۔ میرے لئے یہ اطلاع ذرا تشویشناک تھی کہ شفیع شاہ وغیرہ ابھی تک لاہور سے واپس نہیں آئے تھے اور نہ ہی وہاں ان کا کچھ پتا تھا۔

ہوٹل کے کمرے سے براہ راست لاہور فون بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے آپریٹر کے توسط سے لاہور کے چند نمبروں پر بات کرنے کی کوشش کی۔ یہ نمبر ٹونی، راحیلہ اور شبیر شیخ وغیرہ کے تھے۔ آپریٹر بے چارے نے اپنی سی بہت کوشش کی لیکن ہر نمبر پر ہر بار کوشش کے باوجود کامیابی نہ ہوئی اور وہ یہی جواب دیتا رہا۔ "نو ریسپانس سر!"

میرے حواس میں کچھ ٹھٹک سی آن بسی اور میں ریسیور رکھ کر چند لمحے کے لیے ساکت بیٹھا رہ گیا۔ میں فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے لاہور جانا چاہیے یا نہیں؟ میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے اعصاب پر کچھ سستی سی چھا رہی تھی۔ جنگلوں اور دیہات میں مارا مارا پھرنے کے دوران میں شکار پر نکلے ہوئے درندے کی طرح چاق و چوبند اور مستعد رہا تھا لیکن شہر کی پُرتعیش رہائش نے مجھے فوراً ہی سُست کر دیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ حیثیات، یہ طرز زندگی میرے لیے نیا تو نہیں تھا۔ میں تو برسوں سے ان کا عادی تھا اور میں نے کبھی اپنے آپ کو اس طرح سُست محسوس نہیں کیا تھا۔ کہیں یہ ساتھیوں سے رابطہ نہ ہو سکنے کا اثر تو نہیں تھا؟ شاید یہ میرے لیے ایک ایسی بری خبر تھی جس کی میں توقع نہیں کر رہا تھا لیکن اس سے پہلے تو میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا تھا کہ میں بحران کا آدمی تھا یعنی، بحران کے دوران میں زیادہ مستعد رہتا تھا اور میری صلاحیتیں زیادہ ابھر کر سامنے آتی تھیں۔ میں اپنے آپ کو زیادہ پُراعتماد محسوس کرتا تھا لیکن اس وقت نہ جانے کیوں بدخبری کے آثار محسوس کرتے ہی میرے اعصاب پر تھکن سی سوار ہو گئی تھی۔

میں نے روم سروس کو فون پر بلیک کافی کا آرڈر دیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ہمارے کچھ غیر کاروباری سے ٹھکانے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ بذات خود ان ٹھکانوں پر جا کر اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ میری اسی اُدھیڑ بُن کے دوران ویٹر کافی لے کر آگیا۔ یہ وہ ویٹر نہیں تھا جو گزشتہ رات مجھے کمرے میں چھوڑ گیا تھا لیکن یہ بھی صبح مجھے برے حال میں دیکھ چکا تھا اس لیے اس وقت دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا بلکہ پہلے تو وہ مجھے اس سوئٹ میں ٹھہرے ہوئے شخص کا کوئی ملاقاتی سمجھا۔

مجھے پہچان لینے کے بعد اس نے صرف خوشگوار سی حیرت کا اظہار کیا، کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اپنے انداز و اطوار کی وجہ سے میں ویٹروں کی نظر میں آ رہا تھا۔ مجھے اس حد تک بھی کسی کی نظر میں آنے سے بچنا چاہیے

تھا۔

گرم گرم کافی حلق سے اُتری تو ذہن کی یخ بستگی کچھ کم ہوئی۔ میں کسی فیصلے پر تو نہ پہنچ سکا لیکن اپنے سوئٹ سے ضرور نکل کھڑا ہوا۔ مجھے کمرے میں بیٹھے بیٹھے کچھ وحشت سی ہونے لگی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ان خنک ہواؤں اور بند کمروں سے نکل کر سوچ بچار کرنا چاہیے۔

میں سوئٹ سے نکل کر لفٹ کے انتظار میں کھڑا تھا کہ ایک کونے سے داؤد چوہدری برآمد ہوا۔ وہ میرے ہوٹل کا سیکیورٹی انچارج تھا۔ اس وقت وہ غالباً غیر محسوس سے انداز میں گشت پر تھا۔ میں نے جلدی سے منہ پھیرنے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا۔ وہ مجھے بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔

"سر! آپ یہاں.....؟" وہ تیزی سے میری طرف لپکا۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور جب وہ قریب آگیا تو نہایت نیچی آواز میں کہا۔ "مجھے اصل نام سے مخاطب کرنے اور زیادہ مؤدب نظر آنے کی ضرورت نہیں۔ محض رسمی سا ملاقاتی نظر آنے کی کوشش کرو۔ مجھے صرف خان صاحب کے نام سے مخاطب کرسکتے ہو۔"

"کیوں سر.....؟ خیریت تو ہے؟" وہ ذرا چونکا پھر اس نے غیرارادی طور پر یوں ادھر ادھر دیکھا جیسے اسے توقع ہو کہ ہمارا کوئی دشمن آس پاس ہی کھڑا ہوگا۔

"ہاں..... بہ ظاہر خیریت ہی ہے..... لیکن شاید کچھ اتنی خیریت بھی نہیں ہے۔" میں نے مبہم لہجے میں کہا۔ "میں یہاں ایک عام مہمان کی حیثیت سے ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"سر..... اپنے ہی ہوٹل میں....." وہ ہکلایا۔

میں نے سخت نظروں سے اسے گھورا۔ "میں نے تمہیں احتیاط برتنے کی ہدایت کی تھی لیکن تم اس ہدایت پر بالکل عمل نہیں کررہے۔"

"آئی ایم سوری سر!" اس نے جلدی سے اپنے تاثرات بدلنے کی کوشش کی۔

"میں نے "سر" وغیرہ سے بھی پرہیز کرنے کے لیے کہا ہے۔" میں نے یاد دلایا۔

"جی..... جی..... خان صاحب۔" وہ ہکلایا۔ "پھر بھی..... آپ کچھ تو بتائیں..... کیا چکر ہے؟ میرے لائق کوئی خدمت؟" اس کا ہاتھ غیرارادی طور پر اپنے ماؤزر کے دستے پر تھا۔

"نہیں..... خدمت وغیرہ تو کچھ نہیں ہے۔ بس تم یہاں میری موجودگی کو راز رکھنے کی کوشش کرنا۔ جوش میں آکر اسٹاف کو مت بتا دینا کہ چوہدری صاحب یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔" میں نے ہدایت کی۔

عین اسی لمحے لفٹ ہمارے سامنے آکر رکی۔ کسی طلسمی دروازے کی طرح خاموشی سے دو نوں پٹ ایک دوسرے سے جُدا ہوئے اور ایک تنہا لڑکی اس چوکور قفس میں کھڑی دکھائی دی۔ ایک دُبلی پتلی، لمبی سی سفید فام لڑکی تھی۔ مغربی لڑکیاں قامت و وزرشیں کرکے اپنے آپ کو دُبلے پن کی اس سطح پر لے جاتی ہیں جہاں سے بدنمائی کی سرحد شروع ہوتی ہے۔

وہ لڑکی ابھی اس سطح پر نہیں پہنچی تھی۔ اسے خوبصورت کہا جاسکتا تھا۔ وہ کسی نفیس مگر موٹے سے نیوی بلیو کپڑے سے اسکرٹ میں تھی جو اس پر نہ جانے کیوں بہت جچ رہا تھا۔ اس کے بال عجیب رنگ کے تھے۔ چاندی اور سونے کا ملا جلا سا رنگ اور اس میں چمک آئینے جیسی تھی۔ ہونٹ بھرے بھرے رخساروں کی ہڈیاں کچھ زیادہ ہی ابھری ہوئی تھی۔

سب سے عجیب اس کی آنکھیں تھیں۔ پہلی نظر میں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی آنکھوں کا کوئی رنگ ہی نہیں تھا۔ شیشے کی دو شفاف مصنوعی آنکھیں اس کے چہرے پر جڑی ہوں لیکن ذرا توجہ سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ اس کی آنکھیں نہایت اور شفاف نیلے رنگ کی تھیں۔ آسیبی اور خوفناک قسم کی اجنبی فلموں میں بعض کرداروں کو ڈراؤنا بنانے کے لیے ان کی آنکھوں کا کچھ اسی قسم کے رنگ کی دکھائی جاتی ہیں یا اچانک ان کی آنکھوں کا رنگ تبدیل ہوتے دکھایا جاتا ہے۔

تاہم اس لڑکی کی شخصیت کا تاثر آسیبی یا ایسا خطرناک نہیں تھا۔ اس میں بہرحال ایک خوش شکل لڑکی والی کشش موجود تھی اور وہ لفٹ کی عقبی دیوار سے چپکی بالکل سیدھی کھڑی تھی۔ لفٹ کا دروازہ کھلتے ہی میں نے اسے ایک ٹک اپنی طرف دیکھتے پایا۔ وہ گویا بہت طویل ہوگیا۔ لڑکی پلک جھپکائے بغیر لفٹ سے باہر آئی اور چند قدم چل کر راہداری میں دائیں طرف مُڑ گئی۔

"یہ لڑکی کون تھی؟" میں نے داؤد چوہدری سے پوچھا۔

"معلوم نہیں سر.....! ہوٹل کی کوئی گیسٹ ہوگی....." وہ گڑبڑا کر بولا۔ "معلومات کروں اس کے بارے میں؟"

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے خدا حافظ کہا اور لفٹ کے ذریعے نیچے آگیا۔ میں کچھ دیر ہوٹل کے آس پاس فٹ پاتھ پر ٹہلتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ریڈ ڈاٹ کے مقابلے میں میرے ساتھیوں کی جدوجہد کس مرحلے میں تھی اور وہ خود کہاں تھے لیکن مجھے یہ اندیشہ ضرور تھا کہ شاید ریڈ ڈاٹ اب بھی کراچی اور لاہور میں ان تمام ٹھکانوں کی نگرانی کررہی ہو جن سے میرا تعلق تھا۔ نگرانی کرنے کا بھی ان کا اپنا ہی انداز تھا۔ عجیب وغریب اور ناقابل یقین سے وسائل ان کے پاس موجود تھے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کہاں سے کوئی نیلی آنکھ مجھے دیکھ رہی ہو۔ میں ذرا سا جائزہ لینے کے لیے ہوٹل سے نکلا تھا کہ گردوپیش کے بارے میں میرے محسوسات کیا کہتے ہیں۔

میں ٹہلتا ہوا خاصی دور تک چلا گیا اور چند منٹ بعد لوٹ آیا۔ مجھے کسی گڑبڑ کا احساس نہیں ہوا۔ میری حسیات میں کوئی ہلچل نہیں ہوئی تاہم ذہن کے کسی تاریک گوشے میں اضطراب کی نہایت خفیف سی لہر کروٹیں لے رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ کی اچانک تبدیلی تھی۔ میں اندرون ملک کے جن دور افتادہ علاقوں میں وقت گزار کر آرہا تھا وہاں کم از کم ریڈ ڈاٹ کی حد تک خطرے کا احساس نہیں رہا تھا۔ وہاں خطرات کی نوعیت بدل گئی۔ وہاں مجھے جن خطرات کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ زیادہ اہم نہیں ہوئے تھے لیکن ریڈ ڈاٹ کی بات کچھ اور تھی۔

کچھ دیر بعد میں ہوٹل واپس آگیا۔ گو کہ مجھے کسی گڑبڑ کا کوئی احساس نہیں ہوا تھا' اس کے باوجود میں نے اپنے دو ایک ٹھکانوں پر جانے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ میں ہوٹل کے کافی بار میں جا بیٹھا۔ کافی میں پی چکا تھا۔ اب طبیعت میں سستی اور ملال نہیں تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں نے جوس کا آرڈر دیا اور تازہ اخبار کی اوٹ سے غیر محسوس طور پر اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔

اچانک اخبار کے اوپر سے میری نظر انہی شفاف آنکھوں پر پڑی۔ آسیبی سی آنکھوں والی وہ لڑکی ایک ٹک میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے یاد پڑتا تھا کہ ایک لمحہ پہلے وہ اس کرسی پر موجود نہیں تھی اور چند منٹ پہلے میں نے اسے پانچویں منزل پر جاتے دیکھا تھا۔ لیکن خیر..... یہ کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں تھی۔ عین ممکن تھا' وہ ابھی آکر بیٹھی ہو۔

میرا اس سے سامنا چند لمحوں کے لیے ہوا تھا لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ شاید پلکیں بہت کم جھپکتی تھی۔ اب اس کی تحقیق کے لیے میں نے بھی ایک ٹک اس کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ میرے اس طرح دیکھنے پر عام طور پر مرد بھی نظر چُرا لیتے تھے لیکن اس نے نظر چُرانا تو درکنار' پلک تک نہیں جھپکی۔ اس کا انداز کچھ غیرفطری سا تھا۔ میری رگ وپے میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ انتہائی بری شہرت رکھنے والے کسی خطرناک اور بدشکل اجنبی کو دیکھ کر بھی میرے جسم میں کبھی اس طرح سرد لہر نہیں دوڑی تھی۔ وہ تو ایک اچھی خاصی خوبصورت لڑکی تھی لیکن لگتا تھا کہ اس میں واقعی کوئی آسیبی سی خصوصیت موجود تھی۔ اچانک اس کے سامنے ایک ویٹر آگیا۔ تب میں نے اس کی طرف سے نظر ہٹالینا ہی بہتر سمجھا اور اخبار کی اوٹ میں پناہ لے لی۔

اس قسم کے ہوٹلوں میں جس طبقے کی نشست وبرخاست ہوتی ہے اس میں کسی لڑکی سے تعارف حاصل کرنا کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا۔ مغربی تہذیب نے ہمارے ہاں بھی بہت سے خوبصورت اور مفید تکلفات یا حجابات ختم کردیے ہیں۔ دولت کی فراوانی نے ہمیں بہت سی رسوم اور حدود وقیود سے بے نیاز کردیا ہے۔ پھر وہ لڑکی تو ویسے ہی سفید فام تھی۔ اس کی تہذیب و معاشرت میں تو کوئی رکاوٹ ہی نہیں تھی۔ کوئی بھی اس کی میز پر جاکر اپنا تعارف کرا سکتا تھا اور اس کے تعارف کی فرمائش کرسکتا تھا۔ میں ایسا شرمیلا بھی نہیں تھا کہ مجھے اس سلسلے میں کوئی ہچکچاہٹ ہوتی۔ اس کے باوجود میں اٹھ کر اس کی میز پر نہیں جاسکا۔ حالانکہ میرا دل چاہ رہا تھا' مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوجائے۔

چند لمحے بعد دوسرا ویٹر میرے لیے جوس لے کر آیا۔ میں نے اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹایا تو وہ لڑکی اس نشست سے غائب تھی۔ میں نے نہایت آہستگی سے' غیر محسوس سے انداز میں سر گھماتے ہوئے پورے کافی بار کا جائزہ لیا۔ وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دی اور نہ ہی لاؤنج وغیرہ کی طرف جاتی نظر آئی۔ میرے دل میں بے عنوان سی خلش اور اضطراب کچھ بڑھ گیا۔ تاہم بظاہر میں سکون سے بیٹھا جوس کی چسکیاں لیتا رہا۔

وہ دن میں نے جوں توں ہوٹل میں گزارا۔ وہ لڑکی مجھے کافی بار میں نظر آنے کے بعد کہیں نظر نہیں آئی اور نہ ہی کوئی خاص واقعہ پیش آیا۔ رات کو میں سونے کے لیے لیٹا۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اس لڑکی کو خواب میں دیکھوں گا۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ نوکیلی ایڑی والے سینڈل پہنے میرے سینے پر کھڑی تھی اور اس کا وزن شاید کسی پہاڑ کے برابر تھا۔ وہ گویا گوشت پوست کی لڑکی نہیں' کسی انتہائی وزنی دھات سے بنا ہوا کوئی ٹھوس مجسمہ تھا۔ میری سانس سینے میں رُکی جارہی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اس کے سینڈلوں کی نوکیلی ایڑیاں میرے سینے میں کیوں نہیں اُتر گئی تھیں!

وہ سر ذرا جھکائے میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا' گویا وہ ہزاروں فٹ کی بلندی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس کے باوجود اس کی شکل نہ جانے کیوں بہت خوفناک لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے چہرے کی طرف پھیلائے ہوئے تھے۔ مخروطی انگلیوں والے یہ ہاتھ اس وقت نہ جانے کیوں عقاب کے پنجوں کی طرح بدصورت دکھائی دے رہے تھے اور ناخنوں کے سروں سے دودھیا دُھواں مل کھاتا فضا میں بلند ہورہا تھا۔

اچانک لڑکی نے کرخت اور ڈراؤنی آواز میں ایک طویل قہقہہ لگایا جس سے مجھے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ بالکل کسی ہارر فلم کا سا منظر تھا۔ اس قہقہے کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ خواب میں بھی انسان کو یہ احساس تو نہیں ہوتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ مجھے بھی یہ احساس نہیں تھا لیکن آنکھ کھلنے کے بعد بھی میرا یہ احساس برقرار رہا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن سینے پر وہی لڑکی نظر آتی رہی جس کا وزن پہاڑ کے برابر محسوس ہورہا تھا۔ گویا خواب کا تسلسل ابھی قائم تھا۔

میں نے اپنی تمام تر توانائی مجتمع کرکے ہلنے کی کوشش کی۔ جونہی میں ذرا سا ہلنے میں کامیاب ہوا' خواب کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ لڑکی یک دم غائب ہوگئی اور میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ میں نے ملگجے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھا۔ کمرے

میں میرے سوا کوئی نہیں تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے ایک عجیب سی بُو کا احساس ہوا۔ مجھے فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ کمرے میں کوئی گیس بھر رہی تھی اور اسی کی وجہ سے میرے حواس پر دُھندلاہٹ سی چھانے لگی تھی۔ اس اعتبار سے وہ ڈراؤنا خواب میرے حق میں بہت اچھا ثابت ہوا تھا کہ اس کی وجہ سے میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا ورنہ شاید میں سوتا ہی رہ جاتا اور میری عارضی نیند ابدی نیند میں تبدیل ہوجاتی۔

میں نے فوراً سانس روک لی۔ میں اسی روز بازار سے چھوٹا سا ایک نیا سفری بیگ لایا تھا۔ میں نے اسے بھی وہیں چھوڑ دیا۔ اپنی بچی ہوئی رقم البتہ اندرونی جیب میں ڈال لی۔ میں شب خوابی کا کوئی لباس اپنی شاپنگ کے دوران خرید کر نہیں لایا تھا اور خطرے کے لاشعوری سے احساس کے تحت پینٹ شرٹ میں ہی سویا تھا۔

سانس روکنے کے بارے میں مجھے کوئی تشویش نہیں تھی۔ یوگا کی مشقیں میرے بہت کام آتی تھیں۔ میں بہت دیر تک سانس روک سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ مجھے دوبارہ اس کمرے میں آنے کا موقع نہ ملتا اس لیے میں ذرا اطمینان سے اس پر الوداعی نظر ڈال کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس وقت میرے ذہن پر نیند کا خمار اور گیس کے اثرات کافی حد تک کم ہوچکے تھے۔ میں اپنے آپ کو چوکنا محسوس کررہا تھا۔

جب دروازے پر پہنچ کر میں نے ناب گھما کر دروازہ کھولنا چاہا تو میرا اطمینان رخصت ہوگیا۔ ناب بالکل جام تھی اور ذرا بھی نہیں گھوم رہی تھی۔ دروازہ نیچے سے تقریباً ائرٹائٹ تھا۔ شاید چابی کے سوراخ کے ذریعے ہی کمرے میں گیس بھری گئی تھی اور پھر اس میں کوئی خاص سیال انڈیل کر اسے جام کردیا گیا تھا۔ گویا میرے لیے ایک کشادہ، آراستہ و پیراستہ، آرام دہ قبر تیار کردی گئی تھی۔ ایٹچڈ باتھ اور وال ٹو وال کارپٹ والی قبر۔

اس قسم کی کسی کوشش کا مطلب یہی تھا کہ ریڈ ڈاٹ ابھی تک کراچی میں بھی میری تلاش کے سلسلے میں سرگرم تھی اور یہاں پہنچتے ہی مجھے ان کی نظریں آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ لاہور میں شاید صورت حال اس سے زیادہ خراب ہو۔ میرے لیے یہی تشویش کچھ کم نہیں تھی کہ ریڈ ڈاٹ کا مسئلہ ابھی جوں کا توں برقرار تھا لیکن فی الحال کمرے سے نکلنے کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ تشویش ناک تھا۔

میں نے کافی پیچھے ہٹ کر دو ڈگر دروازے پر کندھے سے ٹکر رسید کی۔ ہلکی سی دھمک کے ساتھ کمرے کی دیوار تک لرز گئی لیکن دروازہ جوں کا توں قائم رہا۔ دروازہ ٹھوس اور مضبوط تھا لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ اندر کی طرف کھلتا تھا۔ اگر میں اس پر باہر سے ٹکر رسید کرتا تو صرف تالا ہی رکاوٹ ہوتا لیکن اب تالے کے ساتھ ساتھ پوری چوکھٹ بھی رکاوٹ تھی کیونکہ باہر کی طرف دروازہ اس میں پھنستا تھا۔

دوسری ٹکر کے بعد ہی میں نے محسوس کرلیا کہ یہ صرف اپنے آپ کو تھکانے والی بات تھی اور اس کوشش میں میرے سانس روکنا بہت مشکل ہوا جارہا تھا۔ میں نے فون پر کسی سے رابطہ کرکے مدد حاصل کرنا چاہی لیکن فون ڈیڈ پڑا تھا۔ یہ میرے لیے حیرت کی بات تھی کیونکہ ہوٹل کے کمروں میں استعمال ہونے والے فون کی تاریں باہر تو نظر نہیں آتیں جنہیں کاٹ دیا جائے۔

اب میرے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا۔ مجھے موت سے خوف نہیں آتا تھا۔ بے بسی میرے لیے موت سے زیادہ خوفناک تھی۔ میں نے کسی کارآمد چیز کی تلاش میں کمرے کی چاروں طرف نظر دوڑائی۔ میرے مطلب کی کوئی چیز کہیں نظر نہیں آئی۔ میں ابھی تک اپنی سانس روکنے میں کامیاب تھا لیکن یہ آخر کب تک میرا ساتھ دے سکتی تھی۔

میں نے ایک موہوم سی امید کے سہارے باتھ روم کا دروازہ کھول کر وحشت زدہ انداز میں ادھر اُدھر دیکھا۔ ایک کیبنٹ اوپر سے مجھے ایک نوکیلی سی چیز جھانکتی نظر آئی۔ میں نے جلدی سے اوپر ہاتھ مارا اور وہ چیز میرے ہاتھ میں آگئی۔ اگر میں نے سانس روک رکھی ہوتی تو شاید اس وقت میں اطمینان کی گہری سانس لیے بغیر نہ رہ سکتا۔ وہ چیز گویا کسی دستِ غیبی نے خاص طور پر میری مدد کے لیے وہاں رکھی تھی۔

بظاہر وہ ایک حقیر سی چیز تھی۔ عام حالات میں ہمیں اس کی اہمیت کا قطعاً اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے بارے میں کسی کو محسوسات کم از کم ویسے نہیں ہوسکتے جیسے اس وقت میرے تھے۔

وہ ذرا بڑے سائز کا ایک پرانا سا اسکریو ڈرائیور تھا جس کا دستہ تھوڑا سا ٹوٹا ہوا تھا۔ باتھ روم کی فینسی لائٹس بالکل نئی آرہی تھیں۔ شاید حال ہی میں تبدیل کی گئی تھیں اور الیکٹریشن وہ اسکریو ڈرائیور وہاں بھول گیا تھا یا بے کار سمجھ کر بوجھ کر چھوڑ گیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہاں اس کی موجودگی کا منظر کچھ اور رہا ہو۔ بہرحال مجھے اس سے غرض نہیں تھی۔ میرے لیے تو اس کا میسر آجانا ہی کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

میں لپک کر دروازے تک پہنچا۔ باہر کی طرف سے تالے کی ساخت میں مضبوطی کا زیادہ بندوبست کیا گیا ہوگا لیکن اندر کی طرف فولاد کی صرف ایک پلیٹ تھی۔ اس کے چاروں پیچ کھولنے میں مجھے کچھ وقت پیش آئی لیکن پھر بھی شاید میں نے کم سے کم وقت میں کھولنے کا ایک ریکارڈ قائم کیا۔

اس کے نیچے لکڑی کا ایک مختصر سا ٹکڑا تھا جو تالے کی "زبان" یا لیچ (LATCH) کو روکے ہوئے تھا۔ میں نے اسکریو ڈرائیور ہی کے ذریعے اسے توڑ ڈالا۔ اسکریو ڈرائیور اس میں پھنس کر ایک جھٹکا دینا ہی کافی ثابت ہوا۔ "کرر ر ر" کی ہلکی سی آواز کے ساتھ مسئلہ حل ہوگیا۔

اب میں دروازہ کھول سکتا تھا لیکن میں نے اسے کھولنے

ت نہیں کی۔ میں ابھی کچھ دیر اور سانس روک سکتا تھا۔ میں نے ی دیر مزید انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں چاہتا تھا کہ باہر کوئی موجود ہو تو اسے یہ تاثر ملے کہ بالآخر میری جدوجہد دم توڑ چکی تھی اور میں مجھ پر اثر کرچکی تھی۔ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ اس دوران کوئی کمرے میں داخل ہونے کی کوشش تو نہیں کرتا۔

میں دروازے کے عقب میں مزید دو ڈھائی منٹ دیوار سے چپکا کھڑا رہا لیکن کسی نے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی باہر کوئی آواز سنائی دی۔ سکوت کے وہ لمحے اعصاب شکن تھے۔

آخر کار میں نے نہایت آہستگی سے دروازہ صرف اتنا کھولا کہ ناک باہر نکال سکوں۔ میرے پھیپھڑوں میں اب سانس کو مزید روکنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ میں نے نہایت آہستگی سے اپنے پھیپھڑوں میں مقید ہوا یا کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کی۔ اس وقت آہستگی سے اس ہوا کو خارج کرنا بھی ایک صبر آزما کام تھا۔ پھیپھڑے گویا پھٹ پڑنے کو تھے لیکن میں نے اپنی سانس کی آمد و رفت کی آواز پیدا نہ ہونے دی۔

جب تک میری ناک دروازے اور چوکھٹ کے درمیان رہی تب تک خیریت رہی، جونہی میں نے گردن باہر نکالی "ٹک" کی ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میں کچھ دیکھنے سے پہلے ہی اضطراری طور پر گردن نیچے کرچکا تھا۔ یہ حرکت میرے کام آگئی۔ کوئی چیز میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزری لیکن وہ گولی یقیناً نہیں تھی اور نہ ہی "ٹک" کی وہ آواز سائلنسر والے کسی پسٹل وغیرہ کی تھی۔

میں نے چھوٹے چاقو کے پھل جیسی کسی چیز کی جھلک دیکھی جو دروازے کی چوکھٹ میں پیوست ہوچکی تھی لیکن میں صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا کہ وہ کیا چیز تھی کیونکہ اس وقت میں کمرے سے نکل چکا تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ دروازے کے دائیں بائیں دونوں طرف دو افراد دیوار سے چپکے ہوئے تھے۔ اگر میں ان سے بچ کر لفٹ کی طرف بھاگنے کی کوشش کرتا تو ان دونوں کے پاس جو بھی ہتھیار موجود تھے، وہ انہیں استعمال کرسکتے تھے۔ ان سے الجھنے میں بھی جان کا خطرہ تھا لیکن اس طرح بھاگنے میں زیادہ خطرہ تھا۔ اس لیے دروازے سے نکلتے ہی میں لفٹ کی طرف بھاگنے کے بجائے دائیں طرف والے شخص کی طرف لپکا۔

میں اس وقت اتنی تیزی میں تھا کہ چیزیں مجھے بالکل اسی طرح دکھائی دے رہی تھیں جیسے چلتی ٹرین سے دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے وہ شخص سیاہ پوش دکھائی دیا تھا۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ گہرے رنگ کے بنوٹ میں تھا اور... سیاہ فام تھا۔ اس کے ہاتھ میں ذرا بڑے پسٹل سے مشابہ کوئی چیز تھی جس کی نال عام پسٹل سے کہیں زیادہ موٹی تھی۔ اس نے یقیناً اسی چیز سے مجھ پر فائر کیا تھا اور اس سے جو کچھ بھی نکلا تھا وہ یقیناً میری کھوپڑی سے اسی طرح گزر جاتا جیسے مکھن سے بلیڈ... کیونکہ میں نے اسے لکڑی کی چوکھٹ میں اسی طرح پیوست ہوکر غائب ہوتے دیکھا تھا۔ اس ہتھیار کی ایک بڑی خوبی تو یہی تھی کہ اس سے ہلکی سی "ٹک" کے علاوہ کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ دوسرا فائر کرپاتا، میری ٹھوکر اس کے ہاتھ پر پڑی۔ وہ چیز اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں جا گری۔ میں چونکہ اس کے بالکل پاس پہنچ چکا تھا اس لیے دوسرا شخص فائر کرنے سے باز رہا۔ ویسے مجھے اس وقت تک صحیح طور پر معلوم بھی نہیں تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ موجود تھا یا نہیں۔

سیاہ فام نے پسٹل نما چیز ہاتھ سے نکل جانے کے فوراً بعد ایک طرف کو جھکتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ میں نے اس کی گردن پر کراٹے کا ہاتھ رسید کیا اور فوراً ہی اس کی اوٹ میں ہونے کی کوشش کی تاکہ اس کے ساتھی کے حملے کے سامنے اسے ہی ڈھال بنا سکوں لیکن جونہی میں اسے اپنے سامنے لاتے ہوئے تیزی سے گھوما تو میں حیرت سے کرتے کرتے بچا۔ اس کا دوسرا ساتھی غائب ہوچکا تھا۔

اس کا غائب ہونا اس کی موجودگی سے زیادہ خطرناک محسوس ہوا۔ میں نے سیاہ فام کا سر دیوار سے ٹکرا دیا۔ کچھ اسی قسم کی آواز پیدا ہوئی جیسے میں نے لوہے کا گولا دیوار سے ٹکرا دیا ہو۔ نہ جانے وہ کس کے کمرے کی دیوار تھی۔ اس سے پہلے میں اپنے کمرے میں دو مرتبہ کندھے سے دروازے پر ٹکر رسید کرچکا تھا، اس سے بھی اچھی خاصی دھمک پیدا ہوئی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کوئی کسی کمرے کا دروازہ کھول کر نہ جھانکنے لگے اور خوفزدہ ہوکر چیخنے نہ لگے۔ اس طرح مدد میسر آنے کے بجائے میرے حق میں صورتِ حال خراب ہوسکتی تھی۔

سیاہ فام قالین پر ڈھیر ہوگیا اور میں نے لفٹ کی طرف چھلانگ لگائی۔ وہ لمحاتی سا سکوت مجھے بتا رہا تھا کہ کچھ ہونے والا تھا۔ مجھے جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ خوش قسمتی سے لفٹ اسی فلور پر موجود تھی اور اس میں کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک تیز رفتار لفٹ تھی لیکن اس وقت مجھے اس کی رفتار بہت کم محسوس ہوئی۔ تاہم میں خیریت سے نیچے پہنچ گیا۔

لابی میں کوئی نہیں تھا۔ ریسپشن پر ایک کلرک سُست انداز میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ شاید وہ سمجھا کہ میں اس کی طرف آرہا ہوں لیکن میں بیرونی دروازے کی طرف نکلتا چلا گیا۔ میرے اعصاب تاروں کی طرح تنے ہوئے تھے۔ ہر قدم پر مجھے دھڑکا سا محسوس ہورہا تھا کہ کسی کونے کھدرے سے کوئی عجیب سی چیز میرے لیے موت کی پیامبر بن کر نہ نکل آئے۔

دربان نے میرے لیے دروازہ کھولتے ہوئے قدرے تجسس سے میری طرف دیکھا۔ وہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ تاہم مجھے جاتے

دیکھ کر اس کے چہرے پر کچھ زیادہ حیرت نہیں تھی۔ ہوٹلوں میں دن رات لوگوں کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے لیکن ان آنے جانے والوں کے طور طریقے اور انداز ذرا مختلف ہوتا ہے۔ میرا رخصت ہونے کا انداز کچھ اور تھا۔

میں صحیح سلامت ہوٹل سے باہر بھی آگیا۔ شاید میرا تعاقب کرنے والے ابھی نیچے نہیں پہنچ سکے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ابھی مجھے اوپر ہی تلاش کیا جارہا ہو۔ شاید انہیں توقع نہ رہی ہو کہ میں اتنی جلدی ہوٹل چھوڑ بھاگوں گا۔ بہرحال میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے لیے تیار نہیں تھا کہ مجھے تلاش نہیں کیا جارہا ہوگا۔

ہوٹل کی حدود سے باہر سڑک کے کنارے ایک ٹیکسی کھڑی تھی مگر اس کا ڈرائیور سیٹ پر اس طرح لیٹا ہوا تھا کہ اس کی ٹانگیں کھڑکی سے نکلی ہوئی تھیں۔ سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا۔ بعض علاقوں کو صرف رات میں گزرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ شاید اس لیے اکا دکا ٹرک ہی گزرتے دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ اگر میں ڈرائیور کو جھنجھوڑ کر جگاؤں گا تو اس کے حواس صحیح طور پر بیدار ہونے اور اسے یہ سمجھنے میں کئی لمحے لگیں گے کہ میں مسافر تھا اور کہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد یہ بھی ممکن تھا کہ وہ غنودگی زدہ ذہن کے ساتھ ہی گاڑی چلاتا۔ چنانچہ میں نے اس چکر میں پڑنے کا تکلف ہی نہیں کیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا گریبان پکڑ کر اسے سیٹ سے ذرا اوپر اٹھاتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

مجھے امید تھی کہ چابیاں اس کی قمیص کی سامنے والی جیب میں ہوں گی۔ میں نے اس جیب میں ہاتھ مارا۔ میرا اندازہ درست ہی تھا۔ چابیاں فوراً ہی میرے ہاتھ میں آگئیں۔ میں نے خود ہی ٹیکسی اسٹارٹ کی اور اس طرح آگے بڑھائی کہ کار چیزنگ کے فلمی منظر کی طرح اس کے ٹائر بری طرح چرچرا اٹھے۔

جس وقت تک ڈرائیور پوری طرح ہوش میں آکر سیدھا ہو کر بیٹھا' اس وقت تک ہم ہوٹل سے کافی دور نکل آئے تھے۔ میری نظر عقب نما آئینے پر تھی۔ جب میں موڑ مڑ رہا تھا تو مجھے عقب نما آئینے میں ایک گاڑی کی ہیڈلائٹس کی نہایت تیز چمک دکھائی دی۔ یہ گاڑی ہوٹل کے پارکنگ لاٹ سے نکل کر سڑک پر مڑ رہی تھی۔ اس دوران میں نے موڑ عبور کرلیا۔ میں اس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ پایا۔

اس دوران ڈرائیور سنبھل چکا تھا۔ وہ قدرے خوفزدہ لہجے میں بولا۔ "صاب! تم کو گاڑی چاہیے تو لے جاؤ..... مگر ام کو تو ادھر اتار دو۔"

اسے اتنا خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ چاہتا تو کسی ہتھیار وغیرہ کا سہارا لیتے ہوئے مجھے دھمکانے کی کوشش کرسکتا تھا لیکن شاید وہ اچانک افتاد سے خوفزدہ ہوگیا تھا۔

میں نے گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھاتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "آرام سے بیٹھے رہو۔ مجھے نہ تمہاری ضرورت ہے نہ تمہاری گاڑی کی..... بس تھوڑی دیر کی بات ہے..... میں تمہیں تمہاری گاڑی سمیت چھوڑ دوں گا۔"

اسے شاید کچھ اطمینان ہوا۔ مزید کچھ نہ بولا لیکن اس کی چال سے اس کی گاڑی نے بولنا شروع کردیا۔ وہ کچھ زیادہ اچھی حالت میں گاڑی نہیں تھی۔ میں نے رفتار بڑھائی تو اس کی نہ جانے کیا کیا چیزیں کھڑکھڑانے لگیں۔ سڑکیں خالی ہونے کا یہ فائدہ تو تھا کہ میں اس پرانی سی گاڑی کو بھی کافی رفتار سے بھگا سکتا تھا لیکن ساتھ ہی یہ مشکل بھی تھی کہ خالی سڑک پر کسی کو ڈاج دینا زیادہ مشکل تھا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ابتدا ہی میں کافی دور نکل آنے کا موقع مل گیا تھا۔ جب تک مجھے دوبارہ وہی ہیڈلائٹس عقب نما آئینے میں دکھائی دیں تب تک میں ایک اور موڑ پر پہنچ چکا تھا۔ میری چونکہ کوئی خاص منزل نہیں تھی اس لیے میں نے تعاقب کرنے والوں کو کنفیوژ کرنے کے لیے یہی ٹیکنک اپنائی کہ میں سائڈ پر جو بھی موڑ آتا گیا میں اسی طرف گاڑی موڑتا چلا گیا۔

جس انداز میں میں موڑ کاٹ رہا تھا اس سے ڈرائیور بدحواس ہورہا تھا اور اس کی گاڑی نہ جانے کس کس انداز سے صدائے احتجاج بلند کررہی تھی۔ اس کھٹارا گاڑی کو اس طرح استعمال کرنے میں بھی اپنی قسمت کو کچھ زیادہ ہی آزمانے والی بات تھی تاہم گاڑی نے..... یا پھر شاید قسمت نے مجھے دھوکا نہیں دیا۔

مسلسل زگ زیگ کرتے کرتے بالآخر میں نے محسوس کیا کہ عقب نما آئینے میں وہ ہیڈلائٹس نظر آنا بند ہوچکی تھیں۔ میں اس دوران ایک تنگ مگر ٹوٹے سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ پھر ایک چھوٹے سے راؤنڈ اباؤٹ کے قریب سے گزر کر اچانک ہی میں نے خود کو کینٹ اسٹیشن کے سامنے پایا۔

میں نے عین سیڑھیوں کے سامنے ٹیکسی لے جاروکی۔ رات کے اس پہر بھی ایک پولیس والا سیٹی بجاتا ٹیکسی کی طرف لپکا۔ ڈرائیور کو ایک مصیبت سے تو نجات ملتی نظر آئی لیکن ساتھ ہی دوسری مصیبت اپنی طرف لپکتی نظر آئی اور وہ کراہنے کے سے انداز میں بولا۔ "مروا دیا..... میرے پاس تو اس کو دینے کے لیے بھی کچھ نہیں ہے..... اب تو شاید چالان ہی ہوجائے....."

میرے پاس اس وقت کوئی چھوٹا نوٹ نہیں تھا۔ میں نے ہزار کا نوٹ جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "بے فکر رہو..... میں مفت کی سواری نہیں ہوں..... ایسا مسافر تمہیں روز روز نہیں ملے گا جو گاڑی خود ہی چلا کر بھی لائے اور یہاں تک ہزار روپیہ کرایہ بھی دے۔ اس پولیس والے سے اب خود ہی نمٹتے رہنا....."

یہ کہتے ہوئے میں ٹیکسی سے اتر چکا تھا۔ ڈرائیو کو دم بخود چھوڑ کر میں سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ اس وقت تک مجھے مزید کوئی گاڑی

اسٹیشن کی طرف آتی دکھائی نہیں دی تھی لیکن میں اسی طرح تقریباً دوڑتا ہوا پلیٹ فارم پر آگیا جیسے مجھے کوئی گاڑی پکڑنی تھی لیکن پلیٹ فارم پر دائیں طرف کچھ دور تک چلنے کے بعد میں یک دم ہی بائیں طرف بنے ہوئے سیکنڈ کلاس کے ایک نئے ویٹنگ روم کی طرف مڑ گیا۔

اس ویٹنگ روم سے گزر کر میں دوبارہ باہر آگیا لیکن اب میں مرکزی دروازے سے کافی دور تھا اور یہاں اسٹیشن کی سیڑھیوں سے لے کر فٹ پاتھ تک خاصی بھیڑ بھاڑ تھی۔ سڑک پر مختلف سواریاں بھی موجود تھیں حتیٰ کہ دو بگھیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ میں تیزی سے اس ساری بھیڑ بھاڑ سے گزرتا اور اپنے چاروں طرف غیر محسوس طور پر نظر رکھے آگے بڑھتا چلا گیا۔

عوامی قسم کے ریستورانوں پر ناشتے کی تیاریاں شروع ہوچکی تھیں۔ برتن اور کڑاہیاں کھنک رہی تھیں۔ ویٹروں کی بھانت بھانت کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ فٹ پاتھ پر پڑی میزوں پر بھی کافی لوگ نظر آنے لگے تھے۔ میں ان کے درمیان سے گزرتا اسٹیشن کی قریبی گلیوں میں جا گھسا جہاں نچلے درجے کے کئی ہوٹل موجود تھے۔ یہ ذرا بہتر قسم کے..... بلکہ شاید خاصے معززانہ مسافر خانے تھے۔

میں آنکھیں تقریباً بند کرکے اور قسمت پر تکیہ کرکے ایک ہوٹل میں گھس گیا۔ ریسپشن پر ایک نوجوان بیٹھا قرآن پاک کی تلاوت کررہا تھا۔ اس نے مجھے ذرا انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔ میں ذرا ایک طرف کو ہو کر کھڑا ہوگیا تاکہ باہر سے مجھے نہ دیکھا جاسکے۔ ریسپشن پر چاروں طرف مقدس مقامات کی فریم شدہ تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ میں سانس درست کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ شاید میں کچھ ٹھیک جگہ پر ہی پہنچ گیا تھا۔ شاید میرے لیے یہاں پناہ اور حفظ و امان ہو۔

کلرک باریش نوجوان تھا۔ اس نے رکوع ختم کرکے قرآن پاک کو بوسہ دے کر ایک شیلف میں رکھا اور مہذبانہ لہجے میں بولا۔ "فرمایئے؟"

میں نے اسے بتایا کہ مجھے کمرا چاہیے۔ اس نے مجھے اپنے ہوٹل کے آداب کے بارے میں ایک مختصر سا لیکچر دیا کہ کمرا تو مجھے مل جائے گا لیکن میں وہاں کوئی بدمعاشی' کوئی غلط سلط حرکت کرنے کی کوشش نہ کروں اور ہوٹل کے واجبات ادا کیے بغیر بھاگنے کا خیال دل میں نہ لاؤں ورنہ میرے ساتھ بہت بری ہوگی۔ میں نے نہایت سعادت مندی سے وعدہ کیا کہ میں اس قسم کی کوئی گھٹیا حرکت نہیں کروں گا۔ اس نے واضح کیا کہ زمانہ خواہ کہیں بھی پہنچ چکا تھا اور دنیا میں خواہ کچھ بھی ہورہا تھا لیکن وہ کاروبار میں اعلیٰ روایات برقرار رکھنے کے لیے کوشاں تھا اور اپنے اصولوں پر قائم تھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے خراج تحسین پیش کیا۔ میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ وہ خود اس ہوٹل کا مالک تھا لیکن بوقتِ ضرورت اپنے ہوٹل میں ویٹر کے طور پر بھی خدمات انجام دیتا تھا۔

چند منٹ بعد میں اس ہوٹل کے نہایت چھوٹے سے بیڈ پر لیٹا حالات کے تغیر پر غور کررہا تھا۔ کچھ دیر پہلے میں اپنے فائیو اسٹار ہوٹل کے عالیشان لگژری سوئٹ میں لیٹا تھا اور اب اس ڈربا نما کمرے میں موجود تھا لیکن یہاں میں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس کررہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ میرا تعاقب کرنے والے اگر اسٹیشن کے سامنے کھڑی ٹیکسی تک پہنچنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو وہ یہی سمجھیں گے کہ میں نے اندر جاکر کسی ٹرین کے ذریعے فرار ہونے کی کوشش کی ہوگی۔ اگر انہوں نے ڈرائیور سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تب بھی انہیں یہی پتا چلے گا کہ میں اندر گیا تھا۔ اپنے آپ کو یہ اطمینان دلا کر میں سو گیا تاکہ میری نیند میں جو کمی رہ گئی تھی وہ پوری ہوسکے۔

دوپہر کے بعد اٹھ کر میں نے کمرے ہی میں کھانا منگوایا۔ اس ہوٹل کے کمروں میں فون نہیں تھا۔ ہر فلور پر صرف سننے کے لیے فون کی ایک اینٹینا رکھی تھی۔ فون کرنے کے لیے مجھے نیچے استقبالیہ کاؤنٹر پر جانا پڑا۔ ڈائریکٹری دیکھ کر میں نے ایک ٹریول ایجنٹ سے رابطہ کیا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ لاہور پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ اگر کراچی میں میرے پہنچنے کے ایک رات بعد ہی ریڈ ڈاٹ کو میری موجودگی کا علم ہوگیا تھا تو پھر میرے لیے کراچی اور لاہور میں یکساں ہی خطرات تھے۔ لاہور میں کم از کم میں اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرسکتا تھا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ جس پہلے ٹریول ایجنٹ سے میرا رابطہ ہوا' اس نے مجھے رات کی ایک فلائٹ میں ٹکٹ دینے کا وعدہ کرلیا۔ وہ مجھے میرے پتے پر بھی ٹکٹ بھجوا سکتا تھا لیکن میں نے احتیاطاً اس سے یہی کہا کہ میں فلائٹ سے ڈیڑھ دو گھنٹا پہلے اس کے ہاں سے ٹکٹ لے کر ائرپورٹ چلا جاؤں گا۔

باقی وقت میں نے ایک قیدی کی طرح اس ہوٹل میں گزارا اور شام کا اندھیرا ہونے پر ہوٹل سے نکلا۔ ایک ٹیکسی پکڑ کر میں ٹریول ایجنسی پہنچا۔ دفتر میں بھورے بالوں والی ایک میک اپ زدہ لڑکی چند ٹکٹیں لیے مسافروں کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس سے اپنا ٹکٹ لے کر ادائیگی کرکے میں اپنی روکی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ کر ائرپورٹ کی طرف روانہ ہوا۔

میں تمام راستے چوکنا رہا لیکن مجھے کسی گاڑی پر یہ شبہ نہیں ہوا کہ وہ میرا تعاقب کررہی تھی۔ مجھے اطمینان ہونے لگا لیکن میری قسمت میں زیادہ دیر کے لیے اطمینان نہیں تھا۔ گاڑی ابھی ٹرمینل کے قریب نہیں پہنچی تھی کہ میری نظر انکوائری بوتھ کی طرف چلی گئی۔ حالانکہ وہاں روشنی زیادہ نہیں تھی اور فاصلہ بھی خاصا تھا' اس کے باوجود میں نے بوتھ کے قریب کھڑی شخصیت کو پہچان لیا۔ وہ وہی آسیبی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ وہ شولڈر بیگ لٹکائے

بوتھ کے قریب ایک مجسمے کی طرح کھڑی تھی۔ ٹرمینل پر اگر کوئی مکمل تاریک گوشہ ہوتا تو شاید وہ وہاں کھڑی ہوتی۔ جہاں وہ کھڑی تھی وہاں سب سے کم روشنی تھی۔

"گاڑی روک دو اور ہیڈ لائٹس آف کردو۔" میں نے ڈرائیور کو ہدایت کی۔ اس نے گاڑی روک لی لیکن کچھ پریشان سا ہوگیا۔ ہیڈ لائٹس مجھے خود ہاتھ بڑھا کر آف کرنا پڑیں۔

میں اسے محض اتفاق نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ آسیبی آنکھوں والی لڑکی اس وقت ائرپورٹ پر موجود تھی۔ یقیناً ائرپورٹ کی نگرانی ہورہی تھی اور وہ لڑکی وہاں تنہا نہیں تھی۔ اس پُرہجوم مقام پر اس کے ساتھی نہ جانے کہاں کہاں بکھرے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا طریقۂ واردات بھی کچھ انوکھا ہی ہوتا تھا۔

صرف ایک لمحہ سوچنے کے بعد میں نے واپس ہولینے کا فیصلہ کیا لیکن ڈرائیور اگر ون وے کی پابندی کرتے ہوئے واپس مُڑنا چاہتا تو اسے ٹرمینل کے قریب جاکر راؤنڈ اباؤٹ کے گرد چکر کاٹ کر دوسری سڑک پر آنا پڑتا۔ ٹرمینل کے سامنے تیز چمکیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں ٹیکسی کو وہاں تک لے جانے اور واپس گھمانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

"گاڑی واپس موڑ لو۔" میں نے ڈرائیور سے کہا۔ "یہیں سے گھمالو۔"

"کیوں مروائیں گے صاحب! یہ ون وے ہے۔" ڈرائیور کراہا۔

"ادھر اندھیرا ہے اور ٹریفک سارجنٹ ٹرمینل کے پاس کھڑا ہے۔ اگر کوئی ادھر آیا تو میں خود اس سے نمٹ لوں گا۔ میں جس طرح کہہ رہا ہوں اسی طرح کرو۔ تمہیں بہت اچھی دہاڑی ملے گی۔" میں نے کہا۔ تب وہ خطرہ مول لینے پر آمادہ ہوا اور اندھیرے میں ہیڈ لائٹس آن کیے بغیر اس نے گاڑی واپس موڑی۔ کچھ دور پہنچ کر اسے درمیان میں راستہ میسر آگیا اور وہ دوسری طرف ہوگیا۔ میں گردن گھمائے پیچھے دیکھ رہا تھا۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد ڈرائیور بولا۔ "صاحب جی! اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو ایک بات پوچھوں؟"

"ضرور پوچھو بھائی! میں آج کل کسی بھی بات کا برا منانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ کیا کوئی سیاسی شخصیت ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"اللہ نہ کرے۔ تمہیں یہ شبہ کیونکر ہوا؟" میں نے جلدی سے سیدھا ہوکر بیٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے کافی حد تک یقین ہوچکا تھا کہ کوئی گاڑی میرا تعاقب نہیں کررہی تھی۔

"صاحب! میں نے دوسرے ڈرائیوروں سے سنا ہے..... اور مجھے خود بھی دو تین بار تجربہ ہوا ہے کہ بعض سیاسی شخصیتیں اسی طرح بھاگم بھاگ ائرپورٹ پہنچتی ہیں لیکن وہاں انہیں معلوم نہیں کیا نظر آتا ہے کہ ایک دم فلائٹ چھوڑ کر واپس بھاگ لیتے ہیں۔"

ڈرائیور بولا۔ وہ کافی ہوشیار معلوم ہوتا تھا۔

"دراصل وہ سیاسی کم..... اور "سیاہ سی" شخصیات زیادہ ہوتی ہیں لیکن میں نہ سیاسی شخصیت ہوں اور نہ سیاہ سی۔ میں تو ایک شریف آدمی ہوں۔ کچھ مجبوریوں کی وجہ سے مجھے ائرپورٹ سے واپس آنا پڑا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔ شارع فیصل پر کافی آگے آجانے کے بعد ایک بار پھر میرے سامنے یہ سوال آن کھڑا ہوا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے میں نے خواہ مخواہ ٹیکسی کو ادھر ادھر گھمانا شروع کردیا۔

اس وقت میں ڈیفنس کی ایک گلی سے گزر رہا تھا جب میری نظر ایک جانے پہچانے بنگلے پر پڑی۔ وہ ذرا مختلف اور منفرد ڈیزائن کا ایک خوبصورت بنگلا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی مجھے یاد آگیا کہ وہ سیٹھ رمضان کا بنگلا تھا۔ سیٹھ رمضان کسی زمانے میں ہوٹل میں میرا پارٹنر تھا۔ بعد میں میں نے اس کی خواہش پر اس کے حصے کے شیئرز خرید کر اسے الگ کردیا تھا لیکن اس سے دوستی برقرار تھی۔ یارباش آدمی تھا۔ ذرا الگ ہی قسم کی طبیعت پائی تھی۔ مدت ہوئی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت وہ کام بھی آسکتا تھا۔

کچھ آگے جاکر میں نے ٹیکسی رکوائی اور ڈرائیور کو فراخ دلی سے ادائیگی کرکے رخصت کیا اور ایک دوسری گلی میں گھس کر ذرا گھوم کر واپس سیٹھ رمضان کے بنگلے تک آیا۔ ٹیکسی جاچکی تھی۔ گلی سے اکا دُکا کاریں گزر رہی تھیں اور نہ جانے کیوں مجھے ہر کار کچھ پُراسرار سی لگ رہی تھی۔ اس گلی کا ماحول بھی کچھ پُراسرار سا ہی تھا۔ روشنی بہت کم تھی اور چاروں طرف عجیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بڑے بڑے محل نما مکانات اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود ویران ویران سے لگ رہے تھے۔

میں نے کال بیل بجائی تو ایک شخص نے بلند و بالا گیٹ کی مخصوص جھری سے میرا جائزہ لیا' نام پوچھا' پھر گیٹ کھولا۔ وہ مسلح گارڈ تھا اور چھوٹے سے گیسٹ ہاؤس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے گیسٹ ہاؤس میں بٹھایا اور انٹرکام پر سیٹھ رمضان کو اطلاع دی کہ کوئی افضل چوہدری صاحب اس سے ملنا چاہتے ہیں۔

چند لمحے بعد سیٹھ رمضان اس عالم میں ماربل کے خوبصورت فرش پر دوڑتا ہوا آتا دکھائی دیا کہ اس کے جسم پر صرف ایک ڈھیلی ڈھالی سی بنیان اور دھوتی تھی۔ اس کے پیروں میں چپل تک نہیں تھی البتہ ہاتھ میں لوٹا ضرور تھا جس سے پانی کی دھار وقفے وقفے سے بہتی آرہی تھی۔ اس وقت کوئی اسے دیکھتا تو شاید یہی سمجھتا کہ وہ گھر کا کوئی بدحواس قسم کا نوکر ہوگا۔ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اس محل نما بنگلے اور اس جیسی کئی دوسری املاک اور کاروبار وغیرہ کا مالک تھا۔ اس کی تعلیم بھی واجبی تھی اور انداز و اطوار ان پڑھوں والے ہی تھے۔ اس کے باوجود اس کے بہت سے کاموں میں بڑا سلیقہ نظر آتا تھا۔ بڑے بڑے پڑھے لکھے جغادری قسم کے لوگوں

حتیٰ کہ غیر ملکیوں تک سے اس کے مراسم تھے۔

مجھے دیکھ کر اس نے لوٹا لان پر پھینک دیا اور اچھل کر مجھ سے آن لپٹا۔ اپنے استخوانی بازوؤں سے وہ مجھے جھنجھوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "چوہدری! میرے یار..... تم کہاں مرگئے تھے؟ اتنے عرصے سے تمہاری شکل نہیں دیکھی..... کبھی فون تک نہیں کیا تم نے..... میں نے کئی بار فون کیا تو تمہارا کچھ پتا نہیں چلا۔"

"میں تقریباً مرہی گیا تھا رمضانی یار!" میں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ "بس یوں سمجھو کہ دوسری زندگی ملی ہے تو تم سے ملنے آگیا ہوں۔ بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں۔"

وہ رنڈوا تھا۔ اس کی شادی شدہ بیٹی اور بیٹا اس بنگلے میں اس کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ مجھے اپنے شاندار بیڈ روم میں لے گیا۔ نوکروں کو اس نے میری خاطر تواضع کے لیے دوڑانا شروع کردیا تھا۔ کمرا بند کرکے وہ ایک صوفے پر اکڑوں بیٹھ چکا تو اس کی فرمائش پر میں نے اپنی داستان غم شروع کی۔ میں نے اسے اختصار کے ساتھ لیکن تمام واقعات صحیح طور پر سنا دیے۔ میں نے اسے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں بھی صحیح بتا دیا۔ اس کے ہوش اُڑ گئے۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ رنگت زرد پڑ گئی۔

بنیادی طور پر وہ ایک ڈرپوک آدمی تھا۔ جن دنوں اسمگلنگ کے دھندوں میں ملوث تھا ان دنوں بھی ایک طرف تو اچھے خاصے خطرناک معاملات میں ہاتھ ڈالتا رہتا تھا لیکن دوسری طرف اس کے ڈرپوک ہونے کا یہ عالم تھا کہ وقت بے وقت کال بیل بج اٹھتی تھی تو بیڈ کے نیچے گھس جاتا تھا۔ اس کی شخصیت میں یہ ایک عجیب تضاد تھا۔

بہت دیر تک ہم ان حالات کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ بالآخر وہ بولا۔ "چوہدری یار! میرا مشورہ تو یہی ہے کہ کچھ دنوں کے لیے تم ادھر ادھر ہوجاؤ۔ اپنے ہی کسی ٹرالر وغیرہ کے ذریعے مڈل ایسٹ کی طرف نکل جاؤ۔"

"ٹرالر یا لانچ کے ذریعے میں جانا نہیں چاہتا۔ انہیں اکثر کوسٹ گارڈ والے روک لیتے ہیں کیونکہ ان ریاستوں کی طرف انسانوں کی اسمگلنگ انہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ میں خود بھی یہاں آنے سے ذرا دیر پہلے یہی سوچ رہا تھا کہ کچھ دنوں کے لیے باہر ہی نکل جاؤں لیکن کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس وقت میرے پاس پاسپورٹ وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ جعلی پاسپورٹ پر بھی میں سفر کرنا نہیں چاہتا..... بلکہ کسی سیدھے راستے سے تو سفر کرنا ہی نہیں چاہتا۔ میرا خیال ہے باہر جانے کے جتنے بھی ذرائع ہیں ان کی نگرانی ہورہی ہوگی۔"

وہ کچھ دیر کے لیے سوچ میں ڈوبا رہا پھر بولا۔ "ایک ترکیب ہے۔ میں تمہارا ایک بندوبست کرسکتا ہوں..... بلکہ اس طرح تم میرے ایک جاننے والے انگریز کی بھی کچھ مدد کرسکو گے۔ وہ بے چارہ لندن میں بہت پریشان بیٹھا ہے۔ اس نے کل ہی مجھے فون کیا تھا اور مدد کی درخواست کی تھی۔ میں نے اس کی مدد کا وعدہ بھی کرلیا تھا لیکن ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کی کیا مدد کروں۔"

"تمہارا خیال ہے کہ میں..... یعنی ایک ایسا شخص جو خود جان بچانے کے لیے بھاگا پھر رہا ہے' وہ اس کی مدد کرسکے گا؟" میں نے سیٹھ رمضان کو گھورا۔

"چوہدری یار! تمہاری بات کچھ اور ہے۔" اس نے پیار سے میرا بازو تھپتھپایا۔ "تم تو ڈوبتے ڈوبتے بھی دو چار کو ڈوبنے سے بچا سکتے ہو۔"

"مکھن مت لگاؤ۔ یہ بتاؤ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟" میں نے کہا۔

وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "میں جس انگریز دوست کا ذکر کررہا ہوں اس سے پرانی اور خاندانی دوستی چلی آرہی ہے۔ اس کا باپ میرے باپ کا دوست تھا۔ پارٹیشن سے پہلے اس کا باپ بمبئی میں ہائی کمشنر تھا۔ ظاہر ہے اس زمانے میں اس عہدے کا انگریز بڑی توپ چیز تھا۔ سچی بات ہے' ہمارے خاندان میں دولت داخل ہی اس وقت ہوئی تھی جب اس انگریز نے میرے باپ کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس سے پہلے میرا باپ پیتل کی تھالیوں پر نقش و نگار بنانے کا کام کرتا تھا۔ بس کسی طرح ہمارے ابا جان کی اس انگریز کے بنگلے میں رسائی ہوگئی تھی۔ اس کے بعد ہمارے دن پھرنے شروع ہوگئے تھے....."

"یہ پرانے قصے چھوڑو..... اب کا قصہ بتاؤ۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"وہی بتانے لگا تھا۔ اس کے بیٹے چارلس سے میرے بھی مراسم چلے آرہے ہیں۔ اس نے مجھے فون پر بتایا ہے کہ اس کی بیٹی کیتھرین ایک بحری جہاز پر سفر کررہی ہے جو اس وقت کراچی کی بندرگاہ پر لنگرانداز ہے۔ جہاز گو کہ باربرداری کا ہے مگر اس قسم کے جہازوں میں سے ہے جو باربرداری کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی بہانے ہر بندرگاہ سے دو چار مسافر بھی اٹھا لیتے ہیں اور کم کرائے میں ایک سے دوسرے ملک پہنچا دیتے ہیں۔ چارلس کو پتا چلا ہے کہ اس کی بیٹی منشیات کے دھندے میں ملوث ہے اور اس کی جان کو خطرہ ہے۔ وہ شاید ترکی جارہی ہے۔ وہ ایک معزز خاندان کی لڑکی ہے۔ اس کا باپ اس لیے بھی کسی سے مدد طلب نہیں کرسکتا کہ کہیں اس کی بیٹی کے منشیات کے دھندے میں ملوث ہونے کا معاملہ سامنے نہ آجائے۔ اس صورت میں بیٹی بچ بھی گئی تو انہیں انگلینڈ میں سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑے گا اور رسوائی الگ ہوگی۔ تمہیں معلوم ہی ہے' مغرب کے والدین اپنی اولاد کو دی ہوئی آزادیوں کی سزا کس کس طرح بھگت رہے ہیں۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تم چاہتے ہو کہ ان کے حصے کی کچھ سزا میں بھگتوں؟"

"یار! تمہیں بھی تو فرار کا مسئلہ درپیش ہے۔ میں تمہیں اس جہاز پر سوار کرانے کا بندوبست کردیتا ہوں۔ بس تم راستے میں ذرا دیکھ لینا کہ مسئلہ کیا ہے۔ البتہ اس لونڈیا سے عشق لڑانے مت بیٹھ جانا۔ میں نے اسے دیکھا تو نہیں کہ کیسی ہے لیکن اگر خوبصورت ہوئی تو تم پھسل مت جانا۔ مجھے معلوم ہے تم کفرانِ نعمت نہیں کرتے۔ حسن والے مہربان نظر آئیں تو فوراً دل کے دروازے' کھڑکیاں اور روشن دان وغیرہ کھول دیتے ہو۔"

"کیوں..... اس لڑکی کو عشق سے پرہیز ہے کیا؟ یا اس کی نظر میں منشیات کا دھندا عشق کے دھندے سے زیادہ بہتر اور معززانہ ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں یار! میں تو اس لیے منع کر رہا ہوں کہ تم کہیں کسی اور خطرناک چکر میں نہ پھنس جاؤ۔ تم تو پہلے ہی ریڈ ڈاٹ کے چکر میں پھنسے ہوئے ہو۔ تمہیں معلوم ہے ڈرگز کے دھندے میں بھی کچھ اسی قسم کی بڑی بڑی سینڈی کیٹس کام کر رہی ہیں۔ اب تو ایک نہیں' بیسیوں مافیائیں ہیں۔ تم بس شرافت سے صرف اپنی جان بچانے سے غرض رکھنا۔"

"ٹھیک ہے حاجی رمضان صاحب! میں آپ کے قیمتی مشوروں پر دل و جان سے عمل کروں گا۔" میں نے کہا۔ "ویسے یہ تمہیں محض غلط فہمی ہے کہ میں ہر اچھی صورت دیکھ کر عاشق ہو جاتا ہوں یا مہربان چہرے کے سامنے دیدہ و دل فرشِ راہ کردیتا ہوں۔ ہم پیار اسی سے کرتے ہیں جو پیار کے قابل ہوتا ہے۔"

"اچھا..... مجھے یہ گاڑھی اردو کی مار مارنے کی کوشش مت کرو اور نہ ہی گاڑھی اردو میں پتلے فلمی گانے مکس کرو۔ یہ بتاؤ تم جانے کے لیے تیار ہو؟" سیٹھ رمضان نے پوچھا۔

"ہاں یار..... میں سوچ رہا ہوں چند دن کے لیے ادھر اُدھر ہو ہی جاؤں....." میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تم اس دوران میرے ساتھیوں کا پتا کرنے اور انہیں کسی ٹھکانے پر جمع کرنے کی کوشش کرنا....."

میں اسے سمجھانے لگا کہ وہ کس طرح میرے ساتھیوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کرسکتا ہے۔ وہ سر ہلاتا رہا۔ بظاہر وہ غبی نظر آتا تھا لیکن درحقیقت غبی نہیں تھا۔

یہ باتیں ختم ہوچکیں تو میں نے پوچھا۔ "اس جہاز پر سوار ہونے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"آج آدھی رات کو ہی یہ جہاز روانہ ہوجائے گا۔ تمہیں فوری طور پر کلفٹن جاکر ایک چھپر ہوٹل میں عاشق بھٹی نامی ایک شخص سے ملنا ہوگا۔ اس چھپر ہوٹل میں تلی ہوئی مچھلی وغیرہ فروخت ہوتی ہے۔ تم آرام سے جاکر ایک گاہک کی طرح بیٹھ جانا اور میرا لکھا ہوا ایک پرچا عاشق بھٹی کو دینا۔ وہاں کسی بھی ویٹر سے پوچھنا' وہ تمہیں عاشق بھٹی سے ملوا دے گا....."

سیٹھ رمضان نے جلدی سے نوکر سے ایک رائٹنگ پیڈ اور قلم منگوایا لیکن جب اس نے پرچا میرے حوالے کیا تو میں اس کی صورت دیکھنے لگا۔ اس پر صرف چند آڑی ترچھی لکیریں سی کھنچی ہوئی تھیں۔

"تم اس چکر میں مت پڑو کہ یہ کیا ہے۔ یہ ایک مکمل پیغام ہے۔" سیٹھ رمضان بولا۔ "تم چاہو تو اسی جہاز سے گھومتے گھامتے واپس بھی آسکتے ہو۔ آتے ہی مجھ سے فون پر رابطہ کرنا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو رہے ہیں۔ جب سے چارلس کا فون آیا تھا میں پریشان تھا کہ کیا کروں۔ خود جانے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی' کسی دوسرے پر مجھے بھروسا نہیں تھا کہ وہ مسئلے کو صحیح طور پر ہینڈل کرسکے گا۔"

پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔ "اچھا یہ بتاؤ تمہیں کتنی رقم کی ضرورت ہے؟"

میں نے اپنی ذرا پھولی ہوئی جیب کی طرف اشارہ کیا۔ "میرے پاس ابھی اچھی خاصی رقم موجود ہے۔"

اس نے مجھے تاریک شیشوں والی ایک گاڑی میں مسلح گارڈ کے ساتھ کلفٹن کی طرف روانہ کردیا۔ ڈرائیور نے مجھے ساحل سے کافی دور ہی اتار دیا۔ ابھی کلفٹن پر تفریح کے لیے آنے والوں کا رش تھا۔ پلے لینڈ کے اس رش سے گزر کر میں اس طرف آیا جدھر مچھلی کی دُکانیں تھیں۔ ہوا میں مچھلی اور تیل کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے مطلوبہ دُکان کا بورڈ دور سے دیکھ لیا اور اس کی طرف بڑھا۔ دُکان کے بڑے سے چھپر تلے بڑا ہجوم تھا۔ پہلے مجھے حیرت ہوئی کہ کیا مچھلی پر اس قدر رش لگا ہوا تھا؟ کیا یہاں بہت ہی اچھی مچھلی ملتی تھی جو لوگ اس طرح ٹوٹے پڑ رہے تھے؟

لیکن قریب جاکر اندازہ ہوا کہ وہ ہجوم مچھلی خریدنے والوں کا نہیں تھا۔ وہاں کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی تھی۔ میں بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے پہنچا تو مجھے جھٹکا سا لگا۔ ہجوم کے درمیان ریتلی زمین پر ایک شخص اس طرح پڑا تھا کہ اس کی گردن تن سے بالکل ہی جُدا تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کسی جلاد نے چند لمحے پہلے ہی اس کا سر قلم کیا تھا۔ گاڑھا گاڑھا خون ریت میں جذب ہوچکا تھا۔

"کون ہے یہ بدنصیب؟" میں نے غیرارادی طور پر خود کلامی کے سے انداز میں پوچھا۔

ویٹر نما ایک شخصیت نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور گویا مجھ پر ترس کھاتے ہوئے میرے سوال کا جواب دے دیا۔ "اس کا نام عاشق بھٹی تھا.....!"

جرمن ڈیوریفل
پروفیسر محمد اشرف قیمت -/90

میں نے بغور اس شخص کی طرف دیکھا جو اس چھپر نما ریستوران کا ویٹر معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گندی سی ایک زنگ آلود ٹرے بھی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے مذاق کر رہا تھا۔ کیا یہ ضروری تھا کہ عاشق بھٹی کو عین اس وقت قتل کیا جاتا جب میں اس سے ملنے کے لیے پہنچنے والا تھا؟

پھر مجھے احساس ہوا کہ ویٹر اور میں تو ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ وہ بھلا مجھ سے مذاق کیوں کرکر سکتا تھا؟ اگر وہ کہہ رہا تھا کہ مقتول عاشق بھٹی تھا..... تو پھر وہ یقیناً عاشق بھٹی ہی ہوگا۔ میرے سامنے اب سوال یہ آن کھڑا ہوا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں تو ناک کی سیدھ میں عاشق بھٹی سے ملنے کے لیے دوڑا چلا آرہا تھا اور عاشق بھٹی یہاں سر بُریدہ پڑا تھا۔

ماحول پر ایک عجیب سوگوار سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ باتوں کی وہ پُرجوش سی بھنبھناہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی جو ایسے موقعوں پر عموماً سننے میں آتی ہے۔ واردات یا حادثے کے بارے میں ہر شخص حسب توفیق اظہار خیال کرتا ہے لیکن وہاں سب خاموش تھے۔ بیشتر چہروں سے ایک بے عنوان سا خوف جھانک رہا تھا اور شاید اسی خوف نے ان کی زبانیں بند کر رکھی تھیں۔

واردات سے پہلے اگر وہاں مچھلی کھانے کے کچھ شائقین موجود تھے تو وہ یقیناً کھسک چکے تھے۔ یہ بھیڑ انہی لوگوں کی معلوم ہوتی تھی جن کا اس جگہ سے کوئی نہ کوئی تعلق تھا۔ میری یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کسی نادیدہ قوت کو یہ علم کس طرح ہوسکتا تھا کہ میں عاشق بھٹی سے ملنے آرہا تھا؟ اگر علم ہو بھی گیا تھا تو اسے ملاقات سے قبل ہی ہلاک کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اسے میری موجودگی میں بھی قتل کیا جاسکتا تھا..... یا کم از کم کوشش ضرور کی جاسکتی تھی۔ بلکہ ان کا اصل نشانہ تو میں تھا۔ مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوتا تو بات کچھ سمجھ میں آتی تھی۔

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ میرے اب تک کے ریکارڈ کے پیشِ نظر یہ بات میرے دشمنوں کی سمجھ میں آگئی ہو کہ قدرت فی الحال مجھ پر مہربان تھی۔ ان کی تمامتر طاقت اور تمامتر سائنسی وسائل کے باوجود میں ان کے ہر حملے سے بچ نکلتا تھا۔ ان کی ہر کوشش اب تک ناکام رہی تھی۔ انہوں نے سوچا ہو کہ اب بھی اگر میری موجودگی میں عاشق بھٹی کا صفایا کرنے کی کوشش کی گئی تو میں شاید اپنے ساتھ ساتھ اسے بھی بچانے میں کامیاب ہوجاؤں اس لیے پہلے اس کا پتا تو صاف کردیا جائے' بعد میں مجھ سے بھی نمٹ لیا جائے گا۔

اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ خطرہ ٹلا نہیں تھا۔ آس پاس ہی جائزہ لیا لیکن کوئی شخص مجھے بطورِ خاص اپنی طرف متوجہ دکھائی نہیں دیا اور نہ ہی کوئی مشکوک محسوس ہوا۔ اگر کوئی نادیدہ سی آنکھ بھی میری طرف دیکھ رہی ہوتی تو شاید میری کوئی نامعلوم حس مجھے خبردار کردیتی لیکن ایسا بھی نہیں ہوا۔

تب مجھے احساس ہوا کہ شاید میں غلط سوچ رہا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ عاشق بھٹی کو میری ہی وجہ سے قتل کیا گیا ہو۔ معلوم نہیں وہ کس قسم کا آدمی رہا ہو۔ کس قسم کے لوگوں سے اس کا تعلق رہا ہو۔ کن کن چکروں میں ملوث رہا ہو۔ مجھے میرے دوست سیٹھ رمضان نے اس کے پاس بھیجا تھا لیکن سیٹھ رمضان خود اپنی جگہ ایک شاہکار چیز تھا۔ اس کے تو ہر طرح کے لوگوں سے تعلقات تھے۔ اور بہت قریبی تعلقات تھے۔ آدمی وہ بہرحال کام کا تھا۔

ان خیالات کی روشنی میں تو امکان یہی نظر آتا تھا کہ شاید عاشق بھٹی اپنے ہی کسی چکر میں مارا گیا ہو اور یہ محض ایک اتفاق تھا کہ عین اس وقت میں اس سے ملنے آپہنچا تھا۔ یہ سب کچھ میں نے غالباً دو چار سیکنڈ میں ہی سوچا اور اپنے قریب کھڑی ہوئی اس ویٹر نما شخصیت سے سرگوشی میں پوچھا۔ "اسے کس نے اور کس طرح قتل کیا؟"

ویٹر نے پہلے شک زدہ سی نظروں سے میرا سرتاپا جائزہ لیا۔ شاید وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اس کے بیان کو گواہی کے طور پر تو استعمال نہیں کروں گا۔ پھر وہ شاید کچھ اطمینان محسوس کرتے ہوئے سرگوشی میں ہی بولا۔ "کچھ پتا ہی نہیں چلا بھائی۔ بھٹی صاحب وہاں ایک کونے میں آرام سے میز پر بیٹھے کولڈ ڈرنک پی رہے تھے....." اس نے آنکھوں سے چھپر کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک کرسی اُلٹی پڑی تھی۔

ویٹر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "کسی کا دھیان اس طرف نہیں تھا۔ بھٹی صاحب کافی دیر سے بیٹھے تھے۔ شاید کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ اچانک ہی کسی نے چیخ ماری۔ وہ کوئی عورت تھی۔ وہ چیخ

رومانی ناول

زیب	حمیدہ جبین	-/75
شاخ بریدہ	حمیدہ جبین	-/75
حنا اور پتھر	حمیدہ جبین	-/75
گیت یہ میرے	حمیدہ جبین	-/75

مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور 2

رہی تھی۔ ’ارے اس آدمی کو تو دیکھو... اس کی گردن کس نے کاٹ دی....‘ ہم نے مُڑ کر دیکھا تو بھٹی صاحب اس طرح یہاں پڑے ہوئے تھے۔"

میرے کان کھڑے ہوئے۔ اس مختصر سے ہجوم میں کوئی عورت نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔ "وہ عورت کہاں گئی؟ کیسی تھی وہ؟"

ویٹر نے ایک بار پھر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ شاید میرا تجسس مجھے اس کی نظر میں مشکوک بنا رہا تھا۔ تاہم اس نے ازراہِ کرم جواب دے ہی دیا "موٹی سی عورت تھی... بچوں کے ساتھ تھی... شوہر بھی ٹیکسی سے اُتر کر پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ شاید وہ لوگ مچھلی کھانے آرہے تھے مگر یہاں یہ معاملہ دیکھ کر اُلٹے قدموں کھسک لیے۔"

"اوہ...." میں نے متاسفانہ سے لہجے میں کہا۔

اسی لمحے کسی نے ذرا تیز سی سرگوشی میں کہا۔ "پولیس آرہی ہے۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا‘ موبائل پولیس کی ایک نیلی گاڑی ایک موڑ سے ریت اُڑاتی آرہی تھی۔ ایک پولیس والا گاڑی میں نصب شدہ مشین گن پر کھڑا تھا۔ گاڑی ابھی خاصی دور تھی۔ بھیڑ یکدم ہی کائی کی طرح پھٹ گئی۔ میں خود بھی وہاں سے کھسک جانے والوں میں شامل تھا۔ مَیں چھپر کے گرد گھوم کر دوسری طرف پہنچ گیا۔ ادھر چھپروں کی دوسری قطار موجود تھی۔ میں اس سے بھی آگے نکل گیا۔ میں واقعی بڑی اُلجھن میں پھنس گیا تھا۔ سیٹھ رمضان کی گاڑی بھی مجھے اتار کر واپس جا چکی تھی۔

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ٹیکسی پکڑ کر دوبارہ سیٹھ رمضان کے پاس جاؤں اور اس سے مشورہ کروں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے‘ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ ایک پیلی ٹیکسی میرے تعاقب میں رینگتی چلی آرہی ہے۔ میں اس وقت ٹوٹے پھوٹے فٹ پاتھ پر تیز تیز قدموں سے چلا جا رہا تھا۔ میں نے گردن ذرا سی گھما کر کن انکھیوں سے اس کی جھلک دیکھی تھی۔

پہلے تو میں یہی سمجھا کہ شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ میں نے کسی بہتر اور اہم چیز کے بارے میں سوچا ہوتا تو شاید وہ بھی مجھے مل گئی ہوتی۔ میں نے صرف ٹیکسی کے بارے میں سوچا تھا۔ وہی میرے پیچھے کھنچی چلی آرہی تھی۔ شاید ٹیلی پیتھی واقعی کوئی چیز تھی اور اس کے ذریعے میرا رابطہ ٹیکسی ڈرائیور سے ہو گیا تھا۔ میرے ذہن کی آوارہ لہریں اس کے ذہن سے جا ٹکرائی تھیں‘ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے اس وقت ٹیکسی کی ضرورت ہے اور وہ بے چارہ میرے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا۔ یا پھر یہ محض ایک اتفاق تھا کہ جس وقت میں ٹیکسی کے بارے میں سوچ رہا تھا‘ کوئی ٹیکسی والا ٹیکسی خالی ہونے کی وجہ سے..... اور خصوصاً مجھے تیز تیز چلتے دیکھ کر میرے پیچھے آگیا تھا۔

دفعتاً مجھے کچھ خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے خاصا فاصلہ طے کر لیا تھا لیکن اس نے ابھی تک گاڑی میرے برابر لا کر نہیں پوچھا تھا کہ مجھے ٹیکسی کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر ٹیکسی ڈرائیور اس طرح پوچھنا اپنی شان کے خلاف سمجھے تب بھی گاڑی قریب سے گزارتے ہوئے کم از کم سوالیہ سی نظروں سے دیکھ تو لیتا ہے لیکن اس نے یہ زحمت بھی نہیں کی تھی۔

میں نے غیر ارادی طور پر سانس روک لی۔ وہاں بائیں ہاتھ پر فٹ پاتھ سے نیچے ریت پر چند چھوٹی موٹی چیزیں سجائے ایک شخص ایئر گن سے نشانے لگوا رہا تھا اور ایک کے بدلے دس روپے دینے کا اعلان کر رہا تھا۔ یہ غریبانہ قسم کا جُوا تھا۔ قوم میں چونکہ پلک جھپکتے میں ایک کے بدلے دس حاصل کرنے کا بڑا رجحان پایا جاتا ہے اس لیے اس کے پاس شائقین کا ایک ہجوم تھا۔

اس ہجوم کے پاس رک کر میں یک دم گھوم گیا۔ میرا خیال تھا کہ اگر کوئی مجھے گولی مارنے کی فکر میں تھا تو شاید ہجوم کی وجہ سے ایک لمحے کے لیے ہچکچا جائے۔ حالانکہ یہ بھی محض میری خوش فہمی تھی۔ مارنے والے محض اس لیے نہیں رُکتے کہ ان کے شکار کے علاوہ کچھ بے گناہ بھی مارے جائیں گے بلکہ اب تو شکار نہ بھی موجود ہو تب بھی بے گناہوں کے ہجوم کا شکار کھیلا جاتا ہے۔ اس کے مقاصد ذرا اور طرح کے ہوتے ہیں۔

میں تقریباً اس ہجوم میں جا گھسا تھا جو ایک کے دس بنانے کے لیے بے چین تھا۔ ایک کے دس ان میں سے شاید ہی کسی خوش نصیب کو ملتے۔ نشانے کی وجہ سے تو نہیں البتہ تُکّے کی وجہ سے شاید مل جاتے کیونکہ مجھے معلوم تھا‘ ایئر گن کی نال میں نہایت معمولی سا خم ہو گا جس کی وجہ سے صحیح نشانہ لگ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہجوم میں سے بھی شاید بہت سے لوگوں کو یہ بات معلوم ہو لیکن ایک کے دس مل جانے کی امید بڑی ظالم ہوتی ہے۔ بڑے بڑے سمجھ دار لوگوں کو نہ جانے کہاں کہاں کھینچ لے جاتی ہے۔

میرے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور میں کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار تھا لیکن کچھ بھی کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ ٹیکسی فٹ پاتھ کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ صرف ایک لمحے کے لیے روشنی ڈرائیور کے چہرے پر پڑی۔ چہرہ سوکھا اور تنا ہوا سا تھا۔ اس کے باوجود کسی ورزشی انسان کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔ اوپر کو اٹھی ہوئی موٹی موٹی نوکیلی مونچھوں نے اس چہرے کو تھوڑا سا رعب دار بنا دیا تھا۔

اصلی حیرت مجھے یہ دیکھ کر ہوئی کہ جس وقت وہ میرے سامنے سے گزرا اس وقت وہ موبائل فون کان سے لگائے ہوئے تھا۔ اس نے بغور میری طرف دیکھا لیکن گاڑی بدستور رینگتی رہی۔ میں جہاں کھڑا تھا وہاں روشنی بہت کم تھی۔ نشانہ بازی کرانے والے کے پاس ایک پیٹرومکس لیمپ روشن تھا لیکن اس کی روشنی گویا ہجوم کے دائرے میں مقید تھی۔ فٹ پاتھ پر کچھ اور لوگ بھی جا رہے

تھے۔ سب کا رخ پلے لینڈ کی طرف معلوم ہوتا تھا۔

میرے عقب میں ریت پر بھی بہت سے لوگ ہیولوں کی طرح رواں دواں تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے انہی ہیولوں کے درمیان کہیں موت بھی اپنا تاریک وجود لیے رینگ رہی تھی۔ میرے حواس کی گھڑی دھیرے دھیرے ٹِک ٹِک کر رہی تھی۔ کہیں دور سے خطرے کا کوئی نہایت مدھم سا سگنل موصول ہو رہا تھا لیکن آنکھیں دیکھنے سے قاصر تھیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ خطرہ تھا کہاں۔

وہ ٹیکسی ڈرائیور موبائل فون پر بات کرتے ہوئے اتنے غور سے میری طرف دیکھتا کیوں گزرا تھا؟ اول تو ایک ڈرائیور کے پاس موبائل فون ہونا ہی خاصی حیرت کی بات تھی لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ آدھی سے زیادہ پیلی ٹیکسیاں بھی تو خوش حال طبقہ لے اُڑا تھا۔ ہم حکومتوں کو تو بُرا بھلا کہتے رہتے ہیں لیکن اپنے گریبان میں جھانک کر نہیں دیکھتے۔ حکومتیں بھی تو آخر ہم میں سے ہی ہوتی ہیں۔ سرکار تو اپنی جگہ ہے‘ عوام بھی تو بے ایمانی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ضرورت مندوں کے لیے جس اسکیم کا بھی کبھی خدا خدا کر کے اعلان ہوتا ہے‘ اس پر بھی غیر مستحق طبقہ ہی ٹوٹ پڑتا ہے۔ زیادہ تر ضرورت مند تو بے چارے قطاروں میں پیچھے ہی کھڑے رہ جاتے ہیں۔ اس کا کیا علاج ہو؟ قوم کو قوم بننے کے لیے جس کردار کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہمارے پاس نظر نہیں آتا۔ ذرا سا فائدہ دیکھ کر ہم سب کچھ بھول بھال کر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ بھوکوں کے ٹھے کی روٹی بھی وہی کھا جاتے ہیں جنہیں پہلے سے زیادہ کھا کھا کر بدہضمی ہوتی ہے۔

ٹیکسی ڈرائیور کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے خیالات کی رو بھٹکنے لگی تھی۔ شاید وہ ٹیکسی ڈرائیور نہیں‘ کوئی خوشحال کاروباری شخص ہی رہا ہو۔ ٹیکسی اس نے ایک فاضل گاڑی کے طور پر رکھی ہو۔ ٹیکسی زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ دفعتاً میں نے اس کی ریورس کی بتی روشن ہوتے دیکھی۔ وہ واپس آرہی تھی۔ ون وے کی وجہ سے اس شخص نے ٹیکسی واپس نہیں گھمائی تھی بلکہ ریورس گیئر میں لا رہا تھا۔

میں ملگجے اندھیرے میں کھلے میدان کی طرف کچھ اور آگے چلا گیا۔ میرے جوتے ریت میں دھنسے جا رہے تھے۔ فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ آگے اور بھی کھیل تماشے ہو رہے تھے۔ سب میں کچھ لگانے اور زیادہ کمانے کا چکر تھا۔ سب کے سامنے کچھ نہ کچھ لوگ موجود تھے۔ یہاں شاید کسی کو علم بھی نہیں تھا کہ اس جگہ سے کچھ ہی دور ایک شخص قتل ہو چکا تھا۔

ٹیکسی ان سب کھیل تماشوں کے سامنے سے ہوتی ہوئی وہیں آن رُکی جہاں ڈرائیور نے مجھے بغور دیکھا تھا۔ میں ہجوم کی آڑ میں کچھ اور آگے چلا گیا۔ اب میں گہرے اندھیرے میں تھا۔ ڈرائیور ٹیکسی سے اُتر آیا اور ہجوم کا جائزہ لینے لگا۔ وہ واقعی دراز قد اور ورزشی جسم کا مالک تھا۔ ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں بھی اس کے ورزشی جسم کے عضلات نمایاں محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے شاید چوڑی چھاتی کی نمائش کے لیے جان بوجھ کر ٹائی نہیں لگائی تھی۔ گریبان کھلا تھا۔ گلے میں سونے کی موٹی چین چمک رہی تھی۔

اس کی نظریں نہایت مضطربانہ انداز میں ادھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ وہ یقیناً مجھے تلاش کر رہا تھا لیکن وہ شاید اس تلاش کو خطرناک بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے چہرے سے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میری طرح اسے بھی آس پاس کسی خطرے کی موجودگی کا احساس ہو۔ میں اس کی طرف سے خطرہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنے ورزشی جسم کے باوجود مجھے اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے تو کسی اور ہی نادیدہ خطرے کا احساس تھا لیکن وہ شاید مجھے ہی خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کے باوجود میری تلاش میں تھا۔

اسے شاید یہ احساس تھا کہ میں فٹ پاتھ پر ساحل کی طرف واپس نہیں گیا ہوں بلکہ وسیع ریتلے میدان میں اسی طرف نکل گیا ہوں جدھر اندھیرا پھیلا ہوا تھا کیونکہ ہجوم کا جائزہ لینے کے بعد وہ اسی طرف آرہا تھا۔ میں تیزی سے کچھ اور آگے رینگ گیا۔

یہاں غالباً کسی پرانی عمارت کو گرا کر اس کا بیشتر ملبہ بھی اٹھایا جا چکا تھا لیکن ٹوٹے پھوٹے پلاز کے کچھ ٹکڑے اب بھی سر اٹھائے کھڑے تھے جن سے موٹے موٹے اور مُڑے تُڑے سریے نکلے ہوئے تھے۔ میں ایسے ہی ایک ٹوٹے ہوئے پلر کی اوٹ میں سُکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا۔ میں اندھیرے میں ان چیزوں کو کافی حد تک صاف طور پر دیکھ سکتا تھا لیکن اس شخص کو شاید کچھ دیکھنے میں دقت پیش آرہی تھی۔

وہ تھوڑا آگے آکر ہی رک چکا تھا۔ میں اس کے تاثرات تو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ الجھن زدہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ بالآخر وہ سیدھا اسی طرف آنے لگا جدھر میں گھات لگائے اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ معلوم نہیں اس کی قسمت ہی اسے گھیر کر لا رہی تھی یا اس کی بھی کسی جس نے اسے احساس دلایا تھا کہ میں اس طرف موجود تھا۔

اس کا موبائل فون اس کے ہاتھ میں تھا لیکن وہ چند قدم اور آگے آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ موبائل فون نہیں‘ سا ٹلنسر لگا ہوا ریوالور تھا۔ میرا ایک طویل سانس لینے کو جی چاہا لیکن میں نے اُلٹا سانس روک لی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر اسے ریوالور لے کر میری تلاش میں نکلنا ہی تھا تو پہلے وہ میری طرف دیکھ کر گزرتا کیوں چلا گیا تھا؟

وہ ٹوٹے ہوئے ایک اور پلر کے قریب آن رُکا۔ اس نے صرف ایک لمحے رک کر ادھر اُدھر دیکھا پھر شاید وہ مایوس ہو کر واپس جانے کے لیے مُڑا تھا لیکن اسی لمحے میں نے عقب سے اس

پر چھلانگ لگائی۔ دوسرے ہی لمحے اس کا ریوالور والا بازو میرے ایک ہاتھ کی گرفت میں اور گردن دوسرے بازو کے شکنجے میں تھی۔ اس کا دوسرا بازو بھی میرے اسی بازو کے حلقے میں پھنس چکا تھا جس کو عقب سے لاتے ہوئے میں نے اس کا ریوالور والا ہاتھ پکڑا تھا۔

اس نے طاقت آزمانا چاہی' ریوالور والے ہاتھ کو موڑتے ہوئے پیچھے کی طرف فائر کرنا چاہا لیکن افضل چوہدری کے شکنجے میں حرکت کرنا کچھ ایسا آسان بھی نہیں تھا۔ اس لمحے اسے یقیناً احساس ہوا ہوگا کہ اس کی ورزشیں اس کے کچھ کام نہیں آئی تھیں۔ اس کی کلائی پر میرے ہاتھ کا شکنجہ اور گردن پر میرے بازو کا شکنجہ سخت تر ہوتا گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ریوالور پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی۔

"ریوالور چھوڑ دو میری جان..... ورنہ گردن ٹوٹ جائے گی۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔

اس نے بات نہ مانی۔ ابھی اپنی طاقت سے اس کی کچھ امیدیں وابستہ تھیں۔ اپنی دانست میں اس نے مجھے کمر پر سے اُلٹتے ہوئے آگے پھینکنے کی کوشش کی لیکن میں جب بھی کسی تھوڑے بہت طاقت ور شخص کو اس طرح دبوچتا تھا تو مجھے پہلے ہی اندیشہ رہتا تھا کہ وہ مجھے اس طرح اُلٹا کر پھینکنے کی کوشش کرے گا لہٰذا میں پہلے ہی اس کا "بندوبست" رکھتا تھا' اس کے لیے تیار رہتا تھا۔ میرے پاؤں گویا زمین میں ہی گڑے رہتے تھے۔

"تمہیں اپنی گردن تُڑوانے کی بہت جلدی ہے۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ اس کی زور آزمائی کے باعث اس کی گردن پر دباؤ خود بخود کچھ اور بڑھ چکا تھا۔ میں نے اس کی کلائی پر بھی ہاتھ کا شکنجہ مزید سخت کر دیا۔ بالآخر اس نے ریوالور چھوڑ ہی دیا۔

میں نے اس کی پیٹھ پر گھٹنا رسید کرتے ہوئے اسے آگے پھینکا اور جھپٹ کر اس کا ریوالور اٹھا لیا۔ میں اس کے ساتھ زیادہ دھینگا مشتی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ گو کہ یہاں اندھیرا تھا لیکن کچھ دور کھیل تماشوں میں مشغول لوگ زیادہ اٹھا پٹخ کی صورت میں اس طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔ فی الحال تو کسی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہاں سے کچھ دور' جھاڑ جھنکاڑ کے دوسری طرف اندھیرے میں کیا ہو رہا تھا۔

وہ شخص ملبے پر جا گرا اور فوری طور پر نہیں اٹھ سکا۔ چند لمحے گردن شکنجے میں رہنے سے اس کے کس بل نکل گئے تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے گردن پکڑے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ پھر وہ یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"خیال رکھنا..... تم اپنے ہی ریوالور کی زد پر ہو۔" میں نے اسے خبردار کیا۔ مُبادا اندھیرے میں وہ ابھی صحیح طور پر نہیں دیکھ پا رہا ہو' ابھی اس کے حواس ٹھکانے پر نہ آئے ہوں۔

اس نے کُبڑا سا ہو کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھا اور بدستور گردن سہلاتے ہوئے جھنجلے دار سے لہجے میں بولا۔ "ارے..... آپ افضل چوہدری تو نہیں.....؟ میں تو آپ کو تلاش کر

رہا تھا..." الفاظ گویا اس کے حلق سے رگڑ کھاتے ہوئے نکل رہے تھے۔ اگر وہ ذرا جاندار آدمی نہ ہوتا تو ابھی کچھ دیر زمین پر لیٹا رہتا۔

اب مجھے جھٹکا لگنے کی باری تھی۔ وہ میرا نام جانتا تھا لیکن کس حیثیت سے؟ دوست کی حیثیت سے یا دشمن کی حیثیت سے؟

میں نے ملائمت سے کہا۔ "یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ تم مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔ سائلنسر لگا ریوالور ہاتھ میں لے کر۔"

"اوہ..... اب میں سمجھا....." وہ گویا کھانسی کی آواز دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "ریوالور کی وجہ سے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے لیکن یہ ریوالور آپ کے لیے نہیں تھا..... یہ تو کسی اور خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تھا۔ آپ کو تو میں آپ کی مدد کرنے کے لیے ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے سیٹھ رمضان کی طرف سے آپ کے لیے حکم ملا تھا....."

"اوہ....." اب میں بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گیا۔ بات کچھ اور ہی تھی۔ میرا ریوالور والا ہاتھ جھک گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا' معذرت خواہانہ سے انداز میں اس کی کمر پر تھپکی دی اور کہا۔ "محض غلط فہمی میں تمہاری جان بھی جا سکتی تھی۔ تم ذرا اور زور آزمائی کرتے تو تمہاری گردن ٹوٹ سکتی تھی۔"

"سر! جان تو اب بھی جا سکتی ہے۔ موت یہیں کہیں نہ جانے کس روپ میں گھوم رہی ہو۔" وہ سیدھا ہو کر اندھیرے میں ادھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"کمال ہے!" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ موت صرف میرے تعاقب میں ہے لیکن یہاں تو تم بھی موت سے بھاگے پھر رہے ہو۔ تم کس چکر میں اس حال کو پہنچے ہو؟"

"یہ پوری کائنات ہی چکر میں ہے سر۔ آپ کو معلوم ہے' سب سیارے ایک دوسرے کے گرد چکرا رہے ہیں۔ لگتا یہی ہے کہ کائنات کے سب جاندار بھی ہر وقت کسی نہ کسی چیز کے گرد چکرا رہے ہوتے ہیں۔ ہم سب کسی نہ کسی چکر میں ہیں۔ یہ دنیا قدرت کی بڑی عجیب تماشہ گاہ ہے۔" وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں تیزی سے کہتا چلا گیا۔

"بہت خوب۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "پہلی بار تم جیسا باذی بلند قسم کا فلسفی دیکھا ہے۔"

"یہ فلسفہ نہیں سر! زندگی کی ایک بیدھی سادی سی حقیقت ہے۔" وہ جھک کر زمین پر کچھ تلاش کرنے لگا۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میرا موبائل فون کہیں گر گیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ وہاں ابھی تک مسمار شدہ عمارت کا کچھ ملبہ باقی تھی جس پر وہ جا کر گرا تھا۔ وہ اس طرف جا کر فون تلاش کرنے لگا اور چند سیکنڈ بعد لوٹ آیا۔ اس کا ٹیلی فون سیٹ مل گیا تھا۔ وہ اسے جیب میں رکھنے کے بعد میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میرا ریوالور بھی دے دیجیے۔"

"اسے ابھی میرے پاس ہی رہنے دو۔" میں نے اس کا ریوالور اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اوہ..... ابھی آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں۔" وہ قدرے حیرت سے بولا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے بے پروائی سے کندھے اُچکا دیے۔ "خیر..... جیسے آپ کی مرضی۔ ہمیں تو سیٹھ رمضان کا حکم ملا ہے کہ آپ کی کچھ مدد کرنی ہے۔ سو ہم کر دیں گے۔ ہمارا کام صرف اتنا ہی ہے۔ آپ ہم پر اعتبار نہیں کرنا چاہتے تو نہ سہی۔" پھر وہ فٹ پاتھ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "میرے ساتھ آیئے۔"

میں خاموشی سے اس کے ساتھ چل دیا۔ ملگجے اندھیرے میں پہنچ کر میں نے پوچھا۔ "میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا چکر ہے۔ مجھے تو عاشق بھٹی سے ملنے بھیجا گیا تھا لیکن میں یہاں پہنچا تو وہ قتل ہو چکا تھا..... اور اب تم مجھے ڈھونڈتے ہوئے مجھ سے آن ٹکرائے۔"

"یہ ایک نہیں' بہت سے چکر ہیں اور ایک دوسرے میں گڈمڈ ہیں۔ ساری باتیں بتائی بھی نہیں جا سکتیں اور بتانے کا وقت بھی نہیں ہے۔ آپ کو یہ سب کچھ جاننے کی ضرورت بھی نہیں..... کیونکہ آپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "آپ بس اتنا سمجھ لیں کہ ہم سیٹھ رمضان کے ماضی کے دوستوں میں سے ہیں۔ سیٹھ رمضان پہلے بھی محتاط آدمی تھا' اب اور بھی زیادہ محتاط ہو گیا ہے۔ ہم سے موبائل فون تک پر بھی رابطہ نہیں رکھتا۔ اسے ڈر رہتا ہے کہ کہیں ہم میں سے کسی کا فون ٹیپ نہ ہوتا ہو۔ اسی لیے اس نے آپ کو عاشق بھٹی کے نام رقعہ دے کر بھیجا تھا....."

میں نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے یہ بات بھی معلوم تھی کہ مجھے عاشق بھٹی کے نام رقعہ دے کر بھیجا گیا تھا۔ تاہم میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ "اتفاق کی بات ہے کہ جس وقت آپ یہاں پہنچے تو ہم جن بہت سے چکروں میں اُلجھے ہوئے ہیں' ان میں سے ایک چکر نے عاشق بھٹی کی جان لے لی تھی۔ میں اس وقت قریب ہی موجود تھا۔ مجھے اسی لمحے عاشق بھٹی کے قتل کی اطلاع مل گئی تھی۔ یہ بھی محض ایک اتفاق ہے کہ میں اس وقت سیٹھ رمضان کو فون کرنے لگا تھا ورنہ ہم بھی عموماً اسے فون نہیں کرتے۔ کوئی ضرورت پڑتی ہے تو آدمی اس کے پاس بھیجتے ہیں لیکن اس وقت کچھ فارن ایکسچینج کا معاملہ تھا..... ایمرجنسی تھی۔ میں نے موبائل فون پر اس سے رابطہ کیا اور بات کرتے وقت اسے یہ بھی بتا دیا کہ عاشق بھٹی چند سیکنڈ پہلے قتل ہو چکا ہے۔ اس خبر سے اسے افسوس تو ہوا لیکن افسوس سے زیادہ پریشانی ہوئی۔ اس نے بتایا کہ وہ تو اپنے ایک جگری یار کو عاشق بھٹی سے ملنے کے لیے روانہ کر چکا ہے۔ وہ پہلے ہی کچھ چکروں میں پھنسا ہوا ہے' کہیں مزید کسی چکر میں نہ پھنس جائے' یا منہ اٹھا کر ادھر اُدھر نہ نکل جائے۔ اسے امید تھی کہ شاید ابھی وہ دوست یہیں کہیں ہو۔ اس نے میری ڈیوٹی لگائی کہ میں فوراً اسے تلاش کروں۔ حُلیہ وغیرہ اس نے سب مجھے بتا دیا تھا۔ وہ دوست آپ تھے۔"

اس وقت تک ہم اس کی ٹیکسی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس نے غیر محسوس سے انداز میں چاروں طرف کا جائزہ لیا اور دروازہ کھول کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے بظاہر پُرسکون انداز میں گاڑی اسٹارٹ کی لیکن اس کی انگلیوں میں خفیف سا ارتعاش تھا۔ بے ہنگم اور بے ترتیب انداز میں پیدل چلتے ہوئے لوگوں کے درمیان سے گاڑی نکالتے ہوئے وہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر قدرے رشک آمیز سے لہجے میں بولا۔ "آپ یقیناً سیٹھ رمضان کے قریبی دوست ہوں گے۔ وہ آپ کے لیے بہت پریشان تھا۔"

"ہاں..... بڑی گہری دوستی رہی ہے اس سے۔" میں نے مُبہم لہجے میں کہا اور وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھی۔

"اس نے جس انداز میں آپ کو تلاش کرنے کا حکم دیا اس کی وجہ سے مجھے یہاں رُکنا پڑا ورنہ عاشق بھٹی کے قتل کے بعد میں فوراً یہاں سے کھسکتے..... بلکہ کچھ دن کے لیے روپوش ہونے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔" اس نے بتایا۔

"اب تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جو پروگرام طے ہے اس کے مطابق آپ کو بھجوانے کا بندوبست کرنا ہے۔ آپ مجھے عاشق بھٹی کا متبادل سمجھیے۔ بس یوں سمجھیے کہ آپ کے لیے تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ بیچ میں یونہی تھوڑی سی پریشانی ہو گئی۔" اس نے جواب دیا۔

دفعتاً اس کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے جیب سے فون نکالا اور ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے فون پر بات کرنے لگا۔ وہ ایک ایسی زبان میں بات کر رہا تھا جو میرے لیے اجنبی تھی اس کے باوجود میں اس کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔ فون سیٹھ رمضان کا تھا اور وہ میرے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ وہ شخص اسے بتا رہا تھا کہ میں اسے مل گیا ہوں۔ وہ غالباً اس تھوڑی سی کشمکش کا بھی تذکرہ کر

رہا تھا جو ہمارے درمیان ہوئی تھی۔ پھر اس نے فون میری طرف بڑھا دیا۔ "سیٹھ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

میں نے سیٹ اس سے لے کر ہیلو کہا تو سیٹھ رمضان سیدھی سادی اُردو میں بولا۔ "معاف کرنا چوہدری یار! تمہیں تھوڑی تکلیف اٹھانی پڑی۔"

"تکلیف مجھے نہیں، تمہارے اس مہمان کو اٹھانی پڑی۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "ایک میرے پہنچنے سے پہلے ہی مارا جا چکا تھا، دوسرا میرے ہاتھوں مارا جاتا۔ بعد میں اصل بات پتا چلتی تو اس غلط فہمی پر زندگی بھر افسوس رہتا۔" میں نے کن انکھیوں سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے کچھ تکلیف کے سے آثار ابھر آئے تھے لیکن فوراً ہی اس کے تاثرات معمول پر آ گئے۔

"خیر..... اب جس طرح یہ بتائے اس طرح کرنا۔ تم آرام سے نکل جاؤ گے۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔" سیٹھ رمضان بولا۔

"میں تو پہلے بھی پریشان نہیں تھا۔" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "ویسے بھی جس کے لیے تم جیسے پریشان ہونے والے دوست موجود ہوں اسے خود پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

"خیر..... ذرا ہوشیار رہنا۔ اس وقت تم دُہرے خطرات کی زد میں ہو۔ ایک تو وہ خطرات ہیں جو تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ دوسرے وہ خطرات ہیں جو اِن لوگوں کو عموماً لاحق رہتے ہیں جن کے پاس میں نے تمہیں بھیجا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، اب خطرات میرے معمول میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"ہو سکے تو اسی جہاز سے واپس آ جانا۔ میں کوشش کروں گا کہ واپسی تک تمہارے لیے یہاں خطرات کچھ کم ہو چکے ہوں یا کوئی خوشخبری تمہاری منتظر ہو۔ میں یہاں تمہارے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق تمہارے لیے کچھ کرنے کی کوشش کروں گا۔ تم وہاں جہاز پر اس لڑکی کے لیے کچھ کرنے کی کوشش کرنا جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا....." وہ اپنے انگریز دوست چارلس کی بیٹی کیتھرین کا ذکر کر رہا تھا۔

"تم فکر مت کرو۔ فی الحال گو کہ میں خود مدد کے قابل ہوں لیکن مجھ سے اس کی جو بھی مدد ہو سکی ضرور کروں گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"میں فون پر زیادہ باتیں نہیں کر سکتا۔ اس حد تک بے احتیاطی بھی تمہاری وجہ سے کی ہے۔ اچھا خدا حافظ۔" اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے فون اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو واپس کر دیا۔

اس وقت تک اس نے ٹیکسی کیسینو کے سامنے جا روکی تھی جس کی نامکمل عمارت برسوں تک ویران پڑی رہی تھی۔ حال ہی میں ایک پارٹی نے اس میں بچوں کے لیے پلے لینڈ کھولا تھا۔ کم زمانے میں، میں خود لاہور میں اس قسم کی عمارتیں بنوانے کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ یہ کراچی میں ہوٹل بنوانے سے پہلے کی بات تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ اس میں کیسینو ہوتا۔ اس میں کسی اور طرح کی تفریح گاہ بنائی جا سکتی تھی لیکن اس عمارت کا حشر دیکھ کر نہ جانے کیوں میری ہمت نہیں پڑی۔

اس شخص نے ٹیکسی چار دیواری سے باہر ہی چھوڑ دی اور ہم پُل سے مشابہ راستے پر چلتے ہوئے بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ دائیں بائیں دونوں طرف کھیل کود کی مشینوں پر بچوں اور ان کے والدین کا ہجوم تھا۔ تیز بھنبھناہٹ سے مشابہ شور سنائی دے رہا تھا۔ وہ درمیانی راستے پر چلتے ہوئے بولا۔ "یہاں ایک ریستوران بھی ہے۔ وہاں بیٹھ کر اطمینان سے بات کریں گے۔"

ہم دوسری طرف عمارت کے ٹیرس نما حصے پر پہنچے جہاں سے سمندر کا نظارہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ یہاں اوسط درجے کا ایک ریستوران بنایا گیا تھا۔ ریستوران میں بھی خاصی بھیڑ بھاڑ تھی لیکن خوش قسمتی سے ہمیں ٹیرس کے ایک کونے پر الگ تھلگ سی ایک میز خالی مل گئی۔ شاید میرے ساتھی کو ایسی ہی کسی میز کی تلاش تھی۔ وہاں روشنی کم تھی۔ معلوم نہیں وہ میز رومانس اور تخلیے کے متلاشی جوڑوں کی نظر سے کیسے بچ گئی تھی۔

ہم وہاں جا بیٹھے اور اس نے گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد غم آلود ہوا میں ایک گہری سانس لی۔ اب وہ یقیناً خود کو خاصا مطمئن محسوس کر رہا تھا۔ ایک ویٹر نہایت مستعدی سے ہمارے سر پر آن کھڑا ہوا۔ اس شخص نے میرے مشورے سے اسے کچھ سینڈوچز اور کافی کا آرڈر دیا۔

ویٹر کے جانے کے بعد وہ بولا۔ "وہ رقعہ آپ مجھے دے دیجیے جو سیٹھ رمضان نے آپ کو عاشق بھٹی کے نام دیا تھا۔"

تاریخی ناول

دنیا کے نامور فاتحین	قمر تسکین	100/-
شیر مصر	قمر تسکین	100/-
شمشیر اسلام	قمر تسکین	100/-
ترک مرد میدان	قمر تسکین	100/-

مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور 2

میں نے جیب سے وہ مُڑا تُڑا رقعہ نکال کر اسے دے دیا۔ اس نے اسے اپنے سامنے میز پر رکھ کر نہایت احتیاط سے اس کی ہر شکن دور کی اور چمک کر اشتہاک سے اس تحریر کو پڑھنے لگا جو میرے لیے ناقابلِ فہم تھی۔ وہ آڑی ترچھی لکیریں گویا اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔

رقعہ حفاظت سے تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے وہ سر ہلا کر بولا۔ "اچھا..... تو آپ کو "پیراماؤنٹ" پر جانا ہے۔"

"پیراماؤنٹ.....؟" میں نے دُہرایا۔

"یہ اس جہاز کا نام ہے جس پر سیٹھ صاحب آپ کو بھیجنا چاہتے ہیں۔ اس پر تو کیتھرین بھی موجود ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟ کیا تمہیں رمضان نے بتایا ہے؟" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے سیٹھ رمضان نے نہیں بتایا لیکن ہمیں ویسے ہی کراچی سے روانہ ہونے والے ہر جہاز، ہر لانچ، حتیٰ کہ فشنگ ٹرالر تک کے بارے میں ضروری باتیں معلوم ہوتی ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ کیتھرین کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سیٹھ صاحب نے آپ کو نہیں بتایا؟"

"نہیں۔" میں نے جھوٹ بولا۔

"ڈرگ مافیا کی کیریئر تھی لیکن یہ کنفرم نہیں ہے کہ آج کل بھی کام کر رہی ہے یا نہیں۔ میں تو سمجھا تھا، شاید سیٹھ صاحب آپ کو اسی کی وجہ سے اس جہاز پر بھیج رہے ہوں ورنہ یہ جہاز اس قابل تو نہیں ہے کہ آپ اس پر جائیں۔ آپ کے لیے اس سے اچھا بندوبست بھی ہو سکتا تھا۔ رقم تو خیر اتنی ہی خرچ ہونی تھی۔" وہ بولا۔

"دراصل میں جلدی میں ہوں، زیادہ نخرے بازیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جو مل جائے غنیمت ہے۔ میں تو فشنگ ٹرالر تک میں جانے کے لیے تیار تھا لیکن اس میں خطرات ذرا زیادہ تھے۔ ویسے یہ پیراماؤنٹ کس قسم کا جہاز ہے؟"

"چھوٹا سا مال بردار جہاز ہے۔ اس کو چار چھ مسافر بھی لے جانے کی اجازت ملی ہوئی ہے۔ عملے نے اس کو ذرا اور طرح کا سائیڈ بزنس بنا لیا ہے۔"

"کس قسم کا مال لے جاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تیل کے لیے کھدائی میں استعمال ہونے والی بھاری مشینری۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا اس کی آڑ میں اور کیا کچھ لے جاتا ہو۔ افغانستان میں روسی جو اسلحہ چھوڑ گئے تھے اس میں سے جو کے بھی دو ایک پھیرے لگائے تھے۔"

"کیا کبھی ڈرگز کے سلسلے میں بھی اس کے استعمال ہونے کی خبریں سُنی گئی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ترکی کے راستے تو ڈرگز کا ٹریفک پہلے بھی رواں دواں تھا لیکن روس کی ریاستوں کی خودمختاری کے بعد گویا مزید سرحدیں کھلتی جا رہی ہیں۔ بے ضرر سامان اسمگل کرنے والوں کو ہی نہیں بلکہ ڈرگ مافیا کو بھی نئے نئے روٹ، نئے نئے کیریئر مل رہے ہیں۔ کوئی بعید نہیں یہ جہاز بھی استعمال ہوا ہو لیکن اس کی شہرت بری نہیں ہے۔ اس پر کبھی چھاپا نہیں پڑا۔"

"کہیں اب نہ پڑ جائے۔ میں جو اس پر جا رہا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آج کل میرے ستارے ذرا گردش میں ہیں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔" وہ وثوق سے بولا۔ "جہاز صرف استنبول تک ہی تو جا رہا ہے۔ ابھی تک تو اس کے بارے میں کوئی غلط خبر نہیں آئی۔ امید ہے استنبول تک بھی خیریت سے ہی پہنچ جائے گا۔ ہماری اطلاع کے مطابق تو اس پر کچھ نہیں ہے۔"

میں ابھی تک اس شخص کی حیثیت کا تعین نہیں کر سکا تھا کہ وہ خود کیا تھا۔ اسی دوران ویٹر اسنیکس وغیرہ لے آیا اس لیے میں اس سے کچھ پوچھتے پوچھتے رک گیا۔ ویسے بھی یہ پوچھنا کچھ اچھا معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ خود کیا تھا۔

میں نے سینڈوچز کی ایک پلیٹ اس کی طرف کھسکائی تو وہ بولا۔ "میں قطعاً کچھ نہیں کھاؤں گا۔ میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔ یہ تو میں نے آپ کے لیے منگایا ہے۔ آپ کھائیں..... میں اس دوران آپ کا کام کرتا ہوں۔"

میں نے بہت اصرار کیا لیکن اس نے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ "میرا کام" کرنے سے اس کی مُراد کیا تھی۔ یہ بات کچھ دیر بعد میری سمجھ میں آئی۔ اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے نہایت چھوٹے سائز کے بریف کیس سے مشابہ ایک چرمی تھیلی نکالی جیسی عموماً لوگ اپنی چھوٹی موٹی چیزیں رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور ہاتھ میں لٹکائے رکھتے ہیں۔

وہ تھیلی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ شاید دنیا کا مختصر ترین دفتر ہے لیکن بہت ہی اہم کام میں استعمال ہوتا ہے۔"

اس نے تھیلی کی زپ کھول کر چھوٹے سائز کی چند چھپی ہوئی پرچیاں سی نکالیں پھر دو تین مہریں اور ایک پیڈ نکالا۔ قلم ہاتھ میں لے کر ایک پرچی سامنے رکھ کر وہ نیچی آواز میں بولا۔ "آپ کس نام سے سفر کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے ایک لمحے سوچا اور کہا۔ "بس مجھے چوہدری سے خان بنا دو۔ یعنی افضل خان۔" کافی دنوں سے میں یہی نام استعمال کر رہا تھا۔ اپنے نام میں معمولی سی ہیرا پھیری سے ہی کام چلا رہا تھا۔ ابھی تک مجھے نام بدلنے کی کوئی خاص ضرورت پیش بھی نہیں آئی تھی۔ میرے خیال میں یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں تھا۔ زیادہ مشہور اور عوامی قسم کی شخصیات کو ایسے حالات میں نام کے بارے میں زیادہ محتاط

ہونا پڑتا ہے۔ میں تو خاصا گمنام آدمی تھا۔

اس نے جھک کر پرچی پر کچھ خانہ پُری کی' اس پر باقاعدہ دو مُہریں لگائیں اور انہیں خشک کرنے کے لیے پھونک مار کر پرچی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اسے اپنی واپسی تک سنبھال کر رکھیے گا۔"

"یہ کیا ہے؟" میں نے جاننا چاہا۔

"اسے اپنا پاسپورٹ سمجھ لیجیے.... ویزا سمجھ لیجیے.... پروانہ راہداری سمجھ لیجیے۔ جہاز کے کیپٹن کو یہ دکھانے کے بعد آپ مکمل طور پر اس کی ذمے داری ہوں گے۔ کوئی آپ کو نہیں پکڑ سکتا۔ ضرورت پڑنے پر وہ آپ کو اپنے عملے کا رکن بھی بنا سکتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پرچی تہہ کر کے جیب میں رکھ لی اور ایک لمحے کے لیے خاموش سا بیٹھا رہ گیا۔ یہ تو صرف ایک نمونہ تھا۔ ملک سے بھاگنے کے اور نہ جانے کیا کیا طریقے ہیں۔ اسی لیے تو خطرناک مجرم' دہشت گرد' اسمگلر راتوں رات فرار ہو جاتے ہیں' کوئی انہیں روک نہیں پاتا۔ بعض تو خفیہ طریقوں اور خفیہ راستوں سے بھی جانے کی زحمت نہیں کرتے۔ پاسپورٹ ویزے پر جاتے ہیں۔ کتنے ہی ملکوں میں انہیں نہ جانے کتنی طرح کے ویزے اور دوسرے کاغذات مل جاتے ہیں۔ مشکلات تو صرف شرفا کے لیے ہیں۔

میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "اس کے لیے مجھے کچھ ادائیگی کرنی ہے؟"

وہ مغموم سے انداز میں مسکرایا۔ "ہمارا حساب کتاب سیٹھ رمضان کے ساتھ چلتا ہے۔ البتہ جہاز کے کیپٹن سے آپ کو خود نمٹنا پڑے گا۔ آپ یہاں سے سیدھے بندرگاہ چلے جائیے گا۔ برتھ نمبر میں ابھی آپ کو فون پر معلوم کر کے بتا دیتا ہوں...." اس نے پیار سے اپنے موبائل فون کو تھپتھپایا اور ایک بار پھر فلسفیانہ سے لہجے میں بولا۔ "اس قسم کی تمام الیکٹرانک اور دوسری سائنسی ایجادات کا شرفا کو اتنا فائدہ نہیں ہوتا جتنا ہم جیسے لوگوں کو ہوتا ہے۔ ہمارے ناجائز دھندوں میں کچھ اور تیزی آجاتی ہے۔ ہمارے لیے بڑی آسانیاں ہو جاتی ہیں۔"

"مجھے ابھی تک تمہارا نام نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔ بالآخر میں نے یہی سوچا تھا کہ کم از کم نام پوچھ لینے میں تو کوئی حرج نہیں۔

"آصف بھٹی۔" اس نے نہایت دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"آصف بھٹی....؟" میں نے غیر ارادی طور پر دُہرایا۔ "کیا عاشق بھٹی سے تمہارا کوئی....؟" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"جی۔ وہ میرا سگا بھائی تھا۔" اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ افسردگی سے مسکرایا اور بولا۔ "اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

میں خاموش رہا۔ وہ سر جھکاتے ہوئے بولا۔ "آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ اُدھر میرا بھائی قتل ہو گیا ہے اور میں یہاں بڑ... دھندا کر رہا ہوں۔ مجبوری ہے.... اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا... صورت حال ایسی تھی کہ آپ کی مدد کرنا بھی ضروری تھا۔ سیٹھ رمضان کا حکم تھا اور آپ بھی مشکل میں تھے۔ اس کام کو ایک دن کے لیے ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ دوسری طرف بھی مجبوری تھی کہ میں فی الحال بھائی کی لاش کے پاس پھٹک بھی نہیں سکتا تھا لیکن خیر.... کوئی بات نہیں.... دیکھا جائے گا...."

اس نے بظاہر بے پروائی سے کندھے اچکائے لیکن ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ پتھرا سا گیا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گویا گلے میں پھنسی ہوئی کوئی چیز نگلتے ہوئے بولا۔ "شکر ہے لاشیں اذیت محسوس نہیں کرتیں۔ عاشق کی لاش کو ضابطے کی کارروائیوں سے گزر لینے دیں.... میں موقع مناسب دیکھ کر جا کر لاش حاصل کر لوں گا.... پھر موقع مناسب دیکھ کر ذرا ان کی طرف بھی رخ کروں گا جنہوں نے میرے شیر جیسے بھائی کی لاش گرائی ہے۔ شاید ان کے سامنے میری حیثیت وہی ہو جو ہاتھی کے سامنے چیونٹی کی ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی چیونٹی بھی ہاتھی کو بلبلانے پر مجبور کر دیتی ہے۔"

"اگر میں یہاں رکتا تو شاید تمہاری کچھ مدد کر سکتا لیکن میں کچھ عجیب ہی حالات کا شکار ہوں۔ میں یہاں رکنے کا رسک نہیں لے سکتا۔" میں نے ہمدردانہ انداز میں اس کا مضبوط ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں بھئی...." وہ کھوکھلے سے انداز میں ہنسا۔ ہنسی کسی درندے کی غراہٹ سے مشابہ تھی۔ "آپ ہمارے... پریشان نہ ہوں۔ آپ اپنی فکر کریں۔ زندگی رہی تو شاید آپ... دوبارہ ملاقات ہو۔ اگر اس وقت مجھے مدد کی ضرورت ہوئی تو... دیجیے گا...."

پھر وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کو اپنی ٹیکسی کی... چھوڑ آتا لیکن وہ گاڑی اب کچھ مشکوک ہو چکی ہے۔ آپ... دوسری ٹیکسی میں جائیں.... ویسے بھی آپ کا اکیلے ہی جانا... ہے۔ اب آپ روانہ ہو ہی جائیں۔ آپ کے پاس زیادہ وقت... نہیں ہے۔ جہاز آدھی رات کے قریب روانہ ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے.... میں چلتا ہوں۔ تم نے میری جو مدد کی ہے... کے لیے میں ہمیشہ تمہارا شکر گزار رہوں گا۔" میں نے اٹھتے ہوئے... کہا۔

"معذرت خواہ ہوں کہ میں آپ کو خدا حافظ کہنے کے... نہیں اٹھ سکتا۔ اٹھوں گا تو میرے چہرے پر روشنی پڑے گی... کچھ دیر یہاں نیم تاریکی میں ہی بیٹھنا چاہتا ہوں۔" اس... مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

میں اس سے ہاتھ ملا کر سر جھکائے' اپنے لمبے قد کو گول...

چھوٹا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میزوں کے درمیان سے گزرتا واپس پلے لینڈ کے درمیانی راستے پر آگیا۔ اس راستے سے گزر کر میں پلے لینڈ کے دروازے پر پہنچا تو اچانک مجھے یاد آیا' میں نے آصف بھٹی سے یہ تو پوچھا ہی نہیں تھا کہ پیراماؤنٹ کون سی برتھ پر کھڑا ہو گا۔

میں ایک لمحے تذبذب کے سے عالم میں کھڑا رہا۔ والدین اور بچے میرے دائیں بائیں رگڑ کھاتے ہوئے گزر رہے تھے۔ بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ تھوڑی سی زحمت کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ مجھے واپس جا کر برتھ نمبر پوچھ ہی لینا چاہیے تھا۔ یہ چھوٹی سی زحمت مجھے خاصی بڑی زحمت سے بچا سکتی تھی۔

میں واپس روانہ ہوا اور ایک بار پھر ریستوران میں جا پہنچا۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا کہ آصف بھٹی ابھی اسی کونے میں ملگجے اندھیرے میں اپنی کرسی پر موجود تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر جھکتے ہوئے نیچی آواز میں کہا۔ "یار' تم نے مجھے برتھ نمبر تو بتائی ہی نہیں۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ کچھ غیر فطری سے انداز میں ساکت تھا اور اس کی گردن ایک طرف کو ذرا جھکی ہوئی تھی۔ میں نے ذرا غور سے اس کی طرف دیکھا اور بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ضرور تھیں مگر ان سے زندگی رخصت ہو چکی تھی۔

اس کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ تک اسی طرح منجمد ہو کر رہ گئی تھی جس طرح میں نے رخصت ہوتے وقت دیکھی تھی۔ کرسی کا پشتہ جس سے وہ ٹیک لگائے ہوئے تھا' نیم دائرے کی طرح گولائی لیے ہوئے تھا اس لیے آصف کا مُردہ جسم اس کے درمیان ہی ٹکا رہ گیا تھا' کرسی سے لڑھکا نہیں تھا۔ مجھے اس کی قمیص پر عین دل کے مقام پر وہ دھبا بھی نظر آ گیا تھا جو دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ ملگجے اندھیرے میں وہ سیاہ ہی نظر آ رہا تھا مگر حقیقت میں سرخ ہو گا۔ گولی یقیناً اس کے دل سے گزر گئی تھی۔

اچھا ہوا میں نے اس کا کندھا پکڑ کر نہیں ہلایا تھا ورنہ شاید وہ کرسی سے لڑھک ہی گیا ہوتا۔ اردگرد اسی طرح باتوں کی بھنبھناہٹ اور قہقہوں کی دبا دبی سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پلے لینڈ کے بڑے بڑے مشینی کھلونوں میں سے بعض کی مدھم سی آوازیں یہاں پہنچ رہی تھیں۔

اگر کسی نے گولی چلنے کی آواز سنی ہوتی تو یقیناً وہاں ہلچل ہوتی۔ بیشتر لوگ کھسک چکے ہوتے اور کچھ آصف کی میز کے گرد جمع ہو چکے ہوتے لیکن وہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ سب کچھ اسی طرح تھا جس طرح میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا' گولی سائلنسر لگے ریوالور سے چلائی گئی تھی اور آصف بھٹی کا سائلنسر لگا ریوالور میری جیب میں موجود تھا جو شاید وہ اپنی پریشانی میں مجھ سے واپس لینا بھول گیا تھا اور مجھے بھی اسے واپس کرنے کا خیال نہیں آیا تھا۔

میرے جسم میں خفیف سی سرد لہر دوڑ گئی۔ بیک وقت کئی اندیشے میرے ذہن میں آئے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ ابھی میرے عقب سے آواز آئے گی۔ "ہینڈز اپ۔" میں مُڑ کر دیکھوں گا تو کوئی پولیس پارٹی میرا راستہ روکے کھڑے ہو گی۔ سب سے آگے جو پولیس آفیسر ہو گا اس کے ہاتھ میں ریوالور یا کوئی دوسری گن ہو گی جس کا رخ میری طرف ہو گا۔ پھر میری جیب سے سائلنسر لگا ریوالور بھی برآمد کر لیا جائے گا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اس میں پہلے ہی سے ایک آدھ گولی کم ہوتی۔ گویا قاتل رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا جاتا۔

دوسرا امکان یہ بھی موجود تھا کہ کسی بھی لمحے عقب سے گولی میرے جسم میں بھی پیوست ہو سکتی تھی۔ اس احساس سے میرے اعصاب تن گئے۔ ایک لمحے کے لیے تو میرے ہاتھ غیر ارادی طور پر خالی کرسی کے پُشتے پر سختی سے جم گئے۔ میرے لیے مُڑ کر دیکھنا دشوار ہو گیا۔ بڑی مشکل سے میں آہستگی سے گھوما۔

کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ کم از کم بظاہر تو یہی محسوس ہو رہا تھا۔ میزوں پر جتنے بھی لوگ موجود تھے ان میں سے ہر ایک اپنی بات میں' اپنی ذات میں یا اپنی گپھات میں مگن تھا۔ مدھم روشنی میں سب اپنے اپنے شغل میں لگے ہوئے تھے۔ شاید وہ شخص اب وہاں موجود نہیں تھا جو آصف کے لیے اجل کا پیامبر بنا تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے اُلجھن میں پڑ گیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔ آصف کو یوں چھوڑ کر جانا مجھے اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا لیکن جلد ہی میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اگر مجھے وہاں سے نکلنے کا موقع میسّر تھا تو نکل ہی لینا چاہیے تھا۔ میں خاموشی سے واپس روانہ ہو گیا۔ میزوں کے درمیان سے گزرتے وقت ہر لمحے مجھے یہی اندیشہ محسوس ہوتا رہا کہ کوئی وہٹر عقب سے چیخے گا۔ "ارے.... اس آدمی کو پکڑو.... یہ اپنے ساتھی کو گولی مار کر بھاگ رہا ہے۔" لیکن میری خوش قسمتی تھی کہ ایسا نہیں ہوا۔

نیچے پہنچ کر میں نے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو منہ مانگے کرائے پر ہامی بھر کر بندرگاہ چلنے کے لیے کہا۔ بندرگاہ پہنچ کر اب مجھے خود ہی معلوم کرنا تھا کہ پیراماؤنٹ کس برتھ پر کھڑا تھا۔ تمام راستے میں مُڑ مُڑ کر دیکھتا رہا۔ مجھے قدرے حیرت بھی ہوئی کہ میرا تعاقب نہیں کیا جا رہا تھا۔ آصف کی صورت بار بار میری نظروں میں پھرتی رہی۔ چند لمحے پہلے وہ زندہ سلامت مجھ سے بات کر رہا تھا۔ مجھے "پروانہ راہداری" تیار کر کے دے رہا تھا اور بھائی کے قتل کا انتقام لینے کا عزم ظاہر کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس کا جسم روح سے خالی تھا۔ زندگی اور موت کے درمیان حائل لکیر کچھ زیادہ ہی باریک تھی۔

بندرگاہ پہنچ کر مجھے پیراماؤنٹ کو تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ کسی جہاز کے سیلر نے میری رہنمائی کر دی۔ پیراماؤنٹ دو نمبر برتھ پر کھڑا تھا۔ مجھے زیادہ چلنا نہیں پڑا۔ برتھ

سے ایک چوبی پُل جہاز تک پہنچا ہوا تھا۔ اس پُل کے اختتام پر تقریباً پچپن کی عمر کا ایک بھاری بھرکم شخص کھڑا تھا۔

وہ سفید فام تھا لیکن سمندری ہواؤں، تیز دھوپ اور موسمی تغیر و تبدل نے یقیناً اس کے چہرے کی سفیدی کو بہت متاثر کیا تھا۔ اب اسے سفید فاموں میں شمار کرنا ذرا مشکل ہی محسوس ہوتا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو میرے کچھ بولنے سے پہلے اس نے خود ہی پوچھ لیا۔ "کس سے ملنا ہے؟"

"جہاز کے کیپٹن سے۔" میں نے جواب دیا اور اسی لمحے مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ یقیناً کیپٹن ہی تھا۔ اس کے جسم پر کیپٹن کی وردی تھی اور سینے پر کیپٹن کا بیج بھی آویزاں تھا۔ اسے یقیناً صدمہ ہوا تھا کہ میں نے اسے کیپٹن کی حیثیت سے نہیں پہچانا تھا۔ اس کا چہرہ ایک لمحے کے لیے غم ناک سا ہوگیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ دونوں طرف کے جنگلوں پر رکھے کھڑا تھا گویا اسے پہلے ہی کسی کی آمد کی توقع رہی ہو اور وہ اس کا راستہ روکنے کے لیے کھڑا ہو۔

"میں ہی کیپٹن ہوں۔" اس نے گویا میری بینائی پر شک کرتے ہوئے کہا۔ وہ جھٹکے دار لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔ لگتا یہی تھا کہ انگریزی اس کی مادری زبان نہیں تھی۔ "میرا نام گونزے۔"

میں نے معذرت خواہانہ سے انداز میں اس سے مصافحہ کیا اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اس کا تعلق کس ملک سے تھا۔ مجھے آم کھانے سے مطلب تھا، پیڑ گننے سے نہیں۔ اس نے نیم خوابیدہ سی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے نیم بیزاری سے مصافحہ کیا۔ اس کا ہاتھ کیا تھا گویا لکڑی کا ایک موٹا سا بے جان ٹکڑا تھا۔

میں نے جلدی سے جیب سے پرچی نکال کر اس کی خدمت میں پیش کی۔ اس نے پہلے پرچی کو اور پھر مجھے بغور دیکھا۔ اسے گویا یقین نہیں آرہا تھا کہ عین آخری لمحوں میں بھی اس کے جہاز پر سفر کرنے کا کوئی خواہش مند پہنچ سکتا تھا۔

"ہمارا یہ مال بردار جہاز کافی چھوٹا ہے۔ زیادہ تر ہم ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ تک سامان پہنچاتے ہیں۔ ہمارے پاس مسافروں کو لے جانے کے لیے زیادہ جگہ نہیں ہے۔" اس نے واضح کیا۔

میں جہاز کا جائزہ تو چوبی پُل پر چڑھنے سے پہلے ہی لے چکا تھا۔ وہ مین لوڈنگ ایریا سے کافی ہٹ کر کھڑا تھا۔ تقریباً دو سو فٹ لمبے اس زنگ خوردہ سے جہاز کی حالت بتا رہی تھی کہ اس پر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ کیپٹن گونزے کے چہرے سے کچھ یوں لگتا تھا جیسے اسے دنیا کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔

"مجھے تو بتایا گیا تھا کہ آپ کو مجھے لے جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

"میں اعتراض نہیں کر رہا۔" وہ بے دلی سے بولا۔ "میں تو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اس جہاز پر تم کچھ زیادہ آرام دہ سفر کی توقع مت رکھنا۔ یہ کوئی پُرتعیش اور مسافر بردار جہاز نہیں

لازوال
کہانیوں کے خالق
انور صدیقی
کے
شاہکار ناول

خبیث (۵ حصے) -/۲۰۰
برہمچاری -/۱۵۰
درخشاں (۲ حصے) -/۹۰
رقصِ ابلیس -/۱۵۰
آسیب زدہ -/۱۱۰
دستک -/۱۰۰

مکتبہ القریش
اُردو بازار لاہور ۲
فون ۷۲۲۴۶۶۵

ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں یہاں عیش و آرام کی تلاش میں نہیں آیا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "عیش و آرام تو زندگی میں بہت دیکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے یہ میرے لیے ذرا بے آرامی اٹھانے کے دن ہیں۔ مجھے بہرحال استنبول جانا ہے۔"

"ہوائی جہاز سے تم چند گھنٹوں میں وہاں پہنچ سکتے ہو۔ اس جہاز پر تم نہ جانے کب تک خوار ہوتے رہو۔ ہمیں استنبول پہنچنے میں کئی دن لگ جائیں گے۔" وہ پوری طرح میری ہمت شکنی پر تُلا ہوا تھا یا پھر شاید میرا حوصلہ آزما رہا تھا۔

"میں ذرا سمندر کی سیر کرنا چاہتا ہوں اور مجھے استنبول پہنچنے کی کچھ ایسی جلدی بھی نہیں ہے۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ ایک طرف کا کرایہ کتنا ہوگا؟"

اس نے جو کرایہ بتایا وہ کم از کم اس وقت میرے ہوش اُڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ سیٹھ رمضان نے تو کہا تھا کہ وہ لوگ کم کرائے پر مسافر لے جاتے ہیں لیکن وہ کرایہ ہوائی ٹکٹ سے بھی کم از کم چار گنا زیادہ تھا لیکن ایک لحاظ سے شاید سیٹھ رمضان نے ٹھیک کہا تھا۔ اگر میں قتل و غارت گری برپا کرانے، اسمگلنگ کے دھندوں میں ملوث رہنے یا کچھ اور خطرناک قسم کی سرگرمیوں میں مصروف رہنے کے بعد قانون کے شکنجے سے بچنے کے لیے ملک سے بھاگ رہا ہوتا تو شاید یہ کرایہ مجھے زیادہ محسوس نہ ہوتا۔ عام حالات میں بھی شاید یہ مجھے گراں نہ گزرتا بشرطیکہ میرا روپیہ پیسہ میرے استعمال میں ہوتا۔ میرے پاس تو فی الحال زرتاج کی دی ہوئی رقم چل رہی تھی۔ سیٹھ رمضان نے مجھ سے پوچھا تھا کہ رقم کی ضرورت تو نہیں۔ میں نے کچھ زیادہ ہی خود اعتمادی اور زعم میں انکار کردیا تھا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ میں نے خواہ مخواہ ہی انکار کیا۔ اگر اس حساب سے اخراجات ہونے تھے تو مجھے رقم لے ہی لینی چاہیے تھی۔

بہرحال ابھی کچھ ایسی تشویش کی بات بھی نہیں تھی۔ کیپٹن گونزے کو تو میں آسانی سے ادائیگی کرسکتا تھا۔ بلکہ اگر راستے میں میری زیادہ کمال نہ کھینچی جاتی تو میں واپسی کا کرایہ بھی دے سکتا تھا۔ میں نے چہرے سے تکلیف کا اظہار نہیں ہونے دیا اور نہ ہی سودے بازی کی کوشش کی بلکہ رقم گن کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

اس کے چہرے کی مُردنی میں کچھ کمی آگئی۔ رقم اپنی بڑی سی جیب میں رکھتے ہوئے اس نے مجھے اپنے جہاز کے بارے میں مزید معلومات مہیا کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارا جہاز پاناما میں رجسٹرڈ ہے اور ہمارا کریو صرف نو افراد پر مشتمل ہے۔ ہمارے پاس چار فاضل کیبن ہیں جن میں سے دو اس وقت بھرے ہوئے ہیں، دو خالی ہیں۔ کھانا وہی ملے گا جو کریو کے لیے پکتا ہے اور زیادہ تر تمہیں کریو کے ساتھ ہی کھانا پڑے گا اور اخراجات کی ادائیگی روز کے روز کرنی ہوگی۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ تم کیش ساتھ لائے ہو۔ میں کریڈٹ کارڈ یا ٹریولرز چیک وغیرہ قبول نہیں کرتا۔ تم آئے بھی اچھے وقت پر ہو۔ جہاز روانہ ہی ہونے والا ہے۔"

عین اسی وقت میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بالائی عرشے کے جنگلے سے ایک لڑکی جھانک رہی تھی۔ وہ ایک خوبصورت سفید فام لڑکی تھی۔ اس کے سنہرے تراشیدہ بال ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اس کے چہرے کے گرد ہلکورے لے رہے تھے۔ وہ بغور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ بلندی زیادہ نہیں تھی۔ میں اس کی آنکھوں کا رنگ تک دیکھ سکتا تھا۔ نیلی شفاف آنکھیں تھیں اور ان آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں تھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو میرا دل گویا دھڑکنا بھول گیا تھا کیونکہ مجھے گمان گزرا تھا، شاید وہ وہی آسیبی سی آنکھوں والی لڑکی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے میری غلط فہمی دور ہوگئی۔ یہ وہ لڑکی نہیں تھی اور اس کی شخصیت کا تاثر آسیبی سا ہرگز نہیں تھا۔

"خوش آمدید سرار! رات بڑی خوشگوار ہے..... آسمان پر چاند بھی نکلا ہوا ہے....." دفعتاً کسی نے قریب ہی سے ذرا شکستہ سی انگریزی میں لیکن کچھ چبھتے ہوئے سے لہجے میں کہا۔

میں نے اوپر سے نظر ہٹا کر دیکھا۔ اسی دوران پکی رنگت کا ایک جوان العمر شخص ہمارے قریب آن کھڑا ہوا تھا۔ وہ ذرا میلی سی سفید یونیفارم میں تھا۔ پیروں میں سفید کینوس کے جوتے تھے۔ شاید وہ کچھ دبے قدموں آیا تھا جو مجھے اس کی آہٹ سنائی نہیں دی تھی۔ ویسے بھی وہ ہلکے جسم کا تھا۔

اس نے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ دُبلا پتلا ہونے کے باوجود اس کے ہاتھ میں مضبوطی تھی۔ لہجے اور نقوش سے وہ گلہ دیشی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے دوبارہ آسمان کی طرف دیکھا۔ ابتدائی تاریخوں کا دھندلا سا چاند کسی قدیم جھومر کی طرح آسمان کی تاریک پیشانی پر آویزاں تھا مگر شاید اس سیاہ فام نوجوان کا اشارہ اس کی طرف نہیں، چاندنی چہرے کی طرف تھا۔

اسے نہ جانے کس طرح معلوم ہوچکا تھا کہ میں جہاز پر سوار ہونے کے لیے آیا تھا جو وہ مجھے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ وہ شاید منتظر تھا کہ میں اس سے اپنا تعارف کراؤں گا لیکن میں نے اس کی زحمت نہیں کی۔ میرا ذہن اس لڑکی میں اُلجھا ہوا تھا جو اوپر جنگلے سے جھانک رہی تھی۔ یقیناً وہی کیتھرین تھی۔ کیا میں جہاز پر قدم رکھتے ہی اس کی نظر میں مشکوک ہوگیا تھا؟ وہ کچھ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے اس سے راہ و رسم بڑھانے میں دقت پیش آئے گی۔ حالانکہ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کام میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی کیونکہ وہ ایک مغربی لڑکی تھی۔

میں نے بھی صرف اس کی ایک جھلک ہی دیکھی تھی لیکن مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ ڈرگ مافیا کی کیریئر بھی ہوسکتی تھی۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک معزز گھرانے کی وضعدار لڑکی تھی۔ خود کو لیے دیے رکھتی تھی لیکن پھر میں نے سوچا، اس میں حیرت کی

کوئی بات نہیں تھی۔ بیشتر کالے دھندے کرنے والوں کی صورت سے اندازہ لگانا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے کہ ان کے کرتوت کیا ہیں بلکہ بعض تو ایسی پارساؤں والی شخصیت بنا لیتے ہیں کہ ان کی طرف انگلی اٹھانے سے پہلے کسی کو سو مرتبہ سوچنا پڑتا ہے۔

میں نے دوبارہ اوپر دیکھا تو کیتھرین غائب ہو چکی تھی۔ پکّی رنگت والا نوجوان بولا۔ "آیئے میں آپ کو آپ کے کیبن تک چھوڑ آؤں۔"

میں خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیا۔ میں ایک تہی دست مسافر تھا۔ میرے پاس کوئی رختِ سفر نہیں تھا۔ وہ مجھے جس کیبن میں لے گیا وہ بظاہر عملے ہی کے کسی فرد کا کیبن معلوم ہوتا تھا۔ اس میں دیوار گیر بستر کے نیچے کچھ اوزار بھی پڑے تھے۔

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو آپ کو خود باہر آنے کی تکلیف کرنا ہوگی۔" پکّی رنگت کے نوجوان نے "گزارے لائق" انگریزی میں کہا اور رخصت ہو گیا۔ شاید اسے میری خاموشی اچھی نہیں لگی تھی۔

دروازہ بند ہوتے ہی میں دیوار گیر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ میں اس وقت بری طرح تھکا ہوا تھا۔ ہر بات کو بھول جانا چاہتا تھا۔ بستر پر گرنے کے شاید چند سیکنڈ بعد ہی میں سو گیا۔ عام حالات میں شاید وہ بے ہودہ سا دیوار گیر بستر مجھے اپنی جسامت کے حساب سے بہت چھوٹا اور ناکافی محسوس ہوتا لیکن اس وقت مجھے اس پر گر کر کچھ ہوش نہ رہا۔

جہاز کی تیز وسل سے میری آنکھ کھلی۔ کیبن گو کہ چاروں طرف سے بند تھا جس طرح عموماً جہازوں کے کیبن ہوتے ہیں لیکن آواز گویا اس میں بلا رکاوٹ آ رہی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ میں بہ مشکل تین گھنٹے سویا تھا لیکن خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ اتنی نیند بھی میرے لیے کافی ثابت ہوئی تھی۔

میں کیبن سے نکل آیا اور ریلنگ پر جا کھڑا ہوا۔ برتھ سے جہاز کی بندشیں کھولی جا چکی تھیں اور جہاز اپنے وقت سے قدرے تاخیر کے ساتھ روانہ ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ جہاز بندرگاہ سے دور ہونے لگا۔ اس وقت کیتھرین یا کوئی اور مسافر کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بالآخر جہاز بحیرۂ عرب کے کھلے پانیوں میں نکل آیا تو میں بالائی عرشے پر چلا گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ کیپٹن گونزاس وقت بھی وہیل روم کے بجائے آرام سے عرشے پر بیٹھا ہوا تھا۔ عملے کا ایک اور فرد بھی اس کے ساتھ تھا۔ گونز جس سگار کے کش لے رہا تھا اس کی بو کھلی فضا میں بھی نہایت تیز اور ناگوار محسوس ہو رہی تھی۔

"آیئے مسٹر افضل خان!" کیپٹن گونز کے لہجے میں اب معمولی سی گرم جوشی تھی۔ اس نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کرسیوں کے پائے اسکریوز کے ذریعے عرشے کے فرش سے جڑے ہوئے تھے۔

میں بیٹھ چکا تو کیپٹن گونز عملے کے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ میرا فرسٹ میٹ جنتر ہے۔"

میں مسکرا دیا۔ جنتر ایک عجیب نام تھا۔ ایک پاکستانی کے ذہن میں اس کے ساتھ لفظ "منتر" آنا لازمی تھا لیکن ان بے چاروں کو شاید معلوم نہیں تھا کہ ہمارے ہاں یہ بھی کوئی اصطلاح تھی۔ جنتر بھی دُبلا پتلا ہی تھا۔ وہ سفید فام تھا لیکن عرشے پر کم روشنی میں بھی اس کی رنگت کی زردی نمایاں تھیں۔ رنگت کی یہ زردی بیماروں والی تھی۔ تاہم اس سے مصافحہ کرتے وقت اندازہ ہوا کہ ہاتھ اس کے بھی مضبوط تھے۔

"ہمارے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ ہمارے ساتھ سفر کر رہے ہیں مسٹر کان!" جنتر نے رسمی سے لہجے میں کہا۔ انگریزی میں بات کرتے وقت اس نے مجھے 'خان' سے 'کان' بنا دیا تھا۔ لہجے سے وہ جرمن معلوم ہوتا تھا۔ وہ مزید رسمیات نبھاتے ہوئے بولا۔ "آج کی رات بڑی خوش گوار ہے۔ آسمان پر تارے چمک رہے ہیں۔"

بحری جہاز والے شاید آسمان کی طرف کچھ زیادہ ہی دیکھتے تھے اور انہیں آسمان پر چاند ستاروں کا بہت خیال رہتا تھا۔ کیپٹن گونز نے سگار کا گہرا کش لیا تو اس کے سگار کا سرا دہک اٹھا۔ میں نے باری باری ان دونوں کی طرف بغور دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ "مجھے تو کافی دنوں سے زمین نے ہی کچھ ایسا اُلجھایا ہوا ہے کہ آسمان کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔"

پھر میں نے گویا اس کا دل رکھنے کو کھلے آسمان کی طرف دیکھا۔ تاروں بھرا آسمان واقعی بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ نیچے سمندر پُرسکون تھا۔ جہاز پانی کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اس لیے آس پاس تھوڑی دور تک تو تلاطم سا محسوس ہو رہا تھا لیکن اس سے آگے سکوت ہی تھا۔ کہیں کہیں پانی سیال چاندی کی طرح چمک اٹھتا تھا۔

"سمندر پُرسکون ہو تو کتنا خوبصورت لگتا ہے اور بپھرا ہو تو کتنا خوفناک۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر مرطب ہوا کو رگ و پے میں سموتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ غور کریں تو آپ کو قدرت کی بنائی ہوئی ہر چیز کا کیا حساب نظر آئے گا مسٹر افضل خان!" عجیب بات تھی کہ وہ میرے نام کا صحیح تلفظ ادا کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "سچ ہے اس خطے میں زیادہ بارشیں نہیں ہوتیں۔ ہمارے سفر کسی نہ کسی حد تک شیڈول کے مطابق ہو جاتے ہیں۔"

جنتر اٹھتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ "میں ذرا وہیل ہاؤس میں جا رہا ہوں۔"

وہ جا چکا تو میں نے کہا۔ "لگتا ہے تمہارے جہاز کے عملے میں ہر ملک کا آدمی شامل ہے۔"

"جہازوں پر عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔" کیپٹن گونز سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا۔ "جہاز بین الاقوامی بھائی چارے کا چلتا پھرتا

نمونہ ہوتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ لوگ غیروں کے جہازوں پر..... غیروں کے ساحلوں پر..... غیروں کے ملکوں میں تو مل جُل کر رہ لیتے ہیں لیکن اپنے ملک میں، اپنے بھائیوں اور اپنے ہم وطنوں سے جانوروں کی طرح لڑتے رہتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ میرے لیے خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ شاید اس نے یہ جوتا میرے ہی منہ پر مارا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔

"ویسے اس جہاز پر صرف میں اور جنتر ہی یورپین ہیں، باقی سات افغانی اور بنگلہ دیشی ہیں۔ افغانستان کا تو تمہیں علم ہی ہوگا کہ کوئی ساحل اسے نہیں لگتا اس لیے اس کی زیادہ تر تجارت تمہارے ہی ملک کے راستے ہوتی ہے۔ وہاں کے لوگوں کو سمندر میں بڑی کشش محسوس ہوتی ہے، کھنچے چلے آتے ہیں اور آج کل تو ویسے ہی وہاں کے حالات بڑے خراب ہیں۔ پہلے وہ روسیوں کے خلاف جہاد کر رہے تھے، آج کل ایک دوسرے کے خلاف "جہاد" میں مصروف ہیں۔ بنگلہ دیش کی حالت بھی پتلی ہے۔ پہلے ان لوگوں کو شکوہ تھا کہ تم لوگ ان کا استحصال کر رہے ہو۔ اب پتا نہیں کون ان کا استحصال کر رہا ہے۔ اب وہاں پہلے سے زیادہ غربت، پہلے سے زیادہ بے روزگاری، پہلے سے زیادہ مہنگائی ہے۔ ہمیں کبھی وہاں لنگر انداز ہونا پڑتا ہے تو بڑے تکلیف دہ مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ بہت سے گھبرو نوجوان آتے ہیں جو صرف روٹی اور کپڑے کے عوض جہاز پر کام کرنے اور ہمارے ساتھ چلنے کے لیے منتیں کرتے ہیں۔" اب میں اسے کیا بتاتا کہ اب وہی لوگ اور ان کی اولادیں یہاں خانساماں گیری اور معمولی گھریلو نوکریاں کرنے چلی آ رہی تھیں جنہیں کل سونار بنگلہ کا خواب دکھایا گیا تھا اور جو مغربی پاکستان والوں کی لاشیں گرا رہے تھے۔

میں خاموش ہی رہا۔ وہ کمبخت خطّے کے حالات کے بارے میں کافی کچھ جانتا تھا۔ میں اس قسم کے تکلیف دہ موضوعات پر بات چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بات بہت دور نکل جاتی ہے۔ زخم تازہ ہوتے ہیں۔ میں نے بات بدلنے کی ایک دھیمی سی کوشش کی۔

"موسم خوشگوار ہو تو تمہیں بحری سفر ایک دلچسپ تفریح محسوس ہوتا ہوگا؟"

"زندگی سمندری سفر میں گزر گئی....." وہ کندھے اُچکا کر بولا۔

"اب اس میں کم از کم میرے لیے تفریح والی کوئی بات نہیں رہی۔ بعض اوقات خوشگوار موسموں میں بھی بڑے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں سمندر پُرسکون تھے مگر خلیج میں جنگ جاری تھی۔ ہمیں خلیج میں کئی جگہ امریکیوں نے روکا اور ہمارے جہاز پر لد کر ادھر سے اُدھر جاتے رہے۔ جنگی سامان بھی ڈھوتے رہے۔ شکر ہے جنگ جلد ختم ہو گئی۔ اس سفر سے واپسی پر مجھے نیا فرسٹ میٹ بھی بھرتی کرنا ہے کیونکہ جنتر نے مجھے دیانت داری سے بتا دیا ہے کہ وہ بیمار ہے۔"

"اوہ..... کیا ہوا اسے؟" میں نے رسماً پوچھا۔

کیپٹن گونز ایک لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ "وہ ایڈز کی ابتدائی اسٹیج پر ہے۔ اگر مجھے یہ بات پہلے معلوم ہوتی تو میں اس سفر پر بھی اسے ساتھ لے کر نہ آتا۔"

"یہ تو بڑی موذی بیماری ہے۔" میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"اس میں کیا شک ہے۔ خدا جنتر پر رحم کرے۔ اسے تو کوئی معیوب عادت بھی نہیں تھی۔ نہ جانے اسے کہاں سے اور کیسے لگ گئی یہ بیماری۔ بعض اوقات ڈاکٹروں کی تھیوریاں بھی غلط ثابت ہو جاتی ہیں۔" کیپٹن متاسفانہ لہجے میں بولا۔

"بعض اوقات نہیں..... بلکہ اکثر اوقات غلط ہی ثابت ہوتی ہیں لیکن ہم اس وقت تک آنکھیں بند کر کے ان پر یقین کیے رکھتے ہیں جب تک وہ خود ان کی تردید نہیں کر دیتے یا ان میں تصحیح نہیں کر لیتے۔ ہمارے لیے یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"شاید تم صحیح کہہ رہے ہو۔" وہ مسکرایا۔ مجھے خوشی تھی کہ اس نے جس رُکھائی سے میرا استقبال کیا تھا، اب اس کا رویّہ اس کی نسبت بہت بہتر نظر آ رہا تھا۔ وہ خاصی بے تکلفی سے گفتگو کر رہا تھا۔

میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے کہا۔ "مجھے باقی دو مسافروں کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ ابھی تک میں نے انہیں دیکھا نہیں۔"

"کیا بتاؤں..... میں خود ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "ویسے بھی ہمارے جہاز پر سفر کرنے والے اس بات کو زیادہ پسند نہیں کرتے کہ ان کے بارے میں جاننے کی کوشش کی جائے۔ بہرحال مجھے اتنا معلوم ہے کہ ان میں سے ایک نوجوان انگریز لڑکی ہے۔ دوسرا مسافر فرانسیسی مرد ہے۔ شاید صبح ناشتے پر تمہاری ان سے ملاقات ہو۔"

اس نے سگار کا ٹوٹا سمندر میں پھینک دیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس جہاز پر مسافروں کو لے کر جانا ہے تو جھنجھٹ ہی..... خواہ ان کے پاس پورے سفری کاغذات بھی موجود ہوں..... لیکن کیا کریں..... ساری دنیا میں، ہر طبقے میں موقعے سے فائدہ اٹھانے اور فاضل دولت کمانے کی دوڑ لگی ہے۔ میں اور میرا عملہ بھی اسی لیے سارے خطرات مول لیتے ہیں۔ میری تو ویسے بھی ریٹائرمنٹ قریب ہے۔ میں چاہتا ہوں، زندگی سمندروں میں دھکے کھاتے گزر گئی، کم از کم بڑھاپا تو کسی اچھی سی جگہ پر عیش سے گزر جائے اور اولادیں بھی یہ کہیں کہ بڈھا مرنے سے پہلے کافی کچھ چھوڑ گیا۔ گو کہ اولاد سے شکر گزاری کی کوئی امید تو نہیں ہے۔ خصوصاً ہم یورپین لوگوں کے ہاں۔"

"اب تو مشرق میں بھی یہی حال ہے۔" میں نے کہا۔

"بہرحال جنتر مسافروں کے آرام اور ضروریات کا خیال رکھتا ہے۔" کیپٹن گونز نے گویا مجھے مطلع کیا۔ "ہم کوشش تو کرتے ہیں

کہ انہیں مسافر جہاز جیسا آرام مہیّا کر سکیں لیکن اگر کوئی زحمت ہو تو اس کے لیے پیشگی معذرت۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب میں بھی دھیل ہاؤس میں جاتا ہوں۔"

میں بھی اپنے کیبن میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ کیبن میں پہنچ کر کچھ دیر کی کوشش کے بعد میں سونے میں کامیاب ہو ہی گیا لیکن صبح بہت جلد میری آنکھ کھل گئی۔ سمندر پُرسکون ہونے کے باوجود مجھے بحری سفر کچھ اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ باہر سے کچھ خفیف سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے دروازہ کھول کر جھانکا۔ وہی بنگلہ دیشی جو مجھے گزشتہ رات کیبن تک چھوڑ گیا تھا' کینوس کے سامنے ڈیک پر پوچا لگا رہا تھا۔ اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور سیاہی مائل ہونٹوں کے درمیان اس کے پیلے دانت چمک اٹھے۔

"تمہارا نام کیا ہے برادر؟" میں نے انگریزی میں پوچھا۔

"عبدل۔" اس نے جواب دیا۔

"عبدل! کیا ناشتا تیار ہو گیا ہے؟" میں نے پوچھا اور باہر آگیا۔

"جلدی ہو جائے گا۔ ٹھیک سات بجے ناشتا میس میں لگا دیا جائے گا۔" عبدل نے جواب دیا۔

"ہیلو مسٹر...!" دفعتاً عقب سے ایک مردانہ لیکن نہایت ملائم سی آواز سنائی دی۔ "تم پاکستانی ہو نا؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا' بنگلا جہاں ذرا گولائی میں گھوم رہا تھا وہاں ایک سفید فام' دراز قد ادھیڑ عمر شخص کھڑا تھا۔ اس کے بالوں میں سفیدی کی جھلک تھی۔ وہ گلے میں دوربین لٹکائے ہوئے تھا۔ ہاتھ میں کوئی البم سا تھا۔

"جی ہاں' میں پاکستانی ہوں۔" میں نے اس کا سرتاپا جائزہ لینے کے بعد کہا۔ "آپ کی تعریف؟"

"میں پیری کلاکر ہوں۔ فرانس کے شہر مارسلز سے میرا تعلق ہے۔" وہ آگے آکر مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "کیا پہلا ماؤنٹ میں یہ تمہارا پہلا سفر ہے؟"

"ہاں۔ تم کیا اکثر اس پر سفر کرتے رہتے ہو؟" میں نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "اس سے پہلے میں نے صرف دو مرتبہ سفر کیا ہے۔"

معلوم نہیں اسے دو مرتبہ بھی مسافر جہازوں کو چھوڑ کر اس جہاز سے سفر کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟ ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ کہیں وہ بھی ڈرگ مافیا کا آدمی تو نہیں تھا؟

"یہ تم دوربین سے کیا دیکھ رہے ہو؟" میں نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

"ساحلی اور سمندری پرندے۔" اس نے جواب دیا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی بڑی سی البم نما کتاب بلند کر کے مجھے دکھانے لگا۔ وہ پرندوں کے بارے میں کوئی فرانسیسی کتاب معلوم ہوتی تھی' پیری کلاکر بات انگریزی ہی میں کر رہا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی اس کی انگریزی میں فرانسیسی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس سفر کے دوران جو ساحلوں سے زیادہ دور نہیں جاتا۔ خصوصاً بحیرۂ احمر سے گزرتے وقت..... چنانچہ ساحلی پرندوں کے مشاہدے کے لیے یہ بہترین موقع ہوتا ہے۔"

اس نے دوربین مجھے تھما دی۔ میں اسے آنکھوں سے لگا کر فوکس کر کے دیکھنے لگا۔ وہ یقیناً ایک طاقتور دوربین تھی۔ بہت دور اُفق پر کچھ پرندے اُڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ کلاکر مجھے ان کی قسموں اور نسلوں کے درمیان باریک باریک سا فرق سمجھانے لگا جس سے مجھے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ میرے خیال میں تو پرندے بس پرندے تھے.... اور کچھ نہیں۔ انہیں قدرت کی دوسری ان گنت اور رنگا رنگ خوبصورت مخلوقات کی طرح دیکھ کر لطف اندوز ہونا چاہیے تھا۔ ان کے بارے میں باریکیوں پر غور کرنا سائنس دانوں کا کام تھا۔

میں کلاکر کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالتے ہوئے دوربین کو آہستگی سے ادھر اُدھر گھما رہا تھا کہ اچانک غیر ارادی طور پر دوربین کا رخ کافی نیچے کی طرف ہو گیا۔ یوں تو سمندر میں دور دور تین چار چھوٹے بڑے جہاز رواں تھے جو دوربین کے بغیر بھی دکھائی دے رہے تھے لیکن اس طرح وہ محض بڑے بڑے کھلونے ہی دکھائی دے رہے تھے۔

اب دوربین کے ذریعے ان میں سے ایک اچانک ہی میری نظر میں آیا تو کچھ یوں لگا جیسے میں اچانک چھلانگ لگا کر اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ وہ جہاز نہیں' ایک بڑا سا خوبصورت اسٹیمر تھا۔ اس میں اصل ڈیک کے علاوہ ایک چھوٹا سا بیضوی ڈیک بنا ہوا تھا جس کے گرد جنگلا تھا۔ یہ ڈیک سب سے اونچا تھا اور اس پر گھٹنوں تک اونچی چست نیلی جینز اور نارنجی بلاؤز میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے سنہرے بال تیز ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ گلے میں نیلا اسکارف باندھے ہوئے تھی۔ ابھرتے سورج کی کندنی کرنوں میں اس کا وجود کسی بہار کی چوٹی پر ایستادہ حسین مجسمے کی طرح چمک رہا تھا۔

وہ بھی آنکھوں سے دوربین لگائے ایک اور جہاز کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اچانک ہی اس نے آنکھوں سے دوربین ہٹائی۔ گو کہ وہ دوسرے جہاز کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن زاویہ کچھ ایسا تھا کہ میں اس کی آنکھیں دیکھ سکتا تھا۔ دوربین میرے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچی اور میرے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ وہ وہی بے رنگ اور آسیبی سی آنکھوں والی لڑکی تھی۔

میرا خیال تھا کہ مجھے اپنے اعصاب پر بڑا قابو رہتا تھا لیکن اس لمحے مجھے اپنے اعصاب مُرتعش محسوس ہوئے۔ بعض اوقات کسی بہت بڑے بدمعاش اور پھنّے خاں قسم کی شخصیت کا وہ تاثر

نہیں ہوتا تھا جو کسی نرم و نازک قسم کی شخصیت کا ہوتا ہے۔ خوف سے زیادہ میرے اعصاب درحقیقت حیرت کے حملے سے مُرتعش ہوئے تھے۔

آخر یہ لڑکی تھی کیا بلا؟ کیا وہ واقعی کوئی آسیبی قسم کی چیز تھی؟ میں جہاں بھی جاتا تھا' آخر وہ کس طرح آس پاس ہی کہیں نہ کہیں دکھائی دے جاتی تھی؟ کیا وہ میری بُو سونگھتی ہوئی میرے تعاقب میں چلی آرہی تھی؟ کیا اس کا واقعی ریڈ ڈاٹ سے کوئی تعلق تھا یا یہ کوئی اور چکر تھا؟ پیچ میں اس نے یقیناً بہت دیر کے لیے میرا سراغ کھو دیا تھا۔ اب وہ دوبارہ میرے پاس کس طرح پہنچ گئی تھی؟ کیا اس نے مجھے تلاش کر لیا تھا؟

اس کے انداز سے لگتا تو یہی تھا کہ ابھی اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا لیکن کیا اب میں پورے سفر کے دوران اس کی نظروں سے محفوظ رہ سکتا تھا؟ اگر اس نے مجھے دیکھ لیا تو اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہ اور اسی قسم کے دوسرے بیسیوں سوالات میرے ذہن میں ابھرے اور یک لخت ہی انہوں نے میرے ذہن میں اتنا ہیجان برپا کیا کہ میرا جی چاہا' سمندر میں چھلانگ لگا دوں اور تیرتا ہوا اس تک جا پہنچوں۔ اسے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالوں اور اپنے تمام سوالات کے جوابات اُگلوانے کی کوشش کروں۔

تاہم میرا ردِعمل میری خواہشات کے بالکل مختلف تھا۔ زندگی میں اکثر ہوتا یہی ہے۔ انسان کا دل کچھ اور چاہ رہا ہوتا ہے مگر وہ کر کچھ اور رہا ہوتا ہے۔ میں بھی سمندر میں چھلانگ لگانے کے بہانے موٹے سے گول پائپ کی آڑ میں ہو گیا۔ دوربین میں نے بہ دستور آنکھوں سے لگائے رکھی۔ لڑکی بھی دوربین دوبارہ آنکھوں سے لگا چکی تھی لیکن اب اس کی پشت میری طرف تھی۔ وہ اب کسی اور ہی سمت میں دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ میرے کیبن سے نکلنے سے پہلے ہمارے جہاز کا جائزہ لے چکی تھی۔ اس اسٹیمر پر اس کے سوا کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

پیری کلاکر کا لیکچر جاری تھا۔ "یہ پرندے جو تم دیکھ رہے ہو' یہ گل نہیں بلکہ "ٹرن" کہلاتے ہیں۔ گل ان ایشیائی علاقوں میں بہت کم پائے جاتے ہیں...."

میں اس کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال رہا تھا۔ اس احمق کو نہیں معلوم تھا کہ میں اس وقت کون سا پرندہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ اس وقت دوربین کا رخ اس طرف تھا ہی نہیں جہاں اُفق پر پرندے دوربین کے بغیر محض نقطوں کی طرح متحرک نظر آرہے تھے۔

دفعتاً لڑکی نے دوربین آنکھوں سے ہٹا کر کندھے پر لٹکائی اور لوہے کی بل کھاتی ہوئی تنگ سی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگی۔ اس کے اترنے کا نظارہ خاصا دلفریب تھا۔ اگر میں اس کے بارے میں اس بُری طرح اُلجھن کا شکار نہ ہوتا تو یقیناً اس نظارے سے خاصا لطف اندوز ہوتا۔

نیچے اتر کر وہ کہیں غائب ہو گئی۔ میں نے اس اسٹیمر کا جائزہ لیا۔ وہ سفید رنگ کا نہایت صاف ستھرا اسٹیمر تھا۔ اسٹیمر بڑی پرانی چیز ہے مگر وہ جدید دور کی چیز نظر آرہا تھا۔ اس کی جو سائڈ مجھے نظر آرہی تھی اس پر دائرے میں صرف "ایس ٹی 117" لکھا ہوا تھا۔ نہ جانے "ایس ٹی" سے کیا مراد تھی؟

میں کچھ دیر دوربین آنکھوں سے لگائے کھڑا رہا لیکن لڑکی دوبارہ دکھائی نہ دی۔ کلاکر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "لگتا ہے آپ کو بھی پرندوں سے خاصی دلچسپی ہے۔"

اب میں اسے کیا بتاتا کہ مجھے پرندوں سے کیسی اور کتنی دلچسپی تھی۔ شاید وہ بے چارہ مجھے اپنا ہم ذوق سمجھنے کے باوجود کچھ بے چین ہو گیا تھا کیونکہ میں اس کی دوربین سے چپک کر ہی رہ گیا تھا۔ جونہی میں نے دوربین آنکھوں سے ہٹائی' اس نے جلدی سے اسے لینے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

دفعتاً ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔ کہیں کلاکر اس لڑکی کا ساتھی تو نہیں تھا؟ کہیں اس نے جان بوجھ کر تو عین اس وقت مجھے دوربین نہیں تھمائی تھی؟ کہیں وہ مجھے دکھانا تو نہیں چاہتا تھا کہ میں خواہ کچھ بھی کر لیتا' کسی طرف بھی نکل لیتا لیکن ان کی رسائی سے دور نہیں تھا؟

میں نے گہری نظر سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا لیکن وہ مجھے ایک عام سے سیاح اور آوارہ گرد کا چہرہ ہی دکھائی دیا۔ اس پر مکاری اور سازشیت کی کوئی جھلک مجھے دکھائی نہیں دی۔ میں نے بے خیالی کے سے عالم میں دوربین اسے تھما دی۔ وہ اسے چمڑے کے کیس میں ڈالتے ہوئے بولا۔ "تم ناشتا کرنے نیچے نہیں چلو گے؟"

"عبدل بتا رہا تھا کہ ناشتا سات بجے لگے گا۔"

"سات تو تقریباً بج ہی چکے ہیں۔" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

میں اس کے ساتھ نیچے میس میں آگیا۔ وہ بھی شاید کوئی بڑا کیبن ہی تھا جسے میس کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس کا بیشتر حصہ ایک ڈائننگ ٹیبل نے گھیر رکھا تھا جو زیادہ بڑی نہیں تھی۔ چھ چھ کرسیاں اس کے دونوں طرف اور ایک ایک کرسی اس کے سروں پر تھی۔ کیپٹن گونزالے کے دو آدمیوں کے ساتھ وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ خانساماں افغان معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ناشتے کے لیے کچھ مشرقی اور کچھ مغربی چیزیں میز پر سجا دیں۔ ان میں سے ایک آدھ کے بارے میں تو میں اندازہ بھی نہیں لگا سکا تھا کہ وہ کیا تھی۔ میں نے انہیں چھیڑنے یا ان کے بارے میں کچھ پوچھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور آملیٹ سلائس' کافی وغیرہ پر مشتمل سیدھا سادا ناشتا کرنے لگا۔

میں نے ابھی ناشتا ختم نہیں کیا تھا جب میس کا دروازہ کھلا اور کیتھرین اندر داخل ہوئی۔ میرا ذہن آسیبی آنکھوں والی لڑکی میں کچھ ایسا اُلجھا ہوا تھا کہ کیتھرین کو میں بھول ہی گیا تھا۔ یہ دیکھ کر

مجھے حیرت کا ایک خفیف سا جھٹکا لگا کہ کیتھرین ساری میں تھی۔ وہ ایک سروقد اور متناسب الاعضا لڑکی تھی۔ بے پناہ خوبصورت تھی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اس قبیل کی سفید فام لڑکی ساری میں اس سے زیادہ قیامت ڈھا سکتی تھی جتنی وہ مغربی لباسوں میں ڈھاتی ہوگی۔

سونے پر سُہاگا..... یا پھر شاید سُہاگے پر سونا یہ تھا کہ پاکستانی لڑکیوں ہی کی طرح وہ سونے کا سیٹ بھی پہنے ہوئے تھی۔ بڑے بڑے جھمکے اس کے کانوں میں کچھ زیادہ ہی ہلکورے لے رہے تھے۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا حالانکہ اس نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔

کیا اس نے یہ اہتمام خاص طور پر کیا تھا؟ کیا اس کے پاس اور بھی پاکستانی ملبوسات و زیورات وغیرہ موجود تھے؟ کیا اس کا کوئی خاص مقصد تھا؟ اس نے گزشتہ رات مجھے جہاز پر سوار ہوتے تو دیکھ لیا تھا اور اسے یہ اندازہ بھی یقیناً ہوگیا ہوگا کہ میں پاکستانی ہوں۔ کیا اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے پاکستانی روپ دھارا تھا؟

اپنی یہ سوچ مجھے خوش فہمی پر مبنی محسوس ہوئی۔ اگر وہ ایک بار بھی پاکستان آچکی تھی تو اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ ہمارے ہاں تو کسی کی طرف متوجہ ہونے کے لیے اس کا صرف لڑکی ہونا ہی کافی ہوتا تھا۔ صورت شکل کا سوال تو بعد میں آتا تھا..... اور اگر لڑکی نہ صرف خوبصورت بلکہ سفید فام بھی ہو تو اچھے بھلے معززین کی آنکھیں حلقوں سے باہر آجاتی تھیں۔ اس کے لیے پاکستانی لباس کے تکلف کی کیا ضرورت تھی؟ ہم پاکستانیوں کو خود اپنے لباس سے ذرا کم ہی دلچسپی تھی۔ سفید فام لڑکیاں ہمیں ان کے اپنے لباسوں میں ہی زیادہ اچھی لگتی تھیں..... بلکہ سچی بات تو یہ تھی کہ درمیان میں لباس کا عمل دخل جتنا کم ہوتا دلچسپیاں اتنی ہی زیادہ ہوسکتی تھیں۔

فرنچ شیفون کی گہری نیلی ساری میں اس کا مرمریں وجود جس طرح مقید تھا اور ہر قدم پر اس کے خدوخال میں جو لچک، جو لہراؤ پیدا ہو رہا تھا اس پر بہت سے شاعر شعر کہتے کہتے دم توڑ سکتے تھے۔

اس نے میری طرف..... بلکہ کیپٹن گونز کے سوا کسی کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا اور میرا خیال تھا کہ اسی طرح وہ میز پر آبیٹھے گی، کیپٹن کے سوا کسی سے بات نہیں کرے گی اور یونہی ناشتا کرکے رخصت ہوجائے گی لیکن ہوا یہ کہ کیپٹن گونز اسے دیکھتے ہی احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی دیکھا دیکھی باقی تین افراد بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب اگر صرف میں بیٹھا رہتا تو کچھ معیوب لگتا چنانچہ میں بھی اٹھ ہی کھڑا ہوا۔

کیپٹن گونز ہمیں ایک دوسرے سے متعارف کرانے لگا۔ "یہ مس کیتھرین چارلس ہیں..... یہ ہمارے دوسرے مسافر مسٹر پیری کلاکر ہیں..... مارسلز، فرانس سے ان کا تعلق ہے..... اور یہ مسٹر افضل خان ہیں..... یہ کراچی سے سوار ہوئے ہیں....."

اس نے باری باری ہم دونوں سے ہاتھ ملایا اور وہی رسمی جملہ ادا کیا۔ "آپ سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر کلاکر اور مسٹر کان۔ آپ لوگ تشریف رکھیے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری آمد کی وجہ سے سب کے ناشتے میں خلل پڑ جائے گا....." وہ ایک وضعدار انسان کی طرح حقیقتاً شرمندہ نظر آرہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا۔ اس جیسی لڑکی کے ہاتھ کا اتنا سرد ہونا کچھ اچھا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایک عجیب سی سرد مہری تھی گو کہ وہ گرم جوشی اور خوش خلقی کا اظہار کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی۔

اس کی عمر چھبیس اور تیس کے درمیان کہیں تھی۔ چہرے مُہرے اور شخصیت کے اعتبار سے وہ بے عیب حسن کی مالک تھی لیکن اس کی آنکھوں کے گرد حلقے تھے جنہیں اس نے ہلکے میک اپ میں چھپانے کی کوشش کی تھی۔ معلوم نہیں یہ حلقے تفکرات کی پیداوار تھے، شب بیداریوں کا نتیجہ تھے یا صحت کی کسی خرابی کی علامت تھے۔ حلقے یوں تو کسی کے چہرے پر بھی اچھے نہیں لگتے لیکن اس کے چہرے پر کچھ زیادہ ہی بُرے لگ رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ اس کے چہرے یا سراپا میں، انحلال، تھکن یا خرابیٔ صحت کی کوئی علامت نہیں تھی۔ دل چاہا کہ کسی جادوئی عمل سے اس کے بے عیب چہرے کی یہ خامی فوراً دور کردوں۔

اس کی آمد سے کمرا کچھ روشن روشن سا ہوگیا۔ ادھیڑ عمر کلاکر کی بھی باچھیں کھل گئیں اور اس نے فوراً کیتھرین کا انٹرویو شروع کردیا کہ وہ کیوں سمندری سفر کر رہی تھی اور کیسا محسوس کر رہی تھی۔

"مجھے ویسے ہی سمندری سفر کا شوق ہے۔ مجھے یہ خوبصورت اور دھیما دھیما ایڈونچر محسوس ہوتا ہے....." وہ صاف اور شستہ قسم کی انگریزی میں بات کر رہی تھی ورنہ آج کل تو انگریز بھی روزمرہ معاملات کی طرح زبان میں بھی اپنی روایت پرستی اور وضعداری بھول چکے ہیں۔ وہ بھی امریکیوں کی طرح منہ اور لہجہ بگاڑ بگاڑ کر انگریزی بولنے لگے ہیں۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "میں کسی سے ملنے اسپین جا رہی ہوں۔ ممکن ہے میں وہیں رہ جاؤں۔ ویسے میرا گھر انگلینڈ کے شہر ریڈنگ میں ہے۔ ہوائی سفر مجھے پسند نہیں ہے اور ٹرین کے ذریعے میں ایران کے راستے جانا نہیں چاہتی تھی۔ پروگرام اچانک ہی بنا تھا۔ سمندری سفر میں بھی میں عام مسافر جہاز کی بھیڑ بھاڑ کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لہٰذا مجھے صرف یہی جہاز مناسب نظر آیا....."

میں سوچ رہا تھا، شاید وہ ایران کے راستے سے اس لیے گزرنا نہ چاہتی ہو کہ ایران میں منشیات کے سلسلے میں سزائیں بہت سخت ہوچکی تھیں اور عام مسافر جہاز کی بھیڑ بھاڑ سے بچنے کا مقصد یہ

کہ اس کی شخصیت اور سرگرمیاں زیادہ لوگوں کی نظر میں نہ آنے پائیں۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے کلاکر سے مخاطب ہوئی۔ "آپ بھی تو اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔"

"میں ایک سابق مجسٹریٹ ہوں اور تعطیلات گزارنے نکلا ہوا ہوں۔" پیری کلاکر باچھیں کھلاتے ہوئے بولا۔ "ساحلی پرندے میری کمزوری ہیں۔ میں نت نئے پرندوں کے مشاہدے اور مطالعے کے لیے سفر کرتا رہتا ہوں۔ جس روٹ سے یہ جہاز سفر کرتا ہے اس سے کوئی مسافر جہاز نہیں گزرتا اور میرے مقصد کے لیے یہ روٹ سب سے زیادہ مناسب تھا۔"

"..... اور آپ مسٹر کان؟" اس نے صراحی دار گردن کو خم دیتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں کراچی میں رہا تو میرا انجام کچھ اچھا نہیں ہوگا۔" میں نے نہایت دیانت داری سے جواب دیا۔ "اس لیے میں بھاگ کھڑا ہوا۔ پہلا جہاز یہی میرے ہاتھ لگا اور میں اسی پر سوار ہوگیا۔"

ایک لمحے کے لیے کھانے کے کمرے میں سکوت چھا گیا۔ سب ایک ٹک میری طرف دیکھ رہے تھے۔ کیپٹن گونز کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی تاہم مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر منجمد ہوکر رہ گئی تھی۔ میں نے گویا انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ لوگ اطمینان رکھیے..... میں کوئی مفرور مجرم نہیں ہوں۔ میں ایک شریف اور معزز آدمی ہوں۔ میری وجہ سے آپ لوگوں کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

انہیں اس تسلی اور یقین دہانی کی غالباً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سب اپنے مسائل خود حل کرنے اور اپنی پریشانیاں خود دور کرنے کے پوری طرح اہل معلوم ہوتے تھے تاہم سب گویا میرا دل رکھنے کو مسکرا دیے۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ "میرا مقصد صرف جان بچا کر بھاگنا ہی نہیں تھا بلکہ میں نے سوچا کہ اس بہانے دنیا کی سیاحت بھی کرلی جائے ورنہ چھپنے کے لیے تو کراچی بھی کچھ چھوٹا شہر نہیں تھا۔ ہزاروں مفرور مجرم وہاں چھپے ہوئے ہیں جنہیں کوئی تلاش نہیں کرتا۔ ایک میں بھی روپوش ہوسکتا تھا جبکہ میں تو مجرم بھی نہیں تھا لیکن میں نے سوچا، موقع اچھا ہے..... یوں تو زندگی کی مصروفیتیں موقع ہی نہیں دیں گی۔ اس طرح ہی کچھ سیاحت ہوجائے گی۔"

"اس کے لیے تم نے بڑا مشکل طریقہ اختیار کیا ہے۔" کیپٹن گونز پُرسکون لہجے میں بولا۔ "بحیرۂ احمر اور شہر سوئز کے راستے استنبول تقریباً چار ہزار میل کے فاصلے پر ہے۔ اگر قسمت نے ہمارا ساتھ دیا اور موسم خوش گوار رہا تو ہم ایک دن میں زیادہ سے زیادہ چھ سو میل کا فاصلہ طے کرپائیں گے۔ اس طرح ہمیں اس سفر میں تقریباً ایک ہفتہ لگ جائے گا۔"

"میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ وہ عجیب کیپٹن تھا۔ ایک طرف سائڈ بزنس کے طور پر زیادہ رقم کمانے کی فکر میں بھی رہتا تھا اور دوسری طرف اپنے جہاز سے سفر کرنے کے منفی پہلو بھی بتاتا رہتا تھا۔

کیتھرین مسکراتے ہوئے بولی۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی جلدی میں نہیں ہے۔ ہم سب بڑے پُرسکون..... بڑے پُرامن لوگ ہیں..... اور ایسا ہی پُرسکون سا جہاز ہمیں مل گیا ہے۔"

اسی قسم کی گپ شپ میں ناشتا ہوگیا۔ سب سے پہلے کیتھرین ہی نے اجازت چاہی اور اٹھ کر چل دی۔ میں بھی تقریباً اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اس سے مزید بات چیت کے لیے موقعے کی تلاش میں تھا۔ وہ ڈیک کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے بظاہر یونہی بے مقصد سے انداز میں اس کے ساتھ چلتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔ "تم پاکستانی لباس اور زیور میں بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

"پاکستانی لباس.....؟" وہ ذرا چونکی۔ اس نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی اور سرہلاتے ہوئے بولی۔ "اوہ..... ہاں..... یہ لباس پاکستان میں بھی پہنا جاتا ہے۔ ویسے میں نے اسے انڈین سمجھ کر پہنا ہوا ہے۔ بہرحال..... تعریف کا شکریہ۔" وہ گویا محض اخلاقاً مسکرائی۔

"تم کبھی پاکستان گئی ہو؟ میرا مطلب ہے، بندرگاہ سے آگے..... کسی شہر وغیرہ میں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں..... لیکن اب شاید جانا ہو....." وہ مُبہم لہجے میں بولی۔ شاید وہ ابھی کچھ اور کہتی لیکن اسی لمحے ایک طرف سے جہاز کا فرسٹ میٹ جنتر نکل آیا۔ وہ یقیناً اس سے پہلے ہی سے متعارف تھا۔ وہ اس سے گپ شپ کرنے لگا۔ ہم تینوں ہی ڈیک پر جا پہنچے۔ کیتھرین نے جنتر سے بھی کچھ زیادہ بات چیت نہیں کی اور ایک کرسی پر سورج کی طرف منہ کرکے بیٹھ گئی۔ وہ شاید دھوپ سینکنا چاہتی تھی۔ پھر اس نے گہری سانس لے کر کرسی کے پشتے سے ٹیک لگا کر یوں آنکھیں بند کرلیں گویا وہ اب کسی سے بات نہ کرنا چاہتی ہو اور محفل برخاست ہوچکی ہو۔ اب خواہ مخواہ کمبل ہونے کا کوئی فائدہ نہیں تھا چنانچہ میں جنتر کو اس کے پاس بیٹھا چھوڑ کر واپس آگیا البتہ ایک لمحے کے لیے نہ جانے کیوں میرا کیتھرین کو جنتر کے بارے میں کہنے کو جی چاہا۔ "خاتون! ذرا ہوشیار رہنا..... یہ ایڈز کا مریض ہے۔"

ظاہر ہے میں یہ کہہ نہیں سکتا تھا اس لیے خاموشی سے اپنے کیبن میں آگیا۔

البتہ اس کے دوسرے روز مجھے کیتھرین سے کچھ بات چیت کا موقع ملا۔ اس وقت ہم عمان کی سمندری حدود سے گزر رہے تھے۔ میں بیسن سے نکل کر ڈیک پر آیا تو میں نے اسے ریلنگ کے

قریب کھڑے پایا۔ اس نے خود ہی بات چیت کا آغاز کیا۔ "یہ عمان ہے نا؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت چھوٹا سا ملک معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ارد گرد تو صحرا کے سوا کچھ نہیں ہے۔" اس نے تبصرہ کیا۔

"ہاں۔ لیکن خوش حال ریاست ہے۔ بیشتر عرب ملکوں کی طرح اس کا انحصار بھی تیل کی کمائی پر ہے۔" میں نے اپنی دانست میں اس کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔

اس نے یوں مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا گویا کوئی بزرگ کسی بچے کی ہمت افزائی کے لیے مسکرایا ہو۔ آج وہ سیدھی طرح انگریز بن گئی تھی۔ کل والے پاکستانی تکلفات کی کوئی جھلک اس کے جسم پر نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ ڈھیلی ڈھالی سفید اسپورٹس شرٹ اور نیکر میں تھی۔ پیروں میں کینوس شوز تھے اور سر پر بڑے سے چھجے والا ہیٹ۔ آج وہ ایک انگریز سیاح لگ رہی تھی۔

"مسٹر کان! آپ کرتے کیا ہیں؟" اچانک اس نے پوچھا۔

"میں چھوٹا سا بزنس مین ہوں۔ لاہور اور کراچی دونوں شہروں میں میرا تھوڑا تھوڑا بزنس ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"جب انڈیا تقسیم نہیں ہوا تھا..... تمہارا پاکستان نہیں بنا تھا..... میں نے سنا ہے اس وقت میرے دادا بمبئی میں ہائی کمشنر تھے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ "اس وقت سے اب تک انڈیا اور پاکستان دونوں جگہ بہت سے افراد سے ہمارے..... خاندانی مراسم چلے آرہے ہیں۔ میرا خیال ہے' ایشیائی بڑے تعلقات نبھانے والے لوگ ہوتے ہیں اور ہم انگریز بھی کافی وضعدار ہیں۔ خصوصاً جن انگریزوں نے غیر منقسم ہندوستان میں طویل وقت گزارا تھا' ان میں اس مٹی اور یہاں کی روایات کی بھی کچھ خوشبو رچ گئی تھی۔"

"اب تک ان روایات کی خوشبو یقیناً مٹ چکی ہوگی۔ نئی نسل کو بھلا وہ باتیں کہاں معلوم ہوں گی..... اور اگر معلوم بھی ہوں گی تو انہیں ان کی کیا پروا ہوگی۔ یہ بڑا ظالم' بڑا ہنگامہ پرور دور ہے۔ آج کی خباثتوں نے مغرب تو مغرب..... مشرق کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ سب قدریں مٹتی جارہی ہیں۔ سب کچھ تباہ ہوتا جارہا ہے۔ ہر طرف کسی نہ کسی طرح کی وحشت اور جنون کا دور دورہ ہے۔ دولت کی دوڑ ہے۔ دولت کے لیے لوگ سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہیں....."

اس کی نیلی آنکھیں جھیل کی طرح پُرسکون رہیں۔ میں بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر کوئی تغیر نمودار نہ ہوا۔ نہایت دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولی۔ "مسٹر کان! آپ نوجوان ہیں لیکن بوڑھوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ میری اگر کبھی اپنے پاپا سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ بھی اسی قسم کی مایوس کن باتیں لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔"

"دراصل..... زندگی کے سفر میں نہ جانے کس موڑ پر میرے اندر کوئی بوڑھی روح حلول کر گئی تھی۔ اب اسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ویسے بھی عمر کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ انسان کو ہر عمر میں ہی اچھی روایات اور اچھی قدروں کی پاس داری کرنی چاہیے۔ ہم اب بھی اس دنیا کو خوبصورت بنا سکتے ہیں۔ اب بھی ایک اچھی زندگی کا خواب پورا کرسکتے ہیں بشرطیکہ ہم ان لوگوں کی باتوں پر کان دھرنا چھوڑ دیں جن کا پیشہ دوسروں کو بہکانا' اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا اور اپنی خواہشات کا ایندھن بنانا ہے۔ ایسے لوگ ہمیں زندگی میں کسی بھی موڑ پر' کسی بھی روپ میں مل سکتے ہیں۔"

"میرے پاپا بھی جب مجھ سے اس قسم کی باتیں کرتے ہیں تو تمہیں معلوم ہے میں ان سے کیا کہتی ہوں مسٹر کان؟" وہ کچھ زیادہ واضح مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔" میں نے اعتماد سے کہا۔ "تم کہتی ہوگی' میں بچی نہیں ہوں پاپا! میں اپنا بُرا بھلا خوب سمجھتی ہوں۔ یہی کہتی ہو نا تم؟"

"بالکل۔" اس نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ "لیکن تمہیں کیسے معلوم؟"

"مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے پاپا جواب میں کیا کہتے ہوں گے۔" میں نے اسی اعتماد سے کہا۔ "وہ کہتے ہوں گے' ہر عمر کے انسان کے اندر ایک چھوٹا..... ناسمجھ اور بے وقوف بچہ چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ شکاری اور خبیث قسم کے لوگوں کو اسی بچے کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ اس کے ذریعے انسان سے عجیب عجیب کام کراتے ہیں۔ اسی لیے تو دنیا میں بعض اوقات اچھی بھلی عمروں کے لوگ جو جو کام کرتے نظر آتے ہیں' انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہوں گے تمہارے پاپا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"واقعی۔" وہ آنکھیں کچھ اور پھیلاتے ہوئے بولی۔ "وہ کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا مسٹر کان؟"

"کچھ تو میں نجومی ہوں اور کچھ میرا دنیا بھر کے دردمند انسانوں سے ذہنی رابطہ ہے۔" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

وہ ڈیک پر رکھے ہوئے چھوٹے سے بیگ سے ایک ضخیم کتاب نکال کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اب اس کا کچھ پڑھنے کا موڈ تھا۔ میں کتاب کا نام پڑھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ خاصا لمبا سا نام تھا اور اس کا ترجمہ کچھ یوں بنتا تھا۔ "مشرقِ وسطیٰ کے معاملات پر تیل کے اثرات کی تاریخ۔"

کیا وہ واقعی اس قسم کی کتابیں پڑھتی تھی یا یہ محض دکھاوا تھا؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ بعض لوگوں میں یہ نفسیاتی بیماری ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کو مرعوب کرنے کے لیے بھاری بھرکم قسم کی کتابیں اٹھائے پھرتے ہیں اور ذرا موقع پاتے ہی..... بلکہ بعض

اوقات تو زبردستی موقع نکال کر انہیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔

میں نے جینگلے سے ٹیک لگا کر اس کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ "تم خود بھی تو خاصی سنجیدہ لڑکی ہو۔ اس قسم کی عالمانہ کتابیں پڑھتی ہو۔" میں نے اس کی کتاب کی طرف اشارہ کیا۔

"انسان والدین سے خواہ کتنا ہی باغی کیوں نہ ہو جائے' ان کے کچھ نہ کچھ اثرات تو آ ہی جاتے ہیں۔" وہ ہیٹ کا چھجا اونچا کرتے ہوئے بولی۔ "میرے دادا سول سروس میں تھے..... والد لندن میں بیورو کریٹ تھے..... عالمی حالات کے بارے میں جاننے کا کچھ نہ کچھ شوق تو مجھ میں بھی آنا ہی تھا۔"

اگر اس قسم کی لڑکی واقعی ڈرگز کے دھندے میں ملوث تھی تو یہ بڑے ہی افسوس کی بات تھی۔ آخر اس کاروبار کو کس حد تک پھیلنا تھا؟ کہیں دنیا میں قیامت اسی دھندے کے ذریعے تو نہیں آنی تھی؟ قیامت کا ایک روپ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ دنیا کی بیشتر آبادی میں سے کوئی منشیات تیار کرنے والا ہو' کوئی پھیلانے والا' کوئی بیچنے والا' کوئی خریدنے والا اور کوئی استعمال کرنے والا۔ کچھ لوگ منشیات کی وجہ سے..... اور کچھ ہولناک بیماریوں کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہوں..... یہ بھی تو ایک قیامت ہی تھی۔

تاہم میں ابھی تک کیتھرین کے بارے میں صحیح طور پر کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس جہاز پر اس کے سفر کا مقصد کیا تھا۔ وہ بہت گہری لڑکی تھی۔ وہ کتاب کھول کر بظاہر اس کے مطالعے میں کھو گئی تھی۔ یہ گویا میرے لیے واضح اشارہ تھا کہ وہ مزید بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں وہاں سے چلا آیا۔

میں نے جہاز کے مختلف گوشوں میں کھڑے ہو کر اس سفید اسٹیمر کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی جس پر میں نے آبی آنکھوں والی لڑکی کو دیکھا تھا لیکن پھر وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ کیا وہ کسی اور سمت نکل گیا تھا یا پیچھے رہ گیا تھا؟ اگر اس لڑکی کو واقعی میری تلاش تھی تو اس نے کس طرح یقین کر لیا تھا کہ میں اردگرد نظر آنے والے کسی جہاز پر نہیں ہوں؟

ان سوالوں میں سے فی الحال کسی کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں نے پرندے دیکھنے کے بہانے پیری کلاکر سے دوربین لے کر بھی اس اسٹیمر کو تلاش کیا لیکن وہ دوربین سے بھی مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ میں نے باقی وقت کلاکر کے ساتھ ہی پرندوں کے بارے میں اس کے ایڈونچر سننے میں گزارا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ پرندوں کے بارے میں واقعی میری معلومات میں خاصا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

تیسرے روز جب کہ جہاز عرب ریاستوں کے گرد گھومتا ہوا بحیرۂ احمر میں داخل ہونے والا تھا' ایک طرف سے خشک کا ایک چھوٹا ٹرالر جہاز کے بالکل قریب آ گیا۔ میں اس وقت ریلنگ پر ہی کھڑا تھا۔ میں چوکنا ہو گیا لیکن اس میں سے کسی نے آنکھ اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا اور نہ ہی جہاز کے عملے میں سے کسی نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں وہاں سے ہٹ جاؤں۔

بظاہر تو ایسا معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ ان کے درمیان کوئی لین دین ہو رہا تھا۔ فرسٹ میٹ جنتر نیچے کھڑا ان سے کچھ باتیں کر رہا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس طرح دن کی روشنی میں علی الاعلان ان کے درمیان مال اور رقم کا تبادلہ ہو گا۔ میں اوپر کھڑا دیکھتا رہا۔ ان کے درمیان کوئی لین دین نہیں ہوا اور چند منٹ بعد ٹرالر واپس چلا گیا۔

جنتر اوپر آ گیا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "یہ لوگ کون تھے اور کس لیے آئے تھے؟"

"ماہی گیر تھے۔ مچھلیاں ہمارے ہاتھ فروخت کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے پاس مال اچھا نہیں تھا اور قیمت بھی زیادہ مانگ رہے تھے۔ ان سے عبدل ہی صحیح طرح نمٹتا ہے۔" جنتر نے جواب دیا۔

اسی روز کچھ دیر بعد ایک اور فشنگ ٹرالر' جہاز کے قریب آ اور گویا وہی منظر دُہرایا گیا۔ عبدل رسّے کی سیڑھی کے ذریعے نیچے اتر گیا۔ اس بار وہ واپس آیا تو اس کے کندھے پر مچھلیوں کی باسکٹ لدی ہوئی تھی۔ جہاز پر آ کر وہ باسکٹ خانساماں کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ "مچھلیاں اچھی ہیں..... تازہ بھی ہیں اور سستی بھی ہیں۔"

خانساماں نے باسکٹ کھول کر اس میں جھانکا۔ باسکٹ میں دس بڑی بڑی مچھلیاں موجود تھیں۔ خانساماں نے ان میں سے ایک کو نکال کر گویا ہاتھوں ہی ہاتھوں میں تولا اور معنی خیز سے انداز میں مسکرا دیا پھر وہ باسکٹ اٹھا کر کچن میں لے گیا۔

میرے ذہن میں شکوک کا سنپولیا رینگنے لگا تھا۔ اس کے بعد میں موقعے کی تلاش میں رہا لیکن افغان خانساماں مجھے زیادہ دیر کے لیے کچن سے اِدھر اُدھر ہوتا دکھائی نہ دیا۔ وہ اگر کچن سے نکلا بھی تو بہت ہی تھوڑی دیر کے لیے..... اور آس پاس ہی کہیں موجود رہا۔ وہ ایپرن باندھے ہوئے تھا اور پچھلے تین دنوں کی نسبت کچھ زیادہ مستعد نظر آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج اس نے سہ پہر ہی رات کے کھانے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

بالآخر میں نے اسے انجن روم کی طرف جاتے دیکھا۔ اس نے ایپرن اتارا ہوا تھا۔ شاید وہ کیپٹن گوئز سے ملاقات کے لیے جا رہا تھا۔ میں نے رسک لینے کا فیصلہ کر لیا اور تنگ سے زینے پر پنجوں کے بل تقریباً دوڑتا ہوا سیڑھیوں تک پہنچا اور پھر چھلانگوں میں سیڑھیاں اتر کر کچن میں جا پہنچا۔

کچن کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر اچھا خاصا دھچکا لگا کہ ہم ایسے کچن میں پکائے جانے والے کھانے کھا رہے تھے۔ بس ذرا برتن پونچھ یا نچھ کر ظاہری طور پر صاف کر کے ہمارے سامنے سجا دیے جاتے تھے جیسا کہ نچلے درجے کے ہوٹلوں میں ہوتا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اس کوفت کو ذہن سے جھٹک دیا۔ پچھلا کچھ عرصہ جس طرح گزر چکا تھا اس میں' میں نہ جانے کیا کچھ برداشت کر چکا تھا۔ اس کچن کی حالت تو پھر بھی غنیمت تھی۔

مجھے وہ مچھلیاں تلاش کرنے کے لیے کسی فریزر وغیرہ میں جھانکنا نہیں پڑا۔ وہ کوکنگ رینج کے قریب ماربل کے کاؤنٹر پر نہایت قرینے سے اور ترتیب سے رکھی تھیں۔ میں نے ان میں سے ایک مچھلی کو دو انگلیوں سے پکڑ کر اٹھا کر دیکھا۔ اس کا پیٹ چاک تھا۔ پھر میں نے جھک کر دیکھا تو سبھی مچھلیوں کے پیٹ چاک نظر آئے۔ انہیں خوب صاف کر کے رکھا گیا تھا۔ میں یہ اندازہ نہیں کر سکا کہ مچھلیوں کے پیٹ تازہ چاک کیے گئے تھے یا پہلے سے چاک شدہ تھے' ٹانگوں وغیرہ کے ذریعے بند تھے اور اب صرف ٹانکے کھولے گئے تھے۔

میں نے ٹانکوں کے نشانات تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مجھے نظر نہیں آئے۔ میں الجھن میں پڑ گیا۔ ایک بار پھر میرا یہ شبہ قوی ہونے لگا کہ مچھلیوں کے پیٹ میں کچھ آیا تھا۔ میں نے خانساماں کو کچن سے باہر کچھ لے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ اگر کچھ آیا تھا تو کیا وہ کچن میں ہی چھپایا گیا تھا؟

بظاہر وہ زیادہ لمبا چوڑا کچن نہیں تھا لیکن اگر عجلت کے عالم میں کوئی نامعلوم چیز تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی تو بڑی دشواری پیش آ سکتی تھی۔ اس میں چیزیں رکھنے کی گنجائش تو کافی تھی۔ بہت سی کیبنٹس تھیں۔ فریج اور فریزر تھے۔ کوکنگ رینج تھی۔ سامان رکھنے کی اور کئی چیزیں تھیں۔

میں نے حتیٰ الامکان تیزی سے کئی چیزوں میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن میں کوئی مشکوک چیز تلاش نہیں کر سکا۔ میں تو ابھی صحیح طرح کچن ہی کی تلاشی نہیں لے پا رہا تھا اور اگر وہ چیز کچن سے باہر جا چکی تھی پھر تو اسے تلاش کرنا کم از کم اکیلے آدمی کے لیے تو تقریباً ناممکن ہی تھا۔ اتنا بڑا جہاز تھا۔ اس میں تو اچھے بھلے حجم کی چیزوں کو چھپانے کے لیے اتنی بہت سی جگہیں تھیں۔ مختصر حجم کی چیز کا تو مسئلہ ہی کچھ نہیں تھا۔

اس تمام افراتفری کے دوران ایک اور خیال بھی میرے ذہن میں گردش کیے جا رہا تھا۔ جس وقت وہ ٹرالر' جہاز پر مچھلیاں دینے آیا تھا' اس وقت ہم عرب ریاستوں کی حدود میں تھے۔ عرب ریاستوں میں تو ہیروئن اندر لانے کی کوشش کی جاتی تھی اور عرب ممالک اپنے سخت قوانین اور سخت رویے کی وجہ سے اس یلغار کو حتیٰ الامکان روکے ہوئے تھے لیکن یہاں سے ہیروئن کا ٹرافک باہر کی طرف جانے کا کوئی سلسلہ ابھی تک کم از کم میرے علم میں تو نہیں آیا تھا۔ تو پھر یہ کیا چکر تھا؟ کہیں میں خواہ مخواہ ہی شکوک اور واہموں کا شکار تو نہیں ہو رہا تھا؟

میں ایک بار پھر مچھلیوں کی طرف پلٹ آیا۔ میں نے دو تین دو کری مچھلیاں بھی اٹھا کر دیکھیں۔ سب کے پیٹ یکساں انداز میں چاک تھے۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں تیزی سے گھوما۔ افغان خانساماں دروازے میں کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ اس وقت کچھ زیادہ ہی سرخ نظر آ رہا تھا اور آنکھیں نفرت سے دہک رہی تھیں۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں گوشت کاٹنے کا بھاری چاپر تھا۔ چاپر اسٹیل کا تھا اور اس وقت دھوپ میں چمک رہا تھا۔ مجھے اپنی جلد کے نیچے سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ لگتا تھا کہ عقب سے مجھ پر نظر پڑتے ہی خانساماں کافی جلال میں آ گیا تھا اور شاید اس نے بہ مشکل اپنے آپ کو چاپر کے استعمال سے باز رکھا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میں تیزی سے نہ گھومتا اور مزید ایک آدھ لمحے اس کی آمد سے بے خبر رہتا تو وہ چاپر استعمال کر ہی گزرتا۔

خانساماں خواہ کہیں بھی ملازمت کریں' عام طور پر وہ کچن کو اپنی ذاتی جائیداد سمجھتے ہیں اور بلا اجازت وہاں کسی کی دخل اندازی کو بہت بُرا محسوس کرتے ہیں۔ ان کی اس نفسیات کا مجھے احساس تھا اور اس وقت تو میں ویسے ہی کچھ مشکوک نظر آ رہا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود مجھے خانساماں کا اس طرح حد سے زیادہ جلال میں آ جانا کچھ غیر فطری سا محسوس ہوا۔

میں نے مچھلی احتیاط سے کاؤنٹر پر واپس رکھتے ہوئے مسکرا کر ہموار لہجے میں کہا۔ "دراصل کافی پینے کا موڈ ہو رہا تھا..... تم کہیں نظر نہیں آئے..... میں نے سوچا' خود ہی بنانے کی کوشش کی جائے....." خانساماں کو اپنا مقصد سمجھانے کے لیے اس سے آسان انگریزی میں بات کرنا پڑی تھی۔ کچھ ایسی ہی انگریزی میں وہ جواب دیتا تھا۔

"کیا آپ کوئی نئی قسم کی کافی بنانے لگے تھے مسٹر افضل خان؟ کوئی ایسی کافی جس میں مچھلی بھی ڈلتی ہے؟" اس نے گویا ایک ایک لفظ کو چباتے ہوئے پوچھا۔ ویسے اس نے بہت تیزی سے اپنے جلال پر قابو پا لیا تھا۔

"نہیں..... نہیں....." میں نے گویا اس کی بات کو مذاق سمجھتے ہوئے اس پر ذرا ہنسنے کی کوشش کی۔ "مچھلیاں تو میں ویسے ہی دیکھنے لگا تھا..... کسی اچھی نسل کی معلوم ہوتی ہیں..... رات کے کھانے میں شاید مچھلی ہی ملے گی؟"

"صرف رات کے کھانے پر ہی نہیں..... بلکہ اب تو اکثر مچھلی ہی کھانے کو ملے گی....." اس کا چہرہ بہت تیزی سے اعتدال پر آ رہا تھا۔ تاہم اس کا لہجہ اب بھی چبھتا ہوا ہی تھا۔ "اس مچھلی کو آپ کے پاکستان میں ہیرا کہا جاتا ہے اور انگریزی میں ریڈ ہیرنگ..... اور کچھ جاننا چاہتے ہیں آپ؟"

"نہیں..... نہیں۔ میں جان کر کیا کروں گا۔ میں تو آم کھانے سے غرض رکھتا ہوں' پیڑ گننے سے نہیں۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"پیڑ گننے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے' البتہ پیڑ کاٹنے سے انسان کو بچنا چاہیے۔" وہ مُربیانہ سے لہجے میں بولا اور معنی خیز سے انداز

میں چاپر کی دھار دیکھنے لگا۔ وہ انگلی چاپر کی دھار پر پھیر رہا تھا لیکن اس کی نظر مجھ پر تھی۔ وہ مضبوط قد کاٹھ کا آدمی تھا۔ عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان تھی۔ باریش تھا۔ اس کی داڑھی اور آنکھوں کا رنگ بھورا تھا اور یکساں معلوم ہوتا تھا۔

"تم نے سب مچھلیوں کے پیٹ چاک کردیے ہیں۔" میں نے مچھلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حتی الامکان سادگی سے کہا۔

اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھا اور بالآخر سادگی سے ہی جواب دینے کا فیصلہ کیا۔ "ابھی تو میں ان کے قتلے بھی بناؤں گا۔ فریزر میں تو یہ اچھی طرح صاف کرکے اور کاٹ کر ہی رکھی جائیں گی۔"

"ہاں..... یہ بات تو ہے۔" میں نے جلدی سے سرہلایا۔

دفعتاً وہ امریکیوں کی طرح کندھے اچکا کر اور گہری سانس لے کر بولا۔ "اگر آپ کو کافی پینی ہے تو آپ چل کر میس میں بیٹھیں' میں آپ کے لیے کافی بنا کر لاتا ہوں۔"

میس' کچن سے ملحق ہی تھا۔ میں میس میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ دو تین منٹ میں ہی میرے لیے کافی بنا کر لے آیا جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ وہ کافی میرے سامنے رکھنے کے بعد بھی چند لمحے وہیں کھڑا رہا گویا دیکھنا چاہتا ہو کہ میں کافی پیتا ہوں یا نہیں؟ سچی بات یہ تھی کہ فی الحال میرا اس کی لائی ہوئی کافی پینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ ابھی اس بدبخت کے دل میں غیظ و غضب کا طوفان کم نہ ہوا ہو' کافی میں کچھ ملا لایا ہو جس کے نتیجے میں میری لاش سمندر کی مچھلیوں کے ڈنر میں بھی کام آسکتی تھی۔

میں نے یہی ظاہر کیا جیسے میں کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور بے خیالی میں مگ کو میز پر رکھا تو رہا تھا لیکن ہونٹوں سے نہیں لگا رہا تھا۔ آخر وہ کچن میں چلا گیا۔ کچن کی بھی ایک کھڑکی میس میں کھلتی تھی جو پینٹری کا کام دیتی تھی۔ میں نے اس کھڑکی سے جو نہی اس کی پشت میس کی طرف ہوتے دیکھی' جلدی سے دبے قدموں اٹھ کر کافی واش بیسن میں الٹ دی۔ اس کے بعد میں چند منٹ تک وہیں بیٹھا کافی کی چسکیاں لینے کی اداکاری کرتا رہا۔

آخر کار میں مگ میز پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ خانساماں نے مجھے لڑکھڑائے بغیر' ٹھیک ٹھاک حالت میں جاتے دیکھ کر بھی کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ عین ممکن تھا' اس نے کافی میں کچھ نہ ملایا ہو۔ مجھے خواہ مخواہ ہی شک ہوا ہو۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ محض معمولی سے شبے کی بنیاد پر وہ اتنی جلدی مجھے ہلاک کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

اس روز میں نے صبح سے کیتھرین کو نہیں دیکھا تھا۔ شاید اس نے ناشتا بھی اپنے کیبن میں منگوایا تھا۔ میں ابھی تک اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کرسکا تھا کہ وہ ڈرگز کے دھندے میں کس طرح ملوث تھی؟ آیا وہ خود کچھ لے کر جارہی تھی یا مال جہاز میں لدا ہوا تھا اور وہ ڈرگ مافیا کی طرف سے نگراں کے طور پر کھیپ کے ساتھ سفر کررہی تھی؟

اس شام جب کیتھرین اور کلاکر اپنے کیبنوں سے باہر تھے' میں نے اپنے کیبن کی چابی ان کے تالوں میں آزما کر دیکھی اور مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ ایک ہی چابی سے چاروں مسافر کیبنوں کے تالے نہایت آسانی سے کھل سکتے تھے۔ چاروں کے تالے بالکل ایک ہی جیسے تھے۔ اس وقت چونکہ اندیشہ تھا کہ کیتھرین اور کلاکر کسی لمحے بھی اپنے کیبن کی طرف واپس آسکتے تھے اس لیے میں نے کسی کے بھی کیبن میں گھسنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے یہی سوچا کہ اگر ضرورت پڑی تو کوئی اور مناسب موقع دیکھ کر گھس جاؤں گا۔ اب تو "کھل جا سم سم" کا طلسم میرے پاس چابی کی شکل میں موجود تھا۔

سفر کے چوتھے روز میں بیدار ہوکر کیبن سے نکلا تو دیکھا کہ ہم بحیرۂ احمر میں داخل ہوچکے تھے اور شمال مغرب کی سمت میں سفر کررہے تھے۔ ناشتے کے بعد عملے کے دو آدمیوں نے اعلان کیا کہ وہ تیراکی کے لیے سمندر میں اتر رہے تھے۔ کیتھرین بھی فوراً ان کے ساتھ تیراکی کے لیے تیار ہوگئی۔ شاید وہ اس "خشک" سے "سمندری" سفر میں جہاز تک محدود رہ کر بور ہوگئی تھی اور اب کوئی شغل میلہ ڈھونڈ رہی تھی۔

ربڑ کی ایک کشتی اور رسّے کی سیڑھی سمندر میں اتاری جارہی تھی۔ کلاکر جلدی سے اپنے کیبن میں جاکر اپنا کیمرا نکال لایا اور بولا۔ "میں کشتی میں بیٹھ کر فوٹو گرافی کروں گا۔"

کیتھرین سوئمنگ سوٹ پہن چکی تھی۔ قباحتیں کچھ اور نمایاں ہوچکی تھیں۔ دل تو میرا بھی چاہ رہا تھا کہ کیپٹن گونزے تیراکی کا لباس مستعار لے کر بحیرۂ احمر کو بحرِ عشق تصور کرتے ہوئے کیتھرین کے ساتھ کود پڑوں اور اسے اپنی تیراکی کے کچھ کمالات دکھادوں لیکن کئی طرح کی سوچوں نے میرے قدم روک لیے۔ ایک تو یہ خیال آگیا کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ میں اسے متاثر کرنے کی بچگانہ یا کچھ کچھ فلمی سی کوشش کررہا ہوں۔ دوسرے مجھے بحیرۂ احمر کا پانی اس قابل نہیں لگ رہا تھا کہ اس میں تیراکی کی جاتی۔

تیسری اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ اگر وہ لوگ نیچے جارہے تھے تو میرے لیے یہ کیتھرین اور کلاکر کے کیبنوں کی تلاشی لینے کا بہترین موقع تھا۔ معلوم نہیں ایسا موقع پھر ہاتھ آتا یا نہیں۔ میں محض ذرا سے شغل کے لیے خود ان کے ساتھ سمندر میں اتر کر اس موقع کو ضائع نہیں کرسکتا تھا۔

تاہم میں نے رسّا کیتھرین سے کہا۔ "میرا خیال ہے' تمہیں یہاں تیراکی نہیں کرنی چاہیے۔ سمندر کا پانی اچھا معلوم نہیں ہورہا۔ شاید تمہارے جسم کو نقصان دے۔"

وہ مڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے خاصے ہوشربا سے انداز میں مسکرائی اور بڑے میٹھے لہجے میں بولی۔ "اگر اس وقت پاپا یہاں ہوتے تو یقیناً ایسی ہی کوئی بات کرتے۔ آخر تمہیں اس عمر میں پاپا

بننے کا اتنا شوق کیوں ہے؟"

'لعنت ہو مجھ پر.....!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "بعض اوقات رسمی بات کرنا بھی مہنگا پڑ جاتا ہے۔ کس بدبخت کو اس عمر میں تم جیسی لڑکی کا پاپا بننے کا شوق ہوگا؟'

پھر میرے ذہن میں ایک اور شبے نے سر ابھارا۔ میں اس سے پہلے بھی غیر ارادی سے انداز میں کئی موقعوں پر اس کے ساتھ مُربیانہ' ہمدردانہ اور کچھ مشفقانہ سا رویّہ اختیار کرچکا تھا۔ نصیحتیں کرچکا تھا' مشورے دے چکا تھا۔ کہیں اسے اندازہ تو نہیں ہوگیا تھا کہ میں کسی خاص مقصد سے جہاز پر سوار ہوا تھا جس کا تعلق اس کی ذات سے تھا؟ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے بزرگی کا کونہ کچھ کم کردینا چاہیے۔

وہ لوگ رسّے کی سیڑھی کے ذریعے سمندر میں اتر چکے تو میں آنکھ بچا کر پہلے کیتھرین کے کیبن تک پہنچا۔ چابی سے اس کے کیبن کا تالا بالکل اسی طرح کھل گیا جس طرح میرے اپنے کیبن کا کھلتا تھا۔ اندر پہنچ کر میں نے دیکھا' اس کا کیبن بالکل میرے ہی کیبن جیسا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ عبدل یا جنتر اس کے کیبن کی صفائی ستھرائی وغیرہ کا بہت خیال رکھ رہے تھے جبکہ میرے کیبن کی طرف کسی نے توجہ دینے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس کے بستر کی چادر بدلی ہوئی تھی۔ کمبل بھی صاف ستھرا تھا۔ فرش بھی صاف تھا جبکہ میرے کیبن کی حالت کچھ ایسی ہی تھی جیسے میں کرایہ دیے بغیر سفر کررہا تھا اور جہاز کا عملہ مجھ سے خفا تھا۔ میں نے اس تضاد پر اپنے آپ کو زیادہ غمناک نہیں ہونے دیا۔ آخر وہ کیتھرین تھی اور میں افضل چوہدری..... فرق صاف ظاہر تھا۔

کیتھرین کا بیشتر سامان دو سوٹ کیسوں میں تھا۔ میں نے تیزی سے ان کی تلاشی لے ڈالی۔ ان میں عام استعمال کے کپڑے تھے۔ وہ ساری بھی تھی جو میں دیکھ چکا تھا۔ اس کے علاوہ شلوار قمیص بھی تھی۔ زیادہ تر ملبوسات مغربی ہی تھے۔ چمڑے کے ایک چھوٹے بیگ میں میک اپ کی کٹ اور کلون وغیرہ تھے۔ انگریزی کی کچھ سنجیدہ کتابیں تھیں۔

ایک اور چرمی بیگ میں مختلف وٹامنز کی گولیوں کی بڑی بڑی پوری بارہ شیشیاں تھیں۔ گویا موصوفہ اپنی صحت سے غافل نہیں تھیں۔ ایک اور چھوٹے بیگ میں اس کا پاسپورٹ اور ویزے وغیرہ تھے۔ فی الحال اس نے صرف ترکی جانے کا ذکر کیا تھا لیکن اس کے پاس کئی یورپی ممالک کے ویزے بھی موجود تھے۔ چھوٹی سی دیوار گیر الماری میں کچھ اور ملبوسات موجود تھے۔ اس بے کیف سے سفر میں بھی وہ صبح شام لباس تبدیل کرتی تھی۔ ننھے سے باتھ روم میں بھی استعمال کی کچھ چیزیں موجود تھیں۔

کسی بھی قسم کی منشیات کا ابھی تک مجھے کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ میں دوبارہ اس کے سامان کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے وٹامنز کی گولیوں کی شیشیوں میں سے ایک کا ڈھکنا کھولا اور ایک گولی ہتھیلی پر نکال کر دیکھی۔ نارنجی سے رنگ کی وہ گولی وٹامنز ہی کی دکھائی دے رہی تھی۔ میں چند لمحے یوں اسے الٹ پلٹ کر متوقع سی نظروں سے دیکھتا رہا جیسے وہ بول پڑے گی اور خود ہی اپنے بارے میں کچھ بتادے گی۔ آخر کار میں نے کیتھرین کی ہر چیز پہلے جیسی حالت میں رکھ دی اور اس احتیاط کے ساتھ کیبن سے نکل آیا کہ کوئی مجھے دیکھ نہ پائے۔

ریلنگ پر پہنچ کر میں نے جھانک کر دیکھا۔ کیتھرین اور عملے کے دو آدمی ابھی تیراکی میں مشغول تھے۔ عملے کے لوگ تھوڑی بہت اٹکھیلیاں بھی کررہے تھے۔ کیتھرین برا نہیں منا رہی تھی بلکہ ان کی شرارتوں میں ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اس نے عام لباس کے ساتھ ساتھ سنجیدگی کا بوجھل لبادہ بھی کچھ دیر کے لیے اتار کر کہیں ٹانگ دیا تھا۔ کلاکر ربڑ کی کشتی میں بیٹھا مختلف زاویوں سے ان لوگوں کی تصویریں اتار رہا تھا۔ ان لوگوں کی کیا..... زیادہ تر کیتھرین ہی کی اتار رہا تھا اور کیتھرین بھی کسی جل پری کی طرح مچل مچل کر مختلف پوز دے رہی تھی۔

وہ بدبخت کلاکر مفت میں ہی ایسے حسین نظارے کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کررہا تھا۔ اپنے ملک میں شاید ہزاروں فرانک خرچ کرکے بھی وہ ایسی حسین لڑکی سے اس قسم کی ماڈلنگ نہیں کرا سکتا تھا۔ میرے سینے پر ایک آدھ سانپ نے لوٹنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے تھپکی دے کر سُلا دیا اور ان سب کو گھورتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر دل ہی دل میں کہا۔ 'ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... تم مزے کرو بدبختو! میں اپنے یار سیٹھ رمضان سے کیا ہوا وعدہ نبھانے کی کوشش کررہا ہوں۔'

میں ایک بار پھر کیبنوں کی طرف پلٹ آیا۔ اس مرتبہ میں نے کلاکر کے کیبن پر قسمت آزمائی کی۔ تالا تو میں پہلے بھی کھول کر دیکھ چکا تھا۔ اس بار اندر بھی جا پہنچا۔ کلاکر کے کیبن میں بھی کپڑے اور مسافرت کا دوسرا سامان موجود تھا۔ پرندوں کے بارے میں چھ سات باتصویر کتابیں تھیں۔ کیمرے سے متعلقہ کچھ دوسری چیزیں تھیں۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اس جہاز پر اپنی موجودگی کا جو مقصد بیان کیا تھا وہ درست ہی تھا۔ اس کے سامان میں بھی کوئی ایسا سراغ موجود نہیں تھا جس سے اس کا ڈرگ مافیا سے کوئی تعلق نظر آتا۔

میں واپس ڈیک پر آگیا۔ لگتا یہی تھا کہ میں نے ان دونوں کیبنوں کی تلاشی لے کر وقت ہی ضائع کیا تھا۔ وقت ضائع کرنے کے اور بھی بہتر طریقے ہوسکتے تھے جن میں وقت کم از کم اس بیہودہ انداز میں تو ضائع نہیں ہوتا۔ وقت ضائع ہی کرنا تھا تو میں بھی کیتھرین کے ساتھ سمندر میں اتر کر ضائع کرسکتا تھا۔ انسان کے وقت ضائع کرنے میں بھی کوئی "سلیقہ" ہونا چاہیے۔

دل ہی دل میں اپنے آپ کو جھاڑتے پلاتے وقت اچانک مجھے خیال آیا کہ ایک چوتھا کیبن بھی تو تھا جس کی میں نے تلاشی

نہیں لی تھی۔ وہ کیبن خالی تھا۔ جہاز پر اور کوئی ضرورت مند مسافر نہیں تھا جسے وہ کیبن الاٹ کیا جاتا۔ میں نے سوچا' جہاں اتنا وقت برباد ہو چکا تھا' اسی بے ہودہ کام میں تھوڑا سا مزید وقت برباد کرلیا جائے تاکہ دل میں کوئی خلش نہ رہ جائے۔

چوتھا کیبن ایک کونے میں تھا۔ اس کا تالا کھولنے میں بھی مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ میرا خیال تھا کہ اس میں مجھے جو دیوار گیر بیڈ نظر آئے گا اس پر کوئی بستر یا چادر وغیرہ نہیں ہوگی لیکن مجھے وہاں نہ صرف بستر لگا ہوا دکھائی دیا بلکہ ویسا ہی کمبل بھی پھیلا نظر آیا جیسا ہم تینوں مسافروں کو دیا گیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے سانس روک لی۔ کمبل بستر پر یونہی نہیں پڑا تھا بلکہ کسی کے جسم پر تھا یعنی کوئی کمبل لپیٹے لیٹا ہوا تھا۔ میں اندر پہنچ چکا تھا۔ میں نے واپس نکل بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ حرکت شاید زیادہ غلط ہوتی۔ فی الحال تو میں کوئی بہانہ کرکے جان چھڑا سکتا تھا۔

اس میں شک نہیں تھا کہ مجھے حیرت کا خاصا زوردار جھٹکا لگا تھا۔ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا' اس کا مطلب یہی تھا کہ جہاز پر چوتھا مسافر بھی سفر کر رہا تھا مگر جہاز کے عملے نے اس بات کو خفیہ رکھا تھا اور وہ شخص بھی چوبیس گھنٹے شاید کیبن ہی میں رہتا تھا اس لیے اب تک دوسروں کی نظروں میں نہیں آیا تھا۔

میں نے اپنے عقب میں دروازہ آہستگی سے بند کردیا۔ تالے کی ہلکی سی کلک کے بعد بھی جب اس شخص نے حرکت نہ کی تو میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ وہ بدستور ساکت رہا۔ بالآخر ایک خفیف سا شبہ محسوس کرتے ہوئے میں نے آگے بڑھ کر آہستگی سے اس کے اوپر سے کمبل اٹھایا۔ وہ کوئی مسافر نہیں' عملے کا آدمی عبدل تھا اور وہ مُردہ تھا۔ کسی نے اسے ذبح کردیا تھا۔ اس کی گردن آدھی سے زیادہ کٹی ہوئی تھی۔

ایک لمحے کے لیے میں اسی حالت میں کھڑا رہ گیا۔ کئی مناظر کسی تیز رفتار فلم کی طرح میری آنکھوں میں گھوم گئے۔ کراچی میں کلفٹن کے ساحل کے قریب دیکھی ہوئی عاشق بھٹی کی لاش..... اس کی گردن تو تن سے بالکل ہی جُدا کردی گئی تھی۔

پھر افغان خانساماں فہمید کی صورت میری نظروں میں ابھری۔ مجھے وہ منظر یاد آیا جب وہ اسٹیل کا چمکتا ہوا تیز دھار چاپر لیے میرے عقب میں کھڑا تھا لیکن جس وقت میں نے کلفٹن پر عاشق بھٹی کی لاش دیکھی تھی اس وقت خانساماں فہمید تو وہاں سے میلوں دور بندرگاہ پر اپنے جہاز پیراماؤنٹ پر موجود ہوگا..... مگر یہ کچھ ایسا ضروری بھی نہیں تھا۔ میں بھی تو اس وقت پیراماؤنٹ سے میلوں دور کلفٹن پر موجود تھا لیکن بعد میں آصف بھٹی سے جھڑپ اور پھر مذاکرات سے بھی فارغ ہوکر کلفٹن سے بندرگاہ پر کھڑے ہوئے "پیراماؤنٹ" تک پہنچ گیا تھا۔ جس طرح ٹیکسی سے میں آسکتا تھا اسی طرح کوئی اور بھی تو آسکتا تھا۔

..... تو کیا یہ فہمید کا کام تھا؟ لیکن فہمید کو اپنے ہی ایک ساتھی کارکن کو قتل کرنے کی کیا ضرورت آن پڑی تھی؟ پھر مجھے احساس ہوا کہ یہ وہاں کھڑے ہوکر اس قسم کے سوالوں پر غور کرنے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے عبدل کی لاش کو کمبل سے ڈھانپ دیا۔

مسئلہ یہ تھا کہ میں کیپٹن گونزز کو بتا بھی نہیں سکتا تھا کہ میں کیبنوں کی تلاشی لیتا پھر رہا تھا اور مجھے عبدل کی لاش مل گئی تھی۔ یہ بھی درست نہیں تھا کہ میں اسی طرح کیبن کو تالا لگا کر چلا جاتا اور اپنی زبان بند رکھتا۔ کیبن واقعی خالی اور مقفل تھا۔ شاید کئی دن تک عبدل کی لاش دریافت نہ کی جاسکتی۔ اس قسم کے کیبنوں میں سے تو لاش سڑنے کے بعد بھی باہر والوں کو سڑاند کا احساس شاید بہت تاخیر سے ہوتا۔ قاتل کا مقصد بھی شاید یہی تھا۔ اس نے لاش اسی لیے اس خالی کیبن میں ڈال کر اسے مقفل کردیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تاخیر سے اس کا پتا چلے۔ اس دوران شاید وہ غائب بھی ہوجاتا۔

دوسرے ہی لمحے میں فیصلے پر پہنچ گیا۔ مجھے ایک درمیانی راستہ سوجھ گیا تھا۔ مجھے سامنے آنے کی ضرورت بھی نہیں تھی اور عبدل کی لاش کی طرف اشارہ بھی دیا جاسکتا تھا۔ میں نے کیبن کا دروازہ پورا کھول دیا اور خود وہاں سے کھسک آیا۔ مجھے یقین تھا کہ جلد ہی کوئی وہاں سے گزرے گا تو اندر جھانک کر ضرور دیکھے گا کہ دروازہ کیوں کھلا تھا۔ اس کے بعد لاش کی موجودگی راز نہیں رہ سکتی تھی۔

میں انجن روم کے قریب جہاز کے پُل نما حصے پر پہنچ گیا جہاں کیپٹن گونزز موجود تھا۔ میں نے اس سے گپ شپ کرتے ہوئے دیوار پر آویزاں چارٹ کی طرف دیکھا جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ جہاز کس رفتار سے سفر کرتے ہوئے کب کس مقام پر پہنچا تھا۔

"ہم نے خاصی تیز رفتاری سے سفر کیا ہے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں۔ موسم خراب نہیں ہوا اس لیے ہم اچھی رفتار برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔" کیپٹن گونزز نے گردن ہلائی۔ "ان دنوں بحیرۂ احمر بھی پُرسکون رہتا ہے۔"

ہمیں اسی طرح گپ شپ کرتے ہوئے تین چار منٹ گزرے تھے کہ فرسٹ میٹ جنتر بوکھلایا ہوا وہاں پہنچا اور گونزز سے مخاطب ہوا۔ "کیپٹن! بہت بری خبر ہے۔ عبدل مارا گیا ہے۔"

"مارا گیا ہے؟" کیپٹن نے حیرت سے دُہرایا۔ "ہم کیا اس وقت میدان جنگ میں ہیں جو وہ لڑتے ہوئے مارا گیا ہے؟"

"میرا مطلب ہے اسے کسی نے قتل کردیا ہے۔" جنتر گڑبڑا کر بولا۔ "کسی نے اس کا گلا کاٹ دیا ہے۔ فتاح تیراکی کرکے واپس آرہا تھا تو اس نے خالی کیبن کا دروازہ کھلا دیکھا۔ اس نے اندر جھانکا تو برتھ پر کوئی لیٹا نظر آیا۔ وہ اندر گیا تو اسے عبدل مُردہ پڑا ملا۔" فتاح بھی افغانی تھا اور جہاز پر غالباً سیلر تھا۔

"تم وہیل سنبھالو۔ میں ذرا جاکر دیکھتا ہوں۔" کیپٹن گونزز نے جنتر کو حکم دیا۔

میں بھی بظاہر تجسس سے مغلوب ہوکر اس کے پیچھے پیچھے لپکا۔ خالی کیبن کے دروازے پر کئی افراد جمع تھے۔ ان میں کیتھرین بھی شامل تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے معصوم بنتے ہوئے کیتھرین سے پوچھا۔

"کریو کے ایک آدمی عبدل کو کسی نے قتل کردیا ہے..... بے چارہ..... نوجوان ہی تھا.....!" وہ افسوس سے بولی۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔" میں نے بھی تاسف زدہ لہجے میں کہا۔

کیپٹن گونزز موٹا سا گارد انتوں میں دبائے بالکل فلمی جاسوسوں کی طرح لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔ اسے یقیناً عبدل کی موت سے دھچکا لگا تھا لیکن وہ غمزدہ نظر آنے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کا سراغرساں نظر آنے کی بھی پوری پوری کوشش کر رہا تھا حالانکہ مجھے اندازہ تھا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

چند لمحے بعد میں ریلنگ کی طرف چل دیا۔ میں نے دیکھا' کیتھرین بھی میرے پیچھے آرہی تھی۔ وہ ابھی تیراکی کے لباس میں ہی تھی لیکن اس کے اوپر اس نے ایک سفید اسپورٹس شرٹ پہن لی تھی جس کے بٹن کھلے تھے۔ اس کے بے ترتیب بالوں میں ابھی نمی تھی اور کچھ لٹیں اس کی پیشانی اور رخساروں سے چپکی ہوئی تھیں۔ میں اسے آتے ہوئے دیکھ کر رک گیا۔

قریب پہنچ کر وہ دھیمے لیکن کچھ بدلے بدلے سے لہجے میں بولی۔ "میرا فضل چوہدری..... ! میرا خیال ہے' اب تم اپنی ڈرامے بازی بند کردو۔"

اس نے مجھے مسٹر کان یا افضل کان کے بجائے اُفضل چوہدری' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ یعنی وہ میرے اصل نام سے واقف تھی۔ میں بھونچکا رہ گیا پھر میں نے سنبھل کر کہا "میرا نام افضل چوہدری نہیں' افضل خان ہے۔"

"خواہ مخواہ کیوں اپنا سر نیم بدلنے کا تکلف کر رکھا ہے؟ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ بس ویسے ہی تمہارے دل کو تسلی رہتی ہوگی کہ تم نے اپنا نام بدل رکھا ہے۔ بہرحال مجھے معلوم ہے تمہیں میرے والد نے میرے پیچھے لگایا ہوگا۔ انہوں نے شاید کراچی میں سیٹھ رمضان سے رابطہ کیا ہوگا اور سیٹھ رمضان نے میری نگرانی کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہوگا۔" وہ اطمینان سے بولی۔

ایک لمحے کے لیے میں نے اپنے آپ کو بڑا کھسیانا محسوس کیا۔ واقعی میرا سارا ڈراما دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ بیری کلا کردو قدم کے فاصلے پر ہی موجود تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا "میں ابھی تم سے بات نہیں کرسکتا۔ رات کے کھانے کے بعد جہاز کے پچھلے حصے میں فین ٹیل کے قریب مجھ سے ملنا پھر اطمینان سے بات کریں گے۔"

اس نے بے پروائی سے کندھے اُچکا دیے اور واپس کیبن کی طرف چلی گئی جہاں کیپٹن گونزز اپنے عملے سے تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

قتل اپنی جگہ تھا لیکن پیٹ بہرحال کھانے کو مانگتا تھا اس لیے اس شام بھی حسبِ معمول کھانے کا بندوبست ہوا۔ کھانے کے دوران اس بات پر بحث ہوتی رہی کہ کیا قتل کی رپورٹ درج کرانے اور تفتیش کے لیے جہاز کو کسی قریبی بندرگاہ پر روکا جائے؟

کیپٹن کا کہنا تھا کہ قتل کی واردات بین الاقوامی سمندری حدود میں ہوئی تھی اس لیے ہمارا ایتھوپیا یا یمن کی بندرگاہ پر رُکنا ضروری نہیں تھا۔ اس وقت ہمارے دائیں بائیں یہی دو ممالک تھے۔ میں تو بغیر کاغذات کے سفر کر رہا تھا اور حالات پہلے ہی میرے کچھ زیادہ حق میں نہیں تھے۔ میں تو خدا سے چاہتا تھا کہ ہم کسی قسم کی پولیس کارروائی میں ملوث نہ ہوں لیکن میں نے محسوس کیا کہ باقی دونوں مسافروں اور بیشتر عملے کی بھی دلی خواہش یہی تھی کہ انہیں کم از کم ایتھوپیا یا یمن کی پولیس کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

آخر کار سارا معاملہ' ساری ذمے داری اور فیصلے کا اختیار کیپٹن گونزز پر چھوڑ دیا گیا جس کے بعد یقیناً سب نے اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ کیپٹن نے حکم دیا کہ لاش کو برف میں محفوظ کردیا جائے' جہاز کے ترکی یعنی اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد ہی پولیس کو اس معاملے کی اطلاع دی جائے گی۔ مجھ سمیت غالباً سبھی نے سکون کی سانس لی۔

کھانے کے بعد میں ٹہلتا ہوا جہاز کے عقب میں' باہر کو نکلے ہوئے گول حصے میں چلا گیا جو فین ٹیل کہلاتا تھا۔ کچھ دیر بعد کیتھرین بھی آن پہنچی۔

وہ گویا کسی تصور سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "تم یقیناً تڑپ رہے ہوگے..... کسمسا رہے ہوگے کہ میں نے تمہیں پہچان لیا؟"

"نہیں۔ اس قسم کی بیماریاں مجھے لاحق نہیں ہیں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "میں نہ تڑپا ہوں اور نہ کسمسایا ہوں۔ تھوڑا سا تجسس ضرور ہے..... اور وہ فطری سی بات ہے۔ ٹھیک ہے..... تم نے یہ اندازہ تو لگا لیا کہ کراچی میں تمہارے والد کا دوست سیٹھ رمضان موجود ہے۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے والد تمہارے بارے میں پریشان ہیں۔ انہوں نے شاید سیٹھ رمضان سے رابطہ کیا ہو اور سیٹھ رمضان نے کسی کو بھیج دیا ہو۔ یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ انسان خیالوں کے گھوڑے دوڑا سکتا ہے اور کبھی کبھی وہ گھوڑے صحیح سمت میں بھی دوڑتے ہیں لیکن تھوڑی بہت حیرت مجھے اس پر ہے کہ تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا..... یعنی صحیح نام؟"

"محض اتفاقاً....." وہ اطمینان سے بولی۔ "میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ میں پاکستان نہیں گئی ہوں۔ میں پاکستان' انڈیا اور بنگلہ دیش' تینوں ملکوں سے گھومتی ہوئی آرہی ہوں۔ مجھے ان ملکوں میں کئی کام بھی تھے۔ مجھے سیٹھ رمضان کو دیکھنے کا بڑا تجسس تھا لیکن میں اپنی اصل حیثیت میں اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے

معلوم تھا کہ اگر میرے فکر مند پاپا اسے میرے بارے میں مطلع کر چکے ہوں گے تو وہ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جائے گا اس لیے میں اس سے ملی ضرور... لیکن کیتھرین کی حیثیت سے نہیں۔" وہ گویا اس ملاقات کے تصور سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرا دی۔

"تو پھر کس حیثیت سے ملیں؟" میں نے ملگجی روشنی میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک غیر ملکی نامہ نگار کی حیثیت سے۔" وہ اطمینان سے بولی۔ "میں بظاہر اتفاقاً ایک ہوٹل میں اس سے ٹکرا گئی...."

"کون سے ہوٹل میں؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ اس نے ہوٹل کا نام بتایا۔ وہ میرا ہی ہوٹل تھا۔ تاہم میں نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی اسے بتایا کہ اس ہوٹل کا بے سروساماں' بے گھر اور بے در مالک اس کے سامنے کھڑا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جس سیٹھ رمضان کا وہ ذکر کر رہی تھی' وہ بھی ابتدا میں اس ہوٹل میں پارٹنر تھا۔

وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ "میں اس کے بارے میں تمام ضروری معلومات حاصل کیے ہوئے تھی اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس وقت وہ اس ہوٹل میں موجود ہوگا۔ میں اتفاقاً... میرا مطلب ہے بظاہر اتفاقاً اس سے جا ٹکرائی۔ میں نے اس سے اپنا تعارف ڈیلی "سن" کی نمائندہ خصوصی سوزن فورڈ کے نام سے کرایا جو میری تھوڑی بہت شناسا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے موضوع پر ایک بہت ضخیم قسم کی رپورٹ تیار کر رہی ہوں جو پہلے اخبار میں قسط وار اور پھر کتابی شکل میں چھپے گی۔ یہ بڑا سنجیدہ اور اہم کام ہے' مجھے اس سلسلے میں اس کی طرف سے کچھ مدد مل سکے تو میں ہمیشہ شکر گزار رہوں گی...."

وہ ذرا ہنسی اور ایک لمحے کے توقف سے بولی "ویسے سیٹھ رمضان ہے بہت دلچسپ آدمی۔ سب سے پہلے تو معذرت کرنے لگا کہ دنیا کی آبادی بڑھانے میں اس کا ہرگز کوئی قصور نہیں' اس کی تو صرف ایک ہی بیٹی ہے اور بے چاری اس کی بیوی نے بھی اس معاملے میں یہاں تک اس کا ساتھ دیا کہ جوانی میں ہی دنیا سے رخصت ہوگئی کہ کہیں دنیا کی آبادی بڑھانے کے سلسلے میں اس سے کوئی بھول چوک نہ ہو جائے...."

مجھے یقین آگیا کہ وہ سیٹھ رمضان سے مل چکی تھی۔ سیٹھ رمضان اسی قسم کی باتیں کرتا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "بہرحال وہ بے چارہ فوراً میری مدد پر کمربستہ ہوگیا اور سب سے پہلے اس نے مجھے اپنے گھر کھانے پر مدعو کر ڈالا۔ میں اس کے ہاں پہنچی تو وہ نیا سوٹ پہن کر بڑے اہتمام سے بیٹھا ہوا تھا۔ خوشی سے اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے کہ ایک غیر ملکی جرنلسٹ اس کے ہاں آئی ہوئی تھی...."

یہاں وہ یقیناً تھوڑا سا مبالغے سے کام لے رہی تھی یا پھر اس نے سیٹھ رمضان کے انداز و اطوار سے کوئی غلط تاثر لیا تھا۔ دولت مند ہونے کے باوجود سیٹھ رمضان کو پبلسٹی کا قطعاً کوئی شوق نہیں تھا۔ اس کی فطرت میں بھی شہرت پسندی نہیں تھی اور ویسے بھی وہ اس خاص طبقے میں سے تھا جو احتیاطاً اور مصلحتاً بھی شہرت سے دور بھاگتا ہے۔ اس جیسے لوگ سرجھکا کر اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ اسے ملکی یا غیر ملکی پریس والوں سے ملنے کا قطعاً کوئی شوق نہیں تھا۔ البتہ خوبصورت اور سفید چمڑی والی لڑکی کو دیکھ کر ذرا ریشہ خطمی ہو رہا ہو تو بات اور تھی۔ اس بدنصیب کو کیا معلوم تھا کہ وہ اس کے دوست کی بیٹی ہے۔ وہی بیٹی جس کی بہتری کے غم میں وہ بھی دُبلا ہو رہا تھا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تم مغربی لوگوں میں ایک یہ بھی بڑی خرابی ہوتی ہے کہ جھوٹ بول کر ہم بے چارے سیدھے سادے مشرقی لوگوں سے اپنا کام نکال لیتے ہو۔ ہم اپنے آپ کو ہر طرح سے قربانی کا بکرا بنا کر پیش کر دیتے ہیں اور تم لوگ بعد میں ہم پر ہنستے ہو' ہماری سادگی کا مذاق اڑاتے ہو۔"

"میں مذاق نہیں اُڑا رہی' میں تو صرف تھوڑا سا لطف اندوز ہو رہی ہوں۔" وہ جلدی سے بولی "وہ خاصا دلچسپ آدمی ہے۔ مجھے تو حیرت ہو رہی تھی کہ اس جیسے آدمی کی میرے پاپا جیسے نہایت سنجیدہ اور بارعب آدمی سے کس طرح دوستی ہوگئی...."

"سیٹھ رمضان کی ہر طرح کے آدمیوں سے دوستی ہے اور اس کی دوستیاں دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔" میں نے کہا۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ سیٹھ رمضان جتنا سادہ لوح... بلکہ بے وقوف نظر آتا ہے' اتنا بے وقوف ہے نہیں۔ اکثر اوقات یہی پتا چلانا مشکل ہوتا تھا کہ وہ بے وقوف بنا رہا تھا یا بن رہا تھا۔

کیتھرین ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "بہرحال.... اس نے مجھ اکیلی کے لیے بہت ہی پُرتکلف کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ کھانے سے پہلے اس نے مجھے اپنا پورا بنگلا دکھایا۔ بہت شاندار بنگلا تھا...."

"یہ سب باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ اصل بات تو بیچ میں ہی رہ گئی۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ تمہیں میرے صحیح نام کا کیسے پتا چلا؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"وہی تو بتانے لگی تھی۔ اب میں اسی طرف آ رہی تھی۔ وہ مجھے اپنا شاندار گھر دکھا رہا تھا تو ظاہر ہے اسٹڈی میں بھی لے گیا۔ تمہارے ہاں دولت مند لوگوں کو خواہ لکھنے پڑھنے کا شوق بالکل نہ ہو لیکن گھر میں شاندار اسٹڈی ضرور ہوتی ہے۔ اس اسٹڈی کی ایک اہم بات یہ تھی کہ اس کی ایک دیوار پر تمہاری تصویر لگی ہوئی تھی۔ بڑی سی.... رنگین.... فریم شدہ تصویر۔"

"میری تصویر....؟" میں نے بے یقینی سے کہا پھر بے اختیار اُردو میں کہا "اے مروا دیا بدبخت!"

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے ہنسی اور بولی۔ "میں شاید یہی سمجھتی کہ وہ اس کا کوئی بیٹا ہوگا مگر وہ مجھے بتا چکا تھا کہ اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اس سے پوچھ لیا تھا کہ وہ کس کی تصویر

ہے' اس نے بڑے فخر سے بتایا تھا کہ وہ اس کے عزیز ترین دوست کی تصویر ہے۔ جس پر مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کیونکہ سیٹھ رمضان کی.... اور تصویر والے شخص کی عمر میں بہت فرق تھا۔ پھر میں نے سوچا' شاید وہ اس دوست کی جوانی کی تصویر ہوگی۔ اس نے خود ہی مجھے تمہارا نام بتایا اور بڑی تعریفیں کرنے لگا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی نظر میں تمہاری حیثیت ایک ہیرو کی سی تھی۔ شاید تم اس کا آئیڈیل ہو۔"

پھر وہ ذرا شوخ سی نظروں سے گویا از سرِ نو میرا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "تم میں ہیرو والی کوئی بات نظر تو نہیں آتی۔"

"ہوتی تو نظر آتی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں تو بڑا مسکین سا آدمی ہوں۔ اس گدھے سیٹھ رمضان کو اظہار عقیدت کے لیے اور کوئی تصویر نہیں ملی ہوگی۔ چغد نے اٹھا کر میری تصویر ٹانگ دی ہوگی۔ یہ بات مجھے تو معلوم ہی نہیں تھی ورنہ تصویر کی جگہ میں اسے ٹانگ دیتا۔ خیر.... اب کیا ہو سکتا ہے۔ جو ہونا تھا سو ہوگیا۔"

"میں نے تمہیں جہاز پر قدم رکھتے ہی پہچان لیا تھا۔" وہ بولی۔

"اس کا مطلب ہے تم اداکارہ اچھی ہو۔" میں نے کہا۔

"انجان بنی رہنے کی اداکاری اچھی کی تھی تم نے۔"

"تعریف کا شکریہ۔" وہ مسکرائی اور ایک لمحے کے توقف سے بولی "ویسے میں نے سیٹھ رمضان سے کچھ زیادہ جھوٹ نہیں بولا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے بارے میں بہت سنجیدہ تحقیقی کام کر رہی ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں ڈیلی "سن" کی نمائندہ نہیں ہوں اور میرا نام سوزن نہیں ہے۔ یہ کام میں ایک تحقیقی ادارے کے لیے کر رہی ہوں۔"

میں ایک بار پھر اُلجھن کے عالم میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اتنی معزز فیملی سے تعلق رکھنے والی.... اتنی سنجیدہ نظر آنے والی.... پڑھی لکھی دکھائی دینے والی.... اور بہت زیادہ پڑھے لکھوں جیسے کام کرنے والی لڑکی کیا واقعی ڈرگ مافیا کی آلۂ کار تھی؟

میں سوچ رہا تھا کہ میری شخصیت تو اس پر کھل ہی چکی تھی' اب اس سے کھل کر ہی بات کرلینی چاہیے تھی۔ ویسے تو سیدھے سبھاؤ پوچھنے پر کوئی اپنی زندگی کے راز اگل نہیں دیا کرتا لیکن جب وہ جہاز پر میری موجودگی کا مقصد سمجھ ہی چکی تھی تو پھر سیدھی طرح بات کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ شاید بات کچھ آگے بڑھتی۔ شاید اصل بات کی طرف کوئی اشارہ ملتا۔ شاید کوئی اندازہ قائم کرنے میں مدد ملتی۔

اصل موضوع پر آنے سے پہلے میں نے خواہ مخواہ جھرجھری سی لے کر کہا۔ "ہمیں اس طرح ہنس ہنس کر باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ ہمیں تھوڑا بہت تو سوگوار نظر آنا چاہیے۔ اس جہاز پر ایک لاش موجود ہے۔"

"صرف لاش ہی نہیں.... ایک قاتل بھی۔" اس نے تصحیح کی۔

"ہاں۔ ایک قاتل بھی۔" میں نے تسلیم کیا۔ "میرا خیال ہے' قاتل کے سوا باقی سب یہی سوچ رہے ہوں گے کہ قاتل کون ہو سکتا ہے۔ جہاز کے کریو میں اب آٹھ آدمی رہ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ہم تین مسافر ہیں۔ یعنی مشتبہ افراد کی کل تعداد گیارہ ہے۔"

"آخر کسی کو اسے قتل کرنے کی ضرورت کیا تھی؟" کیتھرین نے سوال کیا۔

"میرا خیال تھا کہ تم اس موضوع پر کچھ روشنی ڈال سکو گی۔"

"میں....؟" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "تمہیں یہ خیال کیونکر آیا؟"

"بس ویسے ہی... کبھی کبھی مجھے عجیب عجیب خیال آتے رہتے ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض درست بھی ثابت ہوتے ہیں۔" میں نے بظاہر بے نیازی سے کہا۔

وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے ایک لمحے مجھے گھورتی رہی پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "مسٹر چوہدری! کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم اس جہاز پر کیا کر رہے ہو؟"

"کیا واقعی تمہیں یہ پوچھنے کی ضرورت ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُلٹا اسی سے سوال کیا۔ "تمہیں اچھی طرح معلوم ہے' تمہارے والد تمہارے بارے میں بہت پریشان ہیں۔ تمہارا اندازہ صحیح ہے کہ انہوں نے فون پر سیٹھ رمضان سے مدد کی درخواست کی تھی۔ تمہارے معاشرے میں اولاد کے اٹھارہ سال کی ہونے کے بعد.... بلکہ اب تو اس سے پہلے بھی والدین انہیں کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ حتیٰ کہ اگر وہ تباہی کے گڑھے میں گر رہے ہوں تب بھی انہیں نہیں روک سکتے۔ اولاد ہر کام یہی سمجھ کر کرتی ہے کہ اس سے زیادہ عقلمندی کا کام کوئی ہو نہیں سکتا۔ بعض اوقات جھنجلا کر بھی اپنے آپ کو تباہ کرنے والے کام کرتی ہے اور اس کے لیے بیسیوں جواز گھڑ لیتی ہے۔"

"محترم واعظ چوہدری صاحب! تمہیں جو کچھ کہنا ہے' سیدھے اور صاف طریقے سے کہو۔ ناصحانہ قسم کی تقریر مت کرو۔" وہ ملائمت سے بولی۔

"نوجوان نسل نصیحت سے کتنا بھاگتی ہے...." میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "سیدھی' سچی اور صاف بات یہ ہے کیتھرین ڈیئر.... کہ تمہارے والد کا خیال ہے کہ تم ڈرگز کے دھندے میں پڑ گئی ہو اور اس کی وجہ سے کسی مصیبت میں پھنسنے والی ہو۔"

اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں لیکن وہ کچھ نہ بولی۔ اس نے مجھے بولنے کا موقع دیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "کوئی بعید نہیں کہ یہ بات درست ہو۔ میں اس جہاز پر سوار ہونے کے سلسلے میں جن دو آدمیوں سے ملا' پہلے وہ دونوں یکے بعد دیگرے قتل کر دیے گئے اور اب عبدل قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ مجھے ڈرگ مافیا کا کام معلوم ہوتا ہے۔ کراچی کے ساحل پر میں جن دو افراد

سے ملا تھا انہیں اس جہاز پر تمہاری موجودگی کا علم تھا۔"

"کون تھے وہ؟" اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"عاش بھٹی اور آصف بھٹی۔ وہ دونوں سگے بھائی تھے۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ دونوں مارے جاچکے ہیں؟" اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں... اور اس کا مطلب ہے' تم انہیں جانتی ہو۔ کون تھے وہ...؟ اور انہیں کس نے ہلاک کیا؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"کوئی کسی کے بارے میں کچھ پوچھ لے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اسے جانتا ہے۔ میں کسی بھٹی وغیرہ کو نہیں جانتی اور مجھے نہیں معلوم کہ انہیں یا عبدل کو کس نے اور کیوں قتل کیا؟" وہ بیزاری سے بولی۔

"شاید وہ کوئی اہم بات جان گئے تھے اور اس سلسلے میں ان کے زبان کھولنے کا خطرہ تھا۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "خیر... ان باتوں کو چھوڑو۔ ہم صرف تمہاری بات کرتے ہیں۔ تم کس چکر میں پھنسی ہوئی ہو؟ اگر تمہیں مدد کی ضرورت ہو تو میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔"

وہ تمسخرانہ لہجے میں بولی۔ "میں کسی چکر میں پھنسی ہوئی نہیں ہوں ڈیئر افضل چوہدری! کم از کم منشیات کے چکر میں تو ہرگز نہیں پھنسی ہوں۔ ابھی مجھے اس قسم کے ایڈونچر میں ٹانگ اڑانے یا زیادہ دولت کمانے کا جنون نہیں چڑھا۔ میں اپنی زندگی سے بہت مطمئن ہوں اور بڑے مزے میں ہوں۔ میرے والد کو میرے بارے میں فکرمند رہنے کی عادت ہے۔ وہ تھوڑے تھوڑے سے نفسیاتی مریض ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سیٹھ رمضان نے ان کی باتوں کا صحیح تاثر نہ لیا ہو۔"

"اس قسم کے جہاز اکثر ہیروئن لے کر یورپ کی طرف جاتے ہیں۔ کہیں تم اس قسم کی کسی کھیپ کی نگرانی تو نہیں کررہیں؟" میں نے ہمت نہیں ہاری تھی اور سیدھے سادے انداز میں براہِ راست اس سے ہر بات پوچھتے جارہا تھا۔

"میں ابھی اتنے اہم عہدے پر فائز نہیں ہوئی اور میں نے زندگی میں کبھی ہیروئن نہیں دیکھی۔" وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنس کر بولی پھر اس نے یوں میرا گال تھپتھپایا جیسے کسی بچے کو بہلانے کی کوشش کررہی ہو۔ "آخر تم اپنے کام سے کام کیوں نہیں رکھتے؟ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے سے بعض اوقات ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے۔"

"ٹانگ کیا بعض اوقات تو گردن بھی ٹوٹ جاتی ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "لیکن میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں' اپنا کام سمجھ کر ہی پوچھ رہا ہوں۔ ایک تو تم خود دیکھ کر آچکی ہو کہ سیٹھ رمضان میرا کیسا دوست ہے۔ اس نے میری ڈیوٹی لگائی ہے کہ تمہارا خیال رکھوں۔ اب تم خود ہی بتاؤ' میں اس کا کہا کیسے ٹال سکتا ہوں؟ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ تمہیں دیکھنے کے بعد خواہ مخواہ ہی تمہارا خیال رکھنے کو جی چاہنے لگا ہے۔"

"بس... بس رومینٹک ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر گویا مجھے روکا۔ حالانکہ میں اس کی طرف بڑھ نہیں رہا تھا۔ میں تو اپنی جگہ کھڑا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بڑی ان رومینٹک لڑکی ہوں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔ "اگر تم لڑکی ہو تو پھر ان رومینٹک نہیں ہوسکتیں۔ خیر... یہ معاملہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ یہ بتاؤ تم پاکستان' بنگلہ دیش اور انڈیا میں کیا کرتی پھر رہی تھیں؟"

"میں نے بتایا نا کہ میں بڑھتی ہوئی آبادی کے بارے میں تحقیقی کام کررہی ہوں۔ ان تین ملکوں میں جائے بغیر تو اس موضوع پر کوئی مشاہدہ مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ خدا کی پناہ... کس بری طرح ان ملکوں کی آبادیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گھروں میں بھیڑ بکریوں کی طرح انسان بھرے ہوئے ہیں۔ کیڑے مکوڑوں کی طرح سڑکوں پر رینگ رہے ہیں۔ بنگلہ دیش میں' میں نے دیکھا' ایک ایک جھونپڑی میں ایک ایک جوڑے کے بارہ بارہ بچے ہیں اور کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ انڈیا کے تمام بڑے شہروں میں مجموعی طور پر کروڑوں انسان فٹ پاتھوں پر رہ رہے ہیں۔ وہیں شادی بیاہ ہو رہے ہیں... بچوں کو جنم دیا جارہا ہے۔ لوگ گندے جوہڑوں کا پانی پی رہے ہیں۔ بعض جگہوں کے حالات دیکھ کر تو مجھے رات کو اپنے ہوٹل کے کمرے میں نیند نہیں آئی۔"

"درست ہے..." میں نے تسلیم کیا "اس خطے کے حالات لرزہ خیز ہیں لیکن جنت تو مغربی ممالک بھی نہیں ہیں۔ ان کے بھی بے شمار حصے ایسے ہیں جہاں کے حالات دیکھ کر راتوں کی نیند اُڑ سکتی ہے لیکن ایشیائی ملکوں کی آبادی کے بارے میں تم مغرب والوں کی تشویش دیکھ کر مجھے کچھ شک سا ہونے لگتا ہے۔ سفید فام قومیں تو غرض کے بغیر دنیا کا کوئی کام نہیں کرتیں۔ تم لوگ جس طرح آبادی کو کنٹرول کرنے کے سلسلے میں ان ملکوں کے لیے پریشان رہتے ہو' امداد دینے کے لیے بھی تیار رہتے ہو' اس سے کیا واقعی تمہیں ان ملکوں کی بہتری مطلوب ہے یا اس کے پیچھے کوئی خوف کارفرما ہے؟"

"خوف؟ ہمیں کیا خوف لاحق ہوسکتا ہے؟" وہ تیزی سے بولی "جس رفتار سے بنگلہ دیش جیسے چھوٹے سے ملک کی آبادی بڑھ رہی ہے... اندازہ یہی ہے کہ ۲۰۰۵ء میں وہاں کی آبادی امریکا سے زیادہ ہوجائے گی لیکن اس سے امریکا کی صحت پر کیا اثر پڑ جائے گا؟ مفلوک الحال لوگوں کی آبادیاں بڑھنے سے سُپر پاورز کی صحت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ ہم صرف فلاحی نقطۂ نظر سے اس کے بارے میں متفکر ہیں۔" اس کا لہجہ خاصا دانشورانہ اور مُدبرانہ ہوگیا۔

"بہت خوب... بہت خوب۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "اچھا یہ بتاؤ' تم نے سفر کے لیے اسی جہاز کا انتخاب کیوں کیا؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔" وہ اطمینان سے بولی۔ "میں کراچی میں تھی تو میں نے کچھ لوگوں کو باتیں کرتے سنا تھا کہ اس قسم کے جہازوں پر انسان زیادہ سکون سے سفر کرسکتا ہے۔ چیکنگ بھی زیادہ سخت نہیں ہوتی۔"

"تمہیں چیکنگ سے کیا خوف تھا؟ میرا خیال ہے' تمہارے پاس تو پاسپورٹ ویزا وغیرہ سب کچھ ہوگا۔" میں نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ میں یہ چیزیں اس کے سامان میں دیکھ چکا تھا۔

"ہاں۔ میرے پاس سب کچھ ہے۔ مجھے چیکنگ کا کوئی خوف نہیں تھا۔ وہ تو میں ویسے ہی لوگوں سے سنی ہوئی بات بتا رہی ہوں۔ مجھے تو صرف سکون کی تلاش تھی۔ یہ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ مجھے پتا چلا کہ کراچی پورٹ پر یہ جہاز کھڑا ہے جس پر افغانستان سے تیل کی کھدائی کی مشینری بنکوک کے راستے لاکر لادی جارہی ہے۔ میں نے سوچا' استنبول جانے کے لیے یہ روٹ ٹھیک رہے گا۔"

مجھے معلوم تھا کہ وہ کچھ جھوٹ' کچھ سچ بول رہی تھی لیکن میرے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے میں اس کے جھوٹ سچ کو الگ کرسکتا۔ میں نے اس کی باتوں پر کسی شبہے کا اظہار کیے بغیر پوچھا "تم بتا رہی تھیں کہ ترکی میں تم کسی سے ملنے جارہی ہو جس کے بعد شاید تم ترکی میں ہی رہ جاؤ۔ اگر تم اسے زیادہ ذاتی سوال نہ سمجھو تو کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ وہ کون ہے؟"

وہ ایک بار پھر گویا میری کسی نامعلوم کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہنسی۔ شاید اس کا اب بھی یہی خیال تھا کہ میں اندر سے بہت پریشان اور بے چین ہوں۔ حالانکہ میری کم از کم فی الحال یہ کیفیت نہیں تھی۔ ہنسی تھمی تو وہ بولی "میری بات سن کر تم سمجھے ہوگے کہ شاید ترکی میں میرا کوئی بوائے فرینڈ میرا انتظار کررہا ہوگا جس سے ملاقات کے بعد میں مستقبل کا پروگرام طے کروں گی اور شاید ترکی میں ہی رہ جاؤں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ استنبول میں میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں بلکہ میرے والد ہی میرا انتظار کررہے ہیں۔ وہ وہاں کسی نیم سرکاری مشن پر آئے ہوئے ہیں۔ میرے وہاں پہنچنے تک وہ فارغ ہوچکے ہوں گے۔ وہاں سے شاید ہم دونوں آگے یورپ تک جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ مزید کچھ عرصہ ترکی میں گزارنے کے بعد انگلینڈ واپس چلے جائیں۔ ابھی میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"لیکن سیٹھ رمضان نے تو مجھے بتایا تھا کہ تمہارے والد نے اسے انگلینڈ سے فون کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہوگا۔ اس وقت وہ انگلینڈ ہی میں ہوں گے۔ وہ بھی ملک در ملک گھومتے رہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ سرکاری یا نیم سرکاری دوروں پر ہوتے ہیں۔ وہ ریٹائر ہوچکے ہیں لیکن حکومت کو اب بھی ان کی خدمات کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔"

"وہ کہیں اسپائی تو نہیں ہیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "سنا ہے' ایجنٹ عملی طور پر کبھی ریٹائر نہیں ہوتے۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ خوش دلی سے ہنسی۔ "وہ ایجنٹ وغیرہ ہرگز نہیں ہیں۔ وہ تو سیدھے سادے' شریف سے آدمی ہیں البتہ سفارتی معاملات کے بڑے ماہر ہیں اس لیے حکومت کو اکثر ان کی خدمات کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔"

میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اس روپ میں بھی نہ جانے کتنے لوگ اسپائی کے طور پر کام کرچکے تھے۔ بظاہر وہ سفارتی معاملات کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور سفارتی شعبوں سے ہی متعلق ہوتے تھے لیکن درحقیقت اسپائی ہوتے تھے۔ کہیں باپ بیٹی دونوں ہی تو شاہکار قسم کی چیز نہیں تھے اور دنیا بھر میں گل کھلاتے تو نہیں پھر رہے تھے؟ ممکن تھا دونوں کو ایک دوسرے کی لائن ناپسند رہی ہو اور دونوں ایک دوسرے کو اپنی اپنی لائن پر لانے کے لیے کوشاں ہوں۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا' فرسٹ میٹ جنتر نے ہمیں وہاں کھڑے دیکھ لیا اور ٹہلتا ہوا ہماری طرف آگیا۔

"آج کی رات خوشگوار ہے۔ شکر ہے گرمی نہیں ہے۔" اس نے حسب معمول موسم سے بات شروع کی۔

"جہاز جب استنبول پہنچے گا تو کیا ہوگا؟" کیتھرین نے اس سے پوچھا "کیا ہم سب کو پوچھ گچھ کے لیے روکا جائے گا؟" چہرے سے وہ خواہ کتنی ہی بے فکر نظر آرہی تھی لیکن مجھے نہ جانے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ اندر ہی اندر وہ فکرمند ضرور تھی۔ آخر اسے کیا فکر تھی؟ فکرمند تو مجھے ہونا چاہیے تھا جس کے پاس پاسپورٹ تک نہیں تھا۔

"ہاں۔ میرا خیال ہے پوچھ گچھ تو ہوگی۔" جنتر متذبذب لہجے میں بولا "ویسے مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں ہے۔ میں نے جتنے بھی جہازوں پر ملازمت کی ہے' ان میں سے کسی پر کبھی قتل کی کوئی واردات نہیں ہوئی۔ بہرحال کیپٹن گونز کا خیال ہے کہ استنبول چونکہ دارالخلافہ ہے' وہاں کچھ زیادہ ہی افسران موجود ہوں گے اس لیے وہاں زیادہ اُلجھن پیش آنے کا اندیشہ ہے۔ استنبول سے پہلے ہمیں بودرم کی بندرگاہ پر رکنا ہے۔ وہ چھوٹی جگہ ہے۔ کیپٹن نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم وہاں قتل کی رپورٹ درج کرادیں گے۔"

پھر اس نے خاص طور پر گویا میری معلومات کے لیے بتایا۔ "یہ جزیرہ رہوڈز سے ذرا آگے ایجین ہی کی ایک بندرگاہ ہے۔ ہمیں کچھ سامان وہاں بھی اتارنا ہے۔"

"میں تو اپنے کیبن میں جارہی ہوں۔" کیتھرین تھکے تھکے سے انداز میں انگڑائی لیتے ہوئے بولی۔ "صبح تم دونوں سے ملاقات ہوگی۔"

میں بھی جلد ہی اپنے کیبن میں لوٹ آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ جہاز پر ایک قاتل کی موجودگی کے احساس نے عملے تک کو

خوفزدہ کر دیا تھا۔ ڈیک پر کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں بھی جلد ہی سونے کے لیے لیٹ گیا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ ایک ہی چابی سب کیبنوں میں لگتی تھی۔ میں نے اٹھ کر احتیاطاً ایک کرسی دروازے کے ہینڈل کے نیچے پھنسادی۔

سفر کی پانچویں صبح ناشتے کی میز پر کیپٹن گوئز نے اعلان کیا کہ وہ جہاز کی رفتار بڑھا رہا ہے تاکہ مقررہ شیڈول سے کئی گھنٹے پہلے ہم اسی شام نہر سوئز میں داخل ہو جائیں۔ جہاز پر ایک لاش کی موجودگی کے باعث یا پھر شاید کسی اور وجہ سے وہ کچھ مضطرب نظر آرہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جلد از جلد کسی بندرگاہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ شاید بندرگاہ پر وہ کچھ تحفظ محسوس کرتا تھا۔

اس وقت ہم بحیرۂ احمر کے وسط میں سفر کر رہے تھے۔ پیری کلاکر کو شکوہ تھا کہ دونوں طرف ساحل اتنی دور تھا کہ اسے پرندے دیکھنے کو نہیں مل رہے تھے۔ ویسے وہ شخص صحیح معنوں میں اپنے شوق کے ساتھ مخلص تھا۔ سب اپنے اپنے تفکرات میں الجھے ہوئے تھے لیکن اسے پرندوں کی پڑی ہوئی تھی۔

کیتھرین کافی تاخیر سے ناشتے کے لیے میس میں آئی اور اس نے ناشتا بھی صحیح طور پر نہیں کیا۔ وہ کچھ پریشان معلوم ہوتی تھی۔ میں نے پہلی بار اسے پریشان دیکھا تھا۔ اتنی پریشان میں نے اسے اس وقت بھی نہیں دیکھا تھا جب عبدل کی لاش دریافت کی گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ صحیح طور پر سو بھی نہیں سکی تھی۔

میں ناشتا کر چکا تھا اس لیے میں اٹھ کر جانے لگا تو وہ ایک لمحے کے لیے میرے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "ڈیک پر ذرا میرا انتظار کرنا' میں کافی پی کر آرہی ہوں۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" اس نے تقریباً سرگوشی کے سے انداز میں یہ بات کی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ڈیک پر آگیا۔

کچھ دیر کے بعد وہ بھی ڈیک پر آپہنچی۔ اس وقت وہ ٹریک سوٹ میں تھی۔ میں اسے اس ٹریک سوٹ میں اس سے پہلے روزانہ علی الصباح ڈیک پر جوگنگ کرتے دیکھ چکا تھا لیکن آج گویا وہ جوگنگ کو بھول گئی تھی۔

"کیا بات ہے.... کیوں اتنی پریشان نظر آرہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ذرا میرے کیبن میں چلو' میں تمہیں ایک چیز دکھانا چاہتی ہوں۔" اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر قدرے متوحش لہجے میں کہا۔ اس لمحے وہ مجھے ایسی لڑکی دکھائی دی جس کا واقعی منشیات کی اسمگلنگ وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے خیال آیا' کہیں کسی نے اس کی لاعلمی میں اسے منشیات لے جانے کے لیے تو استعمال نہیں کر لیا تھا۔ عین ممکن تھا' کسی نے اس کے سامان میں ہیروئن یا کوکین چھپا دی ہو۔ اسے علم نہ ہو اور اب اچانک اس نے اتفاقاً وہ چیز دریافت کر لی ہو اسی لیے خوفزدہ نظر آرہی ہو لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ میں خود اس کے سامان کی نہایت باریک بینی سے تلاشی لے چکا تھا۔ اگر مجھے کچھ نہیں ملا تھا تو اسے بھی ملنا مشکل ہی تھا۔

بہرحال میں خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیا۔ اپنے کیبن کا تالا کھول کر وہ سیدھی دیوار گیر بستر کے پاس پہنچی۔ اس نے بستر سے کمبل اور چادریں ہٹا دیں۔ نیچے فوم کا گدا تھا اور اس پر عنابی رنگ کا ایک بڑا سا خشک دھبا نظر آرہا تھا۔ مجھے فوری طور پر اندازہ ہو گیا کہ وہ خشک شدہ خون کا داغ تھا۔

"تمہیں یہ کب نظر آیا؟" میں نے پوچھا۔

"آج صبح۔" اس نے جواب دیا۔ "رات مجھے صحیح طور پر نیند نہیں آئی۔ میں کچھ زیادہ ہی کروٹیں بدلتی رہی۔ گدے سے چادر ہٹ گئی اور آج صبح میری اس داغ پر نظر پڑی۔ میرا خیال ہے' عبدل کو میرے کیبن میں قتل کیا گیا تھا۔"

"لگتا تو یہی ہے۔" میں نے اس کی تائید کی "تمہارے کیبن سے کوئی چیز غائب تو نہیں ہے؟"

"اگر غائب بھی ہوگی تو ابھی مجھے اس کا علم نہیں ہو سکا۔ میرا خیال ہے میں اپنے سامان کا جائزہ لے لوں۔"

وہ سامان کا جائزہ لینے لگی لیکن پھر یک دم ہی اسے نہ جانے کیا خیال آیا کہ ایک کرسی پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ سسکیوں کے درمیان وہ بولی۔ "میرے تو اس تصور سے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں کہ میں رات بھر اس بیڈ پر سوتی رہی جس پر ایک شخص کو ذبح کیا گیا تھا۔"

"جو ہو چکا' اب اس کے بارے میں سوچ سوچ کر رونا بیکار ہے۔" میں نے کچھ مشفقانہ سے انداز میں اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کی پریشانی کی وجہ محض یہ احساس نہیں تھا کہ وہ لاعلمی میں رات بھر اس بیڈ پر لیٹی رہی تھی جس پر کسی شخص کو ذبح کیا گیا تھا۔ بلکہ اس کی پریشانی کی وجہ کچھ اور بھی تھی' کوئی اور خیال بھی اسے ستا رہا تھا۔

"میرا خیال ہے' تم واقعی کسی مشکل میں ہو۔ تمہارے والد کا خیال صحیح تھا۔" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"مشکل....؟ ویسے تو کوئی مشکل نہیں ہے...." وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "بس مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں نے اس جہاز پر سوار ہو کر غلطی کی ہے۔ یہ کچھ عجیب.... پُراسرار سا جہاز ہے۔ معلوم نہیں اس پر کیا ہو رہا ہے۔"

"ویسے تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس ایک قتل ہو گیا ہے جس کے سلسلے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اگر کوئی اور پریشانی ہے تو بتاؤ۔"

"خدا نہ کرے کہ مجھے کوئی اور پریشانی ہو" وہ رونا بھول کر جلدی سے بولی۔

"میرا خیال ہے' کل تک سب لوگ پُرسکون ہو جائیں گے۔"

نے کہا۔ "کیپٹن گوئز بتا رہا تھا کہ آج رات ہم نہر سوئز سے گزر ں گے اور کل پُرسکون سمندر میں ہوں گے۔ سمندر پُرسکون ہو ماز بھی پُرسکون ہو جاتے ہیں۔"

میں مزید چند منٹ اسے تسلیاں دے کر باہر آگیا۔ اس روز گویا ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے کترا رہے تھے۔ ایسا معلوم تھا کہ عملے سمیت ہر شخص کو دوسرے پر قاتل ہونے کا شبہ تھا۔ مرین اور کلاکر دونوں اپنے اپنے کیبن تک محدود ہو کر رہ گئے حیرت تھی کہ اب تو کلاکر بھی پرندوں کا نظارہ کرنا بھول تھا۔ اس روز اس مقام پر بھی ماہی گیروں کی ایک لانچ مچھلی ت کرنے کے لیے جہاز کے قریب آئی لیکن اسے نہایت بے ی سے جواب دے دیا گیا۔

اس سے پہلے میں محسوس کر رہا تھا کہ میں جدھر بھی جاتا تھا' نساں نمید کی نظریں میرا تعاقب کرتی تھیں لیکن آج گویا وہ بھی ہر نظر رکھنا بھول گیا تھا۔ میں موقع مناسب دیکھ کر ڈیک کے نیچے لا گیا۔ بظاہر میں انجن روم کی طرف جا رہا تھا لیکن راستے میں' میں س حصے کی طرف مڑ گیا جس میں سامان لادا جاتا تھا۔ جہاز کے مانے کا بہت بڑا حصہ اسی مقصد کے لیے وقف تھا۔

جہازوں کے ان حصوں میں منوں کیا ٹنوں کے حساب سے بھی کوئی چیز اسمگل کی جا سکتی ہے۔ یہ جہاز گو کہ زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن اس میں بھی بہت گنجائش تھی۔ اس بڑے ہال نما حصے میں لکڑی کی بڑی بڑی مضبوط پیٹیاں بھری ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک پیٹی کو اپنی جگہ سے ہلانا شاید آٹھ دس آدمیوں کے بھی بس کی بات نہیں تھی۔ وہ بھاری مشینری ہی کی پیٹیاں معلوم ہوتی تھیں جنہیں لوہے کی پٹیوں کی مدد سے پیک کیا گیا تھا۔ ان پیٹیوں کو کھول کر دیکھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

تاہم میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ تیل کی کھدائی کے لیے استعمال ہونے والی مشینری افغانستان سے آرہی تھی جبکہ افغانستان میں میری معلومات کے مطابق تیل نہیں پایا جاتا تھا۔

میں ڈیک کی طرف واپس جا رہا تھا تو راستے میں مجھے کیپٹن گوئز مل گیا۔ میں اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ "تم نے بتایا تھا کہ تیل کی کھدائی کی مشینری افغانستان سے آئی ہے لیکن افغانستان میں تو تیل نہیں پایا جاتا۔"

"بے شک۔" کیپٹن نے تسلیم کیا۔ "اسی لیے تو انہیں اس مشینری کی ضرورت نہیں ہے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے انہوں نے کسی امید کے سہارے یہ مشینری خریدی ہوگی لیکن جنگ کے بھوسے اب تک وہاں صرف عوام کا تیل نکلا ہے۔ زمین سے کہیں تیل برآمد نہیں ہو سکا اور جس حساب سے اس سرزمین پر خون بہا ہے' مجھے اندیشہ ہے کہ اب وہاں کھدائی ہو تو کہیں زمین سے خون کے چشمے ہی نہ اُبل پڑیں۔ اب تو خیر ویسے ہی انہیں کھدائی کی فرصت نہیں۔ پورا ملک توپوں وغیرہ کے گولوں اور بموں سے کھدا پڑا ہے۔ اوپر سے معاشی حالت تباہ ہے چنانچہ انہوں نے یہ مشینری ترکی کے ہاتھ بیچ دی ہے جہاں تیل موجود ہے۔"

مزید چند منٹ اس سے بات چیت میں گزرے پھر میں اپنے کیبن کی طرف واپس آگیا اور آرام کرنے لگا۔ سفر کا اختتام قریب تھا اور ابھی تک میں کیتھرین کے مسئلے کے بارے میں کچھ نہیں جان سکا تھا تاہم میں کچھ اندازے قائم کرنے کی بساط بھر کوشش کر رہا تھا۔

دوسرے روز علی الصباح جہاز نہر سوئز سے نکل آیا اور کھلے سمندر میں داخل ہوا۔ میں اپنے کیبن سے نکل کر ریلنگ پر جا کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر میں یکے بعد دیگرے کیتھرین اور کلاکر بھی اپنے کیبنوں سے نکل آئے اور طلوع آفتاب کا نظارہ کرنے لگے۔ کیتھرین آج بھی جوگنگ نہیں کر رہی تھی تاہم اب اس کی طبیعت کچھ بہتر نظر آرہی تھی۔ کلاکر بھی شاید اس تصور سے کچھ مطمئن نظر آرہا تھا کہ وہ لوگ اپنی منزل کے قریب پہنچ رہے تھے۔ سفر ان کے طے شدہ شیڈول سے پہلے ہی ختم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

ناشتے کی میز پر کیپٹن گوئز نے اعلان کیا۔ "ہم لوگ آدھی رات کے قریب.... یعنی شیڈول سے بارہ گھنٹے پہلے بودرم پہنچ جائیں گے۔ اگر سمندر کا اتار چڑھاؤ ٹھیک ہوا تو ہمیں فوراً بر تھ مل جائے گی اور ہم علی الصباح وہاں سامان اتارنا شروع کر دیں گے۔ اس دوران میں عبدل کے قتل کے سلسلے میں حکام سے نمٹ لوں گا۔ میرا خیال ہے' وہ پوچھ گچھ تو سب سے کریں گے لیکن امید ہے ہم لیٹ ہوئے بغیر آگے روانہ ہو جائیں گے۔"

جب دوسرے لوگ ہماری طرف متوجہ نہیں تھے تو میں نے نیچی آواز میں کیپٹن سے پوچھا۔ "میرا کیا بنے گا؟ میرے پاس تو پاسپورٹ تک نہیں ہے۔ مجھے تو فوراً مشکوک سمجھ لیا جائے گا۔"

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس نے دوستانہ انداز میں مجھے تسلی دی۔ "میں نے تم سے اتنی رقم تمہیں اس قسم کی پریشانیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ہی لی ہے۔ تمہیں سامنے آنے کی ضرورت ہی نہیں۔ میں کسی سے ذکر ہی نہیں کروں گا کہ تم بھی جہاز پر موجود ہو۔ اتنے بڑے جہاز پر چھپے رہنا کوئی مشکل مسئلہ نہیں۔"

"اگر کسی نے میری موجودگی کی مخبری کر دی؟" میں نے پوچھا۔

"میرے کریو میں سے تو کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ باقی صرف دو مسافر رہ جاتے ہیں۔ انہیں پتا ہی نہیں چلے گا کہ تم سے پوچھ گچھ ہوئی ہے یا نہیں۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ جس عمل سے وہ گزرے ہیں' اسی سے تم بھی گزرے ہو۔" اس نے اطمینان دلایا۔ میں نے سوچا' وہ جہاز کا کیپٹن تھا۔ اگر وہ میرے بارے میں فکرمند نہیں تھا تو مجھے فکرمند ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے خود کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا۔

کیپٹن گوئز کا خیال تھا کہ کھلے سمندر میں آکر سفر زیادہ پُرسکون

گزرے گا لیکن اس کی یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ سمندر پُرسکون نہیں تھا۔ تلاطم کی وجہ سے دوپہر تک کیتھرین کی طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ اس نے دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا۔ اسے ایک آدھ قے ہوئی اور اس کے بعد بھی اُبکائیاں آتی رہیں۔ شام تک کلاکر کی رنگت بھی زرد نظر آنے لگی۔

مجھے اس دوران جنتر نظر آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہارا تجربہ کیا کہتا ہے' سمندر کب تک اس طرح رہے گا؟ بے چارے مسافروں کی حالت خراب ہو رہی ہے۔"

"تم تو بالکل ٹھیک نظر آرہے ہو۔" وہ میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں تو ذرا ڈھیٹ اور سخت جان واقع ہوا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "میری بات چھوڑو۔ میں تو کیتھرین اور کلاکر کی بات کر رہا ہوں۔"

"سورج غروب ہونے تک وہ بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہمارے حساب سے تو سمندر پُرسکون ہی ہے۔ یہ تلاطم تو کچھ بھی نہیں ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔

اس کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو ہوا کے تھپیڑے دھیمے پڑ گئے اور سمندر کو گویا قرار سا آنے لگا۔ ہلکی ہوا کے مدھم جھونکے گویا اسے تھپکیاں دے کر سُلانے لگے اور اس کے ساتھ ہی کیتھرین اور کلاکر کی طبیعت بھی سنبھلنے لگی۔ تنہائی کے خوف سے وہ اپنے کیبن میں بھی نہیں جا رہے تھے۔ مُبادا ان کی طبیعت خراب ہو اور کسی کو پتا بھی نہ چلے۔ اس لیے وہ ڈیک پر ہی موجود تھے تاکہ آتے جاتے لوگوں کی نظر میں رہیں اور مدد کی ضرورت ہو تو وہ آسانی سے کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں۔

کیتھرین کی حالت بہتر دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا لیکن ساتھ ہی ایک اور اضطراب سا لاحق ہو گیا۔ میں ریلنگ کے پاس کھڑا اُفق کی طرف دیکھ رہا تھا جب مجھے شبہ ہوا کہ میں نے کسی بڑے جنگی جہاز کا ہیولا اپنے جہاز کی طرف بڑھتے دیکھا ہے۔ میں اسے زیادہ واضح طور پر نہیں دیکھ سکا کیونکہ اس وقت تک سورج مکمل طور پر ڈوب چکا تھا اور اُفق پر بہت تیزی سے اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں اسی سمت میں دیکھتا رہا لیکن جب اندھیرا گہرا ہو گیا تب بھی مجھے کسی جہاز کی روشنیاں نظر نہ آئیں۔ بالآخر میں نے یہ سوچ کر اس کا خیال ذہن سے جھٹک دیا کہ شاید وہ جہاز کسی اور سمت میں سفر کر رہا ہو۔

رات کو دس بجے کے قریب میں جہاز کے فین ٹیل والے حصے میں کھڑا تھا کہ کیتھرین بھی ٹہلتی ہوئی ادھر آنکلی۔

"اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اسی لیے تو گھوم پھر رہی ہوں۔ یہ دھیمی خنک ہوا بہت بھلی لگ رہی ہے۔" اس نے سر اٹھا کر ایک گہری سانس لی اور بولی "سمندری سفر کے لیے مجھ میں زیادہ قوتِ

امریکہ رے امریکہ	طارق اسمٰعیل ساگر	-/150
صہونیت اور عالم اسلام	طارق اسمٰعیل ساگر	-/125
کورٹ مارشل	طارق اسمٰعیل ساگر	-/200
آخری گناہ کی مہلت	طارق اسمٰعیل ساگر	-/150

مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور 2

برداشت نہیں ہے۔"

"اس کے باوجود تم ٹرین یا ہوائی جہاز سے سفر کرنا پسند نہیں کرتیں۔ ویسے تم انڈیا اور بنگلہ دیش وغیرہ کیسے گئی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے ہوائی جہاز سے سفر کیا تھا۔" اس نے قدرے شرمیلے سے انداز میں اقرار کیا۔ "لیکن یہ حقیقت ہے کہ مجھے ہوائی سفر اچھا نہیں لگتا۔ صرف مجبوری میں کرتی ہوں۔ پھر یہ ملاقات جنتر سے ہوئی۔ اس نے اپنے جہاز کا ذکر کیا اور میں نے محسوس کیا کہ میرے سفر کے لیے یہ ٹھیک رہے گا۔"

"جنتر سے تمہاری ملاقات کہاں ہوئی تھی؟" میں نے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"بمبئی کے قریب واقع ایک ریسرچ لیبارٹری میں۔" اس نے جواب دیا۔ "بعض شعبوں میں انڈین سائنس داں بڑا زبردست کام کر رہے ہیں۔"

"تم کس سلسلے میں ان کا کام دیکھنے چلی گئی تھیں؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں بڑھتی ہوئی آبادی کے موضوع پر جو تحقیقی کام کر رہا ہوں اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ برتھ کنٹرول کی دوائیں بھی اسی سلسلے کا ایک موضوع ہیں۔ انڈین سائنس داں اس میدان میں بڑی محنت کر رہے ہیں۔ میں ذرا ان کے کام کا جائزہ لینے گئی تھی۔" اس نے اطمینان سے بتایا۔

"ریسرچ لیبارٹریز کے کام تو عام طور پر خاصے خفیہ قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ ہر ایرے غیرے کو تو اپنے ہاں نہیں گھسنے دیتے۔" میں نے کہا۔

"میں کوئی ایرا غیرا تو نہیں ہوں۔" وہ گویا بُرا مناتے ہوئے بولی۔ "میرے پاس ایک بین الاقوامی ادارے کا تعارفی خط ہے اور میں اسی ادارے کے لیے کام کر رہی ہوں۔ دنیا میں جہاں بھی کام ہو رہا ہو گا' وہاں مجھے خوش آمدید کہا جائے گا اور جہاں تک بھی اس ادارے کے... یا ان کے ملک کے قوانین اجازت دیں گے وہ

ی ہر ممکن مدد کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"بہت خوب۔" میں نے سر ہلایا۔ "لیکن جنتر وہاں کیا رہا تھا؟ کیا وہ بھی کوئی ریسرچ اسکالر ہے؟ وقت گزاری کے لیے جہاز پر ملازمت کر رہا ہے؟"

"یہ تو میں نے اس سے نہیں پوچھا۔" اس نے گویا میرے تمسخرانہ لہجے پر دھیان دیے بغیر سنجیدگی سے جواب دیا۔ "مجھے اس وقت..... بلکہ ابھی تک خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اب تم نے بات کی ہے تو خیال آیا ہے....."

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا کیونکہ میں جہاز کے برج کی طرف دیکھنے لگا تھا جس پر مجھے دو تین افراد کے دوڑنے کی آواز سنائی دی تھی۔ دفعتاً ہمارے جہاز سے تقریباً ایک میل آگے یکے بعد دیگرے دو چیزیں دھماکے سے پھٹیں اور ایک دو سیکنڈ کے لیے سمندر کا بہت بڑا حصہ روشنی میں نہا گیا۔ پھر وہ روشنی معدوم ہو گئی۔

"یہ کیا تھا؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

کیپٹن گونزر پائلٹ ہاؤس سے باہر آیا اور برج سے جھانکتے ہوئے بولا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ترکی کے ایک جنگی جہاز نے ہمیں خبردار کرنے کے لیے دو فائر کیے ہیں۔ کچھ لوگ جہاز پر آرہے ہیں۔" پھر اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "مسٹر خان! تم ذرا اوپر آجاؤ۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"یہ آدھی رات کو ہمارے جہاز پر کون لوگ آرہے ہیں؟" کیتھرین خوفزدہ سے لہجے میں بولی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"مجھے خود نہیں معلوم۔" میں نے جواب دیا۔ "میں ذرا کیپٹن گونزر کی بات سن کر آتا ہوں۔"

وہ میرا بازو تھامتے ہوئے بولی۔ "مت جاؤ۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" میں اس کی سہمی ہوئی سانسوں کی حرارت اپنے سینے پر محسوس کر سکتا تھا۔ میرا گریبان کھلا تھا۔

"تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی آیا۔ تم یہیں ٹھہرو۔ اگر مجھے دیر لگی تو میں تمہیں بھی وہیں بلا لوں گا۔" میں نے اس کے گداز کندھے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

میں دوڑتا ہوا پائلٹ ہاؤس میں پہنچا۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ کیپٹن گونزر کچھ ایسا پریشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں میں حسب معمول موٹا سا سگار دبا ہوا تھا۔

وہ اندرونی کیبن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہاں تین چار یونیفارم لٹکے ہوئے ہیں۔ ان میں سے جو تمہیں اپنے لیے مناسب نظر آئے وہ پہن لو۔ اب تم اس جہاز کے سی مین ہو۔ اب تم جس سے بھی بات کرو گے اسی حیثیت سے کرو گے۔"

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرنے میں تاخیر نہیں کی اور اندر جا کر انتہائی پھرتی سے یونیفارم اور دوسرے جوتے پہن کر ایک بحری سرپر جماتے ہوئے میں واپس کیتھرین کی طرف جانے لگا۔

تو کیپٹن بولا "میں کوشش کروں گا کہ کوئی تمہاری طرف متوجہ نہ ہو اور تم سے زیادہ پوچھ گچھ نہ کی جائے۔ تم خود بھی کوشش کرنا کہ بلا ضرورت کسی کی نظر میں نہ آؤ۔"

"اوکے کیپٹن!" میں نے اسے سیلوٹ کیا اور پائلٹ روم سے نکل آیا۔ اس وقت تک جہاز کی سرچ لائٹس روشن کی جا چکی تھیں۔ میں نے دیکھا' مڑ کی دو کشتیاں جہاز کے اسٹار بورڈ کی طرف چلی آرہی تھیں۔

کیتھرین مجھے یونیفارم میں دیکھ کر حیرانی سے بولی۔ "یہ اتنی سی دیر میں تمہاری کایا کیسے پلٹ گئی؟"

"دراصل میں کریو کا ہی آدمی ہوں....." میں نے ذرا شرمیلے سے لہجے میں کہا۔ "لیکن میں چھٹی پر تھا اس لیے عام مسافر کی حیثیت سے ہی سفر کر رہا تھا۔ اب چونکہ کچھ ایمرجنسی نظر آرہی ہے اس لیے کیپٹن نے کہا کہ چھٹی وغیرہ کو بھول جاؤ اور فوراً اپنی ڈیوٹی سنبھال لو۔ برائے مہربانی تم بھی اب مجھے سی مین ہی سمجھنا۔ بھول جانا کہ میں مسافر کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا۔"

اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس نے میری بات کا یقین تو نہیں کیا تھا لیکن امید نظر آرہی تھی کہ وہ میرا ساتھ دے گی اور بھانڈا نہیں پھوڑے گی۔ شاید اس میں اسے اپنا بھی کچھ بھلا نظر آرہا ہو۔

پلاسٹک کی جو دو کشتیاں جہاز کی طرف چلی آرہی تھیں' ان میں چھ چھ سیاہ پوش سے افراد موجود تھے۔ دفعتاً ایک طرف سے افغان خانساماں نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں رائفل تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اسے کیپٹن یا کسی اور نے کوئی قدم اٹھانے کا حکم نہیں دیا تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ اپنے طور پر ہی کوئی کارنامہ دکھانے پر تُلا ہوا تھا۔

اس نے رائفل کندھے سے لگائی اور فائر کرنے ہی والا تھا کہ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی نال کا رخ اوپر کی طرف کر دیا۔ غنیمت رہا کہ اس نے ٹریگر دبایا نہیں ورنہ شاید ہوائی فائر کی

صحرا کا چاند	اے حمید	-/80
پہلی محبت کے آنسو	اے حمید	-/250
اداس جنگل کی خوشبو	اے حمید	-/100
چاند چہرے	اے حمید	-/200

مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور 2

آواز سن کر بھی آنے والے لوگ یہی سمجھتے کہ ان پر حملہ کر دیا گیا ہے۔

خانساماں فہمید برہمی کے عالم میں میری طرف گھوما لیکن عین اسی لمحے پیری کلاکر روشنی میں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں بھاری مشین پسٹل تھا جس کا رخ فہمید کی طرف تھا۔

"گن پھینک دو۔" اس نے فہمید کو حکم دیا۔ "جہاز اس وقت ٹرکش نیوی اور ڈرگ انفورس منٹ ایجنسی کے گھیرے میں ہے۔"

پھر میں نے دیکھا' دھڑا دھڑ بہت سے لوگ جہاز پر چڑھے آرہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔

خانساماں فہمید اب بھی رائفل پھینکنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ کچھ جنونی اور خردماغ سا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی رائفل کی نال ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے ایک موہوم سے اندیشے کے تحت رائفل چھوڑی نہیں تھی۔ اس شخص کا کچھ بھروسا نہیں تھا کہ کوئی ایسی حماقت کر گزرتا جو سب کے لیے مصیبت بن جاتی۔

اس گدھے نے مجھ سے زور آزمائی کی کوشش کی اور ایک جھٹکا دے کر رائفل کی نال میری گرفت سے نکال لینا چاہی۔ میں نے محسوس کیا' اب موقع تھا کہ اسے اپنے زورِ بازو کی ایک آدھ جھلک دکھادی جاتی۔ اس کے جھٹکا دینے سے تو رائفل کی نال میرے ہاتھ سے نہ نکل سکی لیکن میں نے اسی طرح نال پکڑے پکڑے اسے ایک جھٹکا دیا تو وہ دور جا گرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے میرے ہاتھ میں آگئی اور اس کا سر ڈیک کے جنگلے سے جا ٹکرایا۔ اگر جنگلا نہ ہوتا تو شاید وہ پھسلتا ہوا سیدھا سمندر میں جا گرتا۔ اس کی اکڑفوں کافی حد تک نکل گئی اور وہ وہیں پڑا رہ گیا۔ میں نے رائفل ایک محفوظ کونے میں پھینک دی۔

پیری کلاکر کو میری یہ حرکت یقیناً پسند آئی تھی۔ اس نے میری کمر پر ہلکی سی تھپکی دی۔ میں نے فہمید سے رائفل چھین کر گویا کلاکر سے تعاون کیا تھا۔ کلاکر کی شخصیت میں تبدیلی نے خود مجھے حیران کر دیا تھا۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ جہاز ٹرکش نیوی اور ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی کے گھیرے میں تھا لیکن خود پیری کلاکر کون تھا؟

مجھے اس سے یہ پوچھنے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ اس دوران گہرے رنگ کے لباسوں میں بہت سے مسلح افراد جہاز پر چڑھ آئے تھے۔ وہ نہایت پھرتی سے جہاز کے مختلف حصوں میں اس طرح بکھر گئے کہ جہاز کے ایک ایک کونے پر نظر رکھی جاسکے۔ وہ اپنے کام میں بہت ماہر معلوم ہوتے تھے تاہم ان کا رویہ جارحانہ نہیں تھا۔ انہوں نے کسی شخص پر بندوق نہیں تانی تھی۔ فی الحال انہیں گویا عملے وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں جہاز کی تلاشی لینے سے زیادہ دلچسپی تھی۔

منحوس

الماس ایم اے قیمت:-/150

سلطان نورالدین زنگی

الماس ایم اے قیمت:-/250

میں نے ایک دراز قد سفید فام کو ایک خطرناک گن اٹھا ڈیک پر آتے دیکھا۔ یہ گن "ایم اے سی ٹین" یا "میک ٹین" کہلاتی تھی اور کسی زمانے میں امریکی فوجیوں کے استعمال میں رہی تھی۔ وہ شخص بھی امریکی ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بہ آواز بلند اعلان کیا "میرا نام میک نیل ہے اور میں امریکی ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں چھاپے کی اس مہم کا نگراں ہوں۔ ہمیں صرف جہاز کی تلاشی سے دلچسپی ہے۔ اگر کچھ برآمد ہوا تو کسی کو کوئی تکلیف نہیں دی جائے گی۔ زحمت کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔"

کیپٹن گوئز نے نرم سے لہجے میں احتجاج کیا "تم لوگ کم از کم ہمارے بندرگاہ پر پہنچنے کا انتظار تو کرسکتے تھے خواہ اس دوران ہمارے جہاز کو حراست میں لے کر ساتھ ساتھ سفر کرتے۔"

"ہم پچھلے ماہ ایک چوٹ کھا چکے ہیں" میک نیل نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ایک جہاز کو ہم نے حراست میں لیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ بندرگاہ تک گئے تھے لیکن اس کا عملہ ہمیں چکما دے گیا۔ راستے میں آنکھ بچا کر اس نے اپنا مال سمندر میں کہیں پھینک دیا۔"

"ہمارے جہاز پر تیل کی کھدائی کے سلسلے میں استعمال ہونے والی مشینری کے سوا کچھ نہیں ہے" کیپٹن گوئز نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

میک نیل نے اپنی گن بے پروائی سے بغل میں دبالی۔ شاید اس نے دیکھ لیا تھا کہ جہاز پر کوئی ان سے الجھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ صرف خانساماں فہمید نے تھوڑی سی تیزی دکھائی تھی اور اس میں نے ہی لتاڑا تھا اور میرے جسم پر حملے کی وردی تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جہاز کا عملہ مزاحمت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میک نیل اپنے آدمیوں کو مختلف احکامات دینے کے بعد پیری کلاکر کی طرف مڑا اور بولا "تم نے کیا دریافت کیا؟"

"کچھ بھی نہیں" پیری کلاکر نے قدرے مایوسی سے جواب دیا۔ البتہ دو دن پہلے ان کے عملے کے ایک آدمی کی گردن کاٹ دی گئی تھی۔ کیپٹن نے ابھی تک کہیں اس واقعے کی رپورٹ درج نہیں کرائی۔"

"وقوعے کے وقت ہم لوگ بین الاقوامی سمندری حدود میں تھے۔" کیپٹن گوئز فوراً پُراحتجاج سے لہجے میں بولا "میں کسی بندرگاہ پر پہنچنے کا انتظار کر رہا تھا۔ بندرگاہ پر پہنچتے ہی میں اس واقعے کی رپورٹ کرتا۔"

میک نیل نے قتل کا تذکرہ سن کر کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ لگتا تھا کہ اسے اپنے مشن کے علاوہ کسی بات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کیپٹن گوئز سے مخاطب ہوا "ہم خاص طور پر جہاز کے اس حصے کی تلاشی لینا چاہتے ہیں جہاں لنگر کی زنجیریں رکھی جاتی ہیں۔ پچھلے دنوں ہمیں ایک جہاز کے اس حصے میں سے مارفیا کی تیاری میں استعمال ہونے والا بنیادی کیمیکل دو ٹن کی مقدار میں ملا تھا۔"

"تم جس حصے کی چاہو تلاشی لے لو۔ تمہیں اس جہاز پر کچھ نہیں ملے گا۔" کیپٹن گوئز ناگواری سے بولا۔

میک نیل اور پیری کلاکر ایک طرف کو چلے گئے۔ شاید وہ تخلیے میں کوئی بات کرنا چاہتے تھے۔ چند لمحے بعد ہی وہ واپس آگئے۔ تب میں میک نیل سے مخاطب ہوئے بغیر نہ رہ سکا "یہ امریکیوں کو ترکی کی سمندری حدود میں چھاپے وغیرہ مارنے کا اختیار کب سے مل گیا ہے؟"

میک نیل نے جواب دینے سے پہلے میرا سرتاپا جائزہ لیا۔ شاید اسے عملے کے کسی آدمی سے اس قسم کے سوال کی توقع نہیں تھی۔ عملے کو تو شاید یہ سوال کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ان لوگوں کو یقیناً اس کا پس منظر معلوم ہوگا۔

تاہم میک نیل بڑے تحمل سے بولا "ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی' امریکی ادارہ ہے لیکن پچھلے ایک سال سے منشیات کی اسمگلنگ روکنے کی غرض سے ٹرکش پولیس کے ساتھ مل کر کام کر رہا ہے۔ ہم یورپ اور امریکا کی طرف منشیات کی اسمگلنگ کے دو بڑے روٹ بند کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سمندری روٹ پر کئی بار ہم نے بہت بڑی مقدار میں منشیات پکڑی ہیں۔ منشیات کی سب سے زیادہ اسمگلنگ اس وقت سمندری راستوں سے۔ اور خصوصاً بحری جہازوں سے ہو رہی ہے۔"

پھر جیسے اسے کوئی خیال آیا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر بغور مجھے دیکھا اور بولا "اگر تم واقعی عملے کے آدمی ہو تو تمہیں یہ باتیں معلوم ہونی چاہئیں۔ سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟" اس کا ہاتھ اپنی گن پر تھا۔

مجھے جواب دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ پیری کلاکر اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے خوش گوار لہجے میں بولا "یہ کوئی پاکستانی ہے۔ بغیر کاغذات سفر کر رہا ہے لیکن اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے پاس کوئی سامان نہیں ہے۔ شاید پاکستان میں کوئی چھوٹی موٹی حرکت کر کے بھاگا ہے لیکن ہمارے نقطۂ نظر سے مشکوک نہیں ہے۔ البتہ کیپٹن نے شاید اس بے چارے کو ہمارے شک و شبے سے بچانے کے لیے وردی پہنادی ہے۔"

اس نے گویا میرے بارے میں اپنے باس کو مختصر لیکن مکمل رپورٹ دے دی تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے اپنے آپ پر اور کیپٹن گوئز پر ترس آیا۔ بے چارے نے خواہ مخواہ ہی مجھے یونیفارم پہنانے کا تردد کیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ چھاپا مارنے والوں کا ایک ایجنٹ تو ہمارے ساتھ ہی سفر کر رہا تھا اور بظاہر بڑی معصومیت سے پرندوں کا شوقین' ایک بے ضرر سا سیاح بنا ہوا تھا۔

میک نیل نے بھی میرے بغیر کاغذات ہونے کو گویا قطعاً اہمیت نہ دی۔ یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس کا مسئلہ شاید صرف منشیات تلاش کرنا تھا۔ اس کے سوا وہ کسی معاملے میں ٹانگ اڑانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سرہلاتے ہوئے تفہیمی انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا "شاید تم نوکری کی تلاش میں یورپ وغیرہ کی طرف نکل رہے ہو؟"

"نہیں۔ میں تو ڈرگ مافیا کا آدمی ہوں" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

میک نیل اور پیری کلاکر دونوں خوش دلی سے ہنسے۔ کلاکر بولا "ڈرگ مافیا کے آدمی بغیر کاغذات کے سفر نہیں کرتے۔ دو چار پاسپورٹ اور دس بیس ویزے تو ان کی جیبوں میں فالتو پڑے رہتے ہیں۔" پھر وہ میک نیل کو بتانے لگا "یہ نوکری کی تلاش میں نہیں جا رہا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ چھوٹا موٹا بزنس مین ہے..... اور میرا خیال ہے سچ ہی کہہ رہا تھا۔"

میک نیل نے بے پروائی سے کندھے اچکائے گویا کہہ رہا ہو "ہمیں ان باتوں سے کوئی غرض نہیں۔"

وہ تلاشی کے کام کی نگرانی کرنے لگا۔ وہ تقریباً چالیس کی عمر کا آدمی تھا اور لگتا تھا اس کی عمر انہی کاموں میں گزری تھی۔ وہ سبھی لوگ تلاشی کے کام میں بہت ماہر معلوم ہوتے تھے۔ اس کے باوجود اس کام میں بہت دیر لگ گئی۔ آخر کار وہ بحری جہاز تھا۔ خواہ چھوٹا ہی تھا لیکن اس کی ہر چیز کو چیک کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کام میں صبح کے چار بج گئے۔ ہمارے کیبنوں کی بھی تلاشی لی گئی۔ ایک بات البتہ مجھے کچھ حیرت انگیز لگی کہ میک نیل یا اس کے کسی آدمی نے کیبنوں سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ کیبنوں کی تلاشی بھی وہ یہ جانے اور پوچھے بغیر لیتے چلے گئے تھے کہ کون سا کیبن کس کا تھا؟ شاید کلاکر انہیں بہت کچھ بتا چکا تھا۔

بالآخر وہ لوگ مایوس ہوگئے اور تلاشی کا کام بند کردیا گیا۔ کیپٹن گونزا ایک بار پھر ڈیک پر آکھڑا ہوا اور سگار سلگاتے ہوئے بولا "میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرے جہاز پر کچھ نہیں ہے لیکن تم لوگوں نے میری بات کا یقین نہیں کیا اور خواہ مخواہ اتنا وقت ضائع کیا۔ اس بار شاید کسی نے غلط مخبری کردی ہے۔"

"کچھ نہیں ملا تم لوگوں کو؟" میں نے نیچی آواز میں میک نیل سے پوچھا جو اس وقت ایک ہاتھ میں گن اور ایک میں سلگتی سگریٹ لیے کھڑا تھا۔

"نہیں۔" اس نے فراخ دلی سے اعتراف کیا پھر دوستانہ لہجے میں بولا "میں نے تو مشینری کا بھی ہر کریٹ کھلوا کر دیکھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر منشیات نہیں تو شاید افغانستان سے روسی اسلحہ ہی جارہا ہو لیکن جہاز میں واقعی کچھ نہیں ہے" وہ گویا کسی سے بھی کوئی بات چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کررہا تھا۔ اس کے ساتھ ٹرکش نیوی کے جو آدمی تھے وہ ان تمام چیزوں کو پہلے جیسی حالت میں لانے کی کوشش کررہے تھے جنہیں انہوں نے کھول ڈالا تھا۔ امریکی ان کی مدد کررہے تھے لیکن جہاز کا عملہ ایک طرف کھڑا تھا۔ وہ لوگ خود اپنے سامان کو ہاتھ نہیں لگا رہے تھے۔ ان سب کے چہروں پر ناگواری تھی اور وہ گویا بہ زبان خاموشی کہہ رہے تھے "تم لوگوں نے ہی ہر چیز کھولی ہے' اب خود ہی بند کرو۔"

اسی چکر میں سپیدۂ سحر نمودار ہوگیا۔ اچھا خاصا اُجالا پھیل چکا تو دور سے ایک لانچ جہازوں کی طرف آتی دکھائی دی۔ اس پر ترکی کا پرچم لہرا رہا تھا۔ وہ قریب آئی تو اندازہ ہوا کہ وہ ٹرکش کوسٹ گارڈ کی لانچ تھی لیکن اس سے بھی ایک ادھیڑ عمر سفید فام شخص اتر کر ربر کی کشتی میں سوار ہوا اور ہمارے جہاز کی طرف آنے لگا۔

کیتھرین اس وقت میرے قریب ہی ڈیک پر کھڑی تھی۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور شکست خوردہ سے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "یہ میرے پاپا ہیں۔ انہیں ہر بات کی خبر ہوجاتی ہے۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ کہیں اس جہاز پر چھاپا بھی انہوں نے ہی نہ ڈلوایا ہو۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے سُدھارنے کے لیے" وہ تلخی سے بولی "معلوم نہیں کیوں انہیں وہم ہوگیا ہے کہ میں ڈرگز کے دھندے میں ملوث ہوں۔ یہ وہم تو اپنی جگہ ہے۔ ویسے بھی وہ مجھے اپنی مرضی کی زندگی گزارتے دیکھ ہی نہیں سکتے۔ انہیں اپنی روایات اور نیک نامی اتنی عزیز ہے کہ میری اصلاح کی خاطر وہ مجھے جیل بھجوانے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔"

ادھیڑ عمر چارلس جہاز پر آگیا۔ اس نے سب سے پہلے میک نیل کو تلاش کرکے اسے ایک خط دیا۔ وہ کوئی سرکاری خط معلوم ہوتا تھا کیونکہ اسے پڑھتے ہی میک نیل کے رویے میں اس کے لیے بے حد احترام آگیا۔ وہ خود اسے ساتھ لیے اوپر کیتھرین کے پاس آیا اور گردن کو خم دیتے ہوئے بولا "اپنی بیٹی سے پوچھ لیجیے۔ ہم نے انہیں کوئی زحمت نہیں ہونے دی۔ اور اگر آپ پہلے آجاتے تو ہم ان کے سامان کی تلاشی بھی نہ لیتے۔"

"بہت خوب!" میں نے دل ہی دل میں سوچا "ایسی لڑکی واقعی ڈرگ مافیا کے لیے بے حد کارآمد ثابت ہوسکتی تھی جس کے باپ کا دوسرے ملکوں میں بھی اتنا اثر و رسوخ تھا۔ منشیات کی روک تھام کے سلسلے میں امریکا کی پالیسی نہایت سخت تھی اس کے باوجود وہیں کے ڈرگ انفورسمنٹ کے ادارے کا نمائندہ اس سے کہہ رہا تھا کہ اگر وہ پہلے آن پہنچتا تو اس کی بیٹی کے سامان کی تلاشی بھی نہ لی جاتی۔ کیتھرین تو اپنے باپ کے اس اثر و رسوخ سے بہت فائدہ اٹھا سکتی تھی لیکن لگتا یہی تھا کہ فی الحال کیتھرین کو اس اثر و رسوخ کی ضرورت نہیں تھی یا پھر باپ بیٹی کے درمیان جذباتی تعلق اتنی وسیع تھی کہ وہ باپ کا کسی قسم کا احسان نہیں لینا چاہتی تھی اور الٹا اس کی طرف سے غلط فہمیوں میں مبتلا تھی۔

چارلس بے تابی سے کیتھرین کی طرف بڑھا لیکن کیتھرین نے منہ پھیر لیا۔ چارلس نے اسے گلے لگانا چاہا تو اس نے چارلس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ حیرانی اور رنجیدگی سے بولا "یہ تم کیا کررہی ہو کیتھی! میں تو تمہاری خاطر استنبول سے بھاگا بھاگا آیا ہوں۔ مجھے پتا چلا تھا کہ اس جہاز کو راستے میں روک لیا گیا ہے۔ میں نے آدھی رات کو گورنر کو اٹھا کر اس سے سفارشی خط لیا اور یہاں بھی ریڈیو پر پیغام بھجوایا کہ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دی جائے۔ اور تم الٹا مجھ سے ناراض ہورہی ہو۔"

"آپ کو اس تردد کی کیا ضرورت تھی؟" کیتھرین بدستور تلخی سے بولی "مجھے ویسے بھی یہاں کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتا تھا۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا لیکن میرا خیال ہے آپ کے دل کو اطمینان نہیں ہورہا ہوگا۔ یہ چھاپا یقیناً آپ نے ہی ڈلوایا ہوگا۔"

"احمقوں والی باتیں نہ کرو۔" چارلس تیزی سے بولا "میں نے اس جہاز کو تمہاری وجہ سے چھاپے سے بچانے کی کوشش کرتا لیکن امریکی سفارت خانے کا دباؤ بہت زیادہ تھا بلکہ میں اپنی کوششوں کی وجہ سے ان کی نظر میں بھی مشکوک ہورہا تھا۔ میں اپنی نیک نامی داؤ پر لگا رہا تھا۔ اس کا تم مجھے یہ صلہ دے رہی ہو!"

"آپ کی خاندانی ساکھ... عزت... نیک نامی... میں بھی آگئی ہوں یہ الفاظ سنتے سنتے" کیتھرین پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی "آپ نے میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے تاکہ آپ کی نیک نامی پر کوئی حرف نہ آئے؟ آپ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ مجھے آزادی کی زندگی کیوں نہیں گزارنے دیتے؟"

"خدا کی پناہ کیتھی!" چارلس کی آنکھیں پھیل گئیں "اٹھائیس سال کی عمر کے بعد سے تم شاید کبھی پورا ایک ہفتہ بھی گھر نہیں رہیں۔ جہاں تمہارا دل چاہتا ہے پھرتی ہو۔ جس سے چاہتی ہو دوستی کرتی ہو' جسے چاہتی ہو چھوڑ دیتی ہو۔ جس کام کو دل چاہتا ہے

وہ کرتی ہو۔ اس سے زیادہ کیا آزادی چاہتی ہو تم...؟"

"میں چاہتی ہوں آپ میرا پیچھا چھوڑ دیں" کیتھرین بلا تامل بولی "میری عمر کی اولادوں کے بارے میں والدین کو علم بھی نہیں ہوتا کہ وہ کہاں ہیں' کس حال میں ہیں لیکن آپ ہیں کہ میرے بارے میں پل پل کی خبر رکھتے ہیں۔ دنیا کے ہر حصے میں لوگوں کو فون کرکرکے کہتے رہتے ہیں کہ کیتھرین کا خیال رکھنا۔ لوگوں کو سائے کی طرح میرے پیچھے لگا دیتے ہیں۔"

چارلس کے چہرے پر اذیت کے آثار ابھر آئے۔ شاید اب اسے کچھ کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ میں بھی اپنی جگہ دم بہ خود کھڑا تھا۔ مشرق اور مغرب میں واقعی بہت فرق تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ مغربی معاشرے نے اپنی اولاد' اپنی عورت کو اس کی من چاہی آزادی دے کر کیا پایا تھا؟ یہ ایک اندھا بھی دیکھ سکتا تھا۔ اس کے باوجود ہمارے ہاں کچھ لوگ ان کی اس آزادی پر رشک کرتے ہیں اور ان کی تقلید کی کوشش کرتے ہیں۔

آخر چارلس شکست خوردہ سے لہجے میں بولا "ٹھیک ہے... صرف اس بار تم میرے ساتھ چلو۔ ہم بیٹھ کر آخری مرتبہ تفصیل سے بات کریں گے۔ اس کے بعد تم جس طرح چاہو زندگی گزارنا۔ جس ڈگر پر چاہے چلنا۔ میں قطعاً کوئی روک ٹوک نہیں کروں گا۔ اگر تم یہی چاہو گی کہ میں تم سے کوئی تعلق نہ رکھوں' تمہاری بالکل کوئی خیر خبر نہ لوں تو میں ایسا ہی کروں گا۔ میں تمہاری طرف سے صبر کرلوں گا۔ میری طرف سے تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ فی الحال تم میرے ساتھ چلو۔"

کیتھرین نے گویا بادل ناخواستہ اس کی التجا قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ سامان لینے اپنے کیبن میں چلی گئی۔ کیپٹن گونزا نے عملے کے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ کیتھرین کے پیچھے پیچھے کیبن میں چلا گیا۔ ادھر نیوی کے جنگی جہاز کے قریب کوسٹ گارڈ کی لانچ چارلس کے انتظار میں ادھر اُدھر ہلکورے لے رہی تھی۔

چند منٹ بعد کیتھرین کیبن سے برآمد ہوئی۔ عملے کا آدمی سامان اٹھائے اس کے پیچھے تھا۔ اسی دوران میں نے جہاز کے فرسٹ میٹ جنتر کو بالائی عرشے سے نیچے آتے دیکھا۔ وہ غالباً کیتھرین سے الوداعی ملاقات کے لیے آرہا تھا۔ کیتھرین اسے دیکھ کر رُک گئی اور وہ قریب آیا تو مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی "خدا حافظ جنتر! میں پاپا کے ساتھ جارہی ہوں۔ مجھے افسوس ہے میں تمہارے..."

وہ نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی۔ اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ جنتر نے اس کا مصافحے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ پکڑ کر اچانک اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ مجھ سمیت شاید کسی کو بھی اس سے اس حرکت کی اور اتنی پھرتی دکھانے کی توقع نہیں تھی۔ اس نے یکدم ہی کیتھرین کو ایک بازو کے حلقے میں جکڑ لیا تھا اور اسے اپنی ڈھال بنا لیا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں نہ جانے کہاں سے ایک نہایت چمکیلے پھل والا چاقو آگیا تھا جسے اس نے کیتھرین کے مرمریں گلے پر ٹکا دیا تھا۔ چاقو کی دھار کو محض دیکھنے پر ہی اندازہ ہورہا تھا کہ اگر کیتھرین نے ذرا بھی ہلنے جلنے کی کوشش کی تو اس کا مرمریں گلا کٹ جائے گا۔

"کوئی مجھے روکنے کی کوشش نہ کرے ورنہ یہ لڑکی ماری جائے گی" جنتر چیخا پھر اس نے میک نیل کے ساتھ آئے ہوئے ٹرکش نیوی کے کمانڈر کو مخاطب کیا "کوسٹ گارڈ کی لانچ پر جو دو آدمی موجود ہیں انہیں بھی یہیں بلوا لو۔ وہ لانچ میں لے جاؤں گا۔ لڑکی میرے ساتھ جائے گی۔"

میک نیل بھی دم بخود رہ گیا تھا۔ اس کی گن بغل میں دبی ہوئی تھی۔ تاہم اس نے عقلمندی کا مظاہرہ کیا کہ اسے بغل سے نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ جنتر کی نظر انہی لوگوں پر تھی جن کے پاس اسلحہ نظر آرہا تھا۔ وہ خود ایک محفوظ گوشے میں تھا اور کیتھرین کو ڈھال بنا کر اور بھی زیادہ محفوظ ہوگیا تھا۔ سب کے ہتھیار بیکار ہوکر رہ گئے تھے کیونکہ کیتھرین کی زندگی کو شدید خطرہ تھا۔

"احمق مت بنو... تم لانچ لے کر نہیں جاسکو گے" میک نیل نے ہونٹوں کے گوشے سے سگریٹ نکالے بغیر تحمل سے کہا "لڑکی کو چھوڑ دو۔"

"میں لڑکی کو بھی لے جاؤں گا... اس کے سامان کو بھی... اور لانچ کو بھی..." جنتر وحشت کے عالم میں بولا "کوئی میرا راستہ روکنے کی کوشش نہ کرے" اس پر کچھ خفیف سا جنون طاری تھا۔ مجھے وہ اب تک ایک بے ضرر سا آدمی لگا تھا لیکن یکدم ہی اس میں گویا کوئی شیطانی روح حلول کرگئی تھی۔

صرف میں جہاں کھڑا تھا وہاں سے زاویہ کچھ ایسا تھا کہ میں جنتر کی کنپٹی کا نشانہ لے سکتا تھا اور اس کی متحرک و مضطرب نظر میری طرف زیادہ گھومی بھی نہیں تھی۔ اسے یقیناً یہ اطمینان تھا

رومانی ناول

لڑکی اس گلی کی	اسلم راہی ایم-اے	-/100
اس جلتے جہاں میں	اسلم راہی ایم-اے	-/100
خدا کہاں ہے	اسلم راہی ایم-اے	-/75
جلتے بجھتے لوگ	اسلم راہی ایم-اے	-/75
سمیرا	اسلم راہی ایم-اے	-/75
روتے کنول	اسلم راہی ایم-اے	-/75

کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میرا ہاتھ نہایت آہستگی سے رینگتا ہوا بش کوٹ کے نیچے جارہا تھا۔ "واشنہ آید بکار" والا محاورہ اس وقت مجھے بہت ہی درست محسوس ہورہا تھا۔ سائیلنسر لگا وہ ریوالور جو آصف بھٹی سے جھڑپ میں میرے ہاتھ لگا تھا اور جسے وہ بعد میں واپس لینا بھول گیا تھا' اس وقت میری بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔

"لانچ کے آدمیوں کو یہاں بلاؤ..." جنتر چیخا "ورنہ میں اس لڑکی کو ماردوں گا.... مجھے تو ویسے بھی مری جانا ہے... میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا.... خواہ پانچ دس آدمیوں کو مار کر مرجاؤں... جلدی کرو۔"

وہ اس سے آگے بھی شاید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میرے ریوالور نے اسے مہلت نہ دی۔ "ٹھک" کی نہایت ہلکی سی آواز کے ساتھ ریوالور سے گولی نکلی اور نہایت صفائی سے اس کی کنپٹی میں اتر گئی۔ وہ دھم سے زیریں عرشے پر گرا اور اس کے ساتھ ساتھ کیتھرین بھی گرتے گرتے بچی۔ ایک لمحے کے لیے کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہوا تھا اگر میں کچھ اور پھرتی کا مظاہرہ کرتا اور ریوالور کو دوبارہ چھپالیتا تو شاید سب لوگوں کو یہ جاننے میں دقت پیش آتی کہ گولی کس نے چلائی تھی لیکن میرے ریوالور جیب میں رکھنے سے پہلے میک نیل کی نظر مجھ پر پڑ گئی پھر کیتھرین نے بھی اپنا گلا مسلتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ وہ سخت دہشت زدہ نظر آرہی تھی۔ چند سیکنڈ کے اس تجربے نے اسے ساری چوکڑی بھلادی تھی۔ جس باپ پر وہ چند لمحے پہلے گرج برس رہی تھی اب اسی کے سینے سے جا لگی۔ انسان کتنا ہی باغی' کتنا ہی جارح' کتنا ہی سرکش ہوجائے' جذباتی سہاروں کی ضرورت باقی رہتی ہے لیکن کبھی کبھی اسے اس کا احساس تاخیر سے ہوتا ہے۔

میک نیل نے گہری سانس لے کر میری طرف پُرخیال نظروں سے دیکھا لیکن فوری طور پر وہ کچھ نہ بولا بلکہ سگریٹ کا کش لینے لگا۔ چارلس کیتھرین کو سنبھالتے ہوئے میرے قریب آکر بولا "میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں برخوردار! تم نے میری بیٹی کو بچانے کے لیے اپنے ہی عملے کے ایک ساتھی کو ہلاک کردیا۔"

کیتھرین باپ سے الگ ہوتے ہوئے بولی "اس کا جہاز کے عملے سے کوئی تعلق نہیں ہے پاپا! یہ جعلی سی مین ہے۔"

"تو پھر یہ کون ہے؟" چارلس نے حیرت سے پوچھا۔ میرے جسم پر بہرحال اسی جہاز کے سی مین کی وردی تھی۔

"آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ یہ آپ کے دوست رمضان کا بھیجا ہوا آدمی ہے۔ اس کا نام افضل چوہدری ہے۔ آپ کو میری بہت فکر تھی نا.... یہ میرا خیال رکھنے کے لیے اس جہاز پر سوار ہوا تھا" کیتھرین کے لہجے میں اب بھی ہلکا سا تیکھا پن تھا۔

"اوہ.... بہت خوب.... بہت خوب" چارلس نے جوشیلے انداز میں مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھایا "رمضان بڑا لاجواب آدمی ہے۔ اس سے جو کام کہو وہ کرتا ضرور ہے۔ مجھے تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی مسٹر افضل چوہدری! تم نے واقعی میری بیٹی کا خیال رکھا۔ صحیح معنوں میں اسے خطرے سے بچایا۔ میں اگر ترکی میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں نہ پھنسا ہوتا تو خود پاکستان آتا اور کیتھرین کے ساتھ سفر کرتا لیکن پرسوں تک صورت حال ایسی تھی کہ میں ایک گھنٹے کے لیے بھی استنبول سے نہیں نکل سکتا تھا۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے ملائمت سے کہا "مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کے کسی کام آسکا۔ سچی بات یہ ہے کہ سیٹھ رمضان نے مجھے دھکے دے کر اس جہاز پر بھیجا تھا۔"

اس دوران میک نیل آگے بڑھ کر جنتر کے قریب بیٹھ گیا تھا اور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ غالباً یہ دیکھنے کی کوشش کررہا تھا کہ کنپٹی میں گولی اترنے کے باوجود اس میں کوئی سانس تو باقی نہیں۔

"یہ مرچکا ہے" اس نے سر اٹھاتے ہوئے اعلان کیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا "یہ جاننے کے لیے مجھے اس کا معائنہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں یہیں کھڑے کھڑے بتا سکتا تھا کہ یہ مرچکا ہے" تاہم یہ بات میں نے منہ سے نہیں کہی۔

میک نیل میرے قریب آکر گویا ایک نئے زاویے سے میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولا "تم نے یکدم ایک انتہائی قدم اٹھایا.. لیکن میرا خیال ہے اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا.... اس شخص نے ہم سب کو بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا..."

اس کا انداز خودکلامی کا سا تھا پھر وہ ایک نظر جنتر کی لاش کی طرف دیکھ کر بولا "اس کے مرجانے سے ایک مسئلہ حل طلب رہ گیا۔ اب ہم یہ نہیں جان سکیں گے کہ آخر اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ یہ کیتھرین کو اس طرح خنجر کی نوک پر ساتھ کیوں لے جانا چاہتا تھا؟"

"میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں!" میں نے امریکیوں کے انداز میں کندھے اچکائے "میں باریکیوں میں جانے کا عادی نہیں ہوں اور یہ باریکیوں میں جانے کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں نے ایک خطرناک صورت حال دیکھی اور فوری طور پر مجھے اس کا جو حل نظر آیا میں نے اس پر عمل کرڈالا۔"

"تم اس پر کچھ روشنی ڈال سکتی ہو کیتھرین؟" اس نے کیتھرین کی طرف مڑتے ہوئے کچھ اس طرح پوچھا' جیسے وہ کیتھرین کو برسوں سے جانتا تھا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں...." کیتھرین بے نیازی سے بولی "سفر کے دوران میرا رویہ اس سے خاصا دوستانہ رہا تھا۔ میں اسے محض ایک مہذب انسان سمجھ کر اچھی طرح پیش آرہی تھی۔ میری اس سے ملاقات جہاز سے باہر بمبئی میں ہوئی تھی۔ مجھے اندیشہ ہے میرے اچھے رویے کی وجہ سے کہیں یہ مجھ پر عاشق نہ ہوگیا ہو اور اب مجھے جاتے دیکھ کر یکدم ہی اس کے ذہن نے پلٹا کھایا ہو۔ مجھے روکنے کا اسے اس کے سوا کوئی طریقہ نظر نہ آیا ہو۔ ویسے مجھے شبہ ہے کہ اس کی کھوپڑی کا کوئی پُرزہ ڈھیلا ضرور تھا۔"

میک نیل پُرخیال انداز میں ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ وہ اس امکان پر غور کرنے کے لیے تو تیار تھا لیکن میرا خیال تھا کہ بات اس کے دل کو نہیں لگی تھی' تاہم وہ خاموش رہا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "میرا دل کہہ رہا ہے کہ عبدل کو بھی جنتر نے ہی قتل کیا تھا... اور آلۂ قتل شاید چاقو ہی رہا ہو" میں نے چوبی فرش پر پڑے جھلمل جھلمل کرتے چاقو کی طرف اشارہ کیا "شاید اس کا کسی لیبارٹری وغیرہ میں تجزیہ کرنے پر عبدل کے خون کے ذرّات مل جائیں۔"

میک نیل نے آگے بڑھ کر رومال کی مدد سے چاقو اٹھالیا اور اسے رومال ہی میں لپیٹ کر جیب میں ڈالتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا "تم تو کہہ رہے تھے کہ تم باریکیوں میں جانے کے عادی نہیں۔ یہ تو خاصی باریک بات کی ہے تم نے۔"

"کوئی بھی شخص جس نے دو چار جاسوسی کہانیاں پڑھی ہوں۔ ایسی بات کرسکتا ہے۔ یہ کچھ ایسی زیادہ باریک بات نہیں۔ البتہ آدمی کی عقل ہی کچھ زیادہ موٹی ہو تو بات دوسری ہے" میں نے ملائمت سے کہا۔

کیپٹن گونزر آگے آتے ہوئے بولا "جنتر نے جو حرکت کی ہے اس کے بعد تو مجھے بھی یقین ہوچلا ہے کہ عبدل کو اسی نے قتل کیا تھا۔ ممکن ہے یہ کسی قسم کے جنون کا شکار ہوگیا ہو۔ جنون کے آثار کچھ نمایاں تو نہیں تھے لیکن اس کی اندرونی کیفیات کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ وہ ایڈز کا شکار تھا۔ ممکن ہے اپنے بارے میں سوچ سوچ کر اس کا ذہن کسی قسم کے خلجان کا شکار ہوگیا ہو۔"

"اگر یہ ایڈز کا شکار تھا تو پھر تمہاری بات درست ہوسکتی ہے" میک نیل نے اثبات میں سر ہلایا "بہرحال.... ہمیں ان واقعات سے کوئی مطلب نہیں۔ بندرگاہ پر تم جس طرح چاہو ان واقعات کی رپورٹ کرسکتے ہو۔ ہمارا کام اب ختم ہوگیا' ہم جارہے ہیں۔"

چارلس بولا "میں بھی کیتھرین کو لے کر لانچ پر ہی استنبول جارہا ہوں کیونکہ جہاز کو تو بودرم کی بندرگاہ پر.... اور پھر استنبول پہنچتے پہنچتے بہت وقت لگ جائے گا...." پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "اور تم بھی میرے ساتھ چلو گے مسٹر چوہدری! تم اب میرے مہمان ہو۔ گو کہ میں خود کسی اور کا مہمان ہوں۔"

"میرے پاس پاسپورٹ وغیرہ نہیں ہے مسٹر چارلس" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ یہ بات اب چونکہ سبھی کو معلوم ہوچکی تھی اس لیے اب اسے چھپانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا" چارلس بے پروائی سے بولا "ہمیں ایسے راستے سے جانا بھی نہیں ہے جہاں پاسپورٹ وغیرہ دیکھے جاتے ہیں۔ استنبول پہنچ کر میں تمہارے لیے پاسپورٹ وغیرہ کا بھی بندوبست کردوں گا۔ تم چلو تو سہی۔ تم میرے محسن ہو لیکن تم سے بہت ہی نامناسب حالات میں ملاقات ہوئی ہے۔ میں نہیں چاہتا' تم یہیں ہم سے جدا ہوجاؤ۔"

میں نے کیتھرین کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ باپ کا اصرار اس کے لیے خوشی کا باعث تھا یا خفگی کا؟ بہرحال میرے لیے یہ ایک معقول پناہ حاصل کرنے کا عمدہ موقع تھا۔ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ چارلس بین الاقوامی طور پر اثر و رسوخ رکھنے والا آدمی تھا۔ اس کے ساتھ رہ کر میرے بہت سے مسائل حل ہوسکتے تھے اس لیے میں نے آمادگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے.... جیسے آپ کی مرضی۔ ویسے میں آپ کو کوئی زحمت نہیں دینا چاہتا تھا۔"

"بھئی ایک تو تم پاکستانی لوگ وضع داری اور تکلف میں بہت پھنسے رہتے ہو" چارلس اپنی تمام تر متانت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "بس اب فضول باتیں چھوڑو اور ہمارے ساتھ چلو۔"

کیپٹن گونزر مضطربانہ انداز میں سگار انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولا "اور اگر مجھے پولیس کو رپورٹ کرنے کے سلسلے میں مسٹر افضل چوہدری کی گواہی کی یا بیان کی ضرورت پڑ گئی تو...؟"

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم استنبول میں کہیں غائب نہیں ہوجائیں گے" چارلس بولا "میں وہاں برطانوی سفیر کا مہمان ہوں اور اس کی سرکاری رہائش گاہ میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ یہ اس کا کارڈ ہے.... تم کسی بھی وقت کوئی بھی ضرورت پڑنے پر اس ایڈریس یا فون نمبرز پر مجھ سے رابطہ کرسکتے ہو" اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ کارڈ دیکھ کر کیپٹن گونزر مطمئن نظر آنے لگا۔

چارلس اور کیتھرین ریلنگ کے اس حصے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں رسّے کی سیڑھی لٹکی ہوئی تھی۔ میں نے بھی ان کے ساتھ قدم بڑھایا تو کیپٹن گونزر میری آستین پکڑ کر ہلاتے ہوئے بولا "ہماری یونیفارم تو اتارتے جاؤ۔"

"اوہ!" میں نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی "میں تو بھول ہی گیا تھا۔" پھر میں نے چارلس سے کہا "آپ لوگ چلیں۔ میں کپڑے بدل کر لانچ پر پہنچتا ہوں۔"

وہ لوگ آگے بڑھ گئے اور میں پانٹل روم کے اندرونی حصے میں جا پہنچا جہاں میں نے اپنا سفاری سوٹ چھوڑا تھا۔ میں لباس تبدیل کرکے باہر آیا اور اس جگہ سے گزرا جہاں چند منٹ پہلے خوب بھیڑ بھاڑ تھی۔ اب وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ صرف جنتر کی لاش پڑی تھی۔ فی الحال اسے اٹھایا نہیں گیا تھا اور کسی نے اس کے پاس رکنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔

میں لاش کے پاس سے گزرنے لگا تو ایک تختے کے نیچے مجھے کچھ پڑا نظر آیا۔ میں نے جھک کر اسے اٹھایا۔ وہاں روشنی کم تھی لیکن میں نے دیکھ لیا' یہ وہی ضخیم کتاب تھی جو میں نے کئی بار

کیتھرین کے ہاتھوں میں دیکھی تھی "مشرق وسطیٰ کے معاملات پر تیل کے اثرات کی تاریخ۔"

لہجے سے عنوان کی یہ کتاب شاید اس وقت بھی کیتھرین کے پاس تھی جب جنتر نے اچانک اسے دبوچ کر یرغمال بنالیا تھا۔ کشمکش میں شاید کتاب نیچے گر گئی تھی اور کیتھرین کو اس کا احساس نہیں ہوسکا تھا۔ وہ کچھ ایسی جگہ جاکر گری تھی جہاں نظروں سے اوجھل رہی تھی۔ میں اس ارادے سے اسے اٹھائے لے چلا کہ جاکر کیتھرین کو دے دوں گا۔

ذرا زیادہ روشنی میں آکر میں نے یونہی سرسری سے انداز میں اس کے ورق پلٹے تو کوئی چیز میری نظر میں کھٹکی۔ کتاب کے وسط میں کچھ اوراق مجھے باقی کتاب سے کچھ مختلف محسوس ہوئے۔ یوں تو یہ کوئی حیرت کی بات بھی نہیں تھی۔ بہت سی کتابوں میں تصویروں یا اہم دستاویزات کے عکس وغیرہ پر مشتمل صفحات الگ سے بائنڈ کئے جاتے ہیں اور وہ باقی کتاب سے مختلف محسوس ہوتے ہیں لیکن ان صفحات پر سرسری نظر ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ ان کا کتاب سے بالکل ہی کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ کمپیوٹر پر چھپی ہوئی کوئی رپورٹ تھی جس کے کاغذ نہایت صفائی سے تراش کر کتاب کے کچھ صفحات نکال کر ان کی جگہ فٹ کئے گئے تھے۔

میں وہاں کھڑے ہوکر ان کا مکمل جائزہ نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے جلدی سے وہ صفحات کتاب سے اکھاڑ کر تہ کرکے جیب میں رکھ لیے اور ذرا پیچھے جاکر کتاب ایک ایسی جگہ سے جہاز کے نچلے حصے میں پھینک دی جہاں مجھے کوئی یہ حرکت کرتے نہیں دیکھ سکتا تھا پھر میں گھوم کر اس طرف آگیا جہاں رسّی کی سیڑھی لٹکی ہوئی تھی۔ سیڑھی سے اتر کر میں لانچ میں پہنچا جہاں چارلس اور کیتھرین میرے منتظر تھے۔ چند منٹ بعد کوسٹ گارڈ کی لانچ ہمیں لے کر استنبول کی طرف روانہ ہوگئی۔ کیتھرین کو ابھی تک احساس نہیں ہوا تھا کہ اس کی کتاب کہیں گر چکی تھی۔

○☆○

استنبول میں چارلس واقعی برطانوی سفیر کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا ورنہ مجھے نہ جانے کیوں وہاں پہنچنے تک اس معاملے میں کچھ شک تھا۔ وہ ایک طویل و عریض دو منزلہ بنگلا تھا جس کی بالائی منزل مکمل طور پر مہمان خانہ تھی۔ اس میں کئی بیڈ رومز اور ضرورت کی تمام چیزوں کے علاوہ ایک نہایت پرتعیش کچن بھی موجود تھا۔ جس علاقے میں بنگلا واقع تھا اس میں اسلام آباد کی جھلک تھی۔ چارلس کے انداز و اطوار وہاں کچھ ایسے ہی تھے جیسے وہ اپنے ہی گھر میں ہو اور کسی حد تک یہ بات درست ہی تھی۔ وہ تو خیر بہت "پہنچی ہوئی" شخصیت تھا لیکن زیادہ تر ملکوں کے عام باشندے بھی اپنے سفارت خانے اور اس سے متعلق چیزوں کو دیارِ غیر میں اپنے گھر ہی کی طرح محسوس کرتے ہیں۔

مجھے وہاں الگ بیڈ روم مل گیا۔ عمدہ کھانا اور ضرورت کی ہر چیز میسر آگئی۔ حتیٰ کہ چارلس نے میرے لیے ایک تقریباً نئے سوٹ کا بھی بندوبست کردیا جو میرے جسم پر میرا اپنا ہی لگنے لگا۔ گھر پر موجود بٹلر اور دیگر دو تین ملازمین چارلس کے اشارے پر ہر کام کررہے تھے۔ سفیر سے ملاقات نہیں ہوسکی اور چارلس گویا اس کی کوئی ضرورت بھی محسوس نہیں کررہا تھا۔ سفیر اس وقت استنبول میں موجود ہی نہیں تھا' وہ کہیں اور گیا ہوا تھا۔

شام ڈھلے چارلس مجھ سے معذرت کرکے کسی کام سے روانہ ہوگیا۔ کیتھرین گویا اس کے جانے ہی کی منتظر تھی۔ اس کے جاتے ہی اس نے اپنے لیے ٹیکسی منگوائی اور وہ بھی کہیں روانہ ہوگئی۔ دونوں باپ بیٹی بنے مجھے تو کیا' ایک دوسرے کو بھی بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ وہ کہاں جارہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اطمینان کی سانس لی اور اپنے کمرے میں لیٹ کر ان اوراق کا مطالعہ کرنے لگا جو میں نے کیتھرین کی کتاب میں سے اکھاڑے تھے۔ انہیں میں نے ابھی تک بہت چھپا چھپا کر' بہت سنبھال سنبھال کر رکھا تھا۔

وہ واقعی کمپیوٹر پر تیار شدہ ایک رپورٹ تھی۔ زیادہ طویل نہیں تھی' میں نے اسے دو مرتبہ پڑھا اور میرے رگ و پے میں تھوڑی دیر کے لیے خفیف سی سنسنی دوڑ گئی۔ اس میں لمبی لمبی کئی طبی اصطلاحیں تھیں جو میری سمجھ میں نہیں آئیں لیکن جو بات سمجھنے کی تھی وہ ذہن پر ذرا زور دینے سے میری سمجھ میں آگئی۔ کڑیاں مل گئیں اور میں دیر تک سوچوں میں کھویا رہا۔

بالآخر میں اپنے کمرے سے نکلا۔ میرے دائیں ہاتھ پر چارلس کا کمرا تھا اور بائیں ہاتھ پر کیتھرین کا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اس فلور پر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم تینوں کے سوا کسی کمرے میں کوئی مہمان ٹھہرا ہوا نہیں تھا۔ میں نے کیتھرین کے کمرے میں پہنچ کر دروازے کی ناب پر قسمت آزمائی کی۔ اس کا دروازہ مقفل تھا۔ کھڑکی بھی اندر سے مضبوطی سے بند تھی۔

میں کھڑکی کو ذرا ٹھونک بجاکر دیکھ ہی رہا تھا اور اسے کھولنے کی کوئی ترکیب سوچ رہا تھا کہ مجھے احساس ہوا کوئی عقب سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں تیزی سے گھوما۔ ذرا فاصلے پر' سیڑھیوں کے قریب بٹلر کھڑا عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ یقیناً سوچ رہا تھا کہ مہمانوں کے اس مہمان نے آتے ہی کیا حرکتیں شروع کردی تھیں۔ وہ یقیناً ابھی سیڑھیوں سے اوپر آیا تھا کیونکہ ایک لمحے پہلے تک وہ وہاں موجود نہیں تھا۔

بٹلر ترک تھا لیکن انگریزی روانی سے بولتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ میں پاکستانی تھا۔ پاکستانیوں کا امیج ویسے ہی دوسرے ملکوں میں کچھ اچھا نہیں۔ بے چارے ترک باشندے پاکستانیوں کو "برادر ملک" کے شہری قرار دے کر تھوڑی بہت محبت کا اظہار کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ مجھے چوروں جیسی حرکت کرتے دیکھ کر بٹلر کے دل میں اگر پاکستانی برادر کے لیے کوئی تھوڑی

مت محبت موجود بھی تھی تو اس کی بنیادیں خطرناک حد تک لرز گئی ہوں گی۔

میں نے پوری کوشش کی کہ میرے چہرے سے خجالت کا اظہار نہ ہونے پائے۔ نہایت متانت سے چلتا ہوا میں اس تک پہنچا۔ خوش خلقی سے مسکراتے ہوئے میں نے سرسری سے لہجے میں کہا "میری ایک کتاب کیتھرین کے پاس رہ گئی ہے۔ میں اب فارغ بیٹھا بور ہورہا تھا۔ سوچا ذرا پڑھ لوں۔۔۔ لیکن اس کا کمرا مقفل ہے۔ تمہارے پاس اس کی چابی ہوگی؟" میں نے یہ ظاہر کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی کہ میرے دل میں چور نہیں تھا۔

اس نے نفی میں سرہلایا اور بولا "چابیاں دروازوں ہی میں لگی رہتی ہیں۔ اگر ڈپلیکیٹ ہوں گی بھی۔۔۔ تو ان کے بارے میں باس کو ہی کچھ پتا ہوگا۔"

"اوہ۔۔۔" میں نے قدرے مایوسی سے کہا "تو پھر تم ہی مجھے کوئی انگریزی اخبار یا رسالہ وغیرہ لادو۔ ترکی تو مجھے پڑھنی نہیں آتی۔"

اس نے اثبات میں سرہلایا اور نیچے چلا گیا۔ چند لمحے بعد وہ کئی انگریزی رسالے لیے واپس آگیا۔ میں نے چہرے سے خوشی کا اظہار کیا' اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کمرے کی طرف واپس چل دیا۔ وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا "سر! میں یہ کہنے آیا تھا کہ اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو انٹرکام پر کہہ دیجئے گا۔"

"بہت بہتر۔" میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور کمرے میں گھس کر دروازہ بند کرکے گہری سانس لی۔

میں نے رسالوں کو ایک طرف پھینکا اور کھڑکی کی جھری سے راہداری میں جھانکا۔ بٹلر واپس جاچکا تھا۔ تاہم میں نے دوبارہ باہر آنے میں عجلت سے کام نہیں لیا۔ معلوم نہیں میں بٹلر کی نظر میں اپنی تھوڑی بہت عزت بحال کرانے میں کامیاب ہوا تھا یا نہیں۔ بہرحال چند منٹ بعد میں نے باتھ روم سے ایک بلیڈ لیا اور دوبارہ کمرے سے نکل آیا۔

اس بار میں نے سیڑھیوں سے نیچے دور تک جھانک لیا۔ سروست کسی کی آمد کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ میں کیتھرین کے کمرے میں گھسنے کے سلسلے میں تاخیر اس لیے نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کی واپسی کے بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ جلد ہی واپس آجاتی۔ اس کام کو کل پر ڈالنے کی صورت میں یہ بھی امکان تھا کہ وہ چیز مجھے اس کے کمرے میں نہ ملتی جس کی مجھے تلاش تھی۔ اس کے غائب ہونے کا اندیشہ تو اب بھی تھا لیکن مجھے کسی حد تک اطمینان اس لیے تھا کہ میں نے کیتھرین کو گھر سے تقریباً خالی ہاتھ ہی رخصت ہوتے دیکھا تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں پرس کے سوا کچھ نہیں تھا۔

میں نے دروازے کے تالے پر جھک کر بلیڈ کو کھڑے رخ سے تالے کی جھری میں داخل کیا اور اس کی رو سے تالے کے لیچ LATCH کو اندر گھسانے کی کوشش کی۔ پہلی کوشش میں تو بلیڈ ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ غنیمت تھا کہ تالا نیا نہیں تھا۔ کافی گھسا ہوا تھا۔ میری دوسری کوشش کامیاب ہوگئی۔ جلدی سے اندر داخل ہوکر میں نے نہایت آہستگی سے دروازہ اپنے عقب میں بند کیا اور اندھیرے میں گہری سانس لی۔

چند لمحے بعد میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوگئیں۔ ویسے بھی راہداری میں روشنی ہونے کی وجہ سے کمرے میں اندھیرا گہرا نہیں تھا۔ میں بتیاں روشن کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ بٹلر ایک بار پھر اوپر آجاتا اور کیتھرین کے کمرے میں روشنی دیکھ کر پریشان ہوجاتا کہ آخر میں کس چکر میں تھا؟

کیتھرین کا سامان اب وارڈ روب میں منتقل ہوچکا تھا۔ میں نے تیزی سے اس کے سامان کی تلاشی لی۔ ڈریسنگ ٹیبل کو کھنگالا لیکن وہ چیز وہاں نہیں تھی جس کی مجھے تلاش تھی۔ چمڑے کا وہ تھیلا جس میں' میں نے جہاز کے سفر کے دوران وٹامنز کی گولیوں کی شیشیاں دیکھی تھیں' خالی پڑا تھا۔

مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ شاید میں صحیح طور پر دیکھ نہیں سکا تھا اور کیتھرین وہ شیشیاں آج ہی باہر لے گئی تھی تاہم ایک موہوم سی امید لیے میں باتھ روم میں جاپہنچا اور میڈیسن کیبنٹ کو کھول کر دیکھا۔ کیبنٹ کے ایک خانے میں وہ شیشیاں قرینے اور ترتیب سے سجی ہوئی تھیں۔ میں بے اختیار طمانیت کی گہری سانس لے کر رہ گیا۔

میں نے جلدی سے وہ شیشیاں نہایت حفاظت سے چمڑے کے تھیلے میں بھریں اور باقی ہر چیز کو جوں کا توں چھوڑ کر نہایت محتاط طریقے سے اپنے کمرے میں واپس جا پہنچا۔

میرے کمرے میں بھی کوئی ایسی محفوظ جگہ نہیں تھی جہاں میں ان شیشیوں کو چھپا کر مطمئن ہوجاتا۔ بہرحال میں نے اپنے باتھ روم میں جاکر فلش کی ٹینکی کا پانی بہادیا اور والو بند کرکے مزید پانی اندر جانے سے روک دیا پھر ایک بڑا اسکریو کھول کر میں نے ٹینکی کا ڈھکن کھولا اور شیشیاں ٹینکی میں اوپر تلے رکھ دیں۔ فی الحال آسانی سے مجھے یہی ذرا محفوظ جگہ میسر تھی۔ ٹینکی بند کرکے میں آرام سے کمرے میں آکر لیٹ گیا اور بٹلر کے دیئے ہوئے رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگا۔

رات کے کھانے پر بھی میں' چارلس اور کیتھرین یکجا نہ ہوسکے۔ میں نے کافی دیر ان کا انتظار کرنے کے بعد بالآخر کھانا کھالیا۔ میں ابھی کھانے کی میز سے اٹھا نہیں تھا کہ چارلس آپہنچا۔ لباس تبدیل کرکے وہ میرے ساتھ آبیٹھا۔ رات کے تقریباً گیارہ بج رہے تھے۔ کیتھرین اب بھی واپس نہیں آئی تھی لیکن اب چارلس کو گویا اس کے بارے میں کوئی تشویش نہیں تھی۔ اس کی تشویش شاید صرف اس وقت تک کے لیے تھی جب تک وہ جہاز پر تھی۔

چارلس ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کرنے لگا کہ میں نے اس کی خاطر بڑی زحمت اٹھائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی بیٹی اگر

ڈرگز کے دھندے میں ملوث رہی بھی تھی تو اب شاید اس سے نکل آئی تھی۔ اسے امید تھی کہ یورپ کے سفر کے بعد وہ اسے سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ گھر لے جانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ میں نے اس پر اپنی اس رائے کا اظہار نہیں کیا کہ ڈرگز کے دھندے میں ایک بار ملوث ہونے کے بعد' چاہتے ہوئے بھی کسی کا اس سے نکلنا تقریباً ناممکن ہی تھا۔ میں چارلس کی امیدوں کو ناامیدی اور دل شکستگی میں بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر وہ ایک باپ تھا۔ اپنی بیٹی کی تمام تر سرکشی کے باوجود اور اپنے مغربی معاشرے کی روایات کے برعکس وہ اب بھی بیٹی کی طرف سے لاتعلقی اور بے حسی اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

وہ کھانا کھا چکا تو میں اسے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ میرا خیال ہے' میں بحری جہاز کی کئی دن کی بے آرامی سے کافی تھکا ہوا تھا اس لیے کچھ زیادہ ہی گہری نیند سو گیا۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ کیتھرین کس وقت واپس آئی تھی لیکن میری اس سے اسی رات اپنے ہی کمرے میں ملاقات ہوگئی لیکن افسوس کہ یہ کوئی محبت بھری یا رومان پرور ملاقات نہیں تھی۔

وہ کمبخت میری کنپٹی پر پستول لگائے میرے بیڈ کے پاس ہی کھڑی تھی۔ درحقیقت میری آنکھ کمرے کی لائٹ آن ہونے اور کنپٹی پر پستول کی نال کے لمس سے ہی کھلی تھی۔ کیتھرین کی بلوری آنکھیں اس وقت شعلے اُگل رہی تھیں۔ اتنی شائستہ' نرم خو' مہذب اور خوش اطوار لڑکی کو اس قدر غصے میں دیکھنا میرے لیے ایک عجیب تجربہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ زیادہ غصے میں تو کبھی آتی ہی نہیں ہوگی۔ وہ ایک نہایت خوب صورت نائٹی میں تھی اور اس کے وجود سے مسحور کُن خوشبو پھوٹ رہی تھی لیکن افسوس کہ اس وقت اسے نائٹی میں دیکھ کر بھی لطف اندوز نہیں ہوا جاسکتا تھا اور اس کے وجود سے پھوٹتی ہوئی خوشبو کو اپنے ہر مشام جاں میں اتارنے کی کوشش بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس کے تاثرات کچھ ایسے ہی خطرناک تھے۔

اس ایک لمحے میں مجھے یہ خیال بھی آیا کہ وہ اتنے پُرامن اور خاموش طریقے سے میرے کمرے میں کیسے آن پہنچی تھی کہ میری نیند میں ذرا بھی خلل نہیں پڑا تھا جبکہ میری گہری نیند بھی کچھ زیادہ گہری نہیں ہوتی تھی؟ پھر میں نے سوچا کہ جب میں ذرا سی بھی کھٹر پھٹر کیے بغیر اس کے مقفل کمرے میں جاسکتا تھا تو وہ میرے کمرے میں کیوں نہیں آسکتی تھی۔ آخر وہ بھی تو نہ جانے کون کون سے تجربے دامن میں سمیٹے دنیا میں گھوم رہی تھی۔

بحری جہاز پر سفر کے دوران جب میں نے اس کے سامان کی تلاشی لی تھی تو مجھے اس میں کوئی پستول وغیرہ نظر نہیں آیا تھا۔ شاید اس وقت وہ بھی میری طرح اسے لباس کے اندر کہیں ہر وقت اپنے وجود سے چپکائے پھرتی ہو۔ یا پھر آج سہ پہر سے وہ جس آوارہ گردی یا مہم پر نکلی ہوئی تھی اس کے دوران بہت سی چیزوں کے انتظامات کرکے آئی ہو۔

حالانکہ میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی' صرف حیرت سے آنکھیں پٹ پٹانے پر اکتفا کیا تھا اس کے باوجود اس نے مجھے خبردار کرنا ضروری سمجھا "اٹھنے کی کوشش مت کرنا۔ شیشیاں کہاں ہیں؟" اس کی آواز ناگن کی پھنکار سے مشابہ تھی۔

"شیشیاں.... کون سی شیشیاں؟" میں نے معصوم بننے کی کوشش کی حالانکہ مجھے خود بھی معلوم تھا کہ میری یہ کوشش فضول تھی لیکن میں سوچنے کے لیے دو چار سیکنڈ کی مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے تاثرات بہت خطرناک نظر آرہے تھے۔ اچانک کوئی حرکت کرنا میرے حق میں مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ ابھی میں اس لڑکی کو پوری طرح نہیں جان سکا تھا۔

"میں تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کرنے کے بعد بھی شیشیاں ڈھونڈ لوں گی لیکن میں تمہاری جان لینا یا زیادہ زحمت اٹھانا نہیں چاہتی۔ مجھے ان دونوں کاموں پر مجبور مت کرو۔" اس کی آواز اب بھی سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی لیکن یہ سرگوشی گویا سماعت کو کھرچتی ہوئی گزر رہی تھی۔

"مجھے تو اس کمرے میں کچھ شیشیاں ڈریسنگ ٹیبل پر.... اور کچھ باتھ روم میں میڈیسن کیبنٹ میں رکھی ہوئی ملی تھیں۔ ان کے سوا تو مجھے کسی شیشی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں" میں نے نہایت ڈھٹائی سے اپنی مصنوعی معصومیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں صرف تین تک گنوں گی...." اس نے سفاک لہجے میں صرف اتنا کہا اور گنتی شروع کرنے سے پہلے ہی ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھ گیا۔

"تمہارے پاپا تمہارے ہاتھوں میرے مرنے کا بہت برا منائیں گے" میں نے تیزی سے کہا۔

"جہنم میں گئے پاپا!" وہ غصے سے بولی۔

"ابھی تو نہیں گئے۔ شاید مرنے کے بعد جائیں" میں نے معصومیت سے کہا۔

"بکو مت" اس نے جھلا کر کہا اور گنتی شروع کی "ایک...."

"ٹھہرو" میں نے بظاہر گھبراتے ہوئے کہا "آخر وہ کون سی شیشیاں ہیں جن کے لیے تم میرے پیچھے پڑ گئی ہو۔ خدا کے لیے کچھ بتاؤ تو سہی.... کوئی اشارہ تو دو۔ شاید تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔"

"مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ مجھے باتوں میں لگانے کی کوشش مت کرو" وہ ذرا ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی "ان شیشیوں کے راز سے تمہارے سوا کوئی واقف نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں.... کیا میں نے شیشیوں کے معاملے میں کوئی خاص تعلیم حاصل کی ہے؟" میں نے ایک بار پھر اسے معصومیت سے چڑانے کی کوشش کی۔ حقیقت یہی تھی کہ میں اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے شروع ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم ایک خطرناک آدمی ہو۔ مجھے تمہاری طرف سے ہوشیار رہنا چاہیے تھا۔ زیادہ محتاط رہنا چاہیے تھا۔ تم یقیناً وہ نہیں ہو جو نظر آتے ہو" وہ ناگواری سے بولی۔

"آج کے دور کا المیہ یہی ہے کیتھی ڈارلنگ!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "زیادہ تر لوگ وہ نہیں ہیں جو نظر آتے ہیں' تم بھی انہی میں شامل ہو۔"

اب میں اسے کیا بتاتا کہ شیشیوں کے راز سے آگاہ ہونے میں میری "خطرناکی" کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اگر اتفاق سے کیتھرین کی وہ گری ہوئی کتاب مجھے نہ ملتی اور اس میں جڑے ہوئے وہ اوراق میری نظر میں نہ آتے تو شاید بات میری سمجھ میں نہ آتی۔ میرا ذہن اتنی دور تک نہیں جاسکتا تھا۔ پوری بات تو ان اوراق میں بھی نہیں تھی لیکن کچھ ایسی کڑیاں ضرور مل گئی تھیں جن کی مدد سے میں نے پوری بات سمجھ لی تھی۔ کیتھرین کو شاید ابھی تک کتاب کی گمشدگی کا علم نہیں تھا یا پھر وہ سمجھ رہی تھی کہ کتاب بھی میں نے ہی پار کی ہوگی اور اس کے بعد ہی مجھے شیشیوں کی اہمیت کا اندازہ ہوا ہوگا۔

وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "اگر تم نے ان شیشیوں کو گھر سے باہر کہیں منتقل کر دیا ہے تو تمہارے ساتھ ساتھ یہ میرے حق میں بھی بہت برا ہوگا۔ اس صورت میں تمہیں ہلاک کرنے کا بھی مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"مجھے ہلاک کرنے کا تو تمہیں کسی بھی صورت میں کوئی فائدہ نہیں ہوگا" میں نے جلدی سے کہا۔

"لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ اس بہانے تم جان بچا سکو گے۔ اگر تم یہ کہو گے کہ تم نے شیشیاں کہیں باہر منتقل کر دی ہیں اور وہ تمہیں ساتھ لے جائے بغیر نہیں مل سکتیں تو میں تمہیں ساتھ لے کر نہیں چل دوں گی۔ میں شیشیوں کی طرف سے صبر کر لوں گی اور اپنا دل ٹھنڈا کرنے کے لیے تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گی لیکن اگر تم شیشیاں یہیں کہیں سے برآمد کرکے میرے حوالے کر دو تو تمہاری جان بچ سکتی ہے۔" اس نے اب گویا اپنے غصے پر قابو پالیا تھا۔

میں نے بظاہر ایک لمحے اس کی پیشکش پر غور کیا پھر سنجیدگی سے کہا "ٹھیک ہے.... میں شیشیاں تمہیں دیتا ہوں۔ مجھے اٹھنے دو۔ پستول میری کنپٹی سے ہٹاؤ۔"

"پستول تمہاری کنپٹی سے ہی لگا رہے گا۔ کوئی حماقت نہ کرنا" وہ اب اس کیتھرین سے بہت مختلف لگ رہی تھی جسے میں نے جہاز پر دیکھا تھا۔

"تم بہت سنگدل ہو۔ اردو کے کسی شاعر کی محبوبہ سے بھی زیادہ" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"میری سنگدلی کا کوئی نمونہ تو ابھی تم نے دیکھا ہی نہیں۔"

اب اس کے یاقوتی ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی پھر اس نے ہدایت کی "نہایت آہستگی سے اٹھنا۔ ایک بار پھر خبردار کر رہی ہوں' کوئی حماقت نہ کرنا۔ تمہارے ساتھ اتنی نرمی صرف اس لیے کر رہی ہوں کہ تم نے جہاز پر میری جان بچائی تھی۔"

میں نے اتنا وقت بکواس میں اس لیے ضائع نہیں کیا تھا کہ اس کی ہدایات پر عمل کرتا۔ میں باتوں باتوں میں اس کے اعصاب کو ذرا معمول پر لانا چاہتا تھا۔ ہیجان زدہ انسان کسی بھی لمحے ٹریگر دبا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں دوسرے انسان کے اندازے غلط ہو سکتے ہیں لیکن جب انسان کے اعصاب اس کے قابو میں ہوں تو پھر دوسرے کو اس کے بارے میں اندازے لگانے میں آسانی رہتی ہے۔

میں نے بظاہر اٹھنے کے لیے بازوؤں کو خفیف سی حرکت دی۔ اس کے بعد یقیناً اس کی بھی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا کہ کس طرح میرا ہاتھ اس کی کلائی تک پہنچا اور کس طرح میں نے اس کا پستول والا ہاتھ اونچا کر دیا۔ اس نے ٹریگر دبانے میں ایک لمحہ بھی تامل نہیں کیا۔ اضطراری سے انداز میں ٹریگر دبا دیا لیکن اس کا ہاتھ بہت اونچا ہو چکا تھا۔ گولی نے فانوس کے کچھ حصے کی کرچیاں بکھیریں جو میرے اوپر ہی آکر گریں۔

دوسرے ہی لمحے میں کیتھرین کو بیڈ کی ایک طرف سے اٹھا کر دوسری طرف اچھال چکا تھا۔ اسمارٹ لڑکیاں اس لحاظ سے بھی اچھی ہوتی ہیں کہ انہیں ایک بازو پر اٹھا کر پھینکنا آسان ہوتا ہے لیکن میرا اندازہ تھوڑا سا غلط ہو گیا۔ وہ دوسری طرف کی دیوار سے جا ٹکرائی۔ اچھی خاصی دھمک محسوس ہوئی۔

فائر کی آواز زیادہ بلند نہیں تھی لیکن اس دھمک سے میں ڈر گیا کہ کہیں اس کی کھوپڑی وغیرہ نہ چٹخ گئی ہو لیکن اس کی سخت جانی نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ تڑپ کر اٹھی۔ پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے جھپٹی لیکن اس وقت تک میں بستر پر لوٹ کر اس پستول پر گر چکا تھا۔

وہ میرے اوپر گری اور اس بدبخت نے فوراً ہی کچکچا کر میری ناک چبانے کی کوشش کی۔ یہ ایک انتہائی غیر رومانوی.... بلکہ غیر نسوانی اور تقریباً غیر انسانی حرکت تھی۔ میرے خیال میں اب وہ کراٹے کے ایک آدھ ہلکے سے ہاتھ کی مستحق ہو چکی تھی جو میں نے بلا تامل اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایک طرف کو لڑھک گئی۔

میں ایک گہری سانس لیتے ہوئے گھٹنوں کے بل اس پر جھک گیا اور جائزہ لینے لگا کہ اس دلکش وجود میں کچھ ٹوٹ پھوٹ تو نہیں ہوئی تھی۔ دفعتاً میں اپنے عقب میں ایک تشویش زدہ آواز سن کر پلٹا "یہ کیا ہنگامہ ہے.... یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

وہ چارلس تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا ایک ہاتھ نائٹ گاؤن کی جیب میں تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک ریوالور

نظر آرہا تھا جس کا رخ میری طرف تھا لیکن اس کا انداز دشمنوں والا نہیں تھا۔ ریوالور اس نے گویا محض احتیاطاً تھاما ہوا تھا۔ وہ تذبذب میں تھا اگر اس وقت میں اپنے کمرے کے بجائے کیتھرین کے کمرے میں ہوتا اور اس طرح اس پر جھکا ہوتا تو شاید وہ کچھ اور سمجھتا۔

وہ کچھ آگے آگیا۔ کیتھرین کو بے جان سے انداز میں چاروں خانے چت پڑے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ وحشت زدہ سے انداز میں بولا "کیا تم نے اسے مار ڈالا؟ میں نے فائر کی آواز سنی تھی۔"

"میں ابھی اتنا بدذوق نہیں ہوا کہ کیتھرین جیسی خوب صورت لڑکیوں کو ہلاک کرنے لگوں۔ مجبوری آن پڑے تو بات دوسری ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "فی الحال تو میں خود اس کے ہاتھوں مرتے مرتے بچا ہوں۔"

"کیا واقعی؟" وہ بے یقینی سے بولا "لیکن اسے تم کو ہلاک کرنے کی کیا ضرورت آن پڑی۔ تم تو اس کے محسن ہو۔"

"یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے؟" میں نے ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر خالص اردو کا مصرع پڑھا۔ میرا خیال تھا چارلس اردو نہیں سمجھتا ہوگا لیکن اس وقت مجھے حیرت کا اچھا خاصا جھٹکا لگا جب چارلس الجھن آمیز لہجے میں اردو میں ہی بولا "یہ تمہارے اور کیتھرین کے درمیان کیا کوئی وفا اور بے وفائی کا بھی سلسلہ چل نکلا ہے؟ کیا چند دن کے بحری سفر کے دوران تم کیتھرین کو.... یا کیتھرین تمہیں.... یا تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے؟" اس کا اردو کا لہجہ بھی اچھا خاصا معقول تھا۔

"نہیں، نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے" میں نے گڑبڑا کر جلدی سے کہا "وہ تو میں ایک طرح کی مثال دے رہا تھا کہ اس دنیا میں بعض اوقات نیکی کا کچھ اچھا صلہ نہیں ملتا۔"

"اوہ۔" اس نے سرہلایا اور ریوالور گاؤن کی جیب میں رکھ لیا۔

"میرا خیال ہے آپ اچھی خاصی اردو بول اور سمجھ لیتے ہیں مسٹر چارلس!" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔ اچھی خاصی" اس نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے تصدیق کی۔

تاہم میں نے واپس انگریزی ہی کی طرف آتے ہوئے کہا "آپ بیٹھ کیوں نہیں جاتے مسٹر چارلس؟ آپ کافی پریشان نظر آرہے ہیں۔"

"کیا مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے؟ رات کے دو بجے میری بیٹی ایک اجنبی کے کمرے میں بے ہوش پڑی ہے.... یہاں ایک فائر بھی ہوا ہے.... اٹھا پٹخ کی آوازیں بھی سنائی دی تھیں۔ آخر یہ سب کیا ہے؟"

"اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں" میں نے ایک بار پھر اردو میں کہا۔

"کس طرح کے کاموں میں؟" اس نے ذرا چونک کر پوچھا۔

"بات ذرا لمبی ہے۔ آپ بیٹھ جایئے نا مسٹر چارلس" میں نے فوراً انگریزی کی طرف الٹی چھلانگ لگاتے ہوئے کہا۔ وہ گویا بالواسطہ ناخواندہ گاؤچ پر بیٹھ چکا تو میں نے کہا "اگر آپ برا نہ منائیں تو میں آپ کی بیٹی کو اٹھا کر بیڈ پر لٹا دوں؟"

"اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟" وہ قدرے حیرت سے بولا۔ آخر وہ انگریز تھا۔ اپنی تمام تر وضعداری کے باوجود اتنے تکلفات کا عادی نہیں تھا۔ میں نے کیتھرین کو گود میں اٹھا کر بیڈ پر لٹایا اور اس کا سر اس طرح تکیوں پر ٹکا دیا کہ وہ نیم دراز سی حالت میں آگئی۔

میں نے پلٹتے ہوئے کہا "مسٹر چارلس! اگر آپ برا نہ منائیں تو میں آپ کی بیٹی کے ہاتھ باندھ دوں؟"

"آخر تم کیا کر رہے ہو؟" وہ یکدم جھنجلا اٹھا "میرے برا ماننے کو جہنم میں ڈالو۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہے کرو لیکن خدا کے لیے مجھے جلدی بتاؤ یہ کیا قصہ ہے؟"

"میں صرف اس لیے اس کے ہاتھ باندھنے کی اجازت طلب کر رہا ہوں کہ آپ تو نارمل نہیں ہیں لیکن آپ کی بیٹی نارمل معلوم ہوتی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہوش میں آتے ہی یہ پھر ہنگامہ کرنا نہ شروع کردے۔ پُرسکون ماحول میں بات چیت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جب یہ ہوش میں آئے تو اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں۔"

"ٹھیک ہے.... ٹھیک ہے، باندھ دو" چارلس نے ہاتھ ہلایا۔

میں نے وارڈ روب میں سے ایک ٹائی نکالی جو نہ جانے کس کی تھی۔ میں نے کیتھرین کے ہاتھ زیادہ سختی سے تو نہیں لیکن اس طرح باندھ دیے کہ وہ خود کسی طرح بھی نہ کھول سکے پھر میں باتھ روم میں جا کر وٹامنز کی وہ تمام شیشیاں نکال لایا جو میں نے قلش کی ٹینکی میں چھپا رکھی تھیں۔ میں نے انہیں بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر سجا دیا پھر میں نے بیڈ روم فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور چھینٹوں سے کیتھرین کا چہرہ بھگو ڈالا۔

"یہ کیا تماشا ہے؟ یہ تم اتنی بہت سی وٹامنز کی شیشیاں کیوں نکال لائے ہو؟ یہ کس کی ہیں؟" چارلس اس دوران پوچھ رہا تھا۔

"یہ آپ کی بیٹی کی ہیں۔ انہی کے لیے سارا ہنگامہ ہو رہا تھا۔ انہی کے لیے یہ مجھے مارنے پر تل گئی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"کیوں....؟ کیا دنیا وٹامنز کے بحران سے دوچار ہونے والی تھی جو کیتھرین نے ایک ساتھ اتنی شیشیاں جمع کر رکھی تھیں؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ وٹامنز کی کچھ اتنی زیادہ شوقین تو نہیں تھی" چارلس بولا۔

اس دوران کیتھرین کسمسانے لگی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر کچھ اور چھینٹے مارے تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میری

توقع کے عین مطابق اس نے سب سے پہلے اپنے ہاتھوں کو حرکت میں لانے کی کوشش کی لیکن وہ بندھے ہوئے تھے۔ وہ بل کھا کر رہ گئی۔ شاید وہ مجھے لات ہی رسید کردیتی لیکن میں دور ہٹ چکا تھا۔ بے شک وہ ایک حسین لات تھی لیکن اس وقت میں حسین لات بھی کھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

دفعتاً اس کی نظر اپنے باپ پر پڑی اور اس نے ایک لتی یا دولتی چلانے کا ارادہ ملتوی کردیا اور تھکے تھکے انداز میں تکیوں سے ٹیک لگالی۔

میں نے سائڈ ٹیبل پر رکھی شیشیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تمہیں انہی کی تلاش تھی نا؟"

اس نے ادھر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں صرف ایک لمحے کے لیے ہلکی سی چمک نمودار ہوئی اور معدوم ہوگئی۔ میں نے چارلس کو مخاطب کیا "آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ وٹامنز کی گولیاں نہیں ہیں۔"

"تو پھر کیا یہ گولیوں کی شکل میں ہیروئن یا کوکین ہے؟" چارلس کے چہرے پر پھیلی ہوئی فکرمندی بڑھ گئی۔ اس کی رنگت میں زردی جھلک رہی تھی۔

"نہیں۔ یہ ہیروئن یا کوکین بھی نہیں ہے" میں نے جواب دیا "اس حجم میں یہ ان سے بھی زیادہ منافع بخش چیز ہے اور اس پر وہ قوانین بھی لاگو نہیں ہوتے۔"

"پہیلیاں مت بجھواؤ۔ سیدھی طرح بتاؤ، یہ کیا چکر ہے" چارلس الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ میں نے کیتھرین کی طرف دیکھا۔ وہ قہر آلود نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے دوبارہ چارلس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "میں یقینی طور پر تو نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے شبہ ہے کہ آپ کی بیٹی ڈرگز کے دھندے میں ملوث رہی ہے.... اور شاید اب بھی ہو کیونکہ اس کے انداز و اطوار میں ایک "ڈرگ کیریئر" کی تمام خصوصیات نظر آتی ہیں۔"

"زیادہ بکواس مت کرو خبیث.... مردود" کیتھرین میری بات کاٹتے ہوئے غرائی "تم سمجھ رہے ہو اس طرح کی باتیں کرکے تم میرے باپ کی نظر میں ہیرو بن جاؤ گے یا وہ تمہیں کسی جاسوس کی اولاد سمجھنے لگیں گے۔"

میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا اور چارلس ہی کو مخاطب کیا "میں خوب صورت خواتین پر زیادہ سختی کا قائل نہیں ہوں لیکن اگر آپ برا نہ منائیں تو اس انداز گفتگو پر آپ کی بیٹی کو ایک آدھ ہاتھ اور رسید کردوں؟"

"نہیں.... نہیں...." چارلس بوکھلا کر جلدی سے بولا "میرا خیال ہے پہلے بھی تم نے اسے کوئی ہاتھ ہی رسید کیا تھا جس کی وجہ سے یہ بے ہوش ہوئی تھی۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ دوبارہ بے ہوش ہو۔ تم اسے ہوش میں رہنے دو اور بات جاری رکھو۔ یہ جو بکواس کرتی ہے اسے کرنے دو۔"

"اچھا.... آپ کہتے ہیں تو میں صبر کرلیتا ہوں ورنہ میرے ہاتھ میں خاصی کھجلی ہو رہی ہے" میں نے اپنے ہاتھ کا جائزہ لیتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں یہ کہنے لگا تھا کہ آپ کی بیٹی نے اپنے لیے ایک نیا سائڈ بزنس بھی تلاش کرلیا ہے۔ پھر گزاد ھر اُدھر لے جانے کا سلسلہ بھی شاید ابھی جاری ہو لیکن یہ سائڈ بزنس شاید اس سے بھی زیادہ منافع بخش ہو۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ سائڈ بزنس خالصتاً آپ کی بیٹی کا اپنا ہی ہے یا اس کے پیچھے بھی کوئی سینڈیکیٹ کام کر رہی ہے۔ کیونکہ آج کل دنیا کے جس دھندے میں بھی خوب دولت نظر آتی ہے۔ کوئی نہ کوئی مافیا جلدی سے آکر اسے جھپٹ لیتی ہے اور اس دھندے کو کنٹرول کرلیتی ہے۔ اسے خود چلانے لگتی ہے۔ ان دھندوں میں دور حاضر کی سیاست بھی شامل ہے۔ یعنی وہ دھندا جس میں دنیا کی سب سے زیادہ دولت ملوث ہوتی ہے۔ اب اسے بھی مختلف قسم کی مافیائیں کنٹرول کرنے لگی ہیں اور دنیا کے سیدھے سادے، بے خبر اور کم علم عوام کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ اس کے نتائج کتنے ہولناک نکلیں گے۔ مافیاؤں کے پاس پہلے سیاسی طاقت نہیں ہوتی تھی۔ ان کی حیثیت بہرحال مجرموں کی رہتی تھی لیکن اب وہ یہ طاقت بھی حاصل کر رہی ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ دولت کے علاوہ ان کے لیے تحفظ اور سلامتی بھی ہے مگر میں شاید اپنے موضوع سے بہت دور نکل گیا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے" چارلس خشک لہجے میں بولا۔

"اصل میں اس قسم کے سب موضوعات کی جڑیں کسی نہ کسی انداز میں ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہیں" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا "بہرحال میں آپ کی بیٹی کے سائڈ بزنس کی بات کر رہا تھا۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ فی الحال اس کے پیچھے کوئی سینڈیکیٹ یا مافیا کام نہیں کر رہی ہوگی کیونکہ میرا اندازہ ہے ابھی یہ بڑے پیمانے پر نہیں پھیلا۔ ابھی اس کا منافع آپ کی ہونہار لائق اور باصلاحیت بیٹی کی جیب میں ہی جا رہا ہوگا۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ انڈیا کے کچھ سائنس دانوں نے جڑی بوٹیوں کی مدد سے ایڈز کا علاج دریافت کرلیا ہے.... کم از کم ان کا دعویٰ یہی ہے.... اور شاید ان کی تیار کردہ دوا کامیاب بھی جا رہی ہے کیونکہ کچھ خفیہ ایجنسیوں کے اشارے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی ڈیمانڈ روز بہ روز بڑھ رہی ہے۔"

چارلس ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ میں نے ایک نظر کیتھرین کی طرف دیکھا۔ اب اس کی تیزی، تندی اور سرکشی دم توڑتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مُردنی چھانے لگی تھی۔ غالباً اب جا کر اسے یقین ہوا تھا کہ اس کا راز، راز نہیں رہا تھا۔

میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد سلسلۂ کلام جوڑا "مسئلہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں انڈیا کے جن سائنس دانوں نے تحقیق کی ہے ان کی نیت خراب ہوگئی ہے۔ ایشیائی ممالک میں اکثر

معاملات میں نیتیں خراب ہونے کا رجحان ویسے بھی کچھ زیادہ ہی تیزی سے بڑھتا جارہا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انڈین سائنس دانوں نے اس ریسرچ کے سلسلے میں لیبارٹریز اور وسائل تو سرکاری استعمال کیے ہوں لیکن ریسرچ انہوں نے اپنا ذاتی کام سمجھ کر کی ہو اور اب وہ اپنی اس دریافت سے خوب دولت کمانا چاہتے ہوں۔ انہوں نے سوچا ہو کہ اس فارمولے کے عام ہونے سے پہلے پہلے وہ جتنا کچھ سمیٹ سکتے ہوں، سمیٹ لیں.... یہ بھی ممکن ہے کہ وہ فارمولا کبھی عام نہ ہونے پائے کیونکہ خفیہ رپورٹ سے کچھ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جڑی بوٹیاں صرف انڈیا میں پائی جاتی ہیں اور شاید صرف انہی سائنس دانوں کی ان تک رسائی ہے جنہوں نے دوا تیار کی ہے۔ بہرحال... قصہ مختصر یہ ہے کہ ان سائنس دانوں نے اپنی اس دریافت کو قطعی خفیہ رکھا ہے۔ وہ اس دریافت کو دنیا کے سامنے رکھ کر.... اور اسے عام کرکے انسانیت کی خدمت کرنے یا سائنس کی دنیا میں اپنا نام امر کرنے کے چکر میں نہیں پڑے۔ انہوں نے کچھ رابطے تلاش کیے جن کے ذریعے ان کی تیار کردہ دوا کو خفیہ طور پر فروخت کیا جاسکے۔ اس کے لیے ایک نہایت محدود سی بلیک مارکیٹ تیار کی جاسکے۔ میرا خیال ہے انہوں نے ایسے لوگوں کو اپنے کام کے لیے موزوں سمجھا ہوگا جو کسی نہ کسی انداز میں ذرا اونچے پیمانے پر منشیات کے دھندے میں ملوث رہے ہوں۔ انہوں نے دو چار ہی ایسے لوگ تلاش کیے ہوں گے۔ آپ کی ہونہار بیٹی ان میں سے ایک ہے...."

چارلس کے چہرے پر ذرا تکلیف کے آثار ابھرے شاید میرا طنزیہ لہجہ اسے نشتر کی طرح چبھ رہا تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا پھر میں نے ذرا ملائمت سے کہا "میں یہ بات محض طنزاً نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کیتھرین ایک نہایت باصلاحیت لڑکی ہے لیکن یہ انہی بدقسمت انسانوں میں سے ہے جن کی صلاحیتیں منفی کاموں میں استعمال ہونے لگتی ہیں۔ جو زندگی کے کسی موڑ پر بھٹک کر ایسے راستوں کی طرف جانکلتے ہیں جو انہیں بہت روشن، بہت فائدہ مند نظر آتے ہیں لیکن ان پر چل کر یہ کسی منزل پر پہنچنے کے بجائے اندھیروں میں کھو جاتے ہیں اور زندگی کے سفر میں آخر کار بالکل تہی دست رہ جاتے ہیں۔"

کیتھرین نے بیزاری سے میری طرف دیکھا اور تھکے تھکے انداز میں تکیے سے ٹیک لگالی پھر وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولی "تم نے ٹھیک کہا تھا۔ زندگی کے کسی موڑ پر تمہارے وجود میں کوئی بوڑھی روح حلول کرگئی تھی۔"

"ہاں۔ لیکن اس بوڑھی روح نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا۔ میں اپنی زندگی کو جھوٹی مسرتوں، جھوٹی کامیابیوں اور جھوٹی تسکین کے پیچھے بھاگنے میں ضائع نہیں کررہا۔ تم جیسے لوگوں کو ایک نہ ایک دن ضرور احساس ہوتا ہے کہ زندگی وہ نہیں تھی جو تم لوگوں نے گزاری لیکن اس وقت بہت تاخیر ہوچکی ہوتی ہے۔"

پھر میں نے چارلس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "میں تمہیں انڈین سائنس دانوں کی تیار کردہ دوا کے بارے میں بتارہا تھا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کہ دنیا بھر میں ایڈز کا علاج دریافت کرنے کے لیے زبردست کوششیں ہورہی ہیں اگر انڈین سائنس دان یہ اعلان کردیتے کہ انہوں نے اس مرض کے لیے دوا تیار کرلی ہے تو انہیں اس کو تجربات کے لیے عالمی لیبارٹریز میں پیش کرنا پڑتا جس کے بعد رفتہ رفتہ یہ عام ہوجاتی۔ اس صورت میں بھی انہیں اور ان کے ملک کو بہت فائدے پہنچتے لیکن انہوں نے ان فائدوں کو بعد کے لیے اٹھا رکھا ہے۔ فی الحال وہ اس کی بلیک مارکیٹ سے جو کچھ کماسکتے ہیں وہ کمارہے ہیں۔ وٹامنز کی گولیوں کی جو شیشیاں آپ سامنے رکھی دیکھ رہے ہیں یہ درحقیقت اسی دوا کی گولیاں ہیں۔ انہیں وٹامنز کی گولیوں کا "بہروپ" دیا گیا ہے اور شیشیوں پر وہی لیبل لگائے گئے ہیں...."

چارلس گویا اب ایک نئے زاویۂ نظر سے، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان شیشیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بات جاری رکھی۔ "انڈین سائنس دان اپنی دانست میں ان گولیوں کی معقول قیمت وصول کررہے ہیں لیکن ان کے تصور میں بھی نہیں ہے کہ انہیں مارکیٹ کرنے والے، آگے ان کی کیا قیمت وصول کررہے ہیں۔ یورپ اور امریکا وغیرہ میں ایڈز کے ایسے ایسے دولت مند مریض موجود ہیں جو اس دوا کی ایک خوراک یعنی ایک گولی کے لیے دو سو سے لے کر تین سو ڈالر تک آسانی سے ادا کردیں گے۔ ان میں سے ہر شیشی میں تقریباً ڈھائی سو گولیاں موجود ہیں اور یہ بارہ شیشیاں ہیں۔ یعنی اس وقت تمہارے سامنے آٹھ دس لاکھ ڈالر کی رقم موجود ہے۔ دھندا برا نہیں ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ انہیں مارکیٹ کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔"

چارلس نے تفہیمی انداز میں سرہلاتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگالی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "کیتھرین اس لیے بحری جہاز سے سفر کررہی تھی کہ ائرپورٹس پر کسٹم والے زیادہ باریک بین ہوتے ہیں تاہم اس میں بھی زیادہ خطرہ نہیں تھا۔ اگر کیتھرین کی یہ چھوٹی سی کھیپ مشکوک بھی قرار پاتی تب بھی زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ یہ گولیاں وٹامنز کی ثابت نہ ہوتیں، کسی نامعلوم دوا کی ثابت ہوتیں۔ جس کے لیے کیتھرین پر کوئی ذمے داری عائد نہ ہوتی۔ شیشیوں پر انڈیا کی کسی فارمیسی کا لیبل ہے۔ شاید اس کا کہیں وجود نہ ہو۔ ان ملکوں میں جعلسازی عام ہے۔ کیتھرین آرام سے کہہ سکتی تھی کہ اسے کسی نے وٹامنز کی جعلی گولیاں دے دی تھیں۔ کم از کم اس پر ہیروئن یا کوکین کی اسمگلنگ کا الزام تو نہیں آسکتا تھا لیکن ایک قیمتی کھیپ ہاتھ سے جانے کا خطرہ بہرحال موجود تھا۔"

پھر مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے مزید کہا "جہاز پر جنتر نامی جو

فرسٹ میٹ موجود تھا اسے بھی ان گولیوں کی بھنک پڑ چکی تھی۔ درحقیقت وہ ان کے چکر میں انڈیا کی متعلقہ لیبارٹری تک بھی جا پہنچا تھا کیونکہ وہ بھی ایڈز کا مریض تھا اور ابتدائی اسٹیج پر تھا۔ نہایت دل برداشتگی کے عالم میں وہ اس کا علاج تلاش کرتا پھر رہا تھا اور اس دوا کی محض اڑتی اڑتی سی خبر سن کر اس نے بڑی امیدیں باندھ لی تھیں لیکن لیبارٹری میں بیٹھے ہوئے گرگے ہر ایرے غیرے کو دوا نہیں دے سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اپنے خاص آدمیوں کو گو کہ وہ گولیاں سستے داموں دے رہے تھے لیکن جنتر وہ کم قیمت بھی افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی بد عادات کی بنا پر وہ ایک تلاش آدمی تھا۔ اس میں مجرمانہ رجحانات بھی موجود تھے۔ اسے یہ ضرور اندازہ ہو گیا کہ کیتھرین اس دوا کی کھیپ لے کر روانہ ہو رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے لگ گیا۔ سفر کے دوران وہ یقیناً کیتھرین کے کیبن کی تلاشی لے رہا تھا اور شاید اس نے گولیاں تلاش کر کے ابھی اندازہ نہیں لگایا تھا کہ یہی اس کی مطلوبہ دوا تھی' اسی دوران عملے کا ایک بنگالی آدمی عبدل اس کے سر پر جا پہنچا۔ اس نے شاید جنتر کو پرنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ جہاز کے ایک آفیسر کے لیے یہ بڑی معیوب صورت حال تھی۔ جنتر نے گھبراہٹ میں اسے قتل کر دیا۔ بعد میں لاش خالی کیبن میں رکھ دی۔ اس کا ارادہ یہی ہو گا کہ موقع ملنے پر لاش سمندر میں پھینک دے' لیکن میری وجہ سے لاش دریافت ہو گئی پھر جب چھاپے کے وقت اس نے دیکھا کہ کیتھرین تو اس کے اندازے سے پہلے ہی رخصت ہو رہی ہے اور دوا گویا اس کے ہاتھ سے جا رہی ہے تو اس نے جان پر کھیل کر اسے یرغمال بنانے کی کوشش کی۔ اس نے شاید سوچ لیا تھا کہ اسے مرنا تو ویسے بھی ہے۔ لہٰذا دردناک موت مرنے کے بجائے ایک آخری کوشش کیوں نہ کر کے دیکھ لی جائے۔ اس کوشش میں وہ میرے ہاتھوں مارا گیا۔ اگر وہ عبدل کا قاتل نہ ہوتا تو شاید مجھے اس کے مرنے کا افسوس ہوتا' اگر میں فوری قدم نہ اٹھاتا تو وہ کچھ بھی کر گزرتا۔"

چارلس جھرجھری سی لے کر سیدھا ہوتے ہوئے بولا "میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ ہم تمہارے لیے اجنبی تھے لیکن تم نے ہمارے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالی۔"

"بات دراصل یہ تھی کہ جس نے آپ لوگوں کی سفارش کی تھی وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا" میں نے ڈرنگ ٹیبل کے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے سیفٹی رمضان...؟" چارلس بولا۔

"ہاں" میں نے اثبات میں سر ہلایا "وہ خاصا بزدل اور نیم مزاحیہ سا شخص ہے لیکن میری خاطر وہ بھی اپنی جان خطرے میں ڈال سکتا ہے... بلکہ کوئی بعید نہیں' زیادہ ہی سنگین صورت حال میں وہ میرے لیے جان قربان بھی کر دے۔"

"مشرق میں بڑے عجیب عجیب کردار پائے جاتے ہیں" چارلس بولا۔

"ہر جگہ بڑے عجیب عجیب کردار پائے جاتے ہیں اور بڑے بڑے بدکردار بھی" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"کیا میں تمام رات یونہی بندھے ہاتھوں کے ساتھ بیٹھی رہوں گی؟" کیتھرین منمنائی۔

"یہ کم از کم ہتھکڑی پہن کر کسی پولیس اسٹیشن کے تفتیشی کمرے میں بیٹھنے سے تو بہتر ہے" میں نے کہا۔

"میں نے کیا کیا ہے جو پولیس مجھے پکڑنے کی جرأت کرتی؟" خوخوار بلی کی طرح غرائی' یکدم ہی اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔

"میرا دل کہتا ہے کہ اگر تم کسی چکر میں پولیس کے ہتھے چڑھ گئیں تو تمہارا ماضی تمہارے لیے مصیبت بن جائے گا" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "میرا خیال ہے تمہاری شہرت اب اس مقام پر آ رہی ہے کہ جس جہاز پر تم سفر کرو گی اس پر چھاپے پڑنے لگیں گے اور جلد ہی شاید وہ مقام بھی آ جائے کہ تمہارے باپ کا بین الاقوامی اثر و رسوخ بھی تمہارے کسی کام نہ آ سکے کیونکہ تمام ترقی یافتہ ممالک میں منشیات کے سلسلے میں پالیسیاں روز بہ روز سخت سے سخت ہوتی جا رہی ہیں۔ خصوصاً امریکا کا حال تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ کس طرح وہ... دوسرے ملکوں میں جا جا کر منشیات کے خلاف لڑ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کے دل میں ان ملکوں کی محبت جوش مارنے لگی ہے بلکہ ظاہر ہے وجہ صرف یہی ہے کہ اس سیلاب نے اس کا اپنا برا حال کر دیا ہے۔ اس کے باقی سارے مسائل تو اپنی جگہ ہیں لیکن اس مسئلے نے اسے سب سے زیادہ بدحواس کر دیا ہے۔ خیر۔ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں جو تمہیں یہ باتیں بتا رہا ہوں۔ یہ باتیں تو تم مجھ سے بہتر جانتی ہو گی لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ انسان ان سب باتوں کا علم رکھتے ہوئے بھی تباہی کے راستوں پر کیوں چلتا رہتا ہے!"

چارلس بولا "ہر انسان کو یہ امید رہتی ہے کہ باقی سب لوگ تو فلاں فلاں وجہ سے پکڑے گئے لیکن میں نے چونکہ فلاں فلاں بندوبست کیا ہوا ہے اس لیے میں نہیں پکڑا جاؤں گا۔"

کیتھرین خاموش تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہماری باتیں سن بھی رہی تھی یا نہیں۔ نصیحتوں میں سب سے بڑی خرابی یہی ہوتی ہے کہ انسان انہیں ہزاروں مرتبہ سن چکا ہوتا ہے۔ اگر نصیحتوں سے دنیا ٹھیک ہو سکتی تو آج ساری دنیا ٹھیک ہوتی کیونکہ نصیحتیں ہزاروں سال سے کی جا رہی ہیں۔ مسئلہ یہی ہے کہ چوٹ کھائے بغیر چوٹ کی تکلیف کا اندازہ نہیں ہوتا۔

"اب تم اس سلسلے میں کیا کرنا چاہتے ہو؟" چارلس نے پوچھا۔

"میں تو کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے جو کچھ معلوم ہو سکا تھا میں نے آپ کو بتا دیا۔ آپ کی بیٹی کی جو مدد میں کر سکتا تھا میں نے کر دی۔ جس نقصان سے اسے بچا سکتا تھا' بچا دیا۔ اب آپ جانیں اور آپ کی بیٹی" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"یعنی تم پولیس کو میرے بارے میں مطلع نہیں کرو گے؟" کیتھرین نے گویا یکدم خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے بارے میں کیا کیا جائے۔ یہ فیصلہ کرنا تمہارے باپ کا کام ہے۔ میں ایک اجنبی ملک میں ہوں۔ میں پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑانا نہیں چاہتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود اس وقت تمہارے باپ کی وجہ سے پولیس اور امیگریشن والوں کے ہتھے چڑھنے سے بچا ہوا ہوں۔ زیادہ فدائی فوجدار بننا میں افورڈ نہیں کر سکتا۔" میں نے صاف گوئی اور دیانت داری سے جواب دیا۔

"تم میری اس کھیپ پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کرو گے؟" کیتھرین نے گردن گھما کر آنکھوں سے شیشیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے کیا پڑی ہے ان پر قبضہ کرنے کی؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا "مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

کیتھرین نے گہری سانس لی۔ اس کے چہرے پر طمانیت پھیل گئی۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میرے بارے میں اتنی بچھی ہوئی کیوں تھی۔ وہ میری طرف سے نہ جانے کیسے کیسے بے بنیاد اندیشوں میں الجھی ہوئی تھی۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ اس نے ایسی سوسائٹی میں پرورش پائی تھی جہاں مادی فائدے ہی سب کچھ تھے۔ اس کے بعد نہ جانے کب سے وہ ان حلقوں میں سرگرم تھی جہاں منافع بخش چیزوں یا دولت کے لیے ایک پل میں دوسرے کا گلا کاٹ دیا جاتا تھا۔ جہاں کسی کے راز سے آگاہ ہونے کے بعد اسے پوری طرح مٹی میں جکڑنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس نے جب گولیاں اپنے کمرے سے غائب پائی ہوں گی تو اسے پہلا خیال یہی آیا ہو گا کہ میں نے وہ ہڑپ کرنے کی نیت سے چرائی ہیں۔

"اگر تم میرے بارے میں پولیس کو بھی مطلع کرنا نہیں چاہتے اور ان شیشیوں پر قبضہ بھی نہیں کرنا چاہتے تو تم نے مجھے باندھ کر کیوں بٹھایا ہوا ہے؟" کیتھرین نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"دھینگا مشتی سے بچنے کے لیے" میں نے سادگی سے جواب دیا "میں تمہارے وجود میں ٹوٹ پھوٹ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے تو جہاز پر تمہیں ٹوٹ پھوٹ سے بچایا تھا۔"

"اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم نے صرف پاپا کے سامنے شرلاک ہومز بننے اور ڈرامے و نصیحت سے بھرپور تقریر کرنے کے لیے شیشیاں غائب کی ہیں تو میں مار دھاڑ کی کوشش نہ کرتی اور سعادت مندی سے اگر بیٹھ جاتی بلکہ پاپا کو بھی پہلے ہی بلا لاتی اور دست بستہ تم سے درخواست کرتی کہ شیشیاں واپس دے دو" اب اس کے چہرے پر دھیرے دھیرے وہی مسکراہٹ واپس آ رہی تھی جو اسے بہت دلکش بناتی تھی۔

میں نے چارلس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ آپ کی بیٹی سدھرنے والی چیز نہیں ہے۔ آپ اسے مزید سمجھانے کی کوشش میں وقت ضائع مت کیجیے گا۔ اب آپ دونوں آرام سے جا کر سو جائیں۔ میں بھی چھ گھنٹے اس آرام دہ بستر پر نیند کے مزے لینا چاہتا ہوں۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔"

چارلس ایک ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کیتھرین کے ہاتھ کھول دیے۔ وہ کلائیاں سہلاتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بھرپور انداز میں مسکرائی اور باپ کی موجودگی کی پروا کیے بغیر انگلی سے میرا رخسار چھوتے ہوئے تحور سے لہجے میں بولی "یو آر سو کیوٹ۔" (YOU ARE SO CUTE)

پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ کلائیاں سہلاتے ہوئے بولی "لیکن تم نے ہاتھ بہت سخت مارا تھا۔ میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔"

"سخت مارا ہوتا تو تمہاری کھوپڑی چیخ چکی ہوتی اور اس وقت تم یوں نہ چہک رہی ہوتیں" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اس نے اپنی شیشیاں پیار بھرے انداز میں ایک ایک کر کے نہایت احتیاط سے اٹھائیں اور ایک تکیے کا غلاف اتار کر دھیرے دھیرے اس میں ڈالتے ہوئے چارلس کے اداس چہرے کی طرف دیکھ کر بولی "پاپا! آپ نے کبھی اپنی بیٹی کی صلاحیتوں کی قدر نہیں کی۔ کبھی میری کارکردگی پر خوش نہیں ہوئے۔ آپ کو کم از کم یہ سن کر تو خوش ہونا چاہیے کہ اس وقت سوئٹزرلینڈ میں ایک خفیہ اکاؤنٹ میں میرے نو ملین ڈالر جمع ہیں۔ اسپین کے شہر میڈرڈ میں میری ذاتی ولا ہے۔ پیرس میں ذاتی اپارٹمنٹ ہے۔ اور میں کچھ بھی نہیں کرتی... بس دنیا بھر میں گھومتی پھرتی ہوں۔ آپ بڑے ہی ناشکرے ہیں پاپا! آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کی بیٹی نے اس نوجوانی میں اتنی دولت کمائی ہے جو آپ اتنے بڑے ڈپلومیٹ ہوتے ہوئے پوری زندگی میں نہیں کما سکے اور ابھی تو میرے سامنے نہ جانے کتنی عمر پڑی ہے۔"

نو ملین ڈالر... اسپین میں ولا اور پیرس میں اپارٹمنٹ کرسن کا یقیناً چارلس کو جھٹکا لگا تھا لیکن اس کے چہرے پر ناگواری برقرار رہی۔ کیتھرین بات جاری رکھتے ہوئے بولی "اگر آپ مجھ سے نفرت کرنا... مجھے ہر وقت نصیحتیں کرنا چھوڑ دیں تو آپ بھی اس دولت سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی گندی دولت پر... ڈرگ منی پر" چارلس تیزی سے بولا "اور جہاں تک لطف اندوز ہونے کا سوال ہے تو تم اس دولت سے کتنا لطف اندوز ہو رہی ہو؟ دولت تو بیکوں میں پڑی ہے... تم تو محض چند کپڑے اٹھائے ادھر سے ادھر خانہ بدوشوں کی طرح پھر رہی ہو۔ یہ کام تو تم میرے وسائل سے بھی کر سکتی تھیں۔ رہنے کے لیے بھی ہمارے پاس لندن میں طویل و عریض حویلی نما آبائی مکان موجود ہے..."

کیتھرین نے میری طرف دیکھ کر یوں حترم لیکن استہزائیہ سا قہقہہ لگایا جیسے کہہ رہی ہو "اس خبطی بڈھے کی سمجھ میں میری بات نہیں آئے گی۔"

چارلس بولا "ایسے ہی کسی سفر کے دوران تم کسی ائرپورٹ یا

بندرگاہ پر زندہ کے بجائے مُردہ حالت میں اترو گی اور تمہاری ساری دولت خفیہ اکاؤنٹ میں پڑی رہ جائے گی۔"

"یہ تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں ایسی حیرت یا عبرت کی کیا بات ہے" کیتھرین بولی۔

"فرق صرف یہ ہے کہ جائز ذرائع سے دولت کمانے والوں کا ضمیر اس وقت بھی مطمئن ہوتا ہے جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہوتے ہیں" چارلس بولا۔

"جائز ذرائع... ضمیر...!" کیتھرین استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ "پاپا' میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ آج کے دور میں یہ باتیں بے معنی ہو چکی ہیں۔"

"تم جیسے لوگوں کے لیے یہ باتیں ہر دور میں بے معنی رہی ہیں" چارلس شکست خوردہ سے انداز میں گہری سانس لے کر بولا "وہ لوگ ہی دوسرے ہوتے ہیں جن کے لیے یہ باتیں ہمیشہ سے بامعنی تھیں اور ہمیشہ بامعنی رہیں گی۔ چلو... آؤ اپنے اپنے کمرے میں چلیں۔ تمہارا ضمیر تو سو رہا ہے' اب تم بھی سو جاؤ۔"

کیتھرین نے بڑی ادا سے مسکرا کر تین انگلیاں ہلا کر مجھے گڈ نائٹ کہا اور باپ کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ میں نے لائٹ بجھائی اور دھم سے بستر پر گر گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ذہن میں بھی کسی نے کوئی سوئچ آف کر دیا تھا۔ میں جلد ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

دوسرے روز تقریباً دوپہر کو ہم تینوں ناشتے کے لیے میز پر یکجا ہوئے۔ اتفاق سے تینوں ہی تقریباً ایک ساتھ تیار ہو کر ڈائننگ روم میں پہنچے تھے۔ کیتھرین اب بالکل تازہ دم نظر آ رہی تھی۔ وہ شوخ سرخ رنگ کے ایک عجیب سے لباس میں تھی اور پیرس کا کوئی ماڈل نظر آ رہی تھی۔ اس کا وجود غالباً فرانس ہی کی کسی بیش قیمت خوشبو میں نہایا ہوا تھا۔ اس خوشبو کے علاوہ اب دولت کی خوشبو بھی اس کے وجود سے پھوٹ رہی تھی۔ اب واقعی اس پر نظر ڈالتے ہی احساس ہوتا تھا کہ وہ ایک دولت مند لڑکی تھی۔ اس نے سیاحوں جیسے حُلیے کو فی الحال خیرباد کہہ دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گویا اس کی حرکات و سکنات میں بھی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ واقعی بہت بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔

میز پر بیٹھتے ہوئے وہ کنپٹی مسل کر دھیمے لہجے میں بولی "رات والی چوٹ خاصی تکلیف دینے لگی تھی۔ پین کلر کھا کر آئی ہوں۔"

"اگر میں نے اپنا دفاع کرنے میں پھرتی نہ دکھائی ہوتی تو اس وقت میری روح عالم بالا میں کہیں بھٹک رہی ہوتی۔ اسے تو کوئی پین کلر واپس بھی نہیں لا سکتا تھا۔ فی الحال تو بات پین کلر پر ہی ٹل گئی ہے ڈیئر کلر!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ دھیرے سے ہنس کر رہ گئی۔

ناشتا کرتے ہی چارلس میز سے اٹھ گیا۔ وہ چند لمحے کے لیے اپنے کمرے میں گیا پھر بریف کیس اٹھائے کمرے سے نکلا اور کچھ بتائے بغیر تیزی سے رخصت ہو گیا۔ وہ کچھ پریشان معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ذہن پر کوئی بوجھ تھا اور میرا اندازہ تھا کہ یہ بوجھ اور پریشانی کیتھرین کے علاوہ تھی۔

میں اور کیتھرین ابھی ناشتے کی میز پر ہی موجود تھے۔ میں کافی دنوں بعد نہایت عمدہ کافی میسر آنے پر دھیرے دھیرے چسکیاں لیتے ہوئے لطف اندوز ہو رہا تھا جبکہ کیتھرین نے سگریٹ سلگا لی تھی۔ اس سے پہلے میں نے اسے سگریٹ پیتے نہیں دیکھا تھا۔

دھوئیں کے لہروں کے عقب سے وہ نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ بظاہر وہ بالکل پُرسکون تھی لیکن میرا اندازہ تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی کھچڑی سی پک رہی تھی۔ دفعتاً وہ بولی "لوگ تم سے زیادہ بے تکلف ہوں گے یا زیادہ قریب ہوں گے کہ تمہیں انی کہہ کر پکارتے ہوں گے؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا "لیکن تمہیں اچانک یہ پوچھنے کا خیال کیوں آ گیا؟"

"اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بھی تمہیں انی کہہ کر پکاروں؟" اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"اعتراض...؟" میں نے آنکھیں پٹ پٹائیں "یہ تو میرے لیے ایک اعزاز ہو گا" پھر میں نے خواب ناک سے لہجے میں کہا "کسی حسین لڑکی کے منہ سے انی کے نام سے پکارے جانا کتنا بھلا لگتا ہے۔"

"خواہ مخواہ دل پھینک نظر آنے کی کوشش مت کرو۔" وہ بدستور سنجیدگی سے بولی "مجھے اندازہ ہے کہ تم دل پھینک نہیں ہو۔"

"میرے بارے میں خواہ مخواہ اندازے وغیرہ قائم کرنے کی کوشش مت کرو۔ میں تو بہت ہی "بے اندازہ" قسم کا شخص ہوں۔ میرے بارے میں اکثر لوگوں کے اندازے غلط ہو جاتے ہیں" میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اچھا...!" اس نے بے یقینی سے آنکھیں پھیلائیں لیکن دوسرے ہی لمحے بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی "خیر دیکھا جائے گا۔"

میں نے ذرا اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا "لیکن تم اس قدر سنجیدہ اور تیز دار کیسے ہو گئیں کہ مجھے انی کے نام سے پکارنے کے لیے بھی تمہیں اجازت لینے کی ضرورت آن پڑی؟"

"میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں؟" وہ بھی ذرا میری طرف کو جھکتے ہوئے نیچی آواز میں بولی۔

"ضرور... ضرور" میں نے گرم جوشی سے کہا۔

"میں اب سُدھرنا چاہتی ہوں لیکن میں جاننا چاہتی ہوں کہ سُدھر کر مجھے کیا ملے گا؟"

"سکون" میں نے بلا تامل جواب دیا۔

"بس؟" اس نے مایوسی سے پوچھا۔

"گویا سکون کی تمہاری نظر میں کوئی اہمیت نہیں؟ لوگ تو اس کی خاطر اپنی ساری دولت لٹانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں" میں نے کہا۔

وہ منہ بنا کر بولی "پتا نہیں تم کس دنیا کی بات کر رہے ہو۔ نہیں سکون عزیز ہوتا ہے وہ دولت کے چکر میں پڑتے ہی نہیں... اور جب ایک بار انسان دولت کے چکر میں پڑ جاتا ہے تو پھر دولت کے سوا اسے کوئی چیز عزیز نہیں رہتی۔ تم اگر مجھے سُدھرتے دیکھنا چاہتے ہو تو سکون کے علاوہ مجھے کسی اور چیز کا بھی لالچ دو۔ مجھے بتاؤ کہ سکون کے علاوہ مجھے کیا ملے گا؟"

"میں کیا بتا سکتا ہوں..." میں نے ذرا گڑبڑا کر کہا "تم ہی بتا دو تم اور کیا حاصل کرنا چاہتی ہو؟"

"میں تمہیں حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ بتاؤ... کیا تم مجھے مل سکتے ہو؟" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بلا ہچکچاہٹ بولی۔

مجھے خفیف سا جھٹکا لگا۔ میں نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مجھے خاموش دیکھ کر استہزائیہ انداز میں ہنسی اور بولی "مٹی کیوں گم ہو گئی؟ کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہیں حاصل کر سکوں؟"

میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا "نہیں... تم تو اس سے کہیں زیادہ قابل ہو... دراصل میں ہی اس قابل نہیں ہوں کہ تمہارا بن سکوں۔ میں تو بہت ہی معمولی' بہت ہی نالائق سا آدمی ہوں۔ تمہیں مجھ میں ایسی کیا خوبی نظر آئی؟"

اس نے بدمزگی سے منہ بنایا اور ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھا ہوا میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی "یہ بلاوجہ کی افسانوی سی کسرِ نفسی سے کام لینا چھوڑو۔ میرا تمہارا ساتھ بے شک بہت مختصر رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ابھی میں نے تمہاری اصل شخصیت کی محض ایک جھلک ہی دیکھی ہے لیکن مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم کیا ہو..."

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "عزت افزائی کا بہت شکریہ۔ اگر تم مجھے کوئی "چیز" سمجھ رہی ہو تو یہ تمہارا حسنِ نظر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں تو خود کو بہت ہی معمولی' بہت ہی نکما سا انسان سمجھتا ہوں۔"

وہ میرے الفاظ پر توجہ دیے بغیر بولی "میں بہت سنجیدہ ہوں... بلکہ یوں کہو کہ میں زندگی میں پہلی بار سنجیدہ ہونے لگی ہوں۔ مجھے احساس ہوا ہے کہ میں واقعی بہت جلد تھک گئی ہوں۔ میں نے دنیا گھوم لی ہے۔ ہر خطرے سے کھیل کر دیکھ لیا ہے لیکن کسی کام میں کچھ نہیں رکھا۔ انسان اپنی زندگی' اپنی خواہشات کو جتنا بھی محدود رکھے اتنا ہی اچھا ہے۔ وہ اتنا ہی مزے میں رہتا ہے اور زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی خوشیوں سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جتنے بڑے ہوتے جاتے ہیں اتنا ہی اس کی زندگی سے خوشیاں رخصت ہوتی جاتی ہیں۔ اسے کچھ بھی پالینے کی خوشی نہیں ہوتی۔"

"یہی تو میں اور تمہارے پاپا تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے" میں نے جلدی سے کہا۔

"جب میں سمجھنے لگی ہوں... جب میرے دل میں تمہاری قدر اور پاپا کی محبت بیدار ہوئی ہے تو تم کیوں دور لگا رہے ہو؟ تم کیوں پیچھے ہٹ رہے ہو؟" وہ میرا ہاتھ اپنے گداز ہاتھ میں مضبوطی سے تھامتے ہوئے بولی "میں اب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تم سے شادی کر کے کسی پُرسکون سے مقام پر گھر بسا کر بیٹھنا چاہتی ہوں۔ پاکستان... انگلینڈ... یا کوئی بھی اور ملک... جہاں تم کہو وہاں کسی پُرسکون اور خوب صورت سے شہر میں رہائش اختیار کر کے ہم اپنی جنت تعمیر کرتے ہیں۔ زندگی کا ایک نیا دور شروع کرتے ہیں... بلکہ یوں کہو کہ اصل زندگی شروع کرتے ہیں۔ ہم یہ سمجھیں گے کہ اب تک تو ہم نے خود کو برباد ہی کیا تھا۔ زندگی کو ضائع ہی کیا تھا۔"

"یہی تو مسئلہ ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "سکون ہی تو میری زندگی میں نہیں ہے۔ میرے ساتھ رہ کر تو تمہاری زندگی میں اگر کوئی تھوڑا بہت سکون ہے بھی... تو وہ بھی برباد ہو جائے گا۔"

"کیوں... کیا تم بھی دولت کے چکر میں ہو؟" اس نے مجھے گھورا۔

"نہیں" میں نے بلا تامل جواب دیا۔

"تو پھر تمہاری زندگی میں سکون کیوں نہیں ہے؟ تمہاری اب تک کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا جیسے صرف ناجائز دولت کے چکر میں رہنے والوں کی زندگی میں سکون نہیں ہوتا۔ باقی سب چین کی بانسری بجا رہے ہوتے ہیں۔"

"نہیں... یہ بات نہیں ہے..." میں نے گڑبڑاتے ہوئے کہا "آج کی زندگی میں ہر ایک کے لیے پریشانیاں اور مسائل تو ہوتے ہیں... لیکن میرا مقصد یہ تھا کہ زیادہ تر مسائل ہمارے اپنے پیدا کردہ ہوتے ہیں... ہماری خواہشات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں... اگر ہم خواہشات پالنا یا انہیں زیادہ پھیلانا چھوڑ دیں تو مسائل کافی کم ہو سکتے ہیں... لیکن بعض اوقات خواہ مخواہ بھی مسائل ہمیں آن چمٹتے ہیں۔ کسی بیماری کے وائرس کی طرح ہم پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ ان کی مثال کچھ ایسی ہی ہوتی ہے کہ میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ میری زندگی بھی کچھ ایسے ہی مسائل کا شکار ہے۔ میرے ساتھ رہ کر تم بھی پہلے سے زیادہ پریشان ہو جاؤ گی۔"

"اس کا مطلب ہے تمہارا پہلا فلسفہ غلط تھا۔ پریشانیاں کسی بھی حال میں انسان کا مقدر ہو سکتی ہیں" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

"بے شک" میں نے تسلیم کر لینے میں ہی عافیت سمجھی۔

"چلو... میں ایک وفا شعار بیوی کی حیثیت سے ہر پریشانی میں بھی تمہارا ساتھ دوں گی۔ تمہیں کچھ اندازہ تو ہو گیا ہو گا۔ مزید اندازہ آگے چل کر ہو جائے گا... میں بہت باصلاحیت لڑکی ہوں۔

مجھے تم کسی بھی قسم کے حالات میں خود پر بوجھ محسوس نہیں کروگے۔ میں تمہارے لیے سہارا ہی ثابت ہوں گی' بوجھ نہیں۔"

"مجھے اس میں کوئی شک نہیں کیتھرین!" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "تم بلاشبہ بہت اچھی.... بہت باصلاحیت لڑکی ہو.... اور میں درحقیقت تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے قابل سمجھا لیکن میرے حالات کچھ ایسے ہیں کہ میں ابھی شادی نہیں کرسکتا۔"

"اگر انسان حالات میں الجھا رہے تو وہ زندگی بھر شادی نہیں کرسکتا۔ کوئی نہ کوئی الجھن' کوئی نہ کوئی پریشانی' کوئی نہ کوئی دشواری تو ہمیشہ ہی لاحق رہتی ہے۔ شادی تو ایک ایسا کام ہے کہ انسان جب سوچ لے کہ اسے کرنی ہے تو بس کر گزرے۔"

"میں ابھی خود کو اسی بات کا تو قائل نہیں کرپاتا" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر اپنا گداز ہاتھ پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی "تم صرف جان چھڑانے کے لیے اتنی لمبی بحث و تمحیص کا سہارا لے رہے ہو حالانکہ میں دنیا کے کسی بھی خطے میں کسی بھی نوجوان پر اس طرح شادی کے لیے زور دیتی تو وہ خوشی سے اچھل پڑتا۔ خصوصاً جب میں کوئی شرط عائد نہ کرتی.... میری طرف سے کسی قسم کا کوئی مطالبہ نہ ہوتا اور اسے یہ بھی معلوم ہوتا کہ میں کتنی دولت مند ہوں۔"

"مجھے اس میں ہرگز شک نہیں کہ کوئی بھی نوجوان اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا کہ تم اسے اپنا شریکِ زندگی منتخب کرتیں" میں نے خلوص سے کہا "یہ محض میری بدقسمتی ہے کہ تم مجھے زندگی کے غلط موڑ پر.... یا پھر شاید غلط وقت پر ملی ہو۔ میں مجبور ہوں۔ تم سے شادی نہیں کرسکتا۔"

وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنسی "میں نے تو سنا تھا کہ مشرق میں صرف لڑکیاں مجبور ہوتی ہیں۔ آج پہلی بار ایک لمبے تڑنگے' آزاد اور خود مختار نوجوان کو مجبور دیکھا ہے۔"

"مجبور تو کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ مجبوریوں کی الگ الگ نوعیتیں ہوتی ہیں" میں نے جواب دیا۔

"میں انتظار بھی کرسکتی ہوں۔ میں نے سنا ہے مشرقی لڑکیاں بڑی ایثار پسند اور صابر ہوتی ہیں۔ بعض لڑکیاں تو ساری عمر اپنے خوابوں کے شہزادے کے انتظار میں گزار دیتی ہیں۔ میں ایک مغربی لڑکی ہوتے ہوئے بھی تمہیں وفا شعاری اور ایثار کی مثال قائم کرکے دکھا سکتی ہوں۔"

"وفا مشرق یا مغرب کی میراث نہیں۔ وہ کہیں بھی پائی جاسکتی ہے۔ کہیں کم' کہیں زیادہ" میں نے مربیانہ لہجے میں کہا "اگر بے وفائی کو مغرب ہی کا تحفہ سمجھا جائے تو اب ہمارے ہاں بھی تمہاری سب برائیاں دھیرے دھیرے چلی آرہی ہیں۔ مشرق اب وہ مشرق نہیں رہا۔ وہ وفا شعاریوں کے قصے' وہ ایثار کی باتیں' وہ عمر بھر انتظار کی باتیں' سب خواب و خیال ہوتی جارہی ہیں۔ تو نہیں اور سہی کا زمانہ ہے۔ آج شادی' کل طلاق کا دور ہے۔ میں اپنی زندگی کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کل کیا ہوگا؟ معلوم نہیں کل میں زندہ بھی ہوں گا یا نہیں۔ میں خواہ مخواہ تمہیں اپنے انتظار میں لٹکا کر تمہاری زندگی کے حسین اور سنہرے ماہ و سال ضائع نہیں کرانا چاہتا۔"

"یوں تو کسی کی بھی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں" وہ بولی "خصوصاً مجھ اور تم جیسے مہم پسندوں کی زندگی کا تو بالکل ہی کوئی بھروسا نہیں ہوتا لیکن اس اندیشے سے لوگ اپنے کام ترک نہیں کردیتے۔ خواہشوں کو خیرباد نہیں کہہ دیتے.... بلکہ اس طرز زندگی میں تو لوگ خواہشوں کی تکمیل میں تیزی دکھانے لگتے ہیں۔ ہر خوشی کو جھپٹ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ نہ جانے کل موقع ملے یا نہیں۔ راہ چلتے شادی کرلیتے ہیں۔"

"اور راہ چلتے ہی طلاق ہوجاتی ہے۔" میں نے بے ساختہ کہا "میں اس قسم کی شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"مجھ جیسی لڑکیوں کی جب کایا پلٹتی ہے تو وہ بڑی عجیب بیویاں ثابت ہوتی ہیں۔ شاید تمہارا کبھی مجھے چھوڑنے کو دل نہ چاہے۔"

اس لڑکی پر یکدم یہ عجیب ہی سنک سوار ہوئی تھی۔ وہ گویا مجھے قائل کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

ادھر میرا یہ عالم تھا کہ میں اس سے شادی کے موضوع پر بات کررہا تھا لیکن میرے ذہن میں بار بار راحیلہ کی تصویر ابھر رہی تھی۔ مجھے نہ جانے کس کس نے شادی کرنا چاہی تھی لیکن ایک میں تھا کہ اس بدبخت کی "ہاں" کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک بے عنوان سی ندامت اور خجالت کے تحت "ہاں" نہیں کرتی تھی۔ خود کو سزا دے رہی تھی۔ ورنہ ویسے مجھ پر زندگی نچھاور کررہی تھی۔ "جان دے دینا" محض لفظوں کی حد تک بہت آسان لگتا ہے لیکن درحقیقت یہ بڑا مشکل کام ہے۔ اس افسانوی جملے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے اپنا لہو بہادینا بڑے جگر کا کام ہے لیکن مجھے معلوم تھا راحیلہ یہ کام کرسکتی تھی.... بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کررہی تھی۔

باقی آوارہ گردیاں اپنی جگہ تھیں لیکن شادی کا مسئلہ میرے خیال میں بڑا نازک تھا۔ میں راحیلہ کی "ہاں" کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا اس کی زندگی میں کوئی کمزور لمحہ ضرور آئے گا جب وہ اپنی ندامت' اپنی خجالت کو بھول جائے گی' اپنی خواہ مخواہ کی عذرداری' انکار اور تکرار سے نکل آئے گی۔ اس کے اندر کوئی کوئی ایسی ہوک ضرور اٹھے گی جب وہ اچانک ہاں کردے گی۔ میں اس لمحے کے انتظار میں تھا۔ یہ انتظار ہی ہر دوسری جگہ میرے انکار نکلوا تا تھا۔

دفعتاً کیتھرین سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور گہری سنجیدگی سے بولی "میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں

لٹانا چاہتی ہوں۔"

اوپر اپنے بیڈ روم میں پہنچ کر اس نے دروازہ مقفل کردیا اور ہر مجھ پر چودہ طبق روشن ہوگئے۔ مجھے اچانک ہی پتا چلا کہ وہ مجھے ورکچھ نہیں صرف اپنا آپ دکھانا چاہتی تھی۔ کیا وہ اپنی ضد کی تتی ہی پکی تھی یا پھر اس کے عزائم کچھ اور تھے؟ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے تم اپنے آپ میں نہیں ہو۔ میں اپنے کمرے میں چلتا ہوں۔"

"ہاں.... میں اپنے آپ میں نہیں ہوں...." وہ مرمریں بانہیں میرے گلے میں حمائل کرتے ہوئے بولی "لیکن کیا تم واقعی اتنے احمق ہو کہ اس وقت اپنے کمرے میں جانا چاہتے ہو؟"

"وہ.... دراصل...." میں ہکلا کر رہ گیا۔ میرا گلا خشک ہورہا تھا۔ فطرت کے تقاضے اپنی جگہ تھے۔ میں کوئی مافوق الفطرت انسان نہیں تھا کہ اس کی حرکتوں سے متاثر نہ ہوتا لیکن میرے ذہن کے کسی گوشے میں کوئی اندیشہ سا ڈنک مار رہا تھا "کیا وہ میرے ساتھ کسی قسم کا کھیل کھیل رہی تھی؟ کیا وہ مجھے کسی طرح بلیک میل کرنے کا کوئی بندوبست کررہی تھی؟ یا وہ واقعی خواہشوں کے جنگل میں اتنا آگے نکل گئی تھی کہ ہر قیمت پر مجھے اپنا طلب گار بنالینا چاہتی تھی؟"

مجھے وہ دکان دار یاد آرہے تھے جو آپ کے ہاتھ اپنی پتلون بیچنے کے لیے بڑے اصرار سے کہتے ہیں "جناب! وہ کونے میں ڈریسنگ روم میں جاکر پہن کر دیکھ لیجیے.... بڑی لاجواب چیز ہے...."

لیکن میرے خیال میں پتلون اور عورت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

اندیشے' سوالات اور خیالات اپنی جگہ تھے' جذبات اپنی جگہ.... میں نے ادھر اُدھر کھسکنے کی کوششیں ترک کردیں اور پیش قدمی کا جواب پیش قدمی سے دینے لگا۔ تب وہ مخمور سے انداز میں ہنسی اور بولی "تم نے صحیح کہا تھا' مغرب دھیرے دھیرے مشرق میں سرایت کرتا جارہا ہے۔ تم مشرقی بھی کتنے بدمعاش ہوگئے ہو۔ عیاشی کا کوئی موقع ملے تو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے لیکن شادی کے نام پر بہانے گھڑنے لگتے ہو۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں اس وقت کسی اور فضا میں پرواز کررہا تھا۔ میں خوابکے جزیروں کے سفر پر تھا اور واپس آنا نہیں چاہتا تھا۔ تاہم اس کی بات سن کر اور اس کے لہجے کے طنز کو محسوس کرتے ہوئے مجھے کچھ یوں لگا جیسے وہ یکدم مجھے زور سے پرے دھکیل دے گی اور بالکل بدلے ہوئے لہجے میں کہے گی "دفع ہوجاؤ یہاں سے.... اور آئندہ میری طرف آنکھ اٹھا کے بھی مت دیکھنا۔"

تاہم ایسا نہیں ہوا۔ اس نے صرف طنز کا ہلکا سا نشتر چبھونے پر ہی اکتفا کیا لیکن چند لمحے بعد وہ بولی "میرا خیال ہے تمہیں ایک ضروری بات بتادوں تو بہتر ہوگا۔"

"حیرت ہے.... تمہیں اس وقت بھی باتیں کرنے کا ہوش ہے؟" میں نے بدلی بدلی سی آواز میں کہا۔

"بات بہت ضروری ہے" وہ لڑکھڑاتی سی آواز میں بولی "میں ایڈز کی مریضہ ہوں۔"

"کیا...؟" مجھے گویا کئی ہزار وولٹ کا جھٹکا لگا۔ جذبات کا سارا نشہ یک لخت اتر گیا۔ میں یوں کئی قدم پیچھے ہٹ گیا جیسے کسی نے مجھے دھکا دیا ہو۔ وہ ہنستے ہنستے دُہری سی ہوگئی۔

"دیکھا.... ایک لمحے میں کیسے ہوش میں آگئے!" بالآخر وہ ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی حالانکہ وہ خود بھی اس طرح چاق و چوبند نظر آنے لگی تھی جیسے بے خودی اسے چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ معلوم نہیں وہ پہلے اداکاری کررہی تھی یا اب اپنے آپ پر ایک ہی لمحے میں قابو پالینے کا حیرت انگیز مظاہرہ کررہی تھی۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اسے بار بار دوسرے کے ذہن کو جھٹکا لگانے کا فن خوب آتا تھا۔

"بات ہی ایسی ہے" میں نے سنبھلتے ہوئے کہا "بہرحال میں تمہارا ازحد شکر گزار ہوں کہ بروقت تم نے یہ بات مجھے بتادی.... ویسے.... جس طرح تمہیں یہ مرض کسی سے لگا ہوگا' کیا اسی طرح تم نے بھی یہ تحفہ آگے کچھ لوگوں تک پہنچایا ہے؟ دانستہ یا نادانستہ طور پر....؟"

"اس معاملے کو راز ہی رہنے دو۔" وہ شریر سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی لیکن یہ اس سنسنی سے بہت مختلف تھی جو چند لمحے پہلے میرے رگ و پے میں دوڑ رہی تھی۔ میں گویا اپنی جھونک میں کسی بھیانک گڑھے کے عین کنارے پر پہنچ گیا تھا لیکن آخری لمحے پر کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا تھا۔

میں نے ایک نئے زاویۂ نگاہ سے اس کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے کہا "لیکن تم ایڈز کی مریضہ لگتی تو نہیں؟"

"ایڈز کے مریضوں کے کوئی سینگ تو نہیں نکل آتے" وہ بدستور شوخ لہجے میں بولی "حالت تو آخری اسٹیج پر جاکر بگڑتی ہے۔ میں تو ابھی ابتدائی اسٹیج پر ہوں۔"

"تمہیں پتا کیسے چلا؟"

"مجھے شبہ ہوا تھا۔ میں نے ٹیسٹ کرایا۔ ٹیسٹ سے یقینی طور پر معلوم ہوگیا" اس کا لہجہ بدستور شوخ و شگفتہ تھا۔ اس کے چہرے پر بھی اس انسان کی سی مایوسی و درماندگی کی کوئی پرچھائیں نہیں تھی جسے معلوم ہو کہ وہ ایک بھیانک' لاعلاج مرض میں مبتلا تھا اور دردناک موت دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اچانک میرا ذہن ایک امکان کی طرف گیا اور میری سمجھ میں آیا کہ اس کے اطمینان کی وجہ کیا ہوسکتی تھی۔ میں نے چونکتے ہوئے کہا "تمہارے پاس تو ایڈز کا علاج موجود ہے۔ کیا تم نے وہ گولیاں نہیں آزمائیں؟"

وہ ایک بار پھر شریر سے انداز میں ہنسی اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "اب میں تمہیں سچ بات بتا ہی دوں۔ میں ایڈز میں مبتلا ضرور ہوئی تھی لیکن بہت جلد ہی مجھے پتا چل گیا۔ میں نے وہی گولیاں استعمال کی تھیں۔ میں بالکل صحت مند ہو گئی تھی۔ میں نے پچھلے دنوں اپنا ایچ آئی وی ٹیسٹ کرایا تھا۔ رزلٹ نیگیٹو نکلا تھا۔ اب میرے خون میں ایڈز کا وائرس نہیں پایا جاتا۔"

"چلو یہ تو اچھا ہوا" میں نے گہری سانس لی۔

"اب تو میں تمہارے قریب آسکتی ہوں نا؟" اس نے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر ایک بار پھر میرے گلے میں بانہیں حمائل کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے نرمی سے اسے روک دیا۔

"دیکھو..." میں نے ملائمت سے کہا "جہاں تک اٹھا کی بنی ہوئی ان گولیوں کا تعلق ہے تو اپنے دل کو تسلی دینے یا ان کے ذریعے لاکھوں' کروڑوں کا کاروبار کرنے کی حد تک تو وہ ٹھیک ہیں... عین ممکن ہے ان سے علاج ہو بھی جاتا ہو... انسان کی جان بچ جاتی ہو اور وہ طبعی عمر گزار لیتا ہو... لیکن میں محض ان کی بنیاد پر اپنے لیے رسک لینے کو تیار نہیں ہوں۔"

"اوہ... میرے خدا...!" وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنسی "انسان کو زندگی کتنی پیاری ہوتی ہے۔"

"بے شک۔ انسان کو جان سے زیادہ کچھ پیارا نہیں... لیکن میں جان کے معاملے میں اس طرح بزدل نہیں جس طرح تم سمجھ رہی ہو۔ میں نے جان جانے کے تصور سے کبھی اپنے آپ کو خوف زدہ محسوس نہیں کیا۔ اگر کسی دشمن سے لڑتے ہوئے... یا کسی اصول کی خاطر لڑتے ہوئے جان جانے کا معاملہ ہو تو میں ایک لمحے کے لیے بھی خوف زدہ نہیں ہوں گا لیکن تین طرح کی موت سے مجھے بڑا خوف آتا ہے۔ ایک تو یہ کہ آپ بڑے اطمینان سے کہیں چلے جا رہے ہوں کہ اچانک کوئی آوارہ گولی آکر آپ کو لگ جائے اور آپ پٹ سے گر کر آوارہ کتے کی طرح مر جائیں۔ یہ ایک عجیب بے مصرف سی موت ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ کسی گروہ کے قابو میں آجائیں اور وہ آپ کو یکدم مارنے کے بجائے اذیتیں دے دے کر زیادہ سے زیادہ دیر میں ہلاک کرے۔ یہ بھی ایک عجیب بے بسی' بے چارگی کی کربناک موت ہے۔ تیسرے یہ کہ آپ کسی ناقابلِ علاج اور غلیظ سی بیماری میں مبتلا ہو کر بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مریں۔ میں نے ہمیشہ خدا سے دعا کی ہے کہ وہ مجھے اس طرح کی موت سے بچائے۔ جس طرح انسان خدا سے ڈھنگ کی زندگی کی دعا کرتا ہے اس طرح موت بھی ڈھنگ کی مانگنی چاہیے۔ آگے جو اللہ کی مرضی..." میں نے گہری سانس لی۔

"واہ... واہ... بہت خوب!" کیتھرین نے تالی بجائی پھر بیڈ کے کنارے پر بیٹھتی ہوئی بولی "اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ میں تو تم سے مذاق کر رہی تھی۔ سرے سے ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے... تو...؟"

"تو میں یہ کہوں گا کہ یہ ایک نہایت ہی واہیات مذاق تھا اور بہت ہی غلط وقت پر کیا گیا تھا۔ اس نے میرے دل میں وہم کا بیج بو دیا ہے جو کسی طرح بھی میرے دل سے نہیں نکل سکتا" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

تب وہ نہ جانے کیوں ہنستے ہنستے بستر پر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ میرا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ میری سنجیدگی دیکھ دیکھ کر اسے زیادہ ہنسی آرہی تھی۔ اس کی ہنسی ذرا تھمی تو وہ اپنے کے سے انداز میں بولی "چلو... یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ تمہارے دل میں وہم بیٹھ گیا... لیکن پھر بھی... تم ذرا بچ کر رہنا... کیونکہ میرا دل تم پر آگیا ہے۔"

میں نے سر کھجاتے ہوئے منہ پھیر کر کہا "میں چلتا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ میں دروازہ کھولتا' دروازے پر دستک ہوئی۔ کیتھرین نے اپنے لباس کی طرف لپکتے ہوئے بہ آواز بلند پوچھا "کون ہے؟"

"میں ہوں... چارلس" باہر سے آواز آئی۔

میں سٹپٹا گیا لیکن کیتھرین کو کوئی تشویش نہ ہوئی۔ وہ نہایت ہموار لہجے میں بولی "ایک منٹ پاپا..."

اب میرا دروازہ کھول کر باہر جانا مناسب نہیں تھا۔ میں وہاں حتی الامکان مدبرانہ انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر کاؤچ پر بیٹھا اور دیوار سے ٹیک لگالی۔ کیتھرین نے صحیح حالت میں آنے میں بڑی پھرتی دکھائی اور دروازہ کھول دیا۔ چارلس برف کیس اٹھائے کمرے میں آگیا۔ اس کے چہرے پر اب بھی پریشانی مترشح تھی۔ کمرے میں میری موجودگی کو اس نے قطعاً کوئی اہمیت نہیں دی اور نہ ہی غالباً اسے یہ گمان گزرا کہ اس کی آمد سے پہلے کمرے میں کوئی ڈراما جاری تھا بلکہ الٹا وہ ہیٹ اتار کر سر کھجاتے ہوئے ذرا طمانیت سے بولا "خدا کا شکر ہے کہ تم دونوں گھر پر موجود ہو۔ میں اس وقت خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ایک ضروری کام سے ایک بار پھر باہر جانا تھا لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھ میں ہمت نہیں ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا' کیتھرین باپ کے قریب پہنچ کر محبت سے اس کے گلے میں بانہیں حمائل کرتے ہوئے بولی "تم کیا ہے پاپا؟ میں جب سے یہاں پہنچی ہوں آپ کو کچھ پریشان دیکھ رہی ہوں۔ لگتا ہے میرے علاوہ بھی کوئی آپ کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔ کم از کم میری طرف سے تو اب آپ پریشان ہونا چھوڑ دیجیے۔ میرے علاوہ اگر آپ کو کوئی پریشانی لاحق ہے تو بتائیے۔"

چارلس نے آنکھیں پھاڑ کر بیٹی کی طرف دیکھا۔ شاید اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ کیتھرین ہی تھی جو اس سے ایسے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔ "میرے کان بچ رہے ہیں کیا واقعی تمہارے لہجے میں وہ اپنائیت اور شیرینی ہے جسے محسوس کر کے

کے لیے میں ترس رہا تھا؟"

"اوہ... چھوڑیں پاپا! اولاد اپنی ضد یا مہم پسندی میں کتنا ہی آگے نکل جائے' والدین سے اس کا رشتہ ٹوٹ تو نہیں سکتا۔" وہ کاؤچ پر ہی اپنے پاپا کی بائیں طرف ٹک گئی۔ دائیں طرف میں تھا۔ چارلس کبھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا کبھی میری طرف۔

کیتھرین نہایت سنجیدگی سے بات جاری رکھتے ہوئے بولی "ماں کی محبت سے تو میں برسوں پہلے ہی محروم ہو چکی تھی۔ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے آپ جیسا محبت کرنے والا باپ میسر تھا ورنہ ہماری سوسائٹی میں تو اولاد کے جوان ہونے کے بعد اولاد کو ماں باپ کی اور ماں باپ کو اولاد کی پروا ہی نہیں ہوتی کہ وہ کہاں رہ رہے ہیں' کس حال میں ہیں۔ میں بدنصیب تھی جو آپ کی محبت سے استفادہ نہیں کر پا رہی تھی۔ مجھے اس کی قدر ہی نہیں تھی کہ یہ کیسی انمول چیز ہے لیکن اب مجھے احساس ہو گیا ہے۔ آپ سے لاتعلق ہو کر میں نے اپنی زندگی میں بہت بڑا خلا پیدا کر لیا تھا۔"

"خدایا... میں کس طرح تیرا شکر ادا کروں؟" چارلس دونوں ہاتھ چھت کی طرف اٹھا کر خالصتاً شیکسپیئر کے ڈراموں والے انداز میں بولا پھر ایک بازو کے حلقے میں کیتھرین کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے رخساروں پر آنسو پھیل رہے تھے۔ یہ کمبخت گورے ویسے بہت بے حس سے لگتے ہیں' اپنے جذبات کے اظہار میں بخیل ہی لگتے ہیں لیکن جب جذبات کے اظہار پر آتے ہیں تو پھر گرد و پیش کی پروا نہیں کرتے۔ کھل کر ہنستے ہیں' کھل کر روتے ہیں۔ ہر معاملے میں کھلے ڈلے ہی نظر آتے ہیں۔ باپ بیٹی کے جذباتی سین میں' میں اپنے آپ کو قطعی فاضل اور کچھ کچھ چغد سا محسوس کر رہا تھا۔

میں اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک چارلس کو جیسے کوئی خیال آیا۔ وہ کیتھرین کو خود سے علیحدہ کرتے ہوئے بولا "یہ انقلاب آیا کیسے؟"

کیتھرین کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ معلوم نہیں اب بھی ڈراما کر رہی تھی یا واقعی سنجیدہ تھی۔ وہ آنسوؤں سے بھیگی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "پاپا! بعض پرانی کہانیوں میں آپ نے پڑھا ہو گا کہ کسی بگڑے ہوئے شخص کو کوئی بزرگ ملتا ہے اور وہ اپنی باتوں سے' اپنے عمل سے اس کی زندگی کا رخ بدل دیتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کردار اور کرداروں کے انداز بدلتے رہتے ہیں لیکن کہانیاں اکثر دہرائی جاتی ہیں پاپا! میری زندگی میں بھی ایک بزرگ گھس آیا ہے۔ لگتا یہی ہے کہ اس نے میری زندگی کا رخ یکسر بدل دیا ہے... اور اگر کوئی کسر رہ گئی ہے تو اسے بھی وہ پوری کر دے گا۔"

"بزرگ...؟ کون بزرگ؟" چارلس نے حیرت سے پوچھا۔

کیتھرین نے میری طرف اشارہ کیا۔ چارلس بھی بھیگی بھیگی آنکھوں کے ساتھ دھیرے سے ہنس دیا۔ "تم کیوں مذاق کر رہی ہو۔ افضل چوہدری کو بزرگ بنا رہی ہو۔ یہ تو ابھی ادھیڑ عمر بھی نہیں ہے۔"

"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بزرگی کا تعلق عمر سے نہیں ہوتا۔" کیتھرین بولی۔ "بہرحال میں نے اچانک ہی اپنے طور طریقے اور اپنی زندگی کا انداز بدلنے کا فیصلہ کیا ہے لیکن مجھے اس میں کافی دشواری پیش آئے گی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں ڈرگز کی کیریئر رہی ہوں اور سائڈ میں اپنا دھندا بھی کرتی رہی تھوں۔ میں کولمبیا کی ایک سینڈیکیٹ کے لیے کام کرتی رہی ہوں اور زیادہ تر کوکین ہماماز کے راستے کیلی فورنیا پہنچاتی رہی ہوں۔ کافی عرصے سے میں نے ان کے لیے کام بہت کم کر دیا ہے لیکن مجھے ان کے پیغام ملتے رہتے ہیں۔ اب میں انہیں مکمل طور پر چھوڑنے کا فیصلہ کر رہی ہوں لیکن لگتا ہے وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے... اور وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ بین الاقوامی طور پر خطرناک لوگ..." اس نے نہ جانے کیا تصور کرتے ہوئے جھرجھری سی لی۔

چارلس فوراً پُرجوش لہجے میں بولا "تم ان کی فکر مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کولمبین مافیا کتنی طاقتور ہے۔ انہوں نے تو اردگرد کی چھوٹی حکومتوں کے سربراہوں تک کو اس دھندے میں ملوث کر لیا ہے۔ جج' صحافیوں اور ہر شعبۂ زندگی کے انتہائی بارسوخ لوگوں تک کو قتل کر چکے ہیں۔ میں ان کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں اور ان کی تمام تر خوفناکی سے آگاہ ہوں۔ اس کے باوجود میں تمہیں اطمینان دلاتا ہوں کہ تمہیں ان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اصل اہمیت تمہارے اپنے ارادے کی تھی اگر تم نے ان کے چنگل سے نکلنے کا ارادہ کر لیا ہے تو میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا' تمہیں تحفظ فراہم کرنے کے لیے اپنا تمام تر اثر و رسوخ استعمال کروں گا۔ ڈرگز والوں کے خلاف مزاحمت کے لیے تو مجھے ہر طرح کی مدد میسر ہے' باقی معاملات میں خواہ میرا ہاتھ زیادہ دور تک نہ پڑتا ہو۔"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "میں اگرچہ ایک معمولی سا آدمی ہوں... اور خود تم سے بھی کچھ زیادہ خطرناک حالات کا شکار ہوں لیکن ایک اچھے مقصد کے لیے میں بھی تمہاری مدد کو حاضر ہوں۔ میں جس قابل بھی ہوں' تمہارے کام آنے کی کوشش کروں گا۔"

"مجھے معلوم ہے تم اس سے کہیں زیادہ "قابل" ہو جتنا نظر آتے ہو۔ معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت تم نے انکسار کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے۔" کیتھرین مسکراتے ہوئے بولی۔

"انکسار... اچھی چیز ہے۔ انسان اگر واقعی کسی قابل ہو تب بھی اسے انکسار سے ہی کام لینا چاہیے" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

چارلس بولا "خدا کا شکر ہے کہ کیتھرین کی طرف سے میرے ذہن پر جو بوجھ تھا وہ اتر گیا لیکن میرے ذہن پر ابھی ایک اور بوجھ بدستور موجود ہے جس نے مجھے پریشان کیا ہوا ہے۔ صرف اسی کی

وجہ سے میں ترکی میں پھنسا بیٹھا ہوں۔"

پھر اس نے بطور خاص مجھے مخاطب کیا "صرف اسی پریشانی کی وجہ سے میں کیتھرین کے پیچھے نہیں آسکا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ میرے نہ آنے کی وجہ سے اسے تمہاری رفاقت میسر آگئی جس کی وجہ سے مجھے اس کی زندگی کا رخ تبدیل ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ اب مجھے جو مسئلہ درپیش ہے۔۔۔ میرا دل کہتا ہے کہ اس کے سلسلے میں بھی تم میری کوئی نہ کوئی مدد ضرور کرسکتے ہو۔"

معلوم ہوتا تھا بے چارے چارلس پر میری کچھ زیادہ ہی دھاک بیٹھ گئی تھی حالانکہ میں نے تو اس کے سامنے کوئی ایسا خاص کارنامہ بھی انجام نہیں دیا تھا۔ وہ بڑی اپنائیت سے میرا گھٹنا تھپتھپاتے ہوئے بولا "تمہارے اندر طاقت اور ذہانت کا ایک عجیب امتزاج موجود ہے۔"

"اچھا۔۔۔؟ مجھے نہیں معلوم تھا" میں نے سادگی سے کہا۔

"اب زیادہ بنو مت۔" وہ گھٹنے سے میرے کندھے پر آگیا اور اسے زیادہ جوش و خروش سے تھپتھپاتے ہوئے بولا "معلوم نہیں کیوں میں تمہارے لیے اپنے دل میں بہت زیادہ اپنائیت محسوس کرنے لگا ہوں۔۔۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ عجیب صورتِ حال تھی۔ صرف بیٹی ہی نہیں' باپ بھی میرے لیے اپنے دل میں اپنائیت محسوس کرنے لگا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے اس پر خوش ہونا چاہیے تھا یا فکرمند؟

چارلس بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میں تمہیں اس امید پر ایک اہم راز میں شریک کررہا ہوں کہ تم میری مدد ضرور کروگے۔"

"پہلے پتا تو چلے مسئلہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔ مجھے اس کی مدد کرنے میں بہرحال کوئی عذر نہیں تھا۔ فی الحال میرے پاس اپنے وقت کا کوئی اور مصرف نہیں تھا۔

"اس چھوٹے سے مسئلے نے برٹش اور ٹرکش' دونوں حکومتوں کی سیکرٹ سروس کو پریشان کررکھا ہے۔۔۔" چارلس کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا "میں بے چارہ آپ کو اس قابل نظر آتا ہوں کہ جس مسئلے نے ایسے ملکوں کی سیکرٹ سروس کو پریشان کررکھا ہے' میں اس کے سلسلے میں کچھ کرسکوں؟" مجھے واقعی چارلس کا یہ خیال عجیب سا لگا تھا۔

"ہاں؟" وہ گہری سنجیدگی سے سرہلاتے ہوئے بولا "بعض اوقات بڑے بڑے ادارے اپنے روایتی طور طریقوں اور گھے بندھے فارمولوں کی وجہ سے وہ کام نہیں کرپاتے جو کوئی اکیلا شخص پھرتی سے حرکت میں آتے ہوئے' صورتِ حال کو صحیح طرح سمجھتے ہوئے' آگے بڑھ کر بہت کم وقت میں کرگزرتا ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ میں اس کے بولنے کا منتظر تھا۔ کیتھرین بھی ہمہ تن گوش تھی۔ چارلس بولا "تمہیں شاید معلوم ہی ہوگا کہ تین دن بعد ہمارے ہاں سے لیڈی ڈائنا ترکی آرہی ہیں۔"

"نہیں' مجھے نہیں معلوم تھا" میں نے اعتراف کیا "میں نے ابھی تک کوئی ٹرکش یا انگریزی اخبار نہیں دیکھا تھا۔ ترکی تو پڑھنی ہی نہیں آتی تھی۔ میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا "زبان یار من ترکی و من ترکی نہ می دانم" میرا ذہن تو ابھی اپنے معاملات میں ہی الجھا ہوا تھا۔ باقی کسر کیتھرین نے پوری کردی تھی۔ اس نے اور بھی زیادہ الجھالیا تھا۔ مجھے بھلا لیڈی ڈائنا وغیرہ کے بارے میں خبریں پڑھنے اور پھر انہیں یاد رکھنے کا ہوش کہاں تھا۔

میں نے نیم سنجیدگی سے پوچھا "اکیلی ہی آرہی ہیں کیا؟ پرنس چارلس ساتھ نہیں آرہے؟"

"نہیں" چارلس نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا "پرنس چارلس کی جگہ غلام چارلس آیا ہوا ہے۔۔۔" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر گردن کو خم دیا۔ "لیڈی بہرحال اکیلی ہی آرہی ہیں۔ ان کی کئی مصروفیات ہیں۔ ریڈ کراس کے ایک سیمینار میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کرنی ہے۔۔۔ سالویشن آرمی کے ایک مرکز کا افتتاح کرنا ہے۔۔۔ خواتین کے عالمی دن سے متعلق ایک کانفرنس کی صدارت کرنی ہے۔۔۔ اس کے علاوہ مجموعی طور پر ان کا یہ دورہ خیرسگالی کا دورہ ہے۔ گو کہ ان کی کوئی سرکاری حیثیت نہیں لیکن انہیں مکمل سرکاری پروٹوکول دیا جائے گا۔ ہمارے سفیر انہی انتظامات کے سلسلے میں مصروف ہیں اسی لیے دن میں یہاں نظر نہیں آتے۔ مسئلہ یہ آن پڑا ہے کہ۔۔۔" اس نے جملہ نامکمل چھوڑ کر گھڑی دیکھی۔

پھر کچھ سوچ کر وہ اٹھتے ہوئے بولا "اگر تم میرے ساتھ چلو تو بات خود بخود تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔ میں اس وقت اسی سلسلے میں ایک جگہ جارہا ہوں۔"

میں نے صرف ایک لمحے سوچا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے لیے یہ ایک طرح کا شغل ہی تھا۔ وقت گزاری ہی وقت گزاری میں اگر میں چارلس کے کسی کام آجاتا تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔

اسی لمحے کیتھرین بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی "میں بھی چلوں گی پاپا!"

چارلس نے گہری نظر سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ گویا الجھن میں پڑگیا پھر ملائمت سے بولا "ہنی! جہاں ہم جارہے ہیں وہ جگہ ایک لڑکی کے لیے۔۔۔ خصوصاً ایک سفید فام اور ماڈرن لڑکی کے لیے بالکل مناسب نہیں ہے۔"

"پاپا! میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جنہیں کہیں جانے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے کہ وہ جگہ ان کے لیے مناسب ہے یا نہیں۔۔۔ کیا آپ کو ابھی تک اس بات کا اندازہ نہیں ہوا؟" کیتھرین قدرے خفگی سے بولی "میں اس مختصر سی عمر میں دنیا کی نہ جانے کون کون سی اور کیسی کیسی جگہوں پر جاچکی ہوں۔"

چارلس گویا لاجواب سا ہوگیا اور ایک لمحے کی الجھن آمیز سی خاموشی کے بعد بولا "مسئلہ رازداری کا بھی ہے۔۔۔ کیا میں تم پر اعتماد کرسکتا ہوں؟"

کیتھرین کو اس سوال سے گویا صحیح معنوں میں جھٹکا لگا۔ وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے مجروح سے لہجے میں بولی "آپ ایک اجنبی اور غیر ملکی پر اعتماد کرسکتے ہیں۔ اپنی بیٹی پر اعتماد نہیں کرسکتے؟"

"مجھے تمہارے ماضی۔۔۔ بلکہ تمہاری آج تک کی زندگی کی وجہ سے تم سے یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے؟" چارلس ملائمت سے بولا۔

"آپ کو اس شخص کے ماضی کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟" کیتھرین ایک بار پھر میری طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولی "آپ کو صحیح طور پر معلوم ہے کہ یہ کون ہے اور کیوں ہم لوگوں کے ساتھ آن ملا ہے؟"

"مجھے سیٹھ رمضان فون پر اس کے بارے میں بتاچکا ہے۔۔۔ اور سیٹھ رمضان میرا قابلِ اعتماد دوست ہے" چارلس نے جواب دیا۔

"لیکن بیٹی آپ کے لیے قابلِ اعتماد نہیں ہے" کیتھرین تلخ لہجے میں بولی۔

"اگر تم ڈرگز کے دھندے میں ملوث نہ رہی ہوتیں تو میرے لیے دنیا میں تم سے زیادہ قابلِ اعتماد کوئی نہ ہوتا۔ یوں تو دنیا میں کوئی بھی انسان کسی بھی خاص وجہ کے بغیر ہی بے ضمیر ہوسکتا ہے لیکن ڈرگز کے دھندے سے وابستہ لوگوں کے ضمیر تو کچھ زیادہ ہی مُردہ ہوجاتے ہیں۔ ان پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا" چارلس صاف گوئی سے بولا حالانکہ انگریز ہونے کی حیثیت سے وہ میری نظر میں ایک جذباتی باپ تھا۔ انگریز۔۔۔ یا کسی اور سفید فام قوم میں اتنا جذباتی باپ میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا لیکن جہاں احتیاط کی ضرورت تھی وہاں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا نظر نہیں آرہا تھا۔

"لیکن انسان کی ذات میں کبھی کبھی اچانک انقلاب بھی تو آجاتا ہے" کیتھرین اپنی بات منوانے پر تلی ہوئی تھی۔

"میں اچانک انقلابات پر کچھ زیادہ یقین نہیں رکھتا۔۔۔ لیکن۔۔۔ چلو تمہارے معاملے میں یقین کرلیتا ہوں" بالآخر چارلس نے ٹھنڈی سانس لے کر نہ جانے کیا سوچ کر یکدم ہی ہتھیار ڈال دیے۔

"او پاپا۔۔۔! آپ عظیم ہیں۔۔۔" کیتھرین نے اپنی خفگی بھول کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

چارلس استہزائیہ انداز میں ہنس دیا "عظیم۔۔۔؟ بس۔۔۔ بس۔۔۔ مجھے مکھن لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مکھن کے بغیر ہی میں نے تمہاری بات مان لی ہے۔ مجھے عظیم بنانے کی کوشش مت کرو۔ عظمت کے درجے بہت آگے سے شروع ہوتے ہیں۔ میں تو ایک سیدھا سادہ سا اصول پرست انسان ہوں۔"

اس دوران میں دوبارہ کاؤنٹر پر بیٹھ چکا تھا۔ چارلس نے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا "ایک مدت کے بعد آپ دونوں باپ بیٹی کے درمیان فاصلے ختم ہوئے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے پھر فاصلے پیدا ہوجائیں۔ جس ضروری کام کا آپ ذکر کررہے ہیں' بہتر ہے اس کے لیے آپ دونوں ہی چلے جائیں۔ مجھے ساتھ نہ لے جائیں' میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

کیتھرین باپ کی موجودگی کی پروا کیے بغیر مجھ پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولی "خفا ہوگئے؟ میں کوئی سچ مچ تمہاری طرف سے بدگمانی کا شکار تھوڑا ہی ہوں۔ میں تو پاپا سے اپنی بات منوانے کے لیے ذرا تمہاری آڑ لے رہی تھی" وہ شریر انداز میں مسکرا رہی تھی۔

"تم اگر میری طرف سے بدگمانی کا شکار بھی رہو تو میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے کون سا تم سے کوئی سرٹیفکیٹ لینا ہے" میں نے بے نیازی سے کہا۔

وہ میرا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی "چلو۔۔۔ اب اٹھ بھی جاؤ۔ زیادہ نخرے مت دکھاؤ۔ دو باتوں کی وجہ سے میں ذرا رکی ہوئی ہوں ورنہ ابھی کرائے کا ایک ہاتھ رسید کرتی۔"

"وہ دو باتیں کیا ہیں؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"ایک تو میں دل ہی دل میں تمہیں استاد تسلیم کرچکی ہوں۔ دوسرے مجھے اپنی زندگی عزیز ہے" وہ بدستور شوخی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"یہ تم نے بڑا عقلمندانہ فیصلہ کیا ہے" چارلس بیٹی کی کمر تھپکتے ہوئے بولا "افضل چوہدری کی شاگرد بن کر شاید تم کسی قابل ہوجاؤ۔۔۔ لیکن صرف دل ہی دل میں تسلیم کرنے سے تو کچھ نہیں ہوگا۔ تمہیں چاہیے کہ مشرقی اصولوں کے مطابق باقاعدہ کوئی رسم وغیرہ کا اہتمام کرکے اس کی شاگردی اختیار کرو۔"

"مجھے بانس پر چڑھا کر مروانہ دینا مسٹر چارلس" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میں تو ابھی خود طفلِ مکتب ہوں۔"

"اچھا اب اٹھ جاؤ۔ پہلے ہی باتوں میں بہت وقت ضائع ہوچکا ہے" چارلس ایک بار پھر گھڑی دیکھتے ہوئے بولا' مجھے اٹھنا ہی پڑا۔

ہم نیچے آئے تو وسیع ڈرائیو وے میں تاریک شیشوں والی ایک سیاہ مرسیڈیز گویا ہماری ہی منتظر تھی۔ ڈرائیور نے ہمیں دیکھتے ہی گاڑی کے دروازے کھولے اور ہمارے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کردی۔ ڈرائیور ترک تھا اور چارلس نے ترکی میں ہی اس سے کچھ کہا تھا۔ اس نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور گاڑی بنگلے سے باہر آگئی۔ کچھ دیر بعد وہ استنبول کی شاہراہوں پر فراٹے بھر رہی تھی۔

ہم چند ایسی مشہور اور تاریخی عمارات کے سامنے سے بھی گزرے جنہیں میں پہچانتا تھا۔ جلد ہی گاڑی شہر کے گنجان آباد علاقوں سے نکل آئی۔ میرے اندازے کے مطابق ہم شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے کی طرف جارہے تھے لیکن پھر ہم شہری

حدود کو عبور کر گئے۔ انجن کی نہایت خفیف سی آواز کے ساتھ گاڑی بدستور فراٹے بھرتی جارہی تھی۔

ہم تینوں سفر کے آغاز سے لے کر اب تک خاموش تھے۔ میں تو اس خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن کیتھرین آخر کار خاموش نہ رہ سکی اور تاریک شیشے کے عقب سے چٹیل میدان کا جائزہ لیتے ہوئے بولی "ہم کہاں جارہے ہیں پاپا؟" دور دور تک کسی آبادی کا نشان نظر نہیں آرہا تھا۔

"دیکھتی رہو" چارلس نے اختصار سے جواب دیا۔ شاید وہ سسپنس پیدا کرنے کی کوشش کررہا تھا یا پھر شاید خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ زیادہ بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہم بائی وے سے ایک سائڈ روڈ پر مڑ چکے تھے اور بتدریج بلندی کی طرف جارہے تھے پھر ہم قدرے نشیب میں پھیلے ہوئے ایک طویل جنگل کے قریب سے گزرے۔ میرے اندازے کے مطابق ہم استنبول سے نکل آنے کے بعد تقریباً چالیس میل کا فاصلہ طے کرچکے تھے۔ کیتھرین بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرادیا۔ وہ خشمگیں نظروں سے مجھے گھور کر رہ گئی۔

چند لمحے بعد گاڑی ایک پگڈنڈی پر مڑ گئی۔ وہ راستہ کسی گدھا گاڑی کے بھی شایانِ شان نہیں تھا جبکہ اس پر اتنی شاندار مرسیڈیز آگئی تھی لیکن ایک لحاظ سے اچھا بھی تھا کہ ہم اس شاندار مرسیڈیز میں سفر کررہے تھے اگر کسی معمولی کھٹارا گاڑی میں ہوتے تو اس وقت ایک ایک فٹ اوپر اچھل رہے ہوتے۔ تمام تر سست رفتاری کے باوجود گاڑی اپنے عقب میں گرد و غبار کا ایک طوفان چھوڑتی جارہی تھی۔

بالآخر کیتھرین خاموش نہ رہ سکی۔ منہ بنا کر بولی "ایشیائی ممالک کے بعض حصے دیکھ کر تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زمانۂ غار کے بعد سے وہاں کسی انسان نے قدم نہیں رکھا۔"

اب چارلس نے بھی ذرا زبان کھولی اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا "ہم جہاں جارہے ہیں وہ بستی بھی تمہیں زمانۂ غار کے انسانوں ہی کی محسوس ہوگی۔"

"ہم وہاں کیا کرنے جارہے ہیں؟" کیتھرین نے بے اختیار پوچھا۔

"یہ تمہیں وہیں چل کر معلوم ہوگا" چارلس نے فوراً ہی زبان بند کرلی۔

تقریباً دو میل کا فاصلہ اسی طرح ہچکولے کھاتے ہوئے طے کرنے کے بعد گاڑی رک گئی۔ آگے سڑک بالکل ہی اس قابل نہیں رہی تھی کہ گاڑی اس پر چل سکتی۔ پگڈنڈی یا سڑک' وہ جو بھی تھی صرف دو ڈھائی فٹ چوڑی رہ گئی تھی۔ اس کی ایک طرف نشیب تھا اور دوسری طرف کچی پہاڑی کی بلندی۔

چارلس گہری سانس لے کر بولا "اب ہمیں کچھ فاصلہ پیدل طے کرنا پڑے گا۔"

ہم تینوں گاڑی سے اتر آئے۔ چارلس نے ڈرائیور کو وہیں رہنے کی ہدایت کی اور ہم آگے چل دیے۔ پہاڑی کے گرد گھوم کر ہم دوسری طرف پہنچے تو ایک اور پہاڑی کے نشیب میں ایک بستی کے آثار دکھائی دیے۔ بستی پہاڑی کے پہلو میں تھی۔ جہاں ہم چل رہے تھے وہاں سے اس کا صرف تھوڑا سا حصہ نظر آرہا تھا۔

اس علاقے میں چلتے ہوئے مجھے اپنے ملک کے شمال مغربی سرحدی علاقوں کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہمارے ان علاقوں میں سبزہ اور خوب صورتی نظر آتی ہے جبکہ یہ علاقہ کافی حد تک بنجر سی لگ رہا تھا۔ نشیب میں کہیں کہیں تھوڑا بہت سبزہ' درخت اور جھاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہیں بہت سے مویشی چر رہے تھے اور گویا اس سبزے کو بھی ختم کرنے کی مقدور بھر کوشش کررہے تھے۔ ان مویشیوں کو چرانے والا کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بل کھاتے راستے پر چلتے بالآخر ہم بستی کے قریب جا پہنچے۔ یہاں کے مکانوں کی ساخت بھی ہمارے پہاڑی علاقوں کے مکانوں سے کافی مختلف تھی۔ زیادہ تر مکان لکڑی کے تھے اور عجیب سی بات یہ تھی کہ تقریباً سبھی مکانوں میں باہر کی طرف سے تنگ سا ایک گول' بل کھاتا زینہ اوپر ضرور جارہا تھا۔ مکانوں کی ساخت جھونپڑیوں سے مشابہ تھی۔

"یہ ترکی کے ایک نہایت قدیم قبیلے کا گاؤں ہے" چارلس نے نیچی آواز میں مجھے اور کیتھرین کو بتایا۔

گاؤں میں بالکل ویرانی نظر آرہی تھی۔ اس کی وجہ ہمیں کچھ آگے جاکر معلوم ہوئی۔ گاؤں کے وسط میں ایک بڑا سا میدان تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گاؤں کے تمام مرد' عورتیں اور بچے اس میدان کے گرد جمع تھے۔ بہت بڑا ہجوم نظر آرہا تھا لیکن میدان میں کیا ہو رہا تھا' یہ ہمیں فوری طور پر معلوم نہیں ہوسکا۔ جہاں تک ہم پہنچے تھے وہاں سے ہمیں پورا میدان نظر نہیں آرہا تھا۔

ہجوم میں زیادہ تر عورتوں نے سرخ اور سفید دھاریوں والے لمبے لمبے لبادے پہن رکھے تھے۔ سروں پر وہ سفید اسکارف باندھے ہوئے تھیں۔ مرد زیادہ تر لمبے لمبے اوور کوٹوں سے مشابہ چغوں میں تھے اور ان کے سروں پر فرکی وہ بڑی بڑی لمبی سی ٹوپیاں تھیں جو تصویروں میں قدیم انگریز فوجیوں کے سروں پر نظر آتی ہیں۔ برطانوی شاہی محل پر تعینات رہنے اور شاہی خاندان کے افراد کے ساتھ چلنے والا فوجی دستہ اب بھی ویسی ہی وردی اور ٹوپی پہنتا ہے۔ اس ٹوپی کی وجہ سے کچھ ایسا تاثر پیدا ہو رہا تھا جیسے ہم کسی برفانی علاقے میں پہنچ گئے ہوں حالانکہ وہاں سردی کچھ ایسی خاص نہیں تھی۔ وہ لوگ نہایت انہماک سے کسی چیز کا نظارہ کررہے تھے۔

ہم لوگ کچھ اور آگے پہنچے تو ہلتے جلتے تماشائیوں کے درمیان سے بھاری بھرکم نیم عریاں سے جسموں کی جھلک دکھائی دی جو ایک دوسرے سے بری طرح الجھ رہے تھے۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ

میدان میں کسی قسم کی کشتی ہو رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ میدان میں گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ تماشائی کچھ عجیب غیر فطری سی خاموشی سے مقابلہ دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ ان میں بچے بھی شامل تھے۔ وہ بھی کوئی آواز نہیں نکال رہے تھے اور کشتی لڑنے والوں کی بھی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ہم ہجوم کے قریب پہنچے تو ہمیں ایک ایسی جگہ میسر آگئی جہاں سے ہم مقابلے کا نظارہ کرسکتے تھے۔ وہ واقعی کشتی تھی اور تقریباً ویسی ہی اسٹائل ہی تھی لیکن اس میں اتنی خونخواری نہیں تھی جتنی غیر ملکی مقابلوں میں ٹی وی پر نظر آتی ہے۔ وہ دونوں سانڈ کی طرح پلے ہوئے پہلوان تھے لیکن ان کے قد درمیانے ہی تھے۔ دونوں کے کندھے البتہ غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ جسم ورزشی تھے لیکن بیشتر مشرقی پہلوانوں کی طرح توندیں خاصی نکلی ہوئی تھیں۔

وہ چمڑے کی ڈھیلی ڈھالی سی پتلونوں میں تھے۔ ایک کا رنگ خاصا گورا تھا۔ دوسرے کی رنگت قدرے سانولی سی تھی۔ بظاہر وہ دونوں ہم پلہ ہی معلوم ہوتے تھے لیکن گورا پہلوان مکمل طور پر سانولے پر حاوی معلوم ہوتا تھا۔ سانولے کی حالت خاصی خراب تھی۔ گورا اسے اٹھا اٹھا کر پٹخ رہا تھا اور اس نے مقابلہ تقریباً ختم ہی کردیا تھا اگر ان کے ہاں پن کرنے یا چت کرنے کا رواج تھا تو میرے خیال میں وہ اب ایسا کرنے ہی والا تھا۔ میرے خیال میں وہ اب کسی بھی لمحے اسے پن کرسکتا تھا لیکن اب شاید وہ محض لطف اندوز ہونے کے لیے اس کی بے رحمانہ طریقے سے پٹائی کررہا تھا۔ گورا پہلوان شکل سے کچھ اذیت پسند معلوم ہوتا تھا یا پھر شاید وہ مجمع کو مرعوب کرنے کے لیے غیر ضروری مار پیٹ کررہا تھا حالانکہ مجمع پہلے ہی کافی مرعوب نظر آرہا تھا۔

ہماری آمد پر کئی عورتوں اور مردوں نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا پھر چند سیکنڈ میں گویا سب کو ہی پتا چل گیا کہ ان کے گاؤں میں کچھ اجنبی آئے ہوئے تھے۔ سب نے ہی باری باری مڑ کر دیکھا تاہم کسی نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا اور دوبارہ کشتی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ مردوں نے البتہ کچھ زیادہ دیر تک کیتھرین کی طرف دیکھا اور ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک ابھری۔ انہوں نے گویا بادلِ ناخواستہ کیتھرین کی طرف سے نظر ہٹالی تھی۔

چارلس کو یقیناً کشتی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ متلاشی سے انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ہمیں ایک طرف کچھ جگہ میسر آگئی دیکھ کر کسی مراد میں ہوشو سے اپنی کشتی یاد آگئی تھی اور میرے رگ و پے میں خفیف سی سنسنی دوڑ گئی تھی۔ وہ ایک خونیں مقابلہ تھا۔ کمال موت رنگ کے اندر ہی نہیں' رنگ کے باہر بھی میری کمات میں تھی۔

یہاں اس مقابلے میں بھی خون بہتا دکھائی دے رہا تھا۔ سانولے پہلوان کا چہرہ خون میں تر تھا۔ اس کی ناک' منہ اور پیشانی سے خون نکل رہا تھا۔ تاہم میرے والے مقابلے کی طرح یہ تاثر نہیں مل رہا تھا کہ اسے گھیر گھار کر مجمع کے سامنے ہلاک کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔

ہم آگے پہنچے تو اس کے چند سیکنڈ بعد ہی کشتی ختم ہوگئی۔ گورے پہلوان نے گویا ازراہِ کرم سانولے کو آخری بار زمین پر پٹخا اور پھر نہیں اٹھایا۔ اس نے اسے پن وغیرہ کرنے کی زحمت نہیں کی بلکہ اس طرح اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوگیا جیسے کوئی شکاری شیر کو شکار کرنے کے بعد اس پر پاؤں رکھ کر تصویر کھنچوا رہا ہو۔

وہ صرف پسینے اور مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ کہیں سے زخمی نہیں تھا۔ چہرے سے پسینہ پونچھ کر اس نے فاتحانہ انداز میں ادھر اُدھر گردن گھما کر تماشائیوں کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خاصی درندگی تھی۔ سانولے پہلوان میں اٹھنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ لوگوں نے تالیاں بجانے کے بجائے اجتماعی طور پر گہری سانس لی جو شاید سب کے سینوں میں کئی لمحے سے مقید تھی۔ یہ طمانیت کی سانس معلوم ہوتی تھی۔ شاید سب ہی کو مقابلہ ختم ہوتے دیکھ کر اطمینان ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے انداز میں ایک خفیف سی مایوسی بھی شامل تھی۔ گورا پہلوان بھی گو کہ انہی میں سے ایک تھا لیکن شاید وہ اسے پٹتے دیکھنا چاہتے تھے مگر نتیجہ ان کی توقعات کے خلاف نکلا تھا۔

فاتح پہلوان کی نظریں تماشائیوں پر سے ہوتی ہوئی ہم تینوں پر آٹھہریں پھر مجھے اور چارلس کو تو اس نے قطعاً نظرانداز کردیا لیکن کیتھرین پر اس کی نظر جم کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک ابھر آئی۔ چارلس کی توجہ اس وقت کسی اور طرف تھی۔ میں پہلوان کی آنکھوں میں تغیر دیکھ رہا تھا۔ اس کا ذہن شاید ایک میدان سے دوسرے میدان کی طرف چھلانگ لگا چکا تھا۔

کیتھرین نے میری طرف کو ترچھی ہوتے ہوئے سرگوشی کی "مجھے یہ شخص سخت منحوس لگ رہا ہے۔"

پہلوان نے یقیناً محسوس کرلیا تھا کہ کیتھرین نے میرے کان میں اس کے بارے میں ہی کوئی بات کی تھی۔ اس کی وحشت کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ ریڈ انڈین جنگجوؤں کے انداز میں آسمان کی طرف منہ کرکے گھونسوں سے اپنا سینہ پیٹنے لگا۔ اس کا سینہ غیر معمولی طور پر چوڑا تھا اور اس پر گوشت کی تہوں کے ابھار بھی غیر معمولی تھے۔ قد ذرا چھوٹا ہونے کی وجہ سے وہ مجموعی طور پر کچھ زیادہ ہی چوڑا چوڑا لگ رہا تھا۔

اس نے حلق سے ڈکرانے کی سی بے معنی آوازیں نکالیں پھر باڈی بلڈروں کے سے انداز میں پوز بنا بنا کر اپنے جسم کی نمائش کرنے لگا حالانکہ وہ اس حد تک نمائش کے قائل نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ صرف کیتھرین کو دکھانے کے لیے یہ سب کچھ کررہا تھا اور ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔

تماشائی اب ویسے بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہے۔ بیشتر کی توجہ کیتھرین کی طرف ہی تھی۔ اب مردوں سے زیادہ عورتیں کیتھرین کو تجسس اور اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں۔ کیتھرین کا لباس کچھ مردانہ سا تھا۔ عورتیں شاید اس کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کے لباس کا بھی بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ بعض بچے کیتھرین کی طرف دیکھ کر منہ پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہی کر رہے تھے۔

چارلس اس صورتِ حال سے غالباً کچھ پریشان ہو گیا تھا لیکن کیتھرین کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ چند لمحے بعد صورتِ حال کچھ اور عجیب ہو گئی۔ فاتح پہلوان نے اچانک آگے بڑھ کر کیتھرین کی مرمریں کلائی پکڑلی۔ اس کے ہاتھ بھی غیر معمولی طور پر بڑے تھے البتہ آنکھیں چھوٹے چھوٹے بٹنوں سے مشابہ تھیں لیکن ان آنکھوں میں خباثت تھی۔ اس طرح کی خباثت عام طور پر اپنی طاقت کے گھمنڈ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

"یُو... انگلش... امریکن...؟" وہ پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔ وہ غالباً یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیتھرین انگریز تھی یا امریکی؟

کیتھرین نے اس کے سوال کا جواب دینے کی زحمت نہیں کی اور آہستگی سے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس کی گرفت ایسی نہیں تھی جس سے یوں آرام سے کلائی چھڑائی جا سکتی۔

چارلس نے غالباً سوچا بھی نہیں تھا کہ کیتھرین کو ساتھ لانے کی وجہ سے اس قسم کی صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔ اس نے آگے بڑھ کر نہایت مہذبانہ لہجے میں پہلوان کو بتانے کی کوشش کی "ہم محترم سیوبک سے ملنے کے لیے آئے ہیں..."

پہلوان نے گویا اس کی بات ہی نہیں سنی اور نہ ہی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کیتھرین کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا "یُو... کم... یُو... آئی... ڈانس..."

وہ غالباً یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ وہ اور کیتھرین میدان میں ڈانس کریں۔ اس نے کیتھرین کو کھینچنے کے لیے ذرا قوت صرف کی تو کیتھرین کلائی چھڑائے بغیر ہی ایڑی کے بل گھومی اور اس کی لات پہلوان کے منہ پر پڑی۔ اس کی کلائی بھی چھوٹ گئی اور پہلوان میدان میں چت جا گرا۔

مجمع پہلے بھی تقریباً خاموش ہی تھا لیکن اب تو اسے گویا سانپ ہی سونگھ گیا۔ عورتیں تو کیا، مرد بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے کیتھرین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک دبلی پتلی اور نرم و نازک نظر آنے والی لڑکی نے پلک جھپکتے میں لٹو کی طرح گھوم کر محض ایک لات رسید کر کے ان کے فاتح پہلوان کو دور پھینک دیا تھا۔

پہلوان ذرا سنبھلا تو اٹھ کر مرکھنے سانڈ کی طرح کیتھی کی طرف لپکا۔ کیتھی کسی مستعد بل فائٹر کی طرح اپنے دفاع کے لیے تیار تھی لیکن اسی لمحے چارلس بیچ میں آ گیا۔ جسمانی طور پر تو پہلوان کو روکنا یا اس کا کچھ بگاڑنا چارلس کے بس کی بات نہیں تھی۔ شاید اسی لیے اس نے مجبوراً نہایت پھرتی سے پستول نکال لیا تھا۔

مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ پہلوان اسے پستول سمیت اٹھا کر کہیں ادھر اُدھر نہ پھینک دے۔ اس نے شفقتِ پدری کے تحت جوش میں آ کر خواہ مخواہ ہی پستول نکال کر سامنے آنے کی حماقت کی تھی۔ اس کی مدد الٹا کیتھرین کے لیے زحمت کا باعث بن سکتی تھی۔ کیتھرین غالباً اس کی دخل اندازی کے بغیر اپنا دفاع بہتر طور پر کر سکتی تھی۔

میں محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً اس معاملے میں ٹانگ اڑانے کے لیے ٹانگ کو حرکت دینے ہی لگا تھا کہ ہجوم میں سے کوئی چیخا۔ کسی ناقابلِ فہم زبان میں اس نے نہ جانے کیا کہا تھا کہ پہلوان کو گویا ائر پریشر بریک لگ گئے تھے۔ وہ یکدم ہی رک گیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے چھریرے جسم کا ایک دراز قد شخص ہجوم کو چیرتا ہوا آگے آیا۔ اس کا لباس بھی گاؤں والوں سے تقریباً ملتا جلتا ہی تھا لیکن اس پر زری وغیرہ کا کچھ ایسا کام کیا گیا تھا کہ اس کا تاثر شاہانہ سا ہو گیا تھا۔ اس کی ٹوپی بھی ذرا مختلف تھی۔ اس پر بھی شاید سونے سے سجاوٹ کی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ تاج سے مشابہ نظر آ رہی تھی۔

وہ گندمی سی رنگت کا ایک عام سا شخص تھا لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ اس کی شخصیت میں بھی ایک شاہانہ سا جلال موجود تھا۔ اس کی آنکھوں میں گویا چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ اس کی مُر چالیس کے قریب رہی ہو گی۔

قریب آ کر اس نے باری باری ہم تینوں کو گھورا۔ کیتھرین کو کچھ زیادہ گھورا۔ چارلس نے پستول جیب میں رکھ لیا اور ذرا خوش خلقی سے باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا "پاشا سیوبک...!"

تب مجھے معلوم ہوا کہ چند لمحے پہلے چارلس نے پہلوان کے سامنے اس شخص کا نام لیا تھا۔ وہ اسی سے ملنے یہاں آیا تھا لیکن "پاشا سیوبک" نے اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہ دی اور تیز تیز لہجے میں پہلوان سے بات کرنے لگا۔ زبان ترکی ہی معلوم ہوتی تھی لیکن اس میں فارسی کی بھی آمیزش تھی۔

جواباً پہلوان بھی تیزی سے بولنے لگا۔ اس کے لہجے میں احترام تو تھا لیکن کچھ سرکشی بھی جھلک رہی تھی۔ ہجوم کچھ آگے کھسک آیا تھا اور دائرہ پہلے سے تنگ ہو گیا تھا۔ سب لوگ سیوبک اور پہلوان کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے کے لیے سخت متجسس معلوم ہوتے تھے جبکہ وہ گفتگو ہم تینوں میں سے غالباً کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ چارلس نے ایک بار پھر مہذبانہ انداز میں اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کی "پاشا سیوبک! ہم آپ سے ملنے آئے ہیں..."

پاشا سیوبک نے اب بھی اسے لفٹ نہیں دی اور اس کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ منہ کچھ دیر پہلوان سے تیز تیز لہجے میں گفتگو کرتا رہا۔ وہ غالباً یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی آمد سے قبل کیا ہوا تھا۔ وہ یقیناً ابھی وہاں پہنچا تھا۔

بالآخر وہ چارلس کی طرف متوجہ ہوا اور اس وقت مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا جب میں نے اسے صاف، شستہ اور رواں انگریزی میں بات کرتے سنا۔ وہ کیتھرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "کیا یہ درست ہے کہ تمہارے ساتھ آنے والی اس سفید فام لڑکی نے ہمارے پہلوانِ اعظم کو لات رسید کی؟"

"پاشا سیوبک! آپ کے پہلوانِ اعظم نے نہایت غیر مہذبانہ... بلکہ معذرت کے ساتھ میں تو یہ کہوں گا کہ نہایت بے ہودہ انداز میں میری بیٹی کا بازو کھینچتے ہوئے اسے اپنے ساتھ رقص پر مجبور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس لیے میری بیٹی نے مجبوراً..."

"اچھا... تو یہ تمہاری بیٹی ہے؟" سیوبک نے ایک بار پھر سُلگتی ہی آنکھوں سے کیتھرین کی طرف دیکھتے ہوئے چارلس کی بات کاٹ دی۔

"جی ہاں پاشا سیوبک!" چارلس نے گویا کسی جرم کا اعتراف کیا۔

سیوبک خاصی گرج دار آواز میں بولا "پہلوانِ اعظم نے اگر تمہاری بیٹی کو اپنے ساتھ ناچنے کی دعوت دی تھی تو یہ اس کے لیے ایک اعزاز تھا۔ اسے تو اس اعزاز کو ٹھکرانے کی بھی جرأت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ چہ جائیکہ اس نے پہلوانِ اعظم کو لات رسید کر دی۔"

میں خاموش کھڑا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ سیوبک اس قبیلے کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ چارلس کے چہرے پر پریشانی کے آثار ابھر آئے تھے۔ وہ نہ جانے کس سلسلے میں سیوبک سے ملنے آیا تھا لیکن یہاں کچھ اور ہی چکر چل پڑا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ہمارے اردگرد موجود ہجوم میں سے کئی مردوں کے ہاتھوں میں جدید ترین ساخت کی آٹومیٹک گنیں نظر آنے لگی تھیں جن کا رخ ہماری طرف تھا اور ہم لوگ پہلے ہی سے ان کے گھیرے میں تھے۔ شاید اس وقت چارلس سوچ رہا تھا کہ اس نے کیتھرین کو ساتھ لا کر بڑی حماقت کی تھی۔

سیوبک گویا اپنے لہجے کے غیظ و غضب پر قابو پاتے ہوئے ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا "تم خواہ کوئی بھی ہو لیکن اس وقت ہمارے علاقے میں کھڑے ہو اس لیے تمہیں ہمارے علاقے کے قوانین کی پابندی کرنی پڑے گی۔ ہمارے قبیلے میں کوئی عورت کسی مرد پر ہاتھ اٹھانا تو درکنار، زبان سے بھی اس کی توہین نہیں کر سکتی۔ اب تمہاری بیٹی کو اپنی حرکت کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ اسے اس میدان میں آ کر سب کے سامنے پہلوانِ اعظم سے مار کھانا پڑے گی۔"

اس موقعے پر میں نے پہلی بار زبان کھولی "ہم تمہارے مہمان ہیں اور میرا خیال تھا کہ دنیا بھر کے قبائلی لوگوں میں مہمان نوازی کی کچھ نہ کچھ عمدہ روایات ضرور پائی جاتی ہیں..."

"مہمان نواز ہم بھی ہیں" سیوبک ایک بار پھر گرج اٹھا "لیکن قاعدے قانون پہلے آتے ہیں۔"

"میں پاکستانی مسلمان ہوں اور یہ دونوں انگریز باپ بیٹی کرسچن ہیں لیکن عورت کو مارنا ہم دونوں ہی کے معاشرے میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اگر تمہارے پہلوانِ اعظم کو اپنی حرکت کے ردِعمل پر اتنی ہی توہین محسوس ہوئی ہے تو کیتھرین کی جگہ میں مار کھا لیتا ہوں۔ تمہارے پہلوان کو تو صرف اپنا غصہ ہی ٹھنڈا کرنا ہے۔ شاید وہ مجھے مار کر ہی ٹھنڈا ہو جائے۔"

کیتھرین نے عجیب والہانہ سے انداز میں مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس کے چہرہ و سکون میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ مجھے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی "میں تمہیں استاد تسلیم کر چکی ہوں اور استاد کی باری بعد میں آتی ہے۔ پہلے اس پہلوانِ اعظم کو شاگرد سے تو نمٹ لینے دو۔"

سیوبک کی آنکھوں میں حیرت سی نمودار ہوئی۔ کیتھرین اس کی طرف مڑتے ہوئے بولی "میں مار کھانے کے لیے تیار ہوں لیکن مجھے اپنے دفاع کا اختیار تو ہو گا؟ آخر میں ایک کمزور اور ناتواں سی عورت ہوں۔ مجھے کم از کم اتنا حق تو ملنا چاہیے کہ پہلوانِ اعظم کے سامنے اپنی جان بچانے کی کوشش کر سکوں۔"

سیوبک نے ایک بار پھر اس کا سرتاپا جائزہ لیا اور پھر اپنے پہلوانِ اعظم کی طرف گھوم کر اسے اپنی زبان میں کیتھرین کی بات کا ترجمہ بتانے لگا۔ پہلوانِ اعظم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ غالباً موصوف نے سوچا تھا کہ ایک لات تو شاید اتفاقاً پڑ گئی تھی لیکن عورت آخر عورت تھی اور وہ پہلوانِ اعظم تھے۔ اس لیے عورت کو دفاع کا حق دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

سیوبک، کیتھرین کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "ہمارے قبیلے میں تو عورت کو دفاع وغیرہ کا حق نہیں ہوتا۔ اسے چھوٹی بدتمیزی پر گھر میں... اور بڑی بدتمیزی پر سب کے سامنے میدان میں کھڑے ہو کر مار کھانا پڑتی ہے لیکن تم چونکہ غیر ملکی ہو۔ تمہیں ہمارے رسم و رواج اور قوانین کا علم نہیں تھا اس لیے تمہیں دفاع کا حق دینے کی میں نے سفارش کی تھی جسے پہلوانِ اعظم نے مان لیا ہے۔ ہم پورے گاؤں کے سامنے پہلوانِ اعظم کا وقار مجروح ہوتے نہیں دیکھ سکتے اس لیے اب وہ جس طرح اور جتنی چاہیں گے، تمہیں مار لگائیں گے، تم جس طرح چاہو اپنا دفاع کر سکتی ہو... بلکہ پہلوانِ اعظم پر جوابی حملہ بھی کر سکتی ہو۔ تم زیادہ سے زیادہ جوڈو کراٹے جانتی ہو گی لیکن عورت آخر عورت ہوتی ہے۔ جوڈو کراٹے تمہیں نہیں بچا سکتے۔ تمہیں پہلوانِ اعظم کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔"

میں نے ایک بار پھر آگے بڑھ کر دخل اندازی کی کوشش کی لیکن کیتھرین نے اس بار بھی میرے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر دھکیلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں کہہ چکی ہوں... پہلے شاگرد کو موقع دو۔ استاد کی خدمات کسی زیادہ بڑے موقعے کے لیے بچا کر رکھنی چاہئیں۔"

اس دوران سیوبک گردن گھما کر تماشائیوں کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں ان کی زبان میں غالباً یہ بتانے لگا کہ ہم لوگوں کے درمیان کیا مکالمہ ہوا تھا۔ اس کی بات سن کر تقریباً تمام مرد کیتھرین

کی طرف استہزائیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے قہقہے لگانے لگے۔ عورتیں البتہ بالکل خاموش تھیں۔ ان کی آنکھوں میں رشک کے ساتھ ساتھ کسی اور جذبے کی بھی جھلک تھی۔ شاید وہ کیتھرین کی ذات سے کوئی اُمید وابستہ کر رہی تھیں۔

تمام مردوں کو قہقہے لگاتے دیکھ کر پہلوانِ اعظم بھی سینے کو گھونسوں سے پیٹتے ہوئے آسمان کی طرف منہ کر کے ڈراؤنی سی آوازیں نکالنے لگا۔ وہ شاید یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ ہنس ہنس کر بے حال ہوا جا رہا تھا۔ اس کی ہنسی کسی پہاڑی پر ڈرم لڑھکنے کی آواز سے مشابہ تھی۔

کیتھرین پہلوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیوبک سے مخاطب ہوئی۔ "اس سے کہو بھینسے کی طرح ڈکرانا بند کرے اور میدان کے بیچ میں چلے۔"

سیوبک ناگواری سے بولا "زبان سنبھال کر بات کرو لڑکی! ہمارے ہاں عورتوں کو مردوں کے بارے میں اس طرح بدتمیزی سے بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس پر تمہاری سزا میں اضافہ ہو سکتا ہے۔"

"میں انگریز ہوں۔ مجھ پر اپنے اصول مسلط مت کرو" کیتھرین منہ بنا کر بولی "میں تمہاری عورتوں کی طرح نہیں ہوں جنہیں شاید تم نے بھیڑ بکریوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔"

"میں بتا چکا ہوں کہ اس وقت تم جہاں کھڑی ہو وہاں صرف ہمارے اصول اور ہمارے قوانین چلتے ہیں" سیوبک غرایا "تم انگریز ہو تو اپنی تہذیب اپنے پاس رکھو۔ جن عورتوں کو تم بھیڑ بکریاں سمجھ رہی ہو وہ تم سے اور تمہارے ملک کی عورتوں سے بہتر حال میں ہیں۔"

چارلس، کیتھرین کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کھینچتے ہوئے نیچی لیکن مضطربانہ آواز میں بولا "فضول بحث میں... اور اس مقابلے وغیرہ کے چکر میں مت پڑو۔ ہم یہاں اس قسم کی احمقانہ حرکتوں کے لیے نہیں آئے ہیں۔ تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں ان لوگوں سے معافی مانگ لیتا ہوں۔"

سیوبک نے اس کی بات سن لی، وہ کیتھرین کے جواب دینے سے پہلے بولا "اب یہ مقابلہ ملتوی نہیں ہو سکتا۔ اب تمہیں معافی نہیں مل سکتی۔"

اس دوران تماشائیوں اور پہلوانِ اعظم کے قہقہے تھم چکے تھے۔ میدان میں ایک بار پھر گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ چارلس ملتجیانہ لہجے میں سیوبک سے مخاطب ہوا "میں تو تم سے صرف اس خط کے بارے میں بات کرنے آیا تھا جو تم نے استنبول میں ہمارے سفارت خانے کو لکھا تھا۔ یہ یہاں کیا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ خدا کے لیے اسے روکو۔"

سیوبک کی آنکھوں میں یک لخت بلا کی سرد مہری در آئی۔ وہ چارلس کو گھورتے ہوئے بولا "کون سا خط! کیسا خط؟ میں نے کسی برطانوی سفارت خانے کو کوئی خط نہیں لکھا۔ میں کبھی کسی کو خط نہیں لکھتا۔"

"وہ فرانسیسی میں لکھا گیا تھا اور ہم پتا چلا چکے ہیں۔ وہ تم نے ہی لکھا تھا" چارلس ملامت سے بولا "انکار مت کرو۔ میں تم سے بہت ہی ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔ تمہارا اس میں کوئی حرج نہیں۔ خدا کے لیے تم میرے چند ضروری سوالوں کا جواب دے دو اور اس احمقانہ سلسلے کو بند کرو۔ چلو... کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔ جہاں ہم اطمینان اور رازداری سے بات کر سکیں۔"

سیوبک چاروں طرف دیکھتے ہوئے بدستور سپاٹ لہجے میں بولا "میں حقِ میزبانی ضرور ادا کروں گا لیکن مجھ سے پہیلیاں بجھوانے کی کوشش مت کرو۔ مجھ سے ایسی باتوں کے بارے میں مت پوچھو جن کے سر پیر کا مجھے علم نہیں۔ رہا یہ مقابلہ، جسے تم احمقانہ سلسلہ کہہ رہے ہو، یہ اب نہیں ٹل سکتا۔ پہلوانِ اعظم ہمارے قبیلے کی ایک اہم ہستی ہے۔ ہم اس کی ناراضگی مول نہیں لے سکتے۔"

"میں خود بھی بہت اہم ہستی ہوں۔ میں بھی نہیں چاہتی یہ مقابلہ ٹلے" کیتھرین آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ چارلس کھڑا بے بسی سے ہاتھ ملتا رہ گیا۔

سیوبک گویا اسے تسلی دینے کے لیے نیچی آواز میں بولا "میں تمہاری تشفی کے لئے ایک وعدہ کر سکتا ہوں اگر تمہاری بیٹی نے اس مقابلے میں اپنی برتری ثابت کر دی تو میں تمہارے تمام سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ جس حد تک بھی مجھے معلوم ہوا اس حد تک ضرور بتا دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ میدان کے وسط میں وہ کیتھرین اور پہلوانِ اعظم سے ذرا دور ریفری کے سے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ پہلوانِ اعظم کے متورم سے ہونٹوں پر اس وقت ایک شیطانی سی مسکراہٹ تھی۔ کیتھرین ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ہم چونکہ پہلوانِ اعظم کا دوسرے پہلوان کے ساتھ مقابلہ دیکھ نہیں سکے تھے اور اختتام پر پہنچے تھے اس لیے ہمیں اس کی طاقت اور لڑنے کے اسٹائل کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میں خود بھی کیتھرین کے سلسلے میں ذرا تشویش کا شکار تھا۔

پہلوانِ اعظم نے اپنے ڈیل ڈول کے برعکس کافی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اچانک اچھل کر کیتھرین کو فلائنگ کِک رسید کرنے کی کوشش کی لیکن کیتھرین نہایت پُرسکون انداز میں ایک طرف ہٹ گئی۔ پہلوانِ اعظم اپنی جھونک میں کولہے کے بل دھپ سے گرے۔ فلائنگ کِک مار کر بھی انسان زمین پر ہی گرتا ہے لیکن کِک خالی چلی جائے تو چوٹ زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

پہلوانِ اعظم کو اٹھنے میں ایک لمحے کی تاخیر ہو گئی۔ کیتھرین نے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی جس نے اس کے سینے جیسے جبڑے کو بھی ایک فٹ اوپر اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ یہ آغاز دیکھ کر ہی میرے دل کو کچھ اطمینان ہونے لگا۔ پہلوانِ اعظم میں یقیناً طاقت تو خاصی ہو گی لیکن وہ احمق تھا۔ اسے کیتھرین سے پہلی لات کھا کر ہی اس کی پھرتی کا اندازہ کر لینا چاہیے تھا۔ اگر وہ پھرتی میں کیتھرین کا

مقابلہ نہیں کرسکتا تھا تو پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے کیترین کو چیلنج دیا تھا جبکہ وہ پہلے ہی ایک پہلوان سے مقابلہ کرکے یقیناً کچھ نہ کچھ تھکا ہوا تھا۔

وہ اچھل کر اٹھنے میں کامیاب ہوگیا اور اب ذرا محتاط انداز میں آگے بڑھا۔ وہ دونوں نیم دائرے میں ایک دوسرے کے سامنے چکرانے لگے۔ اب وہ یقیناً کیترین کو دبوچنے کی فکر میں تھا۔ چند سیکنڈ میں ہی اس کی موٹی عقل میں یہ بات ضرور آگئی تھی کہ پھرتی کے معاملے میں شاید وہ کیترین کو شکست نہ دے سکے۔

وہ خود بھی جوڈو کراٹے سے واقف معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بھی کیترین کے انداز میں ایڑی کے بل گھوم کر کیترین کے منہ پر "چاپ سوئی" رسید کرنے کی کوشش کی لیکن کیترین اتنی آسانی سے مار کھانے والی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ نہ صرف تیزی سے جھکائی دے گئی بلکہ اسی دوران اس نے اس کی پسلیوں میں ایک اور لات رسید کردی۔

پہلوانِ اعظم بے اختیار ڈکرا اٹھا۔ اس کے پھیپھڑوں میں یقیناً خاصی اتھل پتھل ہوئی تھی۔ مجمع کو اب بالکل ہی سانپ سونگھ گیا تھا۔ سب دم سادھے کیترین ہی کو دیکھ رہے تھے اور انہیں گویا اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

آخر کار پہلوانِ اعظم کی وہی کیفیت ہوئی جو اس قسم کی صورتِ حال میں اس قسم کے لوگوں کی عموماً ہوتی ہے یعنی اس میں اگر رتی دورتی عقل موجود تھی تو وہ بھی جلد ہی اس کا ساتھ چھوڑ گئی اور وہ اپنی طاقت کے وحشیانہ اظہار پر ہی اتر آیا۔ اس نے ایک بار پھر سینہ کوبی کی کوشش کی۔ اس کے خیال میں شاید یہ مخالف کو مرعوب کرنے کا کوئی بہت عمدہ حربہ تھا لیکن کیترین نے مرعوب ہونے کے بجائے اس کی اس مصروفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بار پھر اس کی کمر پر اس طرح گھوم کر لات رسید کی کہ وہ اوندھے منہ جاگرا۔

کیترین نے اس کے اٹھنے سے پہلے ہی اس کی کھوپڑی پر پے در پے کئی ٹھوکریں رسید کیں۔ وہ مشینی سے انداز میں حرکت کررہی تھی۔ اس کی حرکات میں جتنی پھرتی تھی' پہلوانِ اعظم اتنا ہی سست پڑگیا۔ اس نے اٹھنے میں چند لمحے صرف کیے' اور اس دوران اس کی پسلیوں پر بھی دو تین ٹھوکریں پڑ چکی تھیں۔

کیترین نے اب تک محض ٹانگوں سے ہی کام لیا تھا اور ٹھوکریں مار مار کر ہی اسے بے حال کردیا تھا۔ مجھے کچھ یوں لگا کہ شاید وہ کراٹے کے خاص انداز میں کک اور بیک کک کے علاوہ خاص انداز میں ایسی ٹھوکریں ہی مارنے میں ماہر تھی جو ہڈیاں چٹخا دیتی ہیں اور انسان کے تمام اندرونی اعضا کو اتھل پتھل کرکے رکھ دیتی ہیں لیکن چند سیکنڈ بعد ہی مجھے اندازہ ہوا کہ کیترین کی مہارت صرف یہیں تک محدود نہیں تھی۔

پہلوانِ اعظم نے ایک ثانیے کے لیے کیترین کو سامنے پاکر اس کی پیشانی پر کراٹے کی چاپ رسید کرنے کی کوشش کی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اگر کیترین اپنے آپ کو اس وار سے بچانے میں کامیاب نہ ہوتی تو صرف یہی اس کے لیے خاصا مہلک ثابت ہوتا۔ پہلوان نہ صرف جھونک میں ایک بار پھر لڑکھڑا گیا اسے کیترین کا ایک اور تکلیف دہ وار سہنا پڑا۔ کیترین نے ہاتھ اکڑاتے ہوئے آہنی پنجے کی طرح اس کی توند میں گھونسہ مارا اگر اس کے پیٹ پر چربی کی موٹی تہیں نہ ہوتیں تو نوکیلے ناخن والا وہ ہاتھ شاید اس کی پشت تک ہی دھنس جاتا۔ تاہم اس کی جس طرح چیخ ماری اس سے اس کی تکلیف کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔

اس نے اپنے جہازی سے ہاتھوں میں کیترین کی مرمریں اور صراحی دار گردن دبوچنے کی کوشش کی۔ ایک ثانیے کے لیے دل اچھل کر حلق میں آگیا جب میں نے دیکھا کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوگیا تھا۔ کیترین کو پیچھے ہٹنے میں صرف ایک ثانیے کی تاخیر ہوگئی تھی۔ مجھے یوں لگا کہ اب تو یہ گردن ٹوٹ کر ہی ان جنگلی ہاتھوں کی گرفت سے چھوٹے گی لیکن کیترین نے ایک ثانیے کی سستی دکھائی تھی دوسرے ہی لمحے اس کی تلافی کردی۔ اس نے پہلوان کی دونوں کلائیاں گرفت میں لیتے ہوئے اچھل کر اس کے سینے پر فلائنگ کک کے انداز میں گھٹنے رسید کیے اور اس کی گرفت مضبوط ہونے سے پہلے ہی صاف نکل گئی۔

پہلوانِ اعظم کا چہرہ' جس پر دوسرے پہلوان سے مقابلے کے دوران خراش تک نہیں آئی تھی' اب خون میں لتھڑا ہوا نظر آرہا تھا حالانکہ کیترین نے اس کے چہرے پر کوئی وار نہیں کیا تھا۔ شاید وہ منہ کے بل کچھ زیادہ ہی زور سے گرا تھا۔ اس کی عینک بھی پھوٹ گئی تھی اور شاید پیشانی کی جلد' ہونٹ وغیرہ بھی پھٹ گئے تھے۔ مٹی اور خون میں لتھڑ جانے کی وجہ سے وہ بہت خوفناک نظر آرہا تھا لیکن ایک لحاظ سے اس کی یہ حالت قابلِ رحم بھی تھی۔ کیترین گویا ایک چھلاوا تھی جو اس کی گرفت میں نہیں آرہی تھی۔

اس نے گویا اپنی بچی کھچی طاقت مجتمع کرتے ہوئے نہایت عجلت سے کیترین پر چھلانگ لگائی۔ اس وقت اس سے اتنی پھرتی کی توقع مجھے بھی نہیں تھی۔ کیترین اس کی گرفت میں آنے سے بال بال بچی۔ اس بار پہلوانِ اعظم کی گدی پر کراٹے کا ہاتھ پڑا۔ یہ ضرب اس کے لیے خطرناک ثابت ہوئی۔ وہ اوندھا گرا اور پھر نہیں اٹھا۔

کیترین مستعدی سے ذرا دور کھڑی اس کے اٹھنے کی منتظر رہی۔ اس بار اس نے اس کے ڈھیر ہونے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی اور اس حالت میں اس پر کوئی وار نہیں کیا۔ شاید وہ شاید ابھی پہلوانِ اعظم کے اٹھنے اور کوئی کرشمہ دکھانے کی امید تھی لیکن بے چارے پہلوانِ اعظم صاحب اوندھے ہی پڑے رہے۔ سانس کی آمد و رفت کے ساتھ پسلیوں کے زیروبم کے سوا ان کے جسم میں حرکت کے کوئی آثار دکھائی نہ دیے۔

بالآخر کیترین کو اندازہ ہوگیا کہ پہلوانِ اعظم اب نہیں

گے۔ وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے گہری سانس لے کر بہ آواز بلند ...سے مخاطب ہوئی "چلو۔ اب اپنے پہلوانِ اعظم کو اٹھوالو ...ں کی مالش' مرہم پٹی وغیرہ کا انتظام کرو اور ہوسکے تو اس ...پر غور کرنا کہ آئندہ اس کا پہلوانِ اعظم کا ٹائٹل برقرار رہنا ...یا نہیں؟"

سیوبک کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ خاموشی ...کیترین کو تک رہا تھا۔ دفعتاً میدان تالیوں کے شور سے گونج ...ں نے اب تک بیک وقت ہر طرف نظر رکھنے کی کوشش کی ...ں نے دیکھا' تالیاں صرف عورتیں بجارہی تھیں اور ان ...چہرے کسی اندرونی جوش سے تمتما رہے تھے لیکن فوراً ہی ان ...مردوں نے خونخوار نظروں سے انہیں گھورا اور ان کے تالیاں ...تے ہوئے ہاتھ ساکت ہوگئے۔ چہروں سے مسکراہٹ غائب ...

ایک لمحے کے توقف سے کیترین بولی "یہ مر بھی سکتا تھا لیکن ...نے زیادہ بدمزگی سے بچنے کے لیے کافی احتیاط برتی ہے اگر اسے ...ت رہی تو میں آئندہ بھی کسی وقت اس سے مقابلے کے لیے ...تی ہوں۔"

سیوبک اب بھی خاموش رہا۔ کیترین میری اور چارلس کی ...ف واپس آگئی۔ چارلس کے چہرے کا اطمینان اس وقت دیدنی ...لیکن وہ اپنی خوشی اور جوش و خروش کو ایک سنجیدہ' مدبر اور متین ...سان کی طرح چھپانے کی پوری پوری کوشش کررہا تھا لیکن مجھے ...یں تھا کہ اس وقت اس کی کیفیت اس باپ جیسی ہی تھی جس کی ...لاڑے کسی عظیم الشان تقریب میں اسٹیج پر حیرت انگیز صلاحیتوں ...اظہار کرکے کوئی بڑا انعام جیتا ہو جبکہ باپ کو اس سے پہلے علم ...نہ رہا ہو کہ اس کی اولاد میں ایسی صلاحیتیں بھی پائی جاتی ...ہیں۔

کیترین کو خراش تک نہیں آئی تھی لیکن چارلس اس کا ہاتھ ...تے ہوئے پوچھے بغیر نہ رہ سکا "تم ٹھیک تو ہو نا؟"

کیترین کوئی جواب دینے کے بجائے میری طرف دیکھ کر ...ہنس دی اور داد طلب انداز میں بولی "میں نے شاگردی ...ادا کیا یا نہیں؟"

...نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "خدا تم جیسی بیٹی بنائی شاگرد ...کی کوسے۔ فی الحال تو تم مجھے استاد نظر آرہی تھیں۔ معلوم ...تم نے کیوں خود کو میری شاگرد قرار دے دیا ہے۔ میں نے تو ...استادی" نہیں دکھائی۔"

...میری نظروں پر چھپے ہوئے جوہر کو پہچان لیتی ہیں" وہ مسکراتے ...

سیوبک اس دوران اپنی زبان میں اپنے آدمیوں کو ہدایات ...رہا تھا کہ وہ پہلوانِ اعظم کو اٹھا کر لے جائیں۔ دوسرے ...ہاری کس بنے سیوبک کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا "اب ...تم میرے سوالوں کے جواب دو گے نا؟ میری بیٹی نے تمہارے پہلوانِ اعظم پر اپنی برتری ثابت کردی ہے۔"

"ہاں... ہاں... میں ضرور جواب دوں گا" سیوبک اس کی طرف گردن گھما کر ذرا برہمی سے بولا "ہم وعدے پورے کرنے والے لوگ ہیں" وہ ایک بار پھر گھوم کر اپنے آدمیوں کو کچھ ہدایات دینے لگا۔ اس دوران ہجوم منتشر ہونے لگا تھا لیکن صرف عورتیں ہی نہیں' مرد بھی مڑ مڑ کر کیترین کو عجیب سی نظروں سے دیکھتے جارہے تھے۔

اسی اثنا میں ایک گدھا گاڑی وہاں لائی گئی جس میں صاف ستھرا گدا بچھا ہوا تھا۔ پہلوانِ اعظم کو اس میں لٹادیا گیا اور گاڑی ایک طرف کو روانہ ہوگئی۔ شاید وہ اس گاؤں کی "ایمبولینس" تھی۔ باقی لوگ بھی اپنے اپنے گھروں کی طرف جارہے تھے۔

میں نے نیچی آواز میں کیترین سے کہا "تمہاری آج کی کارکردگی دیکھ کر تو یقین نہیں آرہا کہ تین روز پہلے تم بحری جہاز پر اتنی آسانی سے جنتر کے قابو میں آگئی تھیں۔"

"اس کی کئی وجوہات تھیں" کیترین مسکراتے ہوئے بولی "اس نے واقعی بالکل غیر متوقع طور پر پیچھے سے آکر میری شہ رگ پر خنجر رکھ دیا تھا... ذرا سی بھی حرکت میرے لیے مہلک ثابت ہوسکتی تھی۔ دوسرے وہاں جگہ بہت تنگ تھی۔ تیسرے جہاز پر چھایا پڑا ہوا تھا۔ میرے دل میں چور تھا۔ میں کسی کے سامنے زیادہ نمایاں نہیں ہونا چاہتی تھی۔ ایک عام اور معمولی سی لڑکی بنی بنی رہنا چاہتی تھی۔ اس طرح کی کئی وجوہات تھیں جن کی بنا پر میں چند سیکنڈ کے اس واقعے میں بالکل ساکت ہوکر رہ گئی تھی۔ ویسے اگر تم جنتر کو ہلاک کرنے میں پھرتی نہ دکھاتے تو پھر شاید میں ہی کچھ کر گزرتی لیکن شاید میں بھی زخمی ہوجاتی۔"

بالآخر سیوبک ہماری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "تم لوگ میرے ساتھ چلو۔"

ہم تینوں اس کے پیچھے چل دیے۔ وہ میدان عبور کرکے ایک ایسی گلی سے گزرا جو غالباً گاؤں کے مین بازار کی حیثیت رکھتی تھی۔ مزید کچھ فاصلہ طے کرنے اور دائیں بائیں مڑنے کے بعد مکانات کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اب ہمارے سامنے ایک پہاڑی تھی جسے اوپر سے تراش کر اس پر مکان بنایا گیا تھا۔ یہ مکان بھی چوبی تھا لیکن نہایت شاندار نظر آرہا تھا۔ پہاڑی کو تراش کر مکان تک جانے کے لیے سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ جیل کی طرز پر مکان کے چاروں کونوں پر برجیاں بنائی گئی تھیں جن میں ایک ایک شخص مشین گن' اسٹینڈ پر فٹ کیے کھڑا تھا۔ چاروں کنوں کا رخ چاروں سمتوں میں تھا۔ مکان کیا تھا' اچھا بھلا چھوٹا موٹا چوبی محل تھا۔

ہمارے اوپر پہنچتے ہی ایک خادم نے دستک سے پہلے ہی لکڑی کا بڑا سا گیٹ کھول دیا۔ یہ شخص بھی مسلح نظر آرہا تھا لیکن خود سیوبک کے پاس کوئی ہتھیار نظر نہیں آرہا تھا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ اس کے شاہانہ طرز کے بھاری بھرکم اور ڈھیلے ڈھالے لبادے میں کچھ پوشیدہ ہوسکتا تھا تاہم معلوم یہی ہوتا تھا کہ اسے خود اپنی

ذات سے زیادہ اپنے گھر اور اہلِ خانہ کی فکر تھی۔

سیوبک کی قلعہ میں ہم اندر پہنچے تو سامنے ہی طویل و عریض صحن نظر آیا۔ اس صحن میں ایک نہایت خوب صورت عورت ڈھیلے ڈھالے لیکن شاہانہ سے لباس میں ایک بچے کو گود میں لیے کھڑی تھی۔ پہلی نظر میں وہ عورت مجھے سفید فام معلوم ہوئی کیونکہ اس کی رنگت سرخ و سفید، آنکھیں نیلی، بال سنہرے لیکن مشرقی عورتوں کی طرح اتنے لمبے تھے کہ کولھوں سے بھی نیچے جا رہے تھے۔ وہ برہنہ سر تھی اور بال کھلے ہی تھے۔ دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہو گیا کہ وہ عورت بہرحال مشرقی ہی تھی۔ سیوبک نے اس سے کچھ نہیں کہا لیکن وہ ہم اجنبیوں کو دیکھتے ہی تیزی سے مڑی اور اندر کہیں چلی گئی۔

سیوبک نے ہمیں دائیں ہاتھ پر واقع ایک طویل و عریض نشست گاہ میں لا بٹھایا۔ اس میں بیش قیمت دبیز قالین، خوب صورت آرام دہ گاؤ تکیے وغیرہ تو موجود تھے لیکن جدید طرز کا نشست کا سامان وغیرہ نہیں تھا۔ دیواروں پر کئیں آویزاں تھیں۔ اس طرز کی نشست گاہیں ہمارے قبائلی علاقوں میں بھی ہوتی ہیں۔

سیوبک کسی خادم کو طلب کرنے کے بجائے ہمیں بٹھا کر باہر جاتے ہوئے بولا "میں مہمانداری کا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔"

وہ جا چکا تو میں نے نیچی آواز میں چارلس سے کہا "اتنا تو مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ اس قبیلے کا سردار ہے لیکن تم اس کے پاس کیوں آئے ہو؟"

"پہلے تو تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ محض اس قبیلے کا سردار نہیں ہے اور اس کی زندگی صرف اس گاؤں تک محدود نہیں ہے....." چارلس آرام سے، پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اب وہ بالکل پُرسکون نظر آ رہا تھا۔

"یہ تو خیر مجھے اندازہ ہے.... اس حیثیت کے لوگ قریبی شہروں تک بھی آتے جاتے رہتے ہیں" میں نے کہا۔

چارلس گویا میری بات سے محظوظ ہوتے ہوئے ہنسا "تم قریبی شہروں کی بات کر رہے ہو، وہ تو دور دراز ملکوں تک جاتا رہتا ہے۔"

"کیا کوئی کاروبار وغیرہ کرتا ہے؟" میں نے کچھ حقیقی، کچھ مصنوعی سادگی سے پوچھا۔

چارلس ایک بار پھر دھیرے سے ہنسا اور میری طرف جھکتے ہوئے نہایت دھیمی آواز میں بولا "تمہیں شاید یقین نہیں آئے گا..... وہ بہت اونچے درجے کا اُجرتی قاتل ہے....."

کیتھرین بھی ذرا باپ کی طرف جھک گئی تھی۔ اس نے ذرا چونک کر باپ کی طرف دیکھا۔ میں نے بغور چارلس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کتنے اونچے درجے کا؟"

"سفیروں..... وزیروں اور سربراہانِ مملکت کو قتل کرتا ہے۔ بہت بھاری معاوضہ لیتا ہے۔ سی آئی اے، آنجہانی کے جی بی، موساد یا خاد وغیرہ کے کسی گھاگ اور تجربے کار ایجنٹ سے زیادہ سردار ہے لیکن جب یہ یورپ، افریقہ یا مشرقِ وسطیٰ کے کسی ملک میں..... یا پھر امریکا، برطانیہ، جرمنی وغیرہ میں نظر آتا ہے تو کوئی اس پر قبائلی ہونے کا شبہ بھی نہیں کر سکتا۔ دنیا کی کئی زبانیں روانی سے بولتا ہے اور دنیا کے کئی خاص شہروں میں اس کا بنگلا یا اپارٹمنٹ موجود ہے جس میں اس کی کوئی نہ کوئی داشتہ رہتی ہے۔ دنیا کی تقریباً ہر قوم کی عورت اس کی داشتاؤں میں شامل ہے یا شامل رہ چکی ہے۔"

"مسٹر چارلس! ایسا لگ رہا ہے جیسے تم مجھے کسی الف لیلوی کردار کے بارے میں بتا رہے ہو" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

چارلس ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اب تو الف لیلہ بھی پرانی چیز ہو چکی ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں ایک نئی الف لیلہ رقم کی جا رہی ہے۔ ہر نظامِ حکومت کی خامیوں یا مصلحتوں کی وجہ سے ہر جگہ الف لیلوی کردار جنم لے چکے ہیں۔ جب ہم پہلی بار ان کے بارے میں جانتے ہیں، ان کے قریب جاتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ ہم بے یقینی سے سوچتے ہیں "اچھا..... آیا دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں؟ کیا دنیا میں ایسا بھی ہو رہا ہے؟" لیکن ہمارے یقین کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ دنیا بہرحال الف لیلوی کرداروں سے بھری پڑی ہے۔"

"تم اس کے پاس کس لیے آئے ہو؟ کسی کو قتل کروانا ہے؟" میں نے پوچھا۔ وہ ایک سُپر پاور کا نمائندہ تھا اور بساط سے مُہرے ہٹاتے رہنا، ان کی جگہ نئے مُہرے جماتے رہنا سُپر پاورز کا مشغلہ ہے۔

"نہیں۔ قتل نہیں کرانا ہے..... بلکہ کسی کو قتل ہونے سے بچانا ہے" چارلس نے سرگوشی میں جواب دیا۔

"کسے؟" میں نے جاننا چاہا۔

"لیڈی ڈائنا کو" اس نے جواب دیا۔

میں چند لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ بالآخر بولے بغیر نہ رہ سکا "اس خوب صورت اور بے ضرر عورت کو کون قتل کرانا چاہتا ہے؟ وہ تو سربراہِ مملکت بھی نہیں ہے..... سیاست سے اس کو کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔"

"اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ کون قتل کرانا چاہتا ہے تو ہمیں یہاں آنے کی ضرورت نہ پڑتی" چارلس گہری سانس لے کر بولا "ویسے ڈائنا سربراہِ مملکت نہ سہی..... سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہ سہی..... لیکن وہ ایک اہم شخصیت ہے۔ ایسی شخصیت کہ اس کو خواہ کوئی عہدہ نہ ہو، لیکن اس کا مقام، اس کی حیثیت کچھ ایسی ہے کہ اس کی زندگی یا موت دنیا کی سیاست پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔"

"کیا لیڈی ڈائنا کو قتل کرنے کا کنٹریکٹ سیوبک کو ملا ہے؟" میں نے دریافت کیا لیکن اسی لمحے باہر آہٹ ابھری۔ شاید سیوبک

چارلس سرگوشی میں بولا "تم خاموشی سے سب کچھ دیکھتے رہو..... سنتے رہو۔ بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔"

چند سیکنڈ بعد سیوبک کمرے میں داخل ہوا۔ دو ملازم اس کے پیچھے ٹرے اٹھائے آ رہے تھے۔ ان میں شراب، وسکی بیئر وغیرہ کی بوتلیں، سوڈا، برف سب کچھ تھا۔

"میرے ہاں ہر مہمان کی تواضع اس کی معاشرت کے مطابق کی جاتی ہے" سیوبک بیٹھتے ہوئے بولا "پہلے مشروبات کا دور چلے گا۔"

چارلس نے اپنے لیے وسکی کا ایک ہلکا پیگ تیار کیا اور کیتھرین نے اپنے لیے شیری پسند کی۔ میں ساکت بیٹھا رہا تو سیوبک نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"آپ کچھ نہیں لے رہے؟" اس نے انگریزی میں نہایت شائستگی سے پوچھا۔

"اگر زحمت نہ ہو تو میرے لیے شربتِ بنفشہ..... سکنجبین یا پھر لسّی منگوا دیجیے" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کیا.....؟ شربت.....؟" سیوبک کے لیے شربتِ بنفشہ، سکنجبین اور لسّی جیسے الفاظ دُہرانا مشکل تھا۔ وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کے ہاں ہر مہمان کی تواضع اس کی معاشرت کے مطابق کی جاتی ہے۔" میں نے معصومیت سے کہا اور بوتلوں کی طرف اشارہ کیا "میری معاشرت میں تو ان کی گنجائش نہیں ہے۔"

"اوہ..... میں سمجھا..." سیوبک سر ہلاتے ہوئے بولا "آپ پیتے نہیں ہیں۔ میں بھی نہیں پیتا ہوں۔"

اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ چارلس نے اس کے بارے میں جو کچھ مجھے بتایا تھا، اس کے بعد یہ جاننا میرے لیے واقعی باعثِ حیرت تھا کہ وہ پیتا نہیں تھا پھر وہ میرے لیے ایک گلاس میں برف اور سوڈا ڈالتے ہوئے بولا "چلیں..... آپ صرف یہی پی لیں۔"

"آپ کہتے ہیں تو پی لیتا ہوں ویسے میری معاشرت میں تو یہ بھی شامل نہیں ہے" میں نے گلاس تھامتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

اب سیوبک بغور میری طرف دیکھ رہا تھا۔

چارلس نے سیوبک کو مخاطب کیا "تم مسٹر افضل چوہدری کی باتوں میں مت الجھو۔ یہ بہت سنجیدگی سے مذاق کرتے ہیں۔"

"میرے ساتھ ٹریجڈی یہی رہی ہے....." میں نے اپنے لہجے کو غمناک بناتے ہوئے کہا "جب بھی میں نے سنجیدگی سے بات کرنے کی کوشش کی، اسے مذاق سمجھ لیا گیا۔"

"خیر....." سیوبک نے کندھے اچکاتے ہوئے موضوع بدل دیا "مشروبات کے دور کے بعد کھانے کا سلسلہ ہو گا۔ بات پھر وہی معاشرت کی آ جاتی ہے..... ہمارے ہاں سالم بکرے کے پیٹ میں چاول بھر کر اسے خاص مسالوں کے ساتھ روسٹ کیا جاتا ہے اور ساتھ ایک خاص طرح کی پھلی پھولی روٹی ہوتی ہے۔ اگر آپ لوگ پسند کریں تو وہ تقریباً تیار ہے، ورنہ پھیکے سیٹھے انگریزی کھانے بھی دستیاب ہو سکتے ہیں۔"

اس انداز میں بکرا ہمارے ہاں بھی قبائلی علاقوں میں روسٹ کیا جاتا تھا۔ میں نے اور چارلس نے اسی کے حق میں ووٹ دیا۔ کیتھرین نے کندھے اچکا کر ہماری تائید کر دی۔ اس کے خیال میں کھانا پینا اہم مسئلہ نہیں تھا۔

سیوبک بولا "کھانے پینے کا سلسلہ چلتا رہے گا..... لیکن میرا خیال ہے ساتھ ساتھ باتیں بھی ہو جانی چاہئیں۔ مسٹر چارلس! آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں، پوچھیے۔"

"چند دن پہلے استنبول میں برطانوی سفارت خانے کو ایک گمنام خط موصول ہوا جو فرانسیسی میں لکھا گیا تھا....." چارلس نے کہا اور خاموش ہو کر یوں سیوبک کے چہرے کا جائزہ لینے لگا گویا اس پر کوئی ردِعمل تلاش کر رہا ہو لیکن سیوبک کا چہرہ ہر تاثر سے عاری رہا۔

چارلس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "اسکاٹ لینڈ یارڈ اور برطانوی سیکرٹ سروس اس خط کے بارے میں فوراً حرکت میں آئی۔ ان کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت تو موجود نہیں، لیکن باور کیا گیا ہے کہ وہ خط تم نے لکھا تھا۔"

"باور نہیں، تم لوگوں کو فرض کرنا چاہیے تھا" سیوبک نے تصحیح کی یا شاید مشورہ دیا۔ لہجہ نہایت نرم تھا۔

"چلو..... فی الحال ہم فرض کر لیتے ہیں کہ وہ خط تم نے لکھا تھا" چارلس نے بحث نہیں کی اور بات جاری رکھی "تم نے اس خط میں خبردار کیا تھا کہ لیڈی ڈائنا کا ترکی کا جو دورہ طے پا چکا ہے اور جس کا شیڈول بھی بن چکا ہے، اس کے دوران انہیں قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تم نے یہ نہیں لکھا تھا کہ اس قسم کی شخصیت کو قتل کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ اگر اس کی پیشگی اطلاع موجود تھی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ کسی جنونی کی حرکت بھی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ جنونی یا اس قسم کے لوگ جن کے دماغ میں کوئی خناس ہوتا ہے وہ اچانک ہی ایسی کسی شخصیت پر حملہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"درست ہے" سیوبک آہستگی سے بولا۔

"برطانوی سیکرٹ سروس اور دیگر کئی ماہرین نے اس خط پر بہت غور کیا....." چارلس بات جاری رکھتے ہوئے بولا "بظاہر اس کے چند مقاصد ممکن نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ جب کوئی بڑی شخصیت کسی ملک کا دورہ کرتی ہے اور اس دوران اسے کوئی گزند پہنچ جاتا ہے تو سب سے پہلے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات خراب ہو جاتے ہیں۔ میزبان ملک پر الزام آتا ہے کہ اس کے سیکیورٹی کے انتظامات ناقص تھے۔ برطانیہ اور ترکی کے تعلقات اس وقت ویسے ہی ایک اہم دور سے گزر رہے ہیں....."

سیوبک خاموش رہا اور سوڈے کے گلاس کو انگلیوں میں گھماتا رہا۔ وہ کسی جھیل کی طرح پُرسکون تھا..... بلکہ جھیل کی سطح پر بھی ہوا سے خفیف سی لہریں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ سیوبک کے

چہرے پر ذرا بھی ارتعاش نہیں تھا۔

"دوسرا مقصد شاہی خاندان کو ایک بڑے بحران سے دوچار کرنا بھی ہوسکتا ہے" چارلس سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا "کیونکہ آج کل ویسے ہی عالمی پریس اور میڈیا میں پرنس چارلس اور لیڈی ڈائنا کے درمیان اختلافات کی خبریں گرم ہیں اور طلاق تک نوبت پہنچتی بتائی جارہی ہے اس لیے یہ شبہ بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ کہیں شاہی خاندان نے خود ہی تو ڈائنا کو نہ مروایا ہو۔ شاہی خاندان کے وقار کو اس سے سخت دھچکا لگ سکتا ہے کیونکہ شاہی خاندان میں آج تک اس طرح کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ شاہی خاندان آج کل ویسے بھی مختلف افواہوں کی کچھ زیادہ ہی زد میں ہے جن کے پیچھے کچھ مخصوص لابیاں کام کررہی ہیں۔ بہرحال ڈائنا عوامی سطح پر بھی خاصی مقبول شخصیت ہے۔ اس کے قتل پر برطانیہ میں خاصا شدید ردِعمل بھی مرتب ہوسکتا ہے جو ملک کو اپنی جگہ کچھ نئے مسائل سے دوچار کرسکتا ہے۔"

چارلس نے ایک لمحے کے لیے خاموش ہوکر گہری سانس لی "چنانچہ لیڈی ڈائنا پر قاتلانہ حملے کا امکان تو پایا جاتا ہے۔ اس لیے ہم نے اس خط کو دیوانے کی بڑ سمجھ کر نظرانداز نہیں کیا لیکن تحقیقات کے بعد ہماری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ تم نے وہ خط کیوں لکھا؟"

"تم نے کیوں فرض کرلیا کہ وہ خط میں نے لکھا تھا؟" سیوبک نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

چارلس ملائمت سے بولا "دیکھو..... اگر ہم انجان اور معصوم بن کر گفتگو کریں گے تو بات آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم دنیا کے ایک نہایت مہنگے اور اونچے درجے کے اُجرتی قاتل ہو۔ بہت ہی خاص الخاص شخصیتوں کو قتل کرنا تمہاری وجۂ شہرت ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ تمہاری یہ شہرت صرف چند افراد تک محدود ہے۔ یہ بھی ایک الگ مسئلہ ہے کہ ایک ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے آج تک تمہارا کچھ نہیں بگاڑا جاسکا۔ دوسرے تم خود اپنی حفاظت کرنا بخوبی جانتے ہو۔ کوئی سیکرٹ ایجنٹ یا اسپائی کوشش بھی کرے تو شاید تمہیں ہلاک نہ کرسکے۔"

اس موقعے پر میں نے سیوبک کے پتلے پتلے سفاک ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک رمق سی نمودار ہوتے محسوس کی۔

چارلس مربیانہ لہجے میں بولا "اس لیے اب اس بات کو جھٹلانا تو چھوڑ دو کہ وہ خط تم نے لکھا تھا۔ میری جیب میں کوئی ننھا سا ٹیپ ریکارڈر وغیرہ پوشیدہ نہیں ہے جس پر تمہارا یہ اعترافِ جرم ریکارڈ ہوجائے گا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تمہاری جیب میں کوئی ٹیپ ریکارڈر وغیرہ نہیں ہے" سیوبک اب ذرا مسکرایا "اگر مجھے اس قسم کا کوئی شبہ ہوتا تو تم لوگوں کی تلاشی لے کر اب تک وہ ٹیپ ریکارڈر برآمد کیا جاچکا ہوتا۔ بلکہ شاید ضائع بھی کیا جاچکا ہوتا۔"

"تو پھر تم کھل کر بات کیوں نہیں کررہے؟" چارلس بولا "تم نے تو کہا تھا کہ تم میرے ہر سوال کا جواب دوگے۔ تم تو پہلے ہی سوال کا جواب نہیں دے رہے۔"

"کبھی کبھی سوال خود اپنا جواب ہوتے ہیں" سیوبک نے یہ کہتے ہوئے گلاس ہونٹوں سے لگالیا۔

چارلس پہلو بدل کر بولا "بہرحال..... ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کنٹریکٹ تمہارے پاس آیا ہوگا۔ اس کے بغیر تم اس راز سے آگاہ نہیں ہوسکتے تھے۔ ہمیں اس سلسلے میں خبردار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے کنٹریکٹ واپس کردیا ہے۔ پہلا سوال تو یہی پیدا ہوتا ہے کہ تم نے کنٹریکٹ کیوں واپس کردیا؟ اگر واپس کرہی دیا تھا تو اس سلسلے میں ہمارے سفارت خانے کو کیوں خبردار کیا؟ یہ تو تم جیسے قاتلوں کی "اخلاقیات" کے خلاف ہے۔"

سیوبک چند لمحے گلاس کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے پُرخیال انداز میں اسی کو گھورتا رہا۔ کیتھرین اب آنکھوں میں ایک نئی دلچسپی لیے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بالآخر سیوبک نے شاید ذرا کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کرہی لیا۔ وہ چارلس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے نہایت ہی دھیمی آواز میں بولا "یہ درست ہے کہ کنٹریکٹ میرے پاس آیا تھا اور یہ بھی درست ہے کہ میں نے واپس کردیا تھا۔ تمہارے آدمیوں نے اندازے لگانے میں مہارت دکھائی ہے۔ مجھے تمہاری حکومت سے یہی امید تھی۔"

"کون لوگ کنٹریکٹ لے کر آئے تھے؟" چارلس نے پوچھا۔

"پانچ آدمیوں کا ایک گروپ تھا۔ وہ ایک چارٹرڈ طیارے میں آئے تھے" سیوبک نے جواب دیا۔

"میرے پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ ان کا تعلق کس ملک سے تھا؟" چارلس ملائمت سے بولا۔

"یہ میں نہیں جان سکا۔ اگر جان بھی لیتا تو تمہیں نہ بتاتا۔ اب تم مجھ سے کاروباری "اخلاقیات" کو اس حد تک بھی ترک کردینے کی توقع مت رکھو" سیوبک سپاٹ لہجے میں بولا۔

"انہوں نے تمہیں کتنا معاوضہ آفر کیا تھا..... یہ تو بتاسکتے ہو؟"

"ہاں۔ ایک ملین پاؤنڈ۔"

"ایک ملین پاؤنڈ.....!" چارلس نے حیرت سے دُہرایا۔

"یہ تو میں صرف نقد رقم کی بات بتارہا ہوں جو وہ ساتھ لے کر آئے تھے۔ یہ ایڈوانس تھا۔ کام ختم ہونے کے بعد مزید ایک ملین پاؤنڈ میرے سوئس اکاؤنٹ میں منتقل ہونا تھے" سیوبک مسکراتے ہوئے بولا۔

چند لمحے کے لیے کمرے میں سکوت چھاگیا!

لازوال کہانیوں کے خالق

انوار صدیقی کی اپنے قارئین کے لیے

ایک نئی سوغات

رقصِ ابلیس

ہولناک اور پراسرار ماحول میں جنم لینے والی ایک حقیقت جو کہانی بن گئی۔

ایک آشفتہ حال کی داستان عبرت جسے قانون نے مجرم بنادیا

قیمت۔/150 روپے

ناشر۔ مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور 2

سیوبک بغور چارلس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چارلس کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہر سوال کرنے کے لیے نہایت احتیاط سے الفاظ کا انتخاب کررہا تھا اور اس سے بھی زیادہ احتیاط کے ساتھ سیوبک جواب دے رہا تھا۔ چارلس تو خیر ایک غیر رسمی قسم کا ڈپلومیٹ اور غیر روایتی قسم کا معاملہ ساز ہی تھا لیکن سیوبک بھی اس وقت اپنے اندازِ گفتگو سے کوئی ڈپلومیٹ ہی معلوم ہورہا تھا۔ جس سنجیدگی، متانت اور ادب واحترام سے دونوں کے درمیان گفتگو ہورہی تھی اس سے یہ گمان بھی نہیں گزرتا تھا کہ ان دونوں میں سے ایک نہایت اونچے درجے کا پیشہ ور اُجرتی قاتل تھا۔

اس دور کا المیہ یہی ہے کہ اس میں قتل وغارت اور دہشت گردی وغیرہ ایک بڑی صنعت یا شاید بہت بڑے فن کا درجہ حاصل کرچکی ہے۔ اگر آپ چھوٹے موٹے آدمی ہیں اور غصے میں یا غلطی سے حتیٰ کہ کسی معقول وجہ کے تحت بھی کسی کو قتل کردیتے ہیں تو آپ قاتل ہیں، پولیس آپ کو پکڑنے کے لیے حسبِ مقدور کوششیں کرے گی اور اگر آپ اس کے ہتھے چڑھ گئے تو امید یہی ہے کہ آپ کا حشر خاصا عبرت ناک ہوگا لیکن اگر آپ اسی کام میں کمال حاصل کرلیتے ہیں، کسی بڑے مقام پر پہنچ جاتے ہیں، اسے صنعت کا درجہ دیتے ہیں، اس قابل ہوجاتے ہیں کہ آپ کے محض ایک اشارے پر کچھ سے کچھ ہوجاتا ہے تو پھر نہ جانے قاعدے قانون کہاں چلے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگ بعض اوقات خود آپ کو سہارا دے کر اونچے سنگھاسن پر بٹھاتے ہیں پھر نہایت ادب واحترام سے آپ سے مذاکرات کرتے ہیں۔ یہ تفاوت، یہ تضاد آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

لیڈی ڈائنا کو ہلاک کرنے کے لیے سیوبک کو دو ملین پاؤنڈ کی پیشکش ہوئی تھی۔ پاکستانی کرنسی میں یہ رقم سات کروڑ سے اوپر تھی لیکن مجھے رقم پر حیرت نہیں تھی۔ ایک سپرپاور کے شاہی خاندان کی ایک نہایت اہم اور ممتاز شخصیت کو قتل کرنے کا یہ معاوضہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ پاکستان جیسے غریب ملک میں غریبوں کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے کسی اسمبلی کے ممبر کو اِدھر سے اُدھر لڑھکنے، کسی معاملے میں "ہاں" کرنے یا کسی معاملے میں "نا" کرنے کا اتنا معاوضہ مل جاتا ہے۔

حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اس معاملے میں برطانوی حکومت کا ایک نمائندہ بیٹھا اس شخص سے نہایت دوستانہ ماحول

میں بات چیت کر رہا تھا جو لیڈی ڈائنا کا قاتل بھی ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اس شخص کو بین الاقوامی قوانین کے تحت اپنے ہاں بلوانے یا اپنی کسی ایجنسی کے ذریعے اغوا کرانے اور اسکاٹ لینڈ وغیرہ میں اس سے تفتیش کرنے کے بجائے اس کے در دولت پر حاضر ہو کر معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اگر یہ کوئی پاکستانی معاملہ ہوتا اور کوئی پاکستانی نمائندہ اس قسم کے مذاکرات کر رہا ہوتا تو مجھے کوئی خاص حیرت نہ ہوتی۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد چارلس گہری سانس لے کر بولا۔ "تم نے دو ملین پاؤنڈ کا یہ کنٹریکٹ ٹھکرا دیا؟"

"ہاں۔" سیوبک نے اختصار سے جواب دیا۔

"کیوں؟" چارلس نے جاننا چاہا۔

"میری مرضی۔" سیوبک کا جواب اب بھی مختصر تھا۔

چارلس نفی میں سر ہلاتے ہوئے ملائمت سے بولا۔ "میرا خیال ہے اس کا جواب اتنا سادہ نہیں ہو سکتا۔"

"شاید جواب مختصر ہونے کی وجہ سے تمہیں اتنا سادہ لگ رہا ہے۔" سیوبک مسکرایا۔ "اگر میں ذرا تفصیل سے جواب دوں گا تب بھی مفہوم یہی ہوگا۔"

"پھر بھی..... میں چاہتا ہوں تم ذرا کھل کر بات کرو۔" چارلس کے لہجے میں مہذبانہ اصرار تھا۔

"کھل کر تو میں نے آج تک اپنی بیوی سے بات نہیں کی۔"

"بیوی سے تو خواہ تم بالکل ہی بات مت کرو۔ مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ میں تو اپنی بات کر رہا ہوں۔" چارلس خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

سیوبک ایک لمحے کچھ سوچنے کے بعد بولا۔ "بس..... کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ ایک تو میں نے اس سے پہلے کسی عورت کو قتل نہیں کیا۔ دوسرے مجھے اس عورت کی اب تک کی زندگی میں کوئی زیادہ بڑی خباثت نظر نہیں آئی۔ کسی کی نجی زندگی سے میں کوئی مطلب نہیں رکھتا لیکن کسی بھی دوسرے زاویے سے یہ عورت کسی بھی اعتبار سے مجھے انسانیت کی مجرم نظر نہیں آئی۔"

"اوہو....." چارلس استہزائیہ انداز میں دھیرے سے ہنسا۔ "گویا تم بہت نیک قسم کے قاتل ہو۔ صرف ان لوگوں کو قتل کرتے ہو جو تمہیں انسانیت کے مجرم نظر آتے ہیں؟"

"نہیں..... ایسی بھی بات نہیں ہے۔" سیوبک ہلکی سی ناگواری سے بولا۔ "تاہم میں چونکہ ہر ایرے غیرے کو قتل کرتا نہیں پھرتا۔ میرا نشانہ بہت بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے ماضی میں مجھے کچھ نہ کچھ گھناؤنا پن مل جاتا ہے۔ بڑے آدمیوں کی غلطیاں بھی بڑی ہوتی ہیں..... یا یوں کہو کہ ان کی غلطیوں کے اثرات بہت بڑے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان کا ذرا سا غلط فیصلہ ہزاروں انسانوں کی زندگیاں برباد کر دیتا ہے۔ لاکھوں انسانوں کو زندہ درگور کر دیتا ہے یا انہیں اذیت ناک موت کی آغوش میں پہنچا دیتا ہے۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں، درست ہے۔" چارلس نے تسلیم کیا۔

"تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ آج کی دنیا میں جنہیں بڑے لوگ کہا جاتا ہے وہ کچھ ایسی مثالی زندگی گزار کر بڑے نہیں بنے نہ جانے کیا کیا جوڑ توڑ کرتے ہیں۔ ان کا اعمال نامہ نہ جانے کیسی کیسی خباثتوں سے بھرا ہوتا ہے۔ میں بے شک معاوضہ لے کر قتل کرتا ہوں اور اپنا مطلوبہ معاوضہ ملنے پر کسی کو بھی قتل کر سکتا ہوں لیکن پھر بھی اپنے دل کے اطمینان کے لیے اس کے اعمال نامے میں سے کوئی نہ کوئی جواز چن لیتا ہوں کہ فلاں شخص اس وقت بے شک بڑا نیک نام تھا، بڑے اونچے مقام پر فائز تھا، بے شمار لوگ اس کے نام کی مالا جپ رہے تھے لیکن اپنی فلاں حرکت کی وجہ سے وہ موت کا مستحق تھا، وہ انسانیت کا مجرم تھا، اسے تو بہت پہلے مرجانا چاہیے تھا اور بڑی عبرتناک موت مرنا چاہیے تھا۔"

"بہت خوب۔ گویا تم بڑے باضمیر قسم کے قاتل ہو۔" چارلس کا لہجہ اب بھی قدرے استہزائیہ ہی تھا اور میرا خیال تھا سیوبک کو یہ بات کچھ ناگوار گزر رہی تھی۔

"نہیں۔ مجھے باضمیر ہونے کا دعویٰ نہیں۔" سیوبک ملائمت سے بولا۔ "میں اپنے آپ کو اس جواز سے صرف اس لیے مطمئن کرتا ہوں کہ رات کو آرام کی نیند سو سکوں۔ کوئی کنٹریکٹ پورا کرنے کے بعد بھی میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہ ہو ورنہ اس قسم کے کام انسان خواہ کتنا ہی بھاری معاوضہ لے کر کرے اور اس کے اعصاب خواہ کتنے ہی مضبوط ہوں لیکن کبھی نہ کبھی وہ اندر سے ضرور پچھتانے لگتا ہے جبکہ میں بالکل مطمئن اور مسرور ہوں۔ میں نے کبھی اپنے آپ کو مضطرب یا پریشان محسوس نہیں کیا۔"

"لیڈی ڈائنا کو قتل کرنے کا تمہیں کوئی مضبوط جواز نہیں مل سکا؟" چارلس نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، میرے انکار کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔" سیوبک نے جواب دیا۔ "مجموعی طور پر بات صرف یہی ہے کہ میرا دل نہیں چاہا۔"

"چلو..... مان لیا....." چارلس نے سر ہلایا۔ "قصہ مختصر یہ کہ تم نے کنٹریکٹ واپس کر دیا لیکن تمہیں پھر بھی یہ یقین ہے کہ لیڈی کو ہلاک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تمہارا خیال ہے یہ پروگرام ملتوی نہیں ہوا؟"

"خیال نہیں..... بلکہ مجھے یقین ہے یہ پروگرام ملتوی نہیں ہوا۔ اسی لیے تو میں نے تمہارے سفارت خانے کو گمنام خط لکھ کر ٹپ دینے کی کوشش کی تھی ورنہ مجھے اس زحمت کی کیا ضرورت تھی؟" سیوبک تیکھے لہجے میں بولا۔

"تم نے یہ زحمت کیوں اٹھائی؟" چارلس نے جاننا چاہا۔

"یونہی۔ میں نے سوچا اس عورت کو قتل نہیں ہونا چاہیے۔" سیوبک کندھے اچکا کر بولا۔ "میں نے اس لیے تمہارے سفارت خانے کو ٹپ دے کر اپنی زندگی اور اپنے کیریئر کے لیے بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے کیونکہ جو لوگ میرے پاس کنٹریکٹ لے کر آئے تھے وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کریں گے کہ ان کا منصوبہ ناکام ہو..... اور اگر منصوبہ ناکام ہوتا ہے تو سب سے پہلے ان کا شک مجھ پر جائے گا کیونکہ میرا انکار سننے کے بعد میرے ہی سامنے غیر ارادی طور پر ان میں سے ایک کے منہ سے نکل گیا تھا کہ پھر تمہاں سے بات کر لیتے ہیں، انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا کہ انہیں اتنی بے صبری سے میرے سامنے یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن میں انجان سا بنا رہا تھا جیسے میں نے یہ بات سنی ہی نہیں تھی۔"

"تمہارے تعاون کے لیے میں واقعی تہ دل سے تمہارا شکر گزار ہوں۔" چارلس حقیقی ممنونیت سے بولا۔ "میں تم سے پوچھنے ہی والا تھا کہ تمہارے بعد کنٹریکٹ کس کے پاس گیا ہوگا؟ میں ابھی اس سوال کے لیے مناسب الفاظ ہی تلاش کر رہا تھا۔ مجھے زیادہ اُمید نہیں تھی کہ یہ بات تمہیں معلوم ہوگی..... اور اگر معلوم ہوگی تو تم مجھے بتانا پسند کرو گے یا نہیں؟ اچھا ہوا تم نے پوچھے بغیر ہی بتا دیا۔"

"جب میں نے تمہارے سفارت خانے کو خط لکھنے کی حماقت کر ہی ڈالی اور تم لوگوں کو معلوم ہو ہی گیا کہ خط میں نے لکھا تھا تو اب کوئی بھی بات چھپانے کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔" سیوبک قدرے بے پروائی سے بولا۔

"اب تم خاصی سمجھ داری سے بات کر رہے ہو۔" چارلس کے لہجے میں اب اچھی خاصی محبت جھلکنے لگی تھی۔ "لیکن تم ہمارے سفارت خانے کو خط لکھنے کو حماقت مت قرار دو۔ میرے خیال میں تو تم نے زندگی میں پہلی بار ایک ڈھنگ کا کام کیا ہے۔ تم ہماری حکومت کی گڈ بکس میں آ گئے ہو۔"

چارلس نے گویا سیوبک کو خوشخبری سنائی تھی لیکن وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ "مجھے تمہاری حکومت کی گڈ بکس میں آ کر کیا ملے گا؟ میری حیثیت تو تبدیل نہیں ہو جائے گی۔ تمہارے ملک سمیت جن ملکوں کی خفیہ ایجنسیوں کے پاس میرا تھوڑا بہت ریکارڈ موجود ہے وہ تو جوں کا توں رہے گا۔ اس میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔"

"شاید۔" چارلس مبہم لہجے میں بولا۔ "لیکن ہم کم از کم یہ کوشش ضرور کریں گے کہ کنٹریکٹ واپس کرنے سے تمہارا جو نقصان ہوا ہے اس کی کچھ نہ کچھ تلافی ہو جائے۔"

چارلس کی دانست میں شاید یہ بھی سیوبک کے لیے ایک خوشخبری تھی لیکن سیوبک نے اس پر بھی کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ کم از کم خوشی تو ہرگز ظاہر نہیں کی۔ وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ "میں نے کنٹریکٹ واپس کر کے اور تمہاری حکومت کو ٹپ آف کر کے اس سے زیادہ خطرہ مول لیا ہے جتنا مجھے کنٹریکٹ قبول کرنے کی صورت میں لاحق ہوتا۔ ظاہر ہے جو لوگ اس قسم کے کنٹریکٹ لے کر آتے ہیں وہ بھی معمولی لوگ نہیں ہوتے۔ ان کے پیچھے بھی کچھ طاقتیں کام کر رہی ہوتی ہیں۔"

"تم اس کی پروا مت کرو۔ تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔" چارلس نے گویا اسے تسلی دی۔

"مجھے معلوم ہے۔ اسی اعتماد کے ساتھ تو میں زندہ ہوں۔" وہ ایک خاص قسم کی بے نیازانہ خود اعتمادی کے ساتھ بولا۔ مجھے اس کے انداز میں کسی حد تک تکبر کی جھلک بھی محسوس ہوئی۔ "مجھے خیر و عافیت کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے تمہاری حکومت کی مدد کی ضرورت نہیں۔"

"میں تمہیں مدد کی پیشکش کر بھی نہیں رہا۔" چارلس نے فوراً گویا اس کی خوش فہمی دور کی۔ "میں تو ویسے ہی تمہارے سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے ایک اندازہ ظاہر کر رہا تھا۔ اچھا..... یہ بتاؤ..... تمہارے خیال میں کنٹریکٹ اب ہمان ہی کے پاس ہے؟"

"مجھے کچھ ایسی ہی خبریں ملی ہیں۔ اور میرا خیال ہے وہ درست ہیں۔" سیوبک نے جواب دیا۔ "اب وہی لیڈی ڈائنا کو قتل کرنے کی کوشش کرے گا اور اس بات کا بہت زیادہ امکان ہے کہ وہ کامیاب ہو جائے۔ اس نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں چار چھ کنٹریکٹ ہی کیے ہیں اور سُنا ہے وہ کسی میں ناکام نہیں رہا۔"

"اگر وہ لیڈی ڈائنا کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ ہمارے لیے بڑی شرم کا مقام ہوگا۔" چارلس بولا۔ "تم اسے روکنے میں ہماری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

"میں.....؟" سیوبک نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ "میں ایک اکیلا حقیر سا آدمی بھلا تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"زیادہ کسرِ نفسی سے کام مت لو۔ ہمیں معلوم ہے تم کتنے حقیر ہو۔" چارلس بولا۔

"میری صلاحیتیں اور میری "خطرناکی" اپنی جگہ سہی..... لیکن فرد بہرحال فرد ہی ہوتا ہے اور حکومتیں بہرحال حکومتیں ہی ہوتی ہیں۔ تم ایک حکومت کے نمائندے ہو۔ حکومت بھی معمولی نہیں..... بلکہ ایسی حکومت جو کبھی تقریباً پوری دنیا پر قابض رہی ہے۔ جس کی حدود میں کبھی سورج ہی غروب نہیں ہوتا تھا۔" سیوبک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"پرانی باتیں مت کرو۔ آج کے دور میں رہ کر بات کرو۔" چارلس ملائمت سے بولا۔

"آج بھی تمہارے ملک کا شمار سپر پاورز میں ہے۔ تمہارے پاس پولیس ہے..... ملٹری انٹیلی جنس ہے..... اسکاٹ لینڈ یارڈ ہے..... اسپیشل سیکرٹ سروس ہے۔ میرے تعاون کی تمہیں بھلا کیا ضرورت ہے؟"

"ہم اپنے سارے محکموں کو تو اٹھا کر یہاں نہیں لا سکتے۔ کسی

اہم شخصیت کے دورے کے موقع پر زیادہ سے زیادہ دو چار خاص خاص آدمی آجاتے ہیں۔ زیادہ تر تو میزبان ملک کے انتظامات پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ویسے بھی ہم شور شرابا نہیں چاہتے۔ اس سے بدنامی ہوتی ہے' اسکینڈل بنتے ہیں۔ پریس عجیب عجیب افسانے تراشنے لگتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو اور خطرہ بھی ٹل جائے۔ بس چند افراد اس معاملے سے آگاہ ہوں۔ اصل میں وہی اس معاملے کو سنبھالیں۔ باقی سب روایتی انتظامات معمول کے مطابق نظر آئیں۔ اس لیے میں تم سے مدد کی درخواست کر رہا ہوں۔"

"میں جو مدد کر سکتا تھا وہ میں نے کر دی ہے۔ یعنی تمہارے سفارت خانے کو خط لکھ کر خبردار کر دیا ہے۔" سیوبک بولا۔

"وہ مدد تو اپنی جگہ ہے اور اس کے لیے ہم تمہارے جتنے شکر گزار ہیں اس کا اندازہ تمہیں جلد ہی ہو جائے گا لیکن اس کے علاوہ بھی تم ہماری خاصی مدد کر سکتے ہو۔" چارلس نے اصرار کیا۔

"میں تمہارے ساتھ استنبول نہیں جا سکتا۔" سیوبک بولا۔ "میں کبھی کسی ایسے پروگرام کے مطابق اس گاؤں سے باہر نہیں جاتا جس کا دوسروں کو علم ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہاری احتیاط پسندی میں ہی تمہاری بقا ہے۔ ورنہ اب تک تم مارے جا چکے ہوتے یا کسی حکومت کے ہتھے چڑھ چکے ہوتے لیکن فی الحال تم باہر بھی محفوظ ہو۔ یہ تو تمہارا اپنا گاؤں ہے اور تمہارے پیچھے ایک خطرناک جنگجو قبیلہ ہے۔ یقیناً یہاں تم اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس کرتے ہو گے لیکن میرے ساتھ چلتے وقت بھی تمہیں اندیشوں کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ میں اپنی مدد کے لیے تمہیں ساتھ لے جاؤں گا اور اس وعدے کے ساتھ لے جاؤں گا کہ کوئی حکومت تم پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہیں کرے گی۔ ویسے بھی کسی حکومت کو تم پر ہاتھ ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تمہارے خلاف کہیں بھی کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ ورنہ شاید اب تک تم پر ہاتھ ڈالا جا چکا ہوتا۔"

سیوبک کسی سوچ میں گم دکھائی دینے لگا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد چارلس بولا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟ تمہیں میرے وعدے پر اعتبار کرنا چاہیے اور اپنے اس قلعے سے نکلنا چاہیے۔"

"اگر انگریزوں کے وعدے قابلِ اعتبار ہوتے تو ایک زمانے میں وہ پوری دنیا پر قبضہ نہ کر پاتے۔" سیوبک مسکراتے ہوئے بولا۔

"طنز و مزاح کو چھوڑو پیارے! انگریز اب ایسی بے کردار قوم بھی نہیں ہے جیسی تم سمجھ رہے ہو۔ اس لمبی بحث میں مت الجھو۔ فی الحال کام کی بات کرو۔ تمہیں لیڈی ڈائنا کے دورے کے موقع پر استنبول میں میرے ساتھ رہنا ہوگا۔"

"اچھا... ٹھیک ہے... میں آجاؤں گا لیکن مجھے قبیلے میں کچھ خاص لوگوں کو اس سلسلے میں آگاہ کرنا ہوگا..." سیوبک گویا یکدم ہی فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولا۔ "تاکہ اگر میرے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو جائے تو وہ اس کا کچھ توڑ کر سکیں۔"

"کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔" چارلس نے ایک بار پھر اسے اطمینان دلایا۔ "جس طرح تمہاری نظر میں زبان اور وعدے کی کوئی اہمیت ہے' اس طرح میری نظر میں بھی ہے۔ تمہارے علاوہ مسٹر افضل چوہدری بھی میرے ساتھ ہوں گے۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ "روایتی انتظامات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ تم دونوں کو ساتھ لے کر میں ایک طرح سے بالکل غیر روایتی انتظام کر رہا ہوں۔ اب تم مجھے حمان کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ میں نے خفیہ محکموں کی جو فائلیں دیکھی ہیں ان میں مجھے اس شخص کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں ملیں۔"

"ملیں گی بھی نہیں۔" سیوبک بولا۔ "وہ ایک افسانوی سا کردار ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے ہم پیشہ لوگوں میں سے بھی کسی نے کبھی اسے دیکھا نہیں ہے لیکن اس کے بارے میں بہت سی باتیں ہمارے حلقوں میں مشہور ہیں۔ وہ شاید نسلاً یہودی ہے اور اسرائیلی فوج میں خدمات انجام دے چکا ہے لیکن یہ بات تصدیق شدہ نہیں ہے۔ اس کے بارے میں یقینی طور پر جو باتیں معلوم ہیں وہ بھی میں تمہیں بتا دیتا ہوں..." وہ پہلو بدلتے ہوئے ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔ "اس کے بارے میں ایک بات تو طے ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے شکار کو کسی دھماکا خیز چیز سے قتل کرتا ہے۔ موقع کی مناسبت سے کسی بھی قسم کا کوئی بم استعمال کرتا ہے۔ دنیا میں ہزار ہا قسم کے بم ایجاد ہو چکے ہیں اور وہ ان سب پر اتھارٹی معلوم ہوتا ہے۔ ان ایجادات سے جتنا فائدہ وہ اٹھاتا ہے اتنا شاید ہی کوئی اٹھاتا ہو..."

وہ ایک بار پھر کسی سوچ میں الجھ گیا۔ شاید کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر پُرخیال انداز میں اپنی مونچھ کو بل دیتے ہوئے بولا۔ "اس کے بارے میں دوسری اہم بات یہ محسوس کی گئی ہے کہ وہ بڑا زبردست حسابی کتابی آدمی ہے۔ اپنی واردات کی تفصیلات وہ بڑے حساب کتاب سے طے کرتا ہے۔ گویا کمپیوٹر سے مدد لے رہا ہو۔ اس کی واردات کا انداز بتاتا ہے کہ اگر اس کے شکار کو اس کے اندازے کے مطابق کسی خاص مقام پر پہنچنے میں دو چار سیکنڈ دیر ہو جاتی تو اس کی واردات ناکام بھی ہو سکتی تھی لیکن اندازہ ہی کسی ایسی چیز کے بارے میں لگتا ہے جس میں تاخیر کا امکان ہی نہیں ہوتا۔"

"حمان کا کوئی اتا پتا...؟" چارلس نے دریافت کیا۔

سیوبک مربیانہ انداز میں مسکرایا۔ "وہ میری طرح جڑوں اور بنیادوں والا آدمی نہیں ہے۔ وہ تو محض ایک چھلاوہ اور سایہ ہے۔"

"پھر بھی... آخر لوگ اس سے رابطہ تو کرتے ہوں گے۔ کتنی بھی اونچی چیز سہی... لیکن بہرحال ہے تو اُجرتی قاتل... محض افسانوی کردار بن کر تو نہیں رہ سکتا۔ اسے کنٹریکٹ کی

ضرورت تو پڑتی ہوگی اور کچھ طاقتوں کو اس کی خدمات کی ضرورت پڑتی ہوگی۔ رابطے کا کوئی طریقہ تو ہوتا ہوگا۔"

"یقیناً ہے۔ ایک ٹیلیفون نمبر کے بارے میں سُنا ہے کہ اس پر کچھ اشاراتی سے انداز میں پیغام چھوڑا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ پیغام "مسٹر ایچ" کے لیے ہے۔ یہ بھی سُنا ہے کہ اس ٹیلی فون نمبر کا تعلق ایک صیہونی تنظیم کے ریٹائرڈ سربراہ سے ہے۔ حمان کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا کہ وہ کس وقت کس ملک میں ہے لیکن پیغام بہرحال اس تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد کچھ لوگ کسی اجنبی کے سے خفیہ انداز میں پیغام دینے والوں کے بارے میں تحقیقات کرتے ہیں کہ کیا وہ اپنے مقصد میں سنجیدہ ہیں۔ پھر بڑے گھماؤ پھراؤ کے بعد حمان ان سے خود رابطہ کرتا ہے اور کہیں ملاقات طے پاتی ہے۔ اس کام میں کئی دن لگ جاتے ہیں۔ تمہارے پاس اب اتنا وقت نہیں ہے... اور اگر وقت ہوتا تب بھی شاید حمان تم سے نہ ملتا۔ کنٹریکٹ طے ہو جانے کے بعد تو وہ یقیناً تم سے نہ ملتا کیونکہ اسے معلوم ہو جاتا تم ایک غیر روایتی قسم کے برطانوی ڈپلومیٹ ہو۔ وہ سمجھ جاتا کہ تمہاری ملاقات کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔"

سیوبک یہ تفصیل بتا کر خاموش ہو گیا۔ چارلس بھی خاموش تھا اور کسی گہری سوچ میں تھا۔ میں نے سیوبک کی گفتگو کا ایک ایک لفظ نہایت توجہ سے سنا تھا لیکن بظاہر میں اس کی طرف کچھ زیادہ متوجہ نہیں تھا البتہ کیترین پوری طرح اس کی طرف متوجہ نظر آ رہی تھی۔ وہ بھی اس بات چیت میں پوری دلچسپی لے رہی تھی اور میرا اندازہ تھا کہ سیوبک اس کی شخصیت میں خاص دلچسپی لے رہا تھا۔ اتنے سنجیدہ موضوع پر بات کرتے کرتے بھی بار بار اس کی نظریں کیترین کے سراپا سے اُلجھنے لگتی تھیں اور ان کی گہرائی میں گویا کچھ چنگاریاں سی سُلگنے لگتی تھیں۔

اس دوران ہمارے سامنے قالین پر لمبا چوڑا دسترخوان بچھا کر کھانا سجایا جانے لگا تھا۔ گو کہ ہمیں وہاں آئے کافی دیر ہو چکی تھی اس کے باوجود میرا خیال تھا کہ اتنی دیر میں بکرے کے پیٹ میں چاول بھر کر اسے روسٹ نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ اس سے پہلے کی تیاریاں بھی خاصا وقت لیتی تھیں مگر بکرا دسترخوان پر آ چکا تھا۔ شاید اس کی تیاریاں پہلے ہی سے جاری تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک ٹرے میں بڑی بڑی چمکتی دمکتی چھریاں بھی سجا دی گئی تھیں۔ کھانے کے دیگر لوازمات بھی چلے آ رہے تھے۔ تقریباً پورا کمرا ہی مختلف ڈشوں اور برتنوں وغیرہ سے بھر گیا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہاں کم از کم پندرہ افراد کے اعزاز میں نہایت پُرتکلف ضیافت ہونے والی تھی۔

سیوبک کے اصرار پر بالآخر ہم دو زانو ہو کر کھانے کے لیے بیٹھے تو اس قدر اہتمام دیکھ کر کیترین کو ہنسی آئے جا رہی تھی۔ مجھے کھانے کو تو چھونے کے لیے تیار ہی نہیں تھی لیکن سیوبک کے اصرار پر جب اس نے بڑی سی چھری اُٹھائی تو اسے کچھ زیادہ ہی ہنسی آنے لگی۔ بکرا بڑی سی طشتری میں ایک اسٹینڈ پر اس طرح رکھا تھا کہ اس کی چاروں ادھ کٹی ٹانگیں چھت کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

"آخر تمہیں اتنی ہنسی کیوں آ رہی ہے؟" سیوبک گہری سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"مجھے یہ سب کچھ فلمی منظر لگ رہا ہے۔" وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی "مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم سب اداکار ہیں اور کسی تاریخی قسم کی فلم کا سین شوٹ کرا رہے ہیں۔ پیٹ بھرنا تو بڑا سادہ سا عمل ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا لوگ اتنے لمبے چوڑے چکروں میں کیوں پڑتے ہیں۔"

"یوں تو زندگی گزارنا ہی بڑا سادہ سا عمل ہے خاتون!" سیوبک مربیانہ انداز میں بولا۔ "لیکن دنیا کے ننانوے فیصد لوگ بے شمار بکھیڑوں میں اُلجھے نظر آتے ہیں۔"

کیترین کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے چھری سے بکرے کی ران سے گوشت کا ایک قتلہ اتارنے لگی۔ سیوبک بولا "زندگی اسی رنگا رنگی کا نام ہے۔ جو جس طرح زندگی گزار رہا ہے' گزارنے دو۔ ہر ایک کا اپنا ایک لائف اسٹائل ہے اور اسی سے دنیا دلچسپ نظر آتی ہے۔ اگر دنیا میں سب سیدھے سادے انداز میں زندگی گزارنے لگیں تو دنیا کیسی بے کیف نظر آنے لگے۔ اسکول' خانقاہ یا مدرسہ نظر آنے لگے۔"

اس کے بعد ہم خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ چارلس بدستور سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے شاید سیوبک اور کیترین کی فلسفیانہ گفتگو بھی نہیں سُنی تھی۔ دفعتاً وہ سیوبک سے مخاطب ہوا۔ "میں ان تمام انتظامات کا جائزہ لے چکا ہوں جو لیڈی ڈائنا کے دورے کے سلسلے میں کیے جا رہے ہیں۔ مجھے ان کے درمیان کہیں کوئی امکان نظر نہیں آیا کہ لیڈی پر کوئی قاتلانہ حملہ ہو سکتا ہے۔ سیکیورٹی کے سلسلے میں جو لوگ لیڈی کے قریب رہیں گے ان کا بھی مختصر ریکارڈ میں نے دیکھا ہے۔ سب پرانے لوگ ہیں۔ کوئی کھٹکنے والا نہیں لگتا۔"

"اس دنیا میں کسی کے کھٹکنے نہ کھٹکنے کے بارے میں تمہیں کوئی بات وثوق سے نہیں کہنی چاہیے۔" سیوبک نے گویا اسے نصیحت کی۔ "سربراہانِ مملکت کے خصوصی باڈی گارڈز تک بک جاتے ہیں جنہیں برسوں کی چھان بین کے بعد رکھا جاتا ہے۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "ویسے تمہیں کہاں سے حملے کا امکان نظر آتا ہے؟"

"میرے خیال میں کوشش اندر سے نہیں' باہر سے ہو سکتی ہے۔" چارلس بولا۔ "یعنی لیڈی کے گرد جو حفاظتی حلقہ ہوگا اس میں کچھ نہیں ہوگا۔ باہر سے کچھ ہوگا۔ حمان کا جو نقشہ تم نے کھینچا ہے اس سے مجھے لگتا ہے کہ وہ لیڈی کی آمد کے وقت ہی کچھ کرنے

کی کوشش کرے گا۔ ائرپورٹ سے لے کر صدارتی محل تک کے راستے میں کچھ کرنا کسی حد تک آسان ہوگا۔ اس سڑک پر ایک جگہ تعمیراتی کام ہو رہا ہے۔ سرتوڑ کوشش کی جارہی ہے کہ لیڈی کے دورے سے پہلے پہلے وہاں کام مکمل کرلیا جائے۔ اگر مکمل نہ ہوسکا تب بھی اس دن وہاں کام بند کردیا جائے گا جس روز لیڈی ڈائنا آرہی ہوں گی۔ اس مقام پر فی الحال سڑک بھی تنگ ہے۔ وہ جگہ میری نظر میں کھٹک رہی ہے لیکن میں نے سیکیورٹی والوں کو وہاں خصوصی توجہ دینے کی ہدایت کردی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں اس جگہ کا معائنہ کیے بغیر بھلا کیا رائے دے سکتا ہوں۔" سیوبک بولا۔ "میں تمہارے ساتھ استنبول چلوں گا اور ان تمام انتظامات کا جائزہ لوں گا۔ اس کے بعد ہی میں کچھ کہہ سکوں گا کہ کہاں کیا کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" چارلس بولا۔ "تم ہمارے ساتھ ہی استنبول چلنا۔"

اس کے بعد ہم خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔

○☆○

سیوبک ہمارے ساتھ ہی استنبول آیا تھا اور برطانوی سفیر کے گھر میں ہی مہمان ٹھہرا تھا۔ اسی کی موجودگی میں اس رات پہلی بار میری بھی برطانوی سفیر سے ملاقات ہوئی۔ چارلس نے اسے تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ سیوبک سے ملتے وقت برطانوی سفیر کے انداز میں کچھ زیادہ گرمجوشی نہیں تھی۔ شاید اسے یہ صورتِ حال کچھ پسند نہیں آئی تھی کہ ایک اُجرتی قاتل کے متوقع حملے سے بچنے کے لیے دوسرے اُجرتی قاتل کی خدمات حاصل کی جارہی تھیں اور اسے اپنے تمام سیکیورٹی کے انتظامات میں جھانکنے کا موقع دیا جارہا تھا۔ تاہم سفیر نے اپنی ناپسندیدگی کا واضح طور پر اظہار نہیں ہونے دیا۔ اس کے رویے سے مجھے اندازہ ہوا کہ برطانوی حکومت کی نظر میں واقعی چارلس کی بڑی اہمیت تھی۔ چارلس کے کسی بھی فیصلے کے سامنے سفیر بھی کچھ نہیں بول رہا تھا۔

سیوبک ہمارے ساتھ استنبول پہنچا تو اس سیوبک سے قطعی مختلف نظر آرہا تھا جسے ہم نے اس کے گاؤں میں دیکھا تھا۔ وہ جدید فیشن کے سیاہ سوٹ میں تھا۔ سر پر سیاہ رنگ کا ہی فیلٹ ہیٹ تھا۔ ہاتھ میں بریف کیس اٹھائے ہوئے تھا۔ پہلی نظر میں وہ کوئی معزز بزنس مین یا کسی بڑی کمپنی کا ایگزیکٹو دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کی شخصیت میں کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اسے ایک مشکوک انسان ظاہر کرتی تھی۔ شاید اعمال کے مطابق ہر انسان کی شخصیت میں کوئی نہ کوئی تاثر ضرور پیدا ہوجاتا ہے لیکن شاید ہر آنکھ اسے محسوس کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی اور ظاہری روپ سے دھوکا کھا جاتی ہے۔

اس روز تو ہم آرام کرنے کے سوا کچھ نہ کرسکے کیونکہ رات

پاکستانی، انڈین اور چائنیز
کھانوں پر مشتمل اپنے طرز
کی واحد اور مکمل کتاب

سپیشل کچن گائیڈ

قیمت: -/75 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

گئے واپس پہنچے تھے۔ دوسرے دن چارلس نے ہم تینوں کو یعنی مجھے، سیوبک اور کیتھرین کو سیکیورٹی کے انتظامات سے آگاہ کرنا شروع کیا پھر اہم افراد سے ملایا جو مختلف محکموں سے تعلق رکھتے تھے اور سیکیورٹی کے انتظامات کو کنٹرول کررہے تھے۔

صرف سیوبک نے ان سے چند سوالات کیے۔ میں اور کیتھرین خاموش ہی رہے۔ سچی بات تو یہ تھی کہ میں صرف چارلس کے اصرار پر ساتھ گھسٹتا پھر رہا تھا ورنہ میں اس معاملے میں خود کو قطعی غیر متعلق سا محسوس کررہا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی مجھے اس طرح کے کسی معاملے میں حصہ لینا پڑے گا۔ مجھے اس قسم کے معاملات کا کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔ میں تو بس ایک خاموش تماشائی کی طرح ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں چارلس مجھے اہمیت دیے جارہا تھا اور اکثر پہلوؤں پر مجھ سے رائے طلب کررہا تھا۔ میں محض کامن سینس کی بنیاد پر مختصر جواب دینے کی کوشش کررہا تھا۔ ہمارے پاس جائزہ وغیرہ لینے کے لیے وہی ایک دن تھا۔ اس سے اگلے روز لیڈی ڈائنا کو آنا تھا۔

آخر کار ہم ائرپورٹ سے ایوانِ صدر تک جانے والی سڑک کا جائزہ لینے کے لیے روانہ ہوئے۔ ہم اسی سیاہ مرسیڈیز میں تھے جس میں سیوبک کے گاؤں گئے تھے۔ ہمارے پیچھے گہرے نیلے رنگ کی ایک اور بڑی سی گاڑی میں استنبول کا پولیس کمشنر اور ٹرکش انٹیلی جنس کا ایک آفیسر موجود تھا۔ وہ لوگ ضرورت پڑنے پر ہمیں سیکیورٹی کے انتظامات کے بارے میں کسی بھی قسم کی معلومات مہیا

کرتے تھے۔

ائرپورٹ پر ارائیول لاؤنج کا جو حصہ انتہائی اہم شخصیات کے مخصوص تھا وہاں سے باہر آنے کے لیے ایک سرنگ نما راستہ تھا جس میں سے گزر کر کوئی بھی وی آئی پی اس گاڑی تک جاتا تھا جو اس کے لیے مخصوص ہوتی تھی۔ اس سرنگ نما راستے میں دن جیسی روشنی رہتی تھی اور جب تک کسی وی آئی پی کی آمد متوقع نہیں ہوتی تھی تب تک وہ بند رہتا تھا۔ اس کے دونوں سروں پر وی آئی پی لاؤنج اور خارجی راستے پر اسٹیل کے مضبوط دروازے تھے۔ جب یہ راستہ بند ہوتا تھا تب بھی اس کی نگرانی جاری رہتی تھی۔

سیوبک نے اس راستے کا بھی ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہایت باریک بینی سے معائنہ کیا اور اسے تسلی بخش قرار دے دیا۔ وہ نہ جانے کیوں اپنے اس نظریے پر مصر تھا کہ لیڈی ڈائنا پر اگر حملہ ہوا تو اس کی آمد سے لے کر صدارتی محل تک پہنچنے اور پھر وہاں سے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس تک پہنچنے کے دوران ہوگا۔ اگر اس دوران کچھ نہ ہوسکا تو پھر لیڈی کے باقی تین دن کے قیام اور مصروفیات میں اس کی ذات کو کوئی خاص خطرہ نہیں ہوگا حالانکہ میرے خیال میں ان مصروفیات کے دوران بھی کسی قاتل کو اپنا کام دکھانے کے لیے کافی مواقع میسر تھے۔

ائرپورٹ سے ہم لوگ خاصی سست رفتاری سے ایوانِ صدر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں سیوبک کچھ نہیں بولا۔ بس خاموشی سے دونوں طرف کی عمارات اور خالی جگہوں کا گہری نظر سے جائزہ لیتا رہا۔ یہ کہنا بہت مشکل تھا کہ کس عمارت میں کس جگہ کوئی قاتل گھات لگا کر بیٹھ سکتا تھا۔ گو کہ وہ ایک چوڑی شاہراہ تھی اور دونوں طرف جتنی بھی اونچی عمارتیں موجود تھیں وہ سڑک سے کافی ہٹ کر تھیں۔

ان عمارتوں میں کئی ایسی جگہیں نظر آرہی تھیں جہاں کوئی قاتل ٹیلی اسکوپک اور دوربار رائفل لے کر گھات لگا کر بیٹھ سکتا تھا جن انٹیلی جنس والوں نے ہمیں بتایا تھا کہ ایسی بیشتر جگہوں کی نگرانی کی جارہی ہے۔

سیوبک اس پہلو کو اہمیت دینے کے لیے ہی تیار نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ حمان اس طرح دوربار رائفل لے کر گھات لگا کر بیٹھنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس میں کامیابی کا امکان بہت کم تھا کیونکہ لیڈی ڈائنا کو کسی کھلی گاڑی میں نہیں بلکہ تاریک شیشوں والی بند گاڑی میں سفر کرنا تھا۔ تاریک شیشوں والی ایسی گاڑی جو تیز رفتاری سے جارہی ہو اور جس میں چار پانچ افراد موجود ہوں، کسی ایک مخصوص انسان کو نشانہ بنانا تقریباً ناممکن تھا جبکہ حمان اوچھا وار کرنے والا قاتل نہیں تھا اور اس کے طریقۂ واردات میں دوربار رائفل بندوق کا عمل دخل بھی کم ہی ہوتا تھا۔ اس لیے سیوبک کی دوربین زاویۂ نظر سے سڑک کے دونوں اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ ٹرکش پولیس اور انٹیلی جنس والے بھی بہرحال بے وقوف نہیں تھے۔ وہ بھی ہر امکان کا جائزہ لے چکے تھے۔ راستے میں سیوبک کے ذہن میں جو بھی سوال اُبھرا اس نے چارلس سے اس کا جواب مانگا۔ اوّل تو چارلس خود ہی اتنا "ہوم ورک" کرچکا تھا کہ وہ بیشتر سوالوں کے جواب دے سکتا تھا لیکن اگر کوئی بات اسے معلوم نہیں ہوتی تھی تو وہ موبائل فون پر پیچھے گاڑی میں آنے والے آفیسرز سے پوچھتا تھا اور چلتے چلتے ہی اس کا جواب مل جاتا تھا۔

ایوانِ صدر اور اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس وغیرہ کا چکر لگا کر ہم احتیاطاً پرائم منسٹر ہاؤس تک بھی ہو آئے۔ لیڈی ڈائنا کو پروٹوکول کے مطابق وہاں تک بھی لے جایا جانا تھا۔ بالآخر ہم اسی سڑک پر دوسری لین سے واپس روانہ ہوئے اور وہاں آن رکے جہاں ایک فلائی اوور کی تعمیر کا کام زور و شور سے جاری تھا۔

سیوبک نے گاڑی ایک طرف محفوظ جگہ پر رکوائی اور گہری سانس لے کر چارلس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہارے خیال سے متفق ہوں۔ یہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں قاتل کے گھات لگانے کا سب سے زیادہ امکان ہے۔"

چارلس نے قدرے فاتحانہ سی نظروں سے میری اور کیتھرین کی طرف دیکھا گویا کہہ رہا ہو، 'آخر میرا بھی کچھ تجربہ ہے۔'

توڑ پھوڑ کی وجہ سے وہاں سڑک خاصی تنگ ہوچکی تھی۔ کہیں کھدائی ہوچکی تھی۔ کہیں بڑے بڑے مضبوط پلر سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ کہیں مٹی پھیلی ہوئی تھی۔ دور دور تک انواع و اقسام کی مشینری بکھری نظر آرہی تھی۔ پچاسوں افراد وہاں تندہی سے کام میں مصروف تھے۔ جو کمپنی فلائی اوور تعمیر کررہی تھی، ایک طرف اس کا سائٹ آفس بھی نظر آرہا تھا۔ پہلے سے موجود اونچی نیچی عمارتیں بھی پس منظر میں دکھائی دے رہی تھیں۔

چارلس بولا "کل یہاں کوئی کام نہیں ہو رہا ہوگا۔ دور دور تک صفائی ہوچکی ہوگی اور کوئی بھی مزدور، کارکن یا کمپنی کا کوئی بھی آدمی یہاں موجود نہیں ہوگا۔ ان کی جگہ چپے چپے پر پولیس تعینات ہوگی۔ وہ اس وقت انٹیلی جنس والوں کے تحت کام کررہے ہوں گے۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے.... لیکن ہم چاروں کو اپنی توجہ یہیں رکھنی چاہیے اور یہیں کہیں آس پاس ہی موجود رہنا چاہیے۔ باقی جگہیں سیکیورٹی والوں ہی کو سنبھالنے دو۔" سیوبک چاروں طرف کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ میں بھی وہاں کی ہر چیز کو بغور دیکھ رہا تھا اور گویا زندگی کا ایک نیا تجربہ حاصل کررہا تھا۔

چارلس میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "تمہارا کیا خیال ہے افضل؟"

"میرے خیال میں سیوبک ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ سیوبک نے محض سرسری نظر سے میری طرف دیکھنے پر اکتفا کیا۔ پھر وہ چارلس سے مخاطب ہوا۔ "ہمیں

کسی عمارت میں بلندی پر موجود رہنا چاہیے جہاں سے ہم چاروں طرف نظر رکھ سکیں بلکہ ہم میں سے دو افراد سڑک کے ایک طرف ہوں اور دو دوسری طرف ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔ ہمارے پاس دوربار رائفلیں بھی ہونی چاہئیں اور جدید واکی ٹاکی بھی۔ جن پر ہمارا چاروں کا بیک وقت ایک دوسرے سے رابطہ رہ سکے اور ہم پولیس کو بھی ہدایات دے سکیں۔"

"ٹھیک ہے' میں یہ سب انتظامات کرادوں گا۔" چارلس بلا تامل بولا۔ "لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا حمان کس سمت سے اور کس طرح حملہ کرے گا۔ وہ لانچر کے ذریعے راکٹ تو فائر کرنے سے رہا۔"

"اس سے یہ بھی بعید نہیں ہے۔" سیوبک بولا۔

"اس طرح تو وہ خود بھی بچ کر نہیں جاسکتا۔ کیا خطیر معاوضے کے لیے وہ جان بھی دے دے گا؟ اگر وہ زندہ ہی نہ رہا تو دولت اس کے کس کام کی؟" چارلس بولا۔

"اس بارے میں یقین سے کچھ مت کہو۔" سیوبک نے گویا مشورہ دیا۔ "وہ آج تک پکڑا نہیں جاسکا۔ اب تک کا ریکارڈ یہی بتاتا ہے کہ اپنا کام وہ خود ذاتی طور پر کرتا ہے' کسی پر بھروسا نہیں کرتا اور ہمیشہ جائے واردات کے آس پاس ہی کہیں موجود ہونے کے باوجود کبھی نہیں پکڑا جاسکا۔ چھلاوے کی طرح غائب ہوگیا۔ حمان محض ایک سائے کا نام ہے۔ فی الحال ہمیں بھی یہی فرض کرکے اپنا کام کرنا چاہیے۔"

"جیسے تم کہو گے ویسے انتظامات ہوجائیں گے۔" چارلس نے اسے یقین دلایا۔ "بس کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے اور پولیس کو ان معاملات کی بھنک نہیں پڑنی چاہیے ورنہ دنیا بھر کے اخبارات و رسائل اور ٹی وی چینلز کو ایک نیا موضوع مل جائے گا۔ بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ اس میں نئے نئے پہلو تلاش کرلیے جائیں گے۔ برطانوی حکومت اور شاہی خاندان کے لیے ایک نیا دردِ سر کھڑا ہوجائے گا۔"

"ہم سب مل کر کوشش کریں گے کہ ایسا نہ ہو۔" سیوبک کے لہجے میں خلوص تھا۔ "بہرحال ہمیں اس نکتے کو نہیں بھولنا چاہیے کہ حمان بموں کا اسپیشلسٹ ہے۔ وہ اپنے شکار کو ہمیشہ کسی نہ کسی قسم کے بم بلاسٹ کے ذریعے ہلاک کرتا ہے۔ اپنے گردوپیش پر نظر رکھتے وقت اس صورتِ حال کو ضرور ذہن میں رکھنا ہوگا۔"

سیوبک کی بتائی ہوئی یہ بات پہلے ہی سے میرے ذہن میں تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ اس نے بتایا تھا حمان بڑا حسابی کتابی آدمی تھا۔ میں اس نقطۂ نظر سے بھی ہر چیز کو ذہن میں رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ گردوپیش کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد آخرکار ہم لوٹ آئے۔

شام کو میں اپنے کمرے میں تھا اور تازہ دم ہونے کے بعد بازار سے خریدا ہوا ایک نیا سوٹ زیب تن کیے ایک کرسی پر بیٹھا سوچ

پرتھا

قمر اجنالوی قیمت:-/125

اصل دشمن

چار حصے

قیمت: ۸۰/۰۰ روپے

رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ دفعتاً دروازے پر نہایت خفیف سی دستک ہوئی۔ کسی نے محض ایک انگلی سے' نہایت آہستگی سے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے محض احتیاطاً میجک آئی سے باہر جھانک کر دیکھ لیا۔ میرے خیال میں اس قسم کی رازدارانہ دستکیں زیادہ احتیاط کا تقاضا کرتی تھیں۔

میجک آئی سے جھانک کر میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ کیتھرین تھی۔ میں نے اس کے لیے دروازہ کھول دیا اور نہایت مؤدبانہ انداز میں ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ اس وقت پھر بڑے کیئر فری قسم کے لباس میں تھی جو دیکھنے والوں کو اچھی بھلی آزمائش میں ڈال سکتا تھا۔ اس کی انگلیوں میں لمبی اور پتلی سی سگریٹ دبی ہوئی تھی۔ میرے قریب سے گزرتے وقت اس نے شریر سے انداز میں میرے منہ پر دھواں چھوڑا اور دھم سے بیڈ پر جاگری۔ میں باتکلف مہمانوں کی طرح ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تمہیں معلوم ہے سیوبک آج شام میرے ساتھ ڈیٹ پر جانے کی فکر میں تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے پاپا کے ساتھ دھکا دیا ہے۔" اس نے گویا مجھے اطلاع دی۔

"تمہیں چلے جانا چاہیے تھا۔ اس میں کیا حرج تھا۔" میں نے نہایت ملائمت سے کہا۔

"یہ تم کہہ رہے ہو؟" اس نے مجھے گھورا۔

میں نے بوکھلا کر ادھر دیکھا اور سادگی سے کہا۔ "ہاں۔ میرا خیال ہے میں ہی کہہ رہا ہوں۔ کمرے میں اور تو کوئی موجود نہیں ہے۔"

"تم بڑے ہی خبیث آدمی ہو۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "کاش تم میرے لیے رقابت میں مبتلا ہوسکتے!"

"تمہیں معلوم ہی ہے آج کل میرے حالات ٹھیک نہیں

ہیں۔ موقع محل دیکھ کر شاید کبھی شغل کے طور پر ہی رقابت میں مبتلا ہوجاؤں لیکن فی الحال مجھ غریب کو ان چکروں میں پھنسانے کی کوشش مت کرو۔ پہلے چکر ہی ختم نہیں ہورہے۔"

وہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں ایک بار پھر کہا۔ "تمہیں محترم سیوبک کے ساتھ چلے جانا چاہیے تھا۔ آخر وہ ایک عظیم شخصیت ہے۔ اس میں خرابی بس یہی ہے کہ تھوڑا سا شادی شدہ واقع ہوا ہے لیکن تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ میں تم سے سنجیدگی سے بات کررہی ہوں۔" وہ واقعی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "پاپا اپنی دانست میں اس شخص کو شیشے میں اتار کر ساتھ ساتھ لیے پھر رہے ہیں لیکن نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ شخص ہمارے لیے بڑی پریشانی کا باعث بنے گا۔ آخر وہ ہے تو اجرتی قاتل....."

"اب کیا کیا جائے۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔ "مجھے تو لگ رہا ہے دنیا میں اُجرتی قاتلوں کی تعداد بہت ہی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ان کے مقام' مرتبے اور واردات کے طریقے مختلف ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ سب اُجرتی قاتل ہیں۔ لگتا ہے جلد ہی وہ وقت آجائے گا جب انہیں مقتول دستیاب نہیں ہوں گے۔ پھر اُجرتی قاتل ایک دوسرے کو ہی قتل کریں گے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں یہ کہہ رہی تھی.... تم نے اس شخص کی طرف غور سے دیکھا ہے؟ اس کی آنکھوں میں سانپ کی آنکھوں جیسی چمک ہے۔"

"ممکن ہے وہ سانپوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "یا پھر سالم سانپوں کا سوپ پیتا رہا ہو۔"

کیتھرین ایک ٹک مجھے گھورنے لگی پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "تمہارے اندر یہی بڑی خرابی ہے کہ جب تمہیں سنجیدہ ہونا چاہیے اس وقت تمہیں کامیڈی کا شوق چرانے لگتا ہے اور جب تمہیں ہنسنا کھیلنا چاہیے اس وقت گوتم بدھ بن کر بیٹھ جاتے ہو۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو؟" میں نے کراہ کر کہا۔ "میں کوئی کامیڈین ہوں جو کامیڈی کروں گا؟ میرے خیال میں تو ہر موقع ہی نہایت سنجیدگی کا ہوتا ہے اور میں نہایت سنجیدہ و مدبر آدمی ہوں۔"

"واقعی۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر اثبات میں سر ہلایا۔ "دل تو چاہ رہا ہے اسی سنجیدگی سے تمہاری اس تیکھی ناک پر کراٹے کا ایک ہاتھ رسید کرکے اسے ہمیشہ کے لیے چپٹی کردوں لیکن کیا کروں تمہیں استاد تسلیم کرچکی ہوں اور استاد پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے۔"

"اور اگر میری طرف سے اجازت ہو؟" میں نے کہا۔

"تب بھی مجھے اپنی جان عزیز رہے گی۔" وہ مسکرائی پھر وہ سیدھی ہوکر بیٹھتے ہوئے تکیہ گود میں رکھ کر بولی۔ "دیکھو.... خدا کے لیے سنجیدگی سے بات کرو.... کیا تمہیں واقعی اُمید ہے کہ سیوبک لیڈی ڈائنا والے معاملے میں ہماری مدد کررہا ہے؟ کہیں وہ خواہ مخواہ ہماری توجہ بٹاتا تو نہیں پھر رہا؟"

"بھاڑ میں جائے سیوبک اور لیڈی ڈائنا۔ مجھے ان دونوں سے بلکہ تمہارے پورے برطانیہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"خدا کی پناہ!" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "اس طرح تو مت کہو۔ کم از کم لیڈی ڈائنا کے بارے میں تو مت کہو۔ وہ ہمارے ملک کی ہونے والی ملکہ ہے۔"

"ہوگی۔" میں نے بے نیازی سے کندھے اُچکائے۔ "میں تو اس دن کا منتظر ہوں جب دنیا میں ہر لڑکی شہزادیوں کی طرح اہم ہوگی اور ہر عورت کی اسی طرح حفاظت ہوگی جس طرح کسی ملکہ کی ہوتی ہے یا پھر شہزادیاں اور ملکائیں بھی اسی طرح پھرا کریں گی جس طرح عام لڑکیاں اور عورتیں پھرتی ہیں۔ تم خود ہی سوچو' یہ کوئی انصاف تو نہیں ہے ایک عورت کی حفاظت کے لیے زمین آسمان ایک کیے جارہے ہیں۔ دوسری طرف وہ پھول سی بچیاں ہوتی ہیں جنہیں درندے اٹھا کرلے جاتے ہیں اور بہیمانہ طریقے سے مسل کر پھینک دیتے ہیں۔ مزید ظلم یہ کہ وہ کبھی کپڑے بھی نہیں جاتے۔"

"اوہ میرے خدا....!" کیتھرین نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ "تم بھی اس احمقانہ انقلاب کی آرزو میں گرفتار ہو۔ یہ جس کسی کا بھی خواب ہے' بالکل غلط ہے اور کبھی پورا نہیں ہوگا۔ خدا نے سب انسانوں کو برابر پیدا نہیں کیا لہٰذا کوئی اور انہیں کس طرح برابر لاسکتا ہے۔ اس بکواس کو چھوڑو اور سیوبک کے بارے میں سوچو۔"

"میں آج کل تم جیسی حسین اور مہربان لڑکی کے بارے میں نہیں سوچ رہا۔ تم مجھے اس بدبخت کے بارے میں سوچنے کے لیے کہہ رہی ہو۔ مجھ پر اتنا ظلم مت کرو۔" میں نے کراہ کر کہا۔

"آج صبح تو تم لیڈی ڈائنا کے دورے میں اور باقی سب باتوں میں بڑی دلچسپی لیتے پھر رہے تھے۔" وہ حیرت سے بولی۔

"میں صرف پھر رہا تھا۔ دلچسپی لینا اور بات ہوتی ہے۔" میں نے تصحیح کی۔ "یوں تو میں کل بھی تم لوگوں کے ساتھ چلوں گا اور مجھ سے جو مدد ہوسکی وہ بھی کروں گا۔ لیڈی ڈائنا پر قاتلانہ حملے کی اگر واقعی کوئی کوشش ہوتی نظر آئی تو اسے بھی ناکام بنانے کی اپنی سی کوشش کروں گا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اس معاملے سے واقعی کوئی دلچسپی ہے۔ یہ بس ایسے ہی ہے جیسے انسان چلتے چلتے سرِراہ کسی کو گرتے دیکھ کر اٹھنے کے لیے سہارا دے دیتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اسے اس کے گرنے کے اسباب سے' اس واقعے سے یا اس شخص کی ذات سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے۔"

"تم عجیب آدمی ہو۔" کیتھرین منہ بنا کر بولی۔

"بے شک۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر تم غور سے دیکھو تو تمہیں دنیا کا ہر انسان عجیب نظر آئے گا۔ زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت

عجیب ضرور نظر آئے گا۔"

"میرا خیال ہے سیوبک تم سے بھی زیادہ عجیب انسان ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو۔" میں نے تسلیم کیا۔

"اگر میں سُدھرنے کا عزم نہ کر چکی ہوتی تو ضرور اس کی ذات میں اتنی ہی دلچسپی لینے کی کوشش کرتی جتنی وہ میری ذات میں لے رہا ہے۔" وہ بولی۔

"کیا تم واقعی سُدھر چکی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تمہیں ابھی اس میں شک ہے کیا؟" اس نے مجھے گھورا۔

"بس... ویسے ہی... یقین سا نہیں آتا۔ اچانک ہی ہوا ہے نا یہ حادثہ۔" میں نے سر جھٹک کر کہا۔

"انسان کی زندگی میں بڑے انقلابات اچانک ہی آتے ہیں۔"

"اور اگر یہ انقلاب نہ آیا ہوتا تو تم کیوں سیوبک کی ذات میں دلچسپی لیتیں؟" میں نے جاننا چاہا۔

"وہ دلچسپی قطعی غیر جذباتی اور کاروباری ہوتی۔" کیتھرین بولی۔ "وہ میرے لیے اور ان سینڈی کیٹس کے لیے، جن سے میرا تعلق رہا ہے بڑے کام کا آدمی ثابت ہو سکتا تھا۔"

"کوئی بعید نہیں وہ پہلے ہی کسی سینڈیکیٹ کا آدمی ہو اور وہ بھی تم میں اسی نقطۂ نظر سے دلچسپی لے رہا ہو۔ یہ دنیا کلدرخانۂ عجائب ہے۔ یہاں کبھی کبھی سانپ، سانپ کو بھی کاٹ لیتا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اس میں تو خیر کوئی حرج نہیں۔ زہر کسی کو بھی نہیں چڑھتا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں محسوس کرتی ہوں سیوبک کی دلچسپی دوسری قسم کی ہے۔ تمہیں معلوم ہے عورت ان باتوں کو اچھی طرح محسوس کر سکتی ہے۔"

"ہاں... بلکہ میرا خیال ہے عورت انہی باتوں کو اچھی طرح محسوس کر سکتی ہے۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

کیتھرین ایک لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر مایوسی سے ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "اس وقت تم خباثت پر اُترے ہوئے ہو۔ کوئی بھی بات سیدھی طرح نہیں کرو گے۔" پھر وہ جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "اچھا، سنجیدگی سے صرف یہ بتا دو، صبح تو تم ہمارے ساتھ چلو گے نا؟"

"ہاں، وہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"پاپا بے چارے تم پر بہت تکیہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ تم نے آج کے پورے سروے کے دوران کچھ زیادہ زبان نہیں کھولی۔"

"انسان کو زبان کے بجائے ہاتھ پاؤں زیادہ چلانے چاہئیں۔" میں نے مدبرانہ انداز میں کہا۔

"یہ بات بھی تم صرف زبان سے ہی کہہ رہے ہو۔ تمہاری عملی زندگی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔"

"بہت غلط اندازہ لگا رہی ہو میرے بارے میں۔" میں نے مجروح سے لہجے میں کہا۔ "کیا تمہیں یہ اندازہ نہیں ہوا کہ جب ہاتھ پاؤں چلانے کا موقع ہوتا ہے تو پھر مجھ سے بہتر کارکردگی دکھانے والا ذرا مشکل سے ہی ملتا ہے۔"

"بڑی خوش فہمی ہے تمہیں اپنے بارے میں؟"

"اگر یہ خوش فہمی ہے تو تم نے مجھے استاد کیوں مان لیا ہے؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"یونہی۔ محبت میں آکر۔" وہ کندھے اُچکا کر بولی۔

"میں ابھی تمہیں دو چار ہاتھ دکھا دیتا ہوں جس کے بعد تم اپنی محبت واپس لینے پر مجبور ہو جاؤ گی۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"بس... بس۔" وہ ہاتھ سے مجھے رکنے کا اشارہ کر کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے واپس کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ویسے یہ جو تم پاپا کے مجھ پر تکیہ کرنے کی بات کر رہی تھیں تو مجھے لگتا ہے تمہارے پاپا کو لوگوں پر تکیہ کرنے کی خاصی عادت ہے۔ وہ تو سیوبک پر بھی کافی تکیہ کر رہے ہیں۔"

"اسی لیے تو تمہیں زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ میں تم سے یہی تو کہنے آئی تھی۔ تم اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"میں تو صرف تمہاری باتوں کے جواب دے رہا تھا۔ اپنی طرف سے تو میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔" میں نے کہا۔

"بہرحال... کل ہوشیار رہنا۔" وہ رخصت ہوتے ہوئے بولی۔

○☆○

دوسرے روز ہم لوگ ائرپورٹ سے آنے والی سڑک کے قریب واقع ایک عمارت کی چھت پر موجود تھے۔ اس روز اتوار تھا۔ ترکی میں ہفتہ وار تعطیل اتوار کو ہوتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف بیشتر عمارات کاروباری تھیں اور چھٹی ہونے کی وجہ سے خالی تھیں کیونکہ تمام دفاتر بند تھے۔ جن عمارات میں کچھ لوگ موجود بھی تھے، ان سے بھی معذرت کر کے انہیں چار گھنٹے کے لیے نکال دیا گیا تھا۔ تمام عمارتوں کے دروازے بند کر دیے گئے تھے۔

سڑک پر برائے نام ٹریفک تھا۔ کچھ دیر بعد یہ بھی رک جانا تھا۔ لیڈی ڈائنا کی فلائٹ گیارہ بجے پہنچنا تھی جبکہ ہم ائرپورٹ سے چار میل کے فاصلے پر تھے اور ہم صبح آٹھ بجے ہی اس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں لائی اور تعمیر ہو رہا تھا۔

ایک بار پھر نئے سرے سے اس حصے کا تفصیلی جائزہ لیا گیا تھا۔ کنسٹرکشن کمپنی والوں نے اپنی تمام مشینری سڑک سے پیچھے ہٹا دی تھی۔ دونوں طرف کی سڑکیں اچھی طرح صاف کر دی گئی تھیں۔ سڑک کے کنارے کنارے کافی دور تک کمپنی نے لمبے دار ٹین کی دیوار کھڑی کر دی تھی تاکہ کاٹھ کباڑ زیادہ بکھرا ہوا دکھائی نہ

۔اس حصے میں دونوں طرف حدِ رفتار چالیس کلومیٹر فی گھنٹا کے نصب تھے۔ رکاوٹوں اور توڑ پھوڑ سے خبردار کرنے کے لیے دن ہی سُرخ بتیاں گھوم رہی تھیں۔

سڑک کے کنارے موجود تمام مشینری کو پولیس اور انٹیلی کے ماہرین نے ایک بار پھر چیک کیا تھا۔ کہیں کوئی مشکوک چیز پائی گئی تھی۔ اس روز سائٹ پر کمپنی کا کوئی آدمی موجود نہیں ان کا سائٹ آفس بھی بند تھا۔ ان کی جگہ چپے چپے پر پولیس انٹیلی جنس کے آدمی پھیلے ہوئے تھے۔

طے یہ پایا تھا کہ میں، چارلس، سیوبک اور کیتھرین ایک ہی رت کی چھت پر رہیں گے تاکہ ہمارے درمیان بہتر رابطہ رہ سکے ضرورت پڑنے پر ہم فوری طور پر کوئی کارروائی کر سکیں۔ وائی پاپا ریڈیو پر ایک دوسرے کو پیغام دینے میں وقت ضائع نہ ہو ورنہ شدہ روز یہی طے ہوا تھا کہ ہم میں سے دو افراد سڑک کے ایک ف کسی عمارت پر رہیں گے اور دو افراد دوسری طرف کی کسی رت پر۔ بعد میں ہم نے محسوس کیا کہ ہمیں اپنی تمام تر توجہ پورٹ سے آنے والی سائڈ پر ہی رکھنی چاہیے تھی۔ اس لین پر ا توجہ دینے کی ضرورت نہیں تھی جدھر سے ٹریفک ائرپورٹ کی ف جاتا تھا کیونکہ اس پر تو ٹریفک بند ہو جانے سے ہی ہمارا درد ر ختم ہو جانا تھا۔

ہم لوگ چھت کی چھوٹی سی منڈیر کے عقب میں چھپے ہوئے ہمارے پاس ٹیلی اسکوپک سائٹ والی رائفلیں تھیں تاہم ارلس کے پاس رائفل کے بجائے صرف دوربین ہی تھی۔ اس کی ذمے داری ریڈیو پر ائرپورٹ سے رابطہ رکھنا تھا جہاں ہمیں پل پل کی خبر مل رہی تھی۔ لیڈی ڈائنا کا خصوصی طیارہ ائرپورٹ پر لینڈ کر چکا تھا اور اس وقت وہ پریس وغیرہ کے نمائندوں سے ملاقات کر رہی تھی۔ ہر رپورٹر اور کیمرا مین کو بڑی سخت چیکنگ کے بعد ایک ایک کر کے اندر جانے دیا گیا تھا۔ فوٹو گرافروں اور ٹی وی والوں کے کیمرے تک چیک کیے گئے تھے۔ فلیش لائٹس تک اچھی طرح دیکھی گئی تھیں کہ ان میں کوئی دھماکا خیز مادہ نہ چھپایا گیا ہو۔ چارلس اردگرد بکھرے ہوئے پولیس اور انٹیلیجنس کے لوگوں سے بھی اسی ریڈیو پر فریکوئنسی بدل کر فوری طور پر رابطہ کر سکتا تھا۔

میں دوربین چاروں طرف گھماتے ہوئے ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہا تھا۔ ماحول نہایت پُرسکون تھا اور ہر چیز اس ماحول کا ایک ضروری حصہ محسوس ہو رہی تھی۔ کسی چیز کو دیکھ کر کسی گڑبڑ کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہ تمام انتظامات بے معنی محسوس ہوئے۔ جب ہر چیز چیک کی جا چکی تھی۔ کہیں کوئی مشکوک چیز کم از کم اس رینج میں موجود نہیں تھی جو سڑک سے ہوا کسی چیز کو نقصان پہنچا سکتی، سڑک پر ٹریفک بھی رک چکا تھا، سڑک پر کسی غیر متعلق شخص کو

ہم لوگ رائفلیں لیے چھت پر گھات لگائے کس کا انتظار کر رہے تھے؟ حمان ہیلی کاپٹر کے ذریعے اوپر سے تو نہیں آ سکتا تھا۔ اگر اس وقت کسی پیشگی اطلاع کے بغیر کوئی ہیلی کاپٹر فضا میں نمودار ہوتا تو کوئی پوچھ گچھ کیے بغیر بلا تردد اسے گرا دیا جاتا۔

میں رائفل کی دوربین کے ذریعے لمبے دار ٹین کی چادروں سے بنائی گئی اس دیوار کو دیکھ رہا تھا جس کے عقب میں ملبہ اور تعمیراتی مشینری وغیرہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس دیوار میں ٹین کی سب سے پہلی چادر پر سفید پینٹ تھا جبکہ باقی چادریں بغیر پینٹ کی تھیں۔ اگر سفید پینٹ والی اس چادر میں لمبے نہ ہوتے تو وہ سینما کی اسکرین معلوم ہوتی۔

کیتھرین مجھ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ رائفل گود میں رکھے منڈیر کے ایک چوکور سوراخ سے جھانک رہی تھی۔ وہ گردن میری طرف گھماتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرا کر بولی۔ "تم اس وقت کیا محسوس کر رہے ہو؟"

"میں عجیب سی متضاد کیفیت کا شکار ہوں۔" میں نے نیچی آواز میں جواب دیا۔ "مجھے سیوبک کی بات ٹھیک بھی محسوس ہوتی ہے کہ جو کچھ ہونا ہے وہ یہیں کہیں ہو گا لیکن میں اس سکوت کو دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ اتنے انتظامات کی موجودگی میں کچھ ہونا بہت مشکل ہے مگر اس کے ساتھ ہی میری کوئی نامعلوم سی حس مجھے یہ احساس بھی دلا رہی ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ فضا میں جیسے کسی شیطانی سی چیز کی موجودگی کے اثرات پھیلے ہوئے ہیں۔"

سیوبک عمارت کے دوسرے کونے پر تھا۔ وہ ہماری باتیں نہیں سُن سکتا تھا۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ دل و جان سے ہمارا ساتھ دے رہا تھا۔ میرے خیال میں تو حقیقت بھی یہی تھی۔ اس کا کیتھرین کے بارے میں زاویۂ نظر کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن کم از کم اس معاملے میں وہ بھی چارلس جتنا ہی تشویش زدہ تھا۔

چھت پر دو پولیس والے بھی سادہ لباس میں موجود تھے۔ وہ احتیاطاً عمارت کے عقب میں دور تک نظر آنے والی دوسری عمارات پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کاغذی کپ میں مجھے اور کیتھرین کو تھرموس میں سے کافی لا کر دی۔ پھر وہ چارلس اور سیوبک کو کافی دینے چلا گیا۔

میں نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے منظر سے نظر ہٹائے بغیر دو گھونٹ بھرے اور کپ ایک طرف رکھ دیا۔ کافی مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر دوربین آنکھوں سے لگائی۔ اس بار دوربین کا زاویہ ذرا اوپر تھا۔ تب میں نے دیکھا سڑک سے کچھ دور ایک بہت ہی بڑی کرین کھڑی تھی جو دوربین کے بغیر بھی بڑی نمایاں نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسے کل بھی اسی طرح کھڑے دیکھا تھا۔

ہاتھی کی سونڈ کی طرح کرین کا بُوم فضا میں بلند تھا اور دور تک

ہوا تھا اور اس کا جو سرا ہوا میں بلند تھا اس پر بہت بڑا ہُک لٹکا ہوا تھا۔ یہ غیر معمولی طور پر بڑے سائز کی کرین تھی اور غالباً سیمنٹ کے بہت بڑے بڑے سلیب اُٹھانے میں زیادہ استعمال ہو رہی تھی۔

مجھے معلوم تھا دیگر مشینری کے ساتھ کرین کو بھی چیک کیا گیا تھا۔ اس وقت اس کی کیب یعنی وہ حصہ جس میں آپریٹر بیٹھتا تھا' خالی اور مقفل تھی۔ میں دوربین کو نہایت آہستگی سے حرکت دیتا رہا اور منظر گویا دھیرے دھیرے میری آنکھوں کے سامنے ہلکورے لیتا رہا۔ کرین کا بُوم درحقیقت سڑک کے اوپر معلق تھا اور اس کا ہُک بلندی پر تھا مگر سڑک کے درمیانی حصے کی عین سیدھ میں تھا۔

مجھے یہ بات کچھ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ کل کرین کے بُوم کا رخ کسی اور طرف تھا۔ آج حالانکہ کرین کو کچھ پیچھے ہٹا کر کھڑا کیا گیا تھا لیکن اس کے بُوم کے معاملے میں کسی نے اناڑی پن کا ثبوت دیا تھا اور اسے سڑک کے اوپر ہی معلق رہنے دیا تھا۔ اس کی بلندی چونکہ کافی زیادہ تھی شاید اس لیے کسی کا اس طرف دھیان نہیں گیا تھا۔ اس میں ویسے کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ وہ بہرحال کرین تھی۔ کیچے دھاگے سے بندھی ہوئی کوئی چیز تو نہیں تھی جو نیچے سے گزرتے ہوئے ٹریفک پر گر پڑتی۔

اسی دوران چارلس نے ہمیں بتایا کہ لیڈی ڈائنا کی گاڑی دیگر گاڑیوں کے جلو میں ائرپورٹ سے روانہ ہو چکی تھی گویا اس کے ہمارے سامنے سے گزرنے میں چار یا پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ ریڈیو کی دھیمی دھیمی آواز مجھ تک بھی پہنچ رہی تھی لیکن الفاظ صحیح طور پر سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

میری توجہ اب بھی منظر کی طرف تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ غیر ارادی طور پر میری نظر ٹین کی دیوار کے اس حصے پر جا رہی تھی جس پر سفید رنگ کیا گیا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ ٹکڑا میری نظر میں کھٹک رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ ٹین کی یہ دیوار کل بھی آدھی سے زیادہ بنی ہوئی تھی لیکن کل اس کے کسی حصے پر سفید رنگ نہیں تھا۔ رنگ کرنے کا کوئی مقصد بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس دیوار کا مقصد تو صرف مشینری اور ملبے کو آڑ میں چھپانا تھا' اگر اس میں خوبصورتی پیدا کرنا ہی مقصود ہوتا تو پوری دیوار پر سفید رنگ کیا جاتا۔ صرف پہلی چادر پر کیوں کیا گیا تھا؟

پھر میری دوربین دھیرے دھیرے گھومتی ہوئی کرین کے بُوم پر آ ٹھہری۔ اس وقت چارلس بتا رہا تھا۔ "لیڈی کی گاڑی دو منٹ اور چند سیکنڈ میں یہاں پہنچنے والی ہے....."

میں دوربین کے ذریعے بُوم میں لٹکے ہوئے بڑے سے ہُک کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ مجھے بے چین کیے ہوئے تھی وہ کسی ایسی بات کے بارے میں تھی جو سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بات کچھ تاخیر سے..... اور الہامی سے ہوئی۔ میری سمجھ میں آئی تھی لیکن وہ میری غلط فہمی بھی ہو سکتی تھی۔ اسی وجہ سے میں چند قیمتی سیکنڈ ضائع ہو گئے۔ میں کسی کو اس کے بارے میں بتا بھی نہ سکا۔

ویسے بھی جو بات میری سمجھ میں آئی تھی وہ چند سیکنڈ میں کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ اگر وہ غلط فہمی تھی تب بھی اپنا وہم دور کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا لیکن اس کے لیے بجلی کی طرح حرکت میں آنے کی ضرورت تھی۔ وقت بہت کم تھا۔ گاڑیوں کا قافلہ وہاں پہنچنے ہی والا تھا۔

وہ چار منزلہ عمارت تھی۔ اس میں لفٹ نہیں تھی۔ ہنگامی ضرورت کے لیے ہم نے عمارت کی چھت سے ایک رسی نیچے لٹکا رکھی تھی جو ایک ستون سے بندھی ہوئی تھی۔ ہم سب کے ہاتھوں پر نائیلون کے خاص قسم کے دستانے تھے جو ہاتھوں کو چھلنے سے بچا سکتے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی ضرورت پڑنے پر نہایت تیزی سے رسی کے ذریعے نیچے جا سکتا تھا۔ سیڑھیوں سے جانے میں اس کے مقابلے میں زیادہ وقت صرف ہوتا۔

میں نے رائفل وہیں چھت پر پھینکی اور لپک کر منڈیر کے اس حصے پر پہنچا جہاں سے رسی نیچے جا رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے رسی پکڑ کر میں منڈیر پھلانگ چکا تھا اور تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔ اوپر میں نے کیتھرین کی ہلکی سی چیخ سنی۔ شاید اس نے مجھے پکارا تھا لیکن اس کے حلق سے چیخ کی سی آواز نکلی تھی۔

میں شاید دو تین سیکنڈ میں ہی نیچے پہنچ گیا تھا۔ نائیلون کے خاص قسم کے باریک جالی دار دستانوں نے میرے ہاتھوں کو رسی کی رگڑ سے محفوظ رکھا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں سڑک کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ میں شاید کبھی اپنی جان بچانے کے لیے بھی اتنا تیز نہیں دوڑا تھا۔

میں نے صرف ایک بار گردن ذرا موڑ کر پیچھے دیکھا۔ کوئی میرے پیچھے نہیں آیا تھا۔ دوسرے لوگوں کی شاید سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ میں کیا کرنے جا رہا تھا اس لیے انہوں نے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہنا ہی بہتر سمجھا ہوگا۔ اس وقت سڑک "فٹ پاتھ" اس کے کنارے فاضل زمین کی چوڑائی اور سروس روڈ وغیرہ کو ملا کر وہ فاصلہ بنتا تھا وہ مجھے میلوں پر محیط محسوس ہو رہا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس وقت ٹریفک دونوں طرف کی سڑکوں پر بالکل بند ہو چکا تھا ورنہ میں بروقت انہیں پار نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

میں گویا ہوا کے دوش پر دوسری سڑک کے کنارے پہنچا۔ اس تیز رفتاری کا ایک فائدہ ہوا کہ میں آسانی سے ٹین کی دیوار کو پھلانگ گیا ورنہ شاید مجھے اس کو پار کرنے میں دشواری ہوتی۔ میں ملبے' سریے کے انباروں اور سیمنٹ کی سلیبوں کو پھلانگتا ہوا کرین تک پہنچا۔

میں نے اس کے دروازے کو صرف ایک جھٹکا دے کر دیکھا۔ وہ مقفل تھا۔ اگر وہ مقفل نہ ہوتا تب بھی شاید مجھے کوئی خاص فائدہ نہ ہوتا کیونکہ کرین اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی یقیناً اندر موجود تھی۔ اگر دروازہ مقفل نہ ہوتا اور چابی اندر موجود ہوتی تب تو اپنے میں کیب میں بیٹھ کر ہی اپنا کام کرنے کی کوشش کرتا۔

میں صرف بُوم کو گھما کر کسی اور طرف کر دیتا تو مسئلہ حل ہو جاتا۔ اس کے لیے زیادہ مہارت کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ہوائی میں ایک تعمیراتی فرم میں کام کر چکا تھا۔ گو کہ میں وہاں ایک عام نما سا اکاؤنٹنٹ تھا لیکن ہر کام سیکھنے کی پرانی عادت کے تحت ہر چیز میں دخل دیتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں وہاں جو کرین موجود تھی وہ بھی میری "دست برد" سے محفوظ نہیں رہی تھی تاہم وہ پرانے ماڈل کی ایک چھوٹی سی کھٹارا کرین تھی۔ اس وقت میرے سامنے جدید ماڈل کی ایک بہت بڑی کرین موجود تھی۔

میں نے دروازے پر زور آزمائی میں وقت ضائع نہیں کیا اور کرین پر چڑھ گیا۔ وہاں موجود تمام پولیس والوں نے اپنی رائفلوں کا رخ میری طرف کر لیا تھا لیکن وہ یقیناً یہ نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے اور نہ ہی غالباً ان کی یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ میں کیا کرنا چاہ رہا تھا۔

وہ بہرحال مجھ پر فائر نہیں کر سکتے تھے کیونکہ صبح سے وہ مجھے یہاں مختلف انتظامات میں شریک دیکھ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں کسی نہ کسی حیثیت میں ان لوگوں میں شامل تھا جو ان انتظامات کو کنٹرول کر رہے تھے۔ انہیں یقیناً حیرت ہو رہی ہوگی کہ دور ایک عمارت کی چھت پر بیٹھے بٹھائے اچانک مجھے کیا ہوا تھا جو میں کسی خارش زدہ بندر کی طرح اُچھلتا کودتا یکدم کرین پر آ چڑھا تھا اور اب آسمان کی طرف اٹھے ہوئے اس کے بازو پر چڑھا جا رہا تھا۔

کرین کے اس حصے میں لوہے کے پچاسوں چھوٹے بڑے گرڈر ایک دوسرے کو کراس کر رہے تھے۔ قینچیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ وہ میرے لیے آہنی سیڑھی کا کام دے رہی تھیں۔ بُوم کے سرے پر پہنچ کر میں نے ایک لمحے کے لیے نیچے جھانکا تو ذرا سا خوف محسوس ہوا۔ میں سڑک کے عین اوپر تین چار منزلہ عمارت جتنی بلندی پر ہوا میں معلق تھا۔

میں نے فوراً نیچے کی طرف سے دھیان ہٹا لیا۔ کرین کا ہُک اب میرے ہاتھ سے دو تین فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ مجھے اپنے چاروں طرف بے پناہ سکوت کا احساس ہو رہا تھا لیکن اسی لمحے میری نظر اس سڑک کے ایک دور افتادہ حصے پر پڑی۔ کاروں کی ایک قطار بڑے سائز کے کھلونوں کی طرح رینگتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ یقیناً ائرپورٹ سے آتی ہوئی کاروں کا قافلہ تھا جو مل کھاتی سڑک پر بظاہر رینگتا دکھائی دے رہا تھا لیکن درحقیقت کاریں تیز رفتاری سے چلی آ رہی تھیں۔ پھر مجھے سائرن کی مدھم سی آواز بھی سنائی دی۔ ٹریفک پولیس کی دو موٹر سائیکلیں جلوس سے کچھ آگے آ رہی تھیں۔ وہ اب اس مقام سے زیادہ دور نہیں رہی تھیں۔

ایک ثانیے کے لیے مجھے اپنے اعصاب میں تھرتھراہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں جو کچھ کر رہا تھا کیا وہ صحیح تھا یا میں محض اپنے آپ کو تمسخر اور تضحیک کا نشانہ بنوانے کا سامان کر رہا تھا؟ یہ سوال ایک بار پھر بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا لیکن میں نے فوراً ہی اس کا گلا گھونٹ دیا۔ اپنا شک دور کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

میں نے کرین کے بڑے سے ہُک کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اب تو ویسے بھی میں اسے صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ میرا شبہ ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا۔ عام حالات میں اس ہُک کو ایک مضبوط اسٹیل پر بڑے بڑے نٹ بولٹس وغیرہ کے ذریعے لٹکا ہونا چاہیے تھا کیونکہ اسی ہُک میں لوہے کی رسیاں وغیرہ ڈال کر بڑی سے بڑی وزنی چیزیں اٹھائی جاتی تھیں۔ نٹ بولٹ اور اسٹیل وغیرہ اب بھی موجود تھے مگر اب وہ محض دکھاوے کے لیے تھے۔

اب ہُک درحقیقت ایک نازک کھانچے میں اٹکا ہوا تھا جو شاید پلاسٹک کا تھا اور درحقیقت یہ وہ ہُک ہی نہیں تھا جو کرین میں ہونا چاہیے تھا۔ یہ اس ہُک کی ایک کامیاب نقل تھی لیکن یہ سب کچھ دور سے دیکھنے پر محسوس نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ویسے بھی کرین کے اس آخری سرے تک اتنی باریکی سے دیکھنے کی ضرورت شاید کسی نے محسوس نہ کی ہو۔ میں بھی اگر دوربین سے نہایت آہستگی سے ایک ایک چیز کا جائزہ نہ لے رہا ہوتا تو شاید مجھے بھی فرق کا احساس نہ ہوتا۔ میں نے کل اتفاق سے کرین کے ہُک تک کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ گہرے سیاہ رنگ کا تھا اور اس کی بناوٹ میں ظاہر ہے بڑی صفائی تھی۔

آج دوربین سے دیکھنے پر وہ مجھے ہلکے سرمئی رنگ کا دکھائی دیا تھا اور اس میں کہیں کہیں ناہمواری بھی تھی۔ اس کا بالائی حصہ تو لوہے کے گرڈرز کی آڑ میں چھپا ہوا تھا اس لیے جب جب میں نے عمارت کی چھت پر سے اسے دیکھا تھا تو مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اس وقت وہ نٹ بولٹوں کے ذریعے صحیح طور پر پھنسا ہوا نہیں تھا۔ تاہم مجھے گڑبڑ کا شبہ ضرور ہو گیا تھا اور اب تصدیق ہو گئی تھی۔

مجھے احساس تھا کہ میرے چہرے سے پسینہ میرے بازوؤں پر ٹپک رہا تھا۔ اس ہُک کو ہاتھ لگانے کا نتیجہ کچھ بھی نکل سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اسے اس کے کھانچے سے نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ عین اسی وقت ایک گولی میری ناک کی نوک کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔

میں بال بال بچ تو گیا تھا لیکن میری آنکھوں کے سامنے تارے ضرور ناچ گئے۔ میں نے خفگی اور بیزاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کچھ زیادہ ہی پھرتی دکھا دی تھی جو مجھے مہنگی پڑ سکتی تھی۔ اس وقت میں کھلی فضا میں بلندی پر اٹکا ہوا ایک ساکت شکار تھا جس پر چاروں طرف سے کوئی بھی نشانے بازی کی مشق کر سکتا تھا۔

یوں تو اس وقت میرے چاروں طرف بہت سے لوگ موجود تھے جنہیں اصولاً میری حفاظت کرنی چاہیے تھی لیکن مجھے امید تھی کہ ان میں سے کوئی مجھے کسی سمت سے آنے والی ناگہانی

گولی سے بچا سکتا تھا کیونکہ فائر یقیناً سائیلنسر لگی رائفل سے ہوا تھا۔ جب تک ان لوگوں کو اندازہ ہوتا کہ فائر کس سمت سے ہو رہا تھا اس وقت تک میرا کام تمام بھی ہو سکتا تھا بلکہ عین ممکن تھا کہ میں پٹ سے نیچے جا گرتا تبھی ان لوگوں کو پتا چلتا کہ مجھ پر کوئی فائر بھی ہوا تھا۔

میں فوراً ہی بُوم کے گرڈرز پر چپک کر لیٹ گیا۔ اس دوران ایک اور گولی آہنی گرڈرز سے ٹکرا چکی تھی اور اس نے چنگاریاں پیدا کی تھیں۔ وہ گولی اچٹ کر بھی مجھے لگتی تو شاید مہلک ثابت ہوتی لیکن میری خوش قسمتی تھی کہ وہ شاید نیچے کی طرف چلی گئی۔ تیسری گولی میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزری۔

یہ سب کچھ خوش قسمتی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں گرڈرز کے اوپر لیٹنا ہونے کے باوجود گولیوں سے محفوظ نہیں تھا۔ فوراً ہی میں نے کروٹ سی لی اور چوڑے گرڈر کی آڑ میں دوسری طرف دونوں ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے چپک گیا۔ اب میں موٹے آہنی گرڈرز کی آڑ میں تو ہو گیا تھا لیکن اگر میرے ہاتھ پیروں کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی یا میں اپنا وزن نہ سنبھال پاتا تو سیدھا سڑک پر جا گرتا اور میری ہڈیاں پسلیاں گوشت سب ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتا۔

اس عالم میں بھی میں ٹِک کی طرف ہاتھ بڑھانے سے باز نہ رہا کیونکہ جان کی بازی تو لگ ہی چکی تھی' اب اصل مقصد بھی پورا ہونا چاہیے تھا ورنہ یہ ساری بھگدڑ فضول اور بے معنی ہو کر رہ جاتی۔ نامعلوم سمت سے مزید کوئی گولی نہیں آئی کیونکہ عمارت کی چھت پر موجود میرے ساتھیوں کو شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھ پر فائر ہوئے تھے اور انہوں نے فائروں کی سمت کا بھی اندازہ کر لیا تھا۔

انہوں نے شاید کچھ جوابی کارروائی کی تھی جس کی وجہ سے میری سمت میں مزید گولیاں نہیں آئی تھیں۔ میں نے دور کہیں شیشہ وغیرہ ٹوٹنے کی مدھم سی آوازیں سُنی تھیں۔ کیتھرین' سیوبک' چارلس اور چھت پر موجود پولیس کے دو آدمی جنہیں اس وقت میں اپنے ساتھی شمار کر رہا تھا' ان سب کے پاس بھی سائیلنسر والی رائفلیں تھیں۔ اس لیے مجھے جوابی فائرنگ کی باقاعدہ آوازیں سنائی نہیں دی تھیں۔ طے یہی پایا تھا کہ وہاں جو کچھ بھی ہونا تھا نہایت خاموشی سے ہونا تھا۔

میرا ہاتھ اس دوران ٹِک تک پہنچ چکا تھا۔ میں اس وقت بہت مشکل میں تھا۔ کچھ اسی طرح لوہے کے گرڈر سے چمٹا ہوا تھا جس طرح بندر بعض اوقات کسی چیز سے خوفزدہ ہو کر درخت کی شاخ سے چمٹ جاتا ہے لیکن ایک انسان کے لیے ظاہر ہے یہ کوئی آسان کام نہیں تھا' خصوصاً جبکہ اسے کچھ اور بھی کرنا تھا۔

تاہم میں کھانچے سے ٹِک نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ٹِک کو میں جہاں کہیں بھی پھینکوں گا' کچھ نہ کچھ تباہی پھیلے گی۔ اب تو یقینی طور پر معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اصل ٹِک نہیں تھا۔ وہ لوہے کے بجائے پلاسٹک کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

سائٹ پر موجود پولیس والے گردنیں اٹھائے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے عقب میں کافی دور مجھے پانی کا ایک بہت بڑا ٹینک رکھا نظر آیا۔ وہ مال گاڑی کے ڈبے سے مشابہ' لوہے کا ایک بہت بڑا کنٹینر تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ پانی غالباً کنسٹرکشن میں استعمال کے لیے وہاں رکھا گیا تھا۔

فاصلہ کافی تھا اور میں جس پوزیشن میں لٹکا ہوا تھا اس میں اس ٹِک کو پانی کے اس ٹینکر تک پھینکنا بڑا مشکل کام تھا لیکن میں اسے مزید ایک سیکنڈ بھی ہاتھ میں رکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں ایک ہاتھ اور دونوں پیروں کی مدد سے گرڈر کے ساتھ چپک کر ایک ہاتھ سے وہ کام کر ہی گزرا۔ میں نے ٹِک کو اندازاً پانی کے اس ٹینکر میں پھینکا لیکن مضحکہ خیز حالت میں ہونے کی وجہ سے نشانہ خطا ہو گیا۔

ٹِک یوں تو واٹر ٹینک کے اندر ہی گیا لیکن اندر کی طرف دیوار کے کونے سے ٹکرا گیا۔ بس میں اتنا ہی دیکھ سکا۔ اس کے ساتھ ہی زبردست دھماکے اور روشنی کے نہایت تیز جھماکے کی وجہ سے میری آنکھیں ایک ثانیے کے لیے غیر ارادی طور پر بند ہو گئیں۔

میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو واٹر ٹینک وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے' دور دور تک کیچڑ سا پھیلا ہوا تھا اور ٹینک کی جگہ گڑھا سا پڑ گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق پانی کی وجہ سے اس دھماکے اور اس کی تباہی کی شدت بہت کم ہو گئی تھی۔ اگر ٹِک کی ساخت کے اس بم کو اس کی اصل جگہ پر گر جانے کا موقع مل جاتا تو نہ جانے کتنی تباہی پھیلتی۔

تمام پولیس والے زمین پر لیٹ چکے تھے اور انہوں نے اپنی اپنی گنوں کے رخ اس طرف کر لیے تھے جدھر دھماکا ہوا تھا لیکن ظاہر ہے ادھر کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس پر وہ بندوق تان کر کسی کو کوئی فائدہ پہنچاتے۔ اس وقت مجھے ان کی حالت اپنے سے بھی زیادہ مضحکہ خیز لگی۔

یہ سب کچھ درحقیقت ایک ڈیڑھ منٹ کے اندر اندر ہو گیا تھا۔ لمبے دار سڑک پر مجھے ٹریفک والوں کی موٹر سائیکلیں کافی قریب دکھائی دیں۔ ان کے سائرن تو صاف سنائی دینے لگے تھے۔ اسی لمحے کسی نے نیچے چیخ کر میرا نام لے کر پکارا۔

میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ چارلس کرین کے قریب کھڑا تھا۔ میں تیزی سے نیچے اُتر آیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کئی دنوں پر محیط ایک صبر آزما جدوجہد سے گزر کر آ رہا تھا لیکن درحقیقت اس عمارت کی چھت سے اُترنے اور اب کرین سے اُترنے کے دوران بمشکل ڈیڑھ منٹ کا وقفہ تھا جس کا اندازہ مجھے اپنی گھڑی دیکھ کر ہوا۔ جب ہم عمارت کی چھت پر تھے اور چارلس نے اعلان کیا تھا کہ کاروں کا قافلہ تقریباً ڈھائی منٹ بعد وہاں پہنچنے والا تھا اس

وقت میں نے گھڑی دیکھی تھی۔

چارلس کافی بوکھلایا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مشین پسٹل تھا اور دوسرے میں ریڈیو..... جس کا ہیڈ فون اس کے گلے میں جھول رہا تھا۔ اس کے عقب میں دو سیکیورٹی آفیسر بھی دوڑے آ رہے تھے۔ وہ سب مشین گنیں اُٹھائے ہوئے تھے اور ان کا دوڑ کر آنے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی فوج سے مقابلہ کرنے کے لیے آ رہے ہوں لیکن شاید غیر ارادی طور پر انہوں نے نشانہ میرا اور چارلس کا لیا ہوا تھا۔

"یہ دھماکا کیسا تھا؟" چارلس وحشت زدہ لہجے میں بولا۔ "کیا میں قافلے کو روک دوں؟" وہ ریڈیو منہ کے قریب لانے لگا۔

میں نے ہاتھ اُٹھا کر اسے روکا اور بے ترتیب سی سانسوں کے درمیان کہا۔ "اب قافلے کو روکنے کا کوئی فائدہ نہیں..... انہیں اب اسی روانی سے گزر جانے دو..... اب خطرہ ٹل چکا ہے۔"

میرے بات کرنے تک ٹریفک پولیس کی موٹر سائیکلیں اس مقام تک پہنچ چکی تھیں جہاں بورڈ لگا تھا۔ "حدِ رفتار پچاس کلومیٹر فی گھنٹا۔" یہ بورڈ غالباً عارضی طور پر فلائی اوور کی تعمیر کی وجہ سے لگایا گیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ خود ٹریفک پولیس والوں نے اس وقت لیڈی ڈائنا جیسی شخصیت کی گاڑی کو پائلٹ کرتے وقت بھی اس ہدایت کا خیال رکھا اور موٹر سائیکلوں کی رفتار کم کر لی ورنہ وہ کچھ تیز رفتاری سے آ رہے تھے۔ انہیں دھماکا کسی نہ کسی حد تک سُنائی دیا ہو گا۔

انہوں نے چاروں طرف دیکھا لیکن انہیں چونکہ خطرے کا کوئی سگنل نہیں ملا تھا اور نہ ہی ریڈیو پر کوئی پیغام ملا تھا اس لیے وہ گزرتے چلے گئے۔ اس کے بعد دوسری گاڑیاں نمودار ہونا شروع ہوئیں۔ پولیس' اسپیشل سیکیورٹی' ملٹری انٹیلیجنس وغیرہ کی گاڑیاں گزریں۔ پھر تاریک شیشوں اور چھ دروازوں والی سیاہ مرسیڈیز گزری۔ اس میں یقیناً لیڈی ڈائنا اور ترک وزیرِ خارجہ موجود تھے۔

ہم ملبے' مشینری اور ٹین کی دیوار کی آڑ میں ساکت کھڑے رہے اور گاڑیوں کا قافلہ ایک مخصوص رفتار سے ہمارے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔ جتنے حصے میں کنسٹرکشن جاری تھی' اس سے نکلنے کے بعد گاڑیوں کی رفتار تیز ہو گئی۔ گویا ان گاڑیوں نے بھی حدِ رفتار کی پابندی کی تھی۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اپنے ملک سے نکل کر ہر جگہ قانون کی پابندی نظر آتی تھی۔

بند گاڑیوں میں گزرنے والے ان لوگوں کو میل ڈیڑھ میل کے فاصلے سے دھماکا بھی سنائی نہیں دیا ہو گا اور نہ ہی یہ گمان گزرا ہو گا کہ انہیں اس مقام سے حفاظت سے گزارنے کے لیے کتنے لوگوں کی جان پر بنی ہوئی تھی اور کس نے کس طرح بروقت جان پر کھیل کر ایک عجیب و غریب متوقع حملے کو ناکام بنایا تھا۔

چند لمحے ہم سب ساکت کھڑے رہے۔ قافلہ گزر جانے کے بعد فضا میں ایک عجیب سا سکوت پھیل گیا تھا۔ اس دوران میرے اعصاب اور میری سانس معمول پر آ گئی۔ میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں چارلس سے پوچھا۔ "کیتھرین اور سیوبک کیا اسی عمارت کی چھت پر ہیں؟"

"نہیں..." چارلس کی آواز ابھی تک مرتعش تھی۔ "اس سے کافی پیچھے ایک اور عمارت تھی۔ وہاں سے تم پر فائرنگ ہوئی تھی..... وہیں ایک کھڑکی میں کچھ حرکت نظر آئی..... کیتھرین نے اس پر فائرنگ کی..... اور اب وہ اس عمارت کی طرف بھاگے ہیں..... پولیس والے بھی ان کے ساتھ ہیں لیکن تم بتاؤ..... یہ کیا چکر تھا؟"

"چکر بعد میں سمجھتے رہنا' ہمیں ان کی مدد کے لیے جانا چاہیے۔" میں نے تیزی سے کہا اور اپنے سامنے کھڑے سیکیورٹی آفیسر کی طرف اشارہ کیا۔ "اس سے کہو اپنی سب مشین گن مجھے دے دے۔"

چارلس نے سیکیورٹی آفیسر کو اشارہ کیا۔ اس نے بادلِ ناخواستہ اپنی سب مشین گن مجھے دے دی اور میں اسی سمت میں واپس دوڑ پڑا جدھر سے آیا تھا۔ ٹین کی دیوار میں سے کسی نے ایک چادر گرا دی تھی اور اب اس کے درمیان سے آنے جانے کا راستہ بن گیا تھا۔ میں ملبے پر سے چھلانگ لگا کر اس راستے سے ہوتا ہوا سڑک پار کرنے لگا۔

دو طرفہ سڑک عبور کرنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ چارلس گرتا پڑتا میرے پیچھے بھاگا آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ وہ سیکیورٹی آفیسر بھی تھا جس نے مجھے گن دی تھی۔ وہ کچھ اس طرح میرے پیچھے آ رہا تھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ میں اس کی گن لے کر بھاگ جاؤں گا۔

چارلس کی وجہ سے مجھے اپنی رفتار کم کرنا پڑی۔ وہ میرے قریب پہنچا تو میں نے کہا۔ "تم مجھے اشارے سے بتا دو وہ کس عمارت کی طرف گئے تھے۔"

اس نے ہانپتے ہوئے براؤن رنگ کی ایک عمارت کی طرف اشارہ کیا جو دیگر عمارتوں سے ہٹ کر کافی پیچھے واقع تھی۔ اتنی دور ہونے کی وجہ سے اسے زیادہ سخت سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے نگرانی میں بھی نہیں رکھا گیا تھا۔ میں نے چارلس کو اس کی طاقت کے مطابق دوڑنے کے لیے چھوڑا اور خود اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے اس عمارت تک پہنچا۔

وہ ایک ہائی رائز عمارت تھی۔ گیارہ بارہ منزلہ معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اوپر تک نظر دوڑائی تو دو منزلوں پر بڑی بڑی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے نظر آئے۔ گہرے رنگ کے شیشے کے کچھ ٹکڑے مجھے نیچے بھی پڑے دکھائی دیے۔ عمارت کے گرد لوہے کا جنگلا تھا اور سڑک کی طرف تھا لیکن اس میں داخلے کا راستہ پیچھے کی طرف سے

تھا۔

میں دوڑتا ہوا پیچھے پہنچا تو پتا چلا اس طرف عمارت کا خاصا بڑا کمپاؤنڈ تھا جو پارکنگ لاٹ کا کام بھی دیتا تھا۔ یہ عمارت بھی کاروباری مرکز معلوم ہوتی تھی کیونکہ اس روز چھٹی کی وجہ سے پارکنگ لاٹ تقریباً خالی نظر آرہی تھی۔

دفعتاً میری نظر سیڑھیوں کی دیوار کے عقب میں مشکوک انداز میں ہلتی ہوئی ایک ٹوپی پر پڑی۔ اچھا ہوا کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے اس پر فائر نہیں کردیا۔ مجھے بروقت احساس ہوگیا تھا کہ وہ رنگ اور ساخت ترکش پولیس کی ٹوپی کی تھی۔

دوسرے ہی لمحے دیوار کے عقب سے ایک سر نمودار ہوا۔ یہ انہی پولیس والوں میں سے ایک تھا جو ہمارے ساتھ عمارت کی چھت پر تعینات تھے۔ وہ اپنی گن اٹھائے ہوئے تھا اور اس کی آنکھیں حیرت، خوف یا پھر کسی اور وجہ سے گول گول سی دکھائی دے رہی تھیں۔

"کیتھرین وغیرہ کہاں ہیں؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"وہ اس آدمی کی تلاش میں گئے ہیں، اس کا پیچھا کررہے ہیں۔" اس نے ٹوٹی پھوٹی سی انگریزی میں جواب دیا۔

"کس آدمی کا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ اس عمارت میں چھپا ہوا تھا۔" اس نے لابی کی طرف اشارہ کیا۔

"اور تم یہاں چھپے کیا کررہے ہو؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔ وہ مجھے اب کچھ ہونق سا لگ رہا تھا اور اس وقت کسی کا بھی ہونق پن میرے لیے ناقابلِ برداشت ہی تھا۔

"ہمارا ایک آدمی مرگیا ہے.... مجھے مس کیتھرین نے یہیں رکنے کے لیے کہا تھا۔" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا اور لابی کے شیشے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دروازہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ شیشے کے ٹکڑے ماربل کی سیڑھیوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

میں نے سیڑھیاں چڑھ کر محتاط انداز میں دروازہ آہستگی سے کھولا جس کا صرف المونیم کا فریم ہی باقی رہ گیا تھا۔ میں نے لابی میں جھانکا۔ سامنے ہی ماربل کے جھلملاتے فرش پر ایک باوردی پولیس والا اوندھا پڑا تھا۔ اس کا ایک رخسار تو فرش پر ٹکا ہوا تھا اور دوسرا رخسار غائب تھا۔ اس کی شکل ناقابلِ شناخت ہوچکی تھی۔ میں نے اندازاً ہی اسے پہچانا۔ اس کے جسم میں اور بھی کئی گولیاں پیوست تھیں۔ اس کے اردگرد خون پھیلا ہوا تھا۔ لابی میں مدھم سی روشنی تھی۔ اس روشنی میں فرش بھی جھلملا رہا تھا اور خون بھی۔

خون ابھی خشک ہونا بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ عمارت میں بلا کا سکوت تھا۔ اندر جانا فضول تھا۔ اب شاید وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے پلٹ کر پولیس والے سے پوچھا۔ "کیتھرین اور سیوبک کس طرف گئے ہیں؟"

ایک نوجوان کی سنسنی خیز لہو رنگ خودنوشت

دہشت گرد

سلیم فاروقی

○ وہ محب وطن ہونے کے باوجود دہشت گرد کہلاتا تھا۔

○ وقت کی راسیں تھامتے اس کے ہاتھ لہولہان ہوگئے تھے۔

○ "سچی کہانیاں" کا ایک مقبول ترین ایڈونچر سلسلہ چار حصوں میں شائع ہو رہا ہے۔

فاطمہ کتھرائن سنٹر کراچی اردو بازار لاہور

فون: 7224665

اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "کیتھرین اس طرف گئی ہے....." پھر دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "سیوبک اس طرف گیا ہے۔"

"کیا وہ دو آدمیوں کے تعاقب میں گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں.... آدمی تو شاید ایک ہی تھا....." وہ بے یقینی سے بولا۔ "شاید وہ اسے دو طرف سے گھیرنے کی کوشش کرنا چاہتے تھے۔ وہ شاید اس طرف بھاگا تھا..... میں صحیح طور پر کچھ دیکھ نہیں سکا۔" اس نے اٹک اٹک کر بتایا۔ اس کی ہرات میں "شاید" شامل تھا۔

اس دوران چارلس اور سیکیورٹی آفیسر بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ سیکیورٹی آفیسر کے ہاتھ میں اب ایک پسٹل نظر آرہا تھا۔ میں نے ان دونوں کو مختصر ترین الفاظ میں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ چارلس ہانپتے ہوئے بولا۔ "اس کا مطلب ہے حمان اس عمارت میں چھپا ہوا تھا....."

"ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "وہ جو کوئی بھی تھا کیتھرین اور سیوبک اس کے تعاقب میں گئے ہیں۔ آپ یہیں ٹھہریں۔ زیادہ بھاگ دوڑ آپ کے بس کی بات نہیں۔ میں اور یہ آفیسر جاکر ان کی مدد کی کوشش کرتے ہیں۔"

چارلس نے اثبات میں سرہلایا۔ "میں نے سیکیورٹی آفیسر کو اشارہ کیا اور ہم دونوں گنیں سنبھالے آگے روانہ ہوئے۔ دوڑتے ہوئے ہم اس عمارت تک پہنچے جس کی طرف پولیس والے نے اشارہ کیا تھا۔ مین روڈ کے آس پاس تو ہمیں ویرانی ہی نظر آئی تھی لیکن اب چونکہ ہم مین روڈ سے کچھ دور نکل آئے تھے شاید اس لیے ہمیں ایک جگہ کچھ لوگوں کی شکلیں دکھائی دیں۔ وہ دو تین کی ٹولیوں کی صورت میں کونے کھدروں میں کھڑے تھے اور وحشت زدہ سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ وہ شاید انہی عمارتوں میں رہتے تھے۔

سیکیورٹی آفیسر بھی میری طرح سادہ لباس میں تھا۔ ہمیں گنیں اٹھائے بھاگتے دیکھ کر وہ لوگ کچھ اور پریشان ہوگئے۔ اِدھر اُدھر بھاگ کر چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے بہ آوازِ بلند تیزی سے انگریزی میں کہا۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں.... ہم سرکاری لوگ ہیں.... آپ نے ایک مرد اور ایک عورت کو ادھر کہیں جاتے دیکھا ہے؟"

ان میں سے تین چار افراد ہچکچاہٹ آمیز انداز میں رک گئے۔ میں نے مختصراً انہیں کیتھرین اور سیوبک کے حلیے بتانے کی کوشش کی۔ سیکیورٹی آفیسر نے ترکی میں انہیں میرا مطلب سمجھانے میں میری مدد کی۔ تب ان میں سے ایک شخص نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے آندھی طوفان کی طرح دو افراد کو ادھر جاتے تو دیکھا تھا۔ انہوں نے چند فائر بھی کیے تھے لیکن وہ دیکھ نہیں سکے تھے کہ ان کے حلیے کیا تھے اور شکلیں کیسی تھیں۔

مین روڈ کے آس پاس تو زیادہ تر کمرشل عمارتیں تھیں۔ بیچ میں کچھ جگہیں خالی بھی تھیں اور کچھ ان عمارتوں کی پارکنگ لاٹس کی وجہ سے کشادگی نظر آرہی تھی لیکن ان کے عقب میں جہاں تک ہم پہنچ چکے تھے وہاں سے کچھ آگے رہائشی مکانات کا سلسلہ شروع ہورہا تھا اور وہ خاصی گنجان آبادی نظر آرہی تھی۔ جس شخص نے ہماری رہنمائی کی کوشش کی تھی اس نے انہی گلیوں کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن وہ یقین سے نہیں بتا سکتا تھا کہ ان میں سے کون کس گلی میں گیا تھا۔

مجھے سیوبک کے بارے میں تو نہیں، البتہ کیتھرین کے بارے میں تشویش تھی۔ میرے خیال میں تو چارلس نے خواہ مخواہ ہی مخمصہ جذبات سے مغلوب ہوکر کیتھرین کو اس آپریشن میں شامل کرلیا تھا ورنہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ حمان بلاشبہ نہایت پھرتیلا اور سفاک قاتل تھا۔ اس کا اندازہ مجھے چند لمحے پہلے اس عمارت میں پولیس والے کی لاش پڑی دیکھ کر ہوا تھا۔

وہ ایک بلند عمارت تھی اور اس میں آمدورفت کا ایک ہی دروازہ تھا۔ جس وقت کیتھرین، سیوبک اور دونوں پولیس والے اس عمارت تک پہنچے ہوں گے اس وقت تک حمان اندر ہی ہوگا۔ کیتھرین، سیوبک اور پولیس والے اب ایسے گئے گزرے لوگ بھی نہیں تھے۔ اس کے باوجود وہ ایک پولیس والے کو چھلنی کرکے صاف نکل گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کا تعاقب بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ممکن ہے کیتھرین کو آتشیں ہتھیاروں کے ساتھ ماردھاڑ کا خاصا تجربہ ہو۔ پھر بھی میرے خیال میں اسے یوں منہ اُٹھا کر حمان کے تعاقب میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ ویسے ابھی تو یہ بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ حمان ہی تھا۔

ہمیں کیتھرین اور سیوبک کی تلاش میں زیادہ دور تک نہیں جانا پڑا۔ ابھی ہم فیصلہ کررہے تھے، ہمیں کون سی گلیوں میں داخل ہونا چاہیے کہ کیتھرین اور سیوبک ہمیں ایک ہی گلی کے موڑ پر ایک ساتھ نمودار ہوتے دکھائی دیے۔ ان کی رائفلیں کندھوں پر تھیں اور منہ لٹکے ہوئے تھے۔ انہیں ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مایوس واپس آرہے تھے۔ سیوبک اپنے ہاتھ میں نیلے سے رنگ کے کچھ کپڑے اٹھائے ہوئے تھا۔ کیتھرین کی ڈینم کی جیکٹ کندھے پر سے پھٹی ہوئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ جینز مٹی میں لتھڑی ہوئی تھی۔ سیوبک کا حال کچھ زیادہ خراب نظر نہیں آرہا تھا۔

وہ قریب آن پہنچے تب بھی میں نے کچھ نہ پوچھا۔ منتظر انداز میں خاموش کھڑا رہا۔ بالآخر سیوبک بولا۔ "وہ نکل گیا۔"

"کیا وہ حمان ہی تھا؟" میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکا..... اور اگر دیکھ بھی لیتا تب بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ میں نے اس سے پہلے بھی کبھی اس کی شکل نہیں دیکھی لیکن اس کے بارے میں جو قصے سُنے

ہیں اور جس طرح آج وہ نکلا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حمان ہی تھا۔"

"یہ کیا اُٹھائے لا رہے ہو؟" میں نے اس کے ہاتھ میں موجود کپڑوں کی طرف اشارہ کیا جنہیں وہ کچھ اس طرح لٹکائے ہوئے تھا جیسے دھوبی کے ہاں لے جا رہا ہو۔

"یہ لفٹ بوائے کی وردی ہے۔" سیوبک نے بتایا۔ "وہ اس وردی میں تھا۔ اسی کی وجہ سے ہم ایک لمحے کے لیے دھوکا کھا گئے اور اس کے لیے وہ ایک لمحہ ہی کافی تھا۔ وہ اس احمق پولیس والے کو اُڑا کر نکل گیا جس نے عمارت میں گھسنے میں کچھ زیادہ ہی عجلت دکھائی تھی۔"

پھر وہ کچھ حسرت آمیز نظروں سے یونیفارم کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ مجھے ایک عمارت کی چھت پر پڑا ہوا ملا۔ تبھی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نکل چکا ہے۔ اس یونیفارم کے نیچے وہ یقیناً دوسرے کپڑے پہنے ہوئے ہوگا۔"

"تو اب انہیں اُٹھائے کیوں چلے آرہے ہو؟ ان کی جیبوں میں یقیناً کچھ نہیں ہوگا لیکن تسلی کے لیے ہاتھ مار کر دیکھ لو اور ایک طرف پھینک دو۔" میں نے کہا۔ "یہ کپڑے اب ہمیں حمان کا پتا بتانے سے تو رہے۔"

سیوبک نے چلتے چلتے یونیفارم کی جیبیں کھنگالیں۔ حسبِ توقع ان میں کچھ نہیں تھا۔ وہ بش کوٹ، ٹوپی اور پتلون تینوں چیزیں پھینکنے لگا تھا لیکن سیکیورٹی آفیسر ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ مجھے دے دیجیے۔ تفتیش میں کام آئیں گے۔"

سیوبک نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنی بیزاری چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "دے دو بھئی! لگتا ہے یہاں بھی سرکاری محکموں کو سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے کا شوق ہے۔"

ہم واپس وہاں پہنچے جہاں میں نے چارلس کو چھوڑا تھا۔ وہ دیوار کی آڑ میں پولیس والے کے پاس بیٹھا تھا اور ریڈیو پر مختلف لوگوں کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ اب وہاں کچھ اور لوگ بھی نظر آنے لگے تھے جو مختلف کونے کھدروں سے سہمے سہمے انداز میں جھانک رہے تھے۔ کافی لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہاں کوئی گڑبڑ تھی۔

"میں ذرا اندر سے اس عمارت کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کسی کو اندازہ ہے کہ حمان کون سی منزل پر موجود تھا؟"

"مجھے اندازہ ہے۔" کیتھرین بولی۔ "جب تم کرین پر چڑھ کر ٹنک کی طرف ہاتھ بڑھا رہے تھے اور ہمیں اندازہ ہوا کہ تم پر فائر ہو رہے تھے تو ہم نے دوربین سے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس عمارت کی ایک کھڑکی کے شیشے کے عقب میں کوئی موجود تھا۔ وہ پانچویں منزل کی کھڑکی تھی اور سب سے پہلے میں نے ہی اس پر فائرنگ کی تھی جس کے بعد یہاں سے فائرنگ رُک گئی تھی اور ہم بھاگ کر یہاں آئے تھے۔"

ہم ٹوٹے ہوئے شیشوں کا دروازہ کھول کر اندر پہنچے۔ لابی میں پولیس والے کی لاش اسی طرح اوندھی پڑی تھی۔ ہم لفٹ کی طرف بڑھے تو سیڑھیوں کی آڑ میں مجھے ایک گٹھڑی سی پڑی دکھائی دی۔ میں نے قریب جا کر دیکھا۔ وہ بھی ایک لاش تھی۔

وہ سادہ لباس میں ایک سیکیورٹی آفیسر تھا جسے محض احتیاطاً اس عمارت کے دروازے پر تعینات کیا گیا تھا ورنہ اس عمارت کو تو ان عمارتوں میں شمار ہی نہیں کیا گیا تھا جہاں سے کسی کارروائی کا اندیشہ تھا۔ اس آفیسر کی گردن میں تانبے کا ایک باریک سا تار پیوست تھا۔ اس کی بے نور آنکھیں حلقوں سے اُبل آئی تھیں۔ اس کی لاش کو یقیناً دروازے کے قریب سے کھینچ کر سیڑھیوں کی آڑ میں ڈالا گیا تھا۔ اس آفیسر کے پاس غالباً صرف ایک پسٹل موجود تھا جو اس وقت بھی اس کے قریب ہی پڑا تھا۔

البتہ باوردی پولیس والے کے قریب ایک اوزی گن پڑی تھی جو یقیناً اس کی نہیں تھی۔ وہاں موجود پچاسوں لوگوں میں سے کسی کے پاس اوزی نہیں تھی۔ وہ یقیناً حمان کی تھی جسے وہ فرار ہوتے وقت وہیں پھینک گیا تھا۔

متاسفانہ سی کیفیت میں ہم لوگ لفٹ کے ذریعے پانچویں منزل پر پہنچے۔ ہمیں وہ کھڑکی تلاش نہیں کرنا پڑی جس کے پیچھے ہمارے اندازوں کے مطابق حمان موجود رہا ہوگا۔ لفٹ سے نکلتے ہی ہمیں وہ بڑی سی کھڑکی نظر آگئی۔ اس کے تمام شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ وہ درحقیقت راہداری کی کھڑکی تھی۔ اس وقت اس کے راستے ہوا فرفر اندر آرہی تھی۔

مزید ثبوت ہمیں کھڑکی کے قریب پہنچ کر مل گیا۔ شیشوں کے ٹکڑوں کے قریب ہی ایک ٹیلی اسکوپک رائفل اور کیکیولیٹر سے مشابہ تقریباً ایک بالشت لمبا اور چار انگل چوڑا ایک ڈبا سا پڑا تھا۔ اسی ٹیلی اسکوپک رائفل سے حمان نے مجھ پر فائر کیے ہوں گے۔ یہ محض میری خوش قسمتی تھی کہ میں بال بال بچ گیا تھا۔

حمان کی دلیری اور خود اعتمادی قابلِ رشک تھی کہ جس چیز کی ضرورت جہاں ختم ہوتی نظر آئی تھی اسے وہیں پھینک گیا تھا۔ ٹیلی اسکوپک رائفل اس نے یہاں صرف دور کی فائرنگ کے لیے رکھی ہوگی۔ یہاں سے ہٹتے وقت وہ اسے یہیں چھوڑ گیا تھا۔ نیچے پولیس والے کو اوزی سے چھلنی کرنے کے بعد چونکہ اسے صرف نکل بھاگنے سے دلچسپی رہ گئی تھی اور وہ کسی سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اسے وہیں پھینک گیا تھا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اس کا ٹکراؤ مسلح لوگوں سے تھا۔

ہمارے ہاتھوں پر چونکہ ابھی تک دستانے تھے اس لیے چارلس نے بلا تامل وہ کیکیولیٹر نما ڈبا اُٹھا لیا اور اسے اُلٹتے پلٹتے ہوئے بولا۔ "یہ کیکیولیٹر ہے یا ریموٹ کنٹرول؟"

"آپ کا دوسرا اندازہ صحیح ہوگا۔ میرے حساب سے اسے ریموٹ کنٹرول ہونا چاہیے۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ میں ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے اس دور افتادہ منظر کا جائزہ لے رہا تھا جس کا چند منٹ پہلے تک میں ایک حصہ تھا۔

بغیر دوربین کے بھی وہاں کی چیزیں صاف ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ بس ذرا سائز اصل سے چھوٹے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ ٹین کی چادروں کی لمبی سی دیوار..... لمبے..... مشینری..... دور دیہ سڑک اور وہ کرین جس پر میرا چڑھنا اور اُترنا گویا تختۂ دار پر چڑھنے اور اترنے کے مترادف رہا تھا۔ دوربین کے ذریعے تو ان میں سے ہر چیز کو بہت صاف اور واضح دیکھا جا سکتا تھا۔

میں نے چارلس، کیتھرین اور سیوبک کو کھڑکی کے قریب آنے کا اشارہ کیا پھر بطورِ خاص چارلس کو مخاطب کیا "آپ اس چکر کے بارے میں جاننا چاہ رہے تھے۔ یہاں کھڑے ہو کر سارا چکر زیادہ بہتر طور پر آپ کی سمجھ میں آسکے گا۔"

"کچھ کچھ تو میری سمجھ میں آگیا ہے۔" چارلس بولا۔ "لیکن کچھ کڑیاں نہیں مل رہیں۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ حمان بلا کا شاطر بھی ہے اور چھلاوے کی طرح پھرتیلا بھی۔ اس میں کوئی افسانہ طرازی شامل نہیں ہے۔ اس کا مجھے یقین آگیا۔ اگر ہم اتنے افراد کی صلاحیتیں یکجا نہ ہوتیں تو وہ بہت آسانی سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔"

"بے شک۔ ایک باریک سے نکتے کی وجہ سے تو میں بھی اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا ہوں لیکن نہ جانے کس معجزے کے تحت میری ذہانت اس حد تک بیدار ہوئی کہ اچانک..... عین وقت پر ہی اس کا چکر میری سمجھ میں آگیا۔"

قریب سے ہی کیتھرین نپی آواز میں بولی۔ "میں نے تمہیں خواہ مخواہ ہی تو استاد تسلیم نہیں کیا ہے۔ تم خود بھی ایک غیر معمولی ذہین آدمی ہو لیکن انکساری کی وجہ سے نہ تو اس کا اظہار کرتے ہو اور نہ اس بات کو تسلیم کرتے ہو۔ بہرحال..... یہ بھی کوئی بُری بات نہیں۔"

"میں اسی میں خوش ہوں کہ مجھے جو بھی مسئلہ درپیش ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی طرح میری سمجھ میں آجاتا ہے اور کسی نہ کسی طرح حل بھی ہو جاتا ہے۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ اپنے تجزیے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے کہا پھر بہت دور نظر آنے والی ٹین کی لمبی سی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ "سرمئی دار ٹین کی چادروں سے بنائی گئی اس دیوار کو دیکھ رہے ہیں آپ لوگ؟"

سب نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ "ان میں سے پہلے ٹکڑے پر سفید رنگ کیا گیا ہے، اگر آپ اسے دوربین سے دیکھیں تو لہروں سے قطع نظر وہ ٹکڑا آپ کو سینما کی اسکرین کی طرح دکھائی دے گا۔"

چارلس کے پاس اپنی دوربین ابھی تک موجود تھی۔ کیتھرین اور سیوبک اپنی رائفلوں پر لگی ہوئی دوربینوں کے ذریعے دیکھنے لگے۔ اب سڑک پر دونوں طرف ٹریفک بھی چل رہا تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ائرپورٹ سے آنے والی ٹریفک کو اس دیوار کے سامنے سے گزرنا تھا اور ہر گاڑی سب سے پہلے اس سفید اسکرین کے سامنے سے ہی گزرتی۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں..... اس میں تو کوئی شک نہیں۔" چارلس دوربین آنکھوں سے ہٹائے بغیر بولا۔ "یہ دیوار کمپنی نے ضرور بنائی تھی لیکن اس ایک چادر پر یہ سفید رنگ انہوں نے یقیناً نہیں کیا ہوگا۔ یہ حمان نے یا تو خود کل شام کے بعد کسی وقت کیا ہوگا یا کمپنی کے کسی مزدور وغیرہ کو کچھ دے دلا کر کرایا ہوگا۔ کیونکہ کل صبح جب ہم نے اس جگہ کا معائنہ کیا تو اس چادر پر سفید رنگ نہیں تھا۔"

چارلس نے آنکھوں سے دوربین ہٹا کر اُلجھن آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "کسی نے بھی اس سفید ٹکڑے کی طرف توجہ نہیں دی لیکن یہ صبح سے میری نظر میں کھٹک رہا تھا۔ تاہم میں بھی آخری وقت تک اس کا مصرف نہیں سمجھ سکا لیکن میرے ذہن میں سیوبک کے وہ الفاظ مسلسل گونج رہے تھے کہ حمان دھماکا خیز اشیا کا اسپیشلسٹ اور بہت حسابی کتابی آدمی ہے۔ شاید اسی نکتے نے میری رہنمائی کی۔"

"کس طرح؟" سیوبک نے ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی گرے ونگ کی گاڑی اس سفید اسکرین کے سامنے سے گزرتی ہے تو بہت جی نمایاں اور واضح نظر آتی ہے۔ عام طور پر نہایت اہم سرکاری مہمانوں کو سیاہ رنگ کی چھ دروازوں والی مرسیڈیز میں لایا جاتا ہے۔ لیڈی ڈائنا بھی ایسی ہی گاڑی میں تھیں۔ ٹین کی اس دیوار کے ایک سرے پر یہ سفید اسکرین تھی اور اس سے کچھ پہلے سڑک پر بورڈ لگا ہوا تھا۔ "حدِ رفتار پچاس کلومیٹر فی گھنٹا" حمان کو معلوم تھا کہ وہاں پہنچ کر گاڑیوں کی رفتار اگر عین اس کے مطابق نہیں تو اس کے قریب قریب ضرور ہو جائے گی۔ دیوار کے دوسرے سرے پر بلندی پر کرین کا بُوم تھا جس میں سے اصل ٹنک نکال دیا گیا تھا اور اس کی جگہ ایک اور ٹنک ایک خاص کھانچے میں لٹکایا گیا تھا جو درحقیقت ٹنک نہیں بلکہ ذرا سی ٹھیس لگنے پر پھٹ پڑنے والا تباہ کن بم تھا۔"

"میں سمجھ گئی..." کیتھرین جلدی سے بولی۔ "حمان نے اس دیوار کا فاصلہ ناپ لیا ہوگا۔ اس کے حساب کے مطابق ایک مخصوص رفتار سے آتی ہوئی گاڑی جب اس سفید اسکرین کے سامنے آتی تو وہ یہاں ریموٹ کنٹرول کا بٹن دباتا جس سے وہ ٹنک نما بم اس کھانچے سے نکل جاتا جو ریموٹ کنٹرول سے حرکت کر سکتا تھا۔ جس وقت ٹنک نما بم نیچے پہنچتا عین اس وقت سیاہ مرسیڈیز اس کے نیچے پہنچ چکی ہوتی۔ یعنی ٹنک عین اس مخصوص گاڑی پر ہی گرتا

اور اس کے پرخچے اُڑ جاتے۔ ناکامی کا کوئی امکان نہیں تھا۔"

"بے شک۔" میں نے تائید کی۔ "بلکہ اس بم نے پانی کے ٹینک میں گرنے کے باوجود جتنی تباہی پھیلائی ہے اس سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ اگر حمان کا اندازہ تھوڑا بہت غلط بھی ہو جاتا.... جس کی اس نے یقیناً گنجائش رکھی ہوگی.... تب بھی سیاہ مرسیڈیز کو تو بہرحال تباہ کر ہی دیتا کیونکہ پاس چلتی ہوئی کم از کم تین گاڑیاں اس کی تباہ کاری کی زد میں آئی تھیں۔"

چارلس دم بخود کھڑا تھا۔ بیٹی بہرحال باپ سے زیادہ ذہین تھی۔ وہ باپ سے پہلے بات کو سمجھ گئی تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ "یہ تیاریاں حمان کے لیے زیادہ مشکل بھی ثابت نہیں ہوئی ہوں گی۔ یہ ایک اوپن سائٹ تھی۔ اس نے اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ مجھے یقین ہے کہ کل شام وہ کرین آپریٹر کے روپ میں سائٹ پر پہنچا ہوگا۔ کوئی بعید نہیں ہے اس نے کرین آپریٹر کو غائب بھی کر دیا ہو۔ بعد کی تحقیقات سے ایسی بہت سی باتوں کا صحیح پتا چلے گا۔ بہرحال اس روپ میں وہ اپنی تیاریاں کر کے چلا گیا ہوگا۔ تیاریاں زیادہ لمبی چوڑی بھی نہیں تھیں۔ اس نے اپنے کھڑے ہونے کے لیے بھی اس جگہ سے بہت پیچھے ہٹ کر جگہ منتخب کر لی تھی جہاں زیادہ سختی تھی اور زیادہ سیکیورٹی والے پھیلے ہوئے تھے۔"

چارلس جھرجھری سی لے کر بولا۔ "اور اگر یہ بات بروقت تمہاری سمجھ میں نہ آتی تو اس وقت ٹی وی اور ریڈیو کے بعض چینل نہایت جوش و خروش سے ایک افسوسناک خبر نشر کر رہے ہوتے۔"

"پوری بات تو فوری طور پر میری سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔" میں نے کہا۔ "پہلے تو صرف سفید اسکرین میری نظر میں کھٹکی تھی۔ پھر میں نے دوربین سے کرین کا جائزہ لیتے ہوئے محسوس کیا کہ اس کے ہُک کی ساخت کچھ مختلف اور مشکوک سی تھی۔ یہ ایسی چیزیں تھیں جن تک کسی کا دھیان جانا مشکل ہی تھا۔ ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے بھی لوگ نظرانداز کر جاتے ہیں۔ سیکیورٹی والوں نے دھماکا خیز مادے کی تلاش کے لیے آج بھی آلات کی مدد سے تمام مشینری کو چیک کیا تھا لیکن کرین کے ہُک تک جانے کا کسی کو خیال نہیں آیا تھا۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد چارلس بولا۔ "حمان کی کوشش کو ناکام بنا دینا ہی ہماری بہت بڑی کامیابی ہے۔ ہمارا اصل مقصد تو پورا ہو گیا ہے.... لیکن پھر بھی حمان کے نکل جانے کا بڑا افسوس رہے گا۔ اس کی کسی واردات میں پہلی بار اس کی اپنی موجودگی کے اتنے واضح آثار نظر آئے تھے۔"

ہمارے قریب ہی کھڑا سیکیورٹی آفیسر بولا۔ "سیکرٹ سروس والوں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ جس مکان کی چھت پر مسٹر سیوبک کو لفٹ بوائے کا یونیفارم پڑا ملا تھا اس سے آگے حمان کا سراغ لگانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کا تعاقب جاری رہے گا۔"

"وہ تو محض رسمی کارروائیاں ہوں گی۔" چارلس منہ بنا کر بولا۔ "وہ تو بس آج ہاتھ آ جاتا تو آ جاتا۔ اب اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب دوبارہ اس کے بارے میں کوئی خبر سننے کو ملے۔"

حمان کے نکل جانے کا مجھے بھی افسوس تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ "اگر میں زیادہ ضروری کام پہلے نہ کرتا اور کرین پر چڑھ کر اس بم کو بروقت دور نہ پھینکتا تو شاید میں حمان کے تعاقب میں جا سکتا۔"

کیتھرین بولی۔ "لیکن اگر تم جا کر کرین پر نہ چڑھتے تو حمان کو تم پر فائر کرنے کی بھی ضرورت پیش نہ آتی اور ہم اس کی موجودگی سے ہی آگاہ نہ ہو سکتے۔ وہ تو اپنا کام کر کے خاموشی سے نکل جاتا۔"

"ہاں.... یہ بات تو ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "لیکن اگر کسی بھی طرح اس کے تعاقب کے لیے میں بھی تم دونوں کے ساتھ شریک ہو سکتا تو شاید وہ نکلنے نہ پاتا۔"

سیوبک ناگواری سے میری طرف دیکھتے ہوئے تیکھے لہجے میں بولا۔ "مسٹر چودھری! آپ ہم سب کو یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ میں اور کیتھرین، حمان کا تعاقب کرنے کے اہل نہیں تھے اور ہماری نالائقی کی وجہ سے وہ نکل گیا۔"

"میں تمہیں یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ دو سے تین افراد بہرحال بہتر ہوتے ہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"اب تو مجھے بھی افسوس ہے کہ تم ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ ہم بھی دیکھتے کہ تم کیا تیر چلاتے۔" سیوبک کے لہجے میں پہلے سے زیادہ تیکھا پن جھلک آیا۔

"یہ کیا حماقت ہے!" چارلس نے بزرگانہ انداز میں ہم دونوں کو ڈانٹا۔ "تم نے تو بچوں کی طرح آپس میں اُلجھنا شروع کر دیا۔ اس معاملے میں تم دونوں ہی کا کردار بے حد اہم رہا ہے۔ میں تم دونوں ہی کا بے پناہ شکر گزار ہوں۔ حکومت برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے میں پوری کوشش کروں گا کہ تم دونوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مناسب ترین طریقہ اختیار کیا جا سکے۔"

سیوبک استہزائیہ سے انداز میں بولا۔ "کیا ستم ظریفی ہے! کبھی کبھی حکومتوں کو مجھ جیسے آدمیوں کی خدمات کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے اور وہ ان پر شکر گزاری کا اظہار بھی کرتی ہیں۔"

"ہاں...." چارلس ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "ڈاکے سے بچنے کے لیے کسی ڈاکو کے مشورے ہی زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں نے یہ بات بزرگوں سے سُنی تھی اور یہ کافی حد تک درست بھی ثابت ہوئی۔"

اس کے بعد چارلس نے مختلف رسمی کارروائیاں پوری کیں۔ کچھ خاص خاص لوگوں کو ہدایات دیں۔ بیشتر لوگ وہاں سے رخصت ہو گئے اور چند منٹ بعد ماحول اس طرح معمول پر آ گیا

جیسے وہاں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

چارلس نے مجھے، سیوبک کو اور کیتھرین کو سیدھے گھر جانے کی ہدایت کی۔ اس نے زور دے کر خاص طور پر کہا کہ ہم اِدھر اُدھر نہیں اور جانے کی ہرگز کوشش نہ کریں۔ اسے خود نہ جانے کہاں سفیر کے پاس پہنچنا تھا جس کی طرف سے اسے ریڈیو پر پیغام ملا تھا۔

وہی مرسیڈیز ہمیں لے جانے کے لیے آ گئی جس میں ہم سیوبک کے گاؤں گئے تھے۔ گھر پہنچ کر میں لباس تبدیل کر کے اور تازہ دم ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ کیتھرین ایک بار پھر رازدارانہ سے انداز میں میرے کمرے میں آ گئی۔

دروازہ بند کر کے اس نے خود ہی مقفل کر دیا اور میرے قریب ہی ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے بغیر کسی تمہید کے نیچی آواز میں بولی۔ "تم ایک عجیب ہی آدمی ہو۔ معلوم نہیں کیوں مجھ سے آن ٹکرائے ہو۔"

"اس میں میرے ارادے کو قطعاً دخل نہیں تھا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "ویسے.... بائی دا وے.... اب مجھ سے کیا خطا ہو گئی ہے؟"

"اب جو بات بھی میرے ذہن پر بوجھ بن رہی ہے وہ میں تمہیں بتائے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"اب اس میں میرا کیا قصور؟" میں نے بے بسی سے کہا۔ "بہرحال تمہارے تازہ ترین بوجھ کی نوعیت کیا ہے؟"

"اس کا تعلق تمہاری ذات سے ہی ہے۔" وہ ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "ویسے اب اس کا تذکرہ کرنے کا کوئی خاص فائدہ تو نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے مناسب سمجھا کہ تمہیں آگاہ کر دیا جائے۔ شاید اس سے آگاہ رہنا آئندہ تمہارے لیے مفید ثابت ہو۔ جب تم کرین پر لٹکے ہوئے تھے تو تم پر سائیلنسر لگی رائفل سے فائر ہوا تھا اور خدا کا شکر ہے گولی تمہیں نہیں لگی تھی۔ اس کے باوجود مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم پر گولی چلائی گئی ہے اور فوراً ہی میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ گولی کس عمارت کی کھڑکی سے چلائی گئی ہے حالانکہ مجھے ان معاملات میں اپنے بارے میں زیادہ خوش فہمی نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں کوئی عام لڑکی نہیں ہوں لیکن میرا خیال ہے میں تمہاری یا سیوبک کی برابری نہیں کر سکتی۔ اس کے باوجود سیوبک نے اس وقت ہم سب کو مس گائیڈ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ایک اور عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ فائرنگ وہاں سے شروع ہوئی ہے۔ اس نے خود بھی بلاوجہ اسی سمت میں فائرنگ شروع کر دی تھی۔ پاپا اور سیکیورٹی والے بھی اُدھر ہی متوجہ ہو گئے تھے۔ جتنی دیر میں انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا اتنی دیر میں تمہارا کام تمام ہو سکتا تھا۔"

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "یعنی صرف تم اکیلی اصل عمارت کی طرف متوجہ رہی تھیں اور تم نے ہی اس کھڑکی پر فائرنگ کرکے مجھ پر ہونے والی فائرنگ کو روکا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے میں جو اس وقت زندہ سلامت بیٹھا نظر آ رہا ہوں، خدا کے کرم کے علاوہ اس کا ایک سبب تم ہو؟"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں تم پر احسان جتانے نہیں آئی ہوں۔ میں تو صرف اس حیرت کا اظہار کرنے آئی ہوں کہ آخر سیوبک کی اس حرکت کا کیا مقصد ہو سکتا تھا؟"

"شاید وہ بے چارہ تمہارے معاملے میں مجھے اپنا رقیب سمجھ رہا ہو اور یہ اس نے مجھے راستے سے ہٹانے کا بہترین طریقہ سوچا ہو۔ اس طرح میرا کام بھی تمام ہو جاتا اور اس پر کوئی الزام بھی نہ آتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس بے چارے کو کیا معلوم کہ تم تو مجھ سے جان چھڑانے کا بہانہ تلاش کرتے پھر رہے ہو۔" کیتھرین منہ بنا کر بولی۔ "بہرحال دوسری اہم بات یہ ہے کہ جب ہم اس شخص کے تعاقب میں دوڑے جسے ہم حمان سمجھ رہے تھے تو سیوبک اس گلی میں گھسا جس میں ہم نے اسے غائب ہوتے دیکھا تھا اور مجھے اس نے عقبی گلی میں جانے کا حکم دیا کہ کہیں حمان اُدھر سے نہ نکل جائے۔ آگے سے وہ گلی بند تھی۔ اس لیے اس طرف سے اس کے فرار ہونے کا امکان ذرا کم ہی تھا۔ میں بے وقوفوں کی طرح پچھلی گلی میں دوڑی پھرتی رہی۔ مجھے حمان کہیں سے فرار ہوتا دکھائی نہیں دیا۔ البتہ چند لمحے بعد سیوبک صاحب ایک مکان کی چھت سے پچھلی گلی میں کودے اور انہوں نے لفٹ بوائے والا وہ یونیفارم ہوا میں لہراتے ہوئے مجھے مطلع کیا کہ محترم حمان صاحب فرار ہو گئے ہیں اور محترم سیوبک صاحب ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"کیا یہ عین ممکن نہیں کہ جس طرح اس نے حمان کو موقع دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس وقت تمہیں شوٹ کرنے میں کامیاب ہو جائے جب تم کرین پر لٹکے ہوئے تھے.... اسی طرح اس نے مجھے ٹرخا کر حمان کو نکل بھاگنے کا موقع بھی دے دیا ہو؟"

کیتھرین بولی۔

"اگر تمہارا یہ خیال درست ہو تو تم اس سے کیا نتیجہ اخذ کرو گی؟"

"یہی کہ لیڈی ڈانا پر حملے کی سازش میں وہ بھی شریک تھا لیکن ہماری نظر میں نیک نام بننے اور ہماری تیاریوں کی خبر رکھنے کے لیے ہمارے ساتھ آن ملا تھا۔" وہ قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ بولی۔

میں خاموش رہا تو وہ زور دے کر بولی۔ "پاپا نے سیوبک پر اعتبار کر لیا ہے لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ایک انٹرنیشنل قسم کے قاتل کو ہم سے یا ہماری حکومت سے کوئی ہمدردی ہو سکتی ہے۔"

"پہلے شاید نہ رہی ہو۔ تمہیں دیکھنے کے بعد ہو گئی ہو۔" میں

نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں پھر بے وقت مذاق سوجھ رہا ہے۔ اس نے جس وقت ہمارے سفارت خانے کو اس سلسلے میں خط لکھا تھا اس وقت تک شاید اس نے خواب میں بھی مجھے نہ دیکھا ہو۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"خوابوں کی بات مت کرو۔ تمہیں کیا معلوم کہ اس کے خوابوں میں کیا کچھ آتا ہو اور کون کون آتا ہو۔" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لیے تم غیر سنجیدگی چھوڑو۔" کیتھرین گویا عاجز آکر بولی۔ "میں ایک گہری سازش کی بو سونگھ رہی ہوں اور تم میری بات پر کان ہی نہیں دھر رہے۔"

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" میں نے تاسف زدہ لہجے میں کہا۔ "اچھی بھلی بے فکری سے گھوما کرتی تھیں۔ نہایت منافع بخش دھندے کیا کرتی تھیں۔ یکدم ہی گہری اور بین الاقوامی سازشوں کی بو سونگھنے کے چکر میں پڑ گئیں۔ خدا تمہارے حال پر رحم کرے۔ ادھر میرا یہ حال ہے کہ مجھے کسی بھی قسم کی سازشوں وغیرہ سے... فی الحال کوئی دلچسپی نہیں۔ کیونکہ کچھ سازشوں نے مجھے خود گھن چکر بنایا ہوا ہے لیکن فرض کرو میں سنجیدہ ہو بھی جاتا ہوں تو اب اس سے کیا حاصل ہوگا؟ سانپ تو نکل چکا ہے اب لکیر پیٹنے کا کیا فائدہ؟"

"ایک سانپ نکل چکا ہے۔" اس نے گویا تصحیح کی۔ "دوسرا سانپ شاید ابھی ہماری آستین میں ہی ہو۔ سیوبک ابھی ہمارے ساتھ ہی ہے۔ مجھے تو یہ بھی کسی سانپ سے کم نہیں لگتا۔"

"کافی ہینڈسم سانپ ہے۔" میں نے سہلایا۔ اس نے مجھے گھورا تو میں نے جلدی سے کہا۔ "تمہیں اندیشہ ہے کہ سازش کی کوئی کڑی ابھی باقی ہے؟"

"ہاں۔" وہ زور دے کر بولی۔ "میں تم سے یہی کہنا چاہتی تھی کہ ابھی تم بے فکر نہ ہو جانا۔ ہوشیار رہنا۔"

"اُف خدایا!" میں نے بڑبڑانے کے سے انداز میں کہا۔ "میں کس کس کی طرف سے ہوشیار رہوں۔ اچھا... فرض کرو وہ اس سازش میں شریک بھی تھا تو اسے کیا ملا؟"

"ملا تو اس لیے نہیں کہ ان کی سازش ناکام ہو گئی۔ پھر بھی... کم از کم یہ فائدہ تو ہوا ہے کہ سیوبک ہماری گڈ بکس میں آگیا۔ ایک اجرتی قاتل ہوتے ہوئے بھی وہ میرے پاپا جیسے بارسوخ برطانوی کا دوست بن گیا۔ اگر سازش کامیاب ہو جاتی تب بھی وہ ہماری گڈ بکس میں ہی رہتا۔"

"تمہارے ذہن میں یہ خیال کیوں بیٹھ گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ان دو باتوں کی وجہ سے جو میں نے تمہیں بتائی ہیں۔ ایک تو سیوبک کا تمہیں موانے کی کوشش کرنا۔ پھر مشکوک انداز میں آکر ہمیں حمان کے فرار کی خبر سنانا۔" کیتھرین پُر اعتماد لہجے میں بولی۔

"قاتل، قاتل کا بھائی ہوتا ہے۔ آج کل شرفا میں انتشار پایا جاتا ہے اور قاتلوں میں بڑا اتحاد دیکھنے میں آتا ہے۔ شاید انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ اتحاد میں ہی ان کی بقا ہے۔ ممکن ہے سیوبک اور حمان نے اس مہم کے سلسلے میں دو نفری یونین بنالی ہو۔"

"تم اس سلسلے میں میری رائے جاننا چاہتی ہو؟"

"ظاہر ہے... اور میں کس لیے اتنی بک بک کر رہی ہوں؟"

"میری رائے یہ ہے کہ تمہاری رائے کچھ زیادہ صحیح نہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"آج کی دنیا میں ہر انسان دوسرے انسان سے یہی کہتا پایا جاتا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"تم نے میری رائے مانگی تھی سو میں نے دے دی۔" میں نے کندھے اُچکا کر کہا۔ "میرا خیال ہے سیوبک ہمیں یہ اطلاع دینے میں تو مخلص تھا کہ لیڈی ڈائنا پر قاتلانہ حملہ ہونے والا ہے۔ اس کے بعد جب ہم لوگ اس کے گاؤں گئے اور وہ ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہوا اس وقت تک بھی اس کی نیت میں کوئی خاص خرابی نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ تمہاری شخصیت اور صلاحیتوں سے متاثر ہو کر تم پر عاشق ہو چکا تھا لیکن تم چونکہ جواباً اس کی طرف التفات کا مظاہرہ نہیں کر رہی تھیں چنانچہ اس نے فرض کر لیا کہ اس کی وجہ میں ہوں۔ جوں ہی اس نے موقع دیکھا کہ مجھے راستے سے ہٹایا جا سکتا ہے' اس نے اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ اس پر کوئی الزام بھی نہیں آسکتا تھا۔ میرے خیال میں تو معاملہ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

اس نے میری رائے سے کچھ زیادہ اتفاق نہیں کیا اور اصرار کرتی رہی کہ میں سیوبک کی طرف سے ہوشیار رہوں۔ آخر میں نے جھنجلا کر کہا۔ "میں اس قسم کے لوگوں کی طرف سے ہوشیار تو رہتا ہی ہوں لیکن اگر تمہاری نصیحت اور تاکید اسی طرح جاری رہی تو میں ابھی جا کر اس کی گردن توڑ دوں گا تاکہ یہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔"

"اس کی گردن توڑنا اتنا آسان نہیں ہوگا' یہ مجھے معلوم ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"تم خواہ مخواہ مجھے کسی شریف آدمی کے قتل پر مت اُکساؤ۔"

"شریف آدمی.....؟" وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بے آواز طریقے سے ہنسنے لگی۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے گویا بُرا مناتے ہوئے کہا۔ "اتنی شرافت اور شائستگی سے عشق کرنے والے میرے خیال میں شریف آدمی ہی ہوتے ہیں۔"

"تو پھر تم خود کیوں "شریف آدمی" بننے کی کوشش نہیں کرتے؟" وہ شریر نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں ابھی شرافت کے اس درجۂ کمال کو نہیں پہنچا کہ ایک بیوی اور دنیا کے مختلف ممالک میں کئی داشتائیں رکھنے کے بعد بھی تم جیسی کسی لڑکی سے نہایت سنجیدگی سے عشق کرنے لگوں۔" میں نے مسکین سی شکل بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے باتوں میں بہلانے کی کوشش کرتے ہو۔ مجھے لگتا ہے اصل چکر کچھ اور ہے۔ شاید تم پہلے ہی سے کسی کے عشق میں گرفتار ہو اور خالص مشرقی انداز میں اس عشق کی "لاج" رکھ رہے ہو۔ کوشش کر رہے ہو کہ کسی اور کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔" پھر وہ رازدارانہ سے انداز میں میری طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "سچ سچ بتا دو..... کیا وہ لڑکی بہت خوبصورت ہے جس سے تمہارے عہد و پیماں چل رہے ہیں؟"

"کون سی لڑکی؟ کیسے عہد و پیماں؟ کیوں دل کے زخموں کو چھیڑتی ہو۔ اپنی ایسی قسمت کہاں کہ کسی خوبصورت لڑکی سے عہد و پیماں ہوں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اُفی! تم اوّل درجے کے بدمعاش اور جھوٹے ہو۔" وہ مجھ سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"تعریف کا شکریہ..... لیکن میرا خیال ہے میں ابھی اس بلند مقام کو نہیں پہنچا۔" میں نے انکساری سے کہا۔

دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔ کیتھرین نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ چارلس بریف کیس ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ یہ حضرت بھی عجیب ہی بزرگوار تھے۔ موصوف جہاں کہیں بھی ہوتے تھے' غالباً انہیں احساس ہو جاتا تھا کہ ان کی بیٹی پر رومانوی جذبات غالب پا رہے ہیں اور وہ مجھ پر مہربان ہونے لگی ہے۔ وہ فوراً مجھے اس کے حسین "شر" سے بچانے کے لیے پہنچ جاتے تھے۔ میں سچ مچ ان کا شکر گزار تھا۔

چارلس ہیٹ اُتار کر' بریف کیس ایک طرف رکھ کر دھم سے کاؤچ پر گرتے ہوئے بولا۔ "میں جب راہداری میں داخل ہوا تو میں نے ایک سایہ اگلے کسی کمرے کی طرف غائب ہوتے دیکھا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ اس کمرے کے دروازے پر کی ہول پر جھکا ہوا تھا۔"

"وہ سیوبک کے علاوہ بھلا کون ہو سکتا ہے۔" کیتھرین فوراً بولی۔ "اس فلور پر ہمارے علاوہ صرف وہی مقیم ہے لیکن یہاں آنے سے پہلے میں نے کی ہول کے ذریعے اس کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تھا۔ اس وقت وہ سو رہا تھا۔"

"ہو سکتا ہے اسے پہلے ہی معلوم ہو گیا ہو کہ کوئی اس کے کمرے میں جھانکنے والا ہے۔ اس کی تسلی کے لیے وہ جلدی سے اسٹیج سجا کر سونے کا ڈراما کرنے لگا ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ اس فلور پر سب ایک دوسرے کے کمروں میں جھانکتے پھر رہے ہیں۔ آخر پرائیویسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

کیتھرین نے مجھے گھورا۔ چارلس کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ "ہاں' ویسے بھی ہم چاروں اب ایک دوسرے کے

ساتھی بن چکے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہیں رہنا چاہیے۔"

"آپ کی بیٹی کے خیالات سیوبک کے بارے میں بہت مختلف ہیں۔" میں نے کیتھرین کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ مجھے احساس تھا کہ وہ مجھے گھور رہی تھی۔ "اس کا خیال ہے کہ سیوبک بھی حمان کا ساتھی ہو سکتا ہے..."

میں نے اسے وہ تمام گفتگو سُنا دی جو میرے اور کیتھرین کے درمیان ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ اس سلسلے میں اپنی رائے بھی بے تکلفی سے ظاہر کر دی۔ چارلس نے اس کا قطعاً برا نہیں منایا بلکہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے تمہاری رائے درست معلوم ہوتی ہے۔ وہ شادی شدہ سہی، کتنی ہی عورتوں سے اس کا واسطہ سہی... لیکن بہرحال انسان ہے، مرد ہے.... کیتھرین پر کوئی بھی مرد عاشق ہو سکتا ہے....."

چارلس نہایت اطمینان سے بیٹی کے بارے میں اظہارِ خیال کر رہا تھا۔ اسے گویا اپنی بیٹی کی شخصیت کے اس کشش انگیز پہلو پر فخر تھا کہ اس پر کوئی بھی مرد عاشق ہو سکتا تھا۔ اس نے تو شاید مجھے بھی اپنی صاحبزادی کے عاشقوں میں شمار کر لیا تھا۔ فی الحال میں نے اس کی یہ غلط فہمی دور کرنا ضروری نہیں سمجھا کیونکہ اس نے میرے بارے میں ابھی کوئی اظہارِ خیال نہیں کیا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "بہرحال میں اس بات کو بُرا نہیں سمجھتا اور نہ ہی فی الحال اسے اہمیت دینے کے لیے تیار ہوں۔ وہ گاؤں واپس جائے گا یا کسی نئے "کنٹریکٹ" میں مصروف ہو جائے گا تو سب کچھ بھول جائے گا۔" اس کے لہجے میں گویا تجربہ بول رہا تھا اور وہ اپنی جگہ نہایت مطمئن نظر آ رہا تھا۔

پھر وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔ "میں تو اس وقت سیوبک سے ہی بات کرنے جا رہا ہوں۔ عملی طور پر اس کا کچھ شکریہ ادا کرنا ہے۔ میں اس لیے راستے میں رک گیا تھا کہ تم دونوں کو بھی ساتھ لے لوں۔"

میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں چارلس مجھے ساتھ لے جانے پر تُلا ہوا تھا۔ کیتھرین بھی ساتھ جانے کی کچھ ایسی زیادہ خواہشمند معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن ہم دونوں ہی کو جانا پڑا۔ ہم دُم چھلّوں کی طرح اس کے ساتھ ہو لیے۔

چارلس کی دستک کے جواب میں سیوبک نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا گویا وہ سوتے سے اٹھا ہو۔ کیتھرین نے یوں میری طرف دیکھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی ہو... "ذرا دیکھو تو... خبیث کیسی ایکٹنگ کر رہا ہے!"

چارلس نے اس سے معذرت کی کہ وہ اس کے آرام میں مخل ہوا تھا پھر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا "لیکن میرے پاس وقت کم ہے اور کام بہت سے نمٹانے ہیں اس لیے میں چلا آیا۔"

"کوئی بات نہیں۔" سیوبک ذرا خشک لہجے میں بولا۔ اس کی آواز میں واقعی غنودگی کی جھلک نہیں تھی۔ اندر پہنچ کر چارلس نے بڑی احتیاط سے دروازہ بند کر دیا۔

ہم تینوں بیٹھ چکے تو چارلس بریف کیس گھٹنوں پر رکھتے ہوئے بولا۔ "سیوبک! میں بلا تمہید بات کروں گا۔ میں غیر رسمی طور پر اپنی حکومت کی طرف سے تمہارا شکر گزار ہوں۔ تم نے نہ صرف ہمیں خبردار کیا بلکہ لیڈی ڈانکا کے قتل کی سازش کو ناکام بنانے میں عملی طور پر ہمارے ساتھ شریک رہے۔ تم نے دو ملین پاؤنڈ کی رقم کو بھی ٹھکرایا۔ یعنی مالی طور پر بھی ایک بڑا نقصان برداشت کیا۔ ہم صحیح طور پر تو تمہارے اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتے لیکن تمہارے نقصان کی کچھ نہ کچھ تلافی کی کوشش کر سکتے ہیں۔"

سیوبک بیڈ کے کنارے پر بیٹھا ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی ڈھیلی ڈھالی شرٹ کا گریبان کھلا تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ نہایت مضبوط ورزشی جسم کا مالک تھا مگر خاصا دبلا اور ہلکا پھلکا نظر آتا تھا۔

چارلس نے بریف کیس کھولا اور میں ذرا چونکا۔ بریف کیس برطانوی کرنسی نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ چارلس بریف کیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میں یہ ایک ملین پاؤنڈ کی رقم تمہاری خدمت میں پیش کرتا ہوں۔"

سیوبک کے سپاٹ چہرے پر کوئی تاثر نہ اُبھرا اور نہ ہی اس نے بریف کیس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ایک لمحے کے لیے کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ چارلس بریف کیس کچھ اور آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ لے لو نا....."

سیوبک کچھ بدلے بدلے اور مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ "محترم چارلس! مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے آپ واپس رکھ لیں۔ البتہ اس کے بجائے اگر آپ مجھے کچھ اور عنایت فرما سکیں تو میں تا زندگی آپ کا شکر گزار رہوں گا۔"

"وہ کیا؟" چارلس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"آپ اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں۔ میں محترمہ کیتھرین صاحبہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ مؤدبانہ تھا اور وہ حد سے زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ چارلس گویا بھونچکا سا رہ گیا تھا اور ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ میں نے پوری پوری کوشش کی کہ کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کروں اور دوسروں کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہوں۔ کیتھرین کے چہرے پر مجھے معمول سے کچھ زیادہ سرخی نمودار ہوتی دکھائی دی۔

آخر چارلس بولا۔ "تم واقعی سنجیدہ ہو یا یہ کسی قسم کا مذاق ہے؟ کوئی ڈراما وغیرہ بول رہے ہو؟"

"آپ اسے مذاق سمجھ رہے ہیں؟" سیوبک گویا گہری تکلیف محسوس کرتے ہوئے بولا۔ "میں زندگی میں کبھی اس سے زیادہ سنجیدہ نہیں ہوا۔ بلکہ میں سوچ رہا ہوں کہ زیادہ سنجیدگی کے اظہار کے

لیے خالص اپنے قبائلی انداز میں آپ سے درخواست کروں۔"

وہ بیڈ سے اُتر آیا اور کچھ اس طرح ایک گھٹنے کے بل بیٹھ گیا جس طرح پُرانے رومن درباری اپنے شہنشاہ کو سلام کرنے کے لیے بیٹھتے تھے۔ اس نے چارلس کے ہاتھوں سے بریف کیس لے کر بند کر کے اسی کے پاس رکھ دیا اور نہایت احترام سے سر جھکاتے ہوئے پہلے چارلس کے دونوں پاؤں چھوئے۔ پھر اس کا ایک ہاتھ تھام کر دونوں آنکھوں سے لگا کر چوما اور اسی ہاتھ کو اپنے سینے سے لگا کر سر جھکاتے ہوئے نہایت عاجزانہ لہجے میں بولا۔ "محترم چارلس! میں اپنی درخواست دُہراتا ہوں اور آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی بیٹی کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ اسے تمام نعمتیں اور آسائشیں بہم پہنچانے کے لیے جدوجہد کروں گا۔"

پھر وہ ذرا سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ "ہمارے قبیلے میں بڑے سے بڑا آدمی اس طرح کسی کی بیٹی سے شادی کی درخواست کرتا ہے۔ میں نے اپنے قبیلے کی یہ ابتدائی رسم ادا کر دی ہے۔ اب آپ مجھے کوئی وقت دے دیں تاکہ میں اپنے قبیلے کے دو تین بزرگوں کو لے کر آ جاؤں اور ایک باضابطہ ملاقات میں شادی کی تاریخ طے پا جائے۔"

چارلس تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "مجھے تم سے اس مسخرے پن کی توقع نہیں تھی سیوبک! ہم نہایت سنجیدہ ماحول میں نہایت سنجیدہ موضوع پر بات کر رہے تھے۔"

سیوبک کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اسے گویا چارلس کے الفاظ سے ایک بار پھر سخت صدمہ پہنچا تھا۔ وہ نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "مسٹر چارلس! ہم جب قبائلی انداز میں کوئی بات کرتے ہیں اور قبائلی انداز میں کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو ہم بے حد سنجیدہ ہوتے ہیں۔ آپ اسے کوئی معمولی یا مذاق کی بات نہ سمجھیں کہ ایک قبیلے کا سردار..... اور وہ بھی سیوبک جیسا سردار آپ کی بیٹی سے محض دوستی یا وقت گزاری کا نہیں، بلکہ شادی کا خواہشمند ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس "اعزاز" کے ذکر پر کیتھرین کے چہرے کی سرخی بڑھ گئی لیکن اس نے اب بھی گفتگو میں کوئی مداخلت نہ کی۔ شاید فی الحال باپ ہی اس کے جذبات کی صحیح ترجمانی کر رہا تھا۔

چارلس اب گویا واقعی سیوبک کے لہجے کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن تم تو پہلے ہی سے شادی شدہ ہو اور کئی ملکوں میں تمہاری داشتائیں بھی موجود ہیں۔"

سیوبک کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے کھنچاؤ سا آ گیا اور وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔ "داشتاؤں کی اس وقت کوئی بات نہیں ہو رہی۔ اس وقت صرف شادی کی بات ہو رہی ہے اس لیے تم صرف بیوی کا تذکرہ کر سکتے ہو۔ تمہیں میری پہلی بیوی کی موجودگی پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے کیونکہ....."

جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے اپنی ڈھیلی ڈھالی قمیص اور پتلون کی جیبیں ٹٹولیں اور بالآخر مڑا تڑا سا ایک کاغذ نکال کر چارلس کی طرف بڑھا دیا۔ چارلس نے ہچکچاتے ہوئے کاغذ ہاتھ میں لیا اور اسے کھول کر دیکھا۔ اس پر کسی ایسی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا جو میرے لیے بھی ناقابلِ فہم تھی۔

"یہ کیا ہے؟" چارلس نے اُکھڑے اُکھڑے سے لہجے میں پوچھا۔

"میری پہلی بیوی کی طرف سے شادی کا اجازت نامہ۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "اس نے مجھے لکھ کر دے رکھا ہے کہ میں جب چاہوں، جہاں چاہوں اور جتنی چاہوں شادیاں کر سکتا ہوں، اسے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"بہت خوب۔ بہت خوب۔" چارلس زہریلے لہجے میں بولا لیکن وہ کچھ ایسی نظروں سے سیوبک کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے اب بھی اُمید تھی کہ سیوبک کسی بھی لمحے کہہ دے گا، وہ تو مذاق کر رہا تھا لیکن چارلس کی یہ اُمید پوری نہ ہو سکی۔ سیوبک نہایت سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا گویا اس کے جواب کا منتظر ہو۔

آخر چارلس گہری سانس لے کر بولا۔ "بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم نے اپنی پہلی بیوی سے آئندہ شادیوں کی پیشگی اجازت لے رکھی ہے اور اس کی طرف سے "این او سی" ہر وقت جیب میں لیے پھرتے ہو۔ مجھے اُمید ہے کہ تم آئندہ جو شادی کرو گے اس بیوی کی طرف سے بھی اس قسم کا اجازت نامہ ہر وقت تمہاری جیب میں پڑا رہا کرے گا۔ یہ سلسلہ غالباً تمہارے مرنے یا انتہائی ضعیف اور عمر رسیدہ ہو جانے تک چلتا رہے گا۔"

وہ بے پروائی سے کندھے اُچکاتے ہوئے بولا۔ "اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ اگر حالات اجازت دیتے ہوں یا حالات کا تقاضا ہو اور انسان افورڈ بھی کر سکتا ہو تو اسے ایک سے زیادہ شادیاں کر لینی چاہئیں۔"

"لیکن ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا سیوبک!" چارلس ذرا سخت لہجے میں بولا۔ "ہمارے ہاں نہ تو کوئی لڑکی پہلی بیوی کی موجودگی میں کسی مرد کی دوسری بیوی بننا پسند کرتی ہے اور نہ ہی قانوناً ایسا ہوتا ہے۔ اس لیے تم اس احمقانہ بحث کو یہیں ختم کر دو۔"

"تمہارے ہاں تو لڑکیاں بغیر شادی کے بھی مردوں کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ غالباً تیس چالیس فیصد جوڑے اسی طرح رہ رہے ہیں۔" سیوبک چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"بات شادی کی ہو رہی ہے اس لیے صرف شادی کے قوانین کا ذکر کرو۔" چارلس نے اسی لہجے میں کہا جس میں چند لمحے پہلے سیوبک نے بات کی تھی۔

"اگر تم چاہو تو میں اپنی پہلی بیوی کو طلاق بھی دے سکتا ہوں۔" سیوبک ملائمت سے بولا۔

"یہ اور بھی بُری بات ہو گی۔" چارلس بولا۔

"تم اپنی بیٹی سے تو کچھ پوچھ ہی نہیں رہے۔ خود ہی گفتگو کیے جا رہے ہو۔" سیوبک، کیتھرین کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"میں اس لیے خود ہی ساری گفتگو کیے جا رہا ہوں کہ کیتھرین سے تمہیں کہیں اور زیادہ سخت و ناگوار جواب سننے کو نہ ملے۔ میں تو پھر بھی بڑی عمر کا ایک جہاندیدہ آدمی ہوں۔ تحمل مزاجی کا مظاہرہ کر سکتا ہوں لیکن کیتھرین....." اس نے ٹھنڈی سانس لے کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"پھر بھی..... ہمیں محترمہ کیتھرین سے ان کی مرضی تو معلوم کر لینی چاہیے۔" سیوبک ایک بار پھر بڑے مؤدبانہ لہجے میں بولا اور اتنی دیر میں اس نے پہلی مرتبہ کیتھرین کی طرف دیکھا۔ اس کی سنجیدگی میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ "آپ کیا کہتی ہیں محترمہ کیتھرین؟"

"میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں تمہیں زبان کے بجائے ہاتھ..... بلکہ لات سے جواب دوں۔" کیتھرین گہری سانس لے کر بولی۔ "اگر تم بُرا نہ مناؤ تو میں تمہارے منہ پر ایک لات رسید کر دوں؟ مجھے اُمید ہے یہ خاصا تسلی بخش جواب ثابت ہوگا۔"

سیوبک کی رنگت متغیر ہوگئی۔ وہ گویا بڑی مشکل سے خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔ "آپ کو محتاط انداز میں بات کرنی چاہیے محترمہ کیتھرین! میں فی الحال اپنے قبیلے کے رسوم و رواج کے مطابق آپ سے بات کر رہا ہوں۔"

"بات تو میں احتیاط سے ہی کر رہی ہوں۔ البتہ لات کے استعمال میں شاید میں زیادہ احتیاط نہ کروں۔" کیتھرین اسے صحیح معنوں میں خار دلانے والے انداز میں بولی۔

اب سیوبک میری طرف دیکھتے ہوئے شائستگی سے بولا۔ "کیا اس خاتون کے جارحانہ رویے کی وجہ تم ہو؟ کیا اس کے ساتھ تمہارا کوئی معاملہ چل رہا ہے؟ کیا شادی وغیرہ کا وعدہ ہو چکا ہے؟"

"اپنی ایسی قسمت کہاں کہ کوئی حسین لڑکی ہم سے شادی یا وغیرہ وغیرہ کرے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ویسے یہ پہلا اور آخری موقع ہے کہ میں اپنی نجی زندگی کے بارے میں کسی سوال کا جواب دے رہا ہوں۔ وہ بھی محض اس لیے کہ تمہیں کافی ذلیل ہوتے دیکھ کر مجھے ترس آگیا ہے۔ براہِ کرم آئندہ مجھ سے میرے نجی معاملات کے بارے میں کوئی سوال نہ کرنا۔"

میرے اہانت آمیز لہجے کے باوجود محض میری زبانی یہ سُن کر سیوبک کے چہرے پر کچھ طمانیت جھلک آئی کہ کیتھرین مجھ پر مہربان نہیں تھی۔ کیتھرین ترحم آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم نے خواہ مخواہ بے چارے افضل چوہدری کو اپنا رقیب سمجھتے ہوئے مروانے کی کوشش کی تھی۔ تم پہلے ہی ہم سے پوچھ لیتے۔"

"تمہیں شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ نرمی سے بولا۔ "اگر میں افضل چوہدری کو مارنے یا مروانے کا ارادہ کروں گا تو پھر یہ اس طرح بیٹھا ہمارے ساتھ باتیں کرتا نظر نہیں آئے گا۔ اس کی گفت و شنید پھر عالمِ بالا پر روحوں سے ہی ہوگی۔" اس کا لہجہ نرم تھا مگر اس میں تکبر بول رہا تھا۔

متکبر لوگوں پر مجھے رحم آنے لگتا تھا۔ پہلے تو میرا اسے کوئی بھی جواب دینے کو جی نہ چاہا لیکن پھر میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔ "یہ بات میں پہلے بھی کئی لوگوں سے سُن چکا ہوں۔ میں تو اسی دنیا میں موجود ہوں لیکن ان کی شاید ہڈیاں بھی گل چکی ہوں۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور چارلس کی طرف دیکھ کر اُٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے افسوس ہے ہماری گفتگو کسی نتیجہ خیز موڑ پر پہنچتی نظر نہیں آرہی۔ اس کے باوجود میں کل اپنے قبیلے کے تین چار بزرگوں اور تین چار دوسرے لوگوں کے ساتھ ... یہاں آؤں گا۔ ہم ذرا مختلف ماحول میں بیٹھ کر بات کریں گے۔ شاید تم یا کیتھرین خود اپنی رائے بدل لو۔"

وہ اپنے کپڑے اور دو چار دوسری چیزیں ٹریولنگ بیگ میں ڈالنے لگا۔ اس کے لہجے میں ایک نہایت ہی ملائم سی دھمکی پنہاں تھی لیکن چارلس شاید اس پر دھیان دیے بغیر دوستانہ ہی لہجے میں بولا۔ "کیا تم گاؤں واپس جا رہے ہو؟"

"ہاں۔" سیوبک نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" چارلس بولا۔ "تمہارا آج جانے کا پروگرام تو نہیں تھا۔"

"میں نے پروگرام بدل لیا ہے۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "میرے یہاں بے کار پڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ سرِ حال..... کل تم سے پھر ملاقات ہوگی۔"

"اگر کل بھی تم یہی باتیں کرنے کے لیے ملاقات کرنا چاہتے ہو تو میرے خیال میں تم خواہ مخواہ ہی ان نامعلوم بزرگوں اور دیگر لوگوں کو تکلیف دو گے۔ میرا جواب کل بھی یہی ہوگا۔ تمہیں معلوم ہے ہم مغربی لوگوں کے ہاں ویسے بھی اولاد کے بالغ ہونے کے بعد والدین کو ان پر کوئی اختیار نہیں رہتا۔ اگر کیتھرین راضی ہوتی تو میری ہاں یا نہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مجھے تم کو یہ سب باتیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی گوشہ تمہارے لیے اجنبی نہیں ہے۔ ہر جگہ کے قوانین اور رسوم و رواج کے بارے میں تم جانتے ہو۔" چارلس کا انداز اب بھی سمجھانے والا اور صلح جویانہ تھا۔

"وہ سب اپنی جگہ ٹھیک ہے..... سب کچھ مجھے معلوم ہے لیکن میں ایک کام سنجیدگی سے کرنا چاہتا ہوں۔ شادی بیاہ کا معاملہ ہمارے ہاں قبائلی طریقے سے ہی طے ہوتا ہے۔ سو میں اپنی رسمی کارروائی پوری کر رہا ہوں۔ تمہیں فیصلہ کرنے کا اختیار دے رہا ہوں۔ ورنہ یوں تو دنیا کے باقی معاملات ہم دنیا کے طور طریقوں کے مطابق کرتے ہی رہتے ہیں۔"

وہ گویا کچھ اس قسم کی بات کر رہا تھا کہ فی الحال تو وہ سیدھی

انگلیوں سے گھی نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چارلس اور کیتھرین کی بھلائی اسی میں تھی کہ اسی دوران اس کی بات مان لی جاتی ورنہ پھر وہ کوئی اور طریقہ آزمائے گا۔ اگر کیتھرین اس کے قبائلی یا "سنجیدہ" طریقے کے مطابق شادی پر آمادہ نہ ہوئی، کسی اور طرح بھی اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے اس کے "محرم" میں داخل ہونے کے لیے تیار نہ ہوئی تو پھر وہ کوئی اور تدبیر کرے گا۔ کم از کم مجھے تو اس کا مفہوم یہی محسوس ہوا۔

چارلس اگر اس کے اس مفہوم کو پہنچ بھی گیا تھا تب بھی اس نے گویا اسے کوئی اہمیت نہ دی اور دوستانہ ہی لہجے میں بولا۔ "تم واقعی یہ رقم نہیں لے رہے؟" اس نے بریف کیس کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے..... میں نے دولت کی خاطر زندگی میں بہت کچھ کیا ہے لیکن انسان کی زندگی میں پیشہ دولت ہی سب کچھ نہیں رہتی۔ کبھی کبھی وہ دولت سے ہٹ کر بھی کچھ سوچنے لگتا ہے۔ اس کے دل میں کچھ اور تمنائیں بھی جاگ اُٹھتی ہیں۔ اگر تم کیتھرین کو مجھ سے شادی پر آمادہ کر سکو تو اس سے زیادہ رقم میں خود تمہاری یا کیتھرین کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔"

"ابھی میں نے بیٹی کہہ..... یا میری بیٹی نے خود کو پہچنوانا شروع نہیں کیا۔" میں نے چارلس کے لہجے میں پہلی بار تلخی محسوس کی۔ "میرا خیال ہے تمہارا چلے جانا ہی بہتر ہے۔ براہِ کرم دوبارہ آنے یا کسی کو ساتھ لانے کی کوشش نہ کرنا۔ میں اب محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے تمہارے پاس آکر غلطی کی تھی۔"

"اگر تم میرے پاس نہ آتے تو یہ تمہاری اور بھی زیادہ بڑی غلطی ہوتی۔" سیوبک بیگ کی زِپ بند کرتے ہوئے بولا۔ "تمہارے ملک اور تمہاری حکومت پر اس وقت تک ایک سانحہ گزر چکا ہوتا۔"

"تم نے صرف اس سانحے کی پیشگی نشاندہی کی لیکن اسے روکنے کا کریڈٹ اب تمہیں نہیں جاتا۔ اس کے باوجود میں تمہارا شکر گزار تھا اور اس شکر گزاری کا اپنا سا اظہار بھی کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن....." چارلس کندھے اُچکا کر رہ گیا۔

تاہم اس مرحلے پر بھی وہ اپنی وضع داری کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ سیوبک بیگ اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا تو چارلس بولا۔ "ایک منٹ ٹھہرو، میں انٹرکام پر ڈرائیور سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ تمہیں چھوڑ آئے گا۔"

"اس تکلف کی ضرورت نہیں۔" سیوبک رُکھائی سے بولا۔ "میں نے فون کر دیا تھا۔ میرے لیے گاڑی آچکی ہے۔ نیچے کھڑی ہے۔ تمہارے علاوہ بھی اس شہر میں میرے کچھ مہربان ہیں۔"

"اچھا..... جیسے تمہاری مرضی۔" چارلس تحمل سے بولا۔

سیوبک رخصت ہوگیا۔ چارلس اس کے ساتھ سیڑھیوں تک گیا۔ چند لمحے بعد وہ واپس آیا اور تھکے تھکے انداز میں کاؤچ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کبھی کبھی حالات کی طرح انسان بھی اچانک ہی بدل جاتے ہیں۔"

پھر اس نے بغور اپنی بیٹی کی طرف دیکھا اور کسی تشویش زدہ نقاد کی طرح بولا۔ "تم جیسی بہت سی لڑکیوں تک اس کی رسائی ہے اور مزید بھی ہو سکتی ہے۔ مجھ میں نہیں آتا اسے تم میں ایسی کیا خاص بات نظر آگئی ہے جو وہ پنجے جھاڑ کر تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

میں اس موقع پر بھی اپنی رائے کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ "میرے خیال میں جب سیوبک نے کیتھرین کو اپنے پہلوانِ اعظم کی دُرگت بناتے دیکھا اور پھر آج کے آپریشن میں حصہ لیتے دیکھا تو اس کے ذہن میں کچھ تحریک پیدا ہوئی۔ اسے کیتھرین کام کی لڑکی نظر آئی ہے۔ وہ شاید دل ہی دل میں کسی اور حساب سے پلاننگ کر رہا ہے۔ ازدواجی زندگی اس کی نظر میں نہیں ہے....." پھر میں نے مصنوعی سنجیدگی سے کیتھرین کو مخاطب کیا۔ "اس کے باوجود تمہیں شکر کرنا چاہیے۔ ایسے عاشق ہر کسی کو کہاں میسر آتے ہیں۔ تمہیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ اتنی ضد کر رہا ہے بے چارا شادی کے لیے۔"

"اگر تم نے اسے میرا عاشق کہا تو میں پاپا کا بریف کیس تمہارے سر پر دے ماروں گی۔" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"اور پاپا اس سلسلے میں اپنی بیٹی کی مدد کریں گے۔" چارلس خوش دلی سے بولا۔

"آپ میری کھوپڑی کے بارے میں بُرے بُرے منصوبے بنانا چھوڑیں اور سیوبک کے بارے میں سوچیں۔" میں نے کہا۔ "وہ تو سنجیدگی سے اپنے قبیلے کے بزرگوں کو لینے چلا گیا ہے۔ کل آن پہنچا تو آپ کیا کریں گے؟ کہیں سفیر کے گھر پر تماشا نہ لگ جائے۔"

"دیکھا جائے گا....." چارلس کسی خاص تشویش کے بغیر بولا۔ "میں اس کا کوئی نہ کوئی بندوبست کر لوں گا۔ یہ لوگ جب چاہتے ہیں خالص قبائلی بن جاتے ہیں اور جب چاہتے ہیں جدت طرازی میں پیرس اور لاس اینجلس والوں کے کان کترنے لگتے ہیں۔ خیر..... ان باتوں کو چھوڑو۔ پہلے ہم ضروری باتیں کر لیں۔"

اس نے بریف کیس اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے لیے مجھے کل رقم کا بندوبست کرنا تھا لیکن سیوبک چونکہ یہ رقم چھوڑ گیا ہے اس لیے اب اسے تم رکھ لو۔"

"کس سلسلے میں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اسے تم ایک طرح کا انعام سمجھ لو۔ سیوبک نے ہماری تھوڑی سی مدد کی۔ ہم تو اسے بھی انعام سے نوازنا چاہ رہے تھے لیکن وہ کسی اور چکر میں پڑ گیا ہے۔ تم نے تو ہماری مدد کے سلسلے میں اپنی جان کو ہی خطرے میں ڈال لیا تھا۔ میں اپنی حکومت کی طرف سے تمہاری کچھ خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ جب دوسرے لوگ ہماری اہم شخصیات یا شاہی خاندان کے افراد کو مروانے کے لیے پیشہ ور

قاتلوں کو بڑی بڑی رقمیں دے سکتے ہیں تو کیا ہم ان لوگوں کی جان بچانے والوں کو تھوڑا بہت انعام بھی نہیں دے سکتے۔"

"بچانے والا تو صرف وہ ہے....." میں نے خالصتاً درویشانہ انداز میں آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔ "میں نے تو یونہی معمولی سی کوشش کی تھی۔ میرے ذہن میں کسی انعام یا صلے کا تصور بھی نہیں تھا۔ میں تو یہ سب کچھ صرف شغل شغل میں کر رہا تھا۔ مجھے اس کا کوئی انعام یا معاوضہ نہیں چاہیے۔" میں نے بریف کیس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔

"شغل شغل میں.....؟" چارلس نے حیرت اور بے یقینی سے دُہرایا۔ اسے سیوبک کے روپے نے تو حیران کیا ہی تھا لیکن اب میرا رویہ شاید اس کے لیے اس سے بھی زیادہ حیرت کا باعث بن رہا تھا۔

میں نے اسے مزید تسلی دی۔ "بے فکر رہیں' میں آپ سے کسی اور صورت میں بھی اپنے تعاون کا صلہ طلب نہیں کروں گا۔"

"تم واقعی سنجیدہ ہو؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"میں اس وقت سیوبک سے بھی زیادہ سنجیدہ ہوں۔ وہ آپ سے رقم کی جگہ کچھ اور مانگنے میں سنجیدہ تھا۔ میں کچھ بھی نہ مانگنے میں سنجیدہ ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تم کب مانگ رہے ہو۔ یہ رقم تو میں خود دے رہا ہوں۔ اپنی حکومت کے ایک خفیہ فنڈ سے میں نے اس کا بندوبست کرایا ہے۔ اگر سیوبک آج یہ رقم لے جاتا تو کل مجھے تمہارے لیے بندوبست کرنا تھا لیکن اب تم یہی رکھ لو۔ میں تم سے درخواست کر رہا ہوں۔"

"میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ اس موضوع کو یہیں ختم کردیں۔ مجھے دوسری حکومتوں کے تو کیا' اپنی حکومت کے خفیہ فنڈز سے بھی اس انداز میں..... اور اس طرح کی رقمیں لینے کا تصور بھی اچھا محسوس نہیں ہوا۔ میں کاروباری آدمی ہوں۔ مجھے بس کاروبار کے ذریعے ہی آتی ہوئی رقمیں اچھی لگتی ہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"عجیب آدمی ہو تم!" اس نے بریف کیس کاؤچ پر رکھ دیا۔

"یہ دنیا عجیب آدمیوں سے بھری پڑی ہے۔ سیوبک بھی عجیب آدمی تھا۔ وہ بھی رقم چھوڑ کر چلا گیا۔ حالانکہ وہ رقم کے لیے قتل کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کا مقصد تو کچھ اور تھا۔ وہ تو یقیناً کسی اور طرح یہ کسر پوری کرنے کی فکر میں تھا لیکن تمہارا سلسلہ سمجھ میں نہیں آرہا" چارلس سر جھٹک کر بولا۔ "معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ دنیا کے تقریباً سبھی ملکوں میں عموماً..... اور چند مشرقی ملکوں میں خصوصاً ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو اپنے بھائیوں کو اذیت کی موت مروانے کے لیے' بغاوتیں کرانے کے لیے' بگلی کو چوں میں آگ بھڑکانے کے لیے اور ملک کی جڑیں کاٹنے کے لیے نوٹوں سے بھرے بریف کیس دینے والوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور پھر بھی نیک نام بنے رہتے ہیں۔"

"ہاں..... میں نے سوچا اس قسم کے لوگ تو بہت پائے جاتے ہیں۔ ایک آدھ ذرا کسی اور قسم کا بھی ہونا چاہیے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اصل مسئلہ یہ ہے کہ جن لوگوں میں اس قسم کی بے نیازی دکھانے کا حوصلہ ہوتا ہے وہ میری طرح گمنام رہتے ہیں۔"

چارلس نے اُداس سی نظروں سے بریف کیس کو دیکھا اور اسے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک بڑی رقم کی اتنی بے قدری بھی ہو سکتی ہے۔"

کیتھرین مسکراتے ہوئے بولی۔ "آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ اگر آپ کو اس رقم کے ٹھکرائے جانے کا اتنا ہی دکھ ہو رہا ہے تو لائیں' مجھے دے دیں۔ میں اسے نہایت عزت واحترام سے اپنے سوئس اکاؤنٹ میں جمع کرادوں گی۔ آخر میں نے بھی تو آج کے آپریشن میں حصہ لیا ہے اور ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ میرے لیے تو کسی انعام کا ذکر ہی نہیں ہو رہا۔"

اس نے بریف کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن چارلس نے جلدی سے اسے اُٹھالیا اور پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "یہ امانت ہے۔ جہاں خرچ کرنے کے لیے لائی گئی تھی' اگر وہاں خرچ نہیں ہو سکی تو واپس جائے گی۔ تمہارے بارے میں تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اب اگر یہ رقم تمہیں دیتا ہوں تو یہ کہیں اقرا پروری ہی نہ ہو جائے۔ ویسے تم نے جو نکتہ اٹھایا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ میں اس کے بارے میں سوچوں گا اور خفیہ فنڈ کے ایک دو نگرانوں سے بھی مشورہ کروں گا تاکہ کل کلاں کو مجھ پر کوئی الزام نہ آسکے۔ میرے خلاف کوئی اسکینڈل نہ بن سکے۔ میں بہت بااختیار ہوں لیکن اپنی نظر میں سُرخرو رہنا چاہتا ہوں۔"

"چھوڑیں پاپا! میں تو مذاق کر رہی تھی۔ میں نے بھی افضل چوہدری کی طرح شغل شغل میں ہی اس آپریشن میں حصہ لیا تھا۔ اس وقت تو ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا کوئی صلہ یا انعام بھی ہو سکتا ہے۔ مجھ جیسی نکمی اور نالائق بیٹی کی وجہ سے آپ کی کچھ نیک نامی ہو جائے' میرے لیے یہی بہت ہے۔" کیتھرین مسکراتے ہوئے بولی۔

"عجب ہے!" چارلس نے بے یقینی سے سرہلایا۔ "تمہارے خیالات میں بھی افضل چوہدری جیسی درویشی آگئی۔ مجھے تو اب بھی یقین نہیں آرہا کہ تمہاری کایا پلٹ چکی ہے۔"

"یقین تو خود مجھے نہیں آرہا ہے۔" کیتھرین ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"چلو خیر..... دیکھتے ہیں تم پر یہ رنگ کچا چڑھا ہے یا پکا۔" چارلس بولا۔ "مجھے اندیشہ ہے تمہارا یہ روپ عارضی نہ ہو۔"

"مجھے تو لگتا ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ رنگ اور گہرا ہو گا۔" کیتھرین بولی۔ "لالچ اور چھوٹی چھوٹی خواہشوں کی غلامی سے آزاد ہو کر ایک عجیب سی بے خوفی اور ایڈونچر پسندی کی زندگی گزارنے میں ایک الگ ہی لطف ہے جس سے میں اب تک ناآشنا تھی۔ ایڈونچر پسندی میری زندگی میں پہلے بھی تھی لیکن وہ منفی قسم کی تھی۔"

"کاش اپنے بارے میں تمہارا اپنا یہ اندازہ درست ثابت ہو۔" چارلس ٹھنڈی سانس لے کر بولا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم بازار جا کر ایک اچھا سا ڈنر سوٹ خریدو اور آکر تیار ہو جاؤ۔ شام کو تمہیں میرے ساتھ ڈنر پر چلنا ہے جہاں میں تمہیں ہرائی نس سے ملواؤں گا۔"

"آپ کا مطلب ہے لیڈی ڈائنا سے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔" وہ کچھ اس طرح مسکرا رہا تھا جیسے میں یہ خبر سن کر خوشی سے اُچھل پڑوں گا۔

"کس لیے ملوائیں گے آپ مجھے ان سے؟"

وہ ایک لمحے کے لیے حیران سا نظر آیا پھر بولا۔ "بس..... ویسے ہی کوئی خاص مقصد تو نہیں ہو گا ملاقات کا۔ فی الحال تو ہم ہرائی نس کو یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ ان پر قاتلانہ حملے کی کوشش ہوئی تھی جسے ناکام بنانے میں تم نے سب سے اہم کردار ادا کیا تھا۔ ہم نہیں چاہتے کہ پریس کو اس بات کی بھنک پڑے۔ اس بات کو رازہی رکھا جائے گا۔ خود ہرائی نس زبان کے معاملے میں زیادہ محتاط نہیں ہیں۔"

"مجھے تو اس طرح جا کر بے مقصد ان سے ملنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ "ایک آدھ منٹ کی اس قسم کی ملاقات کے لیے اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے جس میں آپ ان خاتون کو غالباً صرف یہ بتائیں گے۔ ان سے ملیے..... یہ مسٹر افضل چوہدری ہیں..... یہ ایک پاکستانی بزنس مین ہیں۔ وہ خاتون مصنوعی خوش خلقی سے مسکراتے ہوئے سر ہلائیں گی اور ایک آدھ رسمی سا جملہ بول کر آگے بڑھ جائیں گی۔ مجھے اس قسم کی ملاقات کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"ہرائی نس اب تمہارے ساتھ ڈیٹ پر جانے سے تو رہیں۔" چارلس جل کر بولا۔

"میں کب ایسی فرمائش کر رہا ہوں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے ان سے کسی بھی قسم کی ملاقات کا کوئی شوق نہیں ہے۔ خصوصاً اس قسم کی پُرتکلف سرکاری درباری ملاقاتوں کے تو تصور سے ہی مجھے وحشت ہوتی ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا لوگ کیوں اس قسم کی ملاقاتوں کے لیے مرے جاتے ہیں۔"

"افضل چوہدری! تم بہت ہی ٹیڑھے آدمی ہو۔" چارلس گہری سانس لے کر شکست خوردہ سے لہجے میں بولا۔

"میرے خیال میں تو میں بہت ہی سیدھا اور کھرا آدمی ہوں۔ اس لیے آج کے دور میں سِکس فٹ نظر آتا ہوں۔ تاہم مجھے اس پر افسوس نہیں ہے۔ میری آپ سے دست بستہ یہی گزارش ہے کہ اپنی مصروفیات جاری رکھیے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔"

کیتھرین نہ جانے کیوں منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ میں نے اسی مؤدبانہ لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جب آپ کو لیڈی ڈائنا کے دورے کے مسائل سے فرصت مل جائے تو مجھے پاکستان واپس بھجوانے کا کوئی بندوبست کر دیجیے گا۔ آپ کی یہی بڑی نوازش ہو گی۔ میں اب واپس جانا چاہتا ہوں۔"

"چلے جانا۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" وہ بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر بولا۔ "بہرحال تم ڈنر میں نہیں جا رہے؟"

"نہیں۔ اس کے لیے تو میری معذرت ہی قبول فرمایئے۔" میں نے بدستور اپنا مؤدبانہ لہجہ برقرار رکھا۔ چارلس ایک لمحے مجھے گھورتا رہا۔ بالآخر اس نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر ہی لیا اور رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کیتھرین سے کہا۔ "تمہارے پاپا نے تمہیں ڈنر میں چلنے کے لیے نہیں کہا۔"

"ہماری ایسی قسمت کہاں۔" کیتھرین ٹھنڈی سانس لے کر بولی مگر دوسرے ہی لمحے اس کا لہجہ بدل گیا۔ "میری اس ٹھنڈی سانس سے کسی غلط فہمی میں مبتلا مت ہو جانا۔ مجھے بھی اس خاتون سے اس قسم کی رسمی سی ملاقات کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اگر پاپا مجھے ڈنر میں چلنے کے لیے کہتے تو میرا جواب بھی کم و بیش وہی ہوتا جو تمہارا تھا۔"

"جس سے تمہارے پاپا یہ نتیجہ اخذ کرتے کہ ہم دونوں کے درمیان زبردست ذہنی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"اور یہ تمہارے لیے زبردست خطرے کی علامت ہوتی۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

ہم چند منٹ اسی طرح گپ شپ کرتے رہے پھر ہم نے چارلس کو تیار ہو کر دوبارہ رخصت ہوتے دیکھا۔ بریف کیس اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

کیتھرین بولی۔ "پاپا! آپ کچھ زیادہ ہی بے پروا نہیں ہوتے جا رہے؟ اب آپ اتنی رقم سے بھرا بریف کیس یونہی ہاتھ میں لٹکائے گھومتے رہیں گے؟"

"یہاں آنے سے چند منٹ پہلے تک یہ رقم میرے بریف کیس میں نہیں تھی۔ اب چند منٹ بعد پھر یہ رقم اس بریف کیس میں نہیں ہو گی۔ اس لیے تمہیں تشویش زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" چارلس بولا "ویسے بھی یہاں کی پولیس گو کہ زیادہ مستعد نہیں ہے لیکن پھر بھی یہاں جرائم کی شرح امریکا اور برطانیہ سے کچھ کم ہے۔ اس کے علاوہ تمہارے پاپا تھوڑے سے بوڑھے ضرور ہو گئے ہیں لیکن اتنے گئے گزرے نہیں ہیں کہ سڑکوں پر پھرنے

والے معمولی چور اچکے اور لٹیرے ان سے بریف کیس چھین کر لے جا سکیں۔"

چارلس رخصت ہو چکا تو کیتھرین گہری سانس لے کر کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "عجیب ہی چیز ہیں پاپا بھی!"

"بے شک!" میں نے بڑے خلوص سے سر ہلاتے ہوئے تائید کی۔

○☆○

دوسرے روز بھی چارلس کی مصروفیت کچھ کم نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ لیڈی ڈائنا ابھی شہر میں موجود تھی اور شیڈول کے مطابق اس کی مصروفیات جاری تھیں۔ تاہم چارلس شام سے پہلے واپس آگیا تھا اور ہمارے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ وہ اب خاصا مطمئن اور فارغ فارغ سا دکھائی دے رہا تھا۔ ہم اوپر کی منزل کے ڈائننگ روم میں ہی تھے۔ دفعتاً انٹرکام کا بزر بجا۔ بٹلر وہیں موجود تھا۔ اس نے انٹرکام پر بات کی۔

چند لمحے بات کرنے کے بعد بٹلر چارلس کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "سر! گیٹ ہاؤس سے سیکیورٹی گارڈ بول رہا ہے۔ کہہ رہا ہے دو قبائلی سے آدمی آئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ سیوبک کا کوئی ضروری پیغام لائے ہیں اور جلد از جلد آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ سیکیورٹی گارڈ پوچھ رہا ہے انہیں اندر آنے دیا جائے یا آپ گیٹ پر ہی جا کر ان سے بات کریں گے؟"

چارلس چائے چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور بلا تامل بولا۔ "میں گیٹ پر ہی آکر ان سے بات کروں گا۔"

اس نے مجھے یا کیتھرین کو ساتھ چلنے کے لیے نہیں کہا تھا لیکن ہم خود ہی اٹھ کر اس کے پیچھے چل دیے۔ نیچے کا بلند و بالا آہنی مین گیٹ الیکٹرانک سسٹم سے کھلتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اندر کی طرف چھوٹا سا گیٹ ہاؤس بنا ہوا تھا۔ باوردی سیکیورٹی گارڈ اسی میں کھڑا تھا۔ چارلس کا اشارہ پا کر اس نے بٹن دبا کر گیٹ کھولا۔ ہم چاہتے تو گیٹ ہاؤس کی چھوٹی سی کھڑکی سے جھانک کر بھی باہر دیکھ سکتے تھے لیکن چارلس نے اتنی احتیاط کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

گیٹ کھلا تو سامنے ہی ایک نئی لیکن گرد و غبار میں بری طرح اٹی ہوئی ایک بڑی اور ائرکنڈیشنڈ ڈاج پک اپ کھڑی دکھائی دی۔ قریب ہی دو قبائلی کھڑے کچھ پریشان سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ ویسے ہی لباس میں تھے جیسا میں نے سیوبک کے گاؤں میں اکثر مردوں کو پہنے دیکھا تھا۔ سروں پر وہی پھولی پھولی سی ٹوپیاں تھیں۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر اور بھاری بھرکم تھا جبکہ دوسرا نوجوان اور چھریرے جسم کا تھا۔ ان کے تاثرات کچھ ایسے ہی تھے جیسے بے چارے سیدھے سادے دیہاتی شہر آکر پریشانی اُٹھاتے ہوئے کسی الجھن میں پہنچے ہوں۔

"آپ محترم چارلس ہیں؟" ادھیڑ عمر نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں تصدیق چاہی۔ "ہمیں محترم چارلس کے علاوہ کسی سے بات نہیں کرنی ہے۔"

"میں ہی چارلس ہوں بھائی! مسئلہ کیا ہے؟"

میں اس دوران پک اپ کا جائزہ لے چکا تھا۔ وہ بڑی کیب اور پانچ سیٹوں والی مضبوط پک اپ تھی جو ناہموار اور پہاڑی راستوں پر باربرداری یا سفر کے لیے اچھی سمجھی جاتی ہے۔ اس میں کوئی اور شخص بیٹھا نظر نہیں آرہا تھا۔

ادھیڑ عمر قبائلی نے اپنے لہجے سے چغے میں ہاتھ ڈال کر مڑا تڑا سا ایک پرچا نکالا اور چارلس کو تھما دیا۔ میں اور کیتھرین کچھ آگے بڑھ آئے۔ بال پوائنٹ سے غالباً خاصی عجلت میں انگریزی میں پیغام تحریر کیا گیا تھا۔ چارلس نیچی آواز میں پڑھنے لگا۔

محترم چارلس!

مجھے افسوس ہے کہ میری آپ کے پاس سے روانگی کچھ زیادہ خوشگوار حالات میں نہیں ہوئی تھی۔ میں حسب پروگرام تین بزرگوں کو ساتھ لے کر آپ سے ملاقات کے لیے روانہ ہوا تھا لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ اس طرح کے معاملات زبردستی طے نہیں کیے جاتے۔ میں شاید بزرگوں کے ساتھ راستے ہی سے واپس لوٹ جاتا لیکن اسی سفر کے دوران ایک جگہ مجھے حمان کی موجودگی کے شواہد ملے ہیں۔ کچھ خاص لوگوں کی زبانی اُڑتی اُڑتی سی خبریں بھی ملی ہیں کہ وہ جنگل میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں اس کی گھات میں چھپ کر بیٹھ گیا ہوں۔ میرے خیال میں یہ معاملہ زیادہ اہم ہے۔ ہمیں اس کو ادھورا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ میرے لیے انا کا سوال ہے۔ آپ کے لیے بھی ہونا چاہیے۔ حمان کی انا کو بھی ٹھیس پہنچی ہے۔ وہ آئندہ کسی بھی وقت ہم سب کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر موقع مل رہا ہو تو ہمیں لگے ہاتھوں اس معاملے کو نمٹا ہی دینا چاہیے۔ میرے ساتھ کوئی خاص کام کا آدمی نہیں ہے اور میرے آدمی اس قسم کے کاموں میں کچھ زیادہ ماہر بھی نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے حمان کے ساتھ بھی کچھ آدمی ہیں۔ اگر صرف آپ، مسٹر چوہدری اور کیتھرین میری مدد کے لیے پہنچ جائیں تو کافی ہو گا۔ میں آپ سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ جلدی پہنچنے کی کوشش کیجیے گا۔

سیوبک!"

تحریر سے تو ظاہر ہوتا تھا کہ پیغام خاصی عجلت میں گھسیٹا گیا تھا لیکن کچھ ایسا مختصر نہیں تھا۔ بات آسانی سے سمجھ میں آتی تھی۔ چارلس نے ان لوگوں کو اندر بلانے کا تکلف نہیں کیا اور ان سے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو، ہم چند منٹ میں آکر تمہارے ساتھ چلتے ہیں یا تمہیں کوئی جواب دیتے ہیں۔"

وہ دونوں قبائلیوں کو حیران پریشان سا چھوڑ کر دوبارہ اندر آگیا۔ گیٹ بند ہو گیا۔ چارلس نے ڈرائیو وے میں ہی رُک کر گویا کارنر میٹنگ منعقد کرتے ہوئے کہا۔ "یہ چال بھی ہو سکتی ہے لیکن ہمیں جانا ضرور چاہیے۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ ہم ڈر کر چھپ کر بیٹھ

گئے۔"

اس نے جواب طلب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے قدرے بے پروائی سے کہا۔ "میں تیار ہوں، مجھے تو ویسے بھی شاید خطرات مول لینے کا نشہ سا ہوتا جا رہا ہے۔"

"میں بھی چلتی ہوں۔" کیتھرین بولی۔ "شاید اس نے جو لکھا ہے وہ سچ ہی ہو۔ ویسے بھی اس نے ہمیں اپنے گاؤں نہیں بُلایا ہے۔ اس کے گاؤں جانا ہمارے لیے زیادہ خطرناک ہوتا۔ جنگل میں اس نے پورے گاؤں کو تو بُلا کر نہیں بٹھالیا ہوگا۔ اصل جگہ کے قریب پہنچ کر ہم دیکھ بھال کر آگے بڑھیں گے۔ تھوڑے بہت قبائلیوں سے تو ہم نمٹ ہی لیں گے۔ ویسے مجھے تو زیادہ امکان یہی نظر آرہا ہے کہ اس کا دماغ ٹھکانے آگیا ہے اور اسے واقعی ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ آگے ہماری قسمت ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔" چارلس طمانیت سے بولا۔ "اس خط میں جس جنگل کا تذکرہ ہے وہ یقیناً وہی ہے جو سیوبک کے گاؤں کے راستے میں پڑتا ہے۔ میں احتیاطاً اس کے بارے میں چند خاص افراد کو بھی مطلع کردیتا ہوں کہ ہم اس طرف جا رہے ہیں۔"

"چھوڑیں۔۔۔ اب اتنا پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ سیوبک اور اس کے آدمی ایسے بھی نہیں ہیں کہ ہم ان سے نہ نمٹ سکیں۔" کیتھرین بے نیازی سے بولی۔

چارلس بغور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ "اب یکدم ہی اتنی اونچی ہواؤں میں اُڑنا بھی مت شروع کرو۔"

اور آخر ہم لوگوں نے چند ہتھیار ساتھ لیے جو چارلس ہی نے ہمیں مہیا کر رکھے تھے۔ ہم باہر آئے تو چارلس بولا۔ "تم لوگ نیچے چل کر گاڑی میں بیٹھو۔ میں چند سیکنڈ میں آتا ہوں۔"

"ہم اپنی گاڑی میں چلیں گے یا ان کے ساتھ انہی کی گاڑی میں بیٹھ جائیں؟" میں نے پوچھا۔

چارلس نے ایک لمحے سوچا پھر کہا۔ "انہی لوگوں کے ساتھ انہی کی گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ دیکھا جائے گا۔"

ہم نیچے آگئے۔ وہ قبائلی باہر گاڑی کے پاس ہی کھڑے تھے۔ ہمارے پاس ہتھیار دیکھ کر انہوں نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ ان کے پاس بظاہر کوئی ہتھیار نظر نہیں آرہا تھا۔ ہم گاڑی میں کیب کی پچھلی بڑی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ مجھے گاڑی میں بھی کوئی ہتھیار نظر نہ آیا۔ اتنا غیر مشکوک نظر آنا بھی مجھے کچھ مشکوک ہی لگ رہا تھا۔ نوجوان قبائلی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور ادھیڑ عمر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد چارلس بھی آگیا اور گاڑی یوٹرن لے کر تیز رفتاری سے روانہ ہوگئی۔

راستے میں چارلس نے ادھیڑ عمر قبائلی سے پوچھا۔ "سیوبک کیا جنگل میں اکیلا ہے؟"

"نہیں۔۔۔ دو آدمی اس کے ساتھ ہیں لیکن وہ کافی بوڑھے ہیں۔" ادھیڑ عمر نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جواب دیا۔

"وہ جنگل میں کیا کر رہے ہیں؟" چارلس نے پوچھا۔

"جنگل میں ایک جگہ ایک کنواں ہے۔۔۔ اس کے قریب ایک کیبن بنا ہوا ہے۔ کافی پرانا معلوم ہوتا ہے۔ وہاں کچھ لوگوں کی موجودگی کے آثار نظر آرہے ہیں۔۔۔ سیوبک کو کسی کی جھلک نظر آئی تھی۔ تب سے وہ اور دونوں بزرگ وہیں پہنچے ہیں۔ انہوں نے موبائل فون پر کسی سے بات بھی کی ہے۔ ہم لوگ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہیں لیکن جنگل میں وہ کنواں اور کیبن دیکھ کر ہمیں بھی حیرت ہوئی۔ ہم نے اس سے پہلے وہ دونوں چیزیں وہاں نہیں دیکھی تھیں حالانکہ وہ نئی بھی نہیں ہیں۔ کنواں اور کیبن دونوں برسوں پُرانے معلوم ہوتے ہیں۔" ادھیڑ عمر نے اٹک اٹک کر یہ باتیں بتائیں۔

"سیوبک اور اس کے بزرگ ساتھیوں کے پاس کچھ اسلحہ وغیرہ موجود ہے؟" چارلس نے دریافت کیا۔

ادھیڑ عمر نے اثبات میں سرہلایا اور کہا۔ "ماؤزر اور ٹی ٹی تو ہمارے پاس بھی ہیں لیکن سردار نے ابھی تک ہمیں کچھ کرنے کا حکم نہیں دیا۔ انہیں شاید آپ کا انتظار ہے۔"

شہری حدود سے نکلنے کے بعد تو چھوٹے سے ٹرک سے مشابہ وہ پک اپ طوفانی رفتار سے دوڑنے لگی اور پندرہ بیس کلومیٹر کا فاصلہ اس نے بہت ہی کم وقت میں طے کرلیا۔ اس دوران میں نے کئی بار

طنز و مزاح

منتخب مزاح پارے	ضیاء ساجد	100/-
ممتاز ادیبوں کے منتخب خاکے	ضیاء ساجد	120/-
منتخب شگفتہ شہ پارے	ضیاء ساجد	200/-
سرجیکل وارڈ	ضیاء ساجد	100/-
مزاح مزے کا	ضیاء ساجد	150/-
منتخب شاہکار شخصی خاکے	ضیاء ساجد	90/-
منتخب مزاحیہ مضامین	ضیاء ساجد	120/-

مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور نمبر2

گردن جھکا کر پیچھے دیکھا۔ اِکّا دُکّا گاڑیاں نظر آئیں لیکن کسی پر مجھے یہ شبہ نہ ہوسکا کہ وہ ہمارا تعاقب کر رہی تھی۔

آخر کار وہ جنگل نظر آنی گیا جو ہم نے اس سے پہلے بھی سیوبک کے گاؤں جاتے وقت دور دور سے دیکھا تھا۔ جنگل ہائی وے سے بہت ہٹ کر تھا۔ پک اپ کچے میں اُتر گئی اور ناہموار میدانی علاقے میں ہچکولے کھاتی جنگل کی طرف بڑھنے لگی۔ جس طرف سے ہم جنگل کے قریب پہنچے اس طرف درخت گنجان نہیں تھے لیکن پک اپ اس طرف سے جنگل میں داخل نہیں ہوئی بلکہ درختوں کے قریب سے گزرتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔ کافی طویل چکر کاٹ کر آخر ہم جنگل کے اس طرف آپہنچے جدھر سے ہائی وے نظر نہیں آتا تھا۔

اس طرف سے پک اپ جنگل میں داخل ہوئی اور بہ مشکل ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد رک گئی کیونکہ آگے درخت بھی گنجان تھے اور راستہ بھی نہایت ناہموار تھا۔ وہ پہاڑی سا علاقہ معلوم ہوتا تھا جسے جنگل نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جگہ جگہ مٹی کے بڑے بڑے تودے نظر آرہے تھے۔

نوجوان نے انجن کا سوئچ آف کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے ہمیں پیدل آگے چلنا پڑے گا۔"

اس نے پک اپ درختوں کے جھنڈ میں ایک ایسے مقام پر روکی تھی جہاں وہ تقریباً گیرج ہی کی طرح محفوظ تھی۔ ہم گاڑی سے اُتر آئے اور تینوں نے اپنے مشین پسٹل نکال لیے۔ نوجوان نے بڑی احتیاط سے گاڑی کے شیشے چڑھا کر اسے مقفل کیا اور ہم ان دونوں کی رہنمائی میں آگے بڑھنے لگے۔

جنگل میں بلا کا سناٹا تھا۔ یہاں کے پرندے بھی بڑے امن پسند معلوم ہوتے تھے۔ کہیں سے ان کی چوں چاں بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہمارے جوتوں تلے خشک پتے یا ٹوٹی ٹہنیاں چرچراتی تھیں تو ان کی آواز بھی بلند معلوم ہوتی تھی۔ گو کہ ہم بہت تیزی سے دائیں بائیں مڑتے جا رہے تھے لیکن میں راستہ ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم ان دونوں قبائلیوں کی طرف سے پوری طرح مطمئن تو نہیں تھے لیکن ہم کسی قسم کی دھوکے بازی یا اچانک کچھ لوگوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ ان دونوں کے بارے میں ہمیں ایک بات خاصی تسلی بخش لگی تھی کہ انہوں نے کسی بھی بہانے سے ہمیں غیر مسلح کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی ہمارے ہتھیاروں پر کوئی خاص توجہ دی تھی۔ خود انہوں نے ابھی تک کوئی گن وغیرہ نہیں نکالی تھی۔ ان کے انداز و اطوار تو دوستوں والے ہی تھے۔ ہم تینوں ان کے پیچھے پیچھے شانہ بہ شانہ چل رہے تھے اور بیک وقت چاروں طرف نظر رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اسی دوران ایک طرف سے ایک شخص ایک تگڑے سے گدھے کو ہانکتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ وہ گدھا کیا، تقریباً گھوڑا ہی تھا۔ اس پر لمبی سی ایک بوری لدی ہوئی تھی۔ کیتھرین نے اسے نشانے پر لے لیا تھا لیکن وہ گویا دنیا سے بے نیاز، نخ نخ کرتا ایک ٹیڑھی میڑھی چھڑی سے اپنے گدھے کو ہانکتا چلا آرہا تھا۔

وہ کوئی مفلوک الحال سا ترک دہقان معلوم ہوتا تھا۔ اس کی ٹھوڑی پر مختصر سی داڑھی تھی۔ چہرہ پسینے اور مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ سر پر مختصر سی پگڑی تھی۔ عربوں جیسا اس کا ڈھیلا ڈھالا لبادہ بھی میلا اور مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ بے ہنگم سے جوتے خاصی شکستہ حالت میں تھے۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن کمر شاید افلاس کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھی۔

وہ ہمارے دائیں طرف درختوں کے درمیان سے نمودار ہوا تھا اور کچھ فاصلے پر رہتے ہوئے درختوں ہی کے درمیان زگ زیگ کے سے انداز میں اسی طرف جا رہا تھا جدھر ہم جا رہے تھے۔ اس نے صرف ایک بار متجسس سی نظروں سے ہماری طرف دیکھا لیکن دوسرے ہی لمحے دوبارہ منہ پھیر کر اس طرح اپنے گدھے کے پیچھے لنگڑاتا ہوا چلنے لگا جیسے اسے دنیا کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ قدرے عجیب بات یہ تھی کہ اس کا گدھا آگے آگے چل رہا تھا اور وہ اس کے پیچھے تھا۔ شاید گدھا اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ یہ کچھ ایسی حیرت کی بات بھی نہیں تھی۔ اس دنیا میں بہت سے گدھوں نے بے شمار انسانوں کی رہنمائی کا فریضہ سنبھالا ہوا ہے لیکن یہ گدھا چار ٹانگوں والا تھا۔ محسوس یہی ہوتا تھا کہ وہ اپنے پیچھے آنے والے کو منزل تک پہنچا ہی دے گا کیونکہ وہ راستے سے واقف معلوم ہوتا تھا۔ وہ گردن جھکائے دانشورانہ خاموشی اور سنجیدگی سے چلا جا رہا تھا۔ وہ دنیا سے بے نیاز معلوم ہوتا تھا۔

ہماری رہنمائی کرنے والے قبائلیوں نے شاید محسوس کرلیا تھا کہ ہم گدھے والے کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہوچکے ہیں اور الجھن سے اسی کی طرف دیکھے جا رہے ہیں۔ کیتھرین کے پسٹل کا رخ تو بدستور اسی کی طرف تھا۔ ادھیڑ عمر قبائلی چلتے چلتے ہی ہماری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "اس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ یہ ایک نیم پاگل سا آدمی ہے۔ جنگل میں ہی ایک جھونپڑی میں رہتا ہے۔۔۔ بالکل بے ضرر سا شخص ہے۔"

کیتھرین نے مشین پسٹل کا رخ زمین کی طرف کرلیا۔ لیکن ہم اب بھی چاروں طرف دیکھتے ہوئے چل رہے تھے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ یہی ہماری غلطی تھی۔ ہم ہر طرف دیکھ رہے تھے سوائے اس طرف کے، جدھر دیکھنا ہمارے لیے سب سے زیادہ ضروری تھا۔ یعنی نیچے کی طرف۔

ہم درختوں کی گھنی شاخوں تک کا جائزہ لیتے جا رہے تھے لیکن ہم نے زمین کی طرف دیکھنا زیادہ ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اگر دیکھا بھی تھا تو راستے میں زیادہ تر ہمیں خشک پتے، ٹوٹی ہوئی چھوٹی موٹی ٹہنیاں اور گھاس پھونس ہی نظر آیا تھا۔ وہاں بھی ہمیں اپنے جوتوں تلے انہی چیزوں کی موجودگی کا احساس ہوا تھا جہاں ہم اچانک ہی

گویا غرب سے نیچے چلے گئے۔

ایک لمحے کے لیے تو میں بھی بدحواس سا ہو گیا اور فوری طور پر میری سمجھ میں نہ آیا کہ ہمارے ساتھ ہوا کیا تھا۔ بہت ہی زوردار سا جھٹکا لگا تھا اور ہم یکدم ہی اندھیرے میں اُتر گئے تھے۔ پھر مجھے اپنے اوپر کیتھرین کے لطیف وجود کا احساس ہوا لیکن اس وقت وہ بھی خاصی وزنی لگ رہی تھی۔

پھر مجھے احساس ہوا کہ میرے نیچے کوئی کراہ رہا تھا۔ وہ چارلس تھا جو میرے نیچے دب گیا تھا۔ میں نے اس پر سے ہٹنے کی کوشش کی۔ اس دوران کیتھرین کا وزن خودبخود مجھ پر سے ہٹ گیا۔ تب میں نے دیکھا کہ وہاں اتنا بھی اندھیرا نہیں تھا جتنا مجھے فوری طور پر محسوس ہوا تھا۔

بات صرف اتنی تھی کہ ہم چلتے چلتے اچانک ہی کنوئیں سے مشابہ ایک گڑھے میں آن گرے تھے۔ وہ کافی گہرا گڑھا تھا لیکن اس کا قطر یا گولائی زیادہ نہیں تھی۔ اسے بھی یقیناً جنگل کی بیشتر زمین کی طرح خشک پتوں اور گھاس پھونس سے ڈھانپا گیا تھا۔ اگر ہم زمین کی طرف دیکھ رہے ہوتے تو شاید تب بھی سمجھ نہ پاتے کہ ہمارے پاؤں کسی گڑھے پر پڑنے والے تھے۔

یہ بڑی پرانی ٹیکنیک تھی۔ پرانے شکاریوں کا حربہ تھا جو وہ خطرناک درندوں کو شکار کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ بعض پرانے حربے نئے دور میں قطعی غیر متوقع لگتے ہیں۔ شاید اسی لیے کامیاب ہو جاتے ہیں۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ ہمارے آگے آگے چلتے ہوئے دونوں قبائلی اس گڑھے میں نہیں گرے تھے لیکن ذرا سوچنے پر محسوس کیا جا سکتا تھا کہ اس میں کچھ ایسی حیرت کی بات بھی نہیں تھی۔ وہ یقیناً اس گڑھے کی موجودگی سے باخبر تھے اور اس سے بچ کر گزرے تھے۔ راستہ تنگ ہی تھا۔ ہم نے اگر انہیں تھوڑا بہت اِدھر اُدھر ہوتے دیکھا بھی تھا تو اس سے یقیناً کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا تھا۔

ہمارے حواس بحال ہوئے تو ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم تینوں کے کھڑے ہونے کے بعد گڑھے میں ہمارے اردگرد جگہ کم ہی بچی تھی۔ گڑھے کی تہ میں سیلن تھی اور وہاں ایک عجیب سی بو محسوس ہو رہی تھی حالانکہ گڑھا خالی ہی تھا۔ اس میں ہمارے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ ہمارے ساتھ ہی البتہ کچھ گھاس پھونس اور خشک پتے ضرور اندر آ گرے تھے۔

حواس ٹھکانے آتے ہی ہم تینوں نے بیک وقت ایک دوسرے سے یہی پوچھا کہ کسی کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی تھی۔ غنیمت تھا کہ تینوں کے ہاتھ پاؤں صحیح سلامت دکھائی دے رہے تھے۔ چھوٹی موٹی چوٹوں کی اس وقت ہمیں پروا نہیں تھی۔ ہتھیار ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ گئے تھے جنہیں ہم نے فوراً اٹھایا اور گڑھے کے دہانے کی طرف دیکھا لیکن وہاں ہمیں کوئی سر دکھائی نہ دیا۔ کسی نے اندر جھانکنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ یقیناً اتنے

قیمت 120/-

کائنات

اے راحت

قیمت: 90/00 روپے

احمق نہیں تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ گڑھے میں گرنے والوں کو اگر اب گڑھے کے دہانے پر کوئی کھوپڑی نظر آئی تو وہ اس میں سے گولی بھی گزار سکتے تھے۔ غیر ارادی طور پر ہم تینوں بھی اس خشک کنوئیں کی دیوار سے چپک گئے۔ کوئی اوپر سے ہم پر بھی گولیوں کی بوچھاڑ کر سکتا تھا اور ہم نہایت بے بسی کی موت مر سکتے تھے۔ وہ گہرا گڑھا ہم تینوں کی اجتماعی قبر بن سکتا تھا۔

تاہم ایسا نہیں ہوا۔ اوپر سے ادھیڑ عمر قبائلی کی آواز سنائی دی۔ وہ نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ "اوہو..... بڑا افسوس ہوا..... آپ لوگ گڑھے میں گر گئے۔ معلوم نہیں کس کمبخت نے یہاں یہ ٹریپ بنایا ہوا تھا۔ خیر..... آپ لوگ گھبرائیں نہیں۔ ہم ابھی آپ کو نکالنے کے لیے اپنے ساتھ کچھ لوگوں کو لے کر آئے ہیں۔"

انہیں یقیناً یہ توقع نہیں تھی کہ ہم ان کی اس "مکارانہ معصومیت" پر یقین کر سکتے تھے لیکن وہ غالباً اس کی پروا کیے بغیر اپنا کردار ادا کیے جا رہے تھے۔ دوسرے ہی لمحے اوپر سکوت چھا گیا۔ شاید وہ لوگ واقعی کہیں چلے گئے تھے۔ معلوم نہیں ان کے منصوبے کا اگلا مرحلہ کیا تھا۔

مجھے اس گڑھے والے کے بارے میں سوچ کر بھی حیرت ہو رہی تھی۔ ہمیں گڑھے میں گرتے تو یقیناً اس نے بھی دیکھ لیا ہوگا لیکن کیا اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا؟ کیا وہ اسی طرح دنیا جہان سے بے نیاز اپنے راستے پر بڑھتا چلا گیا تھا؟ اس سے یہ بھی بعید تو نہیں تھا۔ وہ کچھ عجیب ہی مخلوق لگ رہا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اسے دونوں قبائلیوں نے ذرا دھمکا کر بھگا دیا ہو اور یہ بھی عین ممکن تھا کہ میں اس کے بارے میں خواہ مخواہ ہی خوش فہمی میں مبتلا رہا

ں۔

"اب کیا کرنا چاہیے؟" کیتھرین سرگوشی میں بولی۔

"فوراً اس گڑھے سے نکلنا چاہیے۔ میرا خیال ہے وہ ہمیں ذہنوں کی طرح قابو میں کرنے کا کوئی بندوبست کرنے گئے ہیں اور ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ ہمیں اس گڑھے سے نکلنا چاہیے لیکن کیسے؟" کیتھرین بولی۔ گڑھا تقریباً چودہ پندرہ فٹ گہرا تھا۔

"یہ کچھ اتنا زیادہ مشکل کام بھی نہیں۔ میں نے اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مسٹر چارلس! آپ میرے کندھوں پر اکڑوں سی حالت میں بیٹھ جائیے..... جلدی کیجیے..... مشین پسٹل وغیرہ لباس میں ہی چھپا لیجیے..... آپ کو اٹھتے وقت دونوں ہاتھ کنوئیں کی دیوار پر ٹکانا پڑیں گے....."

چارلس نے میری ہدایت پر عمل کرنے میں خاصی پھرتی دکھائی اور میرے کندھوں پر چڑھ بیٹھا۔ تب میں نے کیتھرین سے کہا۔ "تم اب اپنے پاپا کے کندھوں پر چڑھ جاؤ لیکن گڑھے سے سر نکالتے وقت ذرا ہوشیار رہنا..... کوئی گولی بھی تمہارا استقبال کر سکتی ہے۔"

کیتھرین کسی بندر کی سی پھرتی سے..... بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بندر یا کی سی پھرتی سے باپ کے کندھوں پر چڑھ گئی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ میں بازیگروں جیسا طریقہ اختیار کرنا چاہتا تھا جس سے کم از کم نیچے سے اوپر والا فرد کچھ کوشش کر کے نکل سکتا تھا۔ خصوصاً کیتھرین کے لیے یہ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ عام سی لڑکی نہیں تھی۔ اس کے لیے تو شاید گڑھے کے کناروں تک ہاتھ پہنچ جانا ہی کافی ثابت ہوتا۔

ان دونوں باپ بیٹی کا بوجھ کندھوں پر لیے میں اپنی ٹانگوں کی مضبوطی اور طاقت کو آزماتے ہوئے دھیرے دھیرے اٹھا۔ یہ کام میرے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ میرے کھڑے ہونے کے بعد چارلس بھی ہمت کر کے دیوار پر ہاتھ ٹکاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس کے لیے شاید اپنی سبک وجود بیٹی کا وزن بھی کافی تھا۔ تاہم یہ غنیمت تھا کہ اس نے توازن خراب نہیں ہونے دیا۔

اس کے کندھوں پر کیتھرین تو خاصی پھرتی سے کھڑی ہو گئی اور اس کے لیے نہ صرف ہاتھ گڑھے سے باہر لے جانا بلکہ سر بھی نکال لینا آسان ثابت ہوا۔ تاہم اس نے میری ہدایت کے مطابق نہایت آہستگی سے سر نکال کر پہلے چاروں طرف دیکھا پھر وہ سر نیچے جھکاتے ہوئے تیز سی سرگوشی میں بولی۔ "فی الحال تو آس پاس کوئی نظر نہیں آ رہا۔"

"اللہ کا نام لے کر نکل جاؤ اور گڑھے کے کنارے پر لیٹ کر اپنے پاپا کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا پھر چارلس کو سمجھایا کہ اسے کیتھرین کا ہاتھ یا اس کی لٹکائی ہوئی کوئی چیز تھام کر کنوئیں کی دیوار پر پاؤں ٹکاتے ہوئے اوپر چڑھنا تھا تاکہ کیتھرین کے لیے اسے باہر کھینچنا آسان ہو جائے۔ کنوئیں کی دیوار کچی اور ناہموار تھی۔ اس پر جگہ جگہ پاؤں مضبوطی سے ٹکایا جا سکتا تھا۔

کیتھرین ایک بار پھر بندر یا کی سی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گڑھے سے نکل گئی اور اس کے بعد بھی خیریت ہی رہی۔ کوئی دھماکا، کوئی چیخ سنائی نہیں دی لیکن جب کیتھرین نے گڑھے کے کنارے لیٹ کر چارلس کا ہاتھ تھامنا چاہا تو وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کا ہاتھ چارلس کے ہاتھ تک نہیں پہنچ سکا تاہم اس نے جلدی سے ایک ٹوٹی ہوئی شاخ تلاش کر کے گڑھے میں لٹکائی اور درمیانی خلا پُر ہو گیا۔ چارلس نے شاخ پکڑی اور لرزاں و ترساں کسی طرح گڑھے سے نکل ہی گیا۔

اب صرف میرا مسئلہ باقی تھا اور میں کنوئیں کی تہ میں تھا۔ ان کے پاس کوئی ایسی رسی وغیرہ نہیں تھی جسے وہ نیچے لٹکا سکتے لیکن کیتھرین کو جتنا سہارا مل گیا تھا، اتنا ہی کافی تھا۔ وہ میرا مقصد سمجھ رہی تھی۔ اس کا ذہن اور جسم دونوں تیزی سے کام کر رہے تھے۔ وہ باپ کی مدد سے جلدی سے ایک درخت کی لمبی سی شاخ توڑ کر لائی۔

ان دونوں نے کنارے پر لیٹ کر شاخ گڑھے میں لٹکائی۔ خوش قسمتی سے میرا ہاتھ اس تک پہنچ گیا۔ میرے لیے اتنا ہی سہارا کافی تھا۔ میں نے گڑھے کی دیوار پر پاؤں جماتے ہوئے اس طرح چڑھنا شروع کیا کہ اپنا بیشتر وزن میں خود ہی سہار سکوں اور ان دونوں کو زیادہ دشواری نہ ہو۔ چند لمحے بعد میں بھی گڑھے سے باہر تھا۔

اس کام میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی اور باہر آنے کے بعد گویا یقین بھی نہیں آ رہا تھا کہ چند لمحے پہلے ہم خاصی مشکل میں گرفتار تھے۔ مشکل یہ تھی کہ اس قسم کے حالات میں اگر ذرا سی آسانی میسر آتی تھی تو وہ مجھے خدا از علت نہیں لگتی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر وہ قبائلی کسی کو بلا کر لانا ہی چاہتے تھے تو دونوں ہی کیوں چلے گئے تھے؟ ان میں سے ایک جا سکتا تھا اور دوسرا گڑھے کے قریب نگرانی کے لیے موجود رہ سکتا تھا۔ مجھے شبہ محسوس ہو رہا تھا کہ ان میں سے کوئی قریب ہی کہیں چھپا ہماری تمام حرکات و سکنات کا جائزہ نہ لے رہا ہو اور یہ سوچ کر لطف اندوز نہ ہو رہا ہو کہ کسی بھی لمحے ٹریگر دبا کر وہ ہماری ساری اُچھل کود یہیں روک دے گا، ہمیں ہمیشہ کے لیے ساکت کر دے گا۔

ہم تینوں نے تین مختلف سمتوں میں منہ کر لیے اور کندھے سے کندھا جوڑ لیا۔ اس طرح ہم تقریباً ہر طرف کا جائزہ لیتے ہوئے دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگے۔ جنگل کا سکوت برقرار رہا۔ کسی طرف سے کوئی گولی نہ آئی اور نہ ہی کسی نے ہمیں للکارا۔ وہ گدھ والا بھی ہمیں کہیں دکھائی نہ دیا۔ اگر وہ اپنے راستے پر ہی رواں رہا تھا تو اب اس کے نظر آنے کی امید بھی نہیں تھی کیونکہ ہم اپنا

انت میں اسی طرف واپس جا رہے تھے جدھر سے آئے تھے۔

جب کئی منٹ تک کچھ نہ ہوا تو ہمارے تنے ہوئے اعصاب ہلے پڑنے لگے تاہم کیترین کی حیرت اب بھی برقرار تھی کہ آخر وہ دونوں قبائلی کہاں غائب ہو گئے تھے۔ وہ تقریباً سرگوشی میں بولی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آیا آخر سیوبک کا پلان کیا تھا؟ وہ ہمیں کس طرح گھیرنا اور سزا دینا چاہتا تھا؟"

"فی الحال جسم کو حرکت میں رکھنا زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے دماغ پر زیادہ زور مت دو۔" میں نے مشورہ دیا۔

وہ شاید میرے مشورے کے بارے میں کوئی اظہارِ خیال کرنے لگی تھی کہ اچانک کوئی چیز ہمارے قریب ہی گر کر پھٹی۔ دھماکا زبردست زوردار نہیں تھا لیکن میں نے احتیاطاً تیزی سے زمین پر گرتے ہوئے اس طرف فائر بھی کر ڈالا جدھر سے میرے خیال میں چیز پھینکی گئی تھی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری چلائی ہوئی گولی کسی کو لگی تھی یا نہیں لیکن مجھے یہ احساس ضرور ہو گیا کہ میں نے زمین پر گر کر غلطی کی تھی۔ وہ کوئی گرینیڈ نہیں تھا جو ہمارے قریب پھٹا تھا۔ وہ بے ہوش کر دینے والی کسی نہایت ہی سریع الاثر گیس کا شیل تھا۔ اگر ہمیں ذرا بھی شبہ ہوتا کہ وہ اس قسم کی کسی گیس کا شیل ہو گا تو ہم تیزی سے ادھر اُدھر بھاگ کر اس کے اثر سے بچنے کی کچھ کوشش کر سکتے تھے لیکن زمین پر گر کر ہم نے گویا فوراً ہی گیس کو سانس کے ذریعے جسم میں داخل کر لینے کا بندوبست کر لیا تھا۔

میں نے اور کیترین نے فوراً ہی اٹھ کر ایک طرف کو بھاگنے کی کوشش کی۔ اسے بھی یقیناً احساس ہو گیا تھا کہ وہ گیس کیسی تھی لیکن ہمیں تاخیر ہو چکی تھی۔ وہ چار سیکنڈ میں ہی وہ جتنی مقدار میں ہمارے پھیپھڑوں میں پہنچ چکی تھی اتنی ہی ہمارے اعصاب کو شل کر دینے کے لیے کافی تھی۔

کیترین مجھ سے بھی پہلے گر پڑی۔ میں نے دودھیا سے دھوئیں کے مرغولوں سے نکلنے کی کوشش کی لیکن ذہن اور جسم نے میرا ساتھ نہ دیا۔ میں لڑکھڑا کر گرا پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

میری آنکھ کھلی تب بھی مجھے اپنے گرد دودھیا دھواں ہی دکھائی دیا۔ میرا جسم گویا لوہے کی طرح بھاری ہو گیا تھا اور اپنی جگہ سے حرکت کے قابل نہیں رہا تھا لیکن زبان گویا دھنی ہوئی روئی کا گولا بن کر منہ میں پھنس گئی تھی۔ میں نے ہاتھ پاؤں ہلانے کی بہت کوشش کی لیکن انہیں جنبش دینے میں بھی کامیاب نہ ہو سکا تاہم دودھیا دھواں رفتہ رفتہ تحلیل ہونے لگا۔

پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ دودھیا دھواں میرے تخیل کی پیداوار تھا۔ درحقیقت دھواں وہاں موجود نہیں تھا لیکن میں نے بے ہوش ہوتے وقت آخری چیز وہ دھواں ہی دیکھی تھی شاید اس لیے اب بھی مجھے وہی نظر آ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ دھواں غائب ہوتا گیا اور اس کے درمیان سے مجھے ایک چہرہ نمودار ہوتا دکھائی دیا۔

چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ میں نے اپنے مشتعل ذہن پر زور دیا تو یاد آیا کہ وہ سیوبک کا چہرہ تھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ میری آنکھوں کی دھندلاہٹ کچھ اور کم ہوئی تو احساس ہوا کہ وہ مسکرا نہیں رہا تھا بلکہ اس کے ہونٹ اذیت زدہ انداز میں کھنچے ہوئے تھے اور وہیں ساکت ہو کر رہ گئے تھے۔

پھر مجھے احساس ہوا کہ اس کی آنکھیں زندگی کے نور سے خالی تھیں۔ میں نے آنکھیں ملنا چاہیں لیکن ہاتھوں کو حرکت نہ دے سکا تب مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں نے آنکھوں کو زور سے بھینچ کر دوبارہ کھولا تو منظر مجھے کچھ اور صاف دکھائی دیا۔ تب مجھے پتا چلا کہ میرے سامنے سیوبک مکمل حالت میں نہیں بیٹھا تھا۔

وہ صرف اس کا کٹا ہوا سر تھا جو لکڑی کے ایک تخت پر رکھا تھا۔ اس کا دھڑ غائب تھا۔ میں خود اس چوبی تخت کے قریب ہی زمین پر پڑا تھا۔ کیترین اور چارلس بھی میرے قریب ہی پڑے تھے لیکن وہ ابھی بے ہوش ہی تھے۔

تخت کے ایک طرف وہی مفلوک الحال دہقان کھڑا تھا جسے میں نے جنگل میں گدھے کو ہانکتے ہوئے جاتے دیکھا تھا لیکن اب وہ

عظیم مدبر عظیم قائد (زاہد حسین انجم) -/150

(قائداعظم محمد علی جناح کے حالاتِ زندگی)

قائد ملت لیاقت علی خان (زاہد حسین انجم) -/150

(پاکستان کے پہلے وزیراعظم کے حالاتِ زندگی)

مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور 2

کنکا کے بجلی ناگ

اے حمید ○ قیمت 80/00 روپے

دیا۔ مسکین اور مخبوط الحواس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے چہرے سے گویا کوئی کینچلی سی اُتر گئی تھی۔ اس کی آنکھیں کسی سانپ کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے پیروں میں وہ لمبی سی بوری پڑی تھی جو میں نے اسے گدھے پر لادے لے جاتے دیکھا تھا۔

اس وقت اس بوری کا منہ کھلا تھا۔ اس نے جھک کر بوری کے ایک کونے پر پاؤں رکھ کر دونوں ہاتھ اندر ڈال کر کچھ کھینچا۔ دوسرے ہی لمحے ایک انسانی دھڑ باہر آگیا۔ میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ سیوبک کا دھڑ تھا۔ دہقان نے دھڑ بھی اُٹھا کر تخت پر ڈال دیا اور سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اب اس کی کمر میں کوئی خم وغیرہ نظر نہیں آرہا تھا۔

"اسے..... اسے کس نے ہلاک کیا ہے؟" میں نے نحیف سی آواز میں پوچھا اور سیوبک کی سر بُریدہ لاش کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے اس کی حماقتوں نے ہلاک کیا ہے۔" دہقان نے صاف ستھری انگریزی میں کھنک دار لہجے میں جواب دیا۔

"تم..... تم کون ہو؟" میں بڑی دشواری سے اپنی زبان کو حرکت دے رہا تھا۔

"مجھے تم اپنا خادم ہی سمجھو۔ زیادہ تر لوگ مجھے حمان کے نام سے جانتے ہیں۔" اس نے سفاکانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

میرے جسم میں جو تھوڑی بہت جان آئی تھی وہ بھی گویا دوبارہ نکل گئی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اپنے آپ کو اس امید سے بہلانے کی کوششیں کی کہ شاید یہ کوئی ڈراؤنا خواب تھا جسے جلد یا بدیر آخر کار ختم ہو جانا تھا لیکن دل بے ایمان اس بہلاوے میں نہ آیا۔ اندر ہی اندر کوئی سرگوشی کر رہا تھا کہ حقیقت وہی تھی جو اس وقت میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔

اس شخص کو ہم نے جنگل میں اپنے متوازی چلتے دیکھا تھا اور اس وقت ہمیں گماں بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ حمان تھا۔ اس کے گدھے پر جو لمبی سی بوری لدی ہوئی تھی اس میں سیوبک کی سر بریدہ لاش تھی جس کی اب وہ گویا نمائش کر رہا تھا۔

سیوبک خواہ کیسا ہی آدمی تھا اور گزشتہ روز اس کا رویہ خواہ کیسا ہی رہا تھا اس کے باوجود اس وقت مجھے اس کا کٹا ہوا سر لکڑی کے تخت پر رکھا دیکھ کر صدمہ پہنچا تھا۔ وہ شخص جس نے نہ جانے کیسے کیسے مضبوط حفاظتی حصاروں میں رہنے والی ہستیوں کو راہِ عدم دکھائی تھی خود کیسی خاموشی سے دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔ حمان یقیناً اس کا استاد ثابت ہوا تھا۔ اس دنیا میں ہر سیر کے لیے سوا سیر موجود تھا۔

میں نے گہری نظر سے حمان کا جائزہ لیا۔ وہ ایک پست قامت شخص تھا اور عمر چور معلوم ہوتا تھا۔ شاید اس کی عمر چالیس کے قریب ہو لیکن وہ بہ مشکل نہیں کا نظر آتا تھا۔ اس کی شخصیت میں

پھولوں کی سیج پر پروان چڑھنے والے ایک نواب زادے کی خودنوشت

درخشاں

لازوال کہانیوں کے خالق انوار صدیقی کی اپنے قارئین کے لیے ایک نئی سوغات تین دوستوں کا قصہ جن کے عزم و استقلال سے طوفان شکست کھا گئے تھے۔

دو حصوں میں مکمل

حصہ اول 45/-

حصہ دوم 45/-

ناشر: مکتبہ انشائیہ، ہمدرد نگار روڈ، لاہور 2

فون: 7224665

اس کے سوا کوئی بھی قابلِ ذکر خصوصیت نہیں تھی کہ چہرے مہرے اور آنکھوں سے وہ بے پناہ شاطر اور چُرتیلا نظر آرہا تھا لیکن اپنی اس خصوصیت کو بھی شاید وہ ضرورت پڑنے پر نہایت کامیابی سے چھپا لیتا تھا کیونکہ جب ہم نے اسے جنگل میں گدھا ہنکاتے آتے دیکھا تھا تو اس کے چہرے پر یا اس کی آنکھوں میں مکاری، خباثت یا چُرتی کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دی تھی۔ وہ واقعی ایک سست اور مسکین قسم کا مزدور دکھائی دیا تھا۔ شاید اس کی بے ضرر اور نہایت عام سی نظر آنے والی شخصیت ہی اس کا سب سے بڑا سرمایہ تھی۔ وہ کہیں بھی عام آدمیوں کی بھیڑ میں اس طرح گم ہو سکتا تھا کہ شاید کوئی اس پر ایک نظر ڈالنے کے بعد دوسری نظر ڈالنے کی زحمت نہ کرتا۔

کیتھرین اور چارلس بھی دھیرے دھیرے ہوش میں آرہے تھے۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ اپنی جگہ ساکت لیٹا ہونے کے باوجود اپنی رگ و پے میں پھیلتی ہوئی بے بسی کسی طرح دور کر سکوں۔ حمان بلاشبہ اونچا فنکار تھا۔ وہ مجھ جیسے "شاک پروف" شخص کو بھی اچھا خاصا شاک پہنچانے میں کامیاب رہا تھا۔

اس کی فرنچ کٹ داڑھی اور مونچھوں کے درمیان پتلے پتلے سفاک ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی خفیف سی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ خود بھی اس صورتِ حال سے خاصا لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مجھے مختلف قوموں کے افراد کو چہرے مہرے سے پہچاننے کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ ویسے بھی بہت سی قوموں کے افراد کی شکلیں اور نین نقش آسانی سے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو سکتے ہیں۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے حمان کے چہرے میں ایک یہودی کی جھلک دکھائی دی۔ اس کی شکل و صورت کا مجموعی طور پر مجھ پر جو تاثر مرتب ہو رہا تھا اسے میں "یہودیت" کے سوا کوئی نام نہیں دے سکا۔

وہ دونوں قبائلی جنہیں ہم سیوبک کے آدمی سمجھے تھے، اس وقت کمرے کے دو مختلف گوشوں میں لکڑی کی ٹوٹی ہوئی پیٹھوں پر بیٹھے تھے۔ دونوں کی گود میں گنیں تھیں۔ وہ بالکل بے پروا اور صورتِ حال سے کچھ لاتعلق سے نظر آرہے تھے۔ ہم اس وقت جس کمرے میں موجود تھے وہ غالباً کسی سالخوردہ چوبی کیبن کا حصہ تھا۔ اس کا فرش بھی لکڑی کے تختوں کا تھا جو جگہ جگہ سے گل رہے تھے۔ کیبن کا دروازہ نیم شکستہ تھا لیکن بند تھا۔ وہاں گرمی یا گھٹن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ شاید یہ میرے اندر پھیلی ہوئی یخ بستگی کا کمال تھا۔

"تم یقیناً افضل چودھری ہو۔ مجھے تم سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔" وہ پہلے ہی کی طرح شستہ انگریزی میں کھنک دار لہجے میں بولا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے ہماری ملاقات کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر پر ہو رہی ہو اور وہ نہایت تہذیب و شائستگی سے اپنے جذبات کا اظہار کر رہا ہو۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں اس وقت غیر محسوس طریقے سے یوگا کی مشق کے ذریعے اپنی کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیتھرین اور چارلس بھی ہوش میں آچکے تھے اور آنکھیں پٹ پٹا رہے تھے۔ کیتھرین کی حالت بہرحال چارلس سے بہتر نظر آرہی تھی لیکن سیوبک کی لاش دیکھ کر اسے بھی یقیناً زوردار جھٹکا لگا تھا حالانکہ گزشتہ روز سے تو وہ اس کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں رہی تھی۔

"تم..... تم حمان ہو؟" وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں بولی۔

"بے شک خاتون! آپ نے ٹھیک پہچانا۔" حمان نہایت مؤدبانہ انداز میں سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا جھکتے ہوئے بولا۔

"سیوبک تمہارے ہتھے کیسے چڑھ گیا؟" یہ سوال گویا قطعی غیر ارادی طور پر یکدم کیتھرین کے ہونٹوں پر آگیا۔ اس کا لہجہ فی الحال کسی مریض کی کراہ سے مشابہ تھا۔ چارلس بھی ٹکر ٹکر چاروں طرف دیکھنے پر ہی اکتفا کیے ہوئے تھا۔

حمان نے کچھ اس طرح ہلکا سا قہقہہ لگایا کہ آواز اس کے حلق میں ہی گھومتی محسوس ہوئی۔ وہ گویا اس سوال سے..... یا پھر شاید اس صورتِ حال کو یاد کر کے لطف اندوز ہوا تھا جس میں سیوبک اس کے ہتھے چڑھا تھا۔

"سیوبک خود بخود میرے ہتھے نہیں چڑھا تھا خاتون!" اس نے اپنے مخصوص شائستہ انداز میں جواب دیا "اس کے لیے مجھے کچھ کوشش..... نہایت تیزی سے کچھ منصوبہ بندی کرنا پڑی تھی۔ ہر کام کو کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی طریقہ کارگر ہو ہی جاتا ہے۔ سیوبک قبائلی آدمی تھا۔ میں نے اسے سزا دینے کے لیے بھی نہایت قدیم طریقہ ہی منتخب کیا۔ میں نے سوچا شاید اس طرح اس کی روح عالمِ بالا پر زیادہ مطمئن و مسرور رہے۔"

اس نے جھک کر تخت پر ذرا پیچھے کی طرف پڑی ہوئی کوئی چیز اُٹھائی۔ وہ چاپڑ سے مشابہ، چوڑے پھل کی نہایت بھاری بھرکم تلوار تھی۔ ایسی تلوار شاید پرانے وقتوں میں شاہی جلاد مجرموں کا سر قلم کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس تلوار پر اب بھی خون لگا نظر آرہا تھا جو خشک ہو چکا تھا۔

وہ تلوار کو چہرے کے قریب لا کر بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے طمانیت سے مسکرایا لیکن پھر متاسفانہ سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا "کم از کم سیوبک کو اپنے ایک ہم پیشہ کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"کیسا نہیں کرنا چاہیے تھا؟" کیتھرین نے غیر ارادی سے انداز میں پوچھا۔

حمان نے مغموم سے انداز میں سر ہلایا گویا اسے اس سوال سے صدمہ پہنچا ہو۔ پھر وہ تلوار واپس تخت پر رکھتے ہوئے بولا "مس کیتھرین! اس حد تک معصومی سادگی، معصومیت اور بھولپن اچھا نہیں ہوتا۔ آپ لوگوں سے بہتر کون جانتا ہے کہ سیوبک نے کیا کیا۔ میں اپنا کام کر رہا تھا۔ آپ لوگوں کا تو مجھے روکنے کی

کوشش کرنا سمجھ میں آتا ہے لیکن اس بدبخت سیوبک کو آپ کے ساتھ کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑے ہونے کی کیا پڑی تھی؟ مجھے یقین ہے کہ مسٹر چارلس یا کسی اور کو سیوبک نے ہی خبردار کیا ہوگا کہ لیڈی ڈانا کے قتل کا کنٹریکٹ مجھے ملا ہے؟"

اس نے تصدیق طلب نظروں سے چارلس کی طرف دیکھا لیکن چارلس بدستور آنکھیں پٹ پٹاتا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اگر اس کے حواس صحیح طور پر کام کرنے بھی لگے تھے تو وہ اس کا اظہار نہیں کررہا تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے حمان بولا "یہ اپنے پیشے سے غداری تھی۔ سیوبک بے شک مجھے نہیں جانتا تھا، کبھی مجھ سے نہیں ملا تھا۔ ہمارا ایک دوسرے سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا لیکن اسے میرے پیشے کے بارے میں معلوم تھا۔ یوں ہم ایک ہی نادیدہ زنجیر میں بندھے ہوئے تھے۔ اس قسم کے پیشوں سے تعلق رکھنے والوں کی آنکھ میں ایک دوسرے کے لیے شرم و لحاظ ہونا چاہیے۔ وہ اگر ایک دوسرے کی مدد نہ کرسکیں تو کم از کم انہیں ایک دوسرے کی جڑیں نہیں کاٹنی چاہئیں۔"

حمان کا لہجہ اخلاقیات کے کسی مبلغ کا سا ہوگیا تھا۔ میں بس ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جارہا تھا۔ کم بخت تھیٹر کا کوئی بہت منجھا ہوا اداکار معلوم ہوتا تھا اور یقیناً کافی ستم ظریف بھی واقع ہوا تھا۔

پھر وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "اس سے پہلے میرا کوئی منصوبہ ناکام نہیں ہوا تھا۔ شاید اس لیے مجھے ناکامی کا منہ دیکھنے کی عادت ہی نہیں رہی۔ کبھی اس امکان کو ذہن میں رکھنے کا بھی خیال نہیں آیا کہ میرا منصوبہ ناکام ہوسکتا ہے۔ اس لیے اس اہم کنٹریکٹ میں ناکام رہنے کا صدمہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا مسٹر افضل چودھری! میری ساکھ تباہ ہوگئی۔ مستقبل تاریک ہوگیا۔ بہت ہی بڑی رقم صرف کرکے میں نے حال ہی میں ایک نیٹ ورک قائم کیا تھا۔ بہت بڑی انوسٹمنٹ کی تھی۔ مجھے دنیا کے مختلف گوشوں میں کئی بہت ہی اہم کنٹریکٹ ملنے کی اُمید تھی لیکن سب کچھ تباہ ہوگیا، سب کچھ ڈوب گیا مسٹر چودھری!"

دنیا واقعی بڑی ترقی کررہی تھی۔ قتل و غارت بھی ایک کاروبار، ایک انڈسٹری بن گیا تھا۔ اس کے بھی پھلنے پھولنے اور "نیٹ ورک" قائم کرنے کے تذکرے سنجیدگی سے کیے جاتے تھے۔ اس میں "ساکھ" خراب ہونے کا افسوس کیا جارہا تھا!

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ ڈرامائی سے انداز میں سیوبک کے کٹے ہوئے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "میری تباہی کا اصل ذمے دار تو یہی شخص تھا۔" پھر اس کی انگلی ڈرامائی انداز میں ہی میری طرف گھوم گئی "لیکن اگر تم موجود نہ ہوتے تو سیوبک کی ساری کوششیں دھری کی دھری رہ جاتیں۔ تم نے عین آخری لمحوں میں اپنی جان پر کھیل کر میرے منصوبے کو ناکام بنادیا۔ تب سے میں حیران تھا کہ آخر تم کون ہو؟ دنیا کی کون سی خفیہ ایجنسی سے تمہارا تعلق ہے؟ پھر مجھے معلوم ہوا تم پاکستان کے ایک بزنس مین ہو تو میں اور بھی زیادہ حیران ہوا۔ بزنس مین تم جیسے تو نہیں ہوتے مسٹر چودھری!"

"شاید میں غلطی سے بزنس مین بن گیا ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا "تمہیں کس نے میرے بارے میں بتایا؟"

"سیوبک نے" اس نے اطمینان سے جواب دیا "وہ اور اس کے چند آدمی گاؤں سے آتے وقت میرے اور میرے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ میں اس کا حساب برابر کرنے کے لیے اس کی گھات میں تھا۔ میں حساب برابر کرنے میں دیر نہیں کرتا۔ سیوبک نے زندگی کے آخری لمحوں میں مجھ سے بڑا تعاون کیا۔ اس کے لیے میں اس بے چارے کا شکرگزار رہوں گا۔ میں نے جو کچھ اس سے پوچھا۔ اس نے ٹھیک ٹھیک جواب دیا۔ تم لوگوں کے بارے میں جو کچھ بھی اسے معلوم تھا مجھے بتادیا۔"

"وہ رقعہ بھی اسی نے لکھا ہوگا جو ہمیں یہاں لانے کا سبب بنا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"بے شک" حمان نے طمانیت سے سر ہلایا "میں کوئی جعلسازی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب سیوبک ہر طرح سے تعاون کررہا تھا تو مجھے کوئی کچا کام کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ زندگی کی آس بڑی بُری چیز ہوتی ہے مسٹر چودھری! جان بچ جانے کی آس پر انسان آخری لمحے تک ہر کام کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ سیوبک کو بھی زندگی کے آخری لمحے تک آس رہی کہ شاید میں اسے چھوڑ دوں گا۔"

"تم نے اس کے آدمیوں کو بھی ہلاک کردیا؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ میں انہیں خاطر تواضع کے لیے ساتھ تو نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ یونہی بے وقوف سے قبائلی تھے۔ میرے لیے دشواریاں پیدا کرسکتے تھے۔" اس نے بے پروائی سے کہا پھر اپنے آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ انہی کے لباس تو پہنے کھڑے ہیں۔ کچھ لوگ باہر بھی ہیں جو انہی کے لباسوں میں ہیں۔ سیوبک کا لباس میں خود پہننا چاہتا تھا لیکن پھر مجھے ایک چرواہا مل گیا جس کے پاس ایک گدھا بھی تھا۔ مجھے اپنے کام کے لیے وہ ... زیادہ موزوں نظر آیا۔"

"تم اونچے درجے کے قاتل کے بجائے نچلے درجے کے کوئی ڈراما باز معلوم ہوتے ہو۔" میں نے اندر ہی اندر اپنے آپ کو پہلے کی طرح توانا محسوس کرتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر قدرے تکلیف کے آثار اُبھر آئے "تم مجھے ڈراما باز ضرور کہو لیکن نچلے درجے کا مت کہو۔ میں اگر اعلیٰ درجے کا قاتل نہ ہوتا تو یقیناً اعلیٰ درجے کا اداکار یا ہدایت کار ہوتا۔"

میں نے لیٹے ہی لیٹے طویل و عریض کمرے میں نظر دوڑانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا "سیوبک کے آدمیوں کی لاشیں کہاں ہیں؟"

"وہ غیر اہم لاشیں تھیں۔ ہم نے انہیں جنگل میں اِدھر اُدھر دبا دیا تھا۔ آخر درندوں اور پرندوں وغیرہ کو بھی تو پیٹ بھرنا ہے۔ سیوبک کی لاش البتہ اہم تھی۔ اسے میں خود اٹھائے رہا تھا۔ کاش مجھے ریڈ انڈینز کی طرح کھوپڑی سکیڑنے کا نسخہ معلوم ہوتا تو میں ضرور اس کی کھوپڑی کو فتح کی یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھتا۔"

"ہمارے بارے میں تمہارے ارادے کیا ہیں؟" میں نے پوچھا گو کہ مجھے امید نہیں تھی وہ اس سوال کا صحیح جواب دے گا لیکن اس سے کچھ بعید بھی نہیں تھا۔ اس وقت اس کی خود اعتمادی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ صورتِ حال سے خوب لطف اندوز ہورہا تھا۔ دوسری باتیں بھی کافی حد تک صحیح بتا رہا تھا۔ عین ممکن تھا اس سوال کا بھی صحیح جواب دے دیتا اور ہماری کیفیت سے مزید لطف اندوز ہوتا۔

میرے ہاتھ اور پاؤں دونوں ہی سختی سے بندھے ہوئے تھے اور میں خاصی تکلیف کی حالت میں ترچھا سا فرش پر پڑا تھا۔ ہاتھ پشت پر باندھے گئے تھے اور وہ میرے نیچے ہی تقریباً چھپے ہوئے تھے۔ کیتھرین اور چارلس کی حالت بھی مجھ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ چارلس کے چہرے سے تو تکلیف کے علاوہ مایوسی کا بھی اظہار ہورہا تھا جبکہ کیتھرین کا چہرہ سپاٹ تھا۔ میں غیر محسوس طور پر زور آزمائی کرکے دیکھ چکا تھا۔ مجھے اپنے ہاتھوں کی بندشیں کھلتی یا ڈھیلی ہوتی محسوس نہیں ہوئی تھیں۔ زیادہ زور آزمائی کرنے پر شاید کوئی فرق پڑتا لیکن ان لوگوں کی آنکھوں کے سامنے میں پوری طرح زور آزمائی بھی نہیں کرسکتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں سفاک سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور دھیرے دھیرے اس کے ہونٹوں تک آگئی۔ جواب دینے سے پہلے اس نے بطورِ خاص کیتھرین کا گہری نظروں سے سرتاپا جائزہ لیا۔ وہ کچھ اس طرح آڑی ترچھی پڑی تھی کہ اس کے حسین نشیب و فراز کچھ اور نمایاں ہوگئے تھے۔ اوپر سے اس کا سُرخ بھڑکیلا لباس بھی کچھ جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ حالات کی سنگینی اپنی جگہ تھی اور اس کے سراپا کی حشر خیزی اپنی جگہ۔ اس شکستہ حالی میں بھی وہ کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔ خصوصاً حمان کے لیے! کیونکہ وہ اس انٹ ماسٹر آف سیچویشن تھا۔ سب کچھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ہر بات سے لطف اندوز ہورہا تھا اور مزید ہوسکتا تھا۔

وہ ایک انگلی سے دھیرے دھیرے ناک مسلتے ہوئے بولا "تم لوگوں کے بارے میں میں بڑی اُلجھن میں ہوں۔ ابھی تک میں فیصلہ نہیں کرپایا کہ تمہیں کس طرح ہلاک کیا جائے۔ گولی مار دینا تو کوئی بات نہ ہوگی۔ تلوار سے گردن قلم کرنے کا تجربہ میں سیوبک پر کرچکا ہوں۔ مسئلہ یہ بھی نہیں ہے کہ میں تم لوگوں کو بہت زیادہ اذیت دے کر ہلاک کرنا چاہتا ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں انتقامی طور پر ریڈیکل نہیں ہوں۔ بہت زیادہ اذیت پسند نہیں ہوں۔ خصوصاً اپنے قابو میں آئے ہوئے افراد کو زیادہ اذیتیں دینا میرا مشغلہ نہیں ہے لیکن میں چاہتا ہوں قتل کے طریقوں میں کچھ ورائٹی ہو، کچھ تنوع ہو۔ مشکل یہ ہے کہ یہاں ہمیں زیادہ سہولیات اور زیادہ سازوسامان میسر نہیں ہے ورنہ تم لوگوں کو ٹھکانے لگانے کے کافی متنوع طریقے اختیار کیے جاسکتے تھے۔"

میں اس وقت اپنے آپ کو پرسکون رکھنے اور رہائی کی کسی تدبیر کے سلسلے میں ذہن لڑانے کی پوری پوری کوشش کررہا تھا لیکن اس لمحے میرا بڑی شدت سے دل چاہا کہ کسی معجزے کے تحت میرے ہاتھ پاؤں بندشوں سے آزاد ہوجائیں اور میں نتائج کی پروا کیے بغیر اس اُلّو کے پٹھے پر ٹوٹ پڑوں اور اگر مرنا مقدر میں ہو تب بھی مرنے سے پہلے اس کی گردن توڑنے کی ایک بھرپور کوشش کرسکوں لیکن محض سوچنے اور خواہش کرنے سے بندشیں نہیں کھلتیں اور مجھ جیسے گناہ گار کو معجزوں کی امید بھی کم ہی رکھنی چاہیے تھی۔

حمان بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میں نے ایک بار ایک دستاویزی فلم میں ایک شخص کو بجلی کی کرسی پر موت کی سزا پاتے دیکھا تھا۔ مجھے وہ منظر بہت دلچسپ لگا تھا۔ میرا دل چاہتا ہے کبھی میں خود اپنے ہاتھوں سے کسی کو بجلی کی کرسی پر بٹھا کر موت کی سزا دوں لیکن ...." اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "افسوس اس جنگل میں تو بیٹھنے کے لیے عام کرسی بھی دستیاب نہیں، بجلی کی کرسی تو بہت دور کی بات ہے۔ کاش میں تمہارے مضبوط اور درزشی جسم کو اور مس کیتھرین چارلس کے عمر رسیدہ پیکر کو شکنجی جھٹکوں کے ساتھ ٹیڑھا میڑھا ہوتے اور نیلا پڑتے دیکھ سکتا۔ کبھی کبھی فرصت میں بیٹھ کر آنکھیں بند کرکے یاد کرنے کے لیے یہ ایک عمدہ نظارہ ہوتا۔"

اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اذیت پسند نہیں تھا لیکن اس کے الفاظ کے پیچھے یقیناً ایک اذیت پسند بول رہا تھا تاہم وہ ذرا مختلف قسم کا اذیت پسند تھا۔ وہ متاسفانہ سے انداز میں دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا "اب تم ہی بتاؤ اس جنگل میں، اس بے سروسامانی کے عالم میں بھلا تم تینوں کو ہلاک کرنے کے سلسلے میں کیا ورائٹی پیدا کی جاسکتی ہے؟"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بے بسی کا احساس کچھ بڑھتا جارہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "ویسے یہاں قریب ہی ایک کنواں موجود ہے۔ پہلے میں نے سوچا تھا تم تینوں کو رسی سے اُلٹا لٹکا کر باری باری کنوئیں میں اُتارا جائے لیکن کنواں کافی گہرا ہے۔ میں تم لوگوں کی کیفیت کچھ زیادہ صحیح طور پر نہیں دیکھ سکوں گا۔"

اس نے خاموش ہوکر گویا میرے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن میرا اندازہ یہی تھا کہ میں اپنا چہرہ سپاٹ رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔ کیتھرین نے بھی کسی تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا البتہ چارلس کے چہرے سے تکلیف کا اظہار ہورہا تھا لیکن یہ

تکلیف یقیناً حمان کے الفاظ کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ وہ بندھے ہوئے ہاتھ پیروں کے ساتھ فرش پر پڑے پڑے زندگی سے بے زار ہو رہا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد حمان بولا "چنانچہ فی الحال میں نے نہایت قدیم اور نہایت سیدھے سادے طریقے پر اکتفا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یعنی نہایت معمولی سی رسی کا پھندا باری باری تم تینوں کے گلے میں ڈال کر تمہیں درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی جائے۔ تم لوگوں کو اپنی سزائے موت کے اس طریقے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

اس کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ فلاں سفر پہ جہاز کے بجائے ٹرین سے جانے پر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ خبیث اپنی پوزیشن سے کچھ زیادہ ہی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ لیڈی ڈائنا کو قتل کرنے کے سلسلے میں اس نے جس طرح زک اٹھائی تھی شاید اب اس کے جواب میں نفسیاتی طور پر بھی تسکین حاصل کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔

ہم تینوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حتیٰ کہ میں نے بھی اس کے بچگانہ اور احمقانہ سوال کے جواب میں کوئی اہانت آمیزبات کر کے اسے مزید چڑانے کی کوشش نہیں کی۔ شاید میری طرح اس وقت کیتھرین اور چارلس کے ذہن بھی کہیں اور الجھے ہوئے تھے۔

سچی بات یہ تھی کہ پہلے مجھ پر کچھ مایوسی اور اضمحلال سا طاری ہونے لگا تھا گو کہ اس سے قبل بھی زندگی میں بارہا ایسے مواقع آئے تھے جب مجھے زندگی سے مایوس ہو جانا چاہیے تھا لیکن میں نے مایوسی کو قریب نہیں پھٹکنے دیا تھا اور کسی نہ کسی غیبی امداد کے یقین سے خود کو سنبھالے رکھا تھا اور شاید اس یقین ہی کا کرشمہ تھا کہ کسی نہ کسی بہانے صورتِ حال پلٹ جاتی تھی لیکن آج میں نے حقیقتاً اپنے آپ کو مجبور سا پایا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی کہ مایوس آدمی درحقیقت دُہری موت مرتا ہے' اسے گویا مرنے سے پہلے ہی موت آجاتی ہے۔ یہ سب کچھ سوچنے کے باوجود میرے جسم میں جوش و خروش کی وہ لہر نہیں دوڑی تھی جو بساط کو اُلٹ دینے میں میری مدد کرتی تھی۔

مگر جب اس نے ہمیں رسی سے درخت میں لٹکا کر پھانسی دینے کی بات کی تو نہ جانے کیوں مجھے ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا۔ مایوسی کی برف کچھ پگھلتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ اندھیرے میں کوئی کرن سی نظر آنے لگی۔ یہ بھی کوئی حیرت انگیزی تجربہ تھا۔ اس نے ہمیں کوئی خوش خبری تو نہیں سنائی تھی۔

اس سے پہلے میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ اسی بے بسی کے عالم میں ہماری کھوپڑیوں میں محض ایک ایک گولی اُتار کر ہمارا قصہ پاک کر دے گا لیکن بیشتر قاتل چونکہ فطری طور پر اذیت پسند ہوتے ہیں' لمبے چکروں میں پڑ جاتے ہیں۔ وہ بھی لمبے چکروں میں پڑ گیا تھا۔

ہمیں اس طرح پھانسی دینے کے لیے انہیں یقیناً کچھ تردد کرنا پڑتا۔ بے شک ہمارے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے لیکن ہم کوئی ننھے منے بے جان کھلونے بھی نہیں تھے جنہیں نہایت آسانی سے اٹھا کر درخت سے لٹکا دیا جاتا۔ اس حالت میں بھی تھوڑا بہت تو ہل جُل سکتے تھے۔ میں اگر مرنے سے پہلے ٹکر مار کر ان میں سے کسی کی تکسیر بھی پھوڑنے میں کامیاب ہو جاتا تو بڑی طمانیت کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہوتا۔ میری خوشی کی وجہ محض اتنی سی تھی۔

اچانک باہر دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ حمان کے تاثرات یکدم ہی بدل گئے۔ ایک لمحہ پہلے تک وہ انتہائی مطمئن و مسرور نظر آرہا تھا۔ اس کی خود اعتمادی کی کوئی انتہا نہیں تھی لیکن یکدم ہی وہ ایک فکرمند چوہا نظر آنے لگا۔

اس نے چیخ کر کسی کو پکارا اور کسی ناقابلِ فہم زبان میں کچھ پوچھا۔ ایک جھاڑ جھنکاڑ سے چہرے نے دروازے سے جھانکا اور اسی زبان میں کوئی جواب دیا جو کم از کم میرے لیے ناقابلِ فہم تھی۔ کمرے میں حمان کے دو آدمی موجود تھے وہ بھی اچھل کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

جھاڑ جھنکاڑ چہرے کی بات سُنتے ہی وہ تینوں تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔ انہوں نے ہمارے بارے میں مزید کوئی احتیاطی تدبیر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ شاید اس لیے کہ ہم تو پہلے ہی سرتاپا "احتیاطی تدبیروں" میں ہی جکڑے ہوئے تھے۔ جن کے ہاتھ اور پاؤں رسیوں میں جکڑے ہوں' ان کے بارے میں مزید احتیاطی تدبیر کی کیا ضرورت تھی۔ حمان تو شاید ایک لمحے کے لیے ہمیں بھول ہی گیا تھا۔ وہ کچھ اس تیزی سے کمرے سے نکلا تھا جیسے کمان سے تیر نکلا ہو۔ اس کی پھرتی پر میں قدرے حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

دوسرے ہی لمحے باہر سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے گہری سانس لے کر چارلس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی ہی چمک تھی جیسی چوری چھپے دودھ پی جانے کے بعد بلی کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے خاصا بڑا تھا اور تیس بتیس سال کی ایک لڑکی کا باپ تھا لیکن اب میں اس سے دوستانہ انداز میں ہی بات چیت کرنے لگا تھا۔ احترام اور تکلفات کو میں نے بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

"کیا بات ہے آنے سے پہلے کچھ کام دکھا آئے تھے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں' آتے آتے میں نے ایک خاص آدمی کو بتا دیا تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ آتے وقت تم لوگوں کو سفیر کے مکان سے باہر بھیجنے کے بعد میں اندر ایک فون کرنے گیا تھا۔ کام کا آدمی ہے' شاید وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ یہاں پہنچ گیا ہے اور اس نے ہمارا سراغ بھی لگا لیا ہے۔"

"لیکن کیا اس نے آتے ہی اندھا دُھند فائرنگ بھی شروع

دی ہے؟ اس طرح تو تمہارا وہ کام کا آدمی ہمارا کام تمام بھی کر سکتا ہے۔" میں نے فائرنگ کی آوازوں سے کچھ اندازے لگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں' وہ بہت تجربہ کار آدمی ہے۔ جو کچھ کرے گا سوچ سمجھ کر کرے گا۔ مجھے ایس پر بڑا بھروسا ہے۔" چارلس جو سب سے زیادہ پریشان تھا اب یک بیک ہی اس کے لہجے میں سب سے زیادہ اعتماد جھلکنے لگی تھی۔

"حضرات! کیا آپ دونوں براہِ مہربانی میری طرف کچھ توجہ دیں گے؟" کیتھرین کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اگر میں اس وقت فرش پر بندھا ہوا نہ پڑا ہوتا تو یقیناً حیرت سے اُچھل پڑتا۔ وہ تقریباً اسی پوزیشن میں پڑی تھی جس میں' میں نے اسے چند لمحے پہلے دیکھا تھا لیکن اب اس کا ایک بازو ہوا میں بلند تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی ڈوبتا ہوا شخص کسی کو مدد کے لیے پکارنے اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ یعنی اس نے اپنا ہاتھ بندشوں سے آزاد کرا لیا تھا۔

"اب وقت کیوں ضائع کر رہی ہو۔ جلدی سے میرے ہاتھ بھی کھولو۔" میں نے گویا تڑپ کر کہا۔ باہر گولیوں کی تڑتڑاہٹ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

کیتھرین مسکراتے ہوئے پھرتی سے اٹھ بیٹھی۔ ایک ہاتھ آزاد ہو جانے کی وجہ سے اس کے دوسرے ہاتھ پر رسی ڈھیلے ڈھالے انداز میں بندھی رہ گئی تھی۔ کیتھرین نے اسے اُتار پھینکا لیکن اس کے پاؤں اب بھی بندھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اسے کچھ کھسک کر اور کچھ گھسٹ کر میرے قریب آنا پڑا۔

اس نے مجھے یوں دوسرے پہلو کے بل لڑھکا دیا جیسے قصائی بندھے ہوئے جانوروں کو ذبح کرتے وقت بے پروائی سے اِدھر اُدھر لڑھکا دیتے ہیں۔ وہ میری بندشوں سے الجھنے لگی تو میں نے پوچھا "تمہارا ہاتھ کیسے آزاد ہو گیا؟"

"شاید یہ صنفِ نازک ہونے کا ایک اور فائدہ تھا۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولی "شاید میرے ہاتھ ایسی سختی سے باندھے بھی نہیں گئے تھے جس سختی سے تمہارے باندھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ضرورت پڑنے پر خواہ میں کتنی ہی سخت جان ثابت ہوں لیکن میرے ہاتھ پیروں میں جو لچک اور نرمی ہے وہ تمہارے ہاتھ پیروں میں نہیں ہو سکتی۔"

"اللہ نہ کرے" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ گویا میری بات اَن سنی کر کے نہایت دھیمی آواز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی "وہ منحوس چھوٹی نسل کا بکرا جب تم سے بکسے میں الجھا ہوا تھا اس تمام وقت میں' میں اپنے ہاتھ کو سکیڑ سکیڑ کر رسی کے پھندے سے نکالنے کی کوشش ہی کرتی رہی تھی۔ اس کوشش میں میرا ہاتھ چھل کر رہ گیا ہے۔"

طنز و مزاح

پچ در پچ	مظفر بخاری	125/-
قصہ مختصر	مظفر بخاری	75/-
ایک سو ایک (کالم)	مظفر بخاری	90/-
گستاخی معاف	مظفر بخاری	100/-
ایک سو نو (کالم)	مظفر بخاری	100/-
چمن کو چلیے	مظفر بخاری	200/-

مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور نمبر2

"اس وقت جو کام تم نے دکھایا ہے اس میں تو اگر تمہارے ہاتھ کی کھال بھی اتر جاتی تو پروا نہیں تھی۔" میں نے دبے دبے جوش سے کہا۔

"ہاں' تمہیں بھلا کیوں پروا ہوتی۔ وہ تو میرے ہاتھ کی کھال ہوتی نا۔" وہ میری پسلیوں پر ہلکا سا گھونسا رسید کر کے بولی "تمہارے لیے خوش خبری یہ ہے کہ تمہارے ہاتھوں پر کچھ زیادہ ہی چھیدہ اور زیادہ ہی سخت قسم کی گرہیں لگی ہوئی ہیں۔ مجھ سے نہیں کھلی رہیں۔ شاید وہ لوگ تم سے ہی سب سے زیادہ خوف زدہ تھے۔"

"انہیں نہیں معلوم تھا کہ اصل فتنہ تم ہو۔" میں نے کراہ کر کہا "اب باتیں مت کیے جاؤ۔ تخت پر سے وہ تلوار اٹھاؤ اور رسیاں کاٹ ڈالو۔"

تخت تک جانے کے لیے اسے کُھلے دروازے کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔ اس نے پہلے سر ذرا سا آگے بڑھا کر دروازے سے جھانکا پھر گھسٹتی ہوئی تخت تک چلی گئی۔ اس نے شاید باہر جھانک کر کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا تھا تاہم اس نے اب بھی اپنے پیروں کی بندشیں کھولنے میں وقت صرف نہیں کیا۔

تلوار تخت سے اٹھا کر وہ لڑھکتی ہوئی واپس آئی اور سرگوشی میں بولی "واہ کیا شاندار تلوار ہے۔ اسے ہاتھ میں لے کر تو خواہ مخواہ ہی کسی کی گردن قلم کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"واقعی کم ظرف کے ہاتھ میں ہتھیار خطرناک ہوتا ہے۔" میں نے افسوس زدہ لہجے میں کہا "کہیں رسیاں کاٹنے کے بجائے میری گلائیاں نہ کاٹ دینا۔"

میرا جملہ پورا ہونے تک وہ میری بندشیں کاٹ چکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے پیروں کی بندشیں کاٹ ڈالیں پھر وہ اپنے باپ کی طرف متوجہ ہوئی جو یقیناً بے تابی سے اس کا منتظر تھا۔ باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن اپنا کام کرنے میں کیتھرین نے کوئی تاخیر نہیں کی تھی۔ چند سیکنڈ میں اس نے چارلس کو بھی بندشوں سے نجات دلادی تھی۔

میں اس دوران کلائیوں کو رگڑ کر خون کی گردش صحیح طور پر بحال کرچکا تھا' میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "لاؤ جلدی سے یہ تلوار مجھے دے دو۔ اس وقت ہمارے پاس اس کے سوا کوئی ہتھیار نہیں ہے۔"

وہ تلوار مجھے دیتے ہوئے بولی "لو' یہ اکلوتا ہتھیار بھی تم رکھ لو۔ سچ ہے مرد بڑے ہی خود غرض ہوتے ہیں۔"

"تمہیں تلوار کی کیا ضرورت ہے۔ تم تو نظروں کے تیر چلا کر ہی اپنا کام نکال سکتی ہو۔"

"نظروں کے تیر؟" اس نے حیرت سے دُہرایا۔ یہ خالص مشرقی اصطلاح شاید اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن اب وضاحتوں کا وقت نہیں تھا۔ حرکت میں رہتے ہوئے ہم جتنی باتیں کیے جارہے تھے وہی کافی تھیں۔

میں تلوار لے کر باہر کا جائزہ لینے کے لیے دروازے سے باہر جھانکنے کے ارادے سے آگے بڑھا۔ ابھی میں ایک ادھ کھلے پٹ کے قریب ہی پہنچا تھا کہ یک لخت تھوڑے ہی فاصلے پر کہیں سے دروازے پر ہلکی مشین گن کا برسٹ پڑا۔ آدھے پٹ کے پرخچے اُڑ گئے اور میں فوراً ہی فرش پر اوندھا گر پڑا۔

سب مشین گن اس کے بعد بھی وقفے وقفے سے کئی بار گرجی لیکن اب اس کا رخ شاید کسی اور طرف ہوگیا تھا۔ عقب سے کیتھرین فرش پر رینگتی ہوئی میرے قریب آئی اور نیچی آواز میں بولی "اوندھے کیوں گر گئے میرے شیر؟ تلوار لے کر گولیوں کی بوچھاڑ میں نکل جاؤ اور کشتوں کے پشتے لگادو۔"

"خاموش رہو آستین کے سانپ کی مادہ!" میں نے نیچی آواز میں مصنوعی خفگی سے کہا "اگر تمہیں مجھ کو مروانے کا اتنا ہی شوق ہے تو ویسے ہی چیخ کر انہیں مطلع کردو کہ ہم آزاد ہوچکے ہیں۔"

"میں ایسا کر گزرتی لیکن اس صورت میں مجھے اور پاپا کو بھی تمہارے ساتھ مرنا پڑے گا۔ یہ مہنگا سودا ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

اس لمحے اچانک ہی فائرنگ کا سلسلہ بند ہوگیا۔ پھر دوڑتے قدموں کی آواز دروازے کی طرف بڑھتی سنائی دی۔ میں تلوار سنبھال کر اُچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں شکستہ دروازے کی اوٹ میں تھا اور کسی شخص کے اندر داخل ہوتے ہی اس کی گردن اُڑا دینے کے لیے بالکل تیار تھا۔

ایک شخص بگولے کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔ میں اس کی صرف جھلک ہی دیکھ سکا تاہم مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ حمان تھا۔ میں نے تیزی سے تلوار گھمائی۔ اس کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو اس تیزی میں اندر آتے وقت اس غیر متوقع وار سے نہیں بچ سکتا تھا لیکن حمان کی پھرتی نے مجھے بھی حیران کردیا۔

اس نے جس تیزی سے گردن جھکائی اس سے یقیناً کوئی نہ کوئی ریکارڈ قائم ہوا ہوگا لیکن وار خالی نہیں گیا۔ حمان کے پیچھے کوئی اور بھی اندھا دُھند بھاگا آرہا تھا۔ حمان کی جگہ اس کی گردن اڑ گئی۔ زندگی میں پہلی بار میں نے اس طرح کسی شخص کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اپنے آپ کو بیسویں صدی کا کوئی جلاد محسوس کیا۔

اس شخص کی گردن کٹ کر دروازے کے قریب ہی گر گئی مگر اس کی سربریدہ لاش کچھ آگے جاکر گری۔ کمرے میں یکدم گویا کسی نے لہو سے بھرے مشکیزے کا منہ کھول کر چھڑکاؤ سا کردیا۔

اس دوران حمان جو اپنی جھونک میں آگے نکل چکا تھا' گویا ایڑیوں کے بل گھوما۔ مجھے بروقت ہی اس کے ہاتھوں میں گن کی جھلک نظر آگئی۔ میں نے بھی اسی کی طرح پھرتی کا ریکارڈ قائم کرتے ہوئے خود کو فرش پر گرادیا۔ ورنہ گولیوں کی بوچھاڑ نے شاید میرا بالائی دھڑ چھلنی کردیا ہوتا۔

حمان کمرے سے بھاگا تھا تو ہم تینوں کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور ہم فرش پر پڑے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وقت کیبن کو گھیرے میں لیا جاچکا تھا۔ حمان کے ساتھی شاید مارے جاچکے تھے اور وہ نکل بھاگنے کا ارادہ کرچکا تھا لیکن جانے سے پہلے ہم تینوں کا کام تمام کرنے آیا تھا۔

تاہم اس کے اعصاب کی مضبوطی کا اندازہ اس سے ہوتا تھا کہ کمرے میں گھستے ہی اس نے اپنے آپ کو تلوار کے قطعی غیر متوقع وار سے بچایا تھا اور پھر کمرے میں بازی پلٹی ہوئی دیکھ کر حیران ہونے یا صورتِ حال کو سمجھنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا تھا بلکہ فوراً ہی ایڑیوں کے بل گھوم کر مجھ پر برسٹ مارنے کی کوشش کی تھی۔ اپنی ظاہری شخصیت اور جسامت سے وہ ایک معمولی آدمی دکھائی دیتا تھا لیکن بلاشبہ وہ ایک چھلاوا تھا۔

میں نے فوراً ہی دوسری طرف کو لڑھک کر اس کے دوسرے متوقع برسٹ سے بچنے کی کوشش کی گو کہ اس وقت مجھے زندگی کی آس ذرا کم ہی رہ گئی تھی لیکن حمان کی گن کو دوبارہ گرجنا نصیب نہیں ہوسکا۔ میرا دوسری طرف کو لڑھکنا بیکار ہی رہا کیونکہ اسی لمحے میں نے دیکھا ایک گولا سا بڑی طاقت سے حمان کے منہ پر آکر لگا اور وہ بری طرح لڑکھڑا گیا۔

گن اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے چہرے کی طرف اٹھ گئے۔ میں فوراً گن اٹھانے کے لیے جھپٹا اور اسی لمحے میں نے اس گولے کو لڑھکتے دیکھا جو حمان کے چہرے سے ٹکرایا تھا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ سیوبک کی کھوپڑی تھی۔

کیتھرین نے کمال حاضر دماغی کا ثبوت دیا تھا۔ اسے اور کچھ نہیں ملا تھا تو اس نے سیوبک کی کھوپڑی ہی اٹھا کر حمان کے منہ پر کھینچ ماری تھی اور اس وقت اس نے واقعی توپ کے گولے سے زیادہ اہم کام کیا تھا۔

میرا ہاتھ گن تک پہنچا ہی تھا کہ حمان نے اچانک کھڑکی سے باہر چھلانگ لگادی۔ نہ جانے کیوں اس نے کمرے میں مزید رکنے اور اپنی حیرت انگیز پھرتی سے مزید کوئی کام لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ باہر کی صورتِ حال اس کے حق میں نہیں تھی جس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔

کھڑکی زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن وہ گویا کسی پرندے کی طرح اڑتا ہوا اس سے نکل گیا۔ دوسرے ہی لمحے باہر ایک بار پھر کسی گن کی تڑتڑاہٹ ابھری اور میں سمجھا شاید اس کا کام تمام ہوگیا۔ کچھ دیر گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجتی رہی پھر سکوت چھا گیا۔

میرا ہاتھ حمان کی چھوڑی ہوئی گن پر تھا لیکن میں اپنی جگہ ساکت ہوکر رہ گیا تھا۔ کھڑکی اور دروازے سے کئی آوارہ گولیاں اندر آئیں اور اِدھر اُدھر دیواروں میں پیوست ہوگئیں۔ کچھ گولیاں باہر کی طرف سے بھی چوبی دیواروں سے ٹکرائی تھیں جن کی وجہ سے کئی بار دیواریں ہلتی ہوئی سی محسوس ہوئی تھیں لیکن یہ دیواریں یقیناً کافی موٹی تھیں اس لیے گولیاں ان کے پار نہیں ہوئی تھیں لیکن کھڑکی اور دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے فی الحال کھڑے ہونے کا رسک نہیں لیا جاسکتا تھا۔ کیتھرین اور چارلس بھی زمین سے چپک کر رہ گئے تھے۔

کمرے میں اب ایک کے بجائے دو سربریدہ لاشیں پڑی تھیں۔ حمان کے ساتھی کا خون تو چوبی فرش پر کافی دور تک پھیل گیا تھا۔ میں نے جب حمان پر تلوار سے وار کیا تھا اور حمان کے بجائے اس کے ساتھی کا سر قلم ہوگیا تھا تو اس وقت تلوار دروازے میں کہنی گڑ کر رہ گئی تھی۔ میں نے اسے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اس کو نکالنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ وہ اب بھی دروازے ہی میں پھنسی دھیرے دھیرے تھرتھرا رہی تھی۔

کئی لمحے کے سکوت کے بعد کیتھرین گھٹے گھٹے سے لہجے میں بولی "کیا اب ہم زندگی بھر یونہی کچھووں کی طرح زمین سے چمٹے لیٹے رہیں گے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے' ہمیں جان بچ جانے کی خوشی میں ڈانس کرتے ہوئے باہر نکل جانا چاہیے؟" میں نے ملامت سے پوچھا۔

اس نے خوف ناک سی نظروں سے مجھے گھورا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ اور لباس کئی جگہ سے مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ حالت میری بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی لیکن اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے ہنسی آگئی۔

"تم ان حالات میں بھی ہنس سکتے ہو؟" وہ غرائی "تم بھی حمان اور سیوبک سے کچھ کم نہیں ہو۔"

"میں ایک شریف آدمی ہوں۔ مجھے ان کرائے کے قاتلوں سے کیوں ملا رہی ہو۔" میں نے گویا بُرا مناتے ہوئے کہا "میں تو صرف تمہاری حالت دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ پوری ملنگ لگ رہی ہو بلکہ ملنگنی کہنا چاہیے۔ سفید فام ملنگنی۔"

"یہ ملنگنی کیا بہت برا آدمی ہوتا ہے؟" اس نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ہوتا نہیں' ہوتی ہے۔ یوں سمجھ لو جس طرح تمہارے ہاں ہپی ہوا کرتے تھے اس سے کچھ کچھ ملتی جلتی چیزیں ہمارے ہاں ملنگ اور ملنگنی کہلاتی ہیں۔" میں نے حمان کی چھوڑی ہوئی گن اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ وہ اُوزی تھی۔ اس سے پہلے بھی جب حمان اس مقام سے فرار ہوا تھا جہاں لیڈی ڈائنا کی کار کو دھماکے سے تباہ کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی تھی تو ہمیں ایک عمارت میں حمان کی چھوڑی ہوئی ایسی ہی ایک اور اسرائیلی گن اُوزی ملی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ اس کی پسندیدہ گن تھی۔

میں دیوار کی طرف کھسکنے لگا تاکہ ذرا محفوظ گوشے میں جاکر کھڑا ہوسکوں لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے رک جانا پڑا۔ میگا فون پر کوئی آواز اُبھری تھی۔ کوئی انگریزی میں کہہ رہا تھا "مسٹر چارلس! اگر آپ بخیریت ہیں تو کیبن سے باہر آجائیں۔ یا ہمیں بہ آواز بلند بتائیں آپ کس حال میں ہیں۔ ہم کیبن کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔"

چارلس کی آنکھوں میں فاتحانہ سی چمک آگئی اور وہ اپنی تمام درماندگی اور بدحالی کو بھول کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ میری طرف دیکھ کر باچھیں کھلاتے ہوئے بولا "یہ میجر ولسن کی آواز تھی۔" انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے میجر ولسن میرا کوئی بہت پرانا شناسا تھا جسے میں بھلا بیٹھا تھا اور چارلس مجھے اس کی یاد دلا رہا تھا۔

"یہ میجر ولسن کون ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"ایم آئی فائیو کا ایجنٹ ہے۔" اس نے اپنے کپڑوں سے گرد جھاڑتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔

"ایم آئی فائیو؟" میں نے حیرت سے دُہرایا "یہ کیا بلا ہے؟"

"برطانیہ کی ایک خفیہ ایجنسی۔" اس نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

وہ کچھ اس طرح باہر نکلا جیسے خوب تیار ہوکر' بے داغ و بے شکن لباس زیب تن کرکے کسی تقریب میں شرکت کرنے جارہا ہو۔ ابھی اس نے دروازے سے باہر قدم ہی رکھا تھا کہ کسی طرف سے گولی چلی اور وہ پٹ سے واپس کمرے میں آگرا۔ وہ چت گرا تھا اور وہیں ساکت ہوگیا تھا۔ میرے دل کو شدید دھچکا لگا۔

"پاپا!" کیتھرین چیخی اور مزید کسی فائرنگ وغیرہ کی پروا کیے بغیر

اس پر جاگری اور اس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ میں گھٹنوں کے بل اس کی طرف بڑھا اور دوسرے ہی لمحے گہری سانس لے کر رہ گیا۔ چارلس تو نہایت تیزی سے پلکیں جھپک رہا تھا۔

میں نے اس کا سرتاپا جائزہ لیا، کہیں کوئی زخم یا خون وغیرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن کیتھرین صحیح طور پر اس کی طرف دیکھے بغیر اس کے سینے پر سر رگڑے جا رہی تھی۔ میں نے اس کا کندھا پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا "آہ وزاری کی ضرورت نہیں۔ تمہارے پاپا صحیح سلامت ہیں۔"

اس نے چونک کر سیدھا ہوتے ہوئے آنکھیں پونچھ کر باپ کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا۔ کیتھرین رونا دھونا بھول کر اس کا کندھا ہلاتے ہوئے بولی "کیا ہوا پاپا؟ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"

"میری ناک موجود ہے نا؟" چارلس کراہ کر بولا۔

"ہاں' موجود ہے۔ کیوں؟" کیتھرین آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی ناک کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ چارلس نے خود بھی اپنی ناک پر ہاتھ پھیر کر گویا اس کی موجودگی کی تصدیق کی اور طویل سانس لے کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے کمرے میں گرتے ہی باہر دوبارہ فائرنگ شروع ہو گئی تھی جو ابھی جاری تھی۔

چارلس معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولا "میرا خیال ہے گولی میری ناک کو چھوتی ہوئی گزری تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے چہرے پر لگی ہے۔"

"اوہ.... میرے خدا! پاپا! آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔" کیتھرین قدرے بگڑ کر بولی۔ اس کے رخساروں پر لگی ہوئی مٹی کے درمیان آنسوؤں کی لکیریں نظر آ رہی تھیں۔

چارلس اطمینان سے بولا "جان نکلنے کی تو کوئی بات نہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ تم میرے لیے رو بھی سکتی ہو۔"

"یہ بات آپ مجھ سے ویسے بھی پوچھ سکتے تھے۔ مجھے اتنا بڑا جھٹکا دینے کی کیا ضرورت تھی؟" کیتھرین خفگی سے بولی۔

"میں تمہیں کوئی جھٹکا وغیرہ ہرگز نہیں دے رہا تھا۔" چارلس کراہ کر بولا "جھٹکا تو مجھے خود لگا تھا۔ مجھے واقعی یوں لگا تھا جیسے گولی میرے چہرے میں پیوست ہو گئی ہے۔ میں نے باقاعدہ اس کی تکلیف محسوس کی تھی۔"

ایک بار پھر میگا فون پر وہی آواز اُبھری "مسٹر چارلس! کیبن کے قریب ایک شخص چھپا ہوا تھا۔ وہ بھی مارا جا چکا ہے۔ آپ کیبن سے باہر آ جائیں تاکہ ہمیں اندازہ ہو سکے اندر کیا صورت حال ہے۔"

چارلس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا اور سر سہلاتا ہوا یوں اٹھ کر باہر چل دیا جیسے کوئی زبردستی اسے کنوئیں میں دھکا دینے کے لیے کھینچے لیے جا رہا ہو۔ دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی گیا۔ اس بار کسی گولی نے اس کا استقبال نہیں کیا۔

ایک لمحے کے سکوت کے بعد میگا فون پر وہی آواز اُبھری "باقی لوگ بھی براہِ کرم کیبن سے باہر آ جائیں۔"

میں نے اُوڈی وہیں دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی کہ کہیں میرے ہاتھ میں گن دیکھ کر کسی کو غلط فہمی نہ ہو جائے۔ معلوم نہیں وہ لوگ مجھے پہچانتے بھی تھے یا نہیں؟ میں اور کیتھرین بھی محتاط انداز میں کیبن سے باہر آ گئے۔ کیبن سطح زمین سے تین چار فٹ کی بلندی پر تھا۔ تین چار سیڑھیاں مختصر سے پلیٹ فارم کے آگے موجود تھیں۔ دائیں ہاتھ پر ایک کنواں نظر آ رہا تھا جس پر پانی کھینچنے کے لیے چرخی بھی موجود تھی۔

صرف اس کیبن کے اردگرد کچھ دور تک زمین صاف تھی۔ اس سے آگے چاروں طرف گھنا جنگل تھا۔ کھلی جگہ میں مجھے کہیں کوئی لاش پڑی نظر نہ آئی۔ جنگل اتنا گھنا تھا کہ کچھ دور سے کسی کی نقل و حرکت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ جرائم پیشہ افراد کے لیے واقعی یہ بڑی عمدہ پناہ گاہ تھی۔

کچھ دیر بعد جنگل کے مختلف حصوں سے کچھ لوگ برآمد ہوئے۔ کچھ لوگ کیبن کے عقب سے بھی آئے تھے۔ ان میں سے صرف تین سفید فام تھے۔ باقی ترک ہی معلوم ہوتے تھے گو کہ ان کی رنگت بھی سفید فاموں سے کچھ کم سرخ و سفید نہیں تھی۔ وہ مختلف قسم کی خطرناک آٹومیٹک گنیں اٹھائے ہوئے تھے۔ ایک کے کندھے پر سب مشین گن بھی تھی۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ خاص تربیت یافتہ لوگ تھے اور انہوں نے کمانڈو ایکشن کے ذریعے حمان کے ساتھیوں کو ہلاک کیا تھا۔

حمان کے ساتھی خود بھی یقیناً کمانڈو ہی تھے لیکن وہ شاید اس خوش فہمی میں مارے گئے تھے کہ کوئی انہیں یہاں آ کر نہیں گھیر سکتا تھا۔

چاروں طرف سے جنگل سے برآمد ہونے والے لوگ ہمارے قریب آ گئے۔ مضبوط جسم کا ایک دراز قد' ادھیڑ عمر سفید فام شخص ان کا قائد معلوم ہوتا تھا۔ اس کی کمر سے ایک میگا فون بھی بندھا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہم نے یقیناً اسی کی آواز سنی تھی۔ قریب آنے پر اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ چارلس نے صرف اسی سے میرا مختصر تعارف کرایا "یہ میجر ولسن ہیں" اس کے علاوہ اس نے مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

"خدا کا شکر ہے ہم آپ کو زندہ ان لوگوں کی گرفت سے چھڑانے میں کامیاب ہو گئے۔" میجر ولسن مسرور لہجے میں بولا۔ اس کے بالوں میں دو تین پتے اٹکے نظر آ رہے تھے۔

"اس میں تمہارا کچھ ایسا کمال نہیں ہے۔" چارلس بولا "وہ تو شکر ہے کسی طرح کیتھرین کا ایک ہاتھ رسیوں سے آزاد ہو گیا اور اس کی وجہ سے ہم تینوں کے ہاتھ پاؤں کھل گئے ورنہ تمہیں کیبن کے لیے دوبارہ بھاگنا پڑتا۔ پھر چارلس نے مختصراً انہیں بتایا کہ ہم پر کیا گزری تھی۔ آخر میں وہ بولا "بہرحال پانسا تمہارے آنے سے ہی پلٹا۔ ورنہ ہمارا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔"

"ہمیں تیاری کے لیے بہت کم وقت ملا۔ پھر بھی میرا خیال ہے ہماری کارکردگی مناسب ہی رہی۔" میجر ولسن نے کہا پھر وہ اپنے ترک ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "ترکش آرمی کے ان کمانڈوز نے بھی بڑے اچھے طریقے سے ہمارا ساتھ دیا۔ درحقیقت یہی لوگ اس جنگل سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے تعاون کے بغیر یہ آپریشن اتنے کم وقت میں اتنی کامیابی سے تکمیل تک پہنچانا بہت مشکل تھا۔ قابلِ داد بات یہ ہے کہ ہمارے کسی آدمی کو ایک گولی بھی نہیں لگی۔"

مزید کچھ دیر تک وہ وہیں کھڑے ایک دوسرے کی تعریف کرتے رہے۔ میں اور کیتھرین اس دوران بالکل خاموش رہے۔ بالآخر چارلس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے وہ سوال کر ہی ڈالا جو کچھ دیر سے میری زبان پر مچل رہا تھا "کہیں کوئی لاش نظر نہیں آ رہی۔"

"لاشیں جنگل میں ہیں اور ہمیں اندازہ ہے کہاں کہاں بکھری ہوئی ہیں۔" میجر ولسن بولا "ہم ابھی ان کا جائزہ لیتے ہیں۔"

ہم ان کی رہنمائی میں جنگل میں بہت دور تک پھرے۔ ہمیں مختلف مقامات پر کل پانچ لاشیں ملیں۔ ان میں دو افراد وہ بھی تھے جو ہمیں سفیر کے گھر سے لے کر آئے تھے۔ کل تین افراد قبائلی لباس میں تھے جو انہوں نے یقیناً سیوبک کے ساتھیوں کے جسموں سے اتارے تھے۔ باقی دو افراد جینز جیکٹوں میں تھے۔ ایک کیبن میں میرے ہاتھوں تلوار سے مارا گیا تھا۔

حمان کا ایک ساتھی تو عجیب ہی انداز میں درخت میں اُلٹا لٹکا ہوا تھا۔ اس کے پاؤں شاخوں میں کہیں پھنس گئے تھے۔ اس کی گن ابھی تک اس کے ہاتھوں میں ہی پھنسی ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں تو یہی معلوم ہوتا تھا جیسے وہ شخص اُلٹا لٹک کر کسی کا نشانہ لے رہا تھا لیکن اس کے سر کے عین نیچے دائرے میں پھیلا ہوا بہت سا خون کچھ اور کہانی سنا رہا تھا۔ خون ابھی تک اس کے بالوں سے قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ یہ خاصا عبرت انگیز سا منظر تھا۔

یہ تو ابھی صرف حمان کے ساتھیوں کی لاشیں تھیں۔ ان لوگوں نے سیوبک کے کم از کم تین ساتھیوں کو ٹھکانے لگایا تھا۔ اس کا مطلب تھا جنگل میں کہیں اور ان کی لاشیں بھی موجود تھیں۔ کرائے کے ان قاتلوں سیوبک اور حمان نے خواہ مخواہ ہی اتنے لوگوں کو مصیبت میں ڈالا تھا اور اتنی خون ریزی کرائی تھی۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو ہی نہیں خود کو بھی ہلاکت میں ڈالا تھا۔

لاشوں کو کسی نے نہیں چھیڑا۔ جب وہ لوگ اپنا جائزہ مکمل کر چکے تو میں نے کہا "ان میں حمان کی لاش نہیں ہے۔"

ترکش آرمی کا ایک کمانڈو اکھڑی اکھڑی سی انگریزی میں بولا "مجھے کچھ شبہ تو ہے کہ ایک شخص فرار ہونے میں کامیاب ہوا

ہے۔ مجھے معلوم نہیں وہ کون تھا۔ وہ میرے ٹارگٹ پر تھا لیکن اس کی خوش قسمتی تھی کہ عین وقت پر میری گن کا کلپ خالی ہو گیا۔ مجھے کندھے سے دوسری لوڈڈ گن اتار کر سیدھی کرنے میں مشکل سے دو تین سیکنڈ لگے ہوں گے لیکن اس دوران وہ غائب ہو چکا تھا تاہم وہ چونکہ جنگل ہی میں اندر کی طرف بھاگا تھا اور خالی ہاتھ تھا اس لیے میرا خیال تھا کہ ہمارے کسی نہ کسی دوسرے ساتھی کے ہاتھوں ضرور مارا جائے گا۔"

میرے دل میں نہ جانے کیوں اس انکشاف سے خلش سی بیٹھ گئی کہ حمان جان بچا کر نکل جانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن چارلس کو اس بات کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ وہ اسی پر بہت خوش تھا کہ ہم تینوں کی جان بچ گئی تھی' حمان کے تمام ساتھی مارے گئے تھے اور اسے نہ جانے کیسے کیسے عزائم کا اظہار کرتے کرتے اچانک دُم دبا کر بھاگنا پڑا تھا۔

میجر ولسن بولا "اگر ان میں سے حمان بھاگنے میں کامیاب ہو چکا ہے تو ہمیں اب بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔ بے پروائی سے اِدھر اُدھر نہیں پھرنا چاہیے۔" وہ چوکنا سا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اپنے ساتھیوں کی نسبت وہ محتاط آدمی معلوم ہوتا تھا۔

چارلس بولا "اب تم ہوشیار رہو یا غافل' لیکن ہمیں واپس بھجوانے کا بندوبست کر دو۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں ابھی مجرِ اتفاق کے ساتھ یہیں موجود رہوں گا۔" اس نے ترکش آرمی کے کمانڈوز میں سے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو صورت ہی سے نہایت جنگجو معلوم ہوتا تھا۔ پھر اس نے بتایا "باقی لوگ واپس چلے جائیں گے۔ ہم ان لاشوں کے بارے میں کچھ تفتیش کریں گے۔ اچھی طرح ان کا معائنہ کریں گے۔ حمان اگر زندہ بچ گیا ہے تو یہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ اس کا تعاقب جاری رہنا چاہیے۔ ابھی لیڈی ڈائنا کا مزید تین دن یہاں قیام رہے گا۔ وہ اس دوران کوئی اور کوشش نہ کر ڈالے۔ اس کے پاس وسائل اور ساتھی موجود ہیں اور ہماری معلومات اس کے بارے میں ناکافی ہیں۔"

اس نے اپنے ایک سفید فام ساتھی کو ہمارے بارے میں ہدایات دیں اور ہم اس کی رہنمائی میں ایک طرف روانہ ہو گئے۔ بیشتر افراد ہمارے ساتھ ہی چل دیئے تھے۔ سفید فام شخص درحقیقت ایک ترک کمانڈو کی مدد سے ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔

ہمیں جنگل میں کافی فاصلہ طے کرنا پڑا۔ جوں جوں ہم چلتے گئے درختوں کا سلسلہ چھدرا ہوتا گیا ورنہ جہاں سے ہم چلے تھے وہاں تو سورج کی روشنی بھی زمین تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ترک کمانڈو نہ جانے کن نشانیوں کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا۔

خاصے طویل سفر کے بعد بالآخر ہم جنگل کے اس حصے میں آ پہنچے جہاں درخت اتنے چھدرے تھے کہ ان کے درمیان سے چھوٹی موٹی گاڑیاں لہراتی ہوئی گزر سکتی تھیں۔ یہاں دو بند جیپیں

درختوں کے درمیان آڑی ترچھی کھڑی تھیں۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "ایسی ہی کسی جگہ پر وہ پک اپ بھی کھڑی تھی جس میں وہ لوگ ہمیں لے کر آئے تھے۔"

سفید فام کمانڈو بے پروائی سے بولا "وہ جگہ دیکھی جا چکی ہے' پک اپ قبضے میں لی جا چکی ہے۔ ہمارے دو ساتھی وہاں بھی تعینات تھے۔ جنگل میں ہمیں اور بھی کئی کام کی چیزیں ملی ہیں' بہت سا کام یہاں پولیس کو کرنا ہوگا۔"

ہم تینوں جس جیپ میں بیٹھے اس کی ڈرائیونگ سیٹ ایک ترک نے سنبھالی جبکہ دوسری گاڑی کو ڈرائیو کرنے کے لیے ایک سفید فام بیٹھا اور ہم تیز رفتاری سے واپس روانہ ہو گئے۔ ہائی وے وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

راستے میں چارلس میری طرف جھکتے ہوئے بولا "سیوبک کا مرنا ہمارے حق میں بہت بُرا ثابت ہوگا۔" اس کے چہرے پر تفکرات کے سائے تھے۔

اس کا اندازہ تو مجھے بھی تھا لیکن میں نے وضاحت کی خاطر پوچھا "وہ کیوں؟"

"وہ اُلّو کا پٹھا اپنے قبیلے کے دو تین بزرگوں کو لے کر "باضابطہ" طور پر کیتھرین کا رشتہ لینے آرہا تھا۔ اس کا مطلب ہے اس کے قبیلے کے خاص خاص لوگوں کو علم ہوگا کہ وہ کہاں جا رہا تھا۔ اب اگر اس کی موت کی خبر سامنے آتی ہے تو اس کے قبیلے والے فوراً یہی نتیجہ اخذ کریں گے کہ اسے ہم نے مروایا ہے۔ اگر اس کی لاش غائب کر دی گئی تب بھی وہ یہی نتیجہ اخذ کریں گے۔" وہ متفکرانہ سے انداز میں خاموش ہو گیا۔

"تو پھر؟" کیتھرین نے باپ کی طرف جھکتے ہوئے پوچھا۔

"وہ ایک ہنگامہ برپا کر دیں گے۔ موٹے دماغ کے لوگ ہیں۔ کوئی بعید نہیں کہ وہ ہمارے سفیر کی رہائش یا ہمارے سفارت خانے پر دھاوا بول دیں۔ چھوٹی موٹی جنگ کی سی کیفیت پیدا ہو جائے۔ اگر ترک حکومت نے سختی کی اور چند آدمی بھی مارے گئے تو شور برپا ہو جائے گا کہ بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ ہمارے ہی مغربی ملکوں کے اخباری اور ٹی وی رپورٹر کیمرے اٹھا اٹھا کر بھاگے چلے آئیں گے اور دنیا کو بتائیں گے کہ کس طرح "معصوم و بے گناہ" قبائلیوں کو کچلا جا رہا ہے۔ مجھے صورتِ حال بہت ہی پیچیدہ ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔"

"اب آپ کیا کریں گے؟" میں نے پوچھا۔ میرے خیال میں اس کے اندیشے بے بنیاد نہیں تھے۔

"میں آج رات اپنے سفیر' میجر ولسن اور ترک حکام کے ساتھ ایک میٹنگ رکھوں گا۔ اس میں فیصلہ کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔" چارلس سوچتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے تم دونوں کو اس سے پہلے ہی پس منظر میں چلے جانا چاہیے۔" اس نے میری اور کیتھرین کی طرف دیکھا "یہاں صرف میں موجود رہوں گا۔ ضروری نظر آیا تو میں بھی کھسک جاؤں گا۔ افضل! تم تو میرے خیال میں پاکستان ہی واپس چلے جاؤ اور کیتھرین تم اپنے پہلے پروگرام کے مطابق یورپ روانہ ہو جاؤ۔"

"میں تو خود فوری طور پر پاکستان جانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا "میں تو خواہ مخواہ ہی یہاں عجیب و غریب حالات میں الجھتا جا رہا ہوں۔"

کیتھرین باپ سے مخاطب ہوئی "پہلے تو میرے مقاصد کچھ اور تھے۔ اب میری ترجیحات بدل چکی ہیں اور آپ بھی ساتھ نہیں ہوں گے۔ کیوں نہ میں بھی ابی کے ساتھ پاکستان چلی جاؤں؟"

وہ مجھ سے پوچھنے کے بجائے اپنے باپ سے پوچھ رہی تھی گویا صرف وہی اسے میرے ساتھ جانے یا نہ جانے.... کی اجازت دے سکتا تھا۔ اس میں میری اپنی مرضی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ پاکستان جائے۔ اس سے میرے لیے بہت سی دشواریاں پیدا ہو سکتی تھیں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر چارلس نے اسے پاکستان جانے کی اجازت دے دی تو میں منع کر دوں گا۔

اس وقت میں نے خدا کا شکر ادا کیا جب چارلس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہہ دیا "نہیں' نہیں' تمہارا پاکستان جانا ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں اگر اپنے مزید کچھ کام نمٹانے ہیں تو فرانس یا اٹلی کی طرف نکل جاؤ ورنہ واپس لندن ہی چلی جاؤ اور اپنے باپ کے گھر کی طرف بھی تھوڑی سی توجہ دو جو تمہارے جانے کے بعد سے بالکل ہی اُجڑ کر رہ گیا ہے۔"

کیتھرین کا منہ لٹک گیا لیکن وہ گویا خود پر جبر کرتے ہوئے بولی "آپ کہتے ہیں تو چلی جاتی ہوں۔ مجھے اس وقت ذرا آپ کی فرمانبردار اور سعادت مند بیٹی بننے کا شوق چڑھا ہوا ہے۔ اس لیے آپ کی بات ماننی پڑے گی ورنہ میں ضرور پاکستان جاتی۔ بہرحال میں کبھی نہ کبھی جاؤں گی ضرور۔"

"ضرور جانا لیکن کسی معقول وجہ کے تحت جانا۔ زندگی کو یونہی بے مقصد اِدھر اُدھر گھوم پھر کر ضائع مت کرو۔" چارلس ناصحانہ انداز میں بولا "میرا اس وقت اطمینان کی گہری سانس لینے کو جی چاہ رہا تھا لیکن میں کیتھرین کو احساس نہیں دلانا چاہتا تھا کہ فی الحال اس سے جان چھوٹنے پر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ کسی کی اس حد تک بھی دل شکنی اچھی نہیں تھی۔

"میں آج سیٹھ رمضان کو کراچی فون کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی طرف سے گرین سگنل ملتے ہی میں کراچی روانہ ہو جاؤں گا۔ آپ میری جلد از جلد اس سے بات کرا دیں۔" میں نے چارلس سے درخواست کی۔

"یہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔" چارلس دھیمے لہجے میں بولا "گھر پر میں سفیر کے خصوصی ٹیلی فون پر ابھی تمہاری سیٹھ رمضان سے بات کرا دیتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد جیپ نے ہمیں برطانوی سفیر کے بنگلے کے سامنے اتار دیا۔ چارلس نے ایک ٹرکش آفیسر سے کچھ دیر ذرا الگ کھڑے ہو کر باتیں کیں۔ شاید وہ آئندہ کا کوئی پروگرام طے کر رہے تھے۔ پھر دونوں گاڑیاں واپس روانہ ہو گئیں اور ہم اندر آ گئے۔

چارلس بولا "تم شاور لے کر لباس تبدیل کر لو اور کچھ انسانی حلیے میں آجاؤ۔ میں بھی تب تک اپنی حالت درست کر کے کچھ ضروری ٹیلی فون کرتا ہوں پھر سیٹھ رمضان سے تمہاری بات کراتا ہوں۔"

میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا لیکن سیٹھ رمضان سے بات ہونے کی نوبت رات کے کھانے کے کافی دیر بعد ہی آسکی کیونکہ اس دوران سفیر صاحب بھی گھر آ گئے تھے اور چارلس اس کے ساتھ اسٹڈی میں بند ہو کر بہت دیر تک کچھ بات چیت کرتا رہا۔ اس دوران گھر کے ٹیلی فون بھی کافی مصروف رہے۔ پھر سفیر دوبارہ کہیں روانہ ہو گیا۔ گھر میں کچھ کھچڑی سی پک رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ سیوبک کے قبیلے کے ردِعمل کے سلسلے میں خاصے پریشان تھے۔

آخر کار چارلس نے مجھے اسٹڈی میں بلوا بھیجا۔ وہاں تین رنگ کے ٹیلی فون رکھے تھے۔ سرخ' سبز اور نیلا۔ چارلس نے سبز فون پر براہِ راست سیٹھ رمضان کا نمبر ملایا اور ریسیور مجھے تھما دیا۔ اس نے خود سیٹھ رمضان سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

"کون ہے بھئی؟" دوسری طرف سے سیٹھ رمضان قدرے بے زاری سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں خفیف سی یہ بے زاری اکثر ہی پائی جاتی تھی اور یہ مصنوعی ہوتی تھی۔

"میں ہوں افضل؟" میں نے آہستگی سے کہا۔

"افضل! تم کہاں ہو؟" اس نے فوراً تیزی سے پوچھا۔ اس کے لہجے سے بے زاری یکدم غائب ہو گئی اور میں نے چشمِ تصور سے دیکھا وہ گویا چوکنا ہو کر بیٹھ رہا تھا۔

"میں وہیں ہوں جہاں تم نے مجھے بھیجا تھا۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔

"تم اپنا نمبر مجھے دو۔ کچھ دیر تک میں خود تمہیں فون کرتا ہوں۔ میں اس نمبر پر بات نہیں کر سکتا۔" سیٹھ رمضان قدرے مضطربانہ آواز میں بولا۔

میں نے نمبر تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ٹیلی فون سیٹ پر کوئی نمبر نہیں تھا۔ میں نے چارلس سے نمبر پوچھا اور یہ بھی پوچھ لیا کہ سیٹھ رمضان کو یہ نمبر دینا مناسب تھا یا نہیں؟ اس نے سر کے اشارے سے اجازت دے دی اور نمبر بتا دیا۔ نمبر لیتے ہی سیٹھ رمضان نے فون بند کر دیا اور ہم وہیں بیٹھ کر اس کی کال کا انتظار کرنے لگے۔

سیٹھ رمضان کو اس نمبر پر کال ملوانے میں کچھ دیر لگ گئی۔ اس دوران چارلس بولا "اسے گمان بھی نہیں ہوگا کہ اس وقت میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اسے اس کا اتنا محتاط ہونا میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

مجھے نہیں معلوم تھا کہ چارلس کو سیٹھ رمضان کے ماضی اور حال کے چکروں کا کس حد تک علم تھا۔ میں نے گول مول سی بات کی "وہ میری ہی وجہ سے اتنا احتیاط کر رہا ہے۔"

آخر فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور میں نے ہی اٹھایا۔ دوسری طرف سیٹھ رمضان ہی تھا۔ وہ پہلے کی نسبت ذرا پُرسکون لہجے میں بولا "اپنے پرانے نمبروں کے بارے میں مجھے اطمینان نہیں ہے۔ مجھے صحیح طور پر معلوم تو نہیں ہے کہ وہ ٹیلی فون ٹیپ ہوتے ہیں یا نہیں لیکن پچھلے کچھ عرصے میں میرے کئی راز لیک آؤٹ ہوئے ہیں۔ اور تمہارا معاملہ تو بہت ہی نازک معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے میں زیادہ احتیاط کر رہا ہوں۔"

"یہ نمبر محفوظ ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں' یہ نمبر نوٹ کر لو اور آئندہ جب بھی بات کرنی ہو صرف اس نمبر پر کرنا۔ یہ ایک عجیب و غریب نمبر ہے۔ میں تمہیں اس پر فوری طور پر نہیں ملوں گا۔ اس پر پیغام چھوڑ کر پانچ دس منٹ بعد تمہیں دوبارہ فون کرنا ہوگا۔"

اس نے نمبر بتایا پھر بے تابی سے بولا "اچھا' یہ "ضروری بکواس" تو ہو گئی۔ تم اپنا حال احوال سناؤ۔ خیریت سے پہنچ گئے؟ اب کہاں ہو' کس حال میں ہو؟"

"میری داستانِ غریب حمزہ کافی لمبی ہے۔ اس کا خلاصہ بھی فون پر سنانا مشکل ہے۔ فی الحال میں نے صرف یہ جاننے کے لیے فون کیا ہے کہ میں نے ایک کام تمہارے سپرد کیا تھا۔ تمہیں میرے کچھ ساتھیوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنا تھی۔ یہ بتاؤ اس میں کچھ کامیابی ہوئی یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں' تمہارے ایک ساتھی سے رابطہ ہوا ہے۔" وہ کچھ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا "اس کا نام سلیمان ہے۔ وہ لاہور سے آیا ہوا ہے اور تمہاری تلاش میں ہے۔ میں تو اسے نہیں پہچانتا تھا۔ میرا مطلب ہے اس کی اصل شکل میں بھی نہیں پہچانتا تھا لیکن اس نے مجھے پہچان لیا۔ اتفاقاً ہی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ کسی فلمی کیرکٹر کی طرح حلیہ بدلے تمہارے ہی ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا اور ایسے جاسوسی اسٹائل سے بڑے خفیہ طریقے سے مجھ سے ملا کہ میری روح فنا ہو گئی تھی۔ میں سمجھا تھا زیرو زیرو سیون مجھے کے جی بی کا ایجنٹ سمجھ کر اغوا کرنے آگیا ہے۔ اس میں صرف ایک کمی تھی جس کی وجہ سے وہ زیرو زیرو سیون معلوم نہیں ہو رہا تھا....."

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"فضول باتیں کم کرو اور کام کی بات کرو۔" میں نے بے تابی سے کہا "مقصد یہ کہ تمہارا اس سے رابطہ ہو گیا؟"

"ہاں' تم نے جو فون نمبر دیئے تھے اور رابطے کے جو طریقے بتائے تھے ان میں سے کوئی کام نہیں آسکا بس سلیمان سے اتفاقاً رابطہ ہو گیا۔"

"تاہم میں کبھی پاکستان ضرور آؤں گی۔"

"میں تمہیں خوش آمدید کہوں گا۔" میں نے کہا اور وہ واپس اوپر جانے کے لیے مڑ گئی۔ میں اور چارلس گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر عام لباس میں ڈرائیور موجود تھا۔ گاڑی کوئی دوسری تھی۔ وہ سیاہ مرسیڈیز نہیں تھی جس میں ہم زیادہ تر سفر کرتے رہے تھے۔

چند لمحے بعد گاڑی سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ اس دوران بوجھل سی خاموشی طاری رہی۔ چارلس گویا کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر وہ اچانک میری طرف مڑتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے میری بیٹی تمہیں پسند کرنے لگی ہے۔"

میں کہنا چاہتا تھا "تمہیں بہت دیر میں خیال آیا" اس کے بجائے میں نے کہا "یہ اس کا حسنِ نظر ہے ورنہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ اس جیسی لڑکی مجھے پسند کرے۔"

میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ میری وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو، کسی کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔ اچھا ہوا کہ چارلس نے اس موضوع پر مزید کچھ نہیں کہا۔ میری نظر عقب نما آئینے پر تھی۔ پھر میں نے ذرا گردن گھما کر دیکھا۔ ہمارے پیچھے کافی ٹریفک تھا لیکن میں نے چارلس سے کہا "ایک سفید گاڑی ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔"

وہ اپنے خیالات سے چونکا اور گویا محظوظ ہوتے ہوئے بولا "تم اپنے گرد و پیش سے خوب باخبر رہنے والے آدمی ہو۔ بہرحال اس گاڑی کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ ٹرکش انٹیلی جنس کے لوگ ہیں۔ ہماری حفاظت کے لیے ہمارے ساتھ ہیں۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ پھر میں نے اس گاڑی کی طرف سے توجہ ہٹالی اور چارلس کے ساتھ باتوں میں لگ گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے یونہی اپنی احتیاط پسندی سے مجبور ہو کر ایک بار پھر پیچھے دیکھا تو ٹریفک پولیس کی ایک موٹر سائیکل تیزی سے پیچھے آتی دکھائی دی۔

اس سڑک پر ٹریفک کم ہی تھا۔ دو چار گاڑیاں ہمارے پیچھے تھیں تاہم لگتا یہی تھا کہ وہ ٹریفک سارجنٹ ہمارے ہی پیچھے آرہا تھا۔ جب اس کے اور ہمارے درمیان کوئی دوسری گاڑی حائل نہ رہی تو اس نے ہوٹر بھی بجایا۔ تب ہمارے ڈرائیور کی سمجھ میں آیا کہ وہ ہمارے پیچھے آرہا تھا۔

اس نے رفتار کچھ کم کرلی لیکن وہ نہ کرتا تب بھی سارجنٹ اپنی بھاری بھرکم طاقتور موٹر سائیکل پر ہمارے قریب پہنچ ہی چکا تھا۔ اس نے گاڑی سڑک سے اتارنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے گاڑی کچے میں اتار لی اور ٹریفک سارجنٹ نے کسی فلمی ہیرو کے سے انداز میں موٹر سائیکل لہرا کر گاڑی کے عین سامنے لا روکی اور فوراً ہی وہ زیادہ جسیم نہیں تھا اور وردی بھی اس کے جسم پر فٹ نہیں تھی۔ کچھ ڈھیلی ڈھالی لگ رہی تھی لیکن حرکات و سکنات سے بہرحال اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اس کے سر پر ہیلمٹ بھی تھا جسے اس نے اتارنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا تاریک چشمہ اس کے چہرے کی مناسبت سے کچھ بڑا لگ رہا تھا۔ ہم اس کی آنکھیں دیکھ تو نہیں سکتے تھے لیکن میرا اندازہ تھا کہ شاید ان آنکھوں میں خاصی رعونت پائی جاتی تھی۔ کم از کم اس کی چال تو یہی بتا رہی تھی۔

ڈرائیور گاڑی سے نہیں اترا تھا، تاہم اس نے ایئر کنڈیشنر آن ہونے کے باوجود کھڑکی کا شیشہ نیچے کرلیا تھا۔ ٹریفک سارجنٹ نے کھڑکی پر جھکتے ہوئے ترکی میں حتی الامکان بارعب لہجے میں کچھ کہا۔ مجھے اتنا اندازہ ہوگیا کہ وہ اسے گاڑی سے نیچے اترنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس کا انداز بعض پاکستانی ٹریفک سارجنٹوں کا سا تھا۔ میں نے سوچا آخر ترکی ہمارا برادر اسلامی ملک ہے۔ شاید کچھ جراثیم برادرانہ طور پر اُدھر چلے گئے ہوں۔

ہمارا ڈرائیور بھی غالباً کوئی عام ڈرائیور نہیں تھا۔ اس نے ٹریفک سارجنٹ کے حکم پر عمل درآمد کے بجائے جھلا کر تیزی سے ترکی میں کچھ کہا۔ اس نے غالباً یہی جاننا چاہا تھا کہ آخر سارجنٹ کیا چاہتا تھا۔ جواباً سارجنٹ نے بھی تیزی سے کچھ کہا۔ اس نے چونکہ اپنے ہیلمٹ کا اسٹریپ بھی نہیں کھولا تھا اور اس کی ٹھوڑی پر پلاسٹک کی ٹوپی سے چڑھی ہوئی تھی اس لیے اس کی آواز کچھ اس طرح نکل رہی تھی جیسے دانت بھینچ کر بول رہا ہو۔

مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ ڈرائیور سے کاغذات طلب کر رہا تھا اور ڈرائیور جاننا چاہ رہا تھا کہ آخر اس نے ایسی کیا غلطی کی تھی جو سارجنٹ اس کے تعاقب میں چلا آیا تھا؟

جواب میں سارجنٹ نے پہلے سے زیادہ سخت اور اہانت آمیز لہجے میں کچھ کہا۔ شاید اس نے کسی معمولی بات کو فوراً ہی انا کا مسئلہ بنالیا تھا جیسا کہ اس قسم کی صورت حال میں عموماً ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا چارلس کے چہرے پر سرخی نمودار ہو چکی تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سرخی بڑھ چکی تھی کیونکہ اس کی رنگت ویسے بھی سرخ ہی تھی۔

وہ دروازہ کھول کر اُتر گیا اور برہمی سے بولا "کیا بات ہے؟ تم کیوں ہمارے ڈرائیور کو پریشان کر رہے ہو؟"

حالانکہ وہ ترکی سمجھتا تھا اور روانی سے بول بھی سکتا تھا لیکن شاید جان بوجھ کر انگریزی میں بات کر رہا تھا اور اپنے آپ کو معاملے سے لاعلم بھی ظاہر کر رہا تھا۔ اس کا انداز ایک بارعب شخص کا تھا لیکن ٹریفک سارجنٹ اس کے رعب میں آئے بغیر پہلے سے زیادہ غصے سے بولا "تمہارے ڈرائیور نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی ہے اور میرے ساتھ بدتمیزی بھی کی ہے۔ تم لوگوں کو پولیس اسٹیشن چلنا پڑے گا۔" اب وہ بھی انگریزی میں بات

"تمہارا دماغ صحیح ہے؟" چارلس نہایت تحمل مزاج شخص ہوتے ہوئے بھی برہمی سے تقریباً چیخ اٹھا "یہ ڈرائیور بیس سال سے استنبول کی سڑکوں پر گاڑی چلا رہا ہے، تم اسے ڈرائیونگ کے قوانین سکھانے آگئے ہو؟"

"بیس سال یا چالیس سال گاڑی چلانے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسان کبھی ٹریفک قوانین نہیں توڑ سکتا۔" ٹریفک سارجنٹ غرایا اور چارلس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ اگر اس کا قد ذرا اونچا ہوتا تو شاید وہ اپنے ہیلمٹ کا چھجا چارلس کی پیشانی سے ملا دیتا۔

"میں اس کے ساتھ سفر کر رہا ہوں۔ میں بھی استنبول کے ٹریفک قوانین سے واقف ہوں۔ میں دیکھ رہا تھا، اس نے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی۔" چارلس نے اسے ڈانٹا "تم خواہ مخواہ ہمیں مرعوب کرنے کی کوشش مت کرو۔"

"مرعوب تو تم مجھے کر رہے ہو۔ سرکاری کام میں مداخلت کر رہے ہو۔ تمہارے خلاف اس سلسلے میں بھی کارروائی ہوگی۔ تمہیں اب تو ضرور پولیس اسٹیشن چلنا پڑے گا۔" پولیس سارجنٹ قطعی غیر متزلزل لہجے میں بولا۔

"تم تو واقعی کوئی پاگل معلوم ہوتے ہو۔ لگتا ہے اس نوکری سے تمہارا دل بھر گیا ہے اور اب اسے لات مار کر تم جیل جانا چاہتے ہو۔" چارلس کے لہجے میں ہلکی سی خونخواری آگئی "میں نے پوری دنیا دیکھی ہے۔ ہر ملک میں سفر کیا ہے لیکن تم جیسا خردماغ پولیس والا آج تک نہیں دیکھا۔ میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ میں ایک بہت ہی اہم برطانوی ڈپلومیٹ ہوں اور نہایت اہم مشن پر یہاں آیا ہوا ہوں۔ میرے ایک اشارے پر تم نہ صرف نوکری سے برخاست ہوسکتے ہو بلکہ جیل بھی جاسکتے ہو۔ اس وقت میں ایک بہت ضروری کام سے جا رہا ہوں اور مزید تاخیر کا متحمل نہیں ہوسکتا۔"

سارجنٹ نے استہزائیہ انداز میں ایک کھردرا سا قہقہہ لگایا "میں بھی کوئی عام پولیس والا نہیں ہوں۔ میرے عہدے پر نہ جانا۔ میں نے بڑے بڑے وزیروں سفیروں کو عدالت میں کھینچا ہے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ میں جس پر بھی ہاتھ ڈالتا ہوں وہ کوئی اونچی ہی چیز نکلتا ہے۔"

چارلس نے غالباً انٹیلی جنس والوں کی تلاش میں پیچھے نظر دوڑائی۔ ان کی گاڑی کا کہیں دور دور تک نام و نشان نہیں تھا البتہ دوسری اِکّا دُکّا گاڑیاں ہمارے قریب سے گزر رہی تھیں۔ بعض کار نشین ہماری طرف دیکھتے ہوئے گزرے تھے لیکن کوئی رُکا نہیں تھا جیسا عموماً پاکستان میں ہوتا ہے۔

انٹیلی جنس والے اگر وہاں موجود ہوتے تو اب تک انہیں آگے آجانا چاہیے تھا اور چارلس کی حیثیت کی [illegible] چاہیے تھی لیکن میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ وہ ہمارے عقب میں موجود نہیں تھے۔ ان کی گاڑی اس دوران راستے میں کہیں غائب ہو چکی تھی جب میری توجہ ان کی طرف سے ہٹ گئی تھی۔

ان کی گاڑی غائب دیکھ کر چارلس کو قدرے حیرت ضرور ہوئی لیکن اس کی خود اعتمادی اور رعب میں کوئی فرق نہ آیا۔ تاہم اب وہ گویا اس کمبل نما سارجنٹ سے پیچھا چھڑانے کے لیے کچھ تحمل سے کام لیتے ہوئے ڈرائیور سے مخاطب ہوا "عمران! تم اسے کاغذات اور اپنا سفارت خانے کا کارڈ دکھا ہی دو۔ ہم سے غلطی ہوئی کہ ہم احتیاطاً اس وقت سفارت خانے کی نمبر پلیٹ والی گاڑی لے کر نہیں نکلے۔"

سارجنٹ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا "اب کاغذات دکھانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اب تو تمہیں پولیس اسٹیشن چلنا ہی پڑے گا۔ تم نے بدتمیزی کی ہے۔ سرکاری کام میں مداخلت کی ہے اور مجھے اپنی حیثیت سے مرعوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ تمہارے خلاف کارروائی ضرور ہوگی۔"

چارلس نے غالباً بڑی مشکل سے اس وقت اپنی نرم مزاجی اور تحمل کو آوازدی تھی لیکن سارجنٹ کی بات سُن کر اس کا تحمل ایک بار پھر جواب دے گیا۔ میں نے پہلی بار اس کے منہ سے انگریزی کی ایک ہلکی پھلکی سی گالی سُنی پھر وہ غصے سے بولا "تم جیسے آفیسر کو تو اسی سڑک پر کھڑے کھڑے شوٹ کردینا چاہیے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن سارجنٹ کی پھرتی قابل داد تھی۔ اس نے پوسٹرن فلموں کے کسی فائٹر کی سی تیزی سے اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا اور طنزیہ لہجے میں بولا "بہت خوب، بہت خوب! اب تم ایک آفیسر پر قاتلانہ حملہ بھی کرنے لگے تھے۔ تم اپنے جرائم کی فہرست کو لمبا کیے جا رہے ہو۔ چلو بیٹھو گاڑی میں۔"

اس نے اپنے ریوالور کی نال چارلس کی پسلیوں پر نکادی اور اس کا ریوالور نہایت پھرتی سے اس کی جیب سے نکال لیا۔ میرا خیال ہے ایک لمحے کے لیے تو چارلس بھی پریشان ہوگیا تھا۔ اسے یقیناً جھنجلاہٹ بھی ہو رہی تھی کہ اچھا بھلا اپنے راستے پر جاتے جاتے یہ کمبل کہاں سے آن چمٹا تھا۔ اب تو وہ اس جھنجلاہٹ کا اظہار بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

میں نہایت اطمینان سے بیٹھا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ میرے پاس اس وقت کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں تھا کیونکہ مجھے کچھ دیر بعد جہاز پر سوار ہونا تھا۔ کوئی گن وغیرہ لے کر چلنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ائرپورٹ پر چیکنگ کے دوران وہ میرے لیے پریشانی کا باعث بن سکتی تھی۔

سارجنٹ نے ریوالور کی نوک سے چارلس کو گاڑی کی طرف دھکیلا۔ چارلس کا چہرہ کچھ زیادہ ہی سرخ ہوگیا۔ شاید کسی اجنبی ملک میں بھی اس کی اتنی بے عزتی کبھی نہیں ہوئی تھی لیکن اس نے ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہاتھ پاؤں چلانے والا آدمی بھی نہیں تھا۔ جو کچھ کرتا تھا گن کے ذریعے کرتا تھا اور اس

وقت گن اس کے پاس نہیں رہی تھی۔ ہیلمٹ اور بڑے سے تاریک چشمے کی وجہ سے سارجنٹ کے چہرے کا بیشتر حصہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن جتنا نظر آرہا تھا اس سے اندازہ ہورہا تھا کہ چارلس نے ذرا بھی اس کی مرضی کے خلاف حرکت کی تو وہ اسے شوٹ کرنے میں دریغ نہیں کرے گا۔ چارلس نے بھی شاید یہ محسوس کرلیا تھا اس لیے تمام تر بہی کے باوجود اس نے مزاحمت نہیں کی۔ تاہم اس نے مڑ کر ایک نظر میری طرف ضرور دیکھا۔ شاید اسے حیرت تھی کہ میں اس معاملے میں بالکل مداخلت نہیں کررہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میرا ذہن اس وقت کسی اور زاویے سے اس مسئلے میں اُلجھا ہوا تھا۔

چارلس گاڑی میں بیٹھنے لگا تو میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر تیزی سے باہر پھسل گیا۔ دراصل وہ جس طرح بیٹھنے لگے تھے اس سے یہ ہوتا کہ چارلس میرے اور سارجنٹ کے درمیان پھنس جاتا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ سارجنٹ میرے اور چارلس کے درمیان آجائے۔

سارجنٹ نے اب تک گویا میری طرف توجہ نہیں دی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ میری طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا۔ میرے گاڑی سے باہر قدم رکھتے ہی اس کے دوسرے ریوالور کا رخ میری طرف ہوچکا تھا جو اس نے چارلس کی جیب سے نکالا تھا۔ اس کے اپنے ریوالور کی نال بدستور چارلس کی پسلیوں پر رہی تھی۔

"تم کہاں چل دیئے مسٹر؟" وہ بہ آواز بلند بولا "اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو یہاں تمہاری لاش پڑی نظر آئے گی۔"

"میں بھاگ تو نہیں رہا۔" میں نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے سادگی سے کہا "میں تو گاڑی سے اُتر رہا تھا۔ مجھے آپ براہِ کرم یہیں چھوڑ دیں۔ میرا اس گاڑی سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تو صرف ان صاحب کا مہمان ہوں لیکن مجھے ایک گھنٹے بعد فلائٹ پکڑنی ہے۔ اگر میں پولیس کے چکر میں پڑ گیا تو مجھے دیر ہوجائے گی۔ میری فلائٹ نکل جائے گی۔"

"فلائٹ کے بچے! چلو گاڑی میں بیٹھو۔ تم کون ہو اور اس گاڑی سے تمہارا کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ یہ فیصلہ پولیس اسٹیشن چل کر ہوگا۔" سارجنٹ چیخا "تم سمجھ رہے ہو میں تمہیں یہاں چھوڑ کر چلا جاؤں گا؟"

"تمہاری بڑی مہربانی ہوگی آفیسر! مجھے یہیں چھوڑ دو۔ میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا۔" میں نے قدرے التجائیہ لہجے میں کہا "اس کے عوض میں تمہاری مناسب "خدمت" بھی کرسکتا ہوں۔" میں نے جیب کی طرف اشارہ کیا۔

"تم مجھے رشوت کی پیشکش کررہے ہو؟" اس کے لہجے میں کچھ اور برہمی آگئی "ایک اور جرم! چلو بیٹھو گاڑی میں۔" اس نے دوسرے ریوالور کی نال میری پسلیوں پر رکھ دی۔

میں نے اپنی صورت پر بے بسی طاری کرلی اور دروازہ کچھ اور کھول دیا۔ چارلس نے اس وقت ناراضگی میں وہی کیا جو میں چاہ رہا تھا۔ یعنی وہ پہلے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی غیرارادی طور پر سارجنٹ بھی بیٹھ گیا۔ اسے غالباً اطمینان ہوگیا تھا کہ میں بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا کیونکہ اس نے ہاتھ اونچا کرکے ریوالور کی نال بدستور میری پسلیوں پر ٹکائی ہوئی تھی۔

میں شکست خوردہ سے انداز میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میرا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ وہ ہم دونوں کے درمیان آگیا تھا۔ شاید اس نے بھی اس طرح بیٹھنے کو بہتر سمجھا ہو کیونکہ اس طرح وہ بیک وقت ہم دونوں کی پسلیوں پر ریوالور رکھ سکتا تھا۔

"ڈرائیور! سیدھے ہی چلو۔" اس نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

ڈرائیور نے مڑ کر چارلس کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ وہ گویا اب بھی صرف چارلس ہی کے حکم کی تعمیل کرنا چاہتا تھا۔ سارجنٹ نے اسے ڈانٹا "اس کی طرف کیا دیکھ رہے ہو سؤر! گاڑی چلاؤ۔"

ڈرائیور نے گردن گھما کر شعلہ بار نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن چارلس اب تحمل سے بولا "ڈرائیور! یہ نطفہ ناتحقیق جس طرح کہہ رہا ہے اسی طرح کرو۔ اب ہمیں اس کا بندوبست کرکے ہی اپنے کام کے لیے جانا ہوگا۔ اس بدبخت کو نوکری سے برخاست ہونے اور جیل جانے کی اتنی ہی جلدی ہے تو ہم کیا کرسکتے ہیں۔"

ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھادی۔ سارجنٹ نے چارلس کے الفاظ پر کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ شاید اس لیے کہ اس کا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ وہ ہمیں لے کر وہاں سے روانہ ہونا چاہتا تھا۔ ڈرائیور اس کی موٹر سائیکل کو بچاتے ہوئے گاڑی سڑک پر لایا۔ سارجنٹ نے اپنی موٹر سائیکل کو صحیح طرح کھڑی کرنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔

سارجنٹ کی رہنمائی میں گاڑی چند منٹ میں ہی ایک ویران سڑک پر آپہنچی۔ تب چارلس نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا "یہ تم ہمیں کون سے پولیس اسٹیشن لے جارہے ہو؟"

"میں تم لوگوں کو ہائی وے پولیس کے ہیڈکوارٹر لے جارہا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ اس وقت اس کی توجہ ایک لمحے کے لیے میری طرف سے ہٹ گئی تھی۔ شاید وہ میری طرف سے کچھ مطمئن ہوگیا تھا۔ مجھے وہ موقع اپنے لیے مناسب نظر آیا۔ میرے خیال میں اس کا ڈراما خاصا لمبا ہوچکا تھا۔ اب اسے کسی فیصلہ کن موڑ پر لانے کی کوشش کرہی لینی چاہیے تھی۔

میں نے بیک وقت اس کی دونوں کلائیوں پر ہاتھ ڈالا۔ میں نے خوب دیکھ بھال کر نپے تلے انداز میں ہاتھ ڈالا تھا۔ میری گرفت ویسی ہی رہی جیسی میں چاہتا تھا۔ میں نے یکدم اس کے دونوں ہاتھوں میں دبے ہوئے ریوالوروں کا رخ اوپر کی طرف کردیا۔

میں نے اس کے بارے میں دو اندازے لگائے تھے اور دونوں ں درست نکلے۔ میرا ایک اندازہ تو یہ تھا کہ وہ زیادہ طاقتور آدمی نہیں تھا۔ دوسرے وہ اسلحے کے استعمال میں ذرا بھی دریغ کرنے والا نہیں تھا۔ چنانچہ ہوا یہ کہ اس کی کلائیاں میری گرفت میں آئیں تو میری مرضی کے خلاف بال برابر بھی نہیں ہل سکیں۔ لیکن اس نے فائر کرنے میں ایک ثانیے کی بھی تاخیر نہیں کی۔ میں چونکہ اس کی کلائیاں پکڑتے ہی اوپر کرچکا تھا اس لیے دونوں ریوالوروں سے نکلنے والی گولیاں گاڑی کی چھت میں پیوست ہوئیں۔

ڈرائیور بیک وقت دو فائروں کی آواز سُن کر کچھ بوکھلا گیا۔ اسٹیئرنگ وہیل پر اس کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے بہک گیا اور گاڑی لہرا کر کچے میں اُتر گئی۔ تاہم اس کی مہارت کام آئی۔ اس نے گاڑی کو الٹنے نہیں دیا اور نہ ہی بوکھلا کر گاڑی کو دوبارہ پکی سڑک پر چڑھانے میں جلدبازی دکھائی۔

ہم تینوں سمٹ کر ایک طرف کو ہوگئے۔ لیکن سارجنٹ کی کلائیوں پر میری گرفت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دوسرے ہی لمحے میری گرفت اتنی سخت ہوچکی تھی کہ وہ دوسری مرتبہ ٹریگر بھی نہ دبا سکا۔ میں نے اسے اپنے اور چارلس کے درمیان اس طرح دبالیا تھا کہ وہ مزید کوئی حرکت بھی نہ کرسکا۔

میں نے اس کی کلائیوں پر اپنے ہاتھوں کے آہنی شکنجوں کا دباؤ اتنا بڑھایا کہ اس کے ہاتھوں سے دونوں ریوالور خود بخود نکل کر فرش پر گر پڑے۔ تب میں اس کے دونوں بازو موڑ کر اس کی پشت پر لے آیا۔

"پیارے! اب اگر تم نے ذرا بھی اُچھل کود کرنے کی کوشش کی تو دونوں بازو کندھوں سے نکل جائیں گے۔" میں نے نہایت ملائمت سے اسے خبردار کیا۔

چارلس نے دونوں ریوالور اٹھانے میں پھرتی دکھائی اور دانت پیس کر بولا "مسئلہ یہ ہے کہ میں انگریز ہوں اور بڑا خاندانی قسم کا آدمی ہوں۔ قانون کا محافظ کسی بھی ملک کا ہو میں اسے مارنے کا تصور نہیں کرسکتا۔ ورنہ دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ اس بدبخت کو دونوں ریوالوروں سے شوٹ کردوں۔"

"قانون کا محافظ!" میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا لیکن میری ہنسی کراہ سے مشابہ تھی "مسٹر چارلس! تم ابھی تک اسے قانون کا محافظ ہی سمجھ رہے ہو۔ اس جیسے لوگوں کی وجہ سے تو قانون کی حالت پتلی رہتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" چارلس نے جھک کر صحیح طور پر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

"یہ ہمارا پیارا دوست حمان ہے۔ مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی اس سے دوبارہ ملاقات ہوجائے گی اور یہ تنہا ہی ہماری بغل میں آن گھسے گا۔" میں نے حمان کو قابو میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"حمان!" چارلس بے اختیار چیخا۔ اگر وہ اس وقت بری طرح ایک طرف پھنسا نہ ہوتا تو شاید حیرت کے مارے اچھل کر گاڑی کی چھت سے جا ٹکراتا۔

"ہاں، پچھلی مرتبہ ہم نے اسے دیکھا تو اس کے چہرے پر فرنچ کٹ ڈاڑھی اور مونچھیں تھیں۔ اس وقت یہ کلین شیو ہے۔ ہیلمٹ اور بڑے تاریک چشمے نے بھی چہرے کا کافی حصہ چھپا رکھا ہے۔ شروع میں، میں بھی دھوکا کھا گیا تھا۔ اسے اپنی آواز حتیٰ کہ اپنی چال ڈھال بدلنے میں بھی کمال حاصل ہے۔ مجھے اس کی صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔"

"لیکن یہ بدبخت تمہاری صلاحیتوں کا اعتراف نہیں کرے گا۔ حالانکہ اسے چاہیے یہ اب تمہیں استاد مان لے۔" چارلس بولا۔

ڈرائیور اس وقت تک پیچھے مڑ کر یہ دیکھ کر مطمئن ہوچکا تھا کہ وہ شخص ہمارے قابو میں تھا۔ دوسرے لفظوں میں صورتِ حال ہمارے قابو میں تھی۔ وہ گاڑی پکی سڑک پر لے آیا تھا اور نہایت سست رفتاری سے چلا رہا تھا۔ حمان کو یقین آگیا تھا کہ اس نے ذرا بھی زور آزمائی کی تو اس کے دونوں کندھوں کے جوڑ الگ ہوجائیں گے۔ اس لیے وہ ساکت ہوکر بیٹھ گیا تھا۔ سیٹ کے نیچے اس کی دونوں ٹانگیں بھی میں نے ایک ٹانگ کے نیچے پھنسالی تھیں۔

وہ پُرسکون لہجے میں بولا "ڈیئر چودھری! مجھے بھی پچھلی ملاقات میں اندازہ ہوگیا تھا کہ تم ایک طاقتور آدمی ہو لیکن میری غلطی یہ تھی کہ میں نے اس بات کو اہمیت نہیں دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آج کے دور میں جسمانی طاقت کی کوئی اہمیت نہیں۔ صرف ہتھیار اہم ہوتے ہیں لیکن آج مجھے احساس ہوا ہے کہ کبھی کبھی جسمانی طاقت بھی کام آجاتی ہے۔ میرے بازو شل ہوچکے ہیں اور ہاتھ ٹوٹے جارہے ہیں۔ میرے بازو چھوڑ دو۔ میں تمہارے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کروں گا۔ میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔"

"سوری! میں تمہاری اس محبت بھری درخواست پر عمل نہیں کرسکتا۔ تم عمرو عیار کے قبیلے سے معلوم ہوتے ہو۔ میں تمہاری درخواست پر عمل کرکے پچھتانا نہیں چاہتا۔"

"تم بہت ہی غیرمعیاری اور کمینے قسم کے دشمن ہو۔" وہ ہلکی سی کراہ کے ساتھ بولا "تم نے مجھے کب پہچانا؟"

"میں نے تمہیں جلد ہی پہچان لیا تھا لیکن اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ میں چاہتا تھا کہ بھی پوری طرح مکڑی کے جال میں آن پھنسے۔" میں نے جواب دیا۔ "اس لیے میں نے اپنا رویہ ایسا ہی رکھا جیسے میں تمہیں پولیس سارجنٹ ہی سمجھ رہا ہوں اور واقعی تم سے جان چھڑانے کی فکر میں ہوں۔"

"افسوس کہ مجھے تمہارے اس رویے پر حقیقت کا گماں گزرا۔ میں تمہیں اپنے سے بڑا ایکٹر تسلیم کرتا ہوں۔ اب تو میرے بازو چھوڑ دو۔" وہ کراہا۔

"مجھے خود کو ایکٹر تسلیم کرانے کا قطعاً کوئی شوق نہیں۔ تم مجھے بازو چھوڑنے کے لیے کہہ رہے ہو۔ میں تو ابھی مسٹر چارلس سے تمہاری ٹانگیں بھی بندھوائیں گا۔" میں نے کہا۔

"اگر یہ گڑبڑ کرے تو میں کم از کم اس کی دونوں ٹانگوں میں تو گولی مار سکتا ہوں نا؟" چارلس نے اجازت طلب انداز میں پوچھا۔

"نہیں نہیں اب یہ اس طرح ہاتھ آگیا ہے تو میری کوشش یہی ہوگی کہ ہم اس کے جسم پر خراش تک ڈالے بغیر اسے ترکی کی حکومت کے حوالے کریں اور اگر تم چاہو تو اسے اسمگل کر کے برطانیہ بھی لے جاسکتے ہو۔ یہ تمہاری حکومت کا بھی مجرم ہے۔ وہاں اس کا جو مناسب سمجھو وہ حشر کردینا۔ فی الحال میں اس کے ساتھ خون خرابا نہیں چاہتا۔ بشرطیکہ یہ مجھے اس پر مجبور نہ کردے۔"

"میرے بارے میں اتنے لمبے پروگرام مت بناؤ۔" حمان قدرے اطمینان سے بولا "تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ مجھے چھوڑ دو۔ ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ میں اس قسم کی صورتِ حال کا پیشگی بندوبست کر کے چلا تھا۔"

"کیسا بندوبست؟" چارلس نے فوراً پوچھا۔

"یہ تو کچھ دیر تک تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ اس کا اطمینان مجھے کھٹک رہا تھا جس طرح شروع میں ہی اس کی وردی میری نظریں کھٹکی تھی۔ مجھے فوراً ہی احساس ہوا تھا کہ وہ اس شخص کی اپنی وردی نہیں تھی اور اسی احساس نے مجھے اس کی طرف بہت غور سے دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ معلوم نہیں کس بے چارے ٹریفک سارجنٹ کی شامت آئی ہوگی جسے اس نے وردی اور موٹر سائیکل وغیرہ سے محروم کیا ہوگا۔ معلوم نہیں وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہوگا۔

میں نے بے پروائی سے کہا "جس طرح ہم نے تمہیں دیکھ لیا ہے اس طرح تمہارے "بندوبست" کو بھی دیکھ لیں گے۔" میں مڑ کر دیکھ چکا تھا۔ ہمارے پیچھے کوئی گاڑی نہیں تھی۔ پھر میں نے چارلس سے پوچھا "کیا ہم کلچرل سینٹر کی طرف جارہے ہیں؟"

"نہیں" چارلس نے جواب دیا اور ڈرائیور سے کہا "گاڑی واپس موڑو۔"

گاڑی صحیح طور پر واپس موڑنے کی نوبت نہیں آئی۔ ڈرائیور ابھی پورا ٹرن نہیں لینے پایا تھا کہ سامنے سے گہرے سبز رنگ کی ایک گاڑی آندھی طوفان کی طرح نمودار ہوئی۔ اس کے بریک چرچرائے اور اس نے ترچھی ہو کر ہماری گاڑی کا راستہ روک لیا۔

میں اس کی کھڑکی سے ایک گن کی نال باہر آتے دیکھ چکا تھا اور زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ سب مشین گن کی نال تھی۔ اسی طرف کی کھڑکی میں مجھے ڈاڑھی والے ایک شخص کی جھلک نظر آئی۔ گاڑی میں غالباً صرف دو ہی افراد موجود تھے۔ دوسرا ڈرائیو کر رہا تھا لیکن ان کی تعداد کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کیونکہ باقی تمام کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور ونڈ اسکرین سمیت تمام شیشے گہرے رنگ کے تھے۔

مجھے سامنے سے ایسی کسی گاڑی کے آنے کی توقع نہیں تھی۔ میں صرف یہی دیکھ کر مطمئن ہوگیا تھا کہ ہمارے تعاقب میں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ تاہم میں اس گاڑی کی آمد کا انداز دیکھتے ہی کھٹک گیا تھا اور مجھے بروقت احساس ہوگیا تھا کہ وہ حمان کے ساتھیوں کی گاڑی ہوسکتی تھی۔

میرا ذہن اس وقت کمپیوٹر کی طرح کام کر رہا تھا۔ چارلس کے ہاتھوں میں دو ریوالور تھے لیکن اس قسم کے حالات میں مجھے اس سے کوئی خاص امید نہیں تھی جب بجلی کی سی تیزی سے کچھ کر گزرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ میرے لیے اس کے ہاتھ سے کم از کم ایک ریوالور لے لینا ضروری تھا لیکن اس کے لیے مجھے حمان کے بازو چھوڑنا پڑتے۔

میں نے سوچا کہ بازو چھوڑنے سے پہلے اس کے کندھوں کے جوڑ الگ ہی کردوں تاکہ وقتی طور پر کم از کم وہ تو معذور ہوجائے اور جو کچھ ہونے والا تھا اس میں کوئی خاص کردار نہ ادا کرسکے لیکن اس کا ذہن بھی یقیناً کمپیوٹر ہی کی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے تو یقیناً گاڑی کو دور سے دیکھتے ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ میں تو شاید اس کے دو تین سیکنڈ بعد گاڑی کی طرف سے خبردار ہوسکا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں حمان کے بازوؤں پر دباؤ بڑھاتا اس نے گردن ٹیڑھی کر کے اس طرح میرے جبڑے پر ٹکر رسید کی کہ اس کے بازوؤں پر دباؤ بڑھنے نہیں پایا۔ اس کے سر پر ہیلمٹ تھا اور اس نے اس کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ٹکر گو کہ زوردار نہیں تھی لیکن اس سے اتنا ضرور ہوا کہ اس کا ایک بازو میری گرفت سے نکل گیا۔ ساتھ ہی اس نے مجھے ہیلمٹ سے دوسری ٹکر رسید کی۔

اسی دوران اس گاڑی سے سب مشین گن کا برسٹ پڑا۔ مجھے اس کا پہلے ہی خطرہ تھا۔ میں دونوں سیٹوں کی درمیانی جگہ میں گھس چکا تھا۔ میں نے حمان کو چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ سب مشین گن سے برسٹ صرف گاڑی کے ٹائر ناکارہ کرنے کے لیے مارا گیا تھا۔ ان کا اپنا ساتھی گاڑی میں موجود تھا۔ وہ اندھا دھند فائرنگ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

میں نے دیکھا حمان، چارلس کو دھکیلتا ہوا حیرت انگیز پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ دونوں ہی لڑھکتے ہوئے باہر جاگرے۔ میں نے بھی تیزی سے گاڑی سے نکل کر ان دونوں کے اوپر جاگرنا چاہا لیکن میرے قد کاٹھ کے لحاظ سے جگہ تنگ تھی۔ میں دونوں سیٹوں کے درمیان سے نکل کر دوسری طرف کے دروازے سے خاطر خواہ پھرتی سے باہر نہ پہنچ سکا۔ مجھے ایک لمحے کی تاخیر ہوگئی لیکن یہ بھی درحقیقت قدرت نے میری مدد کی تھی۔ وہ ایک لمحے کی

لاتعداد پراسرار اور سنسنی خیز داستانوں کے خالق

ایم اے راحت کا

ایک اور ہیبت ناک پراسرار ایڈونچر ناول

طلسم زادے

روشنی کی دنیا سے دُور پراسرار دنیا کی کہانی جہاں مافوق الفطرت زندگی کا دَور دورہ تھا، دو دشمنوں کی عجیب داستان جنہوں نے جب ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو ایک ناقابلِ یقین کہانی نے جنم لیا۔

ایم اے راحت کا وہ شاہکار ناول جسے شروع کرنے کے بعد مکمل کئے بغیر رکنا ناممکن ہو۔

شائع ہوگیا ہے
ہر اچھے بکسٹال سے طلب کریں۔

دو حصوں میں مکمل
حصہ اول: 150/-
حصہ دوم: 150/-

کتاب اپنے قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ادارے کے نام مکمل قیمت کا منی آرڈر ارسال فرمائیے
کتاب آپ کو بذریعہ رجسٹری ڈاک ارسال کردی جائے گی۔

خط و کتابت کے لئے
مکتبہ القریش سرکلر روڈ، اردو بازار، لاہور ۲، فون ۷۲۲۴۶۶۵

تاخیر میرے لیے خوش قسمتی کا باعث رہی کیونکہ اس دوران چارلس نے بدحواس ہو کر حمان پر تواتر سے کئی فائر کر ڈالے تھے۔

حمان کو تو کوئی گولی نہ لگی کیونکہ میں نے اسے اُٹھ کر بھاگتے دیکھا تھا لیکن اگر میں اس دوران ان دونوں پر جا گرا ہوتا تو ایک آدھ گولی مجھے ضرور لگ جاتی۔ اسی دوران سب مشین گن سے ایک اور برسٹ مارا گیا لیکن مجھے گولیوں کے کسی چیز سے ٹکرانے یا کسی قسم کی ٹوٹ پھوٹ کی آوازیں سُنائی نہیں دیں جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ محض ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کی گئی تھی۔

میں اس وقت تک بہرحال گاڑی سے نکل چکا تھا لیکن گاڑی کے بالکل ساتھ لگ کر سینے کے بل لیٹ چکا تھا۔ ہم تینوں گاڑی کے ایک طرف کے دروازے سے نکلے تھے۔ حمان کی مدد کے لیے آنے والی گاڑی دوسری طرف تھی۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن مجھے اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ حمان دوڑ کر اس تک پہنچ چکا تھا حالانکہ چارلس نے اس پر ایک دو فائر مزید کیے تھے۔

اس بدحواسی میں بھی چارلس نے کم از کم یہ عقلمندی کی کہ اٹھ کر کھڑا نہیں ہوا ورنہ شاید اس کی کھوپڑی اُڑ چکی ہوتی۔ گاڑی پر تیسرا برسٹ پڑا اور شیشے کی کرچیاں اڑنے کی آواز بھی سنائی دی۔ میں دل ہی دل میں ڈرائیور پر فاتحہ پڑھنے لگا تھا لیکن میں نے دیکھا اسی لمحے وہ بھی ہماری طرف کے اگلے دروازے سے باہر لڑھک آیا تھا اور صحیح سلامت نظر آ رہا تھا۔ اس برسٹ سے وہ یقیناً بال بال بچا تھا۔

اسی اثنا میں شہر کی طرف سے سفید رنگ کی ایک گاڑی کچھ اسی انداز میں نمودار ہوئی جس طرح دوسری طرف سے گہرے رنگ کی گاڑی آئی تھی۔ شاید یہ وہی گاڑی تھی جس کے بارے میں چارلس نے مجھے بتایا تھا کہ اس میں ٹرکش انٹیلی جنس کے لوگ تھے۔ بقول اس کے وہ ہماری "حفاظت" پر مامور تھے۔ جتنے عمدہ طریقے سے انہوں نے ہماری "حفاظت" کی تھی اس پر انہیں کوئی تمغا وغیرہ ملنا چاہیے تھا۔ معلوم نہیں اتنی دیر وہ راستے میں کہاں اٹکے رہے تھے اور اب کس طرح ہمارا سراغ پا کر آ رہے تھے۔

میں نے چارلس سے دونوں ریوالور چھینے۔ وہ اس دوران لڑھک کر میرے قریب آ چکا تھا۔ میں نے گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر گاڑی کی آڑ سے ذرا سا سر نکال کر پوزیشن لیتے ہوئے گہرے رنگ کی گاڑی کو دیکھنا چاہا تو پتا چلا کہ وہ واپس جانے کے لیے ٹرن بھی لے چکی تھی۔ ٹائروں کی چرچراہٹ سنائی دی۔

اس کا پچھلا دروازہ کھلا تھا۔ حمان آدھا اندر تھا اور آدھا دروازے پر لٹکا ہوا تھا اور گاڑی کے ٹرن لینے کی وجہ سے جھول کر رہ گیا تھا۔ میں نے بیک وقت دونوں ریوالوروں سے اس پر فائر کیے مگر اس وقت تک وہ گاڑی میں گھس چکا تھا اور دروازہ بند ہو چکا تھا۔ شاید گولیاں گاڑی پر کہیں لگی ہوں لیکن میں اس کے بعد کچھ بھی نہیں دیکھ سکا کیونکہ میں فوراً ہی دوبارہ گاڑی کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق جواباً سب مشین گن کا برسٹ آیا تھا۔ گاڑی کی حالت کچھ اور تباہ ہو گئی۔

میرے اب مزید کوئی کوشش کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا کیونکہ دونوں ریوالور خالی ہو چکے تھے۔ سفید گاڑی طوفانی رفتار سے ہمارے قریب پہنچ چکی تھی لیکن اس کے ڈرائیور نے وہاں رکنے کے بجائے گہرے سبز رنگ کی گاڑی کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ تیزی سے ہمارے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ میں نے اس کی ایک کھڑکی سے کسی کو سر نکالے ریوالور سے فائر کرتے دیکھا۔

میں اس وقت سبز گاڑی کو نہیں دیکھ پا رہا تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ وہ کافی دور جا چکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے ہلکی مشین گن کی تڑتڑاہٹ پھر گونجی۔ ایک ٹائر پھٹنے کا دھماکا سنائی دیا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ میں، چارلس اور ڈرائیور کچھ زیادہ ہی سکڑ سمٹ کر گاڑی کے عقب میں دبکے رہے۔ چند لمحے بعد آخر میں نے ذرا سر نکال کر سڑک کی طرف دیکھا اور مایوسی سے ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

تقریباً سوڈیڑھ سو گز آگے سڑک کے دوسری طرف نشیب میں وہ سفید گاڑی خطرناک حد تک ترچھی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کے آگے ٹنڈ منڈ سا ایک درخت تھا۔ شاید وہ اس درخت سے ٹکرا چکی تھی۔ تاہم امید افزا بات یہ تھی کہ گاڑی کے دروازے کھلے تھے اور چار افراد قریب کھڑے چاروں طرف سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ سبز گاڑی کا دور دور تک کہیں پتا نہیں تھا۔

ایک لمحے کے لیے میری طبیعت میں ہلکا سا اضمحلال آ گیا۔ یہ تمام معرکہ آرائی صرف چند سیکنڈ میں ختم ہوئی تھی۔ سب کچھ اس سے بھی کہیں زیادہ تیزی سے ہوا تھا جتنی تیزی سے کسی ایکشن فلم کے منظر میں ہوتا ہے۔ مجھے اس خیال سے ہلکی سی افسردگی کا احساس ہو رہا تھا کہ سب کچھ عجیب سے انداز میں شروع ہوا تھا اور عجیب سے انداز میں ہی ختم ہو گیا تھا۔

حمان کچھ عجیب بے وقوفانہ سے انداز میں ہی ہمارے قابو میں آ گیا تھا۔ صورتِ حال مکمل طور پر ہمارے حق میں تھی۔ شاید حمان کی وردی میں کوئی حساس آلہ پوشیدہ رہا ہو جس کے ذریعے اس کے ساتھی کہیں سبز گاڑی میں بیٹھے ہماری گفتگو سُن رہے ہوں اور اسی لیے بروقت اس کی مدد کو آن پہنچے ہوں۔ یا پھر شاید سب کچھ کسی حد تک ان کی پلاننگ کے مطابق ہوا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ جس طرح ہم حمان کو قابو میں رکھنے میں ناکام رہے تھے اسی طرح وہ بھی ہمیں اغوا کر کے لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

شاید سفید گاڑی کی آمد کا اس حد تک فائدہ ضرور ہوا تھا کہ حمان اور اس کے ساتھیوں نے فوری طور پر نکل جانے کا فیصلہ کیا تھا ورنہ شاید وہ مزید رکتے اور اس مختصر سے معرکے کو فیصلہ کن ہٹانے کی کوشش کرتے۔ ہمیں ساتھ لے جانے یا وہیں ہلاک کرنے کی کوشش کرتے۔

میرے خیال میں اگر دو آدمی ایک سب مشین گن یا کچھ اور ہتھیاروں کے ساتھ حمان کی مدد کے لیے آن بھی پہنچے تھے تو یہ کوئی زیادہ اہم بات نہیں تھی۔ قابو میں آئے ہوئے شکار کو اس طرح ہمارے ہاتھ سے نکلنا نہیں چاہیے تھا لیکن شاید میں خاطر خواہ پھرتی کا مظاہرہ نہیں کر سکا تھا۔ سچویشن سے صحیح طور پر نہیں نمٹ سکا تھا۔

پھر میں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ قسمت ہمیشہ نیک مقاصد رکھنے والوں پر ہی مہربان نہیں رہتی۔ کبھی کبھی وہ بُرے لوگوں پر بھی مہربان ہوتی ہے۔ شاید قدرت نے اپنے اسی عمل کو "ڈھیل دینا" قرار دیا ہے۔ اس میں قدرت کی نہ جانے کتنی مصلحتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ حمان میرے لیے اتنا اہم مسئلہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ سرے سے میرا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ مجھے اس میں اپنی ذہنی اور جسمانی توانائی صرف کرنے کی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی میرے غمزدہ ہونے کی کوئی تک تھی۔ مجھے تو اب صرف یہی فکر کرنی چاہیے تھی کہ جلد از جلد اور بخیر و عافیت پاکستان روانہ ہو جاؤں۔

میں نے چارلس اور ڈرائیور کو بتایا کہ انہیں گاڑی کے عقب سے نکل آنا چاہیے۔ ہم تینوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے سفید گاڑی تک پہنچے۔ اس کا ایک ٹائر برسٹ ہو چکا تھا اور شاید اسی کی وجہ سے وہ لہرا کر نشیب میں اُتری تھی۔ گاڑی کی پوزیشن بتا رہی تھی کہ وہ اُلٹتے اُلٹتے بچی تھی کیونکہ اس وقت اس کی رفتار بہت تیز تھی۔

وہ چاروں افراد جو گاڑی کے گرد کھڑے تھے ان کے چہروں پر خفیف سی خجالت کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ہماری سروس ریوالور تھا۔ باقی تینوں خالی ہاتھ نظر آ رہے تھے۔

"کہاں مر گئے تھے تم لوگ؟" چارلس نے ریوالور والے کو مخاطب کیا۔ شاید میری سہولت کے لیے وہ اِن سے انگریزی میں بات کر رہا تھا۔

"اس خبیث ٹریفک سارجنٹ نے ہماری گاڑی کو اوورٹیک کرتے وقت عین قریب سے گولی مار کر ہماری گاڑی کا ایک ٹائر برسٹ کر دیا تھا۔" ریوالور والے نے بتایا "ہمیں وہیل بدلنے کے لیے رُکنا پڑا۔ اب یہ دوسرا ٹائر برسٹ ہو گیا ہے۔"

"تم وہیل بدلنے کے بجائے کوئی چلتی گاڑی نہیں پکڑ سکتے تھے؟" چارلس نے اب ذرا کم ناگواری سے پوچھا۔

"کسی کی نجی گاڑی چھیننا یا اسے زبردستی ساتھ لینا ہمارے خیال میں مناسب نہیں تھا۔" ریوالور والے نے جواب دیا۔

چارلس ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا پھر بولا "تم لوگوں کے پاس کچھ اسلحہ وغیرہ بھی تھا یا نہیں؟"

"گاڑی میں دو گنیں تھیں لیکن ہمیں ان کے استعمال کا موقع نہیں ملا۔" ریوالور والے کے لہجے میں رُکھائی آتی جا رہی تھی۔

چارلس ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ آہ بھرنے کو تو میرا بھی جی چاہ رہا تھا۔ ٹرکش انٹیلی جنس کا حال بھی ہمارے ہاں کے خفیہ اداروں سے کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ ایک بار پھر میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ آخر وہ ہمارا "برادر" اسلامی ملک تھا۔ وہ لوگ تو پھر بھی گاڑی کا ٹائر بدل کر کسی نہ کسی طرح ہمارے اور اس گاڑی کے تعاقب میں آن پہنچے تھے جبکہ ہم نہ جانے کہاں سے کہاں نکل آئے تھے۔ ہمارے ہاں کے کسی خفیہ ادارے سے تو شاید یہ اُمید رکھنا بھی مشکل ہوتا۔

چارلس گھڑی دیکھتے ہوئے بولا "اب ہم واپس کیسے جائیں گے؟ دونوں گاڑیاں بے کار ہو گئی ہیں۔ تمہارا اسپیرو وہیل پہلے ہی کام آ چکا ہے۔" اس نے مضطرب انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا "مجھے مسٹر چودھری کو کلچرل سینٹر پہنچانا تھا۔ ان کی فلائٹ میں زیادہ وقت نہیں ہے اور انہیں اس سے پہلے بہت سی تیاریاں بھی کرنا تھیں۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک سنسان سڑک تھی۔ ابھی تک وہاں سے کوئی اور گاڑی گزرتی دکھائی نہیں دی تھی۔ ہماری گاڑی کے تین ٹائر برسٹ ہو چکے تھے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے قدرے مایوسی کا احساس ہوا۔ شاید میرا آج پاکستان پہنچنا قدرت کو منظور نہیں تھا۔

اچانک ہماری گاڑی کا ڈرائیور بولا "یہ دونوں گاڑیاں بے شک مختلف ہیں مگر کمپنی ایک ہی ہے۔ ان کے وہیل کا سائز اور ساخت ایک ہی ہے۔ ہماری گاڑی کا جو ایک وہیل سلامت رہ گیا ہے میں اسے نکال لاتا ہوں تب تک تم لوگ یہ ناکارہ وہیل اُتارو۔ یہ گاڑی صحیح حالت میں ہے۔ ہم اپنی گاڑی کا وہیل اس میں لگا کر اسے لے جاتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک ہے، جلدی کرو۔" چارلس بولا۔

ڈرائیور دوڑتا ہوا واپس اپنی گاڑی تک گیا اور بڑی پھرتی سے وہیل نکال کر تیزی سے سڑک پر لڑھکاتا ہوا لے آیا۔ اس دوران انٹیلی جنس والوں کی سفید کار کا وہیل نکالا جا چکا تھا۔ سفید گاڑی درخت سے بھی ٹکرائی تھی لیکن یہ نہایت معمولی ٹکر تھی۔ لینڈر تھوڑا سا ٹیڑھا ہونے کے سوا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

جلد ہی وہیل تبدیل ہو گیا اور سفید گاڑی ہمارے ڈرائیور نے سنبھال لی۔ حمان کی جگہ دو انٹیلی جنس والے ہمارے ساتھ ہو گئے۔ دو وہیں تباہ شدہ گاڑی کے پاس رک گئے۔ ہم نہایت تیز رفتاری سے واپس روانہ ہوئے۔ راستے میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔

کلچرل سینٹر کی عمارت خاصی بڑی اور خوب صورت تھی۔ ہسپانوی اور ترکی طرزِ تعمیر کا امتزاج اس حویلی نما عمارت کو منفرد

بنا رہا تھا۔ پُرانی ہونے کی وجہ سے اس میں اس شان و شکوہ کی جھلک بھی تھی جو شاہانہ اور نیم شاہانہ قسم کی عمارتوں میں دکھائی دیتی ہے۔ پہلے شاید اس عمارت کا مصرف کچھ اور رہا ہو لیکن اب یہ کلچرل سینٹر کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ اس کی چار دیواری میں ایک سرسبز اور طویل و عریض لان بھی موجود تھا جس پر اِدھر اُدھر مختلف عمروں کے مردوں اور عورتوں کی ٹولیاں بکھری ہوئی تھیں۔

میں چارلس کی رہنمائی میں شاہانہ طرز کے ایک بہت بڑے ہال میں پہنچا جہاں بڑی گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ چاروں طرف کمروں کے دروازے تھے جن سے لوگ ہال میں آ جا رہے تھے۔ ان میں عورتیں مرد سبھی تھے۔ ان میں سے بعض عجیب سے لباس میں تھے۔ لمبے لمبے بھاری بھرکم گاؤن جن پر نیچے کی طرف فر کی لمبی لمبی جھالریں لگی ہوئی تھیں۔ گلے میں موٹی موٹی مالائیں اور سر پہ ترکی ٹوپی' پیروں میں کچھ اس قسم کے لمبے لمبے جوتے جیسے عموماً برفانی علاقوں میں رہنے والے پہنتے تھے۔

ہال میں ایک طرف بہت سے بیگ رکھے تھے۔ ایک طرف کچھ لوگ مختلف قسم کے چمڑے کے کیسز اور کارٹنز وغیرہ میں موسیقی کے مختلف آلات پیک کر رہے تھے۔ شاید طائفے کی سفر کی تیاریاں آخری مراحل میں تھیں لیکن وہاں غالباً اس طائفے کے علاوہ بھی کچھ لوگوں کی مصروفیات جاری تھیں۔

چارلس کے ساتھ میں اوپر کی منزل پر ایک آفس نما کمرے میں پہنچا۔ یہاں بھی کئی افراد موجود تھے اور بڑی سرگرمی نظر آ رہی تھی۔ سامنے ہی شیشے کے ایک کیبن میں تراشیدہ بھورے بالوں والی ایک لڑکی سر جھکائے تندہی سے کچھ ٹائپ کر رہی تھی۔ چارلس نے ایک شخص سے کسی کے بارے میں کچھ پوچھا۔ اس نے ایک شخص کی طرف اشارہ کر دیا۔

سرخ و سپید سا وہ دُبلا پتلا نوجوان سوٹ میں تھا اور کسی دوسرے کی میز پر کونے میں ٹیلی فون کان سے لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ وہ بڑے زور شور سے کسی کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھا اور بڑے تواتر سے ہاتھ بھی ہلائے جا رہا تھا۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم اس تک پہنچے تو اس نے گفتگو ختم کر کے ریسیور رکھ دیا۔

وہ غالباً اٹھ کر تیزی سے کہیں جانے ہی لگا تھا کہ چارلس نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ اس کا گویا صرف تعارف کرانا ہی کافی تھا۔ اس نے گرمجوشی سے چارلس سے مصافحہ کیا اور فوراً ہی میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولا "غالباً یہ مسٹر افضل چودھری ہیں؟" وہ فرانسیسی لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔

چارلس نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھے بتایا "یہ صاحب ترکی کے اس ثقافتی طائفے کے منیجر ہیں جس میں تمہیں شامل ہو کر جانا ہے۔ ان کا نام کنعان ہے۔"

کنعان نشو پیپر سے اپنے چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا "عجیب اتفاق ہے کہ ان صاحب کو فواد الخالص کی جگہ جانا ہے اور آج فواد واقعی ہمارے ساتھ نہیں جا سکتا تھا۔ اسے بڑا شدید قسم کا فلو ہوا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے کم از کم پانچ دن کے لیے بستر میں رہنے کی ہدایت کی ہے۔"

چارلس دھیرے سے ہنس دیا۔ کنعان براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوا "ہمارے پاس وقت کم ہے۔ ہماری پلاننگ تھوڑی سی غلط ہو گئی ہے جس کی وجہ سے بعض کام بڑے غلط وقت پر..... یعنی آخری لمحوں میں ہو رہے ہیں۔ میں آپ کو اپنی ایک اسسٹنٹ کے حوالے کر دیتا ہوں۔ وہ آپ کو سفر کے لیے تیار کرا دے گی۔ ہمیں کاسٹیوم میں ہی جانا ہے۔ تھوڑا سا میک اپ بھی ہو گا۔"

"اوہ میرے خدا!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا "کیا میک اپ کے بغیر کام نہیں چل سکتا؟ یہ شو بزنس کے لوگوں والا میک اپ میں نے کبھی نہیں کیا۔"

"مسٹر چودھری! جب آپ ہمارے طائفے میں شامل ہو کر جا رہے ہیں تو آپ کو طائفے کا ایک رکن ہی نظر آنا چاہیے۔ بلکہ آپ فواد الخالص کی جگہ جا رہے ہیں تو آپ کو فواد ہی نظر آنا چاہیے۔" کنعان مضطربانہ لہجے میں بولا "ہم تھوڑی سی بے ایمانی کر رہے ہیں تو اسے سلیقے سے کریں گے۔ بے ایمانی دور سے ہی بے ایمانی نظر نہیں آنی چاہیے۔"

میں نے کندھے اچکا دیے۔ چارلس مجھے ہولے سے کہنی مار کر بولا "اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔"

"ٹھیک ہے دوست! مجھے تو پاکستان جانا ہے۔ میرا خیال ہے موجودہ حالات میں مجھے زیادہ نخرے نہیں دکھانے چاہئیں۔ میں حاضر ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ آیئے۔" کنعان میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

چارلس بولا "میں اب چلتا ہوں' اب یہاں میری کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنا کام کر دیا ہے۔"

"مسٹر چارلس! میں حقیقتاً آپ کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔" میں نے سنجیدگی اور ادب سے کہا "آپ واقعی اس اجنبی ملک میں میرے بہت کام آئے ہیں۔ میں سوچتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ اگر آپ سے ملاقات نہ ہوتی تو میں اس وقت کہاں ہوتا!"

"تم جہاں بھی ہوتے شاید اس سے زیادہ آرام سے ہوتے۔" چارلس مسکراتے ہوئے بولا "مجھے تو تم سے معذرت کرنا تھی اور تم میرا شکریہ ادا کر رہے ہو۔ میری وجہ سے درحقیقت تمہیں بہت سی تکلیفیں اُٹھانا پڑیں۔ میرے مسائل شیئر کرنا پڑے۔"

پھر اس نے کندھے اچکائے اور میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "بہرحال وقت گزر ہی جاتا ہے۔ یادیں رہ جاتی ہیں۔ ہمیں اتنی رسمی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہو گی۔"

"یقیناً" میں نے گرمجوشی سے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا

"آپ جب بھی پاکستان آئیں' مجھے ضرور اطلاع دیجئے گا۔ سیٹھ رمضان سے کہہ دیجئے گا۔ میں جہاں بھی ہوا' وہ آپ کا مجھ سے رابطہ کرا دے گا۔"

میں نے دیکھا کنعان مضطربانہ انداز میں گھڑی دیکھ رہا تھا۔ میں نے چارلس کو خدا حافظ کہا اور کنعان کے ساتھ ہم دونوں نیچے آ کر اپنے اپنے راستوں پر ہو لیے۔ چارلس باہر کی طرف چل دیا اور کنعان مجھے ایک کمرے کے دروازے پر کھڑی ہوئی لڑکی کے پاس لے آیا۔

وہ تیس سے اوپر کی ایک دُبلی پتلی لڑکی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور بال نہایت مختصر تھے۔ وہ نیلے اور گلابی' دو رنگے اسکرٹ میں تھی۔ کنعان نے اس سے میرا تعارف کرایا "یہ وہی افضل چودھری ہیں جن کے بارے میں ہمیں ہدایات ملی تھیں۔" پھر اس نے مجھے لڑکی کے بارے میں بتایا "یہ ریحا ہے۔ یہ آپ کو جانے کے لیے تیار کرے گی۔ آپ کو اس کی ہدایات پر حرف حرف بہ حرف عمل کرنا ہے۔"

وہ صرف اتنا کہہ کر واپس چل دیا اور ایک دروازہ کھول کر اس کے عقب میں غائب ہو گیا۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ بغلوں میں دیے' دروازے سے ٹیک لگائے کسی ناکام فلسفی کی طرح اداس اداس سی نظروں سے میرا سرتاپا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ گویا فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ مجھے گفتگو کا شرف بخشے یا نہیں؟

تاہم جب وہ بولی تو اس کی آواز انتہائی ذہیمی' شیریں اور لہجہ نہایت دوستانہ تھا "مسٹر چودھری! میرے خیال میں تمہیں سب سے پہلے غسل کی ضرورت ہے۔ لگتا ہے تم سوٹ پہن کر کشتی بازی کرتے رہے ہو۔"

تب پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ قسمت ہی کچھ عجیب تھی کہ چند میل کا سفر بھی سکون سے طے نہیں ہوتا تھا۔ اب میں محترمہ ریحا کو کیا بتاتا کہ میرا زندہ سلامت کلچرل سینٹر پہنچ جانا بھی اوپر والے کی مہربانی ہی تھی ورنہ وہ مجھے جس غسل کا مشورہ دے رہی تھی وہ میرا غسلِ میت بھی ہو سکتا تھا۔

"کیا ہمارے پاس اتنا وقت ہے؟" میں نے اپنی حالت پر ذرا بھی شرمندہ ہوئے بغیر پوچھا "مسٹر کنعان تو بہت عجلت میں معلوم ہوتے ہیں۔"

"وہ تو ہمیشہ اسی طرح عجلت میں ہوتے ہیں اور اسی طرح گھبرائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ہمارے پاس بہت زیادہ وقت نہیں ہے لیکن اگر آپ ذرا مستعدی سے کام کریں تو ہم ذرا ڈھنگ سے تیار ہو کر جا سکتے ہیں۔ ویسے بھی ہم ثقافتی طائفہ لے کر جا رہے ہیں' مہاجرین کا قافلہ نہیں۔" ریحا ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ وہ شستہ انگریزی میں بات کر رہی تھی۔

تھی کہ وہاں اتنی بھی بھگدڑ نہیں مچی ہوئی تھی جتنی بظاہر نظر آ رہی تھی۔ ریحا نے ایک شاندار باتھ روم تک میری رہنمائی کی جو تمام لوازمات سے آراستہ تھا۔

غسل کے بعد ریحا نے مجھے ویسا ہی لباس مہیا کیا جس میں وہاں کئی افراد پھرتے نظر آ رہے تھے۔ وہی لمبا سا بھاری بھرکم چغا یا گاؤن۔ نیچے لمبے کرتے سے مشابہ قمیص' بھاری بھرکم جوتے اور ترکی ٹوپی۔ گلے میں مالائیں..... اور نہ جانے کیا کچھ۔

میں نے اس لباس میں خود کو کارٹون محسوس کیا لیکن ریحا میرا جائزہ لیتے ہوئے طمانیت سے سر ہلا کر بولی "سچ رہے ہو' فواد الخالص سے زیادہ سچ رہے ہو۔"

میں نے دھیمے لہجے میں کہا "اگر میرا دل رکھنے کو کہہ رہی ہو تب بھی میں اس پر خوش ہوں۔"

اس کے پھیکے سے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ اُبھری اور مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ ایک طرف کو چل دی۔ اس بار ہم جس کمرے میں پہنچے وہ ایک طویل و عریض میک اپ روم تھا۔ وہ غالباً ایک بہت بڑے تھیٹر کی میک اپ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس عمارت میں ایک بہت بڑا آڈیٹوریم بھی موجود تھا جہاں تقریباً ہر روز کوئی نہ کوئی ڈراما یا کلچرل شو وغیرہ دکھایا جاتا تھا۔ وہ خالصتاً دفتری قسم کی عمارت نہیں تھی۔ وہاں فن و ثقافت کے شعبے سے متعلق تقریباً تمام ضروریات پوری کرنے کا انتظام تھا حتیٰ کہ دوسرے شہروں سے یا دوسرے ملکوں سے آنے والے فنکاروں کو بھی اگر کسی وجہ سے ہوٹل میں نہ ٹھہرایا جا سکتا تو یہاں ٹھہرایا جا سکتا تھا یہاں ان کے قیام و طعام کا معقول انتظام تھا۔

مجھے دیوار گیر آئینوں میں سے ایک کے سامنے اونچی کرسی پر بٹھا دیا گیا اور ریحا کی ہدایت پر موٹی سی ایک خاتون نے مستعدی سے میرا میک اپ شروع کر دیا۔ چھوٹے قد کی وہ گول مٹول سی عورت بہت ہنس مکھ معلوم ہوتی تھی لیکن اسے انگریزی نہیں آتی تھی۔ وہ ریحا سے صرف ترکی میں بات چیت کر رہی تھی۔

مجھے باقاعدہ پیشہ ور ایکٹروں کی طرح بیٹھ کر میک اپ کرانا بہت عجیب لگ رہا تھا اور اس وقت تو میں بے اختیار کراہ کر رہ گیا جب میرے چہرے پر فوانچوکٹ مونچھوں کا اضافہ ہو گیا۔ پھر میک اپ وومن نے ترکی ٹوپی میرے سر پر رکھ کر ذرا پیچھے ہٹ کر ناقدانہ نظروں سے میرا جائزہ لیا۔

میں نے بے چارگی سے ریحا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ترکی ٹوپی کی حد تک تو معاملہ قابلِ برداشت تھا لیکن کیا یہ لٹکتی ہوئی مونچھیں بھی ضروری ہیں؟"

"مجبوری ہے۔" ریحا نے کندھے اُچکائے "فواد الخالص کی مونچھیں ہیں اور پاسپورٹ پر فی الحال اسی کی تصویر لگی ہے۔"

اور جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ نیم وا آنکھوں سے آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے مجھے کچھ یوں لگا جیسے میرے سامنے کوئی اجنبی بیٹھا ہو۔ اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ یہ سب کچھ تو میرے حق میں بہت ہی اچھا ہو رہا تھا۔ کوئی دوسرا تو مجھے کیا پہچانتا' محض چند چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں سے میں خود اپنے لیے بھی ناقابلِ شناخت ہو چکا تھا۔

میں خود کو شش کرتا تو شاید اس اجنبی ملک میں مجھے اپنی شکل اور حلیہ تبدیل کرانے میں خاصی دشواری پیش آتی لیکن میرا یہ کام کسی فرمائش کے بغیر خود بہ خود ہی ہو گیا تھا۔ میرا اصل شکل میں پاکستان جانا شاید بہتر نہ ہوتا۔ اس قسم کے بہروپ میں جانا زیادہ بہتر تھا۔ یہ سوچ کر میں نے اطمینان کی سانس لی اور کرسی کے پشتے سے سر ٹکا کر پُرسکون انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔

ریحا فوراً ہی میرا کندھا ہلاتے ہوئے بولی "اب اٹھ جاؤ۔ یہ میک اپ روم کی کرسی ہے کوئی پنگوڑا نہیں جہاں لیٹ کر تم لوری سننے کی تیاری کر رہے ہو۔ تسوا کو ابھی کچھ دوسرے لوگوں کا میک اپ بھی کرنا ہے۔"

تب مجھے معلوم ہوا اس گولی مٹول ہنس مکھ عورت کا نام تسوا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "اصل میں میرے ساتھ معاملات کچھ اُلٹ پلٹ سے ہو گئے ہیں۔ جب میں شیر خوار تھا تو لوریوں کے بجائے کلاسیکل موسیقی سنا کرتا تھا۔ اب لوریاں سننے کو جی چاہنے لگا ہے۔"

میں نے تسوا کا شکریہ ادا کیا اور ایک بار پھر ریحا کے ساتھ ہو لیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ ریحا لمبی اور بے پناہ دُبلی تھی۔ شاید حد سے زیادہ ڈائٹنگ کی ماری ہوئی تھی جبکہ تسوا پستہ قد اور ہر طرف سے گول مٹول تھی۔ ریحا کی سنجیدگی تقریباً افسردگی سے مشابہ تھی جبکہ تسوا کے ہونٹوں سے ہی نہیں بلکہ پھولے پھولے سرخ و سپید گالوں سے بھی گویا ہنسی پھوٹی پڑتی تھی۔

راستے میں ریحا بولی "تم اپنا سامان میرے حوالے کر دو۔"

"میرے پاس اس بریف کیس کے سوا کچھ نہیں ہے۔" میں نے اسے اپنا بریف کیس دکھایا جو کچھ زیادہ ہی "بریف" تھا۔

"تم کچھ لے کر تو نہیں جا رہے ہو؟" اس نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم بہت اونچی سفارش پر ہمارے طائفے میں کسی اور کی جگہ شامل ہو کر جا رہے ہو۔ کہیں تم کوئی خاص قسم کے کیریئر وغیرہ تو نہیں ہو؟ ڈرگ مافیا کے آدمی تو نہیں ہو؟ براؤن شوگر وغیرہ تو لے کر نہیں جا رہے؟ میرا مطلب ہے ہیروئن وغیرہ؟" اس نے وضاحت کی۔

"اوہ" میں گہری سانس لے کر رہ گیا "آج کل میں واقعی خود کو کیریئر محسوس کر رہا ہوں لیکن وہ کیریئر نہیں' جو تم سمجھ رہی ہو۔ بلکہ کسی [illegible] کا کیریئر۔"

"بات کو مذاق میں مت ٹالو۔" اس کی سنجیدگی برقرار رہی "میں یہ بات تم سے صرف اپنی معلومات کے لیے پوچھ رہی ہوں۔ ظاہر ہے میں تمہیں روک تو نہیں سکتی۔"

"تمہیں واقعی اپنی معلومات میں اضافے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ تمہاری معلومات بہت ہی ناقص ہیں۔ مجھ جیسا مسکین اور بے سروسامان آدمی تمہیں ڈرگ مافیا کا کیریئر نظر آ رہا ہے۔ خیر تمہارا بھی قصور نہیں۔ ڈرگ مافیا نے واقعی دنیا میں اپنے پنجے اتنے پھیلا لیے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے ساتھ چلتے ہوئے شخص پر ڈرگ مافیا کے آدمی کا شک ہوتا ہے لیکن تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ترکی سے پاکستان کی طرف پاؤڈر لے کر کوئی ایسا شخص ہی جا سکتا ہے جس کا ذہنی توازن درست نہ ہو۔ یہ پاؤڈر لے کر جانے کا نہیں بلکہ لے کر آنے کا روٹ ہے۔" میں نے ملائمت سے اسے سمجھایا۔

"مجھے ان باتوں کا زیادہ علم نہیں ہے۔ میں نے تو احتیاطاً پوچھ لیا تھا۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

کچھ دیر بعد روانگی کا اعلان ہو گیا۔ بڑی سی ایک خوب صورت اور ائرکنڈیشنڈ کوچ ہمیں لینے آئی تھی۔ کچھ مزدور ٹائپ لوگوں نے ہمارا سامان اس پر لادا۔ کنعان' ریحا اور ایک تیسرے شخص نے فرداً فرداً ہم سب کا یوں معائنہ کیا جیسے اسکول میں بچوں کی انسپکشن ہو رہی ہو۔ پھر ہم قطار بنا کر کوچ میں سوار ہوئے۔ طائفے میں چار خوب صورت اور خوش ادا لڑکیاں بھی شامل تھیں۔

کوچ روانہ ہوئی تو سب آپس میں ہنسی مذاق اور چہلیں کر رہے تھے لیکن مجھ سے کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان سب کو معلوم تھا میں جعلی فواد الخالص تھا اور ترک نہیں تھا لیکن انہوں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور نہ ہی کسی نے اس سلسلے میں مجھے کریدنے کی کوشش کی تھی۔

راستے میں لڑکیوں نے ڈف بجا بجا کر کچھ گانا شروع کر دیا۔ مرد بھی ان کا ساتھ دینے لگے۔ انہوں نے گویا راستے ہی میں اپنا ثقافتی شو شروع کر دیا تھا۔ ان کی موسیقی میں عربی موسیقی کی جھلک تھی اور ان میں سے بیشتر کے نام بھی عربی ہی معلوم ہوتے تھے۔

گانے کے درمیان ان سب کے قہقہے بھی گونجنے لگتے تھے۔ ائرکنڈیشنڈ کوچ کے شیشے بند ہونے کی وجہ سے غالباً زیادہ شور باہر نہیں جا رہا تھا۔ اس کے باوجود سگنل وغیرہ پر دوسری گاڑیوں کے لوگ ہماری گاڑی کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ ہمارے ہاں اکثر براتیں اسی طرح سفر کے دوران بسوں یا ویگنوں میں گاتی بجاتی اپنی منزل کی طرف جاتی تھیں۔

آخر کار ہم لوگ ائرپورٹ جا پہنچے اور سرسری انداز میں ضابطے کی کارروائیوں سے گزرنے کے بعد ٹرکش ائرلائنز کے ایک جمبو جیٹ میں سوار ہو گئے۔ میرے خیال میں یہ ایک مشکل مرحلہ تھا لیکن میری توقعات سے کہیں زیادہ آسانی سے طے ہو گیا تھا۔

طیارے کے فضا میں بلند ہونے کے بعد جب اس کی پرواز ہموار ہو گئی تو میں نے بیلٹ کھول کر سیٹ کے پشتے سے سر ٹکا لیا اور آنکھیں بند کر کے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ مجھے امید ہو چلی تھی کہ جس طرح استنبول کے ائرپورٹ پر طائفے کے ہمراہ جہاز میں سوار ہونا کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہوا تھا اسی طرح اسلام آباد ائرپورٹ پر ان لوگوں کے ساتھ کسٹم اور امیگریشن وغیرہ سے نکلنا کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔

طمانیت کے اس احساس کے ساتھ میرے اعصاب پر ایک عجیب میٹھی میٹھی لذت آمیز سی تھکن چھا گئی۔ ایک مدت گزر گئی تھی کہ میں ایک لامتناہی سے ہنگامہ خیز سفر میں تھا۔ یہ سفر گویا ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ اس زنجیر کا سلسلہ کہیں ٹوٹتا ہی نہیں تھا۔ ایک کڑی کے بعد دوسری کڑی...

اب میں وطن واپس جا رہا تھا تو یکدم ہی گویا میرے دل میں آرام کی خواہش جاگ اُٹھی تھی۔ ایسا آرام جس میں اندیشے اور وسوسے اعصاب میں سرسراہٹ پیدا نہ کریں۔ نیند کی حالت میں بھی خطرات کے احساس سے رگ و پے میں سنسنی نہ دوڑتی ہو۔ لیکن ایسا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ کہنے کو اب میں وطن واپس جا رہا تھا لیکن وہاں بھی نہ جانے کس طرح کے حالات میرے منتظر تھے۔

یہ سوچتے سوچتے میرا ذہن غنودگی میں ڈوب گیا۔

○☆○

طیارہ جب اسلام آباد ائرپورٹ پر اُترا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ ائرپورٹ پر بڑی رونق اور چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ ہم کسی خصوصی طیارے میں نہیں آئے تھے۔ اس میں دوسرے عام مسافر بھی موجود تھے۔ پہلے انہیں نکل جانے کا موقع دیا گیا۔ بعد میں ہم ارائیول لاؤنج میں آئے جہاں وزارتِ ثقافت کا سیکریٹری لیول کا کوئی بیوروکریٹ طائفے کو ریسیو کرنے آیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ اسٹاف کے کچھ لوگ اور چند پریس فوٹوگرافر وغیرہ موجود تھے۔

بڑی ترتیب اور سلیقے سے پروٹوکول کے مطابق تعارف وغیرہ کے مراحل طے ہونے لگے۔ مصافحے ہونے لگے۔ دھڑا دھڑ فلیش لائٹس کے جھماکے ہو رہے تھے۔ زیادہ تر کیمروں کا رخ طائفے میں شامل لڑکیوں کی طرف تھا جو بڑی من موہنی مسکراہٹ کے ساتھ ہر ایک سے جھک جھک کر مل رہی تھیں اور سمجھ میں نہ آنے والے جملوں پر بھی ہموار دانتوں کے موتی چمکا رہی تھیں۔

مجھے اس سارے سلسلے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن دل ہی دل میں حالات کی اس ستم ظریفی پر ہنسی ضرور آ رہی تھی۔ میرا نہ جانے اپنے ملک کی ثقافت سے بھی کوئی حقیقی تعلق تھا یا نہیں لیکن میں اس وقت ایک دوسرے ملک کے ثقافتی طائفے میں شامل تھا۔ میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ کوئی بھی شخص مجھ سے کوئی سوال نہ کرنے پائے کیونکہ میں ترکی میں جواب نہیں دے سکتا تھا جبکہ وہاں مترجم بھی موجود تھے۔

میری نظریں وہاں کسی شناسا صورت کو تلاش کر رہی تھیں۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں سیکیورٹی کے انتظامات تھے۔ غیر متعلق لوگوں کو ارائیول لاؤنج میں آنے سے روکنے کے لیے باہر پولیس وغیرہ موجود تھی۔ میں نے سوچا شاید باہر جاتے وقت میرا کوئی ساتھی نظر آئے۔

خدا خدا کر کے استقبال کے تکلفات ختم ہوئے اور ہم میزبان وفد کی رہنمائی میں باہر روانہ ہوئے۔ گاڑیوں کی طرف جاتے وقت میں نے راستے میں نظر آنے والے ہجوم کی طرف بار بار دیکھا لیکن مجھے کہیں کوئی شناسا چہرہ دکھائی نہ دیا۔ مجھے شبہ ہونے لگا کہ شاید چارلس' سیٹھ رمضان کو میرے صحیح پروگرام سے مطلع نہیں کر سکا تھا اور سیٹھ رمضان آگے وہ اطلاعات میرے ساتھی سلیمان تک نہیں پہنچا سکا تھا ورنہ شاید سلمان خود یا میرا کوئی اور ساتھی مجھے یہاں دکھائی دے ہی جاتا۔

ہم ائرپورٹ کی عمارت سے باہر پہنچ گئے اور میری متلاشی نظریں کسی ساتھی کو نہ پا سکیں حتیٰ کہ ہم ان گاڑیوں کی قطار تک جا پہنچے جو ہمیں لینے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ یہاں کوئی ایک بڑی گاڑی نہیں تھی۔ کئی مرسیڈیز کاریں تھیں۔ میزبان اور مہمان سب ٹولیوں میں تقسیم ہو کر ان گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ میں مختلف اندیشوں اور وسوسوں میں گھرا اس قافلے کے ساتھ اسلام آباد ہوٹل پہنچ گیا جہاں کچھ دیر کی خانہ پُری کے بعد سب کو ان کے کمروں میں بھیج دیا گیا۔ میرے حق میں اچھا ہی تھا کہ مجھے سنگل بیڈ روم ملا تھا۔

کھانا ہم جہاز میں ہی کھا چکے تھے۔ کمرے میں پہنچنے کے بعد میں دیر تک کچھ لوگوں کو فون کرنے کے بارے میں سوچتا رہا لیکن اس ارادے پر عمل نہ کر سکا۔ میرے خاص ساتھیوں میں سے کسی کا یہاں ٹھکانا نہیں تھا۔ میرا بزنس آفس یہاں موجود تھا لیکن وہ اس وقت یقیناً بند تھا۔ اپنے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر کے گھر کا فون نمبر بھی مجھے یاد تھا لیکن یہاں کے آفس والے بے ضرر سے لوگ تھے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کیوں غائب تھا اور لاہور میں جو غیر معمولی واقعات پیش آئے تھے ان کا پس منظر کیا تھا۔ میرے لیے یہاں کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر کو اپنی موجودگی کی اطلاع دینا فضول تھا۔ میں نے کسی کو بھی فون نہ کیا اور سو گیا۔ میں نے کوئی بھی قدم اٹھانے کا فیصلہ صبح تک کے لیے ملتوی کر دیا۔

صبح مجھے اس اُلجھن میں نہیں پڑنا پڑا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ علی الصباح ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ درحقیقت اس گھنٹی نے ہی مجھے جگایا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر "ہیلو" کہا تو دوسری طرف سے گہری ٹھہری آواز میں صرف اتنا کہا گیا "سر! باہر آ جائیے' میں آپ کا منتظر ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس انتہائی مختصر ٹیلی فون کال نے مجھے اُلجھن اور تذبذب

سے نکال لیا۔ وہ سلیمان کی آواز تھی۔ اس کی کال کا مطلب یہ تھا کہ وہ میری آمد اور ہوٹل کے اس کمرے میں میری موجودگی سے واقف تھا۔

میرا میک اپ عمدہ تھا۔ کئی گھنٹے کے سفر اور رات کو بستر میں رہنے کے باوجود ذرا بھی خراب نہیں ہوا تھا۔ البتہ اب میں ثقافتی طائفے والوں کے حلیے میں باہر جانے اور اکیلا اِدھر اُدھر پھرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ لوگوں کی توجہ میری طرف مبذول کرانے کا سبب بنتا جبکہ مجھے لوگوں کی توجہ سے بچنا تھا۔

میں بریف کیس میں عام سی ایک پینٹ شرٹ' پی کیپ اور تاریک چشمہ رکھ کر لایا تھا۔ اس کے علاوہ چھوٹا سا ایک کیمرا بھی تھا۔ پینٹ شرٹ پہن کر' پی کیپ سر پر جما کر' تاریک چشمہ لگا کر میں نے کیمرا گلے میں لٹکایا اور ناقدانہ نظروں سے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا..... کوئی اچھا خاصا غور سے دیکھنے کے بعد بھی مجھے کوئی ترک' ایرانی یا عرب سیاح تو سمجھ سکتا تھا' افضل چودھری نہیں سمجھ سکتا تھا۔

میں نے ہوٹل کے کمرے کو الوداع کہا۔ عین ممکن تھا کہ میں اب یہاں واپس نہ آتا۔ میری جگہ اصل فواد الخالص کو بھیجنا اب چارلس کا درد سر تھا۔ میں لفٹ کے ذریعے نیچے آکر ہوٹل کی لابی سے نکلا تو یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ ابھی صبح کا اجالا صحیح طور پر نہیں پھیلا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو ہوٹل کے آس پاس کوئی نظر نہ آیا۔ سردی اس وقت بہت زیادہ تھی۔ اردگرد کھڑے درخت بھی سردی سے ٹھٹھرتے محسوس ہو رہے تھے۔ کچھ دور فٹ پاتھ کے ساتھ ایک درخت کے نیچے ایک فقیر کمبل اوڑھے ٹھٹھرتا نظر آیا۔ اس سے پہلے بھی میں بارہا اسلام آباد ہوٹل میں ٹھہرا تھا لیکن میں نے کبھی اس کے آس پاس فقیر منڈلاتے نہیں دیکھا۔ خصوصاً سویرے سویرے جبکہ اسے کوئی بھیک دینے والا بھی دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

چند ٹیکسیاں فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی تھیں اور ان کے ڈرائیور کھڑکیوں کے شیشے چڑھائے اندر لیٹے سو رہے تھے یا اونگھ رہے تھے۔ میں پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلنے کے سے انداز میں فٹ پاتھ پر چل دیا۔ عمر رسیدہ فقیر لنگڑاتا ہوا میرے قریب آگیا۔ اس کے جسم پر ایک پھٹا پرانا اوورکوٹ تھا۔ پیروں میں پھٹے ہوئے جوتے تھے۔ لمبے لمبے اُلجھے ہوئے سیاہ و سفید بالوں نے آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا اور بے ترتیب ڈاڑھی مونچھوں میں مدغم ہو رہے تھے۔ اس کے چہرے کا بہت کم حصہ نظر آرہا تھا اور اسے بھی صحیح معنوں میں نظر آنا نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ اس پر بھی میل جما ہوا تھا..... اس کے اوورکوٹ کی ایک آستین ڈھیلے ڈھالے انداز میں جھول رہی تھی جس سے پتا چل رہا تھا کہ وہ ٹنڈا تھا۔

میں نے ہوٹل کے کمرے کو الوداع کہا۔ عین ممکن تھا کہ میں اب یہاں واپس نہ آتا۔ میری جگہ اصل فواد الخالص کو بھیجنا اب چارلس کا درد سر تھا۔ میں لفٹ کے ذریعے نیچے آکر ہوٹل کی لابی سے نکلا تو یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ ابھی صبح کا اجالا صحیح طور پر نہیں پھیلا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو ہوٹل کے آس پاس کوئی نظر نہ آیا۔ سردی اس وقت بہت زیادہ تھی۔ اردگرد کھڑے درخت بھی سردی سے ٹھٹھرتے محسوس ہو رہے تھے۔ کچھ دور فٹ پاتھ کے ساتھ ایک درخت کے نیچے ایک فقیر کمبل اوڑھے ٹھٹھرتا نظر آیا۔ اس سے پہلے بھی میں بارہا اسلام آباد ہوٹل میں ٹھہرا تھا لیکن میں نے کبھی اس کے آس پاس فقیر منڈلاتے نہیں دیکھا۔ خصوصاً سویرے سویرے جبکہ اسے کوئی بھیک دینے والا بھی دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

چند ٹیکسیاں فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی تھیں اور ان کے ڈرائیور کھڑکیوں کے شیشے چڑھائے اندر لیٹے سو رہے تھے یا اونگھ رہے تھے۔ میں پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلنے کے سے انداز میں فٹ پاتھ پر چل دیا۔ عمر رسیدہ فقیر لنگڑاتا ہوا میرے قریب آگیا۔ اس کے جسم پر ایک پھٹا پرانا اوورکوٹ تھا۔ پیروں میں پھٹے ہوئے جوتے تھے۔ لمبے لمبے اُلجھے ہوئے سیاہ و سفید بالوں نے آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا اور بے ترتیب ڈاڑھی مونچھوں میں مدغم ہو رہے تھے۔ اس کے چہرے کا بہت کم حصہ نظر آرہا تھا اور اسے بھی صحیح معنوں میں نظر آنا نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ اس پر بھی میل جما ہوا تھا..... اس کے اوورکوٹ کی ایک آستین ڈھیلے ڈھالے انداز میں جھول رہی تھی جس سے پتا چل رہا تھا کہ وہ ٹنڈا تھا۔

کرتے ہوئے بولا "دے جا بابا اللہ کے نام پر..... اللہ بچھڑے ہوؤں کو ملائے گا۔"

اس کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی اور سردی سے کانپ رہی تھی۔ میں نے بغور اس کی طرف دیکھا لیکن وہ سلیمان نہیں ہو سکتا تھا' سلیمان ٹنڈا نہیں تھا۔

"تم نے مجھے بہت اچھی دُعا دی ہے بابا!" میں نے کہا "میرا دل چاہ رہا ہے تمہاری غربت ہمیشہ کے لیے دور کر دوں۔ میرے ساتھ آؤ۔"

میں نے اسے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور ایک ٹیکسی کی طرف بڑھا۔ وہ جلدی سے بولا "اس ٹیکسی کو چھوڑیں جی۔ اس کا ڈرائیور بڑا بدمعاش ہے۔ جو ٹیکسی سب سے پیچھے کھڑی ہے اس میں بیٹھیں۔ اس کا ڈرائیور بہت اچھا آدمی ہے۔ میں ان سب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"جس طرح تم کہو گے میں اسی طرح کروں گا بابا!" میں نے سعادت مندی سے کہا اور اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

فقیر نے آگے بڑھ کر خود ہی ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور پہلے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس ٹیکسی کا ڈرائیور سویا ہوا نہیں تھا اور نہ ہی اونگھ رہا تھا۔ وہ مستعدی سے اسٹیئرنگ وہیل سنبھالے بیٹھا تھا۔ وہ باریش تھا اور پٹھان معلوم ہوتا تھا۔ سر پر موٹی اونی ٹوپی تھی اور وہ گہرے رنگ کی گرم شال لپیٹے ہوئے تھا۔

"کدر چلنا اے صیب!" ڈرائیور نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔

"کسی ایسے شاپنگ ایریا کی طرف چلو جہاں دُکانیں جلدی کھلتی ہوں۔" میں نے کہا "ان بابا جی کا حلیہ تبدیل کرنا ہے۔ میں چاہتا ہوں یہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر نہا دھو کر ایک معزز اور آسودہ حال آدمی نظر آئیں۔ یہ مجھے اس حلیے میں اچھے نہیں لگ رہے۔"

"ڈرائیور نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور ہوٹل کے سامنے والی لائن سے نکال لایا پھر گردن گھمائے بغیر بولا "اس وقت تو کدر بی دُکان کلا نئیں ہوئے گا صیب! لیکن ام تم کو بازار چھوڑ دے گا۔"

"بکواس بند کرو اور اپنی اصل آواز میں صحیح طریقے سے بات کرو۔" میں نے یکدم ہی اسے ڈانٹ دیا۔

میں عقب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ذرا اُچھل پڑا اور یکدم بدلی ہوئی آواز میں بولا "سر! آپ نے مجھے پہچان لیا؟"

"ابھی میرے ہوش و حواس اتنے خراب بھی نہیں ہوئے کہ میں اپنے جاں نثار ساتھیوں کو بھی نہ پہچان سکوں۔" میں نے کہا۔

اس نے بڑی کامیابی سے روپ بدلا ہوا تھا لیکن میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی اسے پہچان لیا تھا۔ وہ میرے خاص ساتھیوں میں سے ایک تھا۔ اس کا نام احمد تھا۔ اس کی اور آفتاب کی جوڑی ہوا کرتی تھی۔ آفتاب بھی میرا ایک خاص ساتھی تھا۔ دونوں دوست ہوا کرتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ تھے لیکن قسمت سے آفتاب بلیک بڑ

کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ بلیک بڑ ایک خاص قسم کے چیمپینزی تھے جو ریڈ ڈاٹ نے پالے ہوئے تھے۔ مجھے اپنا ہر جاں نثار ساتھی بہت عزیز تھا۔ آفتاب کی موت نے میرے دل میں بھی گھاؤ ڈالا تھا لیکن احمد تو عرصے تک سنبھل نہیں سکا تھا۔ تاہم اسی واقعے نے اس کے دل میں آتش انتقام بھی تیز تر کر دی تھی۔

ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد میں نے بھکاری کا بھی زیادہ قریب سے اور زیادہ غور سے جائزہ لیا تھا۔ وہ سلیمان ہی تھا لیکن اس کا میک اپ بہت عمدہ تھا حالانکہ احمد کی ڈاڑھی اصلی تھی جو یقیناً اس نے میری عدم موجودگی میں بڑھائی تھی لیکن سلیمان کی مصنوعی ڈاڑھی اس سے بہتر معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے اس کے مصنوعی ہونے کا یقین صرف اس لیے ہو سکا تھا کہ اس میں سفیدی غالب تھی جبکہ سلیمان بمشکل تیس سال کا نوجوان تھا۔

"سلیمان! تم البتہ چند سیکنڈ کے لیے مجھے بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔" میں نے بھکاری کی طرف مڑتے ہوئے کہا "خصوصاً اس بازو کی وجہ سے۔ جس سے تم اپنے آپ کو ٹنڈا ظاہر کر رہے ہو۔ یہ تم نے کیا ترکیب کی ہے؟ انسان اوورکوٹ کی آستین میں بھی بازو کو اس طرح تو دُہرا نہیں کر سکتا کہ وہ ٹنڈا نظر آئے۔"

گاڑی میں ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ صرف انجن کی خفیف سی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ آخر کار سلیمان نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اپنی اصل آواز میں بولا "سر! یہ کوئی ترکیب وغیرہ نہیں ہے' میرا بازو واقعی کٹا ہوا ہے۔ میں سچ مچ کا ٹنڈا ہوں۔"

اس کے لہجے میں قطعاً کوئی تاسف وغیرہ نہیں تھا۔ اس نے نہایت شگفتہ لہجے میں مجھے یہ اطلاع دی تھی۔ میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ میری زبان پتھرا سی گئی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔

سلیمان اپنی جھاڑ جھنکاڑ ڈاڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ہنس کر بولا "سر! آپ تو اداس ہو گئے۔ اس میں اداسی کی کیا بات ہے۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

"اتنی بے دردی سے اپنے بارے میں بات مت کرو۔ مجھے سنجیدگی سے بتاؤ۔ یہ کس طرح ہوا؟" میں نے کوشش کی کہ میرے لہجے میں ارتعاش نہ پیدا ہونے پائے۔

"چھوڑیں سر! آپ اتنی سی بات کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں؟" وہ بے پروائی سے بولا "میرا بایاں بازو ہی تو کٹا ہے۔ دایاں تو اب بھی سلامت ہے۔ مجھے تو خوشی یہ ہے کہ میں اب بھی پہلے ہی کی طرح آپ کا دست و بازو ہوں۔ میں اب بھی ہر کام پہلے ہی کی طرح کر سکتا ہوں۔"

"میں نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ تمہاری کارکردگی میں کوئی فرق تو نہیں پڑ گیا۔" میں نے قدرے تیزی سے کہا "میں نے جو پوچھا تھا اس کا جواب دو۔ تمہارا بازو کیسے کٹ گیا؟ کس نے کاٹا؟"

تب وہ نظر جھکاتے ہوئے دھیمے سے لہجے میں بولا "سر آپ کو یاد ہو گا۔ ریڈ ڈاٹ کی ایک مخلوق اُڑتی ہوئی آتی تھی؟"

"ہاں' مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں اتنے لمبے عرصے غائب نہیں رہا ہوں کہ یہ سب باتیں بھول جاتا۔ اور نہ ہی میری یادداشت اتنی کمزور ہے۔ ریڈ ڈاٹ کی تو ہر بات ویسے بھی مجھے قبر میں جانے تک یاد رہے گی۔ اب تو اس کے سوا کوئی بات اتنی ضروری محسوس ہی نہیں ہوتی کہ اسے یاد رکھا جائے۔" میں تیزی سے یہ سب کچھ کہتا چلا گیا۔

"سر! وہ غوطہ خوروں جیسے لباس میں ہوتے تھے اور ان کی پشت پر ایک مختصر سا باکس ہوتا تھا۔ غالباً اسی میں وہ مشینری ہوتی تھی جس سے وہ اُڑتے تھے۔" سلیمان اب بھی مجھے گویا بھولی بسری باتیں یاد دلائے جا رہا تھا "اس کے علاوہ ان کے سینے پر بھی ایک باکس بندھا ہوتا تھا جن سے چھوٹی چھوٹی چمکیلی طشتریاں سی تیزی سے گھومتی اور اُڑتی ہوئی نکلتی تھیں جو ہر چیز میں سے گزر جاتی تھیں۔"

"اچھا....." میں نے گہری سانس لے کر سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگا لیا "تو تمہارا بازو ان میں سے کسی طشتری کے راستے میں آگیا تھا۔"

"جی سر!" اس کے لہجے میں اب بھی شگفتگی تھی "بازو بالکل اس طرح کٹ گیا تھا جیسے بلیڈ سے صابن کا کوئی پتلا سا تار۔"

پھر اس کی اُلجھی اُلجھی مونچھوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ مسکرایا تھا "ہر بات کا کوئی نہ کوئی روشن پہلو ہوتا ہے سر.....! جو بعض اوقات ہمیں نظر نہیں آتا۔ اب یہی دیکھ لیجیے کہ میرے معاملے میں بات صرف ایک بازو پر ٹل گئی۔ اس سے میرے لیے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ وہ طشتری میرے سینے سے بھی گزر سکتی تھی۔ میرے دل کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی بھی نکل سکتی تھی۔ میں کم از کم زندہ تو ہوں اور ایک بار پھر آپ سے مل رہا ہوں۔ میرے لیے یہی بڑی خوشی کی بات ہے۔"

"بس سلیمان! اب میرا اتنا بھی دل رکھنے کی کوشش مت کرو۔" میں نے دھیرے سے اس کا کندھا تھپک کر کہا۔

اسی لمحے اس نے نہایت آہستگی سے مڑ کر دیکھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا' وہ اطمینان کر رہا تھا کہ کوئی ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہا؟ میں نے گردن گھما کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔

اس نے مطمئن ہو کر اپنے کشکول میں سے بسکٹوں کا ایک مُڑا تڑا سا ڈبا اور ایسی ہی ایک آدھ دوسری چیز ایک طرف کو کھسکائی۔ ان کے نیچے ایک موبائل فون موجود تھا۔ اس نے کشکول گود میں رکھا ہوا تھا۔ موبائل فون اس میں سے نکالے بغیر اس نے نمبر پنچ کیا پھر فون اٹھا کر کان سے لگایا۔

"سر!" وہ دوسری طرف سے کوئی آواز سن کر مؤدبانہ لہجے میں

بولا "میں "اے ون" بول رہا ہوں۔ چودھری صاحب پہنچ گئے ہیں۔"

فون پر دوسری طرف سے خفیف سی آواز مجھے بھی سنائی دے رہی تھی لیکن میں نے الفاظ سمجھنے کے لیے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ مجھ پر اس وقت خفیف سی بے زاری کا دورہ پڑا تھا اور ذہن پر اس وقت کی کچھ یادوں کی یلغار بھی تھی جب میں لاہور سے فرار ہوا تھا۔ سلیمان کو فون پر غالباً کچھ ہدایات دی جا رہی تھیں۔

چند سیکنڈ بعد ہی اس نے "یس سر" کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا اور احمد کی طرف متوجہ ہوا جو ٹیکسی ڈرائیور کے فرائض انجام دے رہا تھا یا پھر شاید آج کل اس نے مستقلاً یہی روپ دھارا ہوا تھا۔

"تو اب تمہارے کوئی اور "سر" بھی ہو گئے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "یہ کون صاحب ہیں؟"

"سر! یہ ہمارے عارضی سر ہیں۔" سلیمان نے جواب دیا۔

"لیکن ہیں کون؟" میں نے اپنا سوال دُہرایا۔

"یہ آپ کو جلد ہی ان سے ملنے کے بعد معلوم ہو جائے گا۔" سلیمان شریر سے لہجے میں بولا۔ وہ گویا سسپنس پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے..... تمہیں اگر ماسٹر آف سسپنس بننے کے لیے یہی موقع مناسب لگ رہا ہے تو بن لو۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

وہ احمد سے مخاطب ہوا "ہیڈ کوارٹر پہنچنے کی جلدی نہیں ہے۔ سر نے کچھ ٹھہر کر آنے کی ہدایت کی ہے۔ تم گاڑی اور بھی آہستہ چلاؤ۔ بلکہ چاہو تو گاڑی واپس گھما کر ایک دو میل کا فالتو چکر کاٹ لو۔"

ادھر اُدھر گھومنے کے لیے چونکہ کوئی اور راستہ نہیں تھا اس لیے احمد نے اس کی ہدایت پر عمل کرنے کی غرض سے گاڑی واپس موڑلی۔ اس سے پہلے میں نوٹ کر چکا تھا کہ گاڑی چکلالہ ائرپورٹ کی طرف جا رہی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "میں نے استنبول سے سیٹھ رمضان سے کراچی بات کی تھی۔ اس سے پتا چلا تھا کہ تم کراچی میں ہو۔ تم کیا میری آمد کا پروگرام معلوم ہونے کے بعد ہی یہاں پہنچے ہو؟"

"جی ہاں۔ میں اس وقت اتفاق سے کراچی میں تھا جب مجھے سیٹھ رمضان نظر آ گیا اور میں اس سے مل بیٹھا۔ درحقیقت اب ہم لوگ چاہ ہی رہے تھے کہ آپ واپس آ جائیں۔ ہم آپ کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں اسی سلسلے میں کراچی گیا ہوا تھا۔ سیٹھ رمضان سے ملاقات بہت فائدہ مند ہی رہی۔ وہ بڑے کام کا آدمی ثابت ہوا۔ اس نے پرسوں کراچی میں مجھے آپ کے سارے پروگرام سے مطلع کر دیا تھا۔ میں کل ہی اسلام آباد پہنچا ہوں۔ آپ کے پروگرام کا پتا چلتے ہی پہلی فلائٹ پکڑلی تھی۔"

"اسی حُلیے میں؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں سر!" وہ دھیرے سے ہنسا "یہ حُلیہ جہاز میں بیٹھنے کے لیے نہیں ہے۔ مجھے پورے جہاز کے مسافروں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرنا تھا۔ اس وقت ہمیں دوسروں کی توجہ سے بچنے کی ضرورت ہے اس لیے ہم گلی کوچوں میں رینگتے ہوئے کیڑے بنے ہوئے ہیں جن کی طرف دیکھتے ہوئے بھی لوگ نہیں دیکھتے۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ آپ کی فلائٹ اسلام آباد کی تھی۔ درحقیقت ہم سب ساتھی یہیں جمع ہیں۔"

"کیوں؟ یہاں جمع ہونے کی کیا ضرورت آن پڑی؟" میں نے دریافت کیا۔

وہ موبائل فون کو دوبارہ کشکول میں چھپاتے ہوئے بولا "آپ کافی عرصے بعد واپس آئے ہیں سر! اس دوران یہاں بہت کچھ ہو چکا ہے۔ بہت سے انقلابات آئے ہیں۔ بہت سے تغیرات رونما ہوئے ہیں۔ آپ آہستہ آہستہ ہی ان کے بارے میں جان سکیں گے اور آپ کے لیے بہتر بھی یہی ہے کہ مرحلہ وار ان باتوں سے واقف ہوں۔"

"اوہ.....!" میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ کھڑکی کے شیشے پر سردی کی وجہ سے معمولی سی دُھندلاہٹ پھیلی ہوئی تھی لیکن باہر اب صبح کا اُجالا نظر آنے لگا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف صبح کی دھوپ دھیرے دھیرے اپنا کُندنی دامن پھیلانے لگی تھی۔ ماحول کی یخ بستگی کچھ دور ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن میرے اندر جیسے ایک بے عنوان سی یخ بستگی دھیرے دھیرے قدم جما رہی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد سلیمان بولا "سر! ایک بُری خبر البتہ میں آپ کو ابھی سُنا دوں تو بہتر ہو گا....." اس نے یہ کہہ تو دیا لیکن اس سے آگے بولنے کا گویا اس کا حوصلہ نہیں پڑا۔

"کہو... کہو....." میں نے مسکرانے کی کوشش کی "مجھے معلوم ہے یہاں کچھ اچھی خبریں میری منتظر نہیں ہیں لیکن میں نے ہر خبر سُننے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کر لیا ہے۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو۔ مرحلوں وغیرہ کی پروا مت کرو۔"

"سر! صفدر مر چکا ہے۔ ہمیں افسوس ہے ہم اسے نہیں بچا سکے۔" سلیمان نے نہایت دھیمے لہجے میں کہا۔

میرے اندر پھیلتی ہوئی یخ بستگی کچھ بڑھ گئی۔ ایک لمحے کے لیے میں شاید پھر قوتِ گویائی سے محروم ہو گیا تھا۔ خاموشی شاید گاڑی کے اندر ہی نہیں پھیلی تھی بلکہ میرے وجود میں بھی اُتر گئی تھی۔

ریڈ ڈاٹ سے میری آخری معرکہ آرائی لاہور میں وزیر خارجہ حفیظ صاحب کے آبائی مکان سے شروع ہوئی تھی جس کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا کہ جان بچانے کے لیے میرا کسی طرف کو نکل جانا اور روپوش ہو جانا ضروری ہو گیا تھا۔ ریڈ ڈاٹ والوں کو کچھ دیر مغالطے میں رکھنے اور مس گائیڈ کرنے کے لیے میں نے صفدر کو اپنی

جگہ لینے کے لیے تیار کیا تھا۔ اس کے قد کاٹھ اور شکل صورت میں میری شباہت تھی۔ انوار نامی ایک بہت اچھے میک اپ مین نے اس پر مزید محنت کر کے اسے بالکل میرا ہم شکل بنا دیا تھا۔ میں اسے اپنی جگہ چھوڑ کر میک اپ مین کے گھر سے ہی ایک گوالے کے بہروپ میں نکل گیا تھا لیکن ریڈ ڈاٹ کے لوگوں نے بہت دور تک میرا تعاقب کیا تھا جس سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ میرا یہ بلف کامیاب نہیں رہا تھا۔ میرے خیال میں اس صورت میں تو صفدر کو کوئی گزند نہیں پہنچنی چاہیے تھی۔

سلیمان گویا میرے خیالات کو پڑھتے ہوئے بولا "ریڈ ڈاٹ والوں نے صرف چند لمحوں کے لیے دھوکا کھایا تھا کہ وہ آپ ہیں.... اور وہ چند لمحے صفدر کے لیے موت کا پیغام بن گئے۔ اس پر کسی ایسی گن سے فائر کیا گیا تھا کہ اس کا پورا وجود گویا جل کر کوئلہ ہو گیا تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے اس کی لاش کو بچایا لیکن جب تدفین کے لیے اسے غسل دیا جانے لگا تو لاش بالکل ریت کے بُت کی طرح بکھر گئی۔ بس یوں سمجھیے کہ ہم نے صفدر کی لاش کو نہیں بلکہ سیاہ ریت کی ایک ڈھیری کو دفن کیا۔"

وہ الفاظ نہیں، زہر کی بوندیں تھیں جو میرے لہو میں شامل ہو رہی تھیں اور نس نس میں آگ سی لگا رہی تھی۔ سلیمان گویا اس زہر کی اذیت کو کچھ کم کرنے کی غرض سے بولا "یہ مت سمجھیے گا کہ ہمارے پاس آپ کو سُنانے کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ اچھی خبریں بھی بہت سی ہیں ہماری قربانیاں ضائع نہیں گئیں۔"

احمد نے اس دوران ٹیکسی کو ایک بار پھر واپس موڑ لیا تھا۔ ہم دوبارہ چکلالہ ائرپورٹ کی طرف جانے والی سڑک پر رواں تھے۔ جلد ہی ہم ایک ایسی جگہ جا پہنچے جہاں سڑک سے کافی دور کچے میں خانہ بدوشوں کی ایک بستی نظر آ رہی تھی۔ اس سے کچھ اور پیچھے خاصے فاصلے پر غالباً کسی قسم کا تعمیراتی کام جاری تھا۔ بہت سے خیمے لگے نظر آ رہے تھے۔ کچھ عارضی سے کمرے بھی تعمیر کیے گئے تھے۔ بھاری مشینری بھی اِدھر اُدھر کھڑی نظر آ رہی تھی۔ بلڈوزر، ڈمپر، مکسر اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ کہیں کہیں غالباً کھدائی ہو چکی تھی۔ مٹی کے بہت بڑے بڑے انبار نظر آ رہے تھے۔ پانی کے ٹینکر بھی کھڑے تھے۔ لگتا یہی تھا کہ کسی بہت بڑے پراجیکٹ پر کام ہو رہا تھا۔ وہاں تک جانے کے لیے عارضی سی ایک نیم پختہ سڑک بھی بنائی گئی تھی جو خانہ بدوشوں کی بستی کے قریب سے ہو کر گزر رہی تھی۔

احمد نے گاڑی اسی سڑک پر موڑلی تھی۔ چند لمحے بعد ہم خانہ بدوشوں کی بستی کے قریب جا پہنچے۔ وہ خانہ بدوشوں کی دیسی ہی ایک بستی تھی جیسی عموماً شہروں کے گرد و نواح میں کہیں نظر آتی ہیں۔ بوسیدہ اور پیوند زدہ کپڑوں کے خیمے، ٹاٹ اور چٹائیوں کے بے ہنگم چھپر، چھوٹی موٹی جھونپڑیاں، غرضیکہ رہائش کے لیے وہاں کئی طرح کی چیزیں موجود تھیں لیکن سب کی سب انسان کی غربت و افلاس کی قابلِ رحم تصویریں تھیں۔ انہیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ کروڑوں روپے مالیت کے پُرتعیش محلوں میں نامطمئن رہنے والا اور ہر وقت دولت کی چھین جھپٹ میں مصروف رہنے والا انسان کس کس حال میں زندہ رہ لیتا ہے۔ سروائیو کر جاتا ہے۔

احمد گاڑی کو جھونپڑیوں اور خیموں کے درمیان ہی تنگ اور ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گزارتا آخر کار ایک جگہ جا رکا تھا جہاں سامنے ہی لکڑی کے ایک بوسیدہ تخت پر چار پانچ مفلوک الحال افراد بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ کسی کے تن پر میلی انگی اور پیوند زدہ شلوار تھی تو قمیص نہیں تھی، کوئی مختصر دھوتی اور واسکٹ میں تھا، کسی کے تن پر غالباً کسی کی اترن میں ملی ہوئی گھسی پٹی سی پتلون تھی جس میں بیلٹ کی جگہ ازار بند نظر آ رہا تھا۔ کوئی کھیلتے وقت اپنے منہ سے کھیاں اُڑا رہا تھا اور کوئی لمبے لمبے اُلجھے ہوئے بالوں سے بھرا سر کھجا رہا تھا۔

وہ ایک طرح کی بند گلی تھی۔ اس میں ایک طرف گڑھے میں گندا پانی کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی کچھ پھلوں کے چھلکے پڑے تھے جن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ایک عورت چولی اور لنگا پہنے پانی کا ایک کنستر اٹھائے ایک خیمے میں جا رہی تھی۔

میں ابھی دُکھ کی دھند سے نہیں نکلا تھا۔ میں خدا کی اس بستی کا غور سے جائزہ تو لے رہا تھا لیکن ابھی تک میرے ذہن میں یہ سوال نہیں اُبھرا تھا کہ احمد اور سلیمان مجھے یہاں کیوں لائے تھے۔ شاید میں لاشعوری طور پر اس احساس سے مطمئن تھا کہ وہ یہاں آئے تھے تو کوئی مقصد تو ضرور رہا ہو گا۔

تاش کھیلتے ہوئے مرد گردنیں گھما کر ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان سب ہی کی آنکھیں چندھی چندھی سی لگ رہی تھیں۔ میرے ذہن پر جمی افسردگی کی دُھند سے کچھ بھولے بسرے سے مناظر جھانک رہے تھے۔ یہ ماحول، یہ خیمے، یہ بستی، یہ گرد و پیش مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں یہاں پہلے بھی آ چکا تھا۔ ان لوگوں کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس ماحول سے پہلے بھی گزر چکا تھا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ درحقیقت میں اس سے ملتے جلتے ماحول میں اپنی نوجوانی کے کچھ دن گزار چکا تھا۔ اسی طرح خانہ بدوشوں کی ایک بستی ہوا کرتی تھی جس سے کچھ دور چھوٹی سی ایک کنسٹرکشن کمپنی نے ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ وہ کمپنی ایک پُل تعمیر کر رہی تھی۔ میں اس کمپنی میں اکاؤنٹنٹ اور کیشئر ہوا کرتا تھا۔ خانہ بدوشوں کی بستی میں لالی رہتی تھی جو کمپنی کے مزدوروں کے ساتھ پتھر توڑتی تھی اور بعد میں ملک کی صفِ اوّل کی اداکارہ ستارہ بنی تھی اور..... اس کے ساتھ ہی یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جس میں دل کو گدگدانے والے لمحے بھی مقید تھے اور خون کے آنسو رلانے والے بھی..... میں نے احساس کے تھکے تھکے ہاتھوں سے لاشعور کا یہ دریچہ بند کر دیا۔ یہ ایسی یادوں میں اُلجھنے کا وقت نہیں تھا اور نہ

ہی دل اس کے لیے آمادہ تھا۔

لکڑی کے تخت پر موجود افراد میں سے ایک نے اپنے پتے رکھ دیے اور تخت سے اُتر آیا۔ وہ مختصر دھوتی اور پھٹی ہوئی واسکٹ میں تھا۔ اس کا رنگ گندمی تھا مگر اپنے دوسرے ساتھیوں میں وہ گورا لگ رہا تھا کیونکہ وہ سب سانولے تھے۔ وہ لمبا اور دبلا تھا مگر اس کا جسم ورزشی تھا۔ اس کی پھٹی ہوئی واسکٹ کے بٹن کھلے تھے۔ دُبلے پتلے جسم میں بھی پٹھے پھڑکتے دکھائی دے رہے تھے۔

سلیمان ٹیکسی سے اتر کر میرے لیے دروازہ کھول کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے اتر کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ بستی حیرت انگیز طور پر پُرسکون معلوم ہورہی تھی۔ چاروں طرف ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گندمی رنگت والے دُبلے پتلے ادھیڑ عمر شخص نے آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ اس کا ہاتھ مضبوط تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر خفیف مگر پُراسرار سی مسکراہٹ تھی۔ اس کی گہری سیاہ آنکھیں اس مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں اور ہر تاثر سے عاری دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے سر پر مختصر سی پگڑی تھی اور کان پر بیڑی اٹکی ہوئی تھی۔ جس انداز سے وہ اٹھ کر آگے بڑھ کر مجھ سے مل رہا تھا اس سے میں یہی سمجھا کہ وہ اس بستی کا سردار یا اسی قسم کی کوئی اور معزز شخصیت ہوگی۔

احمد بھی ٹیکسی سے اتر کر میرے برابر آن کھڑا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا "سر! آپ ان لوگوں سے ملیں۔ بات چیت کریں' گاڑی کی ضرورت ہو تو ان میں سے کسی سے بھی کہہ دیجئے گا۔ گاڑی حاضر کردی جائے گی۔ میں چلتا ہوں۔ میری اسلام آباد ہوٹل پر ڈیوٹی لگی ہوئی ہے۔"

"ڈیوٹی؟ کیسی ڈیوٹی؟" میں نے گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا تو وہ بڑا پُرانا ٹیکسی ڈرائیور معلوم ہورہا تھا۔

"سر! میں چند غیرملکیوں کی نگرانی کررہا ہوں جو وہاں مقیم ہیں۔" احمد نے جواب دیا۔

"تمہیں اس ڈیوٹی پر کس نے لگایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سر! آپ یہاں بیٹھیں گے' باتیں کریں گے تو آپ کو سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔ میں اب چلتا ہوں۔" اس نے مجھے سیلوٹ کیا اور گاڑی بہ مشکل ریورس کرکے واپس روانہ ہوگیا۔

میرا ہاتھ ابھی تک اس سردار ٹائپ شخصیت کے ہاتھ میں تھا۔ کسی نے اس سے میرا تعارف نہیں کرایا تھا لیکن اس نے مجھے صحیح نام سے مخاطب کیا اور اس وقت مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا جب اس نے روانی سے انگریزی میں کہا "واپسی مبارک ہو مسٹر چودھری! آپ بڑے اچھے وقت پر آئے ہیں۔ ہم آپ کی آمد کے منتظر تھے۔"

"اچھا وقت....؟" میں نے اپنے گردوپیش پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا "کیا یہ سب اچھے وقت کی نشانیاں ہیں مسٹر....؟"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "ہاں مسٹر چودھری! اچھا وقت' اچھے ماحول اور اچھی چیزوں کا نام نہیں۔ اچھا وقت وہ ہوتا ہے جب حالات آپ کے حق میں اچھے ہوتے ہیں اور کسی کے آنے کا سب سے اچھا وقت وہ ہوتا ہے جب اس کی ضرورت محسوس کی جارہی ہوتی ہے۔"

وہ میرا ہاتھ تھامے مجھے ایک قریبی خیمے کی طرف لے چلا جو دوسرے خیموں کی نسبت بہتر حالت میں تھا اور بڑا بھی معلوم ہورہا تھا۔ خیمے میں داخل ہونے سے پہلے وہ رک کر مسکراتے ہوئے بولا "یہ بھی اچھا ہوا کہ آپ نے مجھے نہیں پہچانا مسٹر چودھری! یہ بھی میری کامیابی کی ایک چھوٹی سی دلیل ہے۔"

"عین اس وقت جبکہ آپ اس بات پر خوش ہورہے ہیں' میں نے آپ کو پہچان لیا نفیس صاحب!" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

انہوں نے ایک اور ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ اس وقت بہت خوش معلوم ہوتے تھے ورنہ وہ تو دھیما سا بھی قہقہہ لگانے والے آدمی نہیں تھے۔ نفیس صاحب ملک کی سب سے بڑی خفیہ ایجنسی کے سربراہ تھے۔ میں جب ریڈ ڈاٹ کی کہانی لے کر مجبوراً ان کے پاس گیا تھا تو ان کا ردِعمل کچھ ایسا ہی تھا جیسے میں نے انہیں کوئی فرضی اور تحیرالعقل کہانی سُنا کر ان کا قیمتی وقت ضائع کیا ہے۔ ایسی کہانی جو قطعی طور پر میرے تخیل کی پیداوار تھی۔

مجھے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جتا کی اتنی فکر نہیں تھی لیکن مجھے جب تھوڑا بہت پتا چلا تھا کہ ریڈ ڈاٹ کی وجہ سے ہمارے ملک کو کیا کیا خطرات لاحق تھے تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے حالانکہ وہ معلومات مکمل نہیں' محض جُزوی تھیں۔ وہ پوری فلم نہیں' صرف ٹریلر تھا لیکن اسے دیکھ کر ہی کم از کم ان لوگوں کی تو راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہوسکتا تھا جنہیں ملک سے ذرا سی بھی دلچسپی اور محبت تھی۔

نفیس صاحب نے میری خوب دل شکنی کی تھی اور مجھے مایوس کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری تھی اور انہیں قائل کرنے کی کوششیں جاری رکھی تھیں۔ میں ان کے پاس کافی بڑی سفارش کے ساتھ گیا تھا۔ ان پر کچھ دباؤ بھی تھا۔ آخرکار انہوں نے ملک کی دوسری دو خفیہ ایجنسیوں کے سربراہوں سمیت میرے ساتھ ایک میٹنگ رکھی تھی لیکن نتیجہ اس کا بھی ڈھاک کے تین پات والا ہی رہا تھا۔

تاہم رسمی طور پر انہوں نے دوسری دونوں ایجنسیوں کا بھی تعاون حاصل کرلیا تھا اور اس مقصد کے لیے جو ایک کمیٹی سی بنائی گئی تھی اس کے وہ خود انچارج تھے۔ یعنی رسمی طور پر ریڈ ڈاٹ کے سلسلے میں اگر کچھ کیا جاتا تو اس قسم کی تمام تر کارروائی انہی کی نگرانی میں' انہی کی منصوبہ بندی اور احکامات کے تحت ہوتی لیکن افسوس کی بات صرف یہ تھی کہ اس قسم کی کوئی کارروائی شروع ہونے کی نوبت ہی نہیں آسکی تھی۔ عین اس جگہ جہاں وہ "خفیہ" میٹنگ

منعقد ہورہی تھی' ایک گاڑی دھماکے سے اُڑ گئی تھی اور ان کا ایک آدمی مارا گیا' اس کے باوجود انہیں میری باتوں پر یقین نہیں آیا تھا اور وہ اپنے وسائل کو حرکت میں لاتے دکھائی نہیں دیے تھے۔ کم از کم اس وقت تک تو دکھائی نہیں دیے تھے جب تک میں اسلام آباد اور لاہور میں رہا تھا۔ اگر وہ میرا ساتھ دیتے تو شاید مجھے جان بچانے کے لیے دور دراز علاقوں کی طرف نہ بھاگنا پڑتا۔

مجھے ان کو پہچاننے میں ذرا سی تاخیر اس لیے ہوئی تھی کہ ان میں واقعی سر سے پاؤں تک ان کی اصل شخصیت کی کوئی معمولی سی جھلک بھی موجود نہیں تھی۔ وہ سرخ و سپید آدمی تھے لیکن اس وقت گندمی نظر آرہے تھے۔ ان کی آنکھیں نیلی تھیں لیکن اس وقت سیاہ نظر آرہی تھیں۔ پہلے وہ کلین شیو ہوا کرتے تھے لیکن اس وقت ان کی ڈاڑھی مونچھیں خوب بڑھی ہوئی تھیں۔ چال ڈھال' حرکات و سکنات سبھی کچھ بدلا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہ صرف نام کی حد تک ہی نہیں بلکہ واقعی ہر لحاظ سے ایک نفیس آدمی معلوم ہوتے تھے لیکن اس وقت کچھ ایسی کھردری اور کرخت شخصیت کے مالک نظر آرہے تھے جیسے پیدا ہی اس طبقے اور اس ماحول میں ہوئے ہوں۔

سچی بات تو یہ تھی کہ میں ایسے کسی مقام پر ان کی موجودگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کیونکہ وہ ایک ایسے اہم شخص تھے جو پس پردہ رہتے ہوئے حکومتوں کو بنانے اور گرانے میں اہم کردار ادا کرسکتے تھے۔ وہ بے شک ایک خفیہ ایجنسی کے سربراہ تھے لیکن ان کی حیثیت ایک بہت بڑے اور نہایت طاقتور بیوروکریٹ ہی کی تھی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اتنا بڑا بیوروکریٹ جو گھر اور دفتر دونوں جگہ بے پناہ آرام و آسائش کی زندگی گزارنے کا عادی تھا خانہ بدوشوں کی بستی میں ایک خانہ بدوش ہی کے روپ میں موجود ہوسکتا تھا۔ میں یہاں ان کی موجودگی کا تصور نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے بھی مجھے ان کو پہچاننے میں ذرا دیر لگی تھی۔ پھر بھی ان کے انداز سے یہی ظاہر تھا کہ میں نے انہیں ان کی توقع سے پہلے پہچان لیا تھا۔ شاید ان کا خیال تھا کہ میں ان کے انگریزی بولنے کے باوجود انہیں نہیں پہچان سکوں گا۔

"نفیس صاحب! آپ کا میک اپ بہت عمدہ ہے۔" میں نے خیمے میں داخل ہوتے ہوئے انہیں داد دی۔

"میک اپ سے زیادہ اہم وہ رویّہ ہوتا ہے جو آپ کسی شخصیت میں ڈھل جانے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔" نفیس صاحب بولے "اگر آپ بوریاں ڈھونے والے مزدور بنے ہوں لیکن آپ کا رویّہ بوریاں ڈھونے والے مزدور جیسا نہ ہو تو میک اپ کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"درست ہے" میں نے تسلیم کیا "اس صورت میں آپ کو میرے ساتھ انگریزی میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"میرا تمہیں سسپنس میں مبتلا رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ میں تمہارے لیے خانہ بدوش نہیں بنا ہوں۔" نفیس صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ان کا اس طرح مسکراہٹ اور خوش خلقی کے ساتھ مجھ سے بات کرنا بھی میرے لیے قدرے حیران کُن تھا کیونکہ ان سے میری آخری ملاقات تک ان کے رویّے میں سرد مہری' رکھائی اور بے اعتباری برقرار تھی لیکن اب کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے ظاہری حُلیے میں ہی نہیں' ان کے رویّے میں بھی انقلاب آچکا تھا۔

خیمے کے اندر کوئی نہیں تھا لیکن وہ لوگ جو باہر تخت پر بیٹھے نفیس صاحب کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے' اُٹھ کر ہمارے پیچھے پیچھے اندر آچکے تھے۔ خیمے میں سازوسامان ایک "اوسط درجے" کے خانہ بدوش سے بہتر تھا۔ قدرے صاف بستر' تقریباً صحیح سالم چارپائیاں' کھانا پکانے کے لیے مٹی کے تیل کا اسٹوو' برتن اور بیٹھنے کے لیے موڑھے وغیرہ موجود تھے۔ سامان اتنا اچھا بھی نہیں تھا کہ کوئی اسے ایک خانہ بدوش کے خیمے میں دیکھ کر شک میں پڑجاتا اور اتنا بُرا بھی نہیں تھا کہ اسے استعمال کرنا ایک مصیبت ہوتی۔

نفیس صاحب نے مجھے ایک موڑھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود میرے مقابل بیٹھ گئے۔ ہمارے پیچھے پیچھے آنے والے تینوں افراد بھی خاموشی سے اِدھر اُدھر بیٹھ گئے۔ وہ سب ایک ٹک میری طرف دیکھ رہے تھے۔ گویا میں ان کی نظر میں کسی اور سیارے سے آنے والی مخلوق تھا۔

نفیس صاحب ان میں سے دو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "اگر تم ذرا ذہن پر زور دو تو شاید ان دو حضرات کو بھی پہچان لو۔"

میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا اور کہا "میں نے ذہن پر زور دیے بغیر ہی پہچان لیا ہے۔ یہ باقری صاحب اور شہریار صاحب ہیں۔"

یہ دونوں حضرات ملک کی باقی دو خفیہ ایجنسیوں کے سربراہ تھے لیکن ان کے حُلیے بھی بلاشبہ اتنی عمدگی سے بدلے ہوئے تھے کہ ان کے قریبی جاننے والے بھی انہیں مشکل سے ہی پہچان سکتے تھے۔ مجھے یاد تھا ان میں سے شہریار صاحب نہایت عمدہ قسم کے سگاروں کے رسیا تھے لیکن اب اس وقت وہ ایک بیڑی کا سرا مٹھی میں دبائے کش لے رہے تھے اور چٹکی بجا کر راکھ جھاڑ رہے تھے۔ ان کے جسم پر پھٹا ہوا کوٹ اور بوسیدہ شلوار تھی اور انہوں نے سر پر ایک میلا چکٹ مفلر باندھ رکھا تھا۔

میری بات سن کر ان دونوں حضرات نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ یوں اثبات میں سر ہلایا جیسے وہ ٹی وی کیمرے کے سامنے موجود کوئی مہمان تھے اور میں نے کمپیئر کے فرائض انجام دیتے ہوئے ان کا تعارف کرایا تھا۔

میں نے ایک چارپائی سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "مجھے خانہ بدوشوں کی اس بستی پر رشک آرہا ہے جس میں اتنے بڑے بڑے

لوگ ان جھلیوں میں موجود ہیں۔ میں تو اس قسم کی صورتِ حال کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔"

نفیس صاحب نے بھی اپنے کان پر سے بیڑی اُتار کر سُلگائی اور گہرا کش لے کر بولے "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ عام خانہ بدوشوں کی بستی نہیں ہے۔ یہ بستی ہم نے ہی بسائی ہے۔ ہم نے ہی اس میں حقیقت کا رنگ بھرا ہے لیکن درحقیقت اس میں کوئی حقیقی خانہ بدوش موجود نہیں۔ یہاں موجود سب لوگ ہماری ایجنسیوں کے آدمی ہیں۔"

"بہت خوب" میں نے سرہلایا "آپ نے اپنی دانست میں بڑی کامیابی سے اس بستی میں حقیقت کا رنگ بھرا ہے۔ بے شک اسے دیکھنے والا کوئی بھی شخص اس پر کسی قسم کا شبہ نہیں کر سکتا۔ لیکن میں اب غور کر رہا ہوں تو مجھے ایک کمی محسوس ہو رہی ہے۔"

نفیس صاحب نے بیڑی کا کش لیتے ہوئے سوالیہ انداز میں بھویں اچکائیں۔ میں نے اپنا تاریک چشمہ اتار کر اس کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا "مجھے اس بستی میں خیموں اور جھونپڑیوں کے سامنے ننگ دھڑنگ مفلوک الحال بچے کھیلتے نظر نہیں آئے جو شور مچاتے ہوئے ہماری ٹیکسی کے پیچھے بھاگتے اور اس کے بمپر وغیرہ پر لٹکنے کی کوشش کرتے۔"

نفیس صاحب نے ایک لمحے کے لیے ذرا زور سے آنکھیں بند کرلیں۔ شاید وہ اپنے سیاہ کونٹیکٹ لینز کی موجودگی کو محسوس کر رہے تھے۔ پھر وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولے "تمہارا مشاہدہ تیز ہے۔ بستی میں گھُستے ہی تم نے ایک خامی نوٹ کرلی جسے کوئی اور شاید ہی محسوس کر سکے۔ بہرحال ایسی بات نہیں ہے کہ اس بستی میں بچے موجود ہی نہیں ہیں۔ ہم نے چند بچوں کا بھی انتظام کر رکھا ہے۔ البتہ اس طرح بے حساب بچے نہیں ہیں جس طرح کسی خانہ بدوش بستی میں ہونے چاہئیں کیونکہ خانہ بدوش ... پلاننگ کے قائل نہیں ہوتے۔"

شہریار صاحب کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولے "ویسے اس بستی میں عورتیں بھی کم ہی ہیں۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس ویرانے میں یہ بستی بسانے کی آپ کو کیا ضرورت پیش آگئی؟" میں نے دل میں مچلتے ہوئے سوال کو آخر کار زبان پر لاتے ہوئے کہا۔

"یہ ضرورت ہمیں ریڈ ڈاٹ کی وجہ سے پیش آئی ہے۔" نفیس صاحب نے بلا تامل جواب دیا۔

"ریڈ ڈاٹ؟" میں نے مصنوعی حیرت سے کہا "آپ کے فرمان کے مطابق تو اس قسم کی کسی تنظیم کا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ محض میرے تخیل کی پیداوار تھی۔ سائنس فکشن تھا۔ آپ اس کے لیے اتنے تردد میں کیوں کر پڑ گئے؟"

میں نے ریڈ ڈاٹ کی وجہ سے جو تکلیفیں اٹھائی تھیں وہ تو اپنی جگہ تھیں لیکن نفیس صاحب کے رویے نے مجھے جو اذیت پہنچائی تھی اور ان کی بے اعتنائی کی وجہ سے میرے لیے جتنی دشواریاں پیدا ہوئی تھیں ان کی کچھ نہ کچھ تلخی شاید میرے لہجے میں جھلک آئی تھی لیکن اب تو نفیس صاحب گویا میری تلخی سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

پھر وہ نہایت تحمل اور سنجیدگی سے بولے "ڈیئر افضل چودھری! اس وقت کے اور اب کے حالات میں بہت فرق ہے۔ تمہاری غیر موجودگی میں بہت انقلابات آچکے ہیں۔ اس وقت..... جب تم ریڈ ڈاٹ کی کہانی لے کر ہمارے پاس آئے تھے اس وقت میرا اس سلسلے میں بے اعتباری کا مظاہرہ کرنا اور بظاہر تمہاری بات پر یقین نہ کرنا بھی ہماری حکمتِ عملی کا ایک حصہ تھا۔"

"کیا؟" میں نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" نفیس صاحب بدستور سنجیدہ تھے۔ اس دوران نفیس صاحب کے تیسرے ساتھی نے، جو میرے لیے اجنبی تھا، اسٹوو پر چائے تیار کرلی تھی اور نہایت سستے لیکن صاف ستھرے مگوں میں لاکر ہمارے سامنے رکھ دی تھی۔ نہ جانے کیوں اس خیمے کے ماحول میں ان مگوں سے اٹھتی ہوئی چائے کی مہک مجھے بہت بھلی محسوس ہوئی حالانکہ میں چائے وغیرہ کا کچھ ایسا شوقین نہیں تھا۔

نفیس صاحب اپنا مگ اُٹھا کر پُرخیال انداز میں اس میں جھانکتے ہوئے بولے "تم جب ریڈ ڈاٹ کی کہانی لے کر ہمارے پاس آئے تو درحقیقت وہ ہمارے لیے نئی نہیں تھی۔"

یہ میرے لیے ایک اور حیرت انگیز انکشاف تھا۔ وہ مجھے یکے بعد دیگرے حیرت کا نئے سے نیا جھٹکا دینے پر تُلے ہوئے تھے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولے "ہمیں سراغ مل چکا تھا کہ بہت سے غیر ملکی، جن میں اکثریت سفید فاموں کی تھی، نہ جانے کس کس حیثیت کی آڑ میں ہمارے ملک میں کچھ عجیب و غریب اور پُراسرار قسم کی سرگرمیوں میں مصروف تھے جنہوں نے اسپائی سرگرمیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا لیکن ہمارے پاس کوئی ٹھوس تفصیلات نہیں تھیں۔ پہلی بار ہمارے پاس کچھ تفصیلات تم لے کر آئے تھے۔"

"جنہیں آپ نے جھٹلا دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"ہم نے تمہاری ہی بھلائی کی خاطر ایسا کیا تھا۔" نفیس صاحب تحمل سے بولے۔

"میری بھلائی کی خاطر؟" میں نے ایک بار پھر بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں، تمہارے ساتھ میٹنگ سے پہلے ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ان لوگوں کی باقاعدہ کوئی تنظیم ہے جس کا نام ریڈ ڈاٹ ہے اور جس نے دنیا کی تمام مافیاؤں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ان کے مقاصد اتنے اونچے ہیں اور وہ سائنسی طور پر اتنے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ یہ باتیں ہمیں پہلی بار تم سے ہی معلوم ہوئی تھیں کیونکہ تم اتفاق سے اور ان کی نظرِ عنایت سے ان کے انتہائی خفیہ ٹھکانوں کی سیر کر

آئے تھے لیکن افسوس کہ تم ان تک ہماری رہنمائی نہیں کر سکتے تھے۔"

"اگر میں دوبارہ ان ٹھکانوں تک پہنچنے کے قابل ہوتا تو میں خود ہی اپنے ساتھیوں کی مدد سے ان سے نمٹنے کی اپنی سی کوئی تدبیر کرتا۔" میرے لہجے میں اب بھی غیر ارادی طور پر ہلکی سی تلخی تھی "میں آپ کے پاس اسی لیے تو دوڑا دوڑا آیا تھا اور آپ تک اسی لیے اتنی بڑی سفارش کے ساتھ اپروچ کیا تھا کہ آپ اتنی بڑی طاقت کے مالک ہیں، آپ کے پاس اتنے وسائل ہیں، آپ ان کا پتا چلائیں اور ان سے نمٹنے کی کوئی تدبیر کریں۔ یہ ملک و قوم کی سلامتی اور تحفظ کا مسئلہ تھا۔"

"درست ہے، ہم تمہارے اس جذبے کے ہمیشہ قدر دان رہیں گے۔ تم نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ان لوگوں کی ہدایات کی خلاف ورزی کی تھی اور ہم سے رابطہ کرلیا تھا حالانکہ انہوں نے تمہیں بہت سختی سے اس قسم کی کسی کوشش سے منع کیا تھا۔" نفیس صاحب بولے۔

"میں بڑی اُمیدیں لے کر آپ کے پاس آیا تھا۔" میرے لہجے میں اب بھی کرب تھا۔

"ہمیں خوب اچھی طرح اندازہ ہے۔" نفیس صاحب نے تشفی آمیز انداز میں سرہلایا۔ "ہمیں یہ بھی اندازہ ہے کہ ہمارے رویّے سے تمہارے دل پر کیا گزری ہوگی۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اتنی ہی حب الوطنی کو کافی سمجھ کر اس قسم کی کوششوں سے ہاتھ کھینچ لیتا اور اپنی جان کی فکر کرتا یا ہاتھ باندھ کر دوبارہ ریڈ ڈاٹ کے سامنے حاضر ہو جاتا اور انہوں نے جو پیشکشیں کی تھیں، جو لالچ دیے تھے، انہیں قبول کرلیتا۔ لوگ اس سے کہیں کم قیمتوں پر ملک دشمنوں کے ہاتھوں بک جاتے ہیں۔"

"اس کے باوجود آپ نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ میں ابھی تک آپ کی اس مصلحت کو نہیں سمجھ سکا۔" میں نے کہا۔

"میں اسی طرف آنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" انہوں نے چائے کی چسکی لی پھر گویا بیڑی کے کش سے خوب لطف اندوز ہوتے ہوئے بولے "یہ مسئلہ بہت اُلجھا ہوا تھا۔ ہم مسائل کو اس طرح نہیں دیکھ رہے تھے جس طرح تم دیکھ رہے تھے۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ ریڈ ڈاٹ والے خود تو بے حد منظم، طاقتور اور آنے والے زمانوں کی سائنسی ایجادات سے لیس تھے ہی.... لیکن ہمارے بھی نہ جانے کس کس محکمے میں کس کس شخص کو انہوں نے اس طرح خرید لیا تھا کہ اسے خود بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس کے لیے کام کر رہا ہے اور جو خدمات وہ انجام دے رہا ہے وہ اس ملک و قوم کے لیے کتنی خطرناک ثابت ہوں گی۔"

"درست ہے" میں نے تسلیم کیا "ایسے دو چار افراد مختلف اتفاقات کے تحت مجھ سے بھی ٹکرائے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا۔ کسی نہ کسی انداز میں وہ موت کا شکار ہوگیا۔"

"ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ نہایت خاموشی اور رازداری سے ہم نے کچھ لوگوں پر ہاتھ ڈالا لیکن وہ سب کے سب پُراسرار انداز میں مرگئے۔ بعض کے بارے میں تو یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل تھا کہ انہیں ہلاک کیا گیا تھا یا انہوں نے خودکشی کی تھی۔" نفیس صاحب یہ کہتے ہوئے ایک لمحے کے لیے متاسف نظر آنے لگے "ان میں ہمارے کئی بہت ہی محترم، بہت ہی قابلِ اعتبار اور ہماری دانست میں نہایت بے داغ ماضی رکھنے والے لوگ شامل تھے۔"

انہوں نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا پھر گہری سانس لے کر بولے "اس کے بعد ہمارے لیے یہ کہنا مشکل ہوگیا تھا کہ ہمارے دائیں یا بائیں ہاتھ پر جو شخص بیٹھا ہے وہ سو فیصد اور خالصتاً ہمارا اور اس ملک کا وفادار ہے۔ پکا ہوا نہیں ہے۔ اس صورتِ حال نے ہمیں مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ ہم کوئی بھی قدم اعتماد سے نہیں اُٹھا سکتے تھے۔ چھوٹے سے چھوٹا کام کرتے وقت بھی ہمیں یقین نہیں ہوتا تھا کہ ہم اسے پورا کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ اسی لیے ہم نے بظاہر تمہاری بات پر بالکل یقین نہیں کیا اور تم سے کوئی وعدہ تک نہیں کیا کہ ہم اس سلسلے میں کوئی رسمی کارروائی بھی کریں گے۔ ہمیں اندیشہ تھا کہ اگر یہ بات ذرا بھی لیک آؤٹ ہوگئی کہ تمہیں ہمارا تعاون حاصل ہو چکا ہے تو تمہیں فوراً ہلاک کردیا جائے گا۔ ریڈ ڈاٹ اپنی ساری توجہ اسی بات پر مرکوز کردے گی۔ ہم نے اپنی دانست میں تمہارے لیے خطرات کم کرنے کی کوشش کی تھی اور اندر ہی اندر اس مہم کے سلسلے میں کام شروع کردیا تھا۔ سب سے پہلا ضروری کام تو یہ تھا کہ ہم نے اپنے ان خاص خاص ساتھیوں کا انتخاب شروع کیا جنہوں نے اپنے عمل سے ثابت کردیا تھا کہ وہ اپنے محکمے اور اس ملک کے ساتھ اتنے مخلص ہیں کہ وقت پڑنے پر اس کے لیے جان بھی دے سکتے ہیں۔"

"آپ کی اس عظیم الشان احتیاطی تدبیر کا مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ مجھے تو پھر بھی ان کے قہرِ غضب کا نشانہ بننا پڑا اور پھر جان بچانے کے لیے بڑی تدبیروں کے ساتھ یہاں سے بہت دور جانا پڑا۔ روپوش ہونا پڑا۔" میں نے کہا۔

"خیر ہمیں یہ توقع نہیں تھی کہ تم اچانک اس طرح بھاگ نکلو گے اور غائب ہو جاؤ گے۔ ہم تمہاری حفاظت کے کچھ ایسے منصوبوں پر غور کر رہے تھے جن سے ہمارا یا حکومت کا کوئی تعلق نظر نہ آتا لیکن اسی دوران ریڈ ڈاٹ کھُل کر تم پر حملہ آور ہوگئی۔ اس کے کچھ ہرکارے کھُل کر سامنے آگئے۔ وزیرِ خارجہ حفیظ صاحب کے آبائی مکان پر لاہور میں تمہارا ان لوگوں سے جو معرکہ رہا اس میں تمہارا بچ نکلنا ایک معجزہ ہی تھا۔"

"بے گناہی کی بھی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ شاید وہی میرے کام آگئی۔" میں نے کہا "طاقتوروں کے لیے ہر بے گناہ کو یونہی محض اپنی حکمِ عدولی کی بنا پر ہلاک کرنا اتنا آسان ہوتا تو آج

دنیا کی آبادی بہت کم ہوتی اور قدم قدم پر ایک فرعون کا راج ہوتا۔"

"بے شک" نفیس صاحب نے سرہلایا "بہرحال ہم وہاں کے حالات سے بے خبر نہیں تھے۔ لاہور میں جو کچھ ہوا اس کی رپورٹ ہمیں فوراً ملی اور ہمارے آدمی ذرا تاخیر سے سہی، لیکن حرکت میں آگئے۔ ان واقعات کا ایک فائدہ ہوا کہ ہمیں پہلی بار صحیح معنوں میں ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ کارآمد سراغ ملے اور ہم ان پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہوئے۔"

"کیا؟" میں تقریباً اچھل پڑا "آپ نے ریڈ ڈاٹ پر ہاتھ ڈال دیا؟"

"ہاں" نفیس صاحب نے خاصی طمانیت سے اثبات میں سر ہلایا "نہ صرف ہاتھ ڈال دیا بلکہ ہم نے ان کی کمر بھی توڑ دی ہے۔ اب وہ پہلے جیسی طاقتور تنظیم کے طور پر تو باقی نہیں رہی اور نہ ہی اس کے وہ بڑے بڑے منصوبے باقی رہے ہیں جن کے ذریعے وہ ہمارے ملک کو ایک تماشا گاہ اور تجربہ گاہ بنانے کی تیاریاں کررہی تھی۔ اس کا زیادہ تر کریڈٹ تمہارے ساتھیوں..... خصوصاً اس لڑکی کو جاتا ہے جس کا نام راحیلہ ہے۔"

راحیلہ.....! میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ میں نے جب اسلام آباد انٹرنیشنل ائرپورٹ پر قدم رکھا تھا تب سے میں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن اس کا کوئی ذکر ہی نہیں آیا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے ابھی تک کچھ معلوم ہی نہیں ہوسکا تھا۔

نفیس صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے "مجھے تمہارے ساتھیوں کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوچکی ہیں۔ احمد، سلیمان، منیر، مسعود، ٹونی، شبیر شیخ، حنیف خان، شفیع شاہ اور سردار علی وغیرہ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوچکا ہے۔ وہ تمہارے کاروباری ساتھی ہیں لیکن عام سے کاروباری آدمی نہیں ہیں۔ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ جاتے وقت تم راحیلہ کو انچارج بنا گئے تھے۔ اس نے سرداری کا حق ادا کردیا۔ وہ بڑے ہی کمال کی چیز ہے۔"

"وہ ہے کہاں؟" میں نے بظاہر پُرسکون لہجے میں پوچھا۔ میں اپنے لہجے کے اضطراب کو چھپانے میں بہ مشکل کامیاب ہوا تھا۔

"تمہارے سب ساتھی یہیں اسلام آباد میں موجود ہیں۔ کافی عرصے سے وہ ایک طرح سے ہمارے ہی محکمے کے آدمیوں کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہاں..... اسی بستی میں خانہ بدوشوں کے روپ میں موجود ہیں اور کچھ مختلف مقامات پر، مختلف بہروپوں میں، مختلف ڈیوٹیاں سرانجام دے رہے ہیں۔"

یہ سُن کر میرے دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ سلیمان کو ایک بازو سے محروم دیکھ کر اور صفدر کی موت کی خبر سُن کر میرے دل پر جو گھاؤ سا پڑا تھا اس کی اذیت میں ذرا کمی ہوئی ورنہ مجھے تو اپنے باقی ساتھیوں کے بارے میں بھی تشویش ہو چلی تھی۔

نفیس صاحب بولے "ریڈ ڈاٹ جیسی خطرناک طاقت سے ٹکراؤ میں تمہارے صرف ایک ساتھی کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے لیکن یہ ان لوگوں کے ہمارے ساتھ آملنے سے پہلے کی بات ہے۔ جب سے انہوں نے ہمارے ساتھ مل کر کام شروع کیا ہے، ان میں سے کسی کو کوئی خاص گزند نہیں پہنچی البتہ مختلف خطرناک کارروائیوں میں ہمارے کئی آدمی کام آچکے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ تمہارے آدمیوں نے ہمارے آدمیوں سے زیادہ باصلاحیت، معاملہ فہم اور ذہین ہونے کا ثبوت دیا۔ خصوصاً اس لڑکی کی صلاحیتیں دیکھ کر تو یقین نہیں آتا کہ وہ واقعی لڑکی ہے۔"

"اب صورتِ حال کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"صورتِ حال اب بھی کچھ عجیب ہی ہے۔" نفیس صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولے "ریڈ ڈاٹ کچھ اس انداز میں ہمارے ملک میں بکھری ہوئی تھی اور اس کے زرخرید لوگ کچھ اس طرح مختلف محکموں میں سرایت کرچکے تھے کہ کسی ایک آپریشن کے ذریعے اس کا خاتمہ ممکن نہیں تھا۔ تعداد میں وہ سب لوگ مجموعی طور پر شاید چند ہزار سے زیادہ نہ ہوں لیکن ان کے پاس جیسی جیسی سائنسی ایجادات موجود تھیں ان کو دیکھتے ہوئے اندیشہ تھا کہ کسی براہ راست اور فیصلہ کُن تصادم میں وہ لوگ چند منٹ میں خدانخواستہ ہمارے ملک کو کھنڈر بنا سکتے تھے۔"

"اس خطرے سے تو میں بھی آپ کو آگاہ کرچکا تھا۔" میں نے یاد دلایا۔

"درست ہے لیکن اس کا صحیح اندازہ ہمیں کچھ چیزیں ہاتھ آنے کے بعد ہوا۔" نفیس صاحب بولے "ان کے اصل اور بڑے ٹھکانے ہمارے تین شہروں میں تھے۔ کراچی، لاہور اور اسلام آباد..... لاہور میں تو باقاعدہ ان کی ایک زیرِ زمین دنیا آباد تھی۔ ایک الف لیلوی اور طلسماتی سی دنیا۔ جس کی تم سیر کرچکے تھے۔"

"کیا آپ اس زیرِ زمین دنیا تک پہنچ گئے؟" میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔

"ہاں" انہوں نے اثبات میں سرہلایا "یہی تو وہ سب سے بڑا کارنامہ تھا جو ہم تمہارے ساتھیوں اور خصوصاً اس لڑکی راحیلہ کی وجہ سے انجام دے سکے۔" پھر جیسے انہیں کچھ یاد آیا "ہاں ایک اور لڑکی نے اس ضمن میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ وہ انہی کے کیمپ کی لڑکی تھی لیکن اس نے گویا ان سے غداری کرتے ہوئے ہمارا ساتھ دیا۔ اگر وہ ہماری مدد نہ کرتی تو شاید ہمارا ریڈ ڈاٹ کی لاہور والی زیرِ زمین دنیا تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہوتا اور اس پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں تو بہت ہی خون ریزی ہوتی۔ نہ جانے کتنی جانیں ضائع ہوتیں۔ اس کی مدد اور راحیلہ کی کمانڈو کارروائیوں کی وجہ سے یہ کام آسان ہوا اور زیادہ جانی نقصان نہیں ہونے پایا۔ ان واقعات کی تفصیل تمہیں راحیلہ سے معلوم ہوجائے گی۔"

وہ جھرجھری سی لیتے ہوئے بولے "اب سوچتا ہوں تو واقعی ایسا لگتا ہے جیسے وہ سائنس فکشن پر مبنی کوئی خواب تھا جس سے ہم سب گزر رہے تھے۔ ہر لمحے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی آنکھ کھل

جائے گی اور سب کچھ غائب ہوجائے گا، جھوٹا ثابت ہوگا۔"

"وہ لڑکی کون تھی جس نے ان کے کیمپ میں ہوتے ہوئے آپ کی مدد کی؟" میں نے پوچھا "مجھے تو یہ ناممکن سی بات لگ رہی ہے۔"

"ایک لحاظ سے تم صحیح کہہ رہے ہو۔" نفیس صاحب نے تسلیم کیا۔ "ان کے کیمپ کا کوئی شخص تو غداری کا تصور نہیں کرسکتا لیکن وہ لڑکی دراصل بنیادی طور پر ان کی ساتھی نہیں تھی یعنی سفید فام نہیں تھی۔ وہ یہیں کی تھی۔ تم اسے جانتے ہو۔ وہ بھی تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہے۔ بلکہ شاید وہ تمہاری عقیدت مند ہے۔ کسی زمانے میں وہ پرنس تہمینہ کے نام سے انٹرکان میں ڈانس کیا کرتی تھی۔"

"اوہ!" میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ درحقیقت ہنی کا ذکر کررہے تھے جسے ریڈ ڈاٹ والوں نے برین واش کے ذریعے اپنے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلی بنایا ہوا تھا لیکن ان کے سائنسی تجربات کے دوران شاید اس کے ذہن کے کچھ خلیے ان کی پسند کے سانچوں میں ڈھلنے سے بچ گئے تھے اس لیے اس نے پرنس تہمینہ کے روپ میں بھی میری مدد کی تھی جس کی وجہ سے وہ ریڈ ڈاٹ کے زیرِ عتاب آگئی تھی اور انہوں نے اسے غائب کردیا تھا۔ اس کے بعد نہ جانے کس طرح اس نے ریڈ ڈاٹ کے خلاف آپریشن میں نفیس صاحب کے اور میرے ساتھیوں کی مدد کر ڈالی تھی۔ خیر یہ تفصیلات تو میں بعد میں معلوم کرسکتا تھا۔ فی الحال تو میں مختصراً سب کچھ جاننا چاہتا تھا۔

"میں سمجھ گیا آپ کس کا ذکر کررہے ہیں۔" میں نے جلدی سے کہا "بہرحال آپ لاہور والی زیرِ زمین دنیا تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے؟"

"ہاں" نفیس صاحب نے اثبات میں سرہلایا اور واسکٹ کی جیب سے ایک اور بیڑی نکال کر سُلگائی "وہ زیرِ زمین دنیا تباہ ہوچکی ہے۔ کچھ ہمارے ہاتھوں تباہ ہوئی، کچھ انہوں نے خود تباہ کردی تاکہ چیزیں ہمارے ہاتھ نہ لگنے پائیں۔ اس کے باوجود بہت سی چیزیں ہمارے ہاتھ لگیں۔ بہت کچھ معلوم ہوا۔ بہت سے افراد ان کے بھی مارے گئے۔ اس کے بعد ہی ہمیں پتا چلا کہ کراچی میں ان کی اس قسم کی کوئی زیرِ زمین دنیا موجود نہیں ہے لیکن وہاں بہت سے اہم افراد موجود ہیں جو ادھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ ابھی ہم انہیں تلاش نہیں کرسکے۔ ان تک نہیں پہنچ سکے۔ ہمیں پہلے اسلام آباد کی طرف توجہ دینی پڑی کیونکہ یہاں ان کی دوسری زیرِ زمین دنیا موجود ہے۔"

مجھے یاد آیا کہ ایک بار مجھے اسلام آباد کے نواحی علاقے سے اغوا کیا گیا تھا اور میری آنکھ ایک عجیب الف لیلوی اور طلسماتی ماحول میں کھلی تھی۔

نفیس صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے "درحقیقت ان کے یہاں والے ٹھکانے کی حیثیت وہی تھی جو انسانی جسم میں دماغ کی ہوتی ہے۔ سب کچھ یہیں سے کنٹرول ہوتا تھا۔ اہم احکامات یہیں سے جاری ہوتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ شاید اب یہاں زیادہ افراد موجود نہ ہوں لیکن ان کے نیٹ ورک کو کنٹرول کرنے والے آلات... کوئی بہت بڑا کمپیوٹرائزڈ نظام اور کچھ بہت تباہ کُن قسم کی سائنسی ایجادات یہیں موجود ہیں جو محض کوئی ایک بٹن دبائے جانے کی منتظر ہیں جس کے بعد خوفناک تباہی ہمارا مقدر ہوسکتی ہے۔"

انکا، اقابلہ، سونا گھاٹ کا پجاری،
غلام روحیں، امبر بیل، درخشاں، خبیث
کے بعد انوار صدیقی کا ایک اور
پراسرار ناول

برہمچاری

نیکی اور بدی کا خوفناک تصادم

خوبصورت سرورق، دیدہ زیب
کتابت و طباعت

قیمت =/150 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

"اب آپ اس زیرِ زمین دنیا کی تلاش میں یہاں پڑے ہیں؟"

میں نے تصدیق چاہی۔

"ہمیں لاہور میں کچھ انتہائی جدید کمپیوٹروں کے تیار کردہ نقشے اور دیگر تفصیلات وغیرہ ملی تھیں جن میں سے بیشتر ہمارے لیے ناقابلِ فہم تھیں۔ بہرحال ہمارے کئی شعبوں کے ماہرین نے ان پر سر کھپایا۔ کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی وہ زیرِ زمین دنیا اس علاقے میں آٹھ دس میل کے قطر میں کہیں موجود ہے۔ ہم کئی ایسے طریقوں سے.... کہ کسی کو شک نہ ہونے پائے اس علاقے کو کھنگال چکے ہیں۔ حساس آلات کے ذریعے کمپیوٹروں کے ذریعے گاڑیوں کے ذریعے' جہازوں اور ہیلی کاپٹروں کے ذریعے چپے چپے کا جائزہ لے چکے ہیں لیکن ہمیں کسی زیرِ زمین دنیا کا سراغ نہیں ملا لیکن جو چیزیں ہمیں ملی تھیں ان کی مدد سے بہرحال ایک سمت کا تعین کر کے ہم کام کر رہے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔"

"مجھے تو یہاں کوئی کام ہوتا نظر نہیں آرہا۔" میں نے کہا۔

"کام یہاں نہیں ہو رہا۔ تم نے شاید دیکھا ہو یہاں سے چند فرلانگ دور کنسٹرکشن کے لیے کیمپ لگے ہوئے ہیں۔ کھدائی وغیرہ ہو رہی ہے' آج تو خیر چھٹی کا دن ہے۔ وہاں بھی تمہیں کام ہوتا نظر نہیں آرہا ہوگا۔ ہوا اصل میں یہ ہے کہ ہماری خوش قسمتی سے یہاں کچھ عرصہ پہلے ایک بہت بڑی واٹر سپلائی اسکیم پر کام شروع ہوا تھا۔ قریب ہی ایک جھیل واقع ہے۔ ہم جب ریڈ ڈاٹ کے چکر میں اس طرف متوجہ ہوئے تو ہم نے ترکیب یہ کی کہ رفتہ رفتہ کنسٹرکشن کمپنی کے تمام ملازمین کو ایک ایک کر کے ایک اور جگہ بھجوا دیا گیا جہاں وہ ایک اور ٹھیکے پر کام کر رہے ہیں۔ ان کے تمام بورڈ' مشینری وغیرہ اسی طرح یہاں موجود رہی۔ راتوں رات نہایت خاموشی سے صرف افراد تبدیل ہوتے رہے۔ کمپنی کے آدمیوں کی جگہ فورسز کے آدمیوں نے لے لی اور اسی دوران ہم نے یہاں یہ خانہ بدوشوں والی بستی تخلیق کر ڈالی۔ بظاہر ہم کہیں سے بیل گاڑیوں اور گدھوں پر سفر کرتے ہوئے یہاں آئے تھے اور یہ جگہ خالی دیکھ کر یہاں ڈیرے ڈال لئے تھے۔"

وہ کش لینے کو ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئے تو میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "تدبیریں تو اچھی ہیں بشرطیکہ کامیاب ہوں۔"

نفیس صاحب بولے "اب صورتِ حال یہ ہے کہ بظاہر وہاں واٹر سپلائی اسکیم کا کام جاری ہے لیکن ساتھ ہی مخالف سمت میں ایک بڑی سرنگ بھی کھودی جا رہی ہے۔ ہمیں شبہ ہے کہ شاید ریڈ ڈاٹ والوں نے اپنے زیرِ زمین قلعے کو اوپر سے سیل کر دیا ہو۔ سطحِ زمین پر بظاہر اس کی موجودگی کا کوئی نشان نہ ہو۔ ممکن ہے وہاں کوئی ذی روح بھی موجود نہ ہو لیکن تباہ کن چیزیں موجود ہوں جنہیں کہیں اور سے کنٹرول کیا جا سکتا ہو۔ اس لیے ہم نہایت خاموشی اور رازداری سے وہاں تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی بعید نہیں ہے کہ زیرِ زمین قلعہ یہاں موجود ہو لیکن آمدورفت کا راستہ انہوں نے کہیں بہت دور کھود نکالا ہو کیونکہ ہماری حکومتوں کی بے پروائی یا سیاسی مصلحتوں اور مجبوریوں کی وجہ سے دو تین مغربی ملکوں کے لوگ یہاں مختلف مقاصد کے تحت سروے وغیرہ کی آڑ میں بہت عرصہ ڈیرے ڈالے بیٹھے رہے ہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس دوران وہ کیا کرتے رہے ہوں۔"

وہ خاموش ہوئے تو میں نے کہا "اب آپ لوگ غالباً مزدوری وغیرہ کے بہانے واٹر سپلائی اسکیم پر کام کرتے ہوں گے اور فورسز کے آدمیوں کے ساتھ کام کی نگرانی کرتے ہوں گے۔ آپ لوگ اچانک پیش آنے والی کسی بھی غیر متوقع صورتِ حال کے لیے تیار رہتے ہیں؟"

"ہاں' اپنے وسائل کے مطابق تو تیار رہتے ہیں۔" نفیس صاحب نے جواب دیا۔

اچانک سانولا سا ایک شخص اپنی بیوند زدہ قمیص کی آستین سے ناک پونچھتا ہوا خیمے میں داخل ہوا اور مؤدبانہ لہجے میں بولا "سر! میڈم آئی ہیں۔"

سب لوگ احتراماً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دوسرے ہی لمحے ایک برقع پوش عورت خیمے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر پورا نقاب تھا لیکن خیمے میں داخل ہوتے وقت اس نے نقاب اُلٹ دیا۔

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا آدھا چہرہ بالکل سیاہ اور آدھا سرخ و سپید تھا۔ اور وہ بھی عمودی انداز میں۔ یعنی پیشانی کے درمیان سے لے کر نرخرے کے درمیان تک۔

اگر اس کا چہرہ افقی انداز میں' یعنی ایک کان کی لو سے لے کر دوسرے کان کی لو تک سیاہ ہوتا تو اسے بڑی آسانی سے آدھے نقاب میں چھپایا جا سکتا تھا لیکن وہ اوپر سے نیچے تک سیاہ تھا اور رنگوں کی اس تقسیم میں اتنی صفائی تھی گویا کسی مصور نے تصویر بنا کر باقاعدہ اسکیل رکھ کر تصویر کے آدھے چہرے میں سیاہ رنگ بھر دیا ہو۔

نواب حیدر علی
الماس ایم اے قیمت:- /200

میں بھی غیر ارادی طور پر اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اسے مخاطب کرنا چاہتا تھا' کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میری زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی۔

وہ راحیلہ تھی!

اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ بھی گویا اپنی جگہ بُت بن کر رہ گئی۔ ایک لمحے کے لیے خیمے کا ماحول گویا ساکت ہو کر رہ گیا۔

آخر کار راحیلہ نے ہی یہ سکوت توڑا "ابی... تم...!"

تب میں نے تھوک نگلتے ہوئے بہ مشکل کہا "یہ کیسا بے ہودہ قسم کا میک اپ ہے۔ آدھا چہرہ سیاہ' وہ بھی اوپر سے نیچے کی طرف۔"

خیمے میں دوبارہ سکوت چھا گیا۔ آخر راحیلہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور سر جھکاتے ہوئے آہستگی سے بولی "یہ میک اپ نہیں ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "تو پھر یہ کیا ہے؟"

راحیلہ نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ بظاہر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن اس کی آنکھوں میں خفیف سی اُداسی تیر رہی تھی۔ وہ بے پروائی سے بولی "شاید یہ قسمت کا لکھا ہے.... یا پھر شاید کچھ بھی نہیں ہے۔ تم اس کی فکر میں مت اُلجھو۔ اپنی سناؤ' تم ٹھیک تو ہو نا؟ تم اچانک ہی بھاگ گئے تھے۔ تمہیں زیادہ مصائب کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا؟"

"میرے مصائب کو گولی مارو۔" میں نے تیزی سے کہا اور اٹھ کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا "میں اپنے مصائب کو بھول چکا ہوں۔ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم نے یہ اپنا چہرہ آدھا سیاہ آدھا سفید کیوں کر رکھا ہے؟ اس میں کیا مصلحت ہے؟"

"یہ میں نے نہیں' کسی اور نے کیا ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

میں نے نفیس صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش رہے۔ ان کا چہرہ سپاٹ تھا۔ راحیلہ جلدی سے بولی "ان کی طرف مت دیکھو۔ یہ ان کا کام نہیں ہے۔ میں بتا تو چکی ہوں کہ یہ میک اپ نہیں ہے۔"

"تو پھر یہ کس کا کام ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"بات ذرا لمبی ہے۔ آرام سے بیٹھ کر کریں گے۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ تم اب دوبارہ بھاگنے کی تیاری تو نہیں کر رہے؟" وہ اپنے لہجے میں پرانی شگفتگی لانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

"نہیں۔ میں اب ہرگز نہیں بھاگوں گا۔ خواہ جان ہی چلی جائے۔" میرا لہجہ غیر ارادی طور پر ہی فیصلہ کن ہو گیا "میرا خیال ہے میں نے پہلی مرتبہ ہی بھاگ کر غلطی کی تھی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

اے حمید کی ایڈونچر سیریز

عاطون

۱۔ اہرامِ مصر سے فرار -/150
۲۔ اندلس کی آخری شمع -/125
۳۔ ہڑپہ کی ناگن -/125
۴۔ عاطون موت کے دروازے پر -/200

شیوسینا کے دہشت گرد

۱۔ ٹاپ سیکرٹ مشن -/150
۲۔ کشمیر کے غازی -/150
۳۔ کمانڈو ایکشن -/200
۴۔ گولکنڈہ کے مجاہد -/200

گنگا کے پجاری ناگ (اول) -/150
گنگا کے پجاری ناگ (دوئم) -/200

مکتبہ القریش
اُردو بازار، لاہور۲
فون: 7224665

"نہیں۔ وہ بھگدڑ میں کیا گیا فیصلہ ٹھیک ہی تھا۔ اچھا ہوا تم پیش منظر سے ہٹ گئے ورنہ شاید حالات اور زیادہ خراب ہوتے۔ اب حالات بہت مختلف ہیں۔ اب تم آگئے ہو' یہ بہت اچھا ہوا ہے۔"

"خیر یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم اپنے چہرے سے یہ سیاہی صاف کیوں نہیں کر دیتیں؟" میں نے کہا۔

"اگر ہو سکتی تو ضرور کر دیتی۔" وہ مسکرائی۔

"کیا مطلب؟" میں نے بدستور ایک بے عنوان سا اضطراب محسوس کرتے ہوئے کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی "یہ بدنامی کی کالک سے بھی زیادہ پکی سیاہی ہے۔ بدنامی کی کالک بھی وقت کے ساتھ ساتھ دور ہو جاتی ہے لیکن یہ کسی طرح نہیں اُتر سکتی۔"

وہ مسکرا کر گویا بات کی سنگینی کو کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میرے دل میں سناٹا پھیلتا چلا گیا۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ جو ایک منفرد حُسن کا حامل تھا' جو دیکھنے والوں کو ایک لمحے کے لیے مبہوت سا کر دیتا تھا۔ اس وقت محض اس ایک تبدیلی سے نہایت مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ دیکھنے والے کو شاید یہی گمان گزرتا کہ وہ کسی قسم کا مذاق کر رہی تھی جس طرح بعض بچے یا بڑے دوسروں کو ڈرانے کے لیے چہروں پر بھیانک ماسک لگا لیتے ہیں۔ یہ خیال کسے آسکتا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ مذاق نہیں کر رہی تھی تقدیر خود اس کے ساتھ مذاق کر رہی تھی۔

"تم مجھے بتاؤ تو سہی آخر یہ کس طرح ہوا ہے؟" میں نے پھنسی پھنسی سی آواز میں پوچھا۔

"یہ سب کچھ صحیح طور پر بتانے کے لیے خاصا وقت چاہیے۔ دو چار جملوں میں بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔" وہ یوں تحمل سے بولی گویا کسی ننھے بچے کو کسی ضد سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"میں اتنا مصروف آدمی نہیں ہوں کہ تمہارے بارے میں کوئی اہم بات نہ سن سکوں۔ میں جب مصروف تھا تب بھی کم از کم تمہارے سامنے تو میری مصروفیات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" وہ خوش دلی سے مسکرائی "میں تو درحقیقت یہ چاہ رہی تھی کہ پہلے نفیس صاحب سے وہ ضروری بات کرلوں جس کے لیے میں یہاں آئی تھی۔ باقی باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ اس وقت تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے زندگی کا ایک بڑا سرپرائز ملا ہے۔"

"کیا تمہیں میری آمد کی اطلاع نہیں تھی؟" میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"دوسرے ساتھیوں کو تھی۔" میں نے اسے بتا دیا۔

"مجھے کسی نے نہیں بتایا۔" اس کے لہجے میں شکوہ نہیں تھا "حالات خواہ کچھ بھی ہوں' یہ لوگ سسپنس پیدا کرنے کی کوشش سے باز نہیں آتے۔"

پھر وہ نفیس صاحب کی طرف مُڑی اور گہری سنجیدگی سے بولی "سر! میں آپ سے ہنی کے بارے میں بات کرنے آئی تھی۔ کیا واقعی اسے امریکا یا کینیڈا لے جانا ممکن نہیں ہے؟ میں نے سنا ہے وہاں اس نوعیت کا آپریشن ممکن ہے۔ شاید اس کی جان بچائی جاسکے۔ انسانی ہمدردی تو اپنی جگہ ہے لیکن میں سوچتی ہوں اگر اس کی جان بچ جائے اور اس کا ذہن مکمل طور پر بیدار ہو جائے تو شاید وہ ہمیں ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ اور بھی بتا سکے۔ کسی مرتے ہوئے انسان کے بارے میں اس طرح خود غرضی سے سوچنا اچھا تو نہیں لگتا لیکن میں کچھ مجبوری کے سے عالم میں اس طرح سوچ رہی ہوں۔ ریڈ ڈاٹ کے خاتمے کے لیے ہم نے اپنا سب کچھ..... حتیٰ کہ اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا دی ہے' اب اس آپریشن کو کسی نہ کسی طرح اختتام تک تو پہنچانا ہے۔"

اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں یہ سب کچھ کہا تھا۔ میرے لیے یہ اطلاع افسوس اور تشویش کا باعث تھی کہ ہنی کہیں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس کے بارے میں بجا طور پر کیچڑ میں کنول کی تشبیہ استعمال کی جاسکتی تھی لیکن بعض لوگ نہ جانے کیوں بدقسمتی کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا المیہ انہیں زندگی بھر اُلجھائے رکھتا ہے۔ وہ زندگی میں کئی بار بہت ہی نازک موقعوں پر میرے کام آئی تھی۔ میں اس کے بارے میں مزید جاننا چاہتا تھا لیکن اس وقت میں نے نفیس صاحب اور راحیلہ کی گفتگو میں مداخلت مناسب نہیں سمجھی۔

نفیس صاحب ایک لمحہ پُرخیال نظروں سے راحیلہ کی طرف دیکھتے رہے پھر اپنی پھٹی ہوئی میلی پھیلی روئی دار واسکٹ کے اندر ہاتھ ڈالتے ہوئے بولے "ویسے تو میں بھی پہلے ہی تمام ڈاکٹروں سے بات کر چکا ہوں لیکن تمہاری تسلی کے لیے ایک بار پھر سرجن کرنل رحمان سے بات کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ اگر وہ اجازت نہیں دیتا تو پھر کوئی بھی اجازت نہیں دے سکتا۔ کرنل رحمان ہمارے ملک کے چند ایک قابل ترین نیورو سرجنز میں سے ایک ہے۔"

نفیس صاحب کا ہاتھ واسکٹ سے باہر آیا تو اس میں چھوٹا سا ایک خوب صورت موبائل فون تھا۔ انہوں نے سُلگتی ہوئی بیڑی ایک طرف پھینکی اور فون پر ایک نمبر پنچ کیا۔ اپنی پھٹی پرانی دھوتی کو سنبھالتے وہ ایک چارپائی پر بیٹھ گئے اور انہوں نے ہمیں بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اور راحیلہ موڑھوں پر بیٹھ گئے۔ راحیلہ ان کی طرف پُرامید سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

سلسلہ ملنے پر نفیس صاحب نے بارُعب لہجے میں کہا "سرجن کرنل رحمان سے بات کراؤ۔"

[illegible] چند لمحے بعد نفیس صاحب کا رابطہ سرجن رحمان سے ہو گیا۔ [illegible] منٹ باتیں کرتے رہے۔ آخر کار فون بند کر کے دوبارہ اپنی [illegible]ک میں چھپاتے ہوئے بولے "سرجن رحمان بھی ہنی کو کہیں [illegible]ل کرنے کے حق میں نہیں ہے' کسی دوسرے ملک لے جانا تو [illegible] کا رُوہ اسے ایک بستر سے دوسرے بستر پر منتقل کرنے کے حق میں [illegible]ی نہیں ہے۔ وہ ویسے بھی اس کی زندگی کے بارے میں پُرامید [illegible]ں ہے۔ اس کے خیال میں وہ ایک بجھتا ہوا چراغ ہے۔"

راحیلہ فون پر ان کی گفتگو کے دوران ہی یہ نتیجہ اخذ کر چکی [illegible]ی۔ اس کے آدھے سیاہ' آدھے سفید چہرے پر مایوسی پھیل چکی [illegible]ی۔ نفیس صاحب گویا اسے سمجھاتے ہوئے بولے "جو چیز ہمارے [illegible]ں میں نہیں اس کے بارے میں تمہیں غمزدہ نہیں ہونا چاہیے۔"

"میں شاید غمزدہ نہیں' متفکر ہوں سر!" راحیلہ خیمے کے [illegible]وازے کی طرف دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی [illegible]جھے کچھ اندیشہ محسوس ہو رہا ہے کہ جس فتنے سے ہم نے ٹکر لی [illegible]ی اگر جلد از جلد اس کا سر کچلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تو وہ [illegible]ں دوبارہ ڈسے گا۔"

نفیس صاحب ٹھوڑی مسلتے ہوئے پُرخیال انداز میں اس کی [illegible]رف دیکھتے رہے۔ راحیلہ بولی "اس وقت ہمارے اردگرد ایک [illegible]کت سا طاری ہے۔ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آرہا۔ مجھے [illegible]کہ یوں لگ رہا ہے جیسے سانپ زخمی ہو کر بل میں گھس گیا ہے اور [illegible]بارہ حملہ آور ہونے کے لیے اپنی توانائیاں جمع کر رہا ہے۔ یہ [illegible]کت کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔"

"ہم اپنی سی کوشش کر رہے ہیں۔" نفیس صاحب بولے "تمہیں معلوم ہے ہم نے بہت بڑی منصوبہ بندی کی ہے اور بہت [illegible]ائل نہایت خاموشی سے اس میں لگا رکھے ہیں۔ تم اس منصوبہ [illegible]دی کا ایک حصہ ہو۔ مجھے امید ہے کہ وائر سپلائی کی آڑ میں جو [illegible]نگ کھودی جا رہی ہے وہ ہمیں ریڈ ڈاٹ کے زیرِ زمین قلعے تک [illegible]ئے گی۔"

"لیکن ہمارے انتہائی جدید اور انتہائی حسّاس آلات نے بھی [illegible]ا علاقے میں کہیں زیرِ زمین کسی غیر معمولی چیز کی موجودگی کی [illegible]ری نہیں کی ہے۔" راحیلہ بولی۔

"میں اس سے مایوس نہیں ہوں۔" نفیس صاحب بولے "[illegible]س موضوع پر ایک میٹنگ میں ہم بات کر چکے ہیں۔ ہم سائنسی [illegible]ادات میں ریڈ ڈاٹ کے مقابلے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جن [illegible]ر فاموں نے یہ تنظیم بنائی ہے ان کے اپنے طلوں میں بھی وہ [illegible]ادات منظرِ عام پر موجود نہیں ہیں جن سے انہوں نے ریڈ ڈاٹ [illegible]ئیں کر رکھا ہے۔ آزمودہ [illegible]

[illegible] تھا جبکہ ان کا حُلیہ اور گردوپیش کوئی اور ہی تصویر پیش کر رہا [illegible]میں اس تضاد سے لطف اندوز ہو سکتا تھا بشرطیکہ اس وقت میرا [illegible] کچھ غمناک سے انکشافات میں نہ اُلجھا ہوتا۔

[illegible] چند لمحے بعد نفیس صاحب کا رابطہ سرجن رحمان سے ہو گیا۔ [illegible] منٹ باتیں کرتے رہے۔ آخر کار فون بند کر کے دوبارہ اپنی [illegible]ک میں چھپاتے ہوئے بولے "سرجن رحمان بھی ہنی کو کہیں [illegible]ل کرنے کے حق میں نہیں ہے' کسی دوسرے ملک لے جانا تو [illegible] کا رُوہ اسے ایک بستر سے دوسرے بستر پر منتقل کرنے کے حق میں [illegible]ی نہیں ہے۔ وہ ویسے بھی اس کی زندگی کے بارے میں پُرامید [illegible]ں ہے۔ اس کے خیال میں وہ ایک بجھتا ہوا چراغ ہے۔"

راحیلہ فون پر ان کی گفتگو کے دوران ہی یہ نتیجہ اخذ کر چکی [illegible]ی۔ اس کے آدھے سیاہ' آدھے سفید چہرے پر مایوسی پھیل چکی [illegible]ی۔ نفیس صاحب گویا اسے سمجھاتے ہوئے بولے "جو چیز ہمارے [illegible]ں میں نہیں اس کے بارے میں تمہیں غمزدہ نہیں ہونا چاہیے۔"

"میں شاید غمزدہ نہیں' متفکر ہوں سر!" راحیلہ خیمے کے [illegible]وازے کی طرف دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی [illegible]جھے کچھ اندیشہ محسوس ہو رہا ہے کہ جس فتنے سے ہم نے ٹکر لی [illegible]ی اگر جلد از جلد اس کا سر کچلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تو وہ [illegible]ں دوبارہ ڈسے گا۔"

نفیس صاحب ٹھوڑی مسلتے ہوئے پُرخیال انداز میں اس کی [illegible]رف دیکھتے رہے۔ راحیلہ بولی "اس وقت ہمارے اردگرد ایک [illegible]کت سا طاری ہے۔ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آرہا۔ مجھے [illegible]کہ یوں لگ رہا ہے جیسے سانپ زخمی ہو کر بل میں گھس گیا ہے اور [illegible]بارہ حملہ آور ہونے کے لیے اپنی توانائیاں جمع کر رہا ہے۔ یہ [illegible]کت کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔"

"ہم اپنی سی کوشش کر رہے ہیں۔" نفیس صاحب بولے "[illegible]تمہیں معلوم ہے ہم نے بہت بڑی منصوبہ بندی کی ہے اور بہت [illegible]ائل نہایت خاموشی سے اس میں لگا رکھے ہیں۔ تم اس منصوبہ [illegible]دی کا ایک حصہ ہو۔ مجھے امید ہے کہ وائر سپلائی کی آڑ میں جو [illegible]نگ کھودی جا رہی ہے وہ ہمیں ریڈ ڈاٹ کے زیرِ زمین قلعے تک [illegible]ئے گی۔"

"لیکن ہمارے انتہائی جدید اور انتہائی حسّاس آلات نے بھی [illegible]ا علاقے میں کہیں زیرِ زمین کسی غیر معمولی چیز کی موجودگی کی [illegible]ری نہیں کی ہے۔" راحیلہ بولی۔

"میں اس سے مایوس نہیں ہوں۔" نفیس صاحب بولے "[illegible]س موضوع پر ایک میٹنگ میں ہم بات کر چکے ہیں۔ ہم سائنسی [illegible]ادات میں ریڈ ڈاٹ کے مقابلے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جن [illegible]ر فاموں نے یہ تنظیم بنائی ہے ان کے اپنے طلوں میں بھی وہ [illegible]ادات منظرِ عام پر موجود نہیں ہیں جن سے انہوں نے ریڈ ڈاٹ [illegible]ئیں کر رکھا ہے۔ آزمودہ [illegible]

[illegible] ہیں۔ ممکن ہے ان کے زیرِ زمین قلعے کے گرد بھی کچھ ایسے [illegible]انتظامات موجود ہوں۔ کوئی ایسا غیر مرئی ہالہ موجود ہو جس کی وجہ [illegible]سے ہمارے حسّاس آلات بھی اس کی موجودگی کی نشاندہی نہ کر سکتے [illegible]ہوں۔ ہمیں ان کے کمپیوٹروں سے جو نقشے ملے تھے ان میں اس [illegible]خصوص ٹکڑے کی بہرحال کوئی اہمیت ظاہر کی گئی تھی جس کا صحیح [illegible]مطلب ہم نہیں سمجھ سکے۔"

راحیلہ کچھ سوچتے ہوئے بولی "یہ بھی ممکن ہے کہ جب ہمارے لوگ کھُدائی کرتے ہوئے واقعی اس زیرِ زمین قلعے تک پہنچ جائیں تو اچانک کوئی زبردست تباہی شروع ہو جائے۔ ان کے حفاظتی انتظامات کچھ اس قسم کے ہوں کہ ہم یہ کارروائی کر کے پچھتانے پر مجبور نہ ہو جائیں؟"

"ہم تقریباً ایٹم بم کی سی تباہی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔" نفیس صاحب نے پہلو بدلتے ہوئے جواب دیا "تم سے اب کوئی بات چھپی ہوئی تو نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ کنسٹرکشن مشینری کی آڑ میں وہاں کیا کچھ موجود ہے اور پھر قدرے اطمینان کی بات یہ ہے کہ یہاں چاروں طرف کافی دور دور تک ویرانہ ہے۔ زیادہ جانی اور مالی نقصان کا امکان نہیں ہے۔"

راحیلہ خاموش رہی۔ ان کی گفتگو سے حالات کی تصویر میری نظر میں بھی واضح ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک نفیس صاحب اپنی جگہ سے اُٹھے اور ایک گوشے میں بچھی ہوئی چٹائی کے پاس جا بیٹھے۔ اس چٹائی پر چند گدڑیاں سی بھی لپٹی ہوئی رکھی تھیں۔ پُرانا سا ایک حُقّہ بھی رکھا تھا۔

انہوں نے وہ چیزیں ایک طرف کو کھسکائیں اور چٹائی کا کونا اُٹھا کر اس کے نیچے سے زرد رنگ کا ایک بڑا سا لفافہ نکالا۔ لفافہ راحیلہ کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولے "یہ وہی چند تصویریں ہیں جو ریڈ ڈاٹ کے کمپیوٹروں سے ہمارے ہاتھ لگی تھیں۔ انہیں تم سیکرٹ سروس والوں کو بھجوا دینا۔ وہ انہیں اپنے خاص والٹ میں محفوظ کرا دیں گے۔ پتا چلا ہے کہ یہ تصویریں کسی طرح بھی ہمارے ہاں پرنٹ نہیں ہو سکتیں۔ کسی بھی فوٹو گرافک پیپر پر ان کے پرنٹ نہیں نکل سکتے۔ یہ تصویریں کسی عجیب ہی میٹریل پر ہیں جو اُن کے کمپیوٹروں کے پرنٹرز میں استعمال ہوتا ہے۔"

راحیلہ یونہی سرسری سے انداز میں ان تصویروں کو لفافے سے نکال کر دیکھنے لگی۔ شاید وہ پہلے بھی انہیں دیکھ چکی تھی۔ وہ پلاسٹک کی ٹرانسپیرنٹ پلیٹ پر تھیں اور دونوں طرف سے دیکھی جاسکتی تھیں لیکن کچھ عجیب سی لگ رہی تھیں۔ وہ نہ تو کیمرے کی کھینچی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور نہ ہی ہاتھ کی بنی ہوئی وہ کسی عجیب ہی مشینی عمل کے ذریعے تیار شدہ لگتی تھیں۔

سائز میں وہ تقریباً عام کتاب کے برابر تھیں۔ راحیلہ انہیں تاش کے پتّوں کی طرح ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کر رہی تھی۔ وہ کئی عورتوں اور مردوں کی تصویریں تھیں۔ وہ سب سفید

فام معلوم ہوتے تھے۔

"ان میں سے کچھ مرچکے ہیں اور کچھ کی ہمیں تلاش ہے۔" راحیلہ نے گویا میری معلومات کے لیے سرسری سے انداز میں بتایا۔

اچانک ایک تصویر میرے سامنے آئی۔ وہ اسے ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنے لگی تو میں نے غیرارادی طور پر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا اور اجازت طلب نظروں سے نفیس صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر رازداری مانع نہ ہو تو میں اس تصویر کو ذرا غور سے دیکھ لوں؟"

نفیس صاحب دھیرے سے ہنس دیے "بڑی دیر میں تکلفات کا خیال آیا ڈیئر افضل چوہدری! ابھی تک تمہارے سامنے جو باتیں ہوتی رہی ہیں وہ سب ہی انتہائی رازداری کی تھیں۔ خانہ بدوشی کی آڑ میں ہمارا یہاں موجود ہونا ہی ایک اہم راز ہے۔ اب تم سے بھلا کون سی بات راز رہ گئی ہے۔ تمہیں تو خود اب بہت سے رازوں سے پردہ اُٹھانے میں ہمارا ساتھ دینا ہے۔"

میں نے چٹکی میں پکڑ کر راحیلہ کے ہاتھ سے ٹرانسپیرنسی نما وہ تصویر لے لی۔ شفاف پلاسٹک کی وہ شیٹ اس سیلوفین سے بھی پتلی معلوم ہوتی تھی جو ہمارے ہاں پیکٹوں وغیرہ پر چڑھی ہوتی ہے لیکن وہ فلم کے نیگیٹو کی طرح کراری تھی۔

وہ ایک عورت کی تصویر تھی۔ میں ایک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا۔ تصویر میں گویا زندگی کے آثار موجود تھے اور وہ بھی جیسے ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میری رگ و پے میں خفیف سی سنسنی دوڑ گئی۔ اس عورت کی اصل شخصیت میں ہی نہیں' اس کی شفاف سی تصویر میں بھی کوئی ایسی بات تھی جس سے جسم میں سرد سی لہر دوڑ جاتی تھی۔

وہ اسی عورت کی تصویر تھی جس کی آنکھوں کا کوئی رنگ تھا ضرور۔۔۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کیا نام دیا جائے۔ کوئی رنگ رکھتے ہوئے بھی وہ آنکھیں گویا بے رنگ تھیں اور آسیبی سی معلوم ہوتی تھیں۔

راحیلہ کی خفیف سی ہنسی سُن کر میں چونکا۔ وہ شگفتہ لہجے میں بولی "لگتا ہے تصویر نے ہی ہپناٹائز کردیا ہے۔ تصویر کو دیکھ کر ہی خود تصویر بن کر رہ گئے ہو۔ لگتا ہے جب اصل میں اس عورت کو دیکھا ہوگا تو پتھر کے ہو کر رہ گئے ہوگے۔"

اس نے اندازہ لگالیا تھا کہ میں اس عورت کو دیکھ چکا ہوں۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا "کون ہے یہ عورت؟"

"پہلے تم بتاؤ۔ تم نے اسے کہاں دیکھا تھا؟" راحیلہ نے مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا۔ اس کے آدھے سیاہ' آدھے سفید چہرے پر مسکراہٹ بھی عجیب لگتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مختلف چہرے مسکرا رہے ہوں۔ جنہیں آدھا آدھا

کاٹ کر جوڑ دیا گیا ہو۔

"میں جب لاہور سے بھاگا تھا تو ملک کے نہ جانے کون کون سے ایسے دور افتادہ علاقوں کی طرف نکل گیا تھا جو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ کچھ عرصے پہلے میں نے واپس آنے کی کوشش کی تھی اور کراچی پہنچا تھا۔ وہاں پہلی ہی رات میرے اپنے ہوٹل میں مجھ پر حملہ ہوا۔ اس وقت میں نے پہلی بار اس عورت کو وہیں ہوٹل میں دیکھا تھا۔" میں نے مختصراً بتایا۔

راحیلہ کے دورنگے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی اُتر آئی۔ نفیس صاحب بھی چارپائی پر کچھ آگے کو جھک آئے۔

"پھر کیا ہوا؟" راحیلہ نے نہایت نیچی آواز میں پوچھا۔

"میں نے کراچی میں ٹکنا بہتر نہیں سمجھا۔ ساتھیوں میں سے بھی کسی سے رابطہ نہیں ہوسکا پھر صورتِ حال کچھ ایسی بنی کہ میں بحری جہاز کے ذریعے ترکی کی طرف نکل گیا۔ سفر کے ابتدائی دنوں میں اتفاقاً ہی میں دوربین کے ذریعے سمندر کا جائزہ لے رہا تھا۔ پرندوں کا شوقین ایک شخص مجھے پرندے دکھا رہا تھا کہ اچانک ایک اسٹیمر پر میں نے اس عورت کو دیکھا۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے وہ مجھے ہی تلاش کررہی تھی لیکن پھر وہ اسٹیمر غائب ہوگیا۔"

"اس کے بعد تم نے اس عورت کو نہیں دیکھا؟" نفیس صاحب نے دریافت کیا۔ میں نے نفی میں سرہلایا۔

"ترکی میں بھی یہ عورت کہیں نظر نہیں آئی؟" نفیس صاحب نے جاننا چاہا۔ میں نے ایک بار پھر نفی میں سرہلایا۔ خیمے میں گہرا سکوت چھاگیا۔

"میرے سوال کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ یہ عورت کون ہے؟" میں نے اپنا سوال دُہرایا۔

"صحیح طور پر تو ہمیں بھی نہیں معلوم۔" نفیس صاحب گہری سانس لے کر بولے "لیکن ان کے کمپیوٹروں سے ملنے والی معلومات کو ہم جس حد تک ڈی کوڈ کرسکے ہیں اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عورت کراچی میں ریڈ ڈاٹ کی کرتا دھرتا تھی اور شاید اب بھی ہے۔ یہ ریڈ ڈاٹ کی اہم ترین شخصیتوں میں سے ایک معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ تنظیم میں اس کا نام حیثیت یا عہدہ کیا ہے۔ ہم نے اسے "باس فور" فرض کررکھا ہے باس ون' باس ٹو اور باس تھری ہمارے آپریشن کے دوران مار جاچکے ہیں۔ وہ تینوں مرد تھے۔ کراچی میں ریڈ ڈاٹ کی تمام سرگرمیوں کو غالباً یہی عورت کنٹرول کرتی ہے لیکن ہم اس کی جھلک بھی نہیں دیکھ سکے ہیں۔"

"شاید کبھی دیکھ ہی لیں اور وہ آپ کی زندگی کا عجیب تجربہ ہوگا۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"بہرحال تمہاری بات سے ہمارے اندازوں کی کچھ تصدیق ہوتی ہے۔" نفیس صاحب بولے۔ راحیلہ مزید تصویریں دیکھنے لگی

ن میں ایڈم عرف ایڈی کی تصویر بھی تھی جو لاہور میں سب سے پہلے ریڈ ڈاٹ سے میرے رابطے کا ذریعہ بنا تھا۔

میں نے ایک بار پھر راحیلہ کا ہاتھ روکتے ہوئے کہا "اس شخص کے بارے میں کیا خبر ہے؟ زندہ ہے یا مرگیا؟"

"ہم نے اسے زندہ پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے نہایت شریفانہ انداز میں خودکشی کرلی کیونکہ وہ پکڑے جانے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔" راحیلہ نے جواب دیا۔

"وہ کیوں؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"کیونکہ وہ ہمارے ملک میں دُہری زندگی گزار رہا تھا۔ ایک نہایت طاقتور مغربی ملک جس کی ہم پر "نوازشات" کچھ زیادہ ہی ہیں اور برسوں سے جس سے ہمارا ایک "تعلقِ خاص" چلا آرہا ہے۔ ایڈی ہمارے ہاں اس کا قونصل جنرل تھا لیکن اپنی شکل صورت میں تھوڑی سی تبدیلیوں کے ساتھ وہ ریڈ ڈاٹ کے خاص آدمی کا کردار بھی ادا کررہا تھا۔ اس نے اپنے ملک پر آنچ نہیں آنے دی۔ زندہ ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔"

پھر راحیلہ خود ہی طنزیہ لہجے میں بولی "حالانکہ وہ زندہ بھی ہمارے ہاتھ آجاتا تو ہم اس کا یا اس کے ملک کا کیا بگاڑ لیتے؟ ہمیں ایک جھرجھری پڑتی یا ایک دھمکی ملتی اور ہم فوراً دوبارہ ریت میں سر گھسا کر بیٹھ جاتے۔"

میں نے نفیس صاحب کی طرف دیکھا۔ انہوں نے نظر چُرالی اور اپنی جیب سے ایک اور بیڑی نکال کر پُرخیال انداز میں اسے تکنے لگے۔

"شاید ایسے اور بھی کئی لوگ ہوں جو بظاہر اپنے ملکوں کے لیے یہاں سفارتی خدمات انجام دے رہے ہوں لیکن درحقیقت وہ ریڈ ڈاٹ کے ایجنٹ ہوں؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"بعض لوگوں کے بارے میں ہمیں یہی شبہ ہوا ہے لیکن وہ نہ تو زندہ حالت میں ہمارے ہاتھ لگ سکے اور نہ ہی ان کی لاشیں صحیح سلامت رہیں۔ وہ قطعی طور پر ناقابلِ شناخت ہوگئے تھے۔" راحیلہ نے جواب دیا۔

"کیا ہمارے پاس کوئی طریقہ نہیں کہ ہم ان ملکوں سے احتجاج کرسکیں؟" میں نے دل کے کسی گوشے میں بے بسی کا درد محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"کریں گے' کچھ نہ کچھ کریں گے۔ ہم کوشش کررہے ہیں کہ آپریشن کا بقیہ حصہ کچھ ایسے انداز میں مکمل کرسکیں کہ ہمارے پاس سفید فام قوموں کے سامنے احتجاج کرنے کے لیے بنیاد تیار ہوسکے۔" نفیس صاحب نے گویا مجھے تسلی دی۔

"احتجاج کرنے سے پہلے ہمیں احتجاج کے خوف ناک نتائج بھگتنے کے لیے بھی تیار رہنا ہوگا۔" راحیلہ زہریلے لہجے میں بولی "جرم ضعیفی بھی کیا جرم ہے!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔

نفیس صاحب گویا موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے

اسلحہ رائی ایم اے قیمت -/150

طنز و مزاح

انگور کھٹے ہیں	اعتبار ساجد	100/-
غالب کی آبرو	اعتبار ساجد	80/-
ایمرجنسی وارڈ	اعتبار ساجد	80/-
مُنہ شگافیاں	اعتبار ساجد	75/-
جابیل اسے مار	اعتبار ساجد	75/-
اِس طرح تو ہوتا ہے	اعتبار ساجد	80/-
غالب ہمیں بھی چھیڑ	اعتبار ساجد	100/-

مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2

بولے "تم یہ تصویریں لفافے میں ڈال لو اور بہت احتیاط سے لے کر جانا۔ سیکرٹ سروس والے ان کی کاپیاں کرنے کا کوئی طریقہ نکالیں گے اور وہ کاپیاں کئی شہروں میں ہماری مختلف خفیہ ایجنسیوں کو بھیجی جائیں گی۔"

راحیلہ نے تصویریں لفافے میں ڈال لیں اور جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے بڑا سا سیاہ چشمہ لگانے کے بعد نقاب اس طرح چہرے پر لپیٹا کہ چہرہ پورا چھُپ کر رہ گیا۔ اب وہ بہت سخت پردہ نشین قسم کی خاتون دکھائی دینے لگی تھی۔ بعض خواتین اسی حلیے میں ڈرائیونگ بھی کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ ہر حال میں سختی سے پردے کی پابندی کرتی تھیں اور اس میں فرق نہیں آنے دیتی تھیں لیکن راحیلہ کے بارے میں شاید کسی کو گماں بھی نہ گزرتا کہ اس کے اس طرح نظر آنے کی وجہ کچھ اور تھی۔

میں نے بھی اُٹھتے ہوئے کہا "میں راحیلہ کے ساتھ جاؤں گا۔ مجھے اس سے بہت سی ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

راحیلہ کچھ نہ بولی۔ نفیس صاحب متذبذب دکھائی دینے لگے لیکن ایک لمحے بعد گویا فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولے "ٹھیک ہے... فی الحال چلے جاؤ لیکن کل یہاں واپس پہنچ جانا اور یہیں رہنے کی تیاری کرکے آنا۔ خانہ بدوشوں والے حلیے میں ہی آنا۔ یہ بہروپ دھارنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ راحیلہ سب بندوبست کردے گی۔"

"آپ پرانے اسکول آف تھاٹ کے نمائندے معلوم ہوتے ہیں۔ بھیس بدل کر اپنی کارروائیاں کرتے ہیں۔ مجھے ترکی میں بھی ایک ایسے کردار سے واسطہ پڑا تھا جو ہر پل ایک نیا بھیس بدلتا تھا حالانکہ سُنا ہے وہ دورِ جدید کا کوئی بہت اونچے درجے کا قاتل تھا۔" میں نے اپنا کیمرا گلے میں لٹکاتے ہوئے کہا۔

"کس کی بات کررہے ہو؟" نفیس صاحب کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک نمودار ہوئی۔

"میری معلومات کے مطابق اس کا نام حمان تھا۔ معلوم نہیں اصلی ہے یا فرضی۔ سُنا ہے وہ سربراہانِ مملکت اور تقریباً اسی درجے کی دوسری شخصیتوں کو قتل کرتا ہے۔" میں نے بے دلی سے بتایا۔

"اوہ..... حمان!" نفیس صاحب کی آنکھیں ذرا پھیل گئیں "تمہیں اس سے واسطہ پڑا تھا؟" انہیں گویا یقین نہیں آرہا تھا۔

"جی ہاں' اسے لیڈی ڈائنا کے دورۂ ترکی کے موقع پر اس کے قتل کا کنٹریکٹ ملا تھا۔ مجھے ایک ایسی برطانوی شخصیت کی رفاقت میسر آگئی تھی جس کی وجہ سے مجھے اس معاملے میں ٹانگ اڑانا پڑی اور حمان کنٹریکٹ پورا نہیں کرسکا۔ وہ مجھ سے بہت خفا تھا۔ اس نے بعد میں چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر دو مرتبہ مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ قسمت ہی اچھی تھی کہ بچ کر آگیا ہوں لیکن کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟"

نفیس صاحب گویا کسی خیال سے چونکتے ہوئے بولے "ظاہر ہے ذاتی طور پر تو نہیں جانتا لیکن ملک کی ایک سب سے بڑی خفیہ ایجنسی کے سربراہ کی حیثیت سے میرے لیے اس کے بارے میں باخبر رہنا ضروری ہے۔ ہمارے پاس اس کے بارے میں ایک مختصر سی فائل موجود ہے لیکن مجھے یقین نہیں آرہا کہ تمہیں اس سے واسطہ پڑا اور تم اس سے بچ کر آگئے۔"

انہوں نے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا اور کچھ رشک آمیز سے لہجے میں بولے "تم واقعی ایک خوش قسمت انسان ہو افضل چوہدری!"

نقاب پوش راحیلہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر بولی "صرف خوش قسمت نہیں' بے پناہ باصلاحیت بھی! آپ کو ابھی افضل چوہدری کی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں ہے مسٹر نفیس!"

"مجھے اندازہ ہوچکا ہے۔" نفیس صاحب سرہلا کر بولے "بہت اچھی طرح اندازہ ہوچکا ہے۔ جس کے ساتھی اتنے باصلاحیت ہیں وہ خود....." انہوں نے مسکرا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا پھر میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولے "ویسے تم خود بھی تو پرانے اسکول آف تھاٹ کے آدمی ہو۔ اس وقت بھی تم ہلکے پھلکے بہروپ میں ہو۔"

"جی ہاں' میں بھی پُرانے اسکول آف تھاٹ سے ہی وابستہ رہنا پسند کرتا ہوں۔ اکثر معاملات میں۔" میں نے تسلیم کیا "بہروپ بازی کا سہارا تو میں ایک عرصے سے لیتا آرہا ہوں۔ پُرانے طور طریقے میرے لیے ہمیشہ کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔"

"کل بھی ذرا عمدہ طریقے سے بہروپ بدل کر آنا پھر ذرا آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ آئندہ کے لائحۂ عمل میں تمہارے مشورے بھی شامل ہونے چاہئیں۔" نفیس صاحب بولے "کل یہاں تمہاری چند دوسرے ساتھیوں سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔ اس وقت وہ کچھ دوسری جگہوں پر مختلف ڈیوٹیاں سنبھالے ہوئے ہیں۔"

میں انہیں خدا حافظ کہہ کر راحیلہ کے ساتھ باہر آیا تو میں نے دیکھا' لکڑی کے تخت پر ایک شخص سفید اوورآل پہنے اور اسٹیتھسکوپ گلے میں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کے پاس سیاہ رنگ کا میڈیکل بیگ بھی تھا جس پر سفید دائرے میں سُرخ ہلال بنا ہوا تھا۔ وہ اپنا میڈیکل بیگ اُٹھا کر مؤدبانہ انداز میں راحیلہ کے پیچھے پیچھے آنے لگا۔

ہم بستی سے باہر آئے تو میں نے دیکھا' سڑک کے کنارے ایک سفید ویگن کھڑی تھی جس پر سرکاری سرپرستی میں چلنے والی فلاحی تنظیم کا نشان بنا ہوا تھا جو مختلف مواقعوں پر طبّی امداد فراہم کرتی تھی۔ جلی حروف میں تنظیم کا نام بھی لکھا ہوا تھا اور اس سے بھی زیادہ جلی حروف میں "گشتی شفاخانہ" لکھا دکھائی دے رہا تھا۔ اس قسم کی گاڑیاں غریب بستیوں میں طبّی امداد فراہم کرنے جاتی رہتی تھیں۔

راحیلہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔ جس شخص نے میڈیکل بیگ اُٹھایا ہوا تھا وہ گاڑی کے پچھلے حصے میں آبیٹھا۔ اس حصے میں دوسرا طبّی ساز و سامان بھی رکھا دکھائی دے رہا تھا۔

راحیلہ تصویروں کا جو لفافہ نفیس صاحب سے لے کر آئی تھی وہ سیٹوں کے درمیان سے اس شخص کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی "یہ لودھی صاحب کو پہنچا دینا۔"

میں نے مڑ کر اس شخص کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ گول مٹول سا تھا اور ناک پر موٹے شیشوں کی عینک ٹکی ہوئی تھی۔ وہ بالکل ہونق نظر آرہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنا ایک مہرباں وسیم احمد یاد آگیا۔ وہ بھی کچھ ایسی ہی شخصیت اور ایسے ہی چہرے مہرے کا مالک تھا لیکن وہ نوجوان اور ذرا ہلکے جسم کا تھا جبکہ یہ شخص پختہ عمر کا تھا۔

اس نے لفافہ لے کر اپنا میڈیکل بیگ کھولا اور اسے اس میں رکھ لیا۔ میں نے دیکھا' اس کے میڈیکل بیگ میں طبّی امداد کا

سامان تو برائے نام ہی تھا' زیادہ جگہ چھوٹی نالی والی مگر خوف ناک سی ایک گن نے گھیری ہوئی تھی۔ ایک خانے میں چھوٹا سا ایک پسٹل بھی رکھا نظر آرہا تھا۔ لفافہ رکھتے ہی اس نے جلدی سے میڈیکل بیگ بند کرلیا۔

میں نے دوبارہ ذرا غور سے اس شخص کی طرف دیکھا تو وہ مجھے پہلے جیسا ہونق دکھائی نہیں دیا۔ یوں لگا جیسے اس کے بارے میں میرا یہ تاثر محض نظر کا دھوکا تھا۔ راحیلہ نے ویگن اسٹارٹ کی اور اسے سڑک پر یوٹرن دے لیا۔ گاڑی کے شیشے بند تھے۔ باہر سے بہ آسانی اندر نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

"ہم کہاں جارہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کاش ہمیں معلوم ہوتا!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اس دنیا میں ان گنت لوگ زندگی کے سفر پر نکلے ہوئے ہیں لیکن بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ وہ کہاں جارہے ہیں۔"

میں نے اسے ٹھوکرا تو وہ معصومانہ لہجے میں بولی "کیسا ڈائیلاگ تھا؟ تم نے داد نہیں دی' کیا بالکل ہی بدذوق ہو کر واپس آئے ہو؟"

اس کے لہجے میں وہی پہلے والی راحیلہ بول رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ چہرے کی بربادی سے اس کے مزاج میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ شگفتگی' وہ معصومیت کی تہ میں چھپا ہوا چلبلا پن برقرار تھا جبکہ اسے دیکھنے کے بعد سے میرے پہلو میں خلش کا خنجر سا پیوست تھا۔

"میں نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔"

"میں نے بھی کوئی مزاحیہ جواب تو نہیں دیا۔" وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے بولی۔ اب سڑک پر خاصا ٹریفک نظر آنے لگا تھا۔ گاڑی میں ایک لمحے سکوت رہا۔ میں گردن گھما کر پیچھے دیکھنے لگا۔ مجھے یہی اندازہ ہوا کہ کوئی گاڑی ہمارے تعاقب میں نہیں تھی۔

راحیلہ اس وقت میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی لیکن پھر بھی گویا میری حرکات و سکنات پر اس کی نظر تھی اور وہ میرا مقصد بھی سمجھ رہی تھی۔ وہ اطمینان سے بولی "میرا خیال ہے کوئی ہمارا تعاقب نہیں کررہا۔ ایسا لگتا ہے جیسے آج کل ریڈ ڈاٹ نے ہمیں ہر کام کرنے کے لیے بالکل آزاد چھوڑا ہوا ہے۔ نہ تعاقب' نہ مار دھاڑ' نہ ٹکراؤ۔ آج کل کچھ بھی نہیں ہورہا۔ کوئی مشکوک یا شناسا شکل بھی نظر نہیں آرہی۔ زندگی بہت پھیکی پھیکی سی ہوگئی ہے۔"

وہ بظاہر بالکل بے پروائی سے اتنی بڑی گاڑی کو کھلونے کی طرح ہینڈل کررہی تھی لیکن اس بے پروائی میں بھی بلا کی مشاقی تھی۔ مجھے برسوں پہلے کی وہ راحیلہ یاد آرہی تھی جس سے کراچی میں میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ جو اس وقت یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ جس کے ساتھ میں ایک پُرانی سی اسٹیشن ویگن میں پکنک منانے ہاکس بے گیا تھا۔ ان برسوں میں حالات کیا سے کیا ہوگئے تھے لیکن اس کی شخصیت' اس کا لب و لہجہ آج بھی وہی تھا۔ صرف اس چاند چہرے کو گرہن لگ گیا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "بلکہ اب تو اس سکوت سے مجھے وحشت ہونے لگی ہے۔ ریڈ ڈاٹ کی طرف سے یہ خاموشی مجھے کسی طوفان کا پیش خیمہ لگتی ہے۔ یہ سکون مجھے مشکوک لگنے لگا ہے۔"

میں خاموش رہا تو وہ بولی "ارے اتنے خاموش کیوں ہو؟ ناراض ہوگئے کیا؟ بھئی تمہارا سوال اتنا اہم تو نہیں تھا۔ کوئی زمانہ تھا کہ میرے ساتھ جاتے وقت تم ہالکل نہیں پوچھتے تھے کہ ہم کہاں جارہے ہیں۔ اہم بات صرف یہ ہوتی تھی کہ ہم ایک ساتھ جارہے ہوتے تھے۔ وقت وقت کی بات ہے!" اس نے بڑی کوشش سے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"بکواس مت کرو۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

وہ دھیرے سے ہنسی اور بولی "ناراض مت ہو... اور کسی غمزدہ پہاڑی بکرے کی طرح منہ مت لٹکاؤ۔ چلو میں تمہیں بتادیتی ہوں۔ اس وقت ہم ہنی کے پاس جارہے ہیں۔ آج کل میرا زیادہ وقت اُداسی میں گزرتا ہے۔ اسی لیے آج جب باہر نکلنے کا موقع ملا تھا اور پھر یہ خوشی بھی ملی تھی کہ تم سے ملاقات ہوگئی تو میں ذرا دل کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کررہی تھی۔"

"ہنی کو کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"خود چل کر دیکھ لینا۔" وہ ملائمت سے بولی "شاید یہ اس کی کسی خاموش دعا کا نتیجہ ہے کہ تم یوں اچانک غیر متوقع طور پر واپس آگئے ہو۔ ایک بار اس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں تم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔"

ایک عجیب سے احساس سے میری دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ اس کے بارے میں بھی یقیناً کوئی اچھی خبر میری منتظر نہیں تھی۔ اس سے میرا کوئی ایسا خاص تعلقِ خاطر تو نہیں تھا کہ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں مجھے یاد کرتی۔ اس کے آئینۂ دل میں تو کسی اور کی تصویر تھی۔ وہ کوئی الیکٹرانک انجینئر تھا جسے ریڈ ڈاٹ نے ذہنی و جسمانی طور پر اس طرح اپنا غلام بنالیا تھا کہ وہ ہنی کو پہچانتا بھی نہیں تھا لیکن ہنی کے دل میں اس اُمید کی شمع روشن تھی کہ ایک روز وہ اس کی طرف واپس آئے گا۔ اسے اپنا ماضی یاد آجائے گا۔

"ہنی کے دل میں شاید میرے لیے عقیدت یا اس سے ملتا جلتا کوئی جذبہ موجود ہے اور مجھے اس کی وجہ بھی معلوم نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔" راحیلہ بولی اور شاید وہ پسِ نقاب مسکرائی تھی "اگر وہ تمہارے عشق میں بھی گرفتار ہوتی تب بھی مجھے نہ تو کوئی حیرت ہوتی اور نہ ہی کوئی شکایت۔ میرا تم پر کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔"

"یہی تو زندگی کا سب سے بڑا دکھ ہے کہ تمہارا مجھ پر کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کاش

کوئی دعویٰ ہوتا۔ میں کسی لڑکی کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا تو تم میرے بال نوچنے کی دھمکی دیتیں۔ کوئی لڑکی والہانہ انداز میں میرا ذکر کرتی تو تم اس کا منہ نوچنے کے بارے میں غور کرتیں۔ کاش اس قسم کی کوئی بات ہوتی۔ تمہاری یہ لاتعلقی میری زندگی کا سب سے بڑا روگ ہے۔"

"لاتعلقی تو نہیں ہے۔" وہ نیچی آواز میں بولی "تعلق تو بہت گہرا ہے۔" اس کے اور میرے سر کے درمیان محض چند انچ کا فاصلہ تھا لیکن ان سروں میں پلتی ہوئی سوچیں ایک لامتناہی خلیج کے دو کناروں کی طرح تھیں جو کبھی آپس میں نہیں مل سکتے تھے۔

"ہاں شاید تعلق تو بہت گہرا ہے لیکن اس کا کوئی عنوان نہیں ہے۔" میں نے کچھ اور آہستگی سے کہا۔ ویگن کے پچھلے حصے میں بیٹھا ہوا شخص ہماری گفتگو نہیں سُن سکتا تھا۔

وہ مجھ سے بھی زیادہ دھیمے لہجے میں بولی "وہ شعر سُنا ہے تم نے.....؟

عشق کا ایک ہی عنواں ہو ضروری تو نہیں
ہر کوئی چاک گریباں ہو ضروری تو نہیں"

میں نے سڑک کو گھورتے ہوئے کہا "کاش زندگی صرف شعروں سے بدل سکتی..... بدل سکتی۔"

"تمہاری سوچ میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا؟" اس نے قدرے حیرت سے پوچھا "کیا اب بھی تم موقع ملتے ہی مجھ سے شادی کی فرمائش.... اور پھر اس کی تکرار کرنے لگو گے؟"

"ظاہر ہے" میں نے بلا تامل کہا "اب ایسا کیا ہو گیا ہے جو میرے خیالات تبدیل ہو جاتے؟"

وہ گیئر بدلتے ہوئے کچھ اور دھیمے لہجے میں بولی "شاید تم بھول گئے ہو کہ نقاب اور سیاہ چشمے کی آڑ میں چھپا ہوا یہ چہرہ آدھا سیاہ ہے۔ یہ ایک مضحکہ خیز تصویر ہے۔ میں تو اب چلتا پھرتا "بلیک اینڈ وہائٹ" تماشا ہوں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ چاند کو گرہن لگنے سے اس کی قدر و قیمت کم تو نہیں ہو جاتی۔" میں نے کہا۔

"یہ ایسا گرہن ہے جو شاید کبھی دور نہ ہو سکے۔" اس نے گویا مجھے خبردار کیا۔

"کوئی بات نہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے بدستور بے پروائی سے کہا۔ تب اس نے ایک ثانیے کے لیے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس وقت اس کے چہرے پر کیا تاثرات تھے یا اس کی آنکھیں کیا کہہ رہی تھیں لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس کے بعد ایک لمحے تک وہ بالکل خاموش رہی۔

پھر انجن کی سرسراہٹ کے درمیان اس کی سرگوشی مجھ تک پہنچی "کیا اس مضحکہ خیزی کے ساتھ تم زندگی گزار لو گے؟" اس کی آنکھیں اب بدستور چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہارے ساتھ میں ہر طرح سے زندگی گزار لوں گا۔ میرے جذبے کو لفظوں اور وعدوں کی سولی پر چڑھا چڑھا کر مت پرکھو۔" میں نے کرب کی ایک خفیف سی لہر محسوس کرتے ہوئے کہا "اگر تمہارا جواب ہاں میں ہے تو بے شک ابھی گاڑی کا رُخ کسی نکاح خواں کے گھر کی طرف موڑ لو۔ تم کیا سمجھتی ہو میں زندگی کے ان نازک معاملات میں مذاق کرتا ہوں؟"

"تم بہت ہی ضدی آدمی ہو۔" اس نے بے آواز سی ہنسی میں بات اُڑانے کی کوشش کی "مجھے زچ مت کیا کرو۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کی کتاب میں سے شادی کا ورق پھاڑ دیا ہے۔"

"اس بات پر میرا دل چاہتا ہے میں تمہارا سر پھاڑ دوں۔" میں نے دانت پیس کر کہا "اب بھی وقت ہے۔ میری بات پر غور کرو اور گاڑی روک کر کسی راہ گیر سے پوچھ لو' قریب ترین مسجد کہاں ہے۔ شاید اس کے امام صاحب نکاح رجسٹرار بھی ہوں۔ ہنی کے پاس ہم نو بیاہتا میاں بیوی کی حیثیت سے پہنچیں۔"

"بکواس مت کرو۔ میرے برقعے کے اندر دو جیبیں ہیں اور ان دونوں میں ٹی ٹی موجود ہیں۔ مجھے اتنا تنگ مت کرو کہ میں تمہاری اس بغیر بھیجے والی کھوپڑی میں چند گولیاں اُتار دوں۔" اس نے مجھے ڈانٹا۔

"چلو یہی کر گزرو۔" میں نے ٹانگیں پسارتے ہوئے کہا "کچھ تو کرو۔ بات کو کسی کنارے تو لگاؤ۔ کہانی کو کسی انجام تک تو پہنچاؤ۔ آخر یہ بے ہنگم کہانی کب تک اپنے انجام کی تلاش میں بھٹکتی رہے گی۔"

"موت ہر کہانی کا انجام ہے۔ موت آئے گی تو خود بخود ساری کہانیاں ختم ہو جائیں گی اور ہماری زندگی کچھ ایسی ڈگر پر ہے جہاں قدم قدم پر موت کھڑی ہے۔"

"اسی لیے تو میں زیادہ اصرار کرتا ہوں۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ آخر ہمیں ایسی کیا مجبوری ہے جو ہم یہ حسرت لے کر اس دنیا سے رخصت ہوں؟" میں نے جلدی سے کہا۔

"جبکہ میں تمہیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں کہ ایسی زندگی میں کوئی حسرت پالنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"ہاں واقعی' کسی بھی بات کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ بس پاگل کتے کی طرح اِدھر اُدھر دوڑتے رہو۔ آخر کار ایک دن کسی کے ہاتھوں گولی کھا کر پٹ سے گر کر مر جاؤ۔ بس یہی کُل زندگی ہے۔ یہ دنیا کے ننانوے فیصد لوگ تو پاگل ہیں جو محبت کرتے ہیں۔ شادی کرتے ہیں گھر بساتے ہیں۔"

"اور پھر سر پہ ہاتھ رکھ کے روتے ہیں۔" راحیلہ نے فقرا لگایا پھر ایک لمحے کے توقف سے بولی "ہاں..... میری نظر میں وہ ایسے لوگ نہیں جن کی تقلید کی جائے۔ ویسے میں تمہارے حوصلے کی واقعی داد دیتی ہوں کہ تم ایک مضحکہ خیز چہرے والی عورت سے شادی کے لیے تیار ہو۔"

"مجھے تمہاری داد کی نہیں تمہاری "ہاں" کی ضرورت تھی۔" میں نے تاسف سے کہا۔

"وہ تم کبھی نہیں سن سکو گے۔ میں تمہیں پہلے بھی مشورہ دے چکی ہوں۔ اپنے لیے کوئی ڈھنگ کی لڑکی تلاش کرو اور اپنی زندگی کی یہ کمی بھی پوری کر ہی ڈالو جس نے تمہیں پریشان کر رکھا ہے۔" پھر وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی "اس موضوع پر اب مزید بات نہیں ہو گی۔ ہم اپنی منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔"

میں نے ایک طویل سانس لے کر سیٹ سے ٹیک لگا لیا۔ تبدیلی اس کے چہرے میں آئی تھی۔ اس کے خیالات اور نظریات میں نہیں۔ بلکہ اس کی ضد شاید اپنی جگہ کچھ اور پکی ہو گئی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ خیال شاید کچھ اور مضبوط ہو گیا تھا کہ اب میں تو کیا کوئی اور بھی اگر اس سے شادی کرے گا تو اس پر ترس کھا کر کرے گا اور یہ بات اس کی اونچی انا کو منظور نہیں تھی۔ یہ خیال جب مبہم سے انداز میں اس کے ذہن میں موجود تھا' میں تب بھی اسے نہیں نکال سکا تھا۔ اب اگر یہ خیال اور بھی مضبوط ہو گیا تھا تو مجھے غالباً اس کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دینا چاہیے تھا۔

چند لمحے بعد گاڑی ایک ذیلی سڑک پر مڑی جس پر دونوں طرف پھولدار پودوں سے آراستہ کیاریاں موجود تھیں۔ اس کے گیٹ پر پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک مخصوص سرکاری اسپتال تھا۔ اس کے اندر بھی سرسبز درخت' پھول اور سبزہ اس طرح پھیلا ہوا تھا کہ مریض کی آدھی بیماری تو اس ماحول میں کچھ دیر سانس لینے سے ہی ختم ہو سکتی تھی۔

راحیلہ نے ویگن ایک مخصوص پارکنگ لاٹ میں لے جا روکی اور اسے اسٹارٹ ہی چھوڑ کر اُتر گئی۔ مجھے بھی اس نے اُترنے کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر کے سے حلیے والا وہ شخص جو معلوم نہیں ڈاکٹر تھا یا نہیں' آگے آ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ راحیلہ اس سے مخاطب ہوئی "تم گاڑی جلدی واپس لے آنا اور اسی پارکنگ لاٹ میں عین اسی جگہ پر چھوڑ دینا' چابیاں اندر ہی چھوڑ دینا اور اگر تمہیں مجھ سے کوئی کام نہ ہو تو پھر مجھ سے ملنے کی ضرورت نہیں۔"

اس شخص نے اثبات میں سر ہلایا لیکن اس کا چوبدستور پتھرایا ہوا سا رہا۔ اپنا میڈیکل بیگ اس نے برابر کی سیٹ پر رکھ لیا تھا۔ وہ گاڑی ریورس کر کے نہ جانے کہاں روانہ ہو گیا۔ میں راحیلہ کی رہنمائی میں آگے چل دیا۔

عمارتوں کے کئی بلاک سے گزرنے کے بعد ہم ایک بلاک میں داخل ہوئے۔ اس کی پیشانی پر جلی سرخ حروف میں انگریزی میں "انتہائی نگہداشت کا وارڈ" لکھا نظر آ رہا تھا۔ سامنے ہی سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں لیکن ان کے قریب ایک چاق و چوبند باوردی اہلکار گن لیے کھڑا تھا۔ راحیلہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شناسائی کا تاثر اُبھرا۔ غالباً اس کے مخصوص حلیے کی وجہ سے وہ اسے پہچانتا تھا۔

اس کے باوجود راحیلہ نے اس کے قریب سے گزرتے وقت ایک کمپیوٹرائزڈ سا کارڈ نکال کر اسے دکھایا کیونکہ راحیلہ کا حلیہ ہی میرے خیال میں اسے مشکوک بناتا تھا۔ اس حلیے میں کوئی بھی عورت بلکہ ذرا کمتر قد کاٹھ کا کوئی مرد بھی وہاں داخل ہو سکتا تھا۔

باوردی شخص نے بڑے غور سے کارڈ چیک کیا حتیٰ کہ اس کے اُبھرے ہوئے حروف پر نہ جانے کیوں انگلی بھی پھیر کر دیکھی پھر مطمئن انداز میں سر ہلا کر کارڈ واپس کرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"یہ میرے ساتھ ہیں اور مجھ سے بھی زیادہ خاص آدمی ہیں۔" راحیلہ بولی۔ یہ کہتے ہوئے شاید وہ پسِ نقاب مسکرائی بھی تھی پھر وہ مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

پہلی منزل پر شیشے کا ایک اور دروازہ ہماری راہ میں حائل تھا اس دروازے پر کسی چھوٹے موٹے اہلکار کے بجائے ایک مسلح آفیسر تعینات تھا۔ اس نے بھی راحیلہ کا کارڈ دیکھا۔ میرے بارے میں یہاں بھی راحیلہ نے وہی جملہ دُہرایا جو وہ نیچے بھی بول چکی تھی۔ آفیسر نے خاموشی سے اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔

اندر بائیں ہاتھ پر چھوٹا سا ایک آفس نما کمرا تھا جس کی آدھی دیواریں شیشے کی تھیں۔ اس میں ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ ایک روشن اسکرین پر کوئی ایکسرے لگائے غور سے دیکھ رہے تھے۔

دائیں ہاتھ پر راہداری میں شیشے کے تین کیبن سے نظر آ رہے تھے۔ ان تینوں میں مریض لیٹے نظر آ رہے تھے۔ تینوں کے جسم سینے تک سفید چادر سے ڈھکے نظر آ رہے تھے۔ پاس رکھی مختلف مشینوں کی نالیاں ان کے جسموں سے منسلک تھیں۔

راحیلہ آخری کیبن کے دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔ وہاں ہر طرف دیواروں پر انگریزی میں مختلف ہدایات آویزاں تھیں۔ تھوکیے مت..... شور مت کیجیے..... کسی چیز کو ہاتھ مت لگائیے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہاں روشنی بھی کم ہی تھی۔

"کیا یہ قرنطینہ ہے؟" میں نے شیشے کے کیبن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں" راحیلہ نے نفی میں سر ہلایا "یہ آئی سی یو کے عام کمرے ہیں۔" اس کی آواز بھی سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

اسی اثنا میں نہ جانے کس طرف سے ایک نرس لپک کر ہمارے قریب آئی لیکن اس نے ہمیں روکنے یا ہدایات دینے کے بجائے مؤدبانہ انداز میں سلام کیا اور سرگوشی میں بولی "میڈم! مریضہ کی حالت اب کچھ بہتر ہے۔ آپ اس سے بات کرنا چاہیں گی؟ اس وقت اس کا آکسیجن ماسک بھی اُترا ہوا ہے اور ٹریکولائزر کا اثر کم ہونے کے باوجود وہ زیادہ تکلیف میں نہیں

ہے۔"

"یہ تو تم نے بڑی خوشی کی خبر سنائی ماریا!" راحیلہ سرگوشی میں بولی "میری تو کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے تو کبھی کبھار اس کی دو چار سرگوشیاں سننے کا موقع ملتا رہتا ہے لیکن یہ صاحب جو میرے ساتھ آئے ہیں' یہ اگر اس سے دو چار باتیں کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو بہت اچھا ہو گا۔ اس کی دماغی حالت کیسی ہے؟"

"کسی حد تک ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے۔ کم از کم اسے یہ یاد ہے کہ وہ اسپتال میں ہے اور اس نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ آپ اس کے پاس نہیں ہیں۔ اس نے آپ کے بارے میں پوچھا تھا۔" نرس نے جواب دیا۔

راحیلہ نے طمانیت سے سر ہلایا۔ نرس نے نہایت آہستگی سے کھٹکے دار دروازہ کھولا۔ میں نے راحیلہ کی تقلید میں جوتے باہر ہی اُتار دیے اور ننگے پاؤں شیشے کے کمرے میں داخل ہوا... اس کا فرش اتنا صاف تھا کہ اس پر بغیر جوتے کے بھی پاؤں رکھنا بُرا محسوس ہو رہا تھا۔

ہم دبے پاؤں سفید آہنی بیڈ کے قریب پہنچے۔ ہنی کا صرف چہرہ اور ایک ہاتھ سفید چادر سے باہر تھا۔ ہاتھ میں ڈرپ کی سوئی لگی ہوئی تھی۔ اس ہاتھ اور چہرے کو دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آئی۔ ہاتھ کیا تھا گویا کسی بڑے پرندے کا ٹیڑھا میڑھا سا پنجا تھا۔ جس میں چند مُڑی تڑی ہڈیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چہرہ گویا کئی دن پرانی کسی لاش کا تھا جسے قبر سے نکال کر صاف کر کے پلنگ پر لٹا دیا گیا تھا۔

مجھے ہنی کی صورت اچھی طرح یاد تھی۔ وہ گوری چٹی یا بہت زیادہ خوب صورت لڑکی تو نہیں تھی لیکن اس کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی۔ اس کی رنگت گندمی اور نقوش دلکش تھے لیکن اس وقت اس کا چہرہ محض چند اُبھری ہوئی ہڈیوں کا مجموعہ نظر آ رہا تھا جس پر کھال کی جگہ نیلے سے رنگ کی ایک جھلی چڑھی ہوئی تھی۔

میں نے جھک کر بہت قریب سے اسے دیکھا اور بڑی مشکل سے پہچانا۔ اس کے وجود کے کھنڈر میں شاید کہیں شناسائی کے کچھ موتی دفن تھے۔ میرے دل پر ایک اور چرکا لگا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا یہ وہی ہنی تھی جسے میں جانتا تھا۔

راحیلہ اس کے قریب کاؤچ پر بیٹھ گئی اور نہایت آہستگی سے اس کے بالوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی میں بولی "ہنی! میری جان' ذرا آنکھیں تو کھولو اور دیکھو کون آیا ہے۔" اس کے لہجے میں اس ماں کی سی ملائمت تھی جو اپنے برسوں کے بیمار بچے کو جگانے لگی ہو۔ ہنی نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اگر اس کے جسم پر ڈھکی ہوئی چادر میں نہایت خفیف سا زیر و بم نہ ہوتا تو یہ یقین کرنا بھی مشکل ہوتا کہ وہ زندہ تھی۔

ایک لمحے کے انتظار کے بعد راحیلہ آہستگی سے اس کا سر سہلاتے ہوئے بولی "ہنی! ذرا دیکھو تو افضل چوہدری آیا ہے۔ تم ایک بار اسے پوچھ رہی تھیں نا۔"

تب نہایت آہستگی سے جسم کے اس کھنڈر میں آنکھوں کے دریچے کھلے اور میرے دل پہ لگے ہوئے نئے چرکے کی اذیت کچھ اور بڑھ گئی۔ ان آنکھوں میں کوئی ویرانی سی ویرانی تھی! میں ایک بار پھر اس پر جُھکا تو اس نے آہستگی سے دو تین مرتبہ پلکیں جھپکائیں۔ یہ خفیف سی حرکت زندگی کی علامت تھی پھر اس کی آنکھوں میں بھی زندگی کی رمق نظر آئی۔ شاید اب اسے میرا چہرہ صاف نظر آیا تھا۔

اس کے ہونٹوں میں ہلکی سی حرکت ہوئی۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بیڈ کے ایک طرف راحیلہ تھی۔ میں دوسری طرف بیٹھ گیا۔ اس کا لرزتا ہوا استخوانی سا دوسرا ہاتھ چادر کے نیچے سے باہر رینگ آیا۔ میں نے اسے تھام لیا۔ وہ گویا کسی مُردے کا ہاتھ تھا مگر بعض مُردے زندوں سے زیادہ زندگی کی علامت ہوتے ہیں اور بعض زندہ لوگ زندگی پر محض ایک تہمت ہی ہوتے ہیں۔ دیکھنے کی بات یہی ہوتی ہے کہ انسان کس طرح زندہ رہا اور اسے کس راہ میں موت آئی۔

اس کے ہونٹوں سے کچھ اس طرح آواز نکلی جیسے ان خزاں رسیدہ پتوں کے درمیان ہوا سرسرائی ہو جو ٹوٹ کر گرنے کے قریب ہوں "افضل! اچھا ہوا..... میرے مرنے سے پہلے تم آ گئے۔ شاید اسی لیے سانس جسم میں اٹکی ہوئی تھی۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ اتنا سا بولنا ہی گویا اس کے لیے ایک مشقت تھا۔ اس کی سانسیں کچھ تیز ہوتی محسوس ہوئیں اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر کچھ تکلیف کے سے آثار اُبھر آئے۔ راحیلہ جلدی سے بولی "ڈاکٹر یا نرس کو بُلاؤں؟" اس نے بیڈ کے پاس لگے ہوئے سرخ بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

ہنی نفی میں سر نہیں ہلا سکی کیونکہ اس کی گردن میں کالر تھا۔ معلوم نہیں اس کے لیے گردن ہلانا نقصان دہ تھا یا محض احتیاطاً یہ کالر پہنایا گیا تھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا التجا کی کہ اس کے لیے کسی کو نہ بلایا جائے۔ ایک لمحے بعد وہ سرگوشی میں بولی "ان ڈاکٹروں اور نرسوں وغیرہ نے تو مجھے زندہ رکھنے کی کوشش میں میری بچی کھچی زندگی اجیرن کر دی ہے۔"

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھیں سفید مصنوعی چھت کو تک رہی تھیں۔ چند لمحے کے سکوت کے بعد میں نے آہستگی سے اس کے کان کے قریب کہا "ہنی! تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھیں؟ کوئی خاص بات کرنا چاہتی تھیں؟"

"نہیں کوئی خاص بات تو نہیں تھی۔" اب اس کی سرگوشی آسانی سے سمجھ میں آ رہی تھی "میں بس یہ کہنا چاہتی تھی کہ میں نے تمہارے دوستوں نے اور دوسرے بہت سے لوگوں نے مل کر تمہارا کام کافی آسان کر دیا ہے۔ ریڈ ڈاٹ کی کمر ٹوٹ چکی ہے لیکن تم اس فتنے کو جڑ سے ضرور ختم کرنا ورنہ تم تو کیا اس ملک میں کوئی بھی سکھ سے نہیں رہ سکے گا۔ کسی کو معلوم نہیں ہے' کسی کو اندازہ نہیں ہے کہ یہ کیسا خوف ناک فتنہ ہے۔ یہ فتنہ میری ماں کو کھا گیا' میرے عدنان کو کھا گیا۔ مجھے کھا گیا اور نہ جانے کس کس کو کھا گیا۔ ان لوگوں کی صحیح تعداد کسی کو بھی معلوم نہیں جنہیں یہ اژدھا خاموشی سے کھا گیا۔ اس فتنے نے اس ملک کی بنیادوں میں بارود بچھا دیا ہے۔ تمہیں اس بارود کو بھی سمیٹنا ہے اور اس فتنے کا مکمل خاتمہ بھی کرنا ہے۔"

"تم اب اس حالت میں ان فکروں میں اپنے آپ کو اور اذیت مت دو۔" میں نے اپنی اذیت کو چھپاتے ہوئے اسے اذیت سے بچنے کی تلقین کی "تم یہ کام ہم پر چھوڑ دو۔ تمہیں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ اس حالت میں تمہیں آرام کی تلقین کرنا بڑی مضحکہ خیز سی بات ہے پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ تم اپنے ذہن کو کچھ آرام دینے کی کوشش کرو اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ تم کچھ مت سوچو۔" میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے اور کیا مشورہ دوں' کیا نصیحت کروں' اس کے لیے کیا کروں! میرا دل چاہ رہا تھا اسے بازوؤں پر اُٹھا کر ہوا میں اُڑتا ہوا پلک جھپکتے میں کسی ایسی جگہ لے جاؤں جہاں مجرے رونما ہوتے ہوں' جہاں بیماروں کو شفا ملتی ہو' لب گور انسانوں کو نئی زندگی ملتی ہو لیکن اسے ایسی کسی جگہ لے جانا میرے بس میں نہیں تھا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں پھر گویا بڑی مشکل سے انہیں کھولتے ہوئے بولی "میں نے تو خیران سے غداری کی تھی۔ میرا عدنان تو مکمل طور پر ان کا غلام بنا ہوا تھا۔ اسے انہوں نے صرف شک کی بنا پر میگنیٹرون شعاعوں سے جلا کر ہلاک کر دیا۔ بظاہر اس کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ وہ اسی طرح جیتا جاگتا دکھائی دے رہا تھا لیکن درحقیقت وہ کسی جانور کی طرح روسٹ ہو چکا تھا۔"

میں عدنان کو نہیں جانتا تھا لیکن ہنی نے ہی کافی عرصے پہلے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس کی لڑکپن کی محبت تھا۔ وہ بہت لائق الیکٹرانک انجینئر تھا۔ نہ جانے کب اور کس طرح ریڈ ڈاٹ کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ وہاں وہ ہنی کو بھی نہیں پہچانتا تھا' نہ جانے اس پر کیا گزری تھی لیکن ہنی اس معاملے میں افسانوی سی لڑکی تھی۔ وہ خواہ کیسے ہی ماحول میں رہی تھی اور زندگی میں کیسے ہی نشیب و فراز سے گزری تھی مگر اس شخص سے اس کا عشق ختم نہیں ہوا تھا۔ ناقابلِ یقین سی بات تھی کہ زندگی کا بیشتر حصہ طوائف نما ماحول میں گزارنے کے باوجود وہ ایسا افسانوی سا عشق کرنے کی اہل تھی۔ مجھے ان لوگوں پر رشک آتا تھا جن سے کوئی ایسا لازوال عشق کرتا تھا۔

میں نے اس کے سرد استخوانی ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے زندگی کی حرارت پہنچانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ہنی! میری دوست۔ میری محسن! تم اطمینان رکھو۔ اب ان سے حساب ہو گا اور ہر چیز کا حساب ہو گا۔"

"مجھے تمہاری زبان سے صرف یہی سننے کے لیے تمہارا انتظار تھا۔ اب میں سکون سے مر سکوں گی۔"

اس نے طمانیت بھرے انداز میں آنکھیں بند کر لیں لیکن اس کی طمانیت گویا راحیلہ کے لیے تشویش کا باعث تھی۔ وہ اس پر جھکتے ہوئے بے تابانہ سرگوشی میں بولی "ہنی ہنی!" لیکن ہنی نے نہ تو کوئی جواب دیا اور نہ ہی آنکھیں کھولیں۔ راحیلہ اس کی نبض دیکھنے لگی پھر اس نے شیشے کی دیواروں سے باہر کھڑی نرس کو اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے اندر آئی۔ اس نے ہنی کے جسم سے منسلک دو تین مشینوں کے ڈائلز پر لرزتی سوئیوں کو دیکھا اور جلدی سے اس کے منہ پر آکسیجن کا ماسک لگا دیا پھر اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں راحیلہ کو اشارہ کیا۔ راحیلہ مجھے ساتھ لے کر شیشے کے کیبن سے باہر آ گئی۔

پھر ہم آئی سی یو سے بھی باہر آ گئے اور ایک بالکونی میں جا کھڑے ہوئے۔ وہاں سے اسپتال کے ایک حصے کا سرسبز اور صاف ستھرا لان نظر آ رہا تھا۔ لان کے قریب ہی ایک وارڈ کے دروازے پر ایک ایمبولینس کھڑی تھی۔

چند لمحے کی بوجھل سی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "ہنی کا اس حالت کو پہنچنے کا اصل سبب کیا ہے؟"

"اس کے جسم میں چار گولیاں پیوست ہوئی تھیں۔" وہ افسردگی سے بولی "تین تو سرجری کے ذریعے نکال لی گئیں۔ چوتھی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں پیوست ہے۔ اس کی پوزیشن ایسی ہے کہ ماہر نیورو سرجنز کا خیال ہے' اسے چھیڑنے کی صورت میں فوری طور پر ہنی کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ باقی تینوں گولیاں نکالنے کے لیے ہنی کے جو آپریشن ہوئے' وہ بھی بہت ہی نازک قسم کے تھے۔ انہوں نے بھی اسے موت کے دہانے پر پہنچا دیا ہے۔ گولی کا زہر بھی اس کے جسم میں پھیل رہا ہے۔ کئی مرتبہ اس کا بلڈ ٹرانسفیوژن ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود انفیکشن نہیں رک رہا۔ اس کا ذہن بھی کبھی کبھی بالکل جواب دے جاتا ہے۔ وہ بالکل ہی کوئی بات نہیں کر سکتی یا پھر خواب کے سے عالم میں کچھ بے ربط سی باتیں کرتی ہے۔ اس کے ذہن اور جسم پر جو کچھ گزر چکی ہے اس کے بعد اس نے جتنی باتیں کر لی ہیں وہ بھی غنیمت ہیں۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اصل المیہ یہ ہے کہ اسے ہماری ہی چلائی ہوئی گولیاں لگی ہیں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔

وہ متاسفانہ سے انداز میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "ریڈ ڈاٹ والوں نے اسے اس کی غداری کی یہ سزا دی کہ جب ہم ان کے زیرِ زمین ٹھکانے تک پہنچے اور ان کے ساتھ ہمارا معرکہ جاری تھا تو انہوں نے اسے گولیوں کی بارش میں دھکیل دیا۔ وہ بھی

اس عالم میں کہ ہم اسے پہچان نہیں سکتے تھے۔ یہ تو معجزہ ہی ہے کہ گولیوں کی ایسی بوچھار میں یہ زندہ بچ گئی۔"

"تم خواہ اختصار سے ہی سہی لیکن مجھے سب کچھ بتاؤ۔ آخر یہ سب ہوا کس طرح؟" میں نے اُلجھن سے کہا۔

"یہاں کھڑے کھڑے یہ باتیں نہیں ہو سکتیں۔ آؤ گھر چلتے ہیں۔" وہ بولی۔

"گھر؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا "کیا یہاں تمہارا کوئی گھر بھی ہے؟"

"انسان جہاں بھی کچھ عرصے کے لیے رکتا ہے' وہاں رہنے کا کوئی ٹھکانا تو بنانا ہی پڑتا ہے۔ وہ انسان کا گھر ہی کہلائے گا۔ میرے خیال میں تو جہاں سر چھپانے کو جگہ مل جائے اسے گھر ہی سمجھنا چاہیے۔" اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور آئی سی یو سے باہر جانے والے راستے کی طرف چل دی۔

"تم بھی اچھی خاصی فلسفی ہوتی جا رہی ہو۔" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"ہمارے ہر عمل کی بنیاد کسی نہ کسی فلسفے پر ہوتی ہے۔ اگر زندگی میں سے فلسفے کو بالکل ہی نکال دیا جائے تو یہ ایسی ہی رہ جائے گی جیسے رس کے بغیر گنا..... بالکل پھوکٹ۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی اور آہستگی سے سیڑھیاں اُترنے لگی۔

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا مگر سیاہی میں لپٹی ہوئی ایک گول سی چیز کے سوا میرے سامنے کچھ نہیں تھا۔ کسی ایسے انسان سے بات کرنا ایک عجیب تجربہ ہوتا ہے جو آپ کے سامنے موجود ہو مگر آپ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکتے ہوں۔ صرف آواز آپ تک پہنچ رہی ہو۔

"اس وقت تم سے بات کرتے ہوئے مجھے ریڈ ڈاٹ کے باس ون اور باس ٹو یاد آ رہے ہیں۔" میں نے کہا "ان کے کندھوں پر سر کی جگہ بڑا سا ایک سفید انڈا رکھا ہوتا تھا۔ اس میں سے آواز برآمد ہوتی تھی۔ کوئی چہرہ کوئی تاثر نظر نہیں آتا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ تمہارے کندھوں پر سفید کی جگہ سیاہ انڈا رکھا ہوا ہے اور یہ سائز میں اس سے کچھ چھوٹا ہے۔ نیز اس پر کوئی نمبر درج نہیں ہے اور یہ انڈے کی طرح ہموار نہیں ہے۔"

"تم نے خوب یاد دلایا۔ باس ون کی لاش بھی یہیں موجود ہے۔ اسے خاص طور پر کچھ لوگوں کے معائنے کے لیے اور غیر معینہ عرصے تک محفوظ رکھنے کے لیے یہاں لایا گیا تھا کیونکہ لاہور میں اس مقصد کے لیے زیادہ بہتر سہولتیں موجود نہیں تھیں۔ تم دیکھنا پسند کرو گے؟"

"ضرور" میں نے بلا تامل کہا۔

وہ سیڑھیاں اُتر کر آئی سی یو کے بیرونی دروازے سے نکلنے کے بعد بائیں طرف مڑ گئی۔ راستے میں وہ بولی "ہم نے ہنی کی بہت حفاظت کی ہے اور پوری کوشش کی ہے کہ اس کے زندہ بچ جانے کی خبر ریڈ ڈاٹ والوں تک نہ پہنچے۔ اس مقصد کے لیے ہم نے ہنی کی تدفین کا ڈراما بھی رچایا۔ خدا ہمیں معاف کرے۔ اس کے علاوہ ہم نے اخباروں میں چھوٹی سی خبر بھی چھپوائی کہ عالمی شہرت یافتہ ڈاکٹر پرنسس تہمینہ پراسرار حالات میں انتقال کر گئیں۔ بظاہر یہی معلوم ہوا جیسے وہ خبر لیک آؤٹ ہو کر چھپی ہو۔ شاید ہماری یہ کوشش کامیاب رہی۔ وہ ہمارے ہاتھوں میں محفوظ رہی اور وقفے وقفے سے ہمیں اس سے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوتی رہیں۔"

"اب اس کا نہ تو یہاں پر آپریشن کا کوئی امکان ہے اور نہ ہی اسے باہر لے جایا جا سکتا ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "تم سن ہی چکے ہو۔ وہ کسی بھی قسم کی نقل و حرکت کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ خواہ اس میں کتنی ہی احتیاط برتی جائے۔ اب اس کے اسی حالت میں زیادہ سے زیادہ زندہ رہنے کا امکان ہے۔ ہماری کوئی بھی اور کوشش اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔"

اس وقت ہم ایک اور پارکنگ لاٹ سے گزر رہے تھے۔ میں نے غیر ارادی طور پر مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا "بے شک یہ خبر میرے لیے خوشی کا باعث ہے کہ ریڈ ڈاٹ کی کمر ٹوٹ چکی ہے لیکن اس کے ساتھ جتنی بُری خبریں سننے کو ملی ہیں۔ انہوں نے میرے سینے میں آگ سی دہکا دی ہے۔ صفدر مر چکا ہے۔ سلیمان کا بازو کٹ گیا ہے۔ تمہارا آدھا چہرہ سیاہ نظر آ رہا ہے۔ ہنی کی حالت قابلِ رحم ہے۔ بخدا میرا دل چاہ رہا ہے اس شہر کو آگ لگا دوں۔ شاید اس طرح میرے دل میں دہکتی ہوئی آگ کچھ ٹھنڈی ہو۔"

وہ ایک جھٹکے سے رک گئی اور اس نے تیزی سے گردن گھما کر میری طرف دیکھا "یہ کیا احمقانہ بات کی ہے تم نے۔" وہ تیز سی سرگوشی میں بولی "اس میں شہر کا کیا قصور ہے جو اسے آگ لگا دی جائے؟ ویسے بھی شہروں کو آگ لگانے والے تو اس ملک میں بہت پڑے ہیں۔ ہم تو اس آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں جو ہمارے ان مہربان شہروں' بلکہ ہمارے اس پورے ملک کو لپیٹ میں لینے والی تھی جو ہماری پناہ گاہ ہے۔"

اس کی آواز نیچی تھی لیکن وہ ایک استاد کی طرح مجھے ڈانٹ رہی تھی "مجھے حیرت ہوئی ہے تمہارے منہ سے یہ الفاظ سُن کر! تم نے تو پیشہ ور دہشت گردوں کی سی بات کی ہے۔ ان پر اپنے اعمال کی بدولت بھی کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ شہروں کو آگ لگانے کی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ ہم پر تو اگر تھوڑی بہت تباہی آئی بھی ہے تو وہ اپنے اعمال کے باعث نہیں بلکہ ایک نیک مقصد کے لیے آئی ہے۔ ہمارے ساتھیوں سے کہیں زیادہ نفیس صاحب کے آدمی مرے ہیں۔ اس کے باوجود ہمیں یہ سودا مہنگا محسوس نہیں ہوا کیونکہ ہم ریڈ ڈاٹ کی کمر توڑنا تو درکنار' اس کا بال بیکا کرنے کا بھی تصور نہیں کر پا رہے تھے۔ یہ تو بس ایک معجزہ سا ہو گیا۔"

پھر وہ آگے قدم بڑھاتے ہوئے قدرے ملائمت سے بولی "ویسے بھی آگ لگانا بہت آسان کام ہے۔ آگ بجھانا بہت مشکل۔"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "شاید میں وہ نہیں کہہ پایا جو کہنا چاہ رہا تھا۔ دراصل ایک طویل عرصے سے میں ایک عجیب سی بے بسی کا شکار ہوں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں کچھ کر گزروں۔ صورتِ حال فیصلہ کن ہو جائے۔ ہم اپنے معمولات کی دنیا میں لوٹ جائیں لیکن میرے وجود میں جو بھی تھوڑی بہت طاقت ہے۔ میرے دل میں جو لاوا اُبل رہا ہے اسے کوئی صحیح سمت نہیں مل رہی۔ کوئی راستہ نہیں مل رہا۔"

"ملے گا ضرور ملے گا۔" وہ بڑے تحمل اور وقار سے بولی "حالات اپنے منطقی انجام کی طرف جا رہے ہیں۔ اس جوش' جذبے اور طاقت کو بچا کر رکھو۔ یہ وحشت کوئی کارنامہ سرانجام دینے میں بڑی کام آتی ہے۔ بشرطیکہ کسی منفی راستے پر نہ پڑ جائے۔"

"ویسے بائی دا وے تم میں اتنی بزرگی کہاں سے آ گئی؟" میں نے کہا۔

"تم اگر غور کرو تو شاید تمہیں احساس ہو کہ مجھے لڑکپن سے ہی تمہارے مقابلے میں اپنے جذبات پر زیادہ قابو رہا ہے۔" وہ بدستور پُرسکون لہجے میں بولی۔ میں نے زبان سے تو نہیں کہا لیکن دل ہی دل میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔

اس دوران ہم ایک ایسی مستطیل عمارت کے سامنے پہنچ چکے تھے جس کی بیرونی دیوار سفید ماربل کی تھی۔ دروازہ شیشے اور المونیم کا تھا۔ اس بلاک کی پیشانی پر کوئی بورڈ وغیرہ نظر نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی کچھ لکھا تھا۔ اندر بھی اندھیرا دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کے دروازے پر ایک کے بجائے دو مسلح محافظ موجود تھے۔

وہ یقیناً راحیلہ کو پہچانتے تھے مگر انہوں نے اس کے لیے راستہ نہیں چھوڑا۔ راحیلہ نے انہیں وہ کمپیوٹرائزڈ کارڈ دکھایا جس پر اس کی ننھی سی تصویر چسپاں تھی۔ تب ان میں سے ایک نے والی ٹاکی نکالا اور کسی کو اطلاع دی "میڈم آئی ہیں۔"

چند سیکنڈ بعد ہی سفید یونیفارم میں ایک ادھیڑ عمر اور گنجا سا شخص قدرے لنگڑاتا ہوا ایک طرف سے نمودار ہوا۔ اس نے مؤدبانہ انداز میں راحیلہ کو سلام کیا اور ایک خوب صورت نقرئی چابی سے مقفل دروازہ کھولا۔ اندر قدم رکھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مُردہ خانہ تھا۔ یہاں مُردے یقیناً ان گنت زندہ لوگوں سے زیادہ صاف ستھرے اور محفوظ ماحول میں رہ رہے تھے۔

گنجے نے لائٹس آن کر دیں اور دودھیا سی روشنی ہر طرف پھیل گئی۔ اندر کی فضا میں یخ بستگی تھی۔ میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ ہمارے سامنے ایک دیوار سی کھڑی تھی جس میں لاکرز کی طرح بڑے بڑے خانے نظر آ رہے تھے۔ ان پر نمبر پڑے ہوئے تھے۔

"نمبر گیارہ" راحیلہ نے اس دیوار کے قریب پہنچ کر کہا۔

گنجے نے گیارہ نمبر خانے کا ہینڈل پکڑ کر باہر کھینچا۔ لمبا سا ایک تابوت نما صندوق باہر آ گیا۔ اس میں اس طرح سفید بخارات اُٹھ رہے تھے جیسے فریزر میں اُٹھتے ہیں۔ درحقیقت وہ لمبوترے فریزر ہی تھے۔ ان میں لاشیں موجود تھیں۔

جو فریزر باہر آیا' اس میں موجود لاش پلاسٹک کے تھیلے میں لپٹی ہوئی تھی۔ صرف اس کا سر تھیلے سے باہر تھا۔ وہ یقیناً سفید فام تھا۔ اس وقت بھی اس کا چہرہ سفید ہی نظر آ رہا تھا لیکن یہ سفیدی کچھ اور طرح کی تھی۔ اس کا چہرہ پلاسٹر آف پیرس سے بنا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا اس کی لاش کب سے فریزر میں تھی۔ ممکن تھا اس کی یہ حالت فریزر میں رہنے ہی کی وجہ سے ہوئی ہو یا پھر شاید اس پر کچھ کیمیائی عمل بھی کیے گئے تھے۔

دوسری خاص بات اس کے چہرے میں بس یہی تھی کہ اس کی ناک طوطے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھی۔ اس کا منہ گو کہ کھلا ہوا نہیں تھا اور نہ ہی اس سے نوکیلے دانت جھانک رہے تھے اس کے باوجود نہ جانے کیوں اس کے چہرے کا تاثر ڈریکولا جیسا تھا۔ اسے ذرا گہری نظر سے دیکھتے ہوئے یہی گمان گزرتا تھا کہ ڈریکولا حسبِ روایت دن میں میٹھی نیند سو رہا تھا اور رات ہوتے ہی وہ اُٹھ کھڑا ہو گا اور خون پینے کے لیے شکار کی تلاش میں نکل جائے گا۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا "اس کا مطلب ہے اس کے سر کی جگہ وہ جو بڑا سا انڈا نظر آتا تھا وہ ماسک ہی تھا۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔"

"ہاں' وہ ایک نہایت ہی عجیب اور پیچیدہ ساخت کا ماسک تھا۔" راحیلہ بولی "اس کی بیرونی سطح انڈے کے چھلکے ہی کی طرح تھی مگر اس میں انسانی جلد کی طرح مسام تھے اور ہوا اندر جانے کا نظام موجود تھا۔ ہوا کے ساتھ ہی آواز کی لہریں بھی جمع ہو کر اندر پہنچتی تھیں۔ نقاب پوش کی ناک کے دونوں نتھنوں کے قریب ہوائی نالیاں اور کانوں کے قریب ایئرفون موجود رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اس سفید خول پر سامنے ہی جلی انداز میں "ایک" نمبر سیاہ رنگ میں لکھا نظر آتا تھا۔ اسی نمبر کے درمیان ننھا سا ایک عدسہ چھپا ہوا تھا۔ اس عدسے کے ذریعے اس شخص کے سامنے پورا منظر رہتا تھا۔ اس خول کے اندر نہایت پیچیدہ قسم کا الیکٹرانک نظام پھیلا ہوا تھا۔ وہ ایک انوکھی اور انتہائی جدید چیز ضرور تھی لیکن کوئی طلسماتی قسم کی چیز بہرحال نہیں تھی۔"

"وہ ماسک اس وقت ہے کہاں؟" میں نے دریافت کیا۔

"مختلف لیبارٹریز میں معائنوں وغیرہ کے مراحل سے گزر رہا ہے۔" راحیلہ نے بتایا۔

"اس کا مقصد میری سمجھ میں اب بھی نہیں آیا۔ وہ شخص اس

ماسک کے بغیر بھی تو مجھ سے بات چیت کر سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"شاید اس میں کوئی ایسی مصلحت بھی ہو جسے ہم ابھی سمجھ نہ سکے ہوں۔ فی الحال میرا اندازہ تو یہی ہے کہ اس قسم کی تمام ڈرامے بازیوں کا سب سے بڑا مقصد تو سامنے والے کو مرعوب کرنا اور نفسیاتی طور پر ایک طرح سے اپنے ٹرانس میں لانا ہوتا تھا۔ مرعوب انسان کو اپنا آلۂ کار بنانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ صرف اس لیے بھی ان کے اکثر کاموں میں بہت زیادہ گھماؤ پھراؤ دیکھنے میں آتا تھا۔ سائنسی شعبدہ بازیوں کی مدد سے وہ اپنے آپ کو ایک مافوق الفطرت سی طاقت بنا کر پیش کرنا چاہتے تھے تاکہ لاشعوری طور پر ان کے شکار کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے کہ وہ ناقابلِ شکست ہیں' چنانچہ وہ اپنی شناخت کو چھپانے کے لیے بھی بہت زیادہ ڈرامائی قسم کے طور طریقے اختیار کرتے تھے۔"

پھر راحیلہ مُردہ خانے کے اٹینڈنٹ کو فریزر بند کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی "اس کے علاوہ کسی بھی تنظیم کے طور طریقوں کے پیچھے اس شخصیت کی نفسیات بہت کام آتی ہے جو اصل میں اس تنظیم کی سربراہ ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں ساری پاور اور تمام اختیارات ہوتے ہیں۔ تنظیم کے طور طریقوں میں اس کا عکس ضرور نظر آتا ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ اس تنظیم کے پیچھے جو بھی شخصیت نمبرون ہے' وہ یا تو خود سائنس داں ہے یا سائنس اس کی کمزوری ہے لیکن اس کی ذہنیت مافیائی ہے۔ فی الحال تو پانچ چھ سفید فام قومیں مل کر اس تنظیم کو بورڈ آف گورنرز کی طرح چلا رہی ہیں اور اس کے ذریعے دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنے کی منصوبہ بندی کر رہی ہیں لیکن ممکن ہے بعد میں تنظیم کو چلانے والی شخصیت اتنی طاقتور ہو جائے کہ وہ اکیلی ان پانچوں قوموں کو بھی انگلیوں پر نچانے لگے۔ شاید یہی قدرت کا انتقام ہو۔ یہی مکافاتِ عمل ہو۔"

پھر وہ ذرا آگے بڑھتے ہوئے بولی "ایک بات البتہ ہمیں تقریباً یقینی حد تک معلوم ہو چکی ہے اور وہ بڑی حیرت انگیز ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"وہ شخصیت عورت ہے۔" راحیلہ میری طرف مڑتے ہوئے بولی۔ عین ممکن ہے وہ اس وقت پسِ نقاب مسکرائی بھی ہو۔

"عورت واقعی بڑی ترقی کر گئی ہے۔" میں نے اس ٹھنڈے ماحول میں مزید ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بعض لوگ کہتے ہیں عورت کو زندگی کے تمام معاملات میں مرد کے شانہ بہ شانہ چلنا چاہیے۔ میرا خیال ہے بعض معاملات میں تو وہ مرد کا شانہ توڑ کر آگے نکل گئی ہے۔"

"جیلس ہو گئے؟" راحیلہ نے ملائمت سے پوچھا۔

"بہت غلط سمجھ رہی ہو تم۔" میں نے مغموم انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا "مجھ میں جیلس ہونے کا.... خصوصاً عورت سے جیلس ہونے کا تو مادہ ہی نہیں ہے۔"

اس دوران اٹینڈنٹ نے راحیلہ کا اشارہ پا کر ایک اور فریزر کھول دیا تھا۔ اس میں ایک چمپینزی کی لاش تھی۔ ریڈ ڈاٹ کے اس طرح کے چمپینزیوں سے مجھے بارہا واسطہ پڑ چکا تھا۔ انہوں نے میرا اور میرے دو تین ساتھیوں کا خوب ناک میں دم کیا تھا۔ میرا ایک ساتھی آفتاب ایسے چمپینزی کے ہاتھوں مارا بھی گیا تھا۔ چمپینزی نے ایک خون خوار درندے کی طرح اسے ادھیڑ کر رکھ دیا تھا جبکہ عام حالات میں ان چمپینزیوں میں انسانوں کی سی ذہانت کے مظاہرے دیکھنے میں آتے تھے۔ میں نے انہیں ہر کام انسانوں کی طرح کرتے دیکھا تھا۔ ریڈ ڈاٹ والے انہیں بلیک بڑ کہتے تھے۔

"ایسے کئی چمپینزی ریڈ ڈاٹ کے پاس موجود تھے۔" راحیلہ نے بتایا "ہمارے اور نفیس صاحب کے آدمیوں کے ہاتھوں پانچ تو مارے گئے تھے۔ شاید ابھی کچھ اور بھی باقی ہوں۔ ریڈ ڈاٹ والے شاید کسی خاص مقصد کے تحت ایسے چمپینزیوں کی بھی ایک کھیپ تیار کر رہے تھے۔ ان کے دماغ کا کوئی بہت ہی نازک آپریشن کیا گیا تھا اور ہر ایک کے دماغ میں کچھ مائیکرو چپس ڈالے گئے تھے۔ ہمارے نیورو سرجنز ابھی تک اس آپریشن کی نوعیت کو نہیں سمجھ سکے۔"

"ان سلسلوں میں دماغ کھپانا میرے خیال میں اتنا ضروری نہیں۔" میں نے کہا "اصل مسئلہ تو اس فتنے کا خاتمہ ہے۔ مجھے اپنی واپسی پر جہاں کچھ صدمے اٹھانے پڑے ہیں وہاں یہ بہت بڑی خوش خبری ملی ہے کہ ان کا ایک زیرِ زمین قلعہ تباہ ہو گیا اور اتنے لوگ مارے گئے۔ میں نے تو اتنی کامیابی کا تصور نہیں کیا تھا۔ میرا حوصلہ بہت بڑھ گیا ہے۔ اب باقی کام بہت آسان محسوس ہونے لگا ہے۔ اب مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی کہ ان کے چمپینزی اتنے سمجھدار کیوں تھے۔ ان کے آدمی اُڑتے کس طرح تھے۔ وہ گول گول نقرئی پلیٹیں ہر چیز کو کس طرح چیرتی ہوئی گزر جاتی تھیں۔ یا ان کی دوسری بہت سی سائنسی شعبدے بازیوں کے فارمولے کیا تھے۔ ان چیزوں کی جو تھوڑی بہت مرعوبیت تھی اب تو وہ بھی ذہن سے نکل گئی ہے۔ میرا یہ یقین کچھ اور پختہ ہو گیا ہے کہ اگر ہم سچائی پر ہیں اور کسی اچھے مقصد کے لیے کام کر رہے ہیں تو تمامتر کم مائیگی اور بے سروسامانی کے باوجود آخری فتح ہماری ہو گی' چاہے ان لوگوں کے پاس ان گنت سائنسی شعبدے ہوں' تباہ کن چیزیں ہوں اور خواہ وہ کتنے ہی منظم و ترقی یافتہ ہوں۔"

"میرے محسوسات بہت پہلے سے یہی ہیں۔ اسی لیے تو میں کبھی زیادہ پریشان اور فکرمند نہیں ہوتی۔ مجھے ایک عجیب سا اطمینانِ قلب حاصل ہے۔" راحیلہ بولی۔

پھر اس نے اٹینڈنٹ کو اشارہ کیا۔ اس نے فریزر بند کر دیا۔ راحیلہ بولی "دو تین لاشیں اور بھی یہاں موجود ہیں لیکن وہ زیادہ اہم لوگوں کی نہیں ہیں۔ انہیں صرف مشاہدے اور تجزیے کے لیے یہاں محفوظ کیا گیا تھا کیونکہ ان میں سے بھی کسی کے دماغ پر اور کسی کے جسم پر کوئی حیرت انگیز اور ناقابلِ فہم سا آپریشن کیا گیا

ہے۔ مجھے ایک یہ بات بھی بہت عجیب سی لگی ہے کہ ریڈ ڈاٹ میں کئی بہت ہی کمال کے سرجن موجود تھے جو طلسماتی قسم کے آپریشن کر سکتے تھے۔ تنظیم میں انہیں بہت اہم مقام حاصل تھا۔ یہ بھی گویا ان کی حکمتِ عملی کا کوئی خاص حصہ تھا۔ معلوم نہیں مستقبل میں ان کا ان سرجنوں سے کیا کیا کام لینے کا ارادہ تھا۔"

"ان کے عزائم تو شاخ در شاخ پھیلے ہوئے جنگل کی طرح تھے۔ معلوم نہیں وہ کس کس محاذ پر کیا کیا کرنا چاہتے تھے۔" پھر میں نے گویا خود ہی اپنی خوش فہمی دور کرنے کی غرض سے کہا "ہم تو ان کے لیے اس طرح "تھے" کا صیغہ استعمال کر رہے ہیں جیسے ان کا پوری طرح قلع قمع ہو گیا ہے۔ ابھی تو یہ تلوار ہمارے سر پر لٹک رہی ہے۔ میرا خیال ہے اس سانپ نے ایک شدید چوٹ کھانے کے بعد بل میں سر چھپا لیا ہے۔"

"ہم کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہیں۔" راحیلہ بولی "بہرحال اب یہ امید ضرور ہے کہ جہاں اتنی کامیابی ہوئی ہے وہاں مزید کامیابی بھی حاصل ہو جائے گی۔"

ہم دونوں مُردہ خانے کے سرد ماحول سے نکل آئے۔ فریزروں سے باہر بھی وہاں اچھی خاصی ٹھنڈ تھی۔ باہر آ کر حرارت کا احساس ہوا۔ میں راحیلہ کی رہنمائی میں ایک معقول قسم کے کوارٹر تک پہنچا جسے قدرے حسنِ ظن کے ساتھ بنگلا بھی کہا جا سکتا تھا۔ یہ بنگلہ اسپتال کی حدود میں ہی تھا۔ اس میں چھوٹا سا لان بھی تھا جس پر بڑے خوب صورت رنگا رنگ پھول کھلے تھے۔

پورچ میں داخل ہوتے ہوئے راحیلہ بولی "اصل میں یہ بنگلہ اسپتال کے ایک ڈاکٹر کو ملا ہوا ہے۔ وہ آج کل ایک لمبے کورس کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا ہے اور میں یہاں پناہ گزیں ہوں۔"

لان کے ایک کونے میں ایک مالی بیٹھا کھرپی سے کیاری درست کر رہا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں نے راحیلہ کے ساتھ برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "لان کی حالت بتاتی ہے کہ مالی بہت محنتی ہے۔"

راحیلہ ہولے سے ہنس دی اور برآمدے میں رکتے ہوئے بولی "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ مالی نہیں ہے۔ یہ میرا باڈی گارڈ ہے لیکن اس کی ڈیوٹی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب میں رات کو سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی جاتی ہوں۔ اس کے بعد یہ میرے گھر سے نکلنے تک گھر کے چاروں طرف بھوکے چیتے کی طرح چکر لگاتا ہے۔ فلسفہ اس کے پیچھے یہ ہے کہ جاگتے میں تو میں اپنی حفاظت خود اچھی طرح کر سکتی ہوں البتہ سوتا ہوا انسان مُرے برابر ہوتا ہے اسی لیے نفیس صاحب نے اس کی ڈیوٹی لگائی ہے کہ یہ اس دوران میری حفاظت کرے جب میں مُرے برابر ہوتی ہوں۔ حالانکہ میرا خیال ہے میں اس وقت بھی مُرے برابر ہرگز نہیں ہوتی۔"

ہم نے جب پہلے سے کھلے گیٹ سے اندر قدم رکھا تھا مالی کو یقیناً اسی وقت ہماری آمد کا پتا چل گیا تھا لیکن وہ پوری طرح گردن گھما کر ہماری طرف دیکھنے کے بجائے محض ذرا سا ترچھا ہو کر نامحسوس سے انداز میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ باریش معلوم ہوتا تھا۔ سر پر پرانے کپڑے کی مختصر سی پگڑی تھی۔ وہ غالباً نوجوان ہی تھا۔

راحیلہ اس کے بارے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی "ویسے یہ ہے بڑے کمال کا آدمی! جنات کے قبیلے سے معلوم ہوتا ہے۔ رات بھر دو تین گنوں سے مسلح ہو کر پہرا دیتا ہے۔ دن میں بھی جب دیکھو اِدھر اُدھر کسی نہ کسی چیز میں ہاتھ مارتا پھرتا رہتا ہے۔ معلوم نہیں سوتا کس وقت ہے۔ میرا خیال ہے میں تمہیں اس سے ملوا ہی دوں تو بہتر ہو گا۔"

اب چونکہ آس پاس کوئی نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے راحیلہ تقریباً آنکھوں تک چڑھا ہوا نقاب ہٹا چکی تھی۔ بڑے بڑے تاریک شیشوں والا چشمہ البتہ ابھی ناک پر ٹکا ہوا تھا۔ اب اس کے چہرے کا صرف ایک چوتھائی حصہ سرخ و سفید دکھائی دے رہا تھا۔ گویا اب مضحکہ خیزی نے ایک اور زاویہ اختیار کر لیا تھا۔

راحیلہ نے بارعب لہجے میں پکارا "اے مالی! اِدھر آؤ۔"

وہ شخص جو راحیلہ ہی کے بیان کے مطابق محض مشغل کے طور پر مالی کے کام سے دل بہلا رہا تھا' کھرپی رکھ کر نہایت آہستگی سے اٹھ کر ہماری طرف گھوما۔ اس کی یہ آہستگی اس کی سست طبعی یا بے دلی کی نشاندہی نہیں کر رہی تھی' اتنا مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کا انداز درحقیقت کچھ ایسا تھا جیسے اسے پیچھے سے کسی شخص نے گن کی زد پر لے رکھا ہو اور وہ نہایت احتیاط سے حرکت کر رہا ہو۔ پھر وہ نپے تلے انداز میں قدم اُٹھاتا قریب آ گیا۔

وہ عین میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ہم دونوں چند سیکنڈ ایک دوسرے کو بغور دیکھتے رہے پھر یکدم بازو پھیلا کر بڑھے اور بغلگیر ہو گئے۔ اس کی ڈھیلی ڈھالی واسکٹ کی دونوں جیبوں میں یقیناً پسٹل موجود تھے جن کی چبھن میں نے اپنی پسلیوں پر محسوس کی۔ راحیلہ بڑی خوش دلی سے ہنس رہی تھی۔

ہم جب پُرجوش معانقہ کر چکے اور ایک دوسرے کی پسلیاں کڑا کڑا کر الگ ہو چکے تب بھی چند لمحے تک ایک عجیب سی خوشی کے ساتھ ایک دوسرے کا سراپا جائزہ لیتے رہے۔

راحیلہ بولی "کیسا لگا تمہیں ہمارا یہ مالی؟"

"تمہارے لیے بڑی خوشی اور فخر کا مقام ہے کہ تمہیں ایسے مالی کی خدمات حاصل ہیں۔" میں نے کہا۔

"مالی بھی ایسا جس کے لیے مال کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا "یعنی مجھ غریب کو تو تنخواہ تک دینے کا تکلف نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ ڈیوٹیاں بھی دو دو دیتا ہوں۔ دن میں مالی' رات میں گارڈ بلکہ کبھی کبھی تو مزدور کے فرائض بھی

انجام دینے پڑتے ہیں۔"

"شکوے گلے بعد میں ہوتے رہیں گے' اب تم دونوں اندر چلو۔" راحیلہ مسکراتے ہوئے بولی۔

مالی جو درحقیقت ٹونی تھا' اپنے مٹی میں لتھڑے ہوئے ہاتھ واسکٹ پر رگڑ کر صاف کرتے ہوئے ہمارے ساتھ چل پڑا۔ راحیلہ اندرونی دروازے کا تالا کھولنے لگی تو ٹونی ڈور میٹ پر گرد آلود جوتے صاف کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"چلیں آپ کی آمد کی خوشی میں آج ہمیں بھی میڈم راحیلہ کے گھر میں داخل ہونے اور ان کے ہاتھوں سے اپنی کچھ خاطر تواضع کرانے کا موقع مل جائے گا ورنہ ہماری دوڑ تو سروئٹ کوارٹرز لان تک ہی رہتی ہے یا پھر رات کو احمقوں کی طرح اس مکان کے گرد طواف کرتے رہتے ہیں۔"

"میرے ہاتھوں سے خاطر تواضع کرانے کی تم نے اچھی کہی۔" راحیلہ دونوں ہاتھ مسل کر ان پر پھونک مارتے ہوئے بولی "تم نے اگر اپنی اوقات بھولنے کی کوشش کی تو واقعی میں اپنے ہاتھوں سے تمہاری "خاطر تواضع" کروں گی۔" اس نے کراٹے کے اسٹائل میں اسے ہاتھ دکھایا۔

ٹونی میری طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس لے کر بولا "لگتا ہے آپ کی آمد سے بھی اپنی اوقات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔"

"اس پر مجھے بھی شرمندگی ہے۔" میں نے اپنا لہجہ حتی الامکان شرمسارانہ بناتے ہوئے کہا "مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ میں اپنی عدم موجودگی میں اتنا ڈی گریڈ ہو چکا ہوں۔"

ہم اندر پہنچ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ چکے تو راحیلہ نے برقع اُتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ اب میں نے صحیح طور پر اس کا جائزہ لیا۔ وہ یوں تو ٹھیک ٹھاک ہی دکھائی دے رہی تھی لیکن محض آدھا چہرہ سیاہ ہونے سے اس کی شخصیت بدل کر رہ گئی تھی۔ وہ کچھ عجیب عجیب سی لگنے لگی تھی۔

وہ جوتے اُتار کر دور پھینکتے ہوئے بولی "اِنی! مذاق ایک طرف۔ اب تم سنجیدگی سے بتاؤ تم بالکل ٹھیک ہو نا؟ تمہیں زیادہ تکلیف تو اُٹھانا نہیں پڑی؟ ہم سب ساتھی گو کہ یہاں بہت بُری طرح اُلجھے ہوئے تھے لیکن ہمارے ذہن تم میں ہی اُلجھے ہوئے تھے۔ ہم سب تمہاری طرف سے زیادہ فکرمند تھے۔ ہمیں اپنی جانوں کی اتنی فکر نہیں تھی۔"

"ہاں سر! میڈم راحیلہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم اب واقعی سنجیدگی سے آپ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ ہنسی مذاق تو ہوتا ہی رہے گا۔" ٹونی واقعی سنجیدگی سے بولا "ویسے آپ کو صحیح سلامت اپنے سامنے دیکھ کر ہماری کھوئی ہوئی خوشیاں تو گویا واپس آ گئی ہیں۔"

"تم لوگ میری عدم موجودگی میں خاصے تمیزدار سے ہو گئے ہیں دیکھ رہا ہوں سب ساتھیوں کے لہجے میں بڑا ادب احترام آگیا ہے۔ راحیلہ کو سب "میڈم یا میڈم راحیلہ" کہہ کر پکارنے لگے ہیں۔" میں نے قدرے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"سر! ہم تو کیا انہیں تو اچھے بھلے سرکاری لوگ بھی میڈم کہنے لگے ہیں۔" ٹونی بولا "انہوں نے کارنامے ہی ایسے انجام دیے ہیں۔ ہمیں تو یہاں باقاعدہ ایک طویل جنگ لڑنی پڑی تھی اور میڈم نے اس میں ایک جنرل کی سی مشاقی اور مہارت کا مظاہرہ کیا۔"

"یہ مظاہرہ اس لحاظ سے تو اسے مہنگا پڑ رہا ہے کہ ہر ایک نے اسے میڈم کہنا شروع کر دیا ہے۔" میں نے شرارت سے راحیلہ کی طرف دیکھا "نہ جانے کیوں میڈم کے القاب سے ذہن میں اچھی خاصی پکی عمر کی خرانٹ قسم کی عورت کا تصور ذہن میں آتا ہے۔"

"سر! آپ مذاق میں ٹالنے کی کوشش نہ کریں۔ ہمیں بتائیں آپ پر کیا گزری!" ٹونی بولا۔

"مجھ پر جو گزری میں تم لوگوں کو دیکھ کر وہ سب بھول گیا ہوں۔ جس کے تم جیسے ساتھی موجود ہوں اسے دنیا میں ذرا بھی فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ واپس آنے کے بعد میں تو یہی سوچ رہا ہوں کہ مجھے اس طرح منہ اُٹھا کر بھاگنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ حال میرا بھی تم لوگوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں رہا۔ جب سب دوست اکٹھے ہو کر بیٹھیں گے تو پھر یہ باتیں ہوتی رہیں گی۔ ابھی تو کئی ساتھیوں سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ منیر' مسعود' شفیع شاہ' شبیر شیخ' سردار علی اور حنیف کہاں ہیں؟" میں نے بھی ذرا اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

راحیلہ بولی "وہ سب مختلف مقامات پر مختلف بہروپوں میں ڈیوٹی دے رہے ہیں جو بظاہر مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں لیکن ضروری ہیں۔ منیر اور مسعود تو وہیں خانہ بدوشوں کی بستی میں رہتے ہیں جہاں سے تم آ رہے ہو لیکن اس وقت وہ کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ سلیمان بھی ٹنڈے فقیر کے روپ میں وہیں رہتا ہے۔ اسے جہاں جانے کا حکم ملتا ہے وہاں جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور بظاہر بھیک مانگتا رہتا ہے۔"

"اور اچھا خاصا دولت مند ہو چکا ہے۔" ٹونی نے لقمہ دیا "پچھلے دنوں اس کی ڈیوٹی سینٹرل بورڈ آف ریونیو کی عمارت کے قریب لگی تھی لیکن وہ جلد ہی وہاں سے بھاگ آیا تھا کہ کہیں اندر سے کوئی بڑا افسر اس سے انکم ٹیکس وصول کرنے نہ آ جائے۔ وہ تو سنجیدگی سے اس کام کو نئے پیشے کے طور پر اختیار کرنے کی سوچ رہا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" راحیلہ نے اسے ڈانٹا پھر میری طرف دیکھ کر شکایتی سے لہجے میں بولی "جب سے ہم پر ذرا سخت وقت پڑا ہے یہ کچھ زیادہ ہی شوخ ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں کیوں اس کی جس مزاج کچھ زیادہ ہی بیدار ہو گئی ہے ورنہ یہ اچھا خاصا سنجیدہ نوجوان ہوا کرتا تھا۔"

"مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔" ٹونی ٹھنڈی

سانس لے کر بولا۔

راحیلہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی "احمد ٹیکسی چلاتا ہے۔"

"اس سے اور سلیمان سے تو میں مل چکا ہوں۔ مجھے ہوٹل سے احمد ہی اپنی ٹیکسی میں لے کر آیا تھا۔" میں نے بتایا۔

"وہ ٹیکسی لیے زیادہ تر اسلام آباد ہوٹل کے سامنے ہی کھڑا رہتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اسے صرف غیر ملکی مسافروں کو لانا لے جانا پڑے۔" راحیلہ نے بتایا "سردار علی غریب بستیوں میں جا کر بندر نچاتا ہے۔"

"کیا؟" میں تقریباً اچھل پڑا۔ سردار علی نام سے یہی لگتا تھا کہ وہ کوئی دیہاتی سا شخص ہو گا لیکن وہ ایک نفیس' ماڈرن اور خالصتاً شہری نوجوان تھا۔ چہرے مہرے اور شخصیت سے کسی آسودہ حال گھرانے کا لڑکا لگتا تھا۔ اس کی شخصیت ٹونی اور شفیع شاہ سے کچھ ملتی جلتی ہی تھی لیکن وہ ذرا زیادہ چوڑا چکلا اور قدرے بھاری جسم کا تھا۔ ٹونی اور شفیع شاہ کی طرح چھریرے جسم کا نہیں تھا۔ بہرحال میں اسے بندر نچانے والے کے روپ میں تو چشمِ تصور سے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

راحیلہ میری حیرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مسکرا کر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "شاید ریڈ ڈاٹ والوں کے مافوق الفطرت سے چھینیزیوں کو دیکھ کر نفیس صاحب کو خیال آیا کہ ان کی ایجنسی کے پاس بھی ایک تربیت یافتہ اور حیرت انگیز قسم کا بندر موجود ہے لیکن اس سے کام لینے کا چیلنج صرف سردار علی نے قبول کیا اور اب وہ بندر نچانے والے کے روپ میں دن بھر غریب بستیوں میں گھومتا ہے اور رات کو وہیں خانہ بدوشوں کی بستی میں آ جاتا ہے۔"

"ایسی کون سی مہم پر ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"کسی ایجنسی کو یہ خبر ملی تھی کہ سرحدی علاقے کی طرف سے آنے والا روسی اسلحہ اب غریب بستیوں میں چھپایا جا رہا ہے۔ غیر ملکی طاقتوں نے ہمارے ہاں جو تخریب کار داخل کر رکھے ہیں یا جن جن مقامی لوگوں کو اپنا ایجنٹ بنا رکھا ہے۔ انہوں نے اب کچی آبادیوں میں اسلحہ ذخیرہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ فروخت اور تقسیم کا کام اب وہاں سے ہو رہا ہے لیکن یہ بستیاں اتنی زیادہ تعداد میں' اتنے بے ہنگم طریقے سے پھیلی ہوئی ہیں کہ ان سب کی تلاشی لینا یا ان کے سلسلے میں کوئی صحیح آپریشن کرنا بہت مشکل ہے۔ بے گناہ لوگوں کے زیادہ مارے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ دہشت گرد تو تربیت یافتہ ہوتے ہیں' وہ بے گناہوں کو مروانے کا بندوبست کر کے صاف نکل جاتے ہیں۔ کارروائی کرنے والوں کی بعد میں شامت آتی رہتی ہے۔ ان پر خوب لعن طعن ہوتی ہے۔

"سردار علی اس سلسلے میں کیا کر رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسے ان بستیوں میں جس جگہ کے بارے میں شبہ ہوتا ہے کہ وہاں اسلحہ ذخیرہ کیا جاتا ہے' اس جگہ کا محل وقوع وہ بندر کو "ذہن نشین" کرا دیتا ہے' بعد میں بندر موقع پا کر اکیلا وہاں گھستا ہے۔ جگہ اگر دشوار گزار بھی ہو تو وہ بندر ہونے کی وجہ سے آسانی سے وہاں پہنچ جاتا ہے اور کوئی نہ کوئی ثبوت حاصل کر لاتا ہے۔ بعض اوقات تو وہ کوئی ایسا ہتھیار یا ڈبا وغیرہ ہی اٹھا لاتا ہے جس سے یقینی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ وہاں کوئی ذخیرہ موجود ہے پھر نفیس صاحب نہایت خاموشی سے وہاں چھاپا ڈلوانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ اسلحے کے دو بڑے ذخیرے پکڑنے میں کامیابی ہو چکی ہے۔"

"کیا یہ بھی ریڈ ڈاٹ کا کام تھا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ اس کا ایک نہایت معمولی سا شعبہ تھا۔ وہ اس میں براہِ راست کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ اس نے ہمارے گلی کوچوں میں خطرناک اسلحے کا سیلاب لانے کے لیے کچھ لوگوں کو خرید لیا تھا۔ بعد میں اسے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ تھوڑے سے پیسے کے لیے ہماری قوم اپنی جڑیں خود کاٹنے میں خود کفیل ہے۔ بہرحال نفیس صاحب لگے ہاتھوں جس جس طرف توجہ دی جا سکتی ہے دے رہے ہیں۔ جو کام نمٹ سکتا ہے' نمٹائے جا رہے ہیں لیکن ہر کام درحقیقت بہت مشکل ہے۔ صرف یہ اسلحے کا مسئلہ ہی حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اتنا اسلحہ پھیلا دیا گیا ہے جس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ یہ بڑا ہی زود اثر زہر ہے جس سے قوموں کو کم سے کم وقت میں ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ قوم اسی اسلحے سے خودکشی کر لے گی۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد راحیلہ بولی "شفیع شاہ' شبیر شیخ اور حنیف قدرے معززانہ کام کر رہے ہیں۔ وہ کچھ غیر ملکیوں کی نگرانی کر رہے ہیں جو یہاں بہت ہی حساس اور اہم عہدوں پر کام کر رہے ہیں۔ نفیس صاحب ان کی نگرانی کے لیے سرکاری آدمیوں کو لگانا نہیں چاہتے تھے۔"

"کیا تم سب لوگ آج کل نفیس صاحب کی ماتحتی میں کام کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں" راحیلہ نے جواب دیا "اپنے آدمیوں کی انچارج تو میں ہی ہوں لیکن میں نے نفیس صاحب کی ماتحتی میں کام کرنا قبول کر لیا تھا۔ جب ہمیں معلوم ہوا تھا کہ درحقیقت وہ صرف دکھاوے کے لیے تم سے بے اعتنائی برت رہے تھے لیکن اصل میں وہ ہمارے ہمدرد بھی تھے اور ہماری خدمات کے معترف بھی۔ تو میں نے ان کے ساتھ کام کرنے کی پیشکش قبول کر لی تھی۔ وہ بہت بڑی طاقت ہیں۔ کم از کم ریڈ ڈاٹ کے معاملے میں ملک کی تینوں بڑی خفیہ ایجنسیوں کی سربراہی عارضی طور پر ان کے پاس ہے۔ اگر میں ان کا تعاون قبول نہ کرتی تو ریڈ ڈاٹ والے ہمیں چُن چُن کر مار ڈالتے۔"

"نفیس صاحب بلاشبہ بہت بڑی طاقت ہیں لیکن وہ جو سب سے بڑی طاقت اوپر موجود ہے اس کی خوشنودی کے بغیر کچھ ہونا

ناممکن ہے۔" میں نے علامتی طور پر چھت کی طرف لیکن درحقیقت آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

"وہی سب سے بڑی طاقت تو دراصل ہمیں دوسری چھوٹی چھوٹی طاقتوں کا تعاون مہیا کرتی ہے۔" راحیلہ مسکرا کر بولی "ہمارا کوئی بھی مسئلہ حل کرنے کے لیے وہ ہمیں ظاہری وسائل تو مہیا کرتی ہے نا۔"

"شکر ہے تم بھی بات کو سمجھتی ہو۔" میں نے طمانیت سے کہا "بہرحال نفیس صاحب نے ہمارے ساتھیوں کو عجیب ہی کاموں پر لگا رکھا ہے۔"

"بظاہر یہ کام کچھ حقیر اور مضحکہ خیز ہیں لیکن درحقیقت بہت اہم ہیں۔" راحیلہ بولی "جب سے ہمارا ریڈ ڈاٹ سے براہِ راست ٹکراؤ ہوا ہے' اس کے بعد سے بہت سے لوگ غائب ہوگئے ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ انہیں تلاش کرنا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ہمیں صحیح طور پر کچھ پتا نہیں چل رہا کہ کہاں کہاں ان کا کوئی آدمی موجود ہے اور وہ اپنی اپنی جگہ بیٹھا کیا جال بُن رہا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں روزانہ جائز اور ناجائز طریقوں سے ہمارے ملک میں جو غیرملکی چلے آرہے ہیں ان میں سے کون کون بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کے ایجنٹ ہیں اور وہ کیا مقصد لے کر آرہے ہیں۔ ہم اور نفیس صاحب کے ہزاروں افراد پورے ملک میں پھیل کر اپنی دانست میں ان معاملات پر نظر رکھنے کی کوشش کررہے ہیں لیکن یہ کچھ ایسا ہی کام ہے جیسے سمندر کی تہہ میں اُتر کر چند مخصوص مچھلیوں کو تلاش کرنا۔"

"لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم کامیاب ہوجائیں گے۔ جتنی محنت' لگن اور جذبات کی شدت کے ساتھ ہم لوگ اس کام میں لگے ہوئے ہیں اور ہم نے جو قربانیاں دی ہیں وہ ضرور رنگ لائیں گی۔" میں نے وثوق سے کہا پھر مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے گویا اپنے آپ سے کہا "معلوم نہیں نفیس صاحب کو اب بھی میری ان قربانیوں کا احساس ہے یا نہیں؟"

"بہت اچھی طرح احساس ہے۔" راحیلہ بولی "انہیں معلوم ہے ہمیں کروڑوں کا تو مالی نقصان ہی پہنچ چکا ہے' کاروبار تباہ ہورہا ہے۔ تمہارا عظیم الشان بنگلہ دھماکے سے اُڑایا گیا۔ ہمارے کتنے ہی دوستوں اور ہمدردوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ خود ہمیں جو تکلیفیں اُٹھانا پڑیں ان کا کوئی شمار نہیں۔ نفیس صاحب کو ان سب کا احساس ہے۔ اس لیے تو اب ان کا رویّہ اتنا بدلا ہوا ہے' وہ ہمیں اپنے آدمیوں سے زیادہ عزت دیتے ہیں۔"

"مجھے واپس آکر یہی دیکھ کر سب سے زیادہ خوشی ہوئی ہے۔ مجھے تو ان کا دل جیتنا' ریڈ ڈاٹ سے مقابلہ کرنے سے زیادہ مشکل محسوس ہوتا تھا۔" میں نے کہا۔

"انہیں تمہاری [illegible] کا بھی اندازہ ہوچکا ہے۔" راحیلہ [illegible] انہوں نے باصلاحیت [illegible] پر ہمیں اپنے ساتھ شامل کیا اور اس کے لیے نظام بھی تیار کیا' باقاعدہ اپنی اپنی حدبندیاں مقرر کیں تو انہوں نے ہمیں سرکاری خزانے سے باقاعدہ تنخواہیں' تمام الاؤنسز اور اخراجات وغیرہ بھی دلوانے کی پیشکش کی تھی لیکن میں نے انکار کردیا اور انہیں بتایا کہ ہم اتنے گئے گزرے نہیں کہ سرکاری خزانے پر بوجھ بنیں یا سیکرٹ فنڈز وغیرہ اپنے اوپر خرچ کرائیں جبکہ ہمارا ان کا ساتھ بھی عارضی ہے۔ نہ جانے کب ہمارا کام ختم ہوجائے اور ہمارے راستے الگ الگ ہوجائیں۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "اپنی اپنی جگہ مختلف ڈیوٹیاں انجام دینے کے ساتھ ساتھ ہمیں کبھی کبھار اس مقام پر بھی جانا پڑتا ہے جہاں بظاہر واٹر سپلائی کا کام ہورہا ہے۔ اگر وہاں سرنگ کی کھدائی کامیاب ہوجاتی ہے اور کہیں ریڈ ڈاٹ کا زیرِزمین قلعہ نکل آتا ہے تو ہمیں اس کے ردِعمل کے لیے بھی تیار رہنا ہوگا۔ فی الحال تو ہم سب بظاہر مزدور وغیرہ کی حیثیت سے وہاں جاتے ہیں اور کام کا جائزہ لے کر اپنی اپنی رائے دیتے ہیں حالانکہ ہم نہ انجینئر ہیں' نہ الیکٹرانکس یا دوسرے علوم کے ماہر لیکن ہماری رائے کو بہرحال اہمیت دی جاتی ہے اور وہ ریکارڈ پر آتی ہے۔ اگر ہم کوئی مشورہ دیں تو اس پر عمل کیا جاتا ہے۔"

میں نے ذرا دلچسپی سے آگے کھسکتے ہوئے پوچھا "تم لوگ کس نتیجے پر پہنچے ہو۔ اس کھدائی کا کوئی نتیجہ نکلتا نظر آرہا ہے؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" راحیلہ بولی "بہت ہی خاص قسم کے کمپیوٹرائزڈ مواد کی بنیاد پر فورسز کے بڑے خاص خاص انجینئروں وغیرہ کے مشوروں کے بعد یہ کام شروع کیا گیا ہے۔ شاید کوئی نتیجہ نکل ہی آئے۔ ہم تو بس ان کی مدد کے لیے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔"

اس دوران اسٹیل کی ایک بڑی سی ٹرالی پر اسپتال کے میس سے کھانا آگیا۔ ٹونی باہر جاکر برتنوں میں کھانا لانے کے بعد بولا "یہاں ہم غریبوں' خانہ بدوشوں کے لیے بہت اچھے انتظامات ہیں۔ بیٹھے بٹھائے کھانا مل جاتا ہے۔"

"تبھی اس کی طبیعت میں کچھ حرام خوری سی آتی جارہی ہے۔" راحیلہ کھانا میز پر لگاتے ہوئے بولی۔

کھانے کے دوران بھی باتیں ہوتی رہیں اور مجھے حالات سے زیادہ سے زیادہ آگاہی ہوتی رہی۔ اس دوران راحیلہ سیاہ چشمہ بھی اُتار چکی تھی اور میں نے کئی بار غیرمحسوس سے انداز میں ذرا قریب سے اس کے چہرے کے سیاہ حصے کا جائزہ لیا تھا۔ اس کی جلد سفید حصے ہی کی طرح ہموار تھی لیکن اس میں تارکول کی سی چمک تھی۔

کھانے کے بعد راحیلہ برتن سمیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے ٹونی سے مخاطب ہوئی "اتنی دیر سے ہم لوگ باتیں کررہے ہیں' کھانا بھی کھالیا۔ بول بول کر دوبارہ گلا خشک ہوگیا لیکن تمہیں اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ کچن میں جاکر کافی ہی بنالاؤ۔ باس کے لیے جان دینے کو تو تیار رہتے ہو۔ ان کی خاطر مدارات کے لیے کافی بنانے کی

زحمت نہیں کرسکتے۔"

"یہ شعبہ خواتین کا ہے۔" ٹونی کاؤچ سے اُتر کر دیہاتیوں والے انداز میں قالین پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"جب تمہیں کوئی مقدروں کی ماری خاتونِ خانہ میسر آجائے گی تب یہ بات کرنا۔ فی الحال تو جاکر کافی بنالاؤ۔ کیونکہ یہاں کوئی خاتونِ خانہ نہیں ہے اور ہم سب کمانڈوز کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔" راحیلہ بولی۔

ٹونی نے پھر بھی اٹھنے میں مصنوعی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تو راحیلہ پہلے سے زیادہ بارعب لہجے میں بولی "میں تمہیں کمانڈر ایس ٹی ایف ٹو کی حیثیت سے حکم دیتی ہوں کہ جاکر خود سمیت تینوں کے لیے کافی بنا کر لاؤ۔"

تب ٹونی کراہ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور چھت کی طرف دیکھ کر فریادی انداز میں بولا "اللہ میاں واقعی عورت کو اختیارات مت دیجئے گا۔ یہ تو معلوم نہیں مَردوں کا کیا حال کرے گی۔ ذرا اندازہ لگایئے کافی بنوانے کے لیے کمانڈر ایس ٹی ایف ٹو کے اختیارات استعمال ہورہے ہیں۔ اللہ اللہ!"

"چھوٹی موٹی حیثیت میں تم مرد لوگ بے چاری عورت کی بات پر کان ہی کہاں دھرتے ہو۔" راحیلہ مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

ٹونی اپنی مختصر سی پگڑی کے درمیان سے سر کھجاتا کچن میں چلا گیا۔ میں نے راحیلہ سے پوچھا "یہ ایس ٹی ایف ٹو کیا بلا ہے بھئی؟"

"اسپیشل ٹاسک فورس نمبر دو۔" راحیلہ بولی "یعنی ہمارے ساتھیوں کا گروپ جس کی کمانڈر میں ہوں۔ ریڈ ڈاٹ کا قلع قمع کرنے کے لیے جو سرکاری مشنری حصہ لے رہی ہے وہ ایس ٹی ایف ون کہلاتی ہے۔ ہم لوگ ان کے سامنے اسی طرح ہیں جیسے پہاڑ کے سامنے چوہا لیکن فی الحال عارضی طور پر ہماری بھی ایک سرکاری حیثیت ہے۔ اب تم آگئے ہو تو شاید اپنے گروپ کے کمانڈر کے فرائض تمہیں سنبھالنے پڑیں۔"

"مجھے معاف ہی رکھو۔" میں نے جلدی سے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا "مجھے فی الحال حالات کے سرپیر کا صحیح طور پر پتا نہیں ہے۔ میں اس کمانڈری کا اہل نہیں ہوں۔ میں تو تمہارے ماتحت کے طور پر کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"ذمّے داریوں سے جان چھڑانا تمہیں خوب آگئی ہے۔" راحیلہ بولی۔

"فی الحال تو مجھے یہاں کوئی کام ہی نظر نہیں آرہا۔ وہ جو ایک کہاوت ہے نا کہ فلسفی اسے کہتے ہیں جو کسی تاریک کمرے میں وہ چوہا تلاش کررہا ہوتا ہے جو وہاں موجود نہیں ہوتا۔ مجھے اس وقت تم سب اسی قسم کے فلسفی لگ رہے ہو۔" میں نے اسے چڑانے کی کوشش کی۔

"تم واقعی نئے آئے ہوئے لگ رہے ہو۔ ابھی صورتِ حال تمہاری سمجھ میں نہیں آسکی۔ ہم اتنے احمق نہیں ہیں کہ محض اِدھر اُدھر ٹاک ٹوئیاں مارنے کے لیے اتنا وقت اور انرجی ضائع کرتے پھریں۔ کام بہت سمتوں میں' بہت خاموشی سے ہورہا ہے اور اس کے نتائج یکدم سامنے آئیں گے۔"

"پہلے کا تو مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ احمق نہیں تھے اور تمہیں اِدھر اُدھر ٹاک ٹوئیاں مارنے کی عادت نہیں تھی لیکن میں نے سوچا شاید سرکاری تحویل میں آنے کے بعد ایسے ہوگئے ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"زیادہ طنز فرمانے کی ضرورت نہیں ورنہ ایسا گھونسا رسید کروں گی کہ یہ فوانچو کٹ نقلی مونچھیں دانتوں سمیت معدے میں پہنچ جائیں گی۔" اس نے گھونسا ہوا میں لہرایا۔

"بس بس ہمیں اتنی جلدی اپنی اوقات پر آنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا "ذرا سنجیدگی سے یہ بتاؤ' نفیس صاحب سے یہ سب معاملات کب اور کس طرح طے پائے؟"

"یکدم ہی... اور بڑے طوفانی سے انداز میں۔" راحیلہ نے جواب دیا "ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ نفیس صاحب ہماری نگرانی کرا رہے تھے۔ ہمیں مشکوک سمجھ کر نہیں... بلکہ ہمارے ذریعے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں خبردار رہنے کے لیے۔"

پھر وہ اپنے تراشیدہ بالوں میں انگلیاں پھیر کر گہری سانس لے کر بولی "جب وزیرِخارجہ حفیظ صاحب کے آبائی مکان پر لاہور میں ہمارا ریڈ ڈاٹ سے ٹکراؤ ہوا اور تم حسبِ پروگرام روپوش ہونے کے لیے نکل گئے تھے تو تمہارے پیچھے نفیس صاحب کے آدمی ہماری مدد کے لیے آن پہنچے تھے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اس کے بعد بالکل پاسا ہی پلٹ گیا تھا لیکن صورتِ حال بہت بدل ضرور گئی تھی۔ ایک جنگی ہیلی کاپٹر تک ہماری مدد کے لیے آن پہنچا تھا لیکن وہ مخلوق جو کمر پر کوئی مشینری وغیرہ باندھے اُڑتی پھر رہی تھی ان میں سے ایک نے اس ہیلی کاپٹر کو بھی فضا میں ہی دھماکے سے تباہ کردیا۔ تب نفیس صاحب کو اندازہ ہوا کہ ان کا سامنا واقعی کچھ خطرناک لوگوں سے تھا۔ وہ اس وقت لاہور میں ہی ایک کنٹرول روم میں بیٹھے تھے اور انہیں ایک ایک پل کی خبر مل رہی تھی لیکن ہمیں یہ بات معلوم نہیں تھی۔ بہت سے کمانڈو وہاں پہنچ چکے تھے اور ہم حیران تھے کہ وہ کون لوگ تھے جو ہماری مدد کرنے کی کوشش کررہے تھے۔"

میں حیرت سے راحیلہ کی باتیں سُن رہا تھا جو شاید ایک بار پھر اس وقت کے تصور میں کھوگئی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی "اس روز ریڈ ڈاٹ نے ہمارا جلد از جلد صفایا کرنے کے لیے وہ اُڑنے والے آدمی کافی تعداد میں میدان میں جھونک دیے تھے۔"

"ان میں سے ایک نے تو سیکڑوں میل تک میرا پیچھا کیا تھا۔" میں نے اسے بتایا "پھر میں نے یونہی انداز اً ایک تدبیر کی۔ شاید اس کے بعد اس نے میرا سراغ کھو دیا۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ میری گھڑی میں کوئی ایسی چیز تھی جو اسے میرے بارے میں سگنل دے رہی تھی۔ میں نے گھڑی سے چھٹکارا حاصل کرلیا تھا۔"

"بہرحال رات ہونے تک تو وہ لوگ بڑی بڑی جناتی چمگادڑوں کی طرح اندھیرے میں آسمان سے اُتر آئے تھے اور عجیب و غریب قسم کی لائٹس کے ذریعے ہمیں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ موت ان کے روپ میں ہمارے تعاقب میں تھی۔ ہم جگہ جگہ چھپتے پھر رہے تھے لیکن وہ ہر اس جگہ کو تباہ کردیتے تھے جہاں ہم پناہ لیتے تھے۔ اس دوران کئی کمانڈوز بھی مارے گئے۔ ہم سب بکھر گئے تھے اور میرا خیال ہے ہم اس روز کئی میل کے دائرے میں دوڑے ہوں گے۔"

"ایسے بھی تو بہت سے لوگ موجود تھے جو اُڑ نہیں سکتے تھے۔ وہ ابتدا ہی میں ہم پر حملہ آور ہوئے تھے۔ وہ حفیظ صاحب کو اُٹھا کر لے جانے یا پھر قتل کرنے کے لیے آئے تھے۔" میں نے یاد دلایا۔

"ان میں سے تو بیشتر شروع میں ہی مارے گئے تھے۔ انہیں تو ہم خاطر میں ہی نہیں لا رہے تھے۔ ہمارے لیے تو اصل مسئلہ وہ اُڑنے والے لوگ بنے ہوئے تھے۔ آخر نفیس صاحب خود فورسز کے خاص آدمیوں کی ایک ٹیم کے ساتھ وہاں پہنچے۔ انہوں نے تو ان لوگوں پر باقاعدہ بمباری تک کرانے کا بندوبست کرلیا تھا لیکن اس وقت تک شاید قدرت کو ہم پر ترس آگیا تھا۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگئی۔

"کیا ہوا تھا؟" میں نے قدرے بے تابی سے پوچھا۔

"ان کے جسموں کے ساتھ جو بھی مشینریاں منسلک تھیں وہ کسی جگہ سے کمپیوٹر سے کنٹرول ہوتی تھیں۔ شاید ان کے کنٹرول میں ہی کہیں کوئی خرابی ہوگئی تھی جس کے نتیجے میں سبھی بیک وقت اُڑنے سے معذور ہوگئے۔ ان پر بہت بھاری گنوں سے فائرنگ بھی کی گئی تھی۔ فائرنگ سے تو پھر بھی انہیں کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا تھا لیکن اُڑنے سے معذور ہونے کے بعد ان میں سے کئی زندہ ہمارے اور نفیس صاحب کے آدمیوں کے قابو میں آگئے تھے۔ اس طرح اس معرکے کا تو گویا وہیں اختتام ہوگیا۔"

اس دوران ٹولی ایک ٹرے میں کافی کے مگ سجائے لے آیا اور تپائی پر رکھتے ہوئے بولا "غالباً اس رات کی کہانی چل رہی ہے جس رات ہمیں نئی زندگی ملی تھی؟"

"ایسی راتیں تو ہماری زندگی میں دو آئی تھیں۔ ان میں سے ایک کا ذکر ہو رہا ہے۔" راحیلہ بولی۔

کافی کی ایک چسکی لے کر اس نے سلسلۂ کلام جوڑا "نفیس صاحب نے ایک بڑی عقلمندی کی جس کی اہمیت کو شاید ہم نہ سمجھ پائے۔ انہوں نے زندہ ہاتھ آجانے والے ان آدمیوں کو فوری طور پر ایک خصوصی طیارے کے ذریعے پشاور سے آگے کسی خفیہ مقام پر منتقل کرادیا۔ اس دوران انہوں نے مجھ سے میٹنگ کی اور پوچھا کہ یہ سارا کیا چکر تھا۔ میں نے انہیں سب کچھ بالکل سچ سچ بتادیا بلکہ ہلکی پھلکی لعن طعن بھی کی کہ جو ان کے کرنے کے کام تھے وہ کام ہم کرتے پھر رہے تھے، ہمارے ساتھی مر رہے تھے، کاروبار تباہ ہو رہے تھے۔ میں نے تمہارے سلسلے میں بھی ان سے گلے شکوے کیے کہ انہوں نے تمہاری باتوں پر اعتبار نہیں کیا جس کی وجہ سے نوبت یہاں تک آئی اور آخر تمہیں بھی فرار ہونا پڑا۔ تب نفیس صاحب نے اپنا مؤقف بیان کیا اور بتایا کہ ان کی بے اعتنائی وغیرہ سب مصنوعی تھی۔ وہ بیک وقت کئی محاذوں پر بڑی کامیابی اور رازداری سے لڑ رہے تھے۔ انہوں نے فوری طور پر ہمیں بھی "غائب" کرادیا۔ ہم سب کو چھپنے کے لیے الگ الگ خفیہ ٹھکانے فراہم کیے۔ وہ ٹھکانے بھی ہم روز بدلتے رہتے تھے لیکن ہمارا اس دوران ایک دوسرے سے رابطہ رہا اور نفیس صاحب کے ساتھ مل کر ہم لائحہ عمل بھی طے کرتے رہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کس طرح کرنا چاہیے۔"

"اس دوران ریڈ ڈاٹ کا کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا؟" میں نے پوچھا "اس کے کئی آدمی مارے گئے تھے اور کئی غائب ہوگئے تھے۔"

"میرا خیال ہے نفیس صاحب ہمیں صحیح طرح چھپانے میں کامیاب رہے تھے۔ اس دوران ہم اپنے اپنے گھروں اور دفتروں یا دوسرے ٹھکانوں کے قریب بھی نہیں پھٹکے تھے لیکن یہ اندازہ بہرحال ہو رہا تھا کہ ریڈ ڈاٹ کے نادیدہ سے ایجنٹ موت کے ہرکاروں کی طرح ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ کئی مشکوک افراد اس دوران نفیس صاحب کے آدمیوں کے ہتھے چڑھے لیکن ان کا یہ بڑا "کمال" تھا کہ تفتیش کے کسی بھی مرحلے تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ کسی نہ کسی طرح خودکشی کرتے چلے گئے حالانکہ ان کی مکمل تلاشی لے کر انہیں کسی خفیہ مقام پر قید کیا جاتا تھا۔ بظاہر ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی تھی جس کے ذریعے وہ خودکشی کرسکتے۔ اس کے باوجود کسی کا جسم خشک مٹی کی طرح چٹخا ہوا ملتا....."

"وہی انداز جس میں ستارہ کی موت واقع ہوئی تھی؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں بالکل وہی انداز۔" راحیلہ نے جواب دیا "لیکن یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ زہر انہوں نے کب اور کس طرح استعمال کیا۔ کوئی ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کے باوجود جاپانیوں کی ہاراکاری والے طریقے سے اپنی ہی زبان اپنے ہی حلق میں اُلٹ کر دم گھٹنے سے مرجاتا اور کسی کی تو موت کا سبب بھی معلوم کرنا مشکل ہوجاتا۔ اس طرح کئی آدمی نفیس صاحب کے آدمیوں کے ہتھے چڑھے لیکن اس کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

اس نے دھیرے دھیرے کافی کی چند چسکیاں لیں۔ اس کی

مرمریں اور مخروطی انگلیاں مگ کے بڑے سے ہینڈل پر سختی سے جمی ہوئی تھیں۔ وہ بلاشبہ فولادی اعصاب کی مالک تھی۔ مجھے فخر تھا کہ ایسی جیسی لڑکی میری ساتھی تھی۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "ایک مرتبہ کے زوردار ٹکراؤ براہِ راست ٹکراؤ کے بعد صورتِ حال پھر پہلے ہی کی طرح بے یقین کن ہوگئی تھی۔ نفیس صاحب کے ساتھ ہمارا باضابطہ طور پر اتحاد ہوچکا تھا۔ تمام معاملات اور تفصیلات طے ہوگئی تھیں لیکن اس اتحاد کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔"

"اُڑنے والے جو لوگ ہاتھ لگے تھے اور جنہیں نفیس صاحب نے پشاور کے قریب کسی خفیہ مقام پر بھجوادیا تھا ان سے بھی کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوسکی؟" میں نے پوچھا۔

"میں وہی بتانے لگی تھی۔" راحیلہ بولی "وہ بہت معمولی لوگ تھے اور ایک طرح سے قربانی کے بکروں کے طور پر استعمال ہو رہے تھے۔ سب ہمارے ہم وطن تھے۔ بہرحال نفیس صاحب کے آدمیوں کے جو بھی تفتیش وغیرہ کے طریقے ہوں گے وہ ان پر آزمائے جاتے رہے ہوں گے۔ کئی دن بعد آخرکار ان میں سے ایک نے زبان کھولی اور چند غیر ملکیوں کے نام بتائے جن کے توسط سے انہیں بھاری بھاری رقمیں ملی تھیں اور رفتہ رفتہ انہیں مختلف کاموں کی تربیت دے کر ان میں اُلجھایا گیا تھا لیکن انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ اس سارے سلسلے کے پسِ پردہ اصل طاقت کس کی تھی اور اصل کھیل کیا چل رہا تھا۔ وہ بس بکاؤ قسم کے عناصر تھے۔ معلوم نہیں کیا کچھ کرچکے تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ گرفت میں آنے کے بعد وہ خودکشی نہیں کرسکتے تھے۔ معلوم نہیں کس طرح وہ اس "سہولت" سے محروم رہ گئے تھے۔"

"شاید ان کے پاس اہم معلومات نہیں تھیں اس لیے انہیں اس "سہولت" سے "آراستہ" کرنا ضروری نہ سمجھا گیا ہو یا پھر وہ اس لیے اس سہولت سے محروم رہ گئے ہوں کہ انہیں ہنگامی طور پر آنا پڑا ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"خیر وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو بہرحال وہ زندہ رہے۔ البتہ "تفتیش" میں ان کی جو حالت ہوئی سو ہوئی۔ اس دوران احتیاطاً انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا رہا۔ شاید ان تمام قلعوں میں رکھا گیا جو تاریخ سے زیادہ تفتیش کے سلسلے میں مشہور ہیں۔"

"جن غیر ملکیوں کے نام ان میں سے کسی نے بتائے تھے ان کے سلسلے میں کیا کیا گیا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ سب کے سب سفید فام تھے اور کسی نہ کسی سرکاری یا نیم سرکاری حیثیت میں یہاں موجود تھے تاہم بڑی احتیاط سے ان پر ہاتھ ڈالنے کا منصوبہ بنایا گیا لیکن پتا چلا کہ ان میں سے بیشتر غائب ہوچکے تھے۔ صرف دو افراد ہاتھ آئے۔ انہیں پکڑنے پر بھی فوراً احتجاج شروع ہوگیا۔ سفارتی تعلقات خراب ہونے لگے، حکومت کے لیے مسائل کھڑے ہونے لگے۔ انجام خراب کرنے کی دھمکیاں ملنے لگیں۔ عجیب عجیب سازشیں شروع ہوگئیں۔ ہمارا پورا حکومتی ڈھانچا لرزنے لگا۔ نفیس صاحب پر چاروں طرف سے زبردست دباؤ تھا۔"

"اوہ.... میرے خدا!" میں بے اختیار ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ چھوٹے کمزور اور منتشر منتشر سے رہنے والے ملکوں کی بے بسی کی یہ بڑی پُرانی کہانی تھی۔

راحیلہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "تاہم نفیس صاحب نے ہوشیاری سے اپنا کام جاری رکھا۔ انہوں نے اس دباؤ کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے لیکن غیر ضروری اکڑفوں کا مظاہرہ بھی نہیں کیا۔ وہ بڑی ڈپلومیسی سے چلتے رہے۔ اس دوران حالات نے ایک عجیب پلٹا کھایا۔ ہمیں ایک ایسے طریقے سے مدد میسر آئی جس کا ہمیں وہم و گمان بھی نہیں تھا۔"

وہ ایک لمحے کے لیے پُرخیال انداز میں اپنے کافی کے مگ کو دیکھتی رہی پھر بولی "ہنی عرف پرنسس تہمینہ کو تم ابھی بسترِ مرگ پر دیکھ کر آرہے ہو۔ تم نے اسے تندرستی اور صحت مندی کی حالت میں بھی دیکھا ہے۔"

"ہاں" میں نے اپنے دل میں افسردگی کی ایک لہر محسوس کرتے ہوئے کہا "لوگ فائیو اسٹار ہوٹل میں اس کا ڈانس دیکھ کر دیوانے ہوجاتے تھے۔"

"یہی ہنی ان دنوں ریڈ ڈاٹ کے پاس تھی اور کچھ دنوں کے لیے زیرِ عتاب رہنے کے بعد کسی نہ کسی طرح اپنا اعتماد کافی حد تک بحال کرا چکی تھی۔ ریڈ ڈاٹ والوں نے اسے ہمارے ہاں کی ایک بہت بڑی اور معروف سیاسی شخصیت کے پیچھے لگایا تھا۔ وہ شخصیت کچھ عرصے کے لیے ایک بہت بڑے عہدے پر فائز رہی تھی۔ اس دوران ایک نہایت اہم فائل ان صاحب کے سامنے سے گزری تھی جسے تم ہمارا ایک بڑا قومی راز بھی کہہ سکتے ہو۔ ہنی کو اس کے صرف چند اہم نکات معلوم کرنے کے لیے اس شخصیت کے پیچھے

رومانی ناول

زیب	حمیدہ جبین	75/-
شاخ بریدہ	حمیدہ جبین	75/-
حنا اور پتھر	حمیدہ جبین	75/-
گیت یہ میرے	حمیدہ جبین	75/-

مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور 2

لگایا گیا تھا۔ اسے کروڑوں روپے کی پیشکش کے اختیارات بھی دیے گئے تھے۔"

"کیا ہنی اس مشن میں کامیاب ہوگئی تھی؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

راحیلہ نے نفی میں سر ہلایا "وہ محض دکھاوے کی حد تک یہ کام کررہی تھی۔ اس کی حقیقی دلچسپی اس میں نہیں تھی۔ دوسرے وہ شخصیت بھی کم از کم اس اہم قومی راز کے سلسلے میں اس کے قابو میں نہیں آنے والی تھی۔ تاہم اس نے دکھاوے کے لیے اس شخصیت تک رسائی حاصل کرلی تھی اور بظاہر اسے ڈھب پر لانے کی کوشش کررہی تھی لیکن اصل اہم بات یہ ہے کہ اس دوران اس نے ایک جگہ میری جھلک دیکھ لی۔ وہ مجھے تمہاری قریب ترین ساتھی کی حیثیت سے پہچانتی تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ریڈ ڈاٹ کو جو نقصان پہنچا تھا اس میں' میں نے خاصا اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ معلومات بھی اسے ریڈ ڈاٹ میں ہونے کی وجہ سے ہی حاصل ہوئی تھیں۔ ریڈ ڈاٹ والوں کو جن لوگوں کی تلاش تھی' میں ان میں سرفہرست تھی۔ ہنی کو بھی اس سلسلے میں میرے بارے میں فیڈ کیا گیا تھا کہ وہ اپنی دیگر سرگرمیاں جاری رکھتے ہوئے میرے بارے میں بھی خبردار رہے اور اگر میرا کوئی سراغ ملے تو فوراً ریڈ ڈاٹ کو مطلع کرے۔"

"لیکن وہ ایسا کرنے کے بجائے تم سے مل بیٹھی؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں' وہ جان کی بازی لگا کر ریڈ ڈاٹ کے خلاف ایک آخری داؤ کھیلنے کا فیصلہ کرچکی تھی۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے چند منٹ کے لیے مجھ سے ملاقات کی اور ان چند منٹوں میں اتنی بہت سی معلومات میرے کانوں میں اُنڈیل دیں کہ میرے لیے ان کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔" وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئی۔

ٹونی ہوا میں کسی غیر مرئی چیز کو گھورتے ہوئے بولا "یہ درحقیقت ہمارے لیے بہت بڑی امدادِ غیبی تھی۔ وہاں سے صحیح معنوں میں ہمیں پہلا "بریک تھرو" ملا۔ ورنہ ہم تو کیا نفیس صاحب کی بھی ساری فورس نہ جانے کب تک ٹامک ٹوئیاں مارتی رہتی۔"

راحیلہ بولی "ہنی نے مجھے بتایا کہ جہانگیر کے مقبرے سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ریڈ ڈاٹ کا زیرِ زمین قلعہ تھا۔ مختلف پوش علاقوں میں ان کے پاس کئی بنگلے بھی تھے جو مختلف مواقعوں پر مختلف مقاصد میں استعمال ہوتے تھے لیکن اصل اہمیت اس زیرِ زمین قلعے کی تھی۔ اس کے داخلے کا راستہ اور ہوا کا نظام وغیرہ اس سے بالکل الگ تھلگ ایک کھنڈر میں تھا جسے انہوں نے اپنے سائنسی شعبدوں سے اتنا زیادہ "آسیب زدہ" بنایا ہوا تھا کہ کوئی اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا تھا۔ اس کھنڈر سے جو راستہ زیرِ زمین قلعے تک جاتا تھا اسے تلاش کرنا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔"

لاہور میں جن دنوں میری ریڈ ڈاٹ سے کشمکش چل رہی تھی ان دنوں ہی بہت سی باتوں کی وجہ سے مجھے اکثر شبہ ہوتا تھا کہ کہیں نہ کہیں ان کا کوئی بہت بڑا زیرِ زمین ٹھکانا ضرور موجود تھا لیکن پھر میں یہ سوچ کر خود ہی اپنے خیال کی تردید کردیتا تھا کہ جیمز بانڈ کے ناولوں اور عملی دنیا میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے تھا۔ اس زمانے میں تو چھوٹی موٹی دہشت گرد تنظیمیں بھی اپنے اپنے زیرِ اثر ملکوں میں کوٹھیاں بنگلے حاصل کرکے عام آبادیوں میں ہی اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتی تھیں اور قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکتی رہتی تھیں۔ ان حالات میں ریڈ ڈاٹ جیسی تنظیم کو.... جو غالباً اپنی جڑ بنیاد اور اپنی سائنسی ترقی کے لحاظ سے دنیا کی سب سے طاقتور تنظیم تھی۔ اتنے کھڑاگ میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن اب راحیلہ کی باتوں سے ثابت ہورہا تھا کہ میرا شبہ درست ہی تھا۔

راحیلہ نے بات جاری رکھی "کھنڈر سے جو راستہ کنکریٹ کے اس قلعے تک جاتا تھا اس کے اختتام پر ایک کمپیوٹرائزڈ آہنی دروازہ تھا جس میں ایک کمپیوٹر کارڈ ڈالا جاتا تھا تو چند سیکنڈ بعد اس کا قفل کھلتا تھا لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ کوئی بھی کسی طرح وہ کارڈ حاصل کرکے اس دروازے کی سلاخ میں ڈال دیتا کیونکہ اس پر اپنے انگوٹھے کا نشان بھی ایک خاص جگہ پر ثبت کرنا ہوتا تھا جو انسان کو ویسے نظر نہیں آتا تھا' اگر کمپیوٹر کے ریکارڈ میں انگوٹھے کا وہ نشان موجود ہوتا تھا تو دروازہ کھلتا تھا ورنہ نہیں۔"

"اگر کسی بھی انداز میں طاقت کے استعمال سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی جاتی تو کیا ہوتا؟" میں نے پوچھا۔

"ان کا خودکار دفاعی نظام حرکت میں آجاتا جو کسی چھوٹی موٹی فوج کو تباہ کرنے کے لیے کافی تھا۔" راحیلہ نے جواب دیا "ہنی نے یہ بات مجھے اچھی طرح سمجھادی تھی کہ زبردستی اندر داخل ہونے کی کوشش نہ کی جائے۔ ایک بار دروازے ہی کے راستے اندر داخل ہوجائیں۔ اس کے بعد جو بھی مناسب سمجھیں وہ کریں یا جیسے بھی حالات ہوں اس کے مطابق حکمتِ عملی اختیار کریں۔ اس نے مجھے کارڈ پلاسٹک میں ملفوف کرکے دیا تھا اور اس پر اس کے انگوٹھے کا نشان پہلے ہی ثبت تھا۔ ہمیں اس نادیدہ نشان کی حفاظت کرنا تھی تاکہ وہ نہ تو خراب ہونے پائے اور نہ ہی اس کے ساتھ کسی اجنبی کی انگلیوں کے نشانات گڈمڈ ہوں۔"

راحیلہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوکر اپنا ہاتھ پھیلا کر گویا اپنی انگلیوں کے نشانات میں اُلجھنے لگی۔ ہم کافی ختم کرچکے تھے۔ ٹونی ٹرے اُٹھا کر کچن کی طرف جاتے ہوئے بولا "میں ذرا باہر ہی جارہا ہوں۔ اگر کوئی ضرورت ہو تو مجھے بُلا لیجئے گا۔" اس کے چہرے پر اب گہری سنجیدگی تھی۔ ٹرے کچن میں رکھ کر وہ وہیں سے باہر چلا گیا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد راحیلہ بولی "یوں ہنی کی بدولت ہمارے دو بڑے مسئلے قطعی غیر متوقع طور پر حل ہوگئے۔ یعنی ایک تو

ان کے خفیہ ٹھکانے کا محلِ وقوع معلوم ہوگیا۔ دوسرے اس میں آسانی سے داخل ہونے کا ذریعہ ہاتھ آگیا۔ ہنی نے کسی طرح اس کارڈ کا ڈپلیکیٹ حاصل کیا تھا اور کوئی فیصلہ کن داؤ کھیلنے کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ اسے دراصل تمہارا انتظار تھا۔ تم سے ملاقات کی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ وقت تیزی سے گزرتا جارہا تھا اور اس کی چھٹی حس اسے خبردار کررہی تھی کہ وہ کسی بُرے انجام سے دوچار ہونے والی تھی۔ اس لیے وہ جلد کچھ کر گزرنا چاہتی تھی۔ اس نے مجھے تمہاری جانشین سمجھ کر تمام معلومات میری جھولی میں ڈال دیں۔"

راحیلہ کو جیسے یکدم کوئی خیال آیا۔ چونکتے ہوئے بولی "میں تمہیں نہایت اختصار سے سب کچھ بتارہی ہوں۔ کسی بھی بات کی تفصیل میں نہیں جارہی۔ اس کے باوجود اگر تم بور ہورہے ہو تو مجھے بتادو۔ یہ باتیں پھر کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں۔"

"بیکار باتیں مت کرو۔ جن چکروں نے ہماری زندگی خراب کررکھی ہے ان کے بارے میں سنتے ہوئے میں بور ہونے لگوں گا؟ یہ تو اشتیاق اور تجسس کی زیادتی کی وجہ سے اس وقت میں خلا سے پر اکتفا کررہا ہوں۔ بعد میں اگر آرام و سکون سے بیٹھنا نصیب ہوا اور ذرا زیادہ فرصت میسر آئی تو میں ہر بات پوری تفصیل سے سُنوں گا۔" میں نے تیزی سے کہا۔

تب وہ صوفے کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی "ہنی سے میری ملاقات بھگدڑ کی سی حالت میں ہوئی تھی۔ خوف سے اس کے حواس ٹھکانے نہیں تھے لیکن اس نے مختصر وقت میں جو کچھ مجھے بتادیا وہ میری توقعات سے کہیں زیادہ تھا۔ خوشی اور ہیجان سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں بھاگی بھاگی نفیس صاحب کے پاس گئی۔ میرا خیال ہے اس دوران میں کچھ زیادہ محتاط نہیں رہ سکی اور ریڈ ڈاٹ والوں کی نظر میں آگئی۔"

"اوہ!" میں نہایت دھیمی آواز میں کراہ کر رہ گیا۔

"تاہم یہ اچھا ہوا کہ میں نے فوری طور پر وہ معلومات نفیس صاحب کو منتقل کردی تھیں اور وہ کمپیوٹرائزڈ کارڈ بھی ان کے سپرد کردیا تھا۔ انہوں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور فوری طور پر آپریشن کے انتظامات کیے۔ منصوبہ ان کا یہی تھا کہ اس زیرِ زمین ٹھکانے پر قبضے کی کوشش کی جائے اور جتنے بھی زیادہ سے زیادہ لوگ زندہ ہاتھ آسکیں انہیں زندہ پکڑا جائے لیکن اگر اس میں ذرا بھی دشواری پیش آئے یا ان لوگوں کی طرف سے خطرناک ردِعمل ظاہر ہو تو پھر کسی بات کی پروا کیے بغیر سب کچھ تباہ کردیا جائے لیکن سب تیاریاں کرنے کے بعد جب انہوں نے مجھے بریف کرنے کے لیے میرے ٹھکانے پر تلاش کیا تو میں غائب تھی۔"

"تم کہاں چلی گئی تھیں؟" میں نے جاننا چاہا۔

"مجھے ریڈ ڈاٹ والوں نے اغوا کرلیا تھا۔" اس نے طویل سانس لے کر کہا۔

"اوہ نو" میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا "کیا انہوں نے تمہیں ٹارچر کیا؟"

"ابھی انہوں نے ہلکا پھلکا آغاز ہی کیا تھا۔ کرنٹ وغیرہ لگایا اور کچھ خاص قسم کی چیر پھاڑ کا ارادہ کررہے تھے لیکن انہیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس لیے میں بچ گئی۔ ان کے تو میرے بارے میں بہت لمبے پروگرام تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ ان کے زیرِ زمین قلعے کے خلاف اسی رات آپریشن ہونے والا تھا۔ وہ تو میری برین واشنگ وغیرہ بھی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔"

"انہوں نے تم سے کیا پوچھ گچھ کی؟"

"انہیں پوچھ گچھ کی بھی زیادہ جلدی نہیں تھی۔ ابتدائی طور پر وہ یہی جاننا چاہتے تھے کہ مجھے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کیا معلومات حاصل تھیں اور میں نے انہیں کہاں تک پہنچایا تھا۔ میں ٹال مٹول کرتی رہی۔ انہیں اُلٹے سیدھے جواب دیتی رہی۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اس دوران ہنی بھی وہاں موجود تھی۔ بظاہر وہ سینڈر کی طرح پُرسکون تھی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس کی دلی کیفیت کیا ہوگی۔ اسے یقیناً خدشہ ہوگا کہ میں تشدد کی وجہ سے اس کا پول کھول دوں گی کہ اس نے ہمیں کچھ معلومات فراہم کی تھیں لیکن میں نے زبان بند رکھی۔ تاہم یہ ہم دونوں ہی کی خوش فہمی تھی کہ ریڈ ڈاٹ والوں کو ہماری ملاقات کا علم نہیں تھا۔ ہمیں ملتے ہوئے دیکھ لیا گیا تھا البتہ انہیں یہ علم نہیں ہوسکا تھا کہ ہمارے درمیان کیا بات چیت ہوئی تھی۔ ہنی بھی ان کی نظر میں ایک بار پھر مشکوک ہوچکی تھی لیکن وہ بظاہر انجان بنے ہوئے تھے اور شاید ایک آدھ دن انتظار کرکے دیکھنا چاہتے تھے کہ حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔"

"اس دوران تم پر تشدد کا سلسلہ جاری رہا؟" میں نے مضطربانہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں" اس نے نفی میں سر ہلایا "میں نے بتایا نا کہ انہیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ اسی دوران ایک شخص وہاں نمودار ہوا جہاں مجھے ایک عجیب و غریب سی کرسی پر باندھ کر بٹھایا گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ شخص کہیں باہر سے آیا تھا یا پہلے سے وہیں موجود تھا۔ وہ ایک دُبلا پتلا لمبے قد کا سفید فام تھا۔ جوان تھا مگر اس کی کمر میں بوڑھوں کی طرح خم تھا۔ نوکیلی سی ناک پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک ٹکی ہوئی تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نام برنارڈ تھا اور وہ ایک سرجن تھا۔ ایک سرجن تو کرسچین برنارڈ تھا جس نے تبدیلیٔ قلب کا پہلا کامیاب آپریشن کرکے شہرت پائی تھی لیکن یہ کوئی اور برنارڈ تھا اور کچھ دوسری قسم کا سرجن تھا۔

"وہ لوگ کچھ دیر ایک کونے میں کھڑے کھسر پھسر کرتے رہے پھر وہ سفید فام میرے قریب آیا جو اس وقت تک مجھ سے سوالات کرتا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ وہاں موجود باقی لوگ بھی گویا کسی مذاق سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ مجھ سے پوچھ گچھ کرنے والا سفید فام بولا "ہم تمہیں دوسری سزائیں

بھی دیں گے لیکن زیادہ تر سزائیں ہمیں اس لیے پسند نہیں کہ ان کی تکلیف... ان کے نشانات اور ان کی اذیت ناک یادیں وقت کے ساتھ ساتھ دھندلی پڑ جاتی ہیں لیکن ہم تمہیں فی الحال ایک ایسی سزا دینے لگے ہیں جس کی نشانی تمہارے چہرے پر ہمیشہ موجود رہے گی۔"

"پھر مجھے ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا جو باقاعدہ ایک نہایت جدید قسم کا آپریشن تھیٹر معلوم ہو رہا تھا۔ وہاں اس سرجن نے میرے چہرے پر ایک عجیب قسم کے مارکر سے سیدھی لکیر کھینچ کر گویا اسے دو حصوں میں تقسیم کیا پھر برش کی مدد سے اس پر نہ جانے کس کس طرح کے مخلوط پینٹ کیے جو اس وقت تک تو بے رنگ ہی دکھائی دے رہے تھے۔

"پھر میرے چہرے پر خلا بازوں کے ماسک جیسا ایک ماسک چڑھا دیا گیا۔ اس کے ساتھ بہت سی تاریں منسلک تھیں پھر کوئی سوئچ آن کیا گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے چہرے کے اس آدھے حصے میں مرچیں بھر دی گئی ہوں جس پر کئی طرح کے مخلوط لگائے گئے تھے۔

"میں تڑپنے لگی لیکن انہوں نے زیادہ اذیت پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ فوری طور پر مجھے ایک انجکشن لگا دیا گیا جس کے لگتے لگتے ہی میں سو گئی۔ میری آنکھ کھلی تو میں ایک بار پھر اسی ہال نما کمرے میں تھی جہاں مجھے "آپریشن" سے پہلے رکھا گیا تھا۔

میرے چہرے پر ماسک وغیرہ کچھ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی تکلیف تھی۔ میرے آس پاس چند افراد موجود تھے۔ ایک تو وہی ڈاکٹر برنارڈ تھا۔ اس مردود کے چہرے پر کچھ ایسی طمانیت بھری مسکراہٹ تھی جیسے ایک مصور کوئی شاہکار تخلیق کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ وہ سفید فام بھی بہت خوش نظر آ رہا تھا جو مجھ سے پوچھ گچھ کرتا رہا تھا اور جس نے اپنی نگرانی میں مجھ پر کچھ دیر تشدد کرایا تھا۔ وہاں موجود لوگ اسے مسٹر کم کہہ کر پکار رہے تھے۔ ویسے میرا خیال ہے یہ سب ان کے اصل نام نہیں تھے۔

بہرحال میری کرسی کو ایک دیوار کے قریب دھکیل دیا گیا جس میں بڑا سا آئینہ لگا ہوا تھا۔ میں گردن سیدھی نہیں کر سکتی تھی۔ میری گردن میں بھی نائیلون کا ایک اسٹریپ بندھا ہوا تھا تاہم میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ سکتی تھی جو ایسا ہی نظر آ رہا تھا جیسا اس وقت تم دیکھ رہے ہو۔ میں نے جو کچھ بھی محسوس کیا وہ ایک الگ مسئلہ تھا تاہم مجھے یہ یقین ہرگز نہیں تھا کہ میرا چہرہ مستقل طور پر ایسا ہو چکا تھا۔ مجھے یہ اندیشہ تو محسوس ہوا تھا کہ انہوں نے میرے آدھے چہرے کی جلد جلا دی تھی لیکن ذہن کے کسی گوشے میں یہ اُمید بھی بہرحال موجود تھی کہ اس کا کوئی نہ کوئی حل، کوئی نہ کوئی علاج موجود ہو گا۔

"کم نے دوسرے ہی لمحے یہ اُمید میرے دل سے نکال دی۔ وہ ہنستے ہوئے بولا "ہم تمہارے ساتھ مزید جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہیں وہ ہمیں نہایت حقیر محسوس ہو رہا ہے۔ یہ سزا جو ہم نے فی الحال تمہیں دی ہے، اس وقت تمہیں زیادہ تکلیف دہ محسوس نہیں ہوئی ہو گی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تمہیں اس کی اذیت کا صحیح اندازہ ہو گا۔ اگر ہم نے تمہیں چھوڑ بھی دیا اور اس وقت جسمانی طور پر تمہاری حالت زیادہ عبرت ناک نہ بھی ہوئی تب بھی تمہارے لیے صرف یہی ایک سزا کافی ہو گی۔ ایک خوب صورت لڑکی کے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ سزا کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا چہرہ مضحکہ خیز بنا دیا جائے۔ وہ آسانی سے کہیں آ جا بھی نہ سکے۔ لوگوں میں اٹھ بیٹھ نہ سکے۔ صحیح معنوں میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔"

"وہ سب اپنے اس مذاق پر بہت محظوظ ہو رہے تھے۔ کم نے گویا میری معلومات میں اضافہ کیا "دنیا کا کوئی ماہر ترین سرجن بھی نہ تو اب چہرے کے اس حصے کی گرافٹنگ کر سکتا ہے اور نہ ہی جلد کا کوئی بڑے سے بڑا ماہر اس کا رنگ تبدیل کر سکتا ہے۔ اس کا علاج صرف اور صرف ڈاکٹر برنارڈ کے پاس ہے اور ڈاکٹر برنارڈ ہمارے پاس ہے۔" راحیلہ میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرائی اور خاموش ہو گئی۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" وہ گہری سانس لے کر بولی "تم میرے چہرے کے بارے میں تفصیل جاننے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ کہانی تو یہیں ختم ہو گئی۔"

"کیا انہوں نے تمہیں رہا کر دیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، وہ مجھ پر اتنے مہرباں نہیں تھے۔" راحیلہ مسکراتے ہوئے بولی "ہوا یہ کہ اس رات پچھلے پہر تک میری تلاش میں ناکام رہنے کے بعد نفیس صاحب نے اپنے تیار کردہ پلان کے مطابق ریڈ ڈاٹ کے زیرِ زمین قلعے پر حملہ کر دیا۔ انہیں یہ شبہ تو تھا کہ ریڈ ڈاٹ نے مجھے اغوا کرا لیا ہے لیکن یہ یقین نہیں تھا کہ میں اسی زیرِ زمین قلعے میں موجود تھی ورنہ شاید وہ مجھے بہ حفاظت بازیاب کرانے کے لیے کوئی حکمتِ عملی تیار کرنے کی کوشش کرتے جو تقریباً ناممکن سا ہی کام تھا۔ یہ تو بس میری قسمت ہی اچھی تھی کہ میں اس قسم کی کسی حکمتِ عملی کے بغیر بھی زندہ بچ گئی۔ نہ صرف زندہ بچ گئی بلکہ میں نے ان کی قیدی ہوتے ہوئے بھی انہی کے خلاف آپریشن میں حصہ لیا۔"

"مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اُمیدیں وغیرہ تو سب دھری رہ جاتیں۔ وہ تو بس قسمت نے ساتھ دے دیا۔" راحیلہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اس میں میری صلاحیتوں وغیرہ کا کوئی دخل نہیں تھا۔ میں تو بدستور اس وہیل چیئر نما چیز پر بندھی ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں حتیٰ کہ گردن تک چمڑے کے یا پھر شاید نائیلون کے تسموں میں کسی ہوئی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت مجھ پر زندگی میں شاید پہلی بار مایوسی نے غلبہ پایا تھا۔ میں نہ صرف اپنی زندگی کی طرف سے مایوس ہو چکی تھی

بلکہ مجھے اپنا انجام بھی نہایت بھیانک نظر آ رہا تھا۔

"مجھے وہاں بے پناہ سردی لگ رہی تھی اور کسی نے میرے اوپر کمبل تک نہیں ڈالا تھا۔ وہ سب جیسے مجھے اس بڑے سے کمرے میں چھوڑ کر بھول گئے تھے۔ میں اس وقت خدا سے یہ دعا مانگ رہی تھی کہ مجھے کسی اذیت ناک انجام سے دوچار کرنے کے بجائے خاموشی سے موت دے دے۔

"اچانک گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ بے تحاشہ فائرنگ ہونے لگی۔ دھماکے گونجنے لگے۔ وہاں خنک ہوا کی سپلائی کا جو نظام موجود تھا وہ بھی جیسے یکدم ہی جواب دے گیا۔ گھٹن محسوس ہونے لگی اور ہر طرف بارود کی بو پھیلنے لگی۔ موت تو مجھے گویا سامنے ہی نظر آ رہی تھی لیکن میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکی کہ میں نے تو اللہ سے پُرسکون موت کی دعا کی تھی، یہ مجھے کس انداز میں موت آ رہی تھی؟

"مجھے بعد میں پتا چلا کہ نفیس صاحب خود اس کمپیوٹر کارڈ کے ذریعے دروازہ کھول کر اس قلعے میں داخل ہوئے تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی قیادت خود کر رہے تھے۔ روایتی افسروں کی طرح کسی محفوظ جگہ پر بیٹھ کر حکم نہیں چلا رہے تھے حالانکہ وہ انٹیلی جنس کے شعبے کے آدمی ہیں۔ میدانِ جنگ کے آدمی نہیں ہیں لیکن اس روز وہ سب مشین گن اٹھائے سب سے آگے تھے۔

"وہ ایک عجیب ساخت کا مکان تھا۔ اس کی دیواروں تک میں آلات نصب تھے اور وہاں کی ہر چیز کمپیوٹرائزڈ تھی۔ اس کی بعض دیواریں سیمنٹ اور اینٹوں وغیرہ کے بجائے پلاسٹک جیسے کسی میٹریل سے بنی ہوئی لگتی تھیں۔ جلد ہی وہ دیواریں ٹوٹنے لگیں اور ان میں سے دُھواں نکلنے لگا۔

"اس دوران ہنی دوڑتی ہوئی میرے کمرے میں آئی۔ وہ سخت دہشت زدہ تھی۔ وہ شاید مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اسے ایک لفظ بھی بولنے کا موقع نہیں ملا۔ دو تین آدمی عجیب ساخت کی گنیں لیے اس کے پیچھے تھے۔ ان میں سے ایک چیخ کر بولا "یہاں غدار صرف یہی ہو سکتی ہے۔ اسی کی وجہ سے کارڈ باہر گیا ہو گا۔ میں نے باس سے پہلے ہی کہا تھا اس پر بھروسا مت کرو۔"

دوسرا چیخ کر بولا "لیکن اسے مارو مت۔ اسے ہم انہی لوگوں کے سامنے اچانک پھینکیں گے۔ اسے انہی کی گولیوں کا نشانہ بننے دو۔"

"وہ اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔ میری طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ میں تو ویسے بھی بندھی پڑی تھی۔ انہوں نے اپنی دانست میں تو مجھے مرنے کے لیے ہی چھوڑ دیا تھا۔ میرے اردگرد قیامت کا شور جاری رہا۔ کہیں فلیش لائٹ کے سے جھماکے بھی ہو رہے تھے جس کی نیلگوں روشنی ایک ثانیے کے لیے کمرے میں پھیل جاتی تھی۔ پھر ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ آدھی چھت ٹوٹ کر ترچھی کمرے میں آن گری لیکن وہ تختے کی طرح دیواروں کے درمیان پھنس گئی اور خدا کی قدرت دیکھو کہ میں جس حصے میں تھی اس طرف نہیں گری۔ مجھ پر وہ ایک سائبان کی طرح ترچھی کھڑی ہو گئی۔ اس میں نیچے کنارے کی طرف سے آگ لگنا شروع ہو چکی تھی۔ تپش اور گھٹن سے میں تقریباً بے ہوش ہونے والی تھی۔

"دفعتاً گول گول سی آنکھوں والا ایک شخص اندر آیا۔ میں اسے پہلے بھی وہاں دیکھ چکی تھی اور کوئی ہونق قسم کی چیز سمجھی تھی لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کوئی الیکٹرانک وزرڈ کوئی نہایت جینیئس قسم کی چیز تھا اور وہ ویسے ہی تھا، دراصل وہی ہنی کا محبوب عدنان تھا جسے معلوم نہیں کیوں وہاں مسٹر جے کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ ہنی کو نہیں پہچانتا تھا اور نہ ہی اسے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ یاد تھا۔ ممکن ہے کسی مصلحت کے تحت اس نے ایسا رویہ اختیار کر رکھا ہو۔ وہ ہر وقت کچھ وحشت زدہ سا دکھائی دیتا تھا جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں گول گول سی معلوم ہوتی تھیں۔

"اس وقت وہ میرے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا۔ اس نے کرسی کے پیچھے لگے ہوئے کچھ بٹن دبائے اور میری بندشیں کھل گئیں۔ اس کے پاس خوف ناک سی ایک گن تھی جو اس نے مجھے دے دی اور صرف ایک جملہ کہا "اگر یہاں سے جان بچا کر نکل سکتی ہو تو فوراً نکل جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ پٹ سے گرا اور مر گیا۔ تب میں نے دیکھا، اس کے سینے میں دو تین گولیاں پیوست تھیں، زندگی کے آخری چند لمحے اس نے میری زندگی بچانے میں صرف کر دیے اور اس طرح میرے کام آیا کہ میں اس کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی۔" وہ متاسفانہ سے انداز میں خاموش ہو گئی۔ ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ میرے دل کا بوجھل پن بھی بڑھتا جا رہا تھا لیکن میں اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔

"بس... میں بندشوں سے آزاد ہوئی اور گن میرے ہاتھ میں آئی تو گویا میرے جسم میں نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے بھی اس معرکے میں حصہ لیا۔ وہ بلاشبہ ہمارے لیے قیامت کی سی رات تھی۔ نفیس صاحب کی کوشش تھی کہ وہاں سے کچھ لوگ زندہ ہاتھ آ جاتے لیکن انہوں نے مرنے یا مار دینے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ بہت خون ریزی ہوئی۔ نفیس صاحب کے بھی بہت سے آدمی مارے گئے۔ انہوں نے ہمارے ساتھیوں کو قربانی کا بکرا نہیں بنایا تھا۔ انہیں پیچھے رکھا تھا اور اپنے کمانڈوز کو آگے رکھا تھا۔ اس وقت تک ان کا خیال تھا کہ ان کے کمانڈوز ہمارے ساتھیوں سے لڑ رہے تھے۔"

"کیا اب ان کی رائے بدل چکی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے دل ہی دل میں تو بدل چکی ہے۔ زبان انہوں نے کبھی کسی واضح رائے کا اظہار نہیں کیا۔" راحیلہ

جواب دیا "بہرحال ان کی حکمتِ عملی عمدہ تھی۔ جانی نقصان پھر بھی توقع سے کم ہوا۔ ریڈ ڈاٹ کے تو جتنے بھی لوگ وہاں موجود تھے سب مارے گئے۔ دراصل وہ حملہ ان کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ انہوں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی دروازہ کھول کر بھی اندر آسکتا تھا' اگر کوئی دیوار یا دروازہ توڑ کر اندر گھسنے کی کوشش کرتا تو خود بخود ان کا دفاعی نظام حرکت میں آجاتا اور انہیں خود بھی سنبھلنے کا موقع مل جاتا۔ اس صورت میں ان کا اپنا جانی نقصان بہت کم ہوتا۔ ہمارے بہت آدمی مارے جاتے۔ انہیں اپنے سائنسی شعبوں کو استعمال کرنے کا بھی موقع نہیں ملا پھر بھی انہوں نے جو آتشیں ہتھیار استعمال کیے ہمارے ہتھیاروں کے مقابلے میں تو وہ بھی نہایت جدید اور خطرناک تھے۔"

"کیا وہ زیرِ زمین قلعہ مکمل طور پر تباہ ہوگیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں مکمل طور پر تو نہیں۔" راحیلہ بولی "وہاں سے بہت سی کام کی چیزیں ہمارے ہاتھ لگیں۔ لوگ' بہرحال سب مارے گئے۔ انہوں نے پکڑے جانے پر ... مرجانے کو ترجیح دی۔ نفیس صاحب کی نظر میں یہ ایک کامیاب آپریشن رہا۔"

"اور تمہاری نظر میں؟" میں نے دریافت کیا۔

اس نے کندھے اُچکائے اور طویل سانس لے کر بولی "میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکی۔ ایک لحاظ سے تو اچھا ہوا کہ ریڈ ڈاٹ کا ہم پر جو ہوّا سا بیٹھا ہوا تھا اور ہمیں وہ کوئی طلسماتی سی چیز لگتی تھی وہ تصور ٹوٹ گیا۔ ان کا ٹھکانا اس طرح تباہ ہونے اور اتنے لوگوں کے مارے جانے سے ہمارے حوصلے بڑھے۔ ہمیں یقین ہوگیا کہ وہ بھی قابلِ شکست ہیں ورنہ لاشعوری سے انداز میں شاید ہم سب یہ سوچتے تھے کہ وہ کوئی ناقابلِ شکست طاقت ہیں۔ ایک بات بہرحال طے ہے اگر نفیس صاحب مکمل طور پر اس کے لیے کمربستہ نہ ہوتے تو یہ کام بہت مشکل تھا۔ اس کے لیے بہت زیادہ وسائل اور بہت زیادہ مین پاور چاہیے تھی جو ہمارے پاس نہیں تھی۔ ہم شاید ایک ایک کرکے ان سے ٹکرا کر مرتے رہتے' تباہ ہوتے رہتے۔ ہم ان پر اتنا بڑا حملہ نہیں کرسکتے تھے' جتنے بڑے حملے کا انتظام نفیس صاحب نے کیا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا' ہمارے ہاں اتنے بہت سے غیر ملکی آکر زیرِ زمین قلعے تک تعمیر کرلیتے ہیں اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔" میں نے تعجب سے کہا۔

"ہمارا ملک تو ایک مدت سے انٹرنیشنل یتیم خانہ بنا ہوا ہے۔ جتنی تعداد میں غیر ملکی چاہیں یہاں آکر' جو دل چاہے کرتے رہتے ہیں۔ سفید فام قوموں کا تو ویسے ہی آج تک ہم پر تسلط ہے۔ انہیں تو جو کرنا ہوتا ہے دھونس سے کرتے ہیں۔ ویسے بھی وہ لوگ بہت مکار ہیں۔ کسی مشن' کسی اسٹڈی ٹور' آرکیالوجی کی کسی مہم یا ہماری ہی درخواست پر کیے گئے جیالوجیکل سروے وغیرہ کی آڑ میں نہ جانے کیا کچھ کرکے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں کچھ پتا نہیں چلتا۔ ہم لوگ صرف بس وقت ہوش میں آنے کے عادی ہیں جب پانی سر سے اونچا ہوچکا ہوتا ہے۔ میں تو شکر کررہی ہوں کہ اب بھی ریڈ ڈاٹ کے بارے میں فیصلہ کن کارروائی ہوگئی اور ابھی مزید کارروائی جاری ہے اگر اب بھی اس سلسلے میں کچھ نہ ہوتا تو ہم کیا کرلیتے!"

میں اس کی تائید میں سرہلائے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "میرے لیے ایک لحاظ سے یہ آپریشن مایوس کن رہا کیونکہ میرا چہرہ ایسا کا ایسا ہی رہ گیا۔ وہاں جو لوگ مارے گئے ان میں ڈاکٹر برنارڈ کی لاش نہیں تھی اور نہ ہی وہ زندہ ہاتھ آیا۔ وہ غالباً میرے چہرے پر اپنی کاریگری کا مظاہرہ کرنے کے بعد وہاں سے چلا گیا تھا۔ چنانچہ اب میری زندگی کی جو دیگر مصروفیات چل رہی ہیں وہ تو اپنی جگہ ہیں لیکن ان کے ساتھ ایک نئی اور اہم مصروفیت یہ پیدا ہوگئی ہے کہ مجھے ڈاکٹر برنارڈ کو تلاش کرنا ہے ورنہ باقی زندگی میرا چہرہ ایسا ہی رہے گا۔"

پھر ذرا توقف سے وہ بولی "ویسے میں نے ایسے ہی چہرے کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرلیا ہے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنے کی۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر برنارڈ اگر پاتال میں بھی اُتر گیا ہوگا تو میں تمہارے لیے اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔"

"یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں' اسے ذہن پر سوار مت کرو۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

"زیادہ بے نیاز بننے کی کوشش مت کرو۔" میرے لہجے میں غیر ارادی طور پر ہلکی سی اداسی ... آگئی "میری وجہ سے پہلے ہی تمہارا بہت کچھ چھن چکا ہے اور اب چہرہ بھی....." میری سانس بوجھل سی ہوگئی "وہ مردود ریڈ ڈاٹ والے ٹھیک کہہ رہے تھے ایک حسین لڑکی کے لیے اس کا چہرہ قدرت کا انعام بھی ہوتا ہے اور اس کا ایک اہم اثاثہ بھی۔ انہوں نے واقعی بڑی ستم ظریفانہ سفاکی کا مظاہرہ کیا ہے' پورا چہرہ سیاہ ہو تو مضحکہ خیزی کا پہلو نہیں نکلتا۔ ایسے چہرے کے ساتھ واقعی ایک لڑکی اس سوسائٹی میں کس طرح زندگی گزار سکتی ہے۔"

"میں گزار لوں گی۔ زندگی کچھ اتنی طویل بھی نہیں ہوتی جتنی محسوس ہوتی ہے۔" وہ بدستور بے پروائی سے بولی "اور خدا کے لیے تم میری خاطر اپنے آپ کو مجرم مجرم محسوس کرنا چھوڑ دو۔ یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ میری زندگی میں وہی کچھ ہوگا جو کاتبِ تقدیر نے لکھ دیا ہوگا۔ تم کسی بھی چیز کے ذمے دار نہیں ہوگے۔"

"شکریہ' میرے ضمیر اور ذہن پر سے بوجھ کم کرنے کی اس مخلصانہ کوشش کا بہت شکریہ۔" میں نے کہا "بہرحال ڈاکٹر برنارڈ کو

تلاش کرنا صرف تمہاری ذمے داری نہیں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں اکیلی ہی اسے تلاش کررہی ہوں۔ تمام ساتھیوں نے بھی اس کام کو سرِفہرست رکھا ہوا ہے۔ اب تم آگئے ہو تو ظاہر ہے تم بھی اس مسئلے سے لاتعلق تو نہیں رہ سکتے۔ نفیس صاحب اور ان کے آدمیوں نے بھی ڈاکٹر برنارڈ کی تلاش کے کام کو فراموش نہیں کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہر ممکن کوشش کی بھی جارہی ہے۔ ایک ایک سفید فام غیر ملکی کو چیک کیا جارہا ہے۔ اس کی شکل و شباہت سب کو ذہن نشین کرادی گئی ہے۔"

پھر وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی اور بولی "میں اپنے آپ کو اس لیے بھی اسی چہرے کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کررہی ہوں کہ اگر ڈاکٹر برنارڈ مل بھی گیا اور وہ میرا چہرہ ٹھیک کرنے پر تیار نہ ہوا تو کیا ہوگا؟"

"اس کا تو باپ بھی تیار ہوگا۔" میں نے بے ساختہ کہا "اس کے آباواجداد کی روحیں بھی آکر اس کے سامنے ہاتھ جوڑیں گی کہ اسے جو کچھ کہا جارہا ہے وہ ضرور کرے۔"

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے ہنسی "اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ پہلے صرف یہ دعا کرو کہ برنارڈ مل جائے۔"

"مل جائے گا مل جائے گا۔" میں نے گویا اسے نہیں بلکہ خود کو یقین دلایا پھر پوچھا "لیکن اس سے پہلے کیا تم نے یہاں اپنی سی کوششیں کرکے نہیں دیکھیں؟ ہمارے ملک میں بھی تو جلدی امراض کے بڑے بڑے ماہر پڑے ہیں۔"

"بہت سی کوششیں کی جاچکی ہیں۔ میں لاہور اور کراچی بھی ہو آئی ہوں' جلد کے بڑے بڑے ماہرین نے کچھ دوائیں آزمائیں جن سے کوئی فرق پڑنے کے بجائے اُلٹا تکلیف شروع ہوگئی اور سیاہ جلد پر مزید بدنمائی کے آثار پیدا ہونے لگے تو میں نے فوراً توبہ کرلی۔ کم از کم اس وقت کوئی تکلیف تو نہیں ہے اور جلد بھی ہموار ہے۔" وہ اپنے چہرے کے سیاہ حصے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے مزید بتایا "جلد کے بے شمار ٹیسٹ بھی چند دنوں کے اندر اندر ہوچکے ہیں' جلد کے کچھ ذرّے کھرچ کر باہر کی کسی لیبارٹری میں بھی ٹیسٹ کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ وہاں سے بھی کوئی ہمت افزا جواب نہیں آیا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ کسی حیرت انگیز طریقے سے الٹرا وائیلٹ شعاعیں اتنی طاقت کے ساتھ جلد میں جذب کردی گئی ہیں کہ جلد کے ذرات میں مستقل تبدیلی آگئی ہے لیکن میرا خیال ہے جس طرح ڈاکٹر برنارڈ نے کچھ فارمولوں کے تحت تھوڑی سی دیر میں یہ کام کیا تھا اسی طرح اس کے پاس انہیں بے اثر کرنے کا بھی کوئی فارمولا ہوگا۔ اس کا کوئی توڑ ہوگا۔"

"یقیناً" میں نے سرہلایا "یہ مسئلہ حل ہوجائے گا تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں فکرمند ہوں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"چلو مان لیا تم فکرمند نہیں ہو لیکن میں ضرور فکرمند ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ یہ تسلی میں خود کو دے رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

چند لمحوں کی بوجھل سی خاموشی کے بعد راحیلہ گہری سانس لے کر بولی "بہرحال یہ تھی میری داستانِ غم۔ تمہاری عدم موجودگی میں جو کچھ ہوا اب تم اس سے آگاہ ہوچکے ہو۔ اس کے بعد کے حالات تمہارے سامنے ہیں۔ اب تمہارا پروگرام کیا ہے؟"

"آج تو میں آرام کروں گا۔ میں بھی بڑی ذلت کے روز و شب گزار کر آرہا ہوں۔ نہ جانے کتنی راتیں ایسی گزری ہیں جب مجھے دو چار گھنٹے کے لیے بھی سونا نصیب نہیں ہوا اور پے در پے عجیب و غریب احمقانہ قسم کے حالات سے واسطہ پڑتا رہا۔ اگر تم اجازت دو گی تو ایک رات یہاں گزار لوں گا۔"

"مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ اس مکان میں تین بیڈ روم ہیں۔ ایک میں تم ڈیرا لگالینا جو روکھی سوکھی میسر ہوگی کھالینا۔" وہ کندھے اُچکا کر بے نیازی سے بولی۔

"بہت شکریہ میڈم! آپ نے اس خانہ بدوش کو پناہ عنایت فرمائی۔"

"یوں کہو کہ ایک خانہ بدوش نے دوسرے خانہ بدوش کو پناہ عنایت فرمائی ہے۔ راحیلہ نے تصحیح کی۔

میں نے اپنی واسکٹ اُتار کر ذرا پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا "کل نفیس صاحب کی خدمت میں حاضری دینی ہے۔ دیکھیں' وہ میرے لیے کیا کام تجویز فرماتے ہیں۔ کہیں وہ مجھے ایک طوطا دے کر کسی فٹ پاتھ پر فال نکالنے کے لیے نہ بٹھادیں۔"

"یہ تو تمہارے لیے بہت ہی موزوں کام ہوگا۔ سب سے پہلے میری فال نکالنا۔" راحیلہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"تمہاری فال طوطا نہیں' اُلّو صحیح طریقے سے نکالے گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"چلو پھر تو کام اور بھی آسان ہوجائے گا۔ یعنی تم خود ہی نکال لوگے۔" وہ مجھ سے بھی زیادہ سنجیدگی سے بولی۔

میں نے خون خوار نظروں سے اسے گھورا پھر دھیمے لہجے میں کہا "فال وال نکلوانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تمہارے حالات صرف ایک ہی صورت میں ٹھیک ہوسکتے ہیں اور وہ یہ کہ تم اللہ کے ایک نیک بندے سے شادی کرلو جس کا نام محمدؐ افضل چوہدری ہے۔"

اب اس کی مجھے خونخوار نگاہوں سے گھورنے کی باری تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی "اسے تم اللہ کا نیک بندہ کہہ رہے ہو؟"

"ہاں کیا بُرائی ہے اس میں؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

"کوئی ایک بُرائی ہو تو بتاؤں۔" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی "اس سے تو اپنے حالات ہی نہیں سنبھلتے۔ اس کے ساتھ شادی کرکے

میرے حالات کیا ٹھیک ہوں گے۔"

"اصل میں اس کے اور تمہارے حالات بیک وقت اسی لیے تو خراب ہیں کہ تم دونوں کے ستارے الگ الگ سمتوں میں آوازیں پھر رہے ہیں' شادی ہوجائے گی تو ستارے مل جائیں گے اور دونوں کا صحیح سمت میں سفر شروع ہوجائے گا' حالات بالکل ٹھیک ٹھاک ہوجائیں گے۔" میں نے کہا۔

اس نے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولی "یہاں کوئی ایسی چیز بھی تو نہیں ہے جو اٹھا کر تمہارے سر پر مار سکوں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے تم حکم تو دو۔ جہاں کہو وہاں اپنا سر خود دے ماروں۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔

وہ ایک لمحے خاموشی سے مجھے گھورتی رہی پھر اُلجھن زدہ سے لہجے میں سنجیدگی سے بولی "کیا مجھ سے شادی کا بھوت واقعی ابھی تک تمہارے سر سے نہیں اُترا؟"

"یہ بڑا ڈھیٹ' ضدی اور مستقل مزاج قسم کا بھوت ہے۔ یہ کبھی میرے سر سے نہیں اُترے گا۔ ایک نہ ایک روز میں تمہیں قائل کرکے چھوڑوں گا۔" میں نے غیر متزلزل لہجے میں کہا۔

"میرا مطلب ہے" اس نے اپنے چہرے کی طرف اشارہ کیا "کیا اس کے بعد بھی تم مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو؟"

"بالکل تیار ہوں اگر تمہیں کوئی شک ہے تو ابھی ٹونی کو بھیج کر کسی نکاح خواں کو بُلوالو۔ سچائی کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہوسکتا ہے؟ میں تو عملی آدمی ہوں' عملی بات کرتا ہوں۔ اب تو معاملہ اس لحاظ سے بہت اچھا ہے کہ لوگ میری بیگم کو دیکھیں گے تو کہیں گے' واقعی اب میں اپنے گھر میں سیاہ و سفید کا مالک ہوگیا ہوں۔"

وہ ایک بار پھر مجھے خاموشی سے گھورنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ آخر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "تمہارا واقعی کوئی پُرزہ گرا ہوا ہے۔"

"نہیں پُرزہ نہیں گرا ہے۔ یہ مینوفیکچرنگ فالٹ ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "بہرحال بات خواہ کچھ بھی ہو لیکن تمہیں اب یہ یقین تو آجانا چاہیے کہ تمہیں مجھ جیسا مستقل مزاج عاشق دنیا میں کہیں نہیں مل سکتا۔ میں شوہر بھی ایسا ہی وفادار ثابت ہوں گا۔"

"مجھے عاشق کی ضرورت ہے نہ شوہر کی۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی "آخر تم ہر تھوڑے عرصے بعد یہ بے ہودہ موضوع کیوں لے کر بیٹھ جاتے ہو؟"

"توبہ کرو .... توبہ۔" میں نے گال پیٹتے ہوئے کہا "اتنے ضروری اور اہم موضوع کو بے ہودہ کہتی ہو۔ اس دنیا میں اکثریت شادی شدہ لوگوں کی ہے' تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ سب بے ہودہ زندگی گزار رہے ہیں؟"

"میں کیا کہہ رہی ہوں وہ خود اپنے بارے میں یہی کہتے ہیں۔" راحیلہ بُرا سا منہ بنا کر بولی "سال دو سال میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گزارتے ہیں تو سارا عشق ہوا ہوجاتا ہے۔ باقی صرف بک بک رہ جاتی ہے۔ جو کچھ جس طرح ہے اسے بس اسی طرح رہنے دو۔ اس خوب صورت تصویر کو خراب مت کرو۔"

اچانک باہر کسی کے باتیں کرنے کی آواز سُنائی دی۔ جواباً ٹونی کچھ کہہ رہا تھا۔ راحیلہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولی "میں دیکھتی ہوں۔"

اس نے کھڑکی کا پردہ ذرا ہٹا کر باہر دیکھا پھر جلدی سے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "یہ تو اسپتال سے کوئی آیا ہے۔"

میں بھی اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے دروازے تک پہنچا۔ لان پر کوئی باوردی نوجوان کھڑا ٹونی سے بات کررہا تھا۔ وہ وارڈ بوائے معلوم ہوتا تھا۔ ٹونی بولا "میڈم! آپ فوراً اسپتال چلیں۔ ہنی کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی ہے۔"

راحیلہ جلدی سے اندر آئی اور ایک بار پھر اپنا چہرہ برقع کی نقاب اور چشمہ وغیرہ کے عقب میں چھپانے کا اہتمام کرنے لگی۔ اسی دوران فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ فون آئی سی یو سے تھا اور وہاں موجود ڈاکٹر راحیلہ کو ہنی کے بارے میں وہی اطلاع دے رہا تھا جو وارڈ بوائے لے کر آیا تھا۔

ٹونی وہیں رہا۔ میں اور راحیلہ بھاگم بھاگ آئی سی یو میں پہنچے۔ ہنی بالکل اسی طرح آنکھیں بند کیے سیدھی لیٹی تھی جس طرح ہم اسے بہت دیر پہلے چھوڑ کر گئے تھے۔ اس کے قریب دو ڈاکٹر اور دو نرسیں افسردہ انداز میں سر جھکائے کھڑی تھیں۔ اس کے جسم سے جو مشینیں تاروں اور نالیوں کے ذریعے منسلک تھیں۔ ان کے ڈائلوں پر سوئیاں ساکت ہوچکی تھیں۔ اس کے پاس پہنچتے ہی سب سے پہلے میں نے یہی بات نوٹ کی تھی۔ میرے دل کو دھچکا سا لگا۔

ہمارے پہنچنے پر ایک ڈاکٹر نے تھکے تھکے سے انداز میں سر اُٹھایا اور راحیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میڈم! ہمیں افسوس ہے ہم اسے نہیں بچا سکے۔"

"تمہارا کام صرف کوشش کرنا تھا سو تم کرتے رہے۔ بچانے والا تو کوئی اور تھا۔ اسے منظور ہوتا تو بچا لیتا۔" راحیلہ نہایت دھیمے لہجے میں بولی اور ہنی کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے چادر ذرا سی ہٹا کر ہنی کا استخوانی ہاتھ تھام لیا۔ اس ہاتھ میں بھی ڈرپ کی سوئی پیوست تھی۔

ڈاکٹر اور نرسیں کیبن سے باہر چلی گئیں۔ میں نے ہنی کے دوسری طرف بیٹھتے ہوئے اس کا دوسرا ہاتھ تھام لیا۔ وہ برف کی طرح سرد تھا اور نیلا پڑچکا تھا۔ اس لمس کے ذریعے گویا موت کی یخ بستگی میرے رگ و پے میں بھی رینگنے لگی۔ میرے دل میں ہولناک سا سناٹا پھیل گیا۔ شدتِ غم سے میری یہی حالت ہوتی تھی۔ آنسو بہتے نہیں تھے' انگارے بن کر اندر ہی اندر دل کو جلاتے تھے۔ میں آہ و بکا نہیں کرتا تھا شاید اسی لیے میرے اندر ایک اذیت ناک سناٹا پھیل جاتا تھا۔

راحیلہ نے ایک ہاتھ سے اپنا تاریک چشمہ ذرا کھسکایا اور ٹشو پیپر سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ میں نے ایک بار پھر ہنی کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ وہ چہرہ پہلے بھی گویا ایک مُردے ہی کا چہرہ تھا۔ اب اس کی مُردنی میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا تھا بلکہ اُلٹا اب تو اس چہرے پر طمانیت سی پھیل گئی تھی' شاید ایک لحاظ سے موت اس کے لیے خوش آئند ہی تھی۔ اسے نہ جانے کس کس اذیت سے چھٹکارا مل گیا تھا۔

کئی منٹ تک کیبن میں سناٹا چھایا رہا۔ یہ موت کا سناٹا تھا پھر راحیلہ سر اُٹھاتے ہوئے آنسوؤں سے بھیگی اور بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی "شاید تمہارے ہی انتظار میں اس کے سینے میں سانس اٹکی ہوئی تھی۔ تم سے اس کے ملنے کی خواہش یقیناً بڑی شدید تھی تبھی تم اچانک بالکل غیر متوقع طور پر چلے آئے۔ شاید اسی کی کوئی خاموش دعا تمہیں یہاں کھینچے لارہی تھی۔"

"شاید" میں نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا "لیکن افسوس کہ میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکا۔"

"اس کا تو مجھے بھی زندگی بھر افسوس رہے گا۔ میں بھی اس کے لیے کچھ نہیں کرسکی حالانکہ صرف اسی کی وجہ سے ہمارے لیے ریڈ ڈاٹ پر ہاتھ ڈالنا اور اتنی بڑی کارروائی کرنا ممکن ہوسکا۔ اس کے علاوہ اسی کے ماضی کے دوست عدنان کی وجہ سے میری جان بچی ورنہ شاید میں ریڈ ڈاٹ کے اسی زیرِ زمین قلعے میں بے بسی سے ایک وہیل چیئر پر بندھی' آگ اور دُھوئیں میں جل کر دم گھُٹ کر مرجاتی اور کسی کو پتا بھی نہ چلتا۔ افسوس ہم اپنی اس محسنہ کو بچا نہیں سکے۔"

"اس نے زندگی میں بہت سے اچھے اچھے کام کیے۔ کاش یہ ایک خوش انجام لڑکی ہوتی!" میں نے اذیت سے کہا۔

"شاید دوسری دنیا میں یہ ایک خوش انجام لڑکی ہو۔" راحیلہ سسکی لینے کے سے انداز میں بولی پھر اس نے اپنے برقع کی کسی جیب سے موبائل فون نکالا اور نمبر ملا کر بات کرنے لگی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا۔ وہ نفیس صاحب سے بات کررہی تھی۔ وہ انہیں ہنی کی موت کی اطلاع دے رہی تھی۔ انہوں نے غالباً اظہارِ افسوس کیا اور اسے کچھ ہدایات دیں۔ آخر وہ فون بند کرکے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آؤ چلتے ہیں" وہ بوجھل لہجے میں بولی "اسپتال والے اور نفیس صاحب کے آدمی اس کی تکفین اور تدفین کا انتظام کردیں گے۔ یہ کہانی ختم ہوگئی! ہم اب اسے کوئی اور انجام نہیں دے سکتے۔"

میں بادلِ نخواستہ اس کے ساتھ باہر آگیا۔ اس نے ڈاکٹروں اور نرسوں کو کچھ ہدایات دیں۔ آخرکار ہم آئی سی یو سے نکل آئے۔ اس وقت شام کے سرمئی سائے پھیلنے لگے تھے۔ اسپتال کا ماحول یوں بھی کچھ ایسا روح پرور نہیں ہوتا خواہ اسپتال کتنا ہی اعلیٰ درجے کا کیوں نہ ہو لیکن اس وقت تو جیسے واقعی وہاں در و دیوار پر اُداسی بال کھولے سو رہی تھی' کچھ دیر پہلے میں راحیلہ سے نوک جھونک سے محظوظ ہورہا تھا لیکن اب گویا یکدم ہی میرے اندر کا موسم بدل گیا تھا۔

راحیلہ کی حرکات و سکنات میں بھی اب تک جو مستعدی نظر آرہی تھی وہ اب مفقود تھی۔ وہ سر جھکائے کچھ ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں چلتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی "حالانکہ یہ خبر ہمارے لیے کئی دن سے متوقع تھی۔ یہ کوئی اچانک رونما ہونے والا واقعہ نہیں ہے پھر بھی نہ جانے کیوں دل کو بڑا دھچکا لگا ہے۔"

میں خاموش رہا۔ میرا اس وقت اپنے محسوسات کے اظہار کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "اب شاید میرے یہاں رہنے کی بھی ضرورت نہ رہے۔ میں صرف ہنی کی وجہ سے اسپتال میں ٹھہری ہوئی تھی اور ٹونی میری وجہ سے یہاں ڈیوٹی دے رہا تھا۔"

"تو پھر اب ہم کہاں جائیں گے؟" میں نے حلق میں پھیلی کوئی کڑواہٹ سی نگلتے ہوئے پوچھا۔

"آج کی رات تو یہیں گزارتے ہیں' دیکھتے ہیں صبح ہمیں کیا احکامات ملتے ہیں۔" پھر راحیلہ ذرا توقف سے بولی "ہم ابھی تک نفیس صاحب کی ماتحتی میں کام کررہے تھے لیکن اب تم آگئے ہو۔ تم چاہو تو ہم ان سے علیحدگی اختیار کرسکتے ہیں۔ لاتعلق ہوسکتے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے!" میں نے تیزی سے کہا "میری تو ابھی سمجھ میں ہی نہیں آرہا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اگر ان جیسے وسائل اور اختیارات رکھنے والے آدمی کی سرپرستی میں کام کرکے ہم ریڈ ڈاٹ کے فتنے سے نمٹنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو ہمیں اور کیا چاہیے۔ یہ بھی طے ہے کہ اس مسئلے سے نئے بغیر ہم سکون سے زندگی نہیں گزار سکیں گے۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ ہمیں نفیس صاحب کی نظر میں یہ مقام حاصل ہوگیا ہے۔ کوئی وقت تھا کہ میں نے انہیں اپنی بات کا یقین دلانے اور ان کا ذرا سا تعاون حاصل کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلے تھے' اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہوجاتا کہ اس وقت وہ ڈپلومیسی سے کام لے رہے تھے تو شاید مجھے فرار ہونے کی ضرورت نہ پڑتی۔"

"وہ بہت گہرے آدمی ہیں۔ ان کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ اب بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ ہم پر اتنے ہی فدا ہیں جتنے بظاہر نظر آتے ہیں۔ میں خواہ مخواہ جذباتی ہوکر ان کے ساتھ رہنے کے حق میں نہیں ہوں۔ البتہ میرے خیال میں مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ان کے ساتھ رہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے کہا۔

اس دوران ہم گھر واپس پہنچ گئے جہاں ٹونی بے تابی سے ہمارا منتظر تھا۔ تاہم اس نے اپنے لہجے سے بے تابی کا اظہار نہیں ہونے دیا اور پُرسکون انداز میں پوچھا "کیا بات تھی؟"

"ہنی مرگئی ہے۔" راحیلہ نے نہایت دھیمی آواز میں اختصار

سے بتایا۔

وہ شاید ہماری صورت دیکھ کر ہی اس بات کا اندازہ کر چکا تھا۔ وہ کچھ بولا نہیں۔ خاموشی سے جا کر لان کے ایک کونے میں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ ہم میں ایک دوسرے سے رسمی جملے کہنے کی سکت نہیں تھی اور اس وقت ہم اپنے محسوسات بھی بیان کرنے کی اہلیت اپنے اندر نہیں پا رہے تھے۔

وہ رات میں نے جوں توں وہاں گزاری۔ صبح میں راحیلہ اور ٹونی ناشتے کے بعد نفیس صاحب کو فون کرنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ خود انہی کا فون آگیا۔ انہوں نے راحیلہ اور ٹونی کو ابھی وہیں رہنے کا حکم دیا اور مجھ سے بات کرتے ہوئے کہنے لگے "چند منٹ میں احمد تمہیں لینے پہنچ رہا ہے۔ وہ تمہیں ایک جگہ لے جائے گا۔ وہاں تمہارا میک اپ وغیرہ ہوگا۔ تمہارا حُلیہ بالکل بدل جائے گا۔ اس کے بعد تم لفٹ لیتے ہوئے یا کچھ پیدل چلتے ہوئے خانہ بدوشوں والی بستی تک پہنچنے کی کوشش کرنا کیونکہ اس حُلیے میں تم ٹیکسی میں اتنا لمبا سفر کرتے ہوئے اچھے نہیں لگو گے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے اپنے آدمی بھی تمہیں دیکھیں تو تمہاری کوئی بات ان کی نظر میں نہ کھٹکے۔"

"ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔" میں نے آہستگی سے کہا پھر ایک لمحے کے توقف سے پوچھا "ہنی کی تدفین کے بارے میں آپ نے کیا سوچا؟"

"وہ سب طے ہو چکا ہے۔ اس کی تدفین خاموشی سے ہوگی۔ ہمارے خود سامنے آنے اور اس واقعے کو نمایاں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے ہم اس کے جنازے میں شرکت نہ کر سکیں لیکن اس سے ہمارے دلوں میں اس کا احترام اور محبت کم نہیں ہوگی۔ وہ نہایت عظیم لڑکی تھی ہم سب کی محسنہ تھی۔" پھر وہ راحیلہ سے بات کرنے لگے۔ چند لمحے بعد انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

کچھ دیر بعد احمد اپنی ٹیکسی لیے آن پہنچا۔ اسے بھی ہنی کی موت کی خبر مل چکی تھی۔ وہ بھی افسردہ تھا۔ مجھے ٹیکسی میں بٹھا کر روانہ ہوتے ہوئے وہ بولا۔

"یہ منحوس ریڈ ڈاٹ بھی ہم پر خدا کا عذاب بن کر ہی نازل ہوئی ہے۔ اس نے ہمیں بڑے زخم لگائے ہیں' کاش کوئی ایسا طریقہ ہوتا کہ ہم اس سے تعلق اور ہمدردی رکھنے والے ہر انسان نما حیوان کو ایک جگہ جمع کر سکتے اور ان پر کوئی ایٹم بم گرا سکتے۔"

"تم مطمئن رہو۔ ان پر قدرت کی ناراضگی کا ایٹم بم ضرور گرے گا۔ تمہاری خواہش سے ذرا مختلف انداز میں سہی لیکن وہ اپنے انجام کو ضرور پہنچنے والے ہیں اور وہ یقیناً عبرت ناک انجام ہوگا۔" میں نے وثوق سے کہا۔

"خدا کرے آپ کی پیش گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہو۔" وہ شاید خواہش کی تمام تر شدتوں کے ساتھ بولا۔

چند منٹ بعد ٹیکسی چھوٹے سے ایک بنگلے میں داخل ہوئی جس پر روشیلا بیوٹی پارلر کا بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس کے سامنے کے حصے میں شاید واقعی بیوٹی پارلر رہا ہو لیکن احمد مجھے اپنے ساتھ بنگلے کے عقب میں لے گیا اور بنے ہوئے ایک کمرے میں جا گھسا۔

وہ ایک معمولی سی نشست گاہ معلوم ہوتی تھی۔ احمد نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود دیوار پر لگے ہوئے سوئچ بورڈ پر ایک سوئچ دبایا۔ چند لمحے بعد کمرے کا اندرونی دروازہ کھلا اور ایک لمبی تڑنگی' گوری چٹی' بھاری بھرکم ادھیڑ عمر عورت کھٹ کھٹ کرتی اندر آئی۔ وہ کسی فلمی قسم کی "میڈم" کے انداز میں لمبے سے ہولڈر میں سگریٹ سُلگائے لمبے لمبے کش لے کر ناک سے دُھواں نکال رہی تھی۔ اگر وہ یہ حرکت نہ کر رہی ہوتی تو خاصی معقول عورت نظر آتی۔

احمد اس سے مخاطب ہوا "آپ کو اطلاع تو مل ہی گئی ہوگی میڈم؟"

"ہاں' یہ آدمی ہے؟" اس نے نیم وا آنکھوں سے میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ اس کا جائزہ لینے کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کی جوانی خاصی پُرپیچ گزری تھی بلکہ اب ادھیڑ عمری میں بھی اس کی زندگی کے راستے کچھ زیادہ سیدھے سادے نہیں تھے۔ میری روح کو ہلکی سی جھرجھری آگئی۔

"جی ہاں یہی آدمی ہے۔" احمد مسکراتے ہوئے بولا۔

تب وہ عورت میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی "چلو اندر چلو۔" انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہی ہو "اندر چلو... ذرا دیکھتی ہوں تم کتنے پانی میں ہو۔"

تاہم اس کی پیشہ ورانہ سی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میں اُٹھا تو وہ آنکھیں سکیڑ کر ذرا قریب سے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولی "یہ تو پہلے ہی گیٹ اپ میں ہے۔"

"جی ہاں وہ تو ہے لیکن یہ گیٹ اپ کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" احمد ملائمت سے بولا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ احمد وہیں بیٹھا رہا اور میں اس کے ساتھ ایک بہت بڑے کمرے میں پہنچ گیا جو کسی بہت بڑے فلم اسٹوڈیو کا میک اپ روم معلوم ہوتا تھا۔ تاہم وہاں کا ساز و سامان فلم اسٹوڈیو کے میک اپ روم سے کہیں زیادہ قیمتی اور معیاری معلوم ہوتا تھا۔

غنیمت ہی رہا کہ میڈم مجھے وہاں ایک کرسی پر بٹھا کر غائب ہوگئی اور جلد ہی دو سانولے سے نوجوان کمرے میں آگئے۔ وہ آپس میں بھائی یا کم از کم فرسٹ کزن ضرور معلوم ہو رہے تھے۔ انہوں نے بہت تیزی سے میرا حُلیہ بدلنے کا کام شروع کر دیا۔ ان کی تمام تر پھرتی کے باوجود کام مکمل ہونے میں ڈیڑھ دو گھنٹے لگ گئے۔

کام ختم ہونے کے بعد ہی میڈم دوبارہ کمرے میں آئی اور اس نے تنقیدی نظر سے میرا سرتاپا جائزہ لینے کے بعد مطمئن انداز میں سر ہلا کر گویا مجھے جانے کے لیے "این او سی" دے دیا۔

میں خود بھی قدِ آدم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر تھوڑا سا

حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ میں اب گھنی داڑھی مونچھوں اور لمبے بالوں والا ایک پٹھان تھا۔ جس کے گال پر موٹا سا مسا تھا اور ناک کی ساخت بھی کچھ بدل چکی تھی۔ سر پر میلی سی سفید ٹوپی اور جسم پر ڈھیلا ڈھالا پُرانا سا معمولی شلوار قمیص تھا۔ پیروں میں پُرانے سے پشاوری چپل تھے۔ بس میرے کندھے پر ایک کدال کی کمی تھی اور میں پوری طرح ایک سیدھا سادہ ان پڑھ اور جفاکش مزدور نظر آتا۔

اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب کمرے سے رخصت ہوتے وقت ایک کدال بھی میرے کندھے پر رکھ دی گئی اور یوں گویا یہ کمی بھی پوری کر دی گئی۔ میں دوبارہ نشست گاہ میں پہنچا تو احمد مجھے دیکھ کر ہنسنے لگا پھر ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا "سر! یہ بڑی عجیب بات ہے کہ آپ تقریباً ہر گیٹ اپ میں جچ جاتے ہیں' جو بنتے ہیں وہی لگنے لگتے ہیں۔"

"کیا فائدہ ایسے گیٹ اپ کا۔ جس میں تم نے مجھے پہچان لیا۔" میں نے قدرے مایوسی سے کہا۔

"سر! اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے اور نہ ہی یہ آپ کے گیٹ اپ کی خرابی ہے۔" وہ جلدی سے بولا "میں نے آپ کو اس لیے پہچان لیا کہ مجھے چند منٹ پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ آپ کس حُلیے میں آنے والے ہیں۔"

میڈم دوبارہ اس کمرے میں نہیں آئی اور میں احمد کے ساتھ باہر آگیا۔ احمد نے میرے لیے ٹیکسی کا دروازہ کھولا تو میں نے کہا "نفیس صاحب نے ہدایت کی تھی کہ میں ٹیکسی میں نہ بیٹھوں۔ میرے موجودہ حُلیے کے ساتھ یہ عجیب لگے گا۔"

"اب آٹھ دس میل دور آپ پیدل تو جانے سے رہے۔ میں آپ کو شہر سے باہر جانے والی سڑک پر چھوڑ دوں گا' چند فرلانگ پیدل چل کر آپ بستی تک پہنچ جائیے گا۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا جسے آپ کا ٹیکسی میں سفر کرنا عجیب لگے گا۔ ویسے بھی اس وقت ہم دونوں "بھائی بند" لگ رہے ہیں۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور ایک مزدور۔ دونوں دوست بھی تو ہو سکتے ہیں اور دوست' دوست کی ٹیکسی میں مفت سفر کر سکتا ہے۔"

میں بدستور ہچکچاہٹ کا شکار رہا تو احمد بولا "نفیس صاحب کی احتیاط میں بھی بعض اوقات میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ بھئی اگر کوئی ہمیں نہیں دیکھ رہا ہے تو یہ سارا تردد فضول ہے اور اگر کوئی آنکھ ہمیں دیکھ رہی ہے جس سے ہم لاعلم ہیں تو اس کے لیے تو ہم پہلے ہی مشکوک ہیں۔ بلکہ اسے تو شاید معلوم ہی ہوگا کہ ہم کون ہیں۔ اس صورت میں بھی سارا تردد فضول ہے۔"

"اصل میں نفیس صاحب بے چارے اپنی سی احتیاط کر رہے ہیں' صحیح جواز وغیرہ خود ان کی اپنی نظر میں بھی واضح نہیں ہیں۔ بہرحال وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ریڈ ڈاٹ سمجھ میں نہ آنے والی چیز ہے۔ میں بھی جن دنوں لاہور میں تھا تو بعض اوقات بڑا مطمئن ہوتا تھا کہ کوئی میرا تعاقب یا نگرانی نہیں کر رہا لیکن چند گھنٹے بعد پتا چلتا تھا کہ انہیں نہ صرف میری نقل و حرکت کا علم ہوتا تھا بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ میری کس سے کیا بات ہوئی۔

ذرا توقف کے بعد میں نے کہا "ویسے بھی جب انسان کسی کی ماتحتی قبول کر لے تو پھر اسے اس کا ہر حکم ماننا چاہیے لیکن خیر چلو تھوڑی سی بے احتیاطی کر لیتے ہیں۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں لیکن شہر سے نکلتے ہی تم مجھے اُتار دینا باقی فاصلہ میں پیدل یا لفٹ لے کر طے کر لوں گا۔"

میں اگلی سیٹ پر اس کے برابر ہی بیٹھ گیا اور احمد نے گاڑی اس بنگلے کے پورچ سے نکال لی' روانہ ہوتے وقت ہم دونوں نے ہی غیر محسوس طور پر دور دور تک چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا تھا اور احمد بھی اس سلسلے میں بدستور مطمئن تھا۔

ہم راستے میں اسلام آباد ہوٹل کے سامنے سے بھی گزرے' تب مجھے وہ ترک ثقافتی طائفہ یاد آیا جس کے ساتھ میں استنبول سے یہاں پہنچا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا جی چاہا کہ جا کر ذرا ان لوگوں سے مل کر آؤں لیکن بروقت ہی مجھے یاد آگیا میرا حُلیہ ایسا نہیں تھا کہ میں اس قسم کی غیر ضروری حرکتیں کرتا پھرتا۔

"معلوم نہیں وہ ترک ثقافتی طائفہ اب بھی یہاں مقیم ہے یا نہیں!" میں نے مڑ کر ہوٹل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں فی الحال تو وہ لوگ یہیں ہیں۔" احمد نے بتایا "انہوں نے تو گزشتہ رات لیاقت ہال میں شو بھی پیش کیا ہے۔ آج رات یا کل صبح شاید وہ لوگ لاہور اور پھر وہاں سے کراچی روانہ ہو جائیں۔"

"آہ' کمبختوں نے میرے بغیر ہی ثقافتی شو کر لیا۔" میں نے کراہ کر کہا "میں ترکی میں نہ سہی لیکن ترکی کے بارے میں کم از کم فارسی میں تو ایک شعر گا کر سنا سکتا تھا۔"

"وہی والا' زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم؟" احمد نے ایک نظر میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

"وہی وہی" میں نے جلدی سے سر ہلایا۔

"حاضرین کو پہلی بار کسی ترک کی زبانی یہ شعر سننے کو ملتا' بڑے انڈے اور ٹماٹر پڑتے۔ اس کے علاوہ ریڈ ڈاٹ والوں کو آپ کو تلاش کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔" احمد ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

میں نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا "ریڈ ڈاٹ والے تو گویا بالکل ہی کسی بل میں گھس کر بیٹھ گئے ہیں۔ یہ بات مجھے زیادہ تشویش میں مبتلا کر رہی ہے۔ یہ سکون کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔"

"اب تو ہم منتظر ہیں کہ جو طوفان آنا ہے آچکے' معاملہ کسی کنارے تو لگے۔ روز روز کی اس بک بک سے نجات ملے۔" احمد بے زاری سے بولا "کیا آپ کے محسوسات اس سے کچھ مختلف ہیں؟"

"نہیں' اب تو میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

اسی طرح باتیں کرتے ہم اس موڑ تک پہنچ گئے جہاں سے [illegible] سے کہا "تم مجھے نہیں جانتے۔ عیس صاحب کو خبر کرو معصوم سیس ہونا چاہیے کہ میں نے ان کی ہدایت کی خلاف ورزی کی ہے۔"

احمد قدرے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "ھر! آپ اتنے تابع فرمان کب سے ہو گئے؟"

"آنکھ کی شرم بھی کوئی چیز ہے یار! آج کل وہ بے چارے ہم پر بہت مہربان ہیں۔ ہمیں بھی ان کی دل شکنی نہیں کرنی چاہیے۔" میں نے گاڑی سے اُترتے ہوئے کہا۔

احمد واپس جانے کے لیے گاڑی موڑنے لگا تو میں نے پوچھا "تمہارا اب کیا پروگرام ہے؟"

"میری ڈیوٹی تو مستقل طور پر اسلام آباد ہوٹل پر لگی ہوئی ہے جہاں آکر ٹھہرنے والے تمام غیرملکیوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا میری ذمے داری ہے۔ میرے علاوہ بھی عیس صاحب کا ایک آدمی ویٹر کے طور پر اور ایک کسی اور ملازم کے روپ میں ہوٹل میں کام کر رہا ہے۔" احمد نے بتایا اور واپس روانہ ہو گیا۔

میں نے کدال کندھے پر رکھی اور آگے چل دیا۔ جعلی خانہ بدوشوں کی بستی ابھی کم از کم تین میل دور تھی۔ ہر گاڑی کی آواز سُن کر میں مڑ کر دیکھتا اور لفٹ کے لیے ہاتھ دیتا۔ بیسیوں گاڑیاں گزر گئیں لیکن کسی کے ڈرائیور نے گاڑی روکنے کی زحمت نہیں کی۔ لگتا یہی تھا کہ اس علاقے میں لفٹ دینے کا رواج ذرا کم ہی تھا۔ خصوصاً ایک خستہ حال مزدور کو۔

چند فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے لفٹ کے لیے ہاتھ دینا ترک کر دیا۔ تاہم ہر گاڑی کی آواز سُن کر گردن گھما کر نظروں میں ایک خاموش التجا کے لیے ڈرائیور کی طرف دیکھ ضرور لیتا تھا۔ اس سڑک سے گاڑیاں اِکّا دُکّا ہی گزرتی تھیں' آخر مجھے سلور کلر کی ایک خوب صورت گاڑی ست رفتاری سے عقب سے آتی دکھائی دی۔ میں نے اپنی ایکٹنگ میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی کوشش جاری رکھی اور اس کے ڈرائیور کی طرف بھی لفٹ طلب نظروں سے دیکھا۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ میری اس ایکٹنگ کو کون دیکھ رہا تھا لیکن احتیاط بہرحال بہتر تھی۔

سلور کار کی گاڑی کو کوئی فیشن ایبل سا بوڑھا چلا رہا تھا۔ وہ سفید فام تو نہیں تھا لیکن غیر ملکی ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال برف کی طرح سفید تھے۔ وہ ذرا گہرے رنگ کے شیشوں کی عینک لگائے ہوئے تھا۔ سیاہ کوٹ کے ساتھ اس نے بھڑکتے ہوئے سرخ رنگ کی شرٹ پر سفید ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ وہ متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا جا رہا تھا۔ شاید علاقے کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ علاقہ ویران ہونے کے باوجود سرسبز اور خوب صورت تھا۔

پہلے تو وہ بھی آگے نکلتا چلا گیا لیکن پھر شاید اس کا جذبۂ ترحم بیدار ہوا اور اس کی گاڑی ریورس ہو کر آنے لگی۔ قریب پہنچ کر اس نے دروازہ جوں کا توں رکھتے ہوئے انگریزی میں پوچھا "کدھر جانا ہے؟"

میں غیرارادی طور پر انگریزی میں اس کے سوال کا جواب دینے ہی لگا تھا کہ بروقت مجھے اپنی زبان کو بریک لگانے کا خیال آگیا۔ میں تو اس وقت ایک اَن پڑھ پٹھان مزدور تھا لیکن پریشانی کا مقام یہ تھا کہ مجھے ٹوٹے پھوٹے چند جملوں کے سوا پشتو بولنی بھی نہیں آتی تھی۔ میں نے اشاروں کی بین الاقوامی زبان تک ہی محدود رہنا بہتر سمجھا اور سادگی سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے اشارے سے دریافت کیا کہ وہ کیا پوچھ رہا تھا۔

تب اس نے بھی اشارے سے پوچھا کہ میں کہاں جانا چاہتا تھا۔ میں نے اشارے سے بتایا کہ میں اسی سڑک پر کچھ آگے مزدوری کی تلاش میں جا رہا تھا۔ اس نے مجھے پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں دیکھ چکا تھا کہ پچھلی سیٹ پر گھنی داڑھی مونچھوں اور لمبے لمبے بالوں والا ایک دُبلا پتلا سرخ و سپید نوجوان بیٹھا تھا۔ آنکھوں پر تاریک چشمہ تھا۔ وہ کچھ عجیب روٹھے روٹھے سے انداز میں بیٹھا تھا اور دوسری طرف کے شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس میں تجسس کا مادہ بھی بالکل نہیں تھا۔ اس نے ایک نظر بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ پوری دنیا سے خفا بیٹھا ہو۔ میں یہی سمجھا کہ شاید وہ بڑے میاں کا بیٹا تھا۔

میں نے گاڑی میں بیٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ نوجوان نے تب بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ بڑے میاں گو کہ جان چکے تھے میں انگریزی نہیں سمجھتا تھا اس کے باوجود انہوں نے شاید غیرارادی طور پر انگریزی میں وضاحت کی "اس نوجوان کو بھی میں نے لفٹ دی ہے۔ یہ چھ سات میل آگے اُترے گا۔"

میں انجان بنا بیٹھا رہا گویا اس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہ آیا ہو۔ تاہم میں دل ہی دل میں نوجوان کے انداز پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ کچھ اس طرح بیٹھا تھا گویا اس نے بڑے میاں سے لفٹ لے کر احسان کی گزری ہوئی اور آنے والی سات پشتوں اور سات نسلوں پر احسان کیا ہو۔

بڑے میاں نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ گہرے رنگ کے شیشوں کے عقب سے اس کی آنکھیں صاف دکھائی نہیں دے رہی تھیں لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے بہت غور سے میرا جائزہ لیا تھا۔ میری دھڑکن ذرا تیز ہو گئی لیکن میں ایک سادہ لوح اور انجان شخص کی طرح اپنے چہرے کو سپاٹ رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سکون سے بیٹھا رہا۔

بوڑھا بولا "اس کدال کو تو نیچے رکھ دو۔" پھر اس نے اشارے سے مجھے اپنا مطلب سمجھایا۔ اس کے لہجے سے مجھے اس پر ایرانی ہونے کا شبہ ہوا۔

میں نے کدال کندھے سے اُتاری لیکن نیچے پھر بھی نہیں رکھی بلکہ میں نے اسے گود میں فٹ کر لیا۔ کار آگے بڑھ گئی تب اچانک ہی میری نامعلوم سی جس مجھے اضطراب کا احساس دلانے لگی۔ میں اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ گاڑی کی رفتار اب بھی کچھ زیادہ نہیں تھی' نشیب میں کچی زمین چھدرے سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ میں چاہتا تو گاڑی سے چھلانگ لگا کر لڑھکنے کا خطرہ مول لے سکتا تھا لیکن فوری طور پر میرا دل اس قسم کی بدحواسی کا مظاہرہ کرنے کے لیے بھی آمادہ نہ ہو سکا۔

میں نے محسوس کیا کہ بوڑھا عقب نما آئینے میں میرا جائزہ لے رہا تھا۔ میں ایک سادہ لوح انسان کی طرح ممنونیت سے مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس دوران میری رگ و پے میں دوڑتی ہوئی اضطراب کی لہریں کچھ تیز ہو چکی تھیں' بوڑھے نے کار کی رفتار کچھ بڑھا دی۔

اچانک وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "پیارے اجنبی! میں نے تمہیں پہچانا تو نہیں لیکن مجھے کچھ شبہ ہو رہا ہے۔ میں اس کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے تمہارا میک اپ زیادہ اچھا نہیں ہے' مجھے دیکھو! میں نے اپنا میک اپ خود کیا ہوا ہے لیکن دیکھو کتنا عمدہ ہے۔ اگر تم وہی ہو جو میں تمہیں سمجھ رہا ہوں تب بھی مجھے یقین ہے کہ تم مجھے پہچان نہیں سکے ہو۔"

اچانک میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی یکدم ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔ میری رگ و پے میں دوڑتی ہوئی اضطراب کی لہریں گویا کسی ایک نقطے پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا لیکن ذرا تاخیر کے ساتھ۔

وہ حمان تھا!

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا' ایک لمحے کے لیے مجھے یہی گمان گزرا کہ میں خواب دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ یہاں کیونکر پہنچ گیا تھا؟ اور اگر پہنچ ہی گیا تھا تو کیا اس کا مجھ سے ٹکرانا ضروری تھا؟

وہ انسان نہیں کوئی بدروح معلوم ہوتا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میرا استنبول میں اس سے پیچھا چھوٹ گیا تھا لیکن وہ یہاں بھی آن پہنچا تھا۔ کس طرح آن پہنچا تھا؟ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں عقب نما آئینے میں اس کی صورت دیکھنے میں شاید کچھ زیادہ ہی محو ہو گیا تھا کیونکہ اس دوران ایک سخت سی چیز میری پسلیوں پر آن ٹکی۔

وہ نوجوان جو روٹھے روٹھے انداز میں کھڑکی کی طرف منہ کیے بیٹھا تھا' نہ جانے کس وقت میرے قریب کھسک آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خوف ناک سی شکل کا ایک پستول تھا جس کی نال سے ہی گویا وہ میری پسلیوں میں سوراخ کرنے کی فکر میں تھا۔ تاہم اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس کا چہرہ بدستور پتھرایا ہوا سا تھا لیکن اب اس کی نظر مجھ پر جمی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں پر تاریک چشمے کے باوجود میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ آنکھ نہیں جھپک رہا تھا۔

غیرارادی طور پر کدال پر میری گرفت سخت ہو گئی لیکن نوجوان نے اسے بھی محبوس کر لیا اور پستول کی نال پر دباؤ مزید بڑھا کر گویا مجھے اشارہ دیا کہ میں کدال کے دستے سے ہاتھ ہٹا لوں۔ میں نے دستے سے ہاتھ ہٹا لیے۔ مجھے تھوڑا سا اطمینان یہی تھا کہ شاید حمان سچ بول رہا تھا۔ ابھی وہ میرے بارے میں شک میں ہی تھا۔ اس نے یقینی طور پر مجھے نہیں پہچانا تھا۔

وہ بڑے اطمینان سے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے بولا "مجھے ایک شخص کی تلاش ہے۔ میں نے عہد کیا تھا کہ جہنم تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ دو دن پہلے میرا اس سے آخری بار استنبول میں سامنا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے جان بچا کر بھاگنا پڑا تھا۔ اس شخص کی وجہ سے میرے بڑے بڑے کام بھی خراب ہوئے اور مجھے ذلت بھی بہت اُٹھانی پڑی۔ میں خود اپنی نظر میں گر گیا۔"

میں نے عقب نما آئینے میں احمقوں کی طرح اس کی طرف دیکھنا جاری رکھا جیسے اس کی گفتگو کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہ آ رہا ہو پھر میں نے یوں نوجوان کی طرف دیکھا جیسے میرے خیال میں حمان اس سے بات کر رہا ہو لیکن اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ سانپ کی طرح پلک جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتا رہا۔

حمان نے بات جاری رکھی "مجھے اس شخص کا آخری سراغ یہ ملا تھا کہ میرے فرار ہونے کے بعد وہ استنبول کے سرکاری کلچرل سینٹر کی طرف گیا تھا۔ وہاں سے مجھے کچھ ایسی شہادتیں ملیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ترک ثقافتی طائفے میں شامل ہو کر یہاں آیا ہے۔ میں اس طائفے کے پیچھے پیچھے یہاں پہنچا۔ سب فنکاروں کو چیک کیا۔ وہ شخص ان میں نہیں ہے۔ میں اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں اور کل شام سے کرائے کی اس کار میں اس کی تلاش میں سڑکوں کی خاک چھانتا پھر رہا ہوں۔ معلوم نہیں کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ مجھے یہیں کہیں مل جائے گا۔"

مجھے پشتو کے جتنے بھی ٹوٹے پھوٹے جملے آتے تھے' میں نے ان سب کو گڈمڈ کر کے تیزی سے بول ڈالا۔ انداز کچھ ایسا تھا جیسے میں قدرے غصے سے پوچھ رہا ہوں کہ آخر یہ کیا مذاق تھا اور وہ لوگ کیا چاہتے تھے؟

حمان کے کان پر گویا جوں تک نہیں رینگی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "تمہارا قد کاٹھ وہی ہے' خدوخال وہی ہیں۔ جسمانی ساخت وہی ہے۔ آنکھیں بھی وہی لگ رہی ہیں۔ میری نظر میں تو اس شخص کا سراپا نقش ہو گیا ہے اور اس وقت تک نقش رہے گا جب تک اس سے میرا حساب برابر نہیں ہو جاتا۔ اوپر سے تم میک اپ میں ہو۔ اس ویرانے میں ایک شخص کا میک اپ کیے ہوئے پھرنا مجھے خالی از علت نظر نہیں آ رہا۔ میں ذرا کسی مناسب مقام پر تمہیں میک اپ کے بغیر دیکھنا چاہتا ہوں۔ یا پھر چاہو تو تم مجھے اس زحمت سے بچا لو۔ سیدھی طرح بتا دو کہ تم افضل چوہدری ہو۔"

میں نے ایک بار پھر اپنی غلط سلط اور بے محل پشتو کا ملغوبہ

بناتے ہوئے ہاتھ نچایا۔ میں عموماً اپنے جھوٹ کو آخری وقت تک نبھانے کی کوشش کرتا تھا اس طرح مجھے سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کا موقع مل جاتا تھا۔ جہان نے یوں طویل سانس لی جیسے کوئی جنونی کسی بچے کی ضد کے سامنے بے بس ہو گیا ہو۔

اس دوران مجھ پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ ہم خانہ بدوشوں کی بستی اور وائرلیس اسٹیشن وغیرہ سے آگے نکل آئے تھے۔ بل کھاتی سڑک پہاڑیوں کی طرف جا رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا' نفیس صاحب وہاں خیمے میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ انہیں گمان بھی نہیں ہو گا کہ ان کے سامنے والی سڑک سے کوئی مجھے گاڑی میں اغوا کر کے لیے جا رہا تھا۔ ان کے میک اپ نے مجھے مروا دیا تھا لیکن بات یہ تھی کہ میں میک اپ میں نہ ہوتا اور جہان سے میرا سامنا ہو جاتا تب بھی کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی تھا۔ عین ممکن تھا وہ چلتی گاڑی سے مجھے گولی مار دیتا۔ جو کچھ ہو چکا تھا اس پر پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ جو کچھ ہونے والا تھا مجھے اس کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا۔ قسمت کے لکھے کا سامنا تو کرنا ہی تھا۔

گاڑی اب پہاڑی کے گرد چکر کاٹ کر کچے میں اتر رہی تھی۔ جہان بولا "گویا تم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہو کہ تم افضل چوہدری ہو؟"

میں نے ایک بار پھر بری سے تھوڑی سی بک بک کی لیکن حسب سابق جہان نے میرے جعلی احتجاج کو لفٹ نہیں کرائی اور ناہموار راستے پر احتیاط سے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے بولا "اگر تم افضل چوہدری ہی ہو جس کا مجھے نوے فیصد یقین ہے تو میں تمہیں دو خطرات کے بارے میں خبردار کر دوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ تم بہت اونچی چیز ہو لیکن جہان سے اونچی نہیں۔ اس لیے اب کوئی کرتب دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ یہ نوجوان جو تمہارے برابر بیٹھا ہے دنیا کے آٹھ دس سفاک ترین قاتلوں میں سے ایک ہے۔ اس کے سامنے قطعاً کوئی ہوشیاری مت دکھانا۔ یہ میرا ہوشیار ترین شاگرد ہے۔ دوسری بات یہ کہ میرا ہاتھ اس سوئچ کے بالکل قریب ہے جو ڈیوپر دینے کے کام آتا ہے۔"

گاڑی خفیف سے ہچکولے کھا رہی تھی جس کے ساتھ میری پسلیوں پر پستول کی نال رگڑ سی کھاتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میری ایک آدھ پسلی پر سے تو کھال چھل چکی تھی' میں بالکل دروازے سے چپک چکا تھا۔ مزید کھسکنے کی جگہ نہیں تھی۔

جہان کہہ رہا تھا "تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ میں دھماکا خیز اشیا کا ماہر ہوں۔ میں نے کرائے کی اس کار میں بھی اپنا تھوڑا بہت کام دکھایا ہوا ہے۔ اگر میں ڈیوپر دینے والا سوئچ دبا دوں تو یہ کار دھماکے سے اڑ جائے گی اور اس کے ساتھ ہم سب بھی۔"

میں گو کہ اب بھی یہی ظاہر کرنے پر تلا ہوا تھا کہ اس کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن اس نے گویا فرض کر رکھا تھا کہ میں ہر بات سمجھ رہا تھا۔ اس نے وضاحت کی "ہم تو جان ہتھیلی پر ہی لیے پھرتے ہیں۔ شاید اسی لیے ہم جیسے لوگ زیادہ عرصے زندہ رہتے ہیں۔ اگر مجھے ذرا بھی خطرہ نظر آیا تو میں اس سوئچ کو دبانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ ہم تو مر ہی جائیں گے لیکن ہمارے لیے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تم بھی مر جاؤ گے۔"

اب میں خاموش رہا۔ میں نے اپنے چہرے پر بے بسی طاری کر لی تھی۔ سڑک بہت دور رہ گئی تھی اور ہم ایک پہاڑی کے عقب میں پہنچ گئے تھے۔ سڑک سے اکا دکا گاڑیوں میں گزرنے والے لوگوں کی نظر یہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی اور یہاں سے کوئی آواز بھی سڑک تک پہنچنا مشکل تھی۔ کوئی بڑا سا بم پھٹتا تب شاید آواز وہاں تک پہنچتی۔

جہان نے ایک جگہ جھاڑیوں کے قریب گاڑی روک لی۔ تب میں نے پہلی بار اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے نوجوان کی آواز سنی۔ کسی بدروح کی سی کھرکھراتی ہوئی آواز تھی جیسے کسی زنگ آلود لوہے کو تیز دھار چھری سے کھرچا جا رہا ہو "جس طرح بیٹھے ہو اسی طرح آہستگی سے کھسک کر نیچے اتر جاؤ۔ کدال کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں۔ جہاں گرتی ہے گرنے دو۔" اس نے حکم انگریزی میں دیا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا' اب بھی انجان بنا رہوں جیسے اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن اس نے اشارے سے بھی اپنا مفہوم واضح کر دیا پھر میں نے بھی کار سے اترنے کے موقعے کو غنیمت جانا۔ کھلی جگہ ویسے بھی مجھے قسمت آزمائی کے لیے بہتر محسوس ہوتی تھی۔ بند کار ایک خاصی خطرناک جگہ تھی۔ خصوصاً جبکہ ایک طرف سے پسلیوں پر پستول ٹکا ہوا تھا اور کوئی بعید نہیں تھا اس خبیث جہان کا دعویٰ درست ہی رہا ہو کہ ڈیوپر والا بٹن دبانے سے کار دھماکے سے اڑ سکتی تھی۔ ایسے بدبخت قسم کے لوگوں سے کوئی بھی بات بعید نہیں ہوتی۔ اس قسم کے لوگ عموماً ابنارمل ہوتے ہیں۔

میں نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور باہر پھسل گیا۔ کدال دروازے میں گر گئی۔ اس کا دستہ دروازے سے باہر معلق ہو گیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس دوران پستول کی نال ایک لمحے کے لیے بھی میری پسلیوں سے نہیں ہٹی تھی۔ جہان کا وہ چیلا گویا میرے ساتھ ہی پھسلتا ہوا کار سے باہر آیا تھا۔ میں نے اسے کسی چیز کو پکڑتے یا سہارے کے لیے کسی چیز پر ہاتھ رکھتے نہیں دیکھا۔

جہان مجھ سے پہلے ہی گاڑی سے اتر چکا تھا اور میں جب سیدھا کھڑا ہونے میں کامیاب ہوا تو میں نے اسے اپنے سامنے کھڑے پایا۔ وہ قد میں بہ مشکل میرے سینے تک پہنچتا تھا لیکن اس وقت اس کے ہاتھ میں لمبی سی نال کا ایک پستول تھا جس کی وجہ سے شاید وہ اپنے آپ کو مجھ سے کہیں زیادہ بلند قامت محسوس کر رہا تھا۔

اس دوران اس کے چیلے کے پستول کی نال میری کمر پر منتقل ہو چکی تھی۔ جہان نے پستول کی نال میرے سینے پر رکھ دی۔ یعنی اس وقت میں دو بہت سجھے' پیشہ ور قاتلوں اور ان کے نہایت

جدید پستولوں کے درمیان سینڈوچ بن چکا تھا۔ میں بہت گناہ گار سا آدمی ہوں' یقین کی دولت بڑے خاص اور نیک بندوں کے پاس ہوتی ہے۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں ہمیشہ ایک عجیب سی طمانیت میرے ساتھ رہی تھی۔ موت کے منہ میں بھی میں نے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ میں کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کر رہا اس لیے کوئی غیبی طاقت ضرور میری حفاظت کرے گی۔

اس روز ایک لمحے کے لیے میرا یقین متزلزل سا ہو گیا۔ آخر کار میں ایک گناہ گار' دنیا دار آدمی تھا۔ میری بنیاد تو عام سی ہی تھی۔ میری بنیاد میں روحانی طاقت کا کنکریٹ تو نہیں تھا۔ یقین کا سہارا ہٹا تو ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آ گیا۔

خوش قسمتی یہ تھی کہ مجھ پر یہ کمزوری صرف ایک لمحے کے لیے غالب آئی۔ وہ لمحہ آیا اور گزر گیا۔ ان دونوں کو تو یقیناً پتا نہیں چلا ہو گا کہ اس ایک لمحے میں میری روح پر کیسی طغیانی سی آ کر گزر گئی لیکن دوسرے ہی لمحے میرے یقین کی طاقت پہلے سے زیادہ شدت سے عود کر آئی۔

شاید یہی وہ طاقت تھی جو صرف روح میں ہی نہیں' جسم میں بھی بجلیاں سی بھرے رکھتی تھی۔ جہان نے دائیں ہاتھ سے پستول میرے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ بایاں ہاتھ اس نے میری داڑھی مونچھ نوچنے کے لیے بڑھایا۔

مجھے خود بھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ میرے دونوں ہاتھ کس تیزی سے حرکت میں آئے۔ ایک ہاتھ جہان کی پستول والی کلائی پر نیچے سے اوپر کی طرف مارتے ہوئے میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ میں اتنی قوت سے گھونسا رسید کیا کہ وہ فضا میں کم از کم دو فٹ اچھلا۔

اس کے پستول سے فائر ہو چکا تھا لیکن گولی آسمان کی طرف گئی تھی اور اسی لمحے میں اپنے آپ کو زمین پر گرا چکا تھا۔ وقت کے تعین کے سلسلے میں نے جوا ہی کھیلا تھا۔ جان کی بازی لگائی تھی۔ اسی لمحے پیچھے سے فائر ہوا تھا لیکن میں زمین پر گر چکا تھا۔ یہ سب کچھ تقریباً ایک ساتھ ہی ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں یہ پھرتی دکھانے میں کیونکر کامیاب ہوا تھا۔ یہ کام اتنے ہی وقفے میں ہوا تھا جتنا ٹریگر دبانے اور گولی چلنے کے لیے درکار ہوتا ہے۔

قدرت نے عجیب ہی کام دکھایا۔ جہان کے چیلے نے جو گولی چلائی تھی' میں معجزاتی سے انداز میں اس کے سامنے سے ہٹ چکا تھا اور وہ گولی جہان کو لگ چکی تھی جو اس لمحے میرا گھونسا کھا کر ہوا میں اچھلا تھا۔ تاہم اس وقت تک مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ جہان کو خود اس کے چیلے ہی کی چلائی ہوئی گولی لگ چکی تھی۔

مجھے اس وقت کچھ دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ بس اتنا احساس ضرور تھا کہ جہان میرے اندازے سے کچھ زیادہ ہی دور جا کر گرا تھا۔ جہان کا شاگرد اس وقت تک دوسرا فائر بھی کر چکا تھا لیکن میں اس کی ٹانگ کھینچ چکا تھا۔ دوسری گولی تو نہ جانے کس طرف گئی لیکن گرتے گرتے وہ تیسرا فائر بھی کر چکا تھا۔ گولی میرے کان کے قریب سے گزر کر غالباً زمین میں پیوست ہوئی۔

اس وقت تک اس کی ریوالور والی کلائی میری گرفت میں آ چکی تھی اور یہ وہ موقع تھا جہاں سے جسمانی طاقت کا کام شروع ہوتا تھا۔ اس نے پستول کا رخ میری طرف کر کے فائر کرنے کی کوشش میں پستول خالی کر لیا۔ یہ اس کی غلطی تھی۔ اس دوران اس کا بازو مڑتا چلا گیا۔

دوسرے ہاتھ سے میں نے اسے قابو میں کیا ہوا تھا۔ وہ دبلا پتلا ہونے کے باوجود عام نوجوانوں کی نسبت طاقتور اور مضبوط تھا لیکن میرے لیے نہیں۔ اس کا پستول خالی ہونے کے باوجود میں اس کا بازو موڑتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ کڑک کی آواز آئی اور اس کا بازو کہنی سے الگ ہو گیا لیکن میں نوجوان کی قوت برداشت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے حلق سے چیخ نہیں نکلی۔ گھٹے گھٹے سے انداز میں وہ محض غرا کر رہ گیا۔

چند سیکنڈ کی اس کشمکش کے دوران بھی میں اس بات پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا کہ اب تک مجھے جہان کی طرف سے گولی کیوں نہیں لگی تھی۔ اس وقت تک مجھے نہیں معلوم تھا کہ اسے اس کے اپنے ہی چیلے کی گولی لگ چکی تھی۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ شاید میرا گھونسا اس کے لیے زیادہ خطرناک ثابت ہوا تھا اور وہ کہیں بے ہوش پڑا تھا۔

میں نے چیلے کے لیے اتنی ہی سزا کو کافی سمجھا کہ اس کا بازو ٹوٹ چکا تھا۔ میں اسے چھوڑ کر اٹھنے ہی لگا تھا کہ اس بدبخت کا بایاں ہاتھ تیزی سے کوٹ کی اندرونی جیب میں گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں ایک اور گن کی جھلک دیکھی۔ اس امکان کی طرف میرا ذہن گیا ہی نہیں تھا کہ اس کے پاس دوسری گن بھی ہو سکتی تھی۔

یہ اس کی بدنصیبی ہی تھی کہ اس نے دوسری گن نکالنے کی کوشش کر ڈالی تھی۔ میں نے تو اپنی دانست میں ضبط سے کام لیا تھا اور اسے زندہ رہنے کا موقع دیا تھا لیکن بعض باتیں موت کے ہرکاروں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں اس وقت تک سیدھا کھڑا نہیں ہو پایا تھا جب میں نے اس کے ہاتھ میں کسی گن کی جھلک دیکھی۔

ہم اس وقت گاڑی کے قریب ہی تھے اور وہ دروازہ کھلا تھا جس سے ہم باہر آئے تھے۔ کدال کا دستہ اس دروازے سے جھانک رہا تھا۔ پلک جھپکتے میں کدال میرے ہاتھ میں آئی اور اپنے آپ کو اس کے متوقع فائر سے بچاتے ہوئے میں نے ایک ہی ہاتھ سے کدال گھمائی۔

وہ شاید ایک بازو ٹوٹنے کی تکلیف کی وجہ سے دوسرے ہاتھ کو بھی صحیح طور پر استعمال نہیں کر سکا۔ گولی نہ جانے کس طرف گئی۔ اس وقت تک کدال کا پھل اس کی کھوپڑی میں پیوست ہو چکا تھا۔ میں نے کدال کو نکالنے کی کوشش کی تو اس کا سر کدال کے ساتھ

ہی اوپر اُٹھ آیا۔ میں نے کدال کو وہیں چھوڑ دیا۔ اس کے جسم کو تشفی سے انداز میں دو تین جھٹکے لگے پھر وہ وہیں ساکت ہو گیا کدال اس کے سر میں پیوست تھی۔

اب میں نے حمان کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ وہ لڑھک کر قدرے نشیب میں جا گرا تھا اور ساکت پڑا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا' اس کے سینے سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ شاید آخری سانسیں لے رہا تھا۔

میں اس کے قریب کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے' اچانک اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں بھی لہو رنگ تھیں۔ میں اس کی صورت دیکھنے میں کچھ ایسا محو تھا کہ اس کے نہایت آہستگی سے ہلتے ہوئے ہاتھ کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ شاید مجھے توقع نہیں تھی کہ آخری سانسیں لیتے ہوئے بھی کوئی اپنی زندگی کی بچی کھچی رمق کو فائر کرنے میں صرف کر سکتا تھا لیکن مجھے اس کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی نفرت سے اندازہ ہو جانا چاہیے تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نفرت نے ہی مجھے مبہوت کر دیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مرتے وقت بھی کسی کی آنکھوں میں نفرت کی یہ شدت نظر آ سکتی تھی۔

میں اچانک ہی گویا کسی خواب سے چونکا۔ اس کا لرزتا ہوا ہاتھ سیدھا ہو چکا تھا اور اس میں پستول تھا۔ اگر میں نے بروقت اپنے آپ کو زمین پر نہ گرا دیا ہوتا تو شاید گولی عین میرے چہرے پر لگتی۔ اس کی یہ حرکت کچھ ایسی ہی تھی جیسے شمع بجھنے سے پہلے آخری بار بھڑکی ہو۔

میں نے گرتے گرتے اس کے مصنوعی سفیدی سے سجے ہوئے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کا سر کچھ اوپر اُٹھا کر زور سے زمین پر مارا اور وہ ساکت ہو گیا۔ اس کا پستول والا ہاتھ پہلے ہی زمین پر گر کر ساکت ہو چکا تھا۔ اس بار میں نے احتیاط برتی اور اُٹھنے سے پہلے اس کے ہاتھ سے پستول نکال لیا لیکن اب وہ واقعی ساکت ہو چکا تھا۔ اس کی نفرت بھری آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔

آخر کار میں نے پستول اس کی لاش پر ہی پھینک دیا۔ چند لمحے میں وہیں کھڑا گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ میرے ذہن میں چلتی ہوئی آندھیاں تھم گئی تھیں اور میرے اردگرد بھی گہرا سکوت طاری تھا۔ شاید یہ موت کا سکوت تھا۔

میں چند منٹ وہیں گم صم کھڑا رہا پھر بوجھل سے انداز میں قدم اُٹھاتا پہاڑی کے دوسری طرف سے گھوم کر سڑک کی طرف چل دیا' کچھ دیر بعد میں اسی سڑک کے کنارے کنارے پیدل خانہ بدوشوں کی بستی کی طرف جا رہا تھا جس سے آیا تھا۔ اب میں نے لفٹ لینے کے لیے کسی کو ہاتھ نہیں دیا اور نہ ہی کسی گاڑی والے نے میری طرف توجہ دی۔

اے حمید کی ایڈونچر سیریز

عاطون

۱۔ اہرامِ مصر سے فرار -/150
۲۔ اندلس کی آخری شمع -/125
۳۔ ہڑپہ کی ناگن -/125
۴۔ عاطون موت کے دروازے پر -/200

شیوسینا کے دہشت گرد

۱۔ ٹاپ سیکرٹ مشن -/150
۲۔ کشمیر کے غازی -/150
۳۔ کمانڈو ایکشن -/200
۴۔ گولکنڈہ کے مجاہد -/200

گنگا کے پجاری ناگ (اول) -/150
گنگا کے پجاری ناگ (دوئم) -/200

مکتبہ القریش
اُردو بازار، لاہور ۲
فون: 7224665

مجھے مجھے معلوم تھا کہ میں اس وقت کہاں جا رہا ہوں۔ میں جب خانہ بدوشوں کی بستی پہنچا تو پسینے میں شرابور تھا۔ میں جس گلی سے بستی میں داخل ہونے لگا' اس کے کونے پر دو مفلوک الحال آدمی زمین پر خانے بنائے چوسر کھیل رہے تھے۔ انہوں نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔

ان کے حلیے گو کہ بہت بدلے ہوئے تھے لیکن میں نے انہیں پہچان لیا۔ وہ منیر اور مسعود تھے۔ انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں ان کے قریب نہیں رکا اور جان بوجھ کر چہرے پر اجنبیت لیے گزرتا چلا گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا میرا گیٹ اپ کتنا قابلِ بھروسا تھا میرے ساتھی بھی مجھے پہچانتے تھے یا نہیں؟

منیر اُٹھ کر تیزی سے میرے سامنے آ گیا اور میرا راستہ تقریباً روکتے ہوئے بولا "کس سے ملنا ہے' کس کے پاس جا رہے ہو؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "کسی طرح مجھے افضل چوہدری سے ملوا دو۔ وہ اُلو کی دُم نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ہے۔"

وہ پلک جھپکائے بغیر چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر بے اختیارانہ سے انداز میں مجھ سے لپٹ گیا "سر آپ' مجھے پتا چلا تھا کہ آپ پہنچ چکے ہیں اور کل یہاں بھی آئے تھے۔ افسوس کل آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ آپ کو دیکھ کر اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ بتا نہیں سکتا۔ ویسے سچی بات یہ ہے کہ میں نے آپ کو بالکل نہیں پہچانا تھا۔"

پھر اس نے مجھ سے الگ ہوتے ہوئے مسعود کو پکارا "اوئے بینڈے! ذرا آ کر دیکھ تو سہی کون آیا ہے۔"

تب مجھے معلوم ہوا کہ مسعود کا نام اس وقت بینڈا تھا۔ وہ بھی آ کر مجھ سے ملا اور کچھ دیر ویسی ہی باتیں ہوتی رہیں جیسی عموماً ایک عرصے تک بچھڑے رہنے کے بعد ملنے والے دوستوں میں ہوتی ہیں پھر منیر کو جیسے کچھ یاد آیا۔ وہ چونکتے ہوئے بولا "آپ پہلے جلدی سے جا کر نفیس صاحب سے مل لیں۔ میرا خیال ہے وہ بہت دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں لیکن ہمیں نہیں معلوم تھا آپ اس حلیے میں یہاں پہنچیں گے۔"

میں نفیس صاحب کے خیمے میں پہنچا تو وہ واقعی بے تابی سے میرے منتظر تھے۔ چھوٹتے ہی بولے "کہاں رہ گئے تھے بھئی؟ میں تو تمہارے انتظار میں سوکھ گیا۔"

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں یہاں پہنچ گیا۔ ورنہ شاید آپ زندگی بھر ہی میرا انتظار کرتے رہتے۔" میں نے خیمے میں رکھی صراحی سے ایک بڑے سے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا خیریت تو تھی؟" وہ کچھ چونکے۔

"آپ کی حکمتِ عملی نے تو مجھے مروا دیا تھا۔" میں نے پانی پیٹ میں انڈیلنے کے بعد کہا "خدا کا شکر ہے کہ بچ کر آ گیا لیکن بات

طلسم زادی

☆ ------ ایم - اے راحت

روشنی کی دُنیا سے دُور پُراسرار دُنیا کی کہانی جہاں مافوق الفطرت زندگی کا دور دورہ تھا۔ دو دُشمنوں کی عجیب داستان جنہوں نے جب ایک دُوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ تو ایک ناقابلِ یقین کہانی نے جنم لیا۔

ایم - اے راحت کا ایک شاہکار ناول

قیمت: حصہ اول -/150
قیمت: حصہ دوئم -/150

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

وقت کی رفتار کا کوئی احساس نہ رہا البتہ یہ احساس ضرور ہوا کہ پھر وہی آتی ہے کہ قدرت جو کرتی ہے بہتر کرتی ہے اور میں قدرت کے کاموں پر حیران بھی بہت ہوں۔ شاید میں استنبول میں اس کام کو ادھورا چھوڑ آیا تھا جو قدرت کو مجھ سے یہاں مکمل کرانا تھا۔"

ہو گا اور میرے خیال میں بہتر یہی ہو گا کہ اس واقعے سے تمہارا کوئی تعلق نظر نہ آئے۔ اگر ایسی کوئی شہادت ہوئی تو ہمیں اس کو ختم کرنا ہو گا۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے خودکلامی کے سے انداز میں بولتے جا رہے تھے۔

"مجھے خود اس واقعے کا کریڈٹ لینے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا پھر انہیں تمام واقعہ سنا دیا۔

انہوں نے فوراً موبائل فون نکالا اور کچھ لوگوں کو ہدایات

"آخر ہوا کیا؟" نفیس صاحب بیڑی سلگا کر میرے قریب آن بیٹھے۔

میرا ذہن اس وقت واقعی کہیں دور پہنچا ہوا تھا۔ مجھے ان کی آواز بھی دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ میری نظریں ابھی تک حمان اور اس کے چیلے کی صورت گھوم رہی تھی۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا "آج مجھے معلوم ہوا کہ کبھی کبھی صرف موت ہی انسان کا تعاقب نہیں کرتی، انسان خود بھی موت کا تعاقب کرتا ہے۔ حمان سے میری خواہ مخواہ کی کشمکش استنبول میں ختم ہو گئی تھی اور میں اسے زندہ سلامت چھوڑ کر آیا تھا۔ یہاں آ کر میں گویا اس معاملے کو بھول ہی گیا تھا۔ حقیقت میں تو میری اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی لیکن وہ بدبخت مجھے ڈھونڈتا ہوا میرے پیچھے پیچھے یہاں آن پہنچا۔ درحقیقت وہ اپنی موت کو ڈھونڈتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی اس سے یہاں ملاقات ہو جائے گی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ حمان تمہارے ہاتھوں مر چکا ہے؟" نفیس صاحب بے تابانہ انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"صرف حمان ہی نہیں اس کا ایک چیلا بھی۔ جس پر اسے بہت ناز تھا۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"مذاق مت کرو یار!" نفیس صاحب مجھے گھورتے ہوئے بولے "میں عمر میں بھی تم سے کافی بڑا ہوں اور ایک طرح سے کچھ عرصے کے لیے تمہارا افسر ہوں۔"

"آپ اسے مذاق کیوں سمجھ رہے ہیں؟" میں نے انہیں گھورا "میری تو اس وقت جس مزاج ہی سو چکی ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تم اتنے اطمینان سے حمان کے مرنے کی بات کر رہے ہو۔ اس کو مارنے کے لیے کسی زمانے میں دنیا کی کئی مشہور خفیہ ایجنسیوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا مگر وہ خطرناک ترین ایجنٹوں سے بچ کر نکلتا رہا تھا۔"

"اس وقت اس کی موت نہیں لکھی ہوگی۔ جب موت لکھی ہوتی ہے تو ہاتھی چیونٹی کے ذریعے بھی مر سکتا ہے اور میں کچھ ایسی چیونٹی بھی نہیں ہوں۔ البتہ آپ جیسے لوگوں کے لیے ہم جیسے لوگوں کا معاملہ "گھر کی مرغی دال برابر" والا ہوتا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"مجھے... مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔" نفیس صاحب خیمے میں ٹہلنے لگے "تم مجھے صحیح طرح بتاؤ۔ آخر یہ واقعہ کب کہاں اور کیسے پیش آیا؟"

"وہ تو میں بتا رہا ہوں لیکن میری یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

"تم سمجھ نہیں رہے ہو، درحقیقت یہ بہت اہم واقعہ ہے۔ بین الاقوامی اہمیت کی خبر ہے۔ ہمیں ان کی لاشوں کو بھی قبضے میں کرنا دینے میں مصروف ہو گئے۔ ان کے انداز سے واقعی لگ رہا تھا کہ کوئی اہم واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ انہوں نے کئی افراد سے بات کی اور کافی دیر میں فارغ ہوئے۔ میں اس دوران ان کی صورت دیکھتا رہا اور بور ہوتا رہا۔

آخر کار انہوں نے فون کی جان چھوڑی تو میں نے کہا "میرا خیال ہے آپ نے مجھے کسی کام کے لیے ہی یہاں بلایا ہوگا لیکن لگتا یہی ہے کہ وہ کام اب بیچ میں ہی رہ گیا ہے۔"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ وہ کام تو ہونا ہی ہے تاہم وہ کام کچھ ایسا خاص بھی نہیں ہے۔ دراصل میں تمہیں وہ سرنگ دکھانا چاہتا تھا جو ہم اپنی دانست میں نہایت رازداری سے کھود رہے ہیں۔ میں اس کے بارے میں تمہاری رائے لینا چاہتا ہوں۔" نفیس صاحب کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

"میں کوئی انجینئر وغیرہ تو ہوں نہیں۔ میں بھلا کیا رائے دے سکتا ہوں!" میں نے حیرت سے کہا۔

"میں تم سے انجینئرنگ کے نکتہ نظر سے نہیں بلکہ کامن سینس کے نکتہ نظر سے رائے لینا چاہتا ہوں۔ انجینئر تو ہمارے پاس بہت ہیں اور وہ سب اس پراجیکٹ پر کام کر رہے ہیں لیکن وہ لوگ لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔ وہ صرف ٹیکنیکل رائے دے سکتے ہیں۔ اس رائے کے پیچھے کچھ ضروری محسوسات کام نہیں کر رہے ہوتے۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولے "کل شام رپورٹ آئی ہے کہ کچھ حساس آلات نشاندہی کر رہے ہیں کہ جس سمت میں کھدائی جاری ہے اس سمت میں کچھ ہی آگے کوئی ٹھوس چیز موجود ہے۔ زمین کی ساخت سے مختلف کوئی چیز..... میں نے کھدائی رکوا دی ہے۔ اب ہمیں ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر... بہت احتیاط سے اٹھانا ہے۔ ہمیں ایسی ہی کسی خبر کا انتظار تھا۔"

"تو پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم پہلے میرے ساتھ چل کر سرنگ کا معائنہ تو کرو۔" نفیس صاحب اٹھتے ہوئے بولے۔

ہم دونوں خیمے سے نکلے اور بستی کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے ہوتے ہوئے اس سمت میں روانہ ہو گئے جہاں بظاہر واٹر سپلائی اسکیم پر کام ہو رہا تھا اور دیوہیکل مشینیں متحرک نظر آ رہی تھیں۔

زندگی کے اُونچے نیچے راستوں پر ایک سرکش مسافر کی سرگرانی ابھی جاری ہے باقی واقعات آٹھویں حصے میں پڑھیں۔